



du.com

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

ed By HarfeDua

تاجدرنگہ تپتا ہوا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ جا بجا بکھرے ہوئے ریت کے ٹیلے اور کانٹوں سے الٹی آنچاڑیاں سورج کی
پیش آنے سے اپنا چہرہ چھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔
”وادی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ دور دور تک دوڑائی۔ ”وادی۔ کہاں ہیں!“
سورج کی تیز گرم جھلسائی ہوئی آگ اب اسے اپنے پوٹوں پر محسوس ہوئی اور چند لمحوں کے لیے ہر سواندہ میراچے

”وادی۔ وادی۔ وادی۔ کہاں ہیں آپ!“ پیاس کی شدت سے اس کے گالے میں کانٹے اگ رہے تھے۔
”ربیعہ!“ اچانک وادی کی آواز ایک سرگوشی کی صورت میں اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ربیعہ پیاس گڑ
ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“
”وادی۔ وادی۔ وادی۔ کہاں ہیں آپ!“ دھوپ کی شدت نے بالآخر اسے دیکھنے کی صلاحیت سے قطعاً طور
محروم کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح وادی کو ڈھونڈنے لگی۔

”وادی۔ میری وادی۔“
”ربیعہ!“ سرگوشی پھر ابھری تھی۔ ”ربیعہ پیاس لگی ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“



”پئے ہے بیٹی۔ تکلیف کس بات کی؟“ وہ جھپٹ کر ہنس دیں۔
 ”کتنے دنوں سے آپ ماں بن کر میرا خیال رکھ رہی ہیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ یہ بھی میں شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتی۔ ماں کے خلوص کو شکریہ کے لفظوں میں تو مل کر میں آپ کا مان کم کرنا نہیں چاہتی۔ آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے بہت سارا دیا ہے خالہ جان!“
 ”پئے ہے بیٹی۔ اچھا جاتاؤ!“ نفیسہ خالہ کی جھڑکن بڑھ رہی تھی۔

نفیسہ خالہ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھی لالچی باتیں سوچتی رہی، پھر اس نے جتنا سوچے سمجھے کوئے کی طرف بڑھی جھاڑو اٹھائی اور گھر کی صفائی شروع کر دی۔
 گھر ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک گندا ہو رہا تھا۔ گریبوں کی آمد آمد تھی۔ آج کل دھول مٹی۔ اب بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہفتے بھر سے گھر کی صفائی نہ ہوئی تھی۔
 دادی جان کی زندگی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ بے حد صفائی پسند خاتون تھیں۔ دھول مٹی سے ان کی طبیعت گھبراتی تھی۔
 ”اور... اب... وہ...“ مٹی تلے جاسوی ہیں۔ نجائے نہ کیسے!“ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر سر جھٹک کر دوبارہ صفائی کی جائے متوجہ ہو گئی۔

دراصل اسے دنوں سے محض ایسی ایک بات کی فکر کرنے اس کا ذہن ہی طرح سے تھکا ہوا تھا۔
 ٹوٹ پھوٹ کا عمل پوری شدت سے جاری تھا سو اب اس کا جی چاہ کر رہا تھا کہ وہ دادی کو یاد نہ کرے۔ وہ کچھ کے لیے بھول جائے کہ اس کی باری دادی اس سے بہت دور جا چکی ہیں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ وہ کچھ دیر لیے مصروف رہنا چاہتی تھی۔ وہ کھڑکے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مگن رہی۔ جھاڑو لگا کر اس نے صحن کے کونے میں بنی کیاری صاف کی۔ سب سے پہلے کھڑکے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ پودوں کو پانی دیا۔ باؤں پرچی خانے کے سائے میں سجھڑ چند برتن نجائے کب سے گندے پڑے تھے انہیں دھو کر جگہوں پر پھینچا یا۔ باؤں پرچی خانے کا فرش کرپوٹھے سے خشک کیا پھر وہ کمرے میں چلی آئی۔
 اس کی نگاہ بستر پر پڑی۔ اس پر کچھ بھی چادر تنکوں سے پر تھی۔ سنہ چائے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آئیں۔ وہ یہ چادر بدلنا نہ چاہتی تھی۔ اس چادر میں ابھی اس کی دادی کے جسم کی مہک باقی تھی۔ زندگی آخری رات انہوں نے اسی بستر گزارا تھا۔ اس کی تنکوں میں ان کے وجود کی گواہی تھی۔
 وہ آہستہ آہستہ چلتی چلتی بستر تک آئی، پھر اس پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے اسے چھو کر محسوس کرنے لگی۔

مہک تھی، تنکیں تھیں، مگر وہ جوند تھا۔
 اس کا، تنکوں میں تیز ہو گیا۔ ایک بار پھر دادی سے پچھلے دنوں کا دکھ اس کی رگ رگ میں سکے لگا۔
 دروازے پر دستک نے اسے واپس حواسوں میں لوٹایا تھا۔ چند لمحے اسے خود پر قابو پانے میں لگے پھر وہ اپنے کمرے سے نکل گئی۔
 ”جاکم خانہ!“ باہر سے آواز آئی تھی۔
 ”بیٹہ کے دروازے کھول دیا۔“

(۴۷)

Scanned by

[illegible]

[illegible][illegible]

”میں بتا دیتی ہوں ماما!“ ورنہ عذرا بیگم کو اٹھنا دیکھ کر بولی۔ ”کیا بتانا ہے؟“

”ایک اندھ فراخی کرو، دو سلاکس سینک دو ایک کپ چائے۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گئیں۔

”اور رافع! تم ناشتہ کر کے ورنہ کوٹھار کیٹ تنک لے جاؤ۔ اسے کچھ کام ہے۔“

”کوئی نیک بخت دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو مارکیٹ سے کام نہ ہو۔“

”بھیکو مت!“ ماں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”تمہیں کون سے براڑوں نے ہیں یہاں۔“

”میرا ڈبے شک تروالیں۔ یہ ہونقلوں کی مانند بازار میں کھڑا ہونا بہت مشکل کام ہے۔ خاتون تو کسی دکان میں جا گھسی ہیں ساتھ جانے والا زندہ بیٹے چار اس پیاس گزرتی لڑکیوں سے کئی کترا مارتا ہے۔“

”صدقے جاواں۔“ علی کی آمد عمو! پوچھی ہوا کرتی تھی۔ ”یہ شرافت ہمیں نہ ملی ہے۔“

”جی آپ تو سہرا شرافت ہیں۔“ رافع نے طنز سے اسے دیکھا۔ ”مجسم پار سالی۔“

”آداب عرض کرتا ہوں پہلی بار کسی نے میرا ”Inner“ کھو جا ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری امی کیا کر رہی تھیں؟“ شفیقہ حیات نے اس سے پوچھا۔

”ایک عدد دست تیار کر رہی تھیں۔ جوں ہی میری نگاہ بڑی گھبرا کر بھاگا، یہاں آکر رکا۔“

”شرم نہیں ہے ان لوگوں کو۔“ عذرا بیگم ہنسنے لگیں۔

”ناشتہ تو کروا دیں چچی! اکل رات کا کھانا کھایا ہوا ہے۔“

”ہم نے کیا فجر کے وقت اٹھ کر کھا لیا تھا؟“ رافع نے اسے گھورا۔ ”ہم بھی رات کا ہی کھائے ہوئے ہیں۔“

”ہا! ماشاء اللہ! آپ میں صبر بہت ہے۔“ انہیں نے بچن سے آتی ورنہ کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔ ”ابھی کچھ دیر اور صبر کریں۔“

”میں تو بیٹا جی دوپہر تک صبر کر سکتا ہوں۔“ اس نے اس کی حرکت پر جی بھر کر اطمینان کا اظہار کیا۔ ”تم ذرا یہ ناشتہ منسا کرو ورنہ کوٹھار کیٹ تنک لے جانا اُسے کچھ کام ہے۔“

اس نے اسے پہلے کہ علی غلت میں لقمہ نگل کے کچھ کتنا وہ منظر سے غائب ہو چکا تھا۔

”ہائے اللہ امی! یہ اتار دیا کیوں ہے۔“ ماہین نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ”بچوں میں اللہ (میاں) نے آن آتے

کائنات کیوں نہیں لگایا۔ کم از کم کسی گھڑی تو آف کر کے کسی کو بے میں بٹھو دیتے۔“

”توبہ کرو۔“ فردوس بیگم نے اسے گھرا۔ ”اللہ نے لولاؤ دئی ہے! این کا شکر ادا کرو۔ بجائے اس کے الٹی

سیدھی باتیں کیے جاتی ہو۔“

”میں بھی اتار توئی تھی اتنا ہی تنگ کرتی تھی آپ کو؟“

”نہیں۔“ وہ طنز سے بولیں۔ ”تم تو پیدا ہی اتنی بڑی ہوئی تھیں مجھے کیا کرنا پڑا۔“

”افوہ۔“ وہ حسام کو تیز پرچ کر جھلائی۔ ”چپ سی نہیں ہوتا۔“

فردوس بیگم اسے خف سے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ ریکٹ ہلانا محروماند داخل ہوا تو ماہین کی جان میں جان

”ذرا آئی صبر کرو۔“

”خیر خیر! میرا بھائی۔۔۔ ذرا اس کیلئے کوڈ گھڑی کے لیے کہیں بے جاؤ ورنہ میں اسے مار بیٹھوں گی۔“

”وہ کسی کیلئے کوڈ؟“ انہیں نے فراخی سے اسے ہڑاؤ دھرا دیا۔

”اس ریس میں کو۔“ ہر وقت کا باجا۔“

اس نے حسام کے سر پر چت لگائی وہ اور زیادہ روٹنے لگا۔
 "اے ہمارے بھائی کی شان میں آپ اس سے زیادہ گستاخی نہیں کر سکتیں۔" اس نے ریکٹ بیڈ پر بیٹھ کر حسام کو اٹھا لیا۔ فوراً "خاموش ہو گیا تھا۔
 "یہ آپ کی شکل دیکھ کر روٹا ہے یا آپ؟"
 "کیوں؟" وہ متشعل ہوئی۔ "میری شکل کو کیا ہوا؟"
 "تپ کی شکل کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کا مزاج اتنے باہر چلا گیا ہے۔"
 "آئے ہمارے لڑکے؟" فردوس بیگم اسے گھورنے لگیں۔ "گستاخ لگا ہو رہا ہے۔"
 "مگر میں میں تو میرا ہی چاہتا ہے سائنس دانوں کو مشورہ دے والوں۔ بیڈی ایس سی ایجاد کرنے کا۔ بس ہاتھ میں پکڑ کر کھوٹے رہو۔"
 عرشہ جیسے بلوائی ہوئی کرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرخ استرج کالان کا چرٹ اس کی دیکھی ہوئی رنگت پر خوب ہمارے رہا تھا۔
 "شکر کروا لے بیڈروم میں کئی بھر کریش کر لیتی ہو۔" فردوس بیگم نے اس کی بھی خبر لے والی۔
 "جہانے سسرال میں جا کر کیا کروے۔ بیڈی ایس سی ایجاد کرنا میں کی سائنس دانوں سے ملکر اڑتھ۔"
 "فردوس! ابھی تو دعا بھی دے دیا کر۔" وہ بھلائی۔ "بیب بوبلیں کی بولناک ساقشہ گھوٹاؤں میں پھروں گی۔"
 "ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔" ماہین نے اس کا ساتھ دیا۔ "تمہارے تو باغی نہیں ملتے ہر جگہ تھوڑی یہ غزنی پتلے ہیں۔ لڑکیوں کو تو صبر شکر کا عادی ہونا چاہیے۔"
 "ارے ایسا! انہیں بے چاری کو ڈرا رہی ہیں۔" جہانے نے لگا۔ "صبر شکر ٹینگ انٹیمی ٹیٹ میں باضابطہ ایڈیشن لے گی تو خود ہی سب کچھ سمجھ جائے گی۔ ابھی سے کیوں اپنی سخت ٹینگ کا اشارت لے رہی۔"
 "یہ کون سا اسکول ہے؟" فردوس بیگم کچھ سمجھ نہ سکیں۔
 "سائنس کی آس" فندگی بھڑاس ڈیوڑھی باس اور شوہر کا سیتھاس۔ کچھ اس قسم کی کلاسز ہوتی ہیں وہاں ایسی جم۔
 ان تینوں کو بھی اچھی تھی۔
 "توبہ! کئی کلاس کرنا ہے۔" فردوس بیگم نے خود پر قابو پکرا کر اسے معصومی خشکی سے گھورا۔ "سجھال ہے جو کبھی لکھتا دھتلا نظر آئے۔"
 "ارے جی جی! آج کل ٹیبل پر بیٹھ کر لکھتے بیٹھے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو دور ہے حرکت کا۔ ہر شے میں حرکت لگایا جاتا لکھنا درحساب حرکت میں نہ کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تو ذرا ہے کچھ عرصہ بعد دوبارہ حرکت میں نہ ہو۔ آدمی سوچتی رہا ہے اور مزے سے اسے کچھ بھی نہ سنا نا پھر رہا ہے۔ کیوں رہا؟"
 "اسی فضول حرکت تھی کہ کہتے ہو۔" اس نے ناگ کر چلائی۔ "یہ علی کہاں ہوتا ہے آج کل، نظری نہیں آتا ہے۔"
 "نظر آکر اس کو اپنی شامت بلوائی ہے کہ؟" وہ لالہ لالہ سے پوچھنے لگا۔
 "کیوں! ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" لڑنے لڑاؤ۔ "کبھی کبھار کئی شے ہیں کہ ذرا سسرال سے آکر لے جاؤ۔ ہمیں۔ اب کیا کہیں گے؟" انہیں سواں پیچھوئے ہوئے سن میں ہر وقت رات گھر اور دور کے کام کرنا رہتا ہے۔
 "ناگ کرنا۔" انہیں کیوں کیوں کر کہیں تو اس نے بے چارے کی اعلیٰات اچھے میں کیا؟ "جہانے شوخی نہ لے اسے۔"

اس نے حسام کے سر پر چت لگائی وہ اور زیادہ روٹنے لگا۔
 "اے ہمارے بھائی کی شان میں آپ اس سے زیادہ گستاخی نہیں کر سکتیں۔" اس نے ریکٹ بیڈ پر بیٹھ کر حسام کو اٹھا لیا۔ فوراً "خاموش ہو گیا تھا۔
 "یہ آپ کی شکل دیکھ کر روٹا ہے یا آپ؟"
 "کیوں؟" وہ متشعل ہوئی۔ "میری شکل کو کیا ہوا؟"
 "تپ کی شکل کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کا مزاج اتنے باہر چلا گیا ہے۔"
 "آئے ہمارے لڑکے؟" فردوس بیگم اسے گھورنے لگیں۔ "گستاخ لگا ہو رہا ہے۔"
 "مگر میں میں تو میرا ہی چاہتا ہے سائنس دانوں کو مشورہ دے والوں۔ بیڈی ایس سی ایجاد کرنے کا۔ بس ہاتھ میں پکڑ کر کھوٹے رہو۔"
 عرشہ جیسے بلوائی ہوئی کرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرخ استرج کالان کا چرٹ اس کی دیکھی ہوئی رنگت پر خوب ہمارے رہا تھا۔
 "شکر کروا لے بیڈروم میں کئی بھر کریش کر لیتی ہو۔" فردوس بیگم نے اس کی بھی خبر لے والی۔
 "جہانے سسرال میں جا کر کیا کروے۔ بیڈی ایس سی ایجاد کرنا میں کی سائنس دانوں سے ملکر اڑتھ۔"
 "فردوس! ابھی تو دعا بھی دے دیا کر۔" وہ بھلائی۔ "بیب بوبلیں کی بولناک ساقشہ گھوٹاؤں میں پھروں گی۔"
 "ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔" ماہین نے اس کا ساتھ دیا۔ "تمہارے تو باغی نہیں ملتے ہر جگہ تھوڑی یہ غزنی پتلے ہیں۔ لڑکیوں کو تو صبر شکر کا عادی ہونا چاہیے۔"
 "ارے ایسا! انہیں بے چاری کو ڈرا رہی ہیں۔" جہانے نے لگا۔ "صبر شکر ٹینگ انٹیمی ٹیٹ میں باضابطہ ایڈیشن لے گی تو خود ہی سب کچھ سمجھ جائے گی۔ ابھی سے کیوں اپنی سخت ٹینگ کا اشارت لے رہی۔"
 "یہ کون سا اسکول ہے؟" فردوس بیگم کچھ سمجھ نہ سکیں۔
 "سائنس کی آس" فندگی بھڑاس ڈیوڑھی باس اور شوہر کا سیتھاس۔ کچھ اس قسم کی کلاسز ہوتی ہیں وہاں ایسی جم۔
 ان تینوں کو بھی اچھی تھی۔
 "توبہ! کئی کلاس کرنا ہے۔" فردوس بیگم نے خود پر قابو پکرا کر اسے معصومی خشکی سے گھورا۔ "سجھال ہے جو کبھی لکھتا دھتلا نظر آئے۔"
 "ارے جی جی! آج کل ٹیبل پر بیٹھ کر لکھتے بیٹھے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو دور ہے حرکت کا۔ ہر شے میں حرکت لگایا جاتا لکھنا درحساب حرکت میں نہ کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تو ذرا ہے کچھ عرصہ بعد دوبارہ حرکت میں نہ ہو۔ آدمی سوچتی رہا ہے اور مزے سے اسے کچھ بھی نہ سنا نا پھر رہا ہے۔ کیوں رہا؟"
 "اسی فضول حرکت تھی کہ کہتے ہو۔" اس نے ناگ کر چلائی۔ "یہ علی کہاں ہوتا ہے آج کل، نظری نہیں آتا ہے۔"
 "نظر آکر اس کو اپنی شامت بلوائی ہے کہ؟" وہ لالہ لالہ سے پوچھنے لگا۔
 "کیوں! ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" لڑنے لڑاؤ۔ "کبھی کبھار کئی شے ہیں کہ ذرا سسرال سے آکر لے جاؤ۔ ہمیں۔ اب کیا کہیں گے؟" انہیں سواں پیچھوئے ہوئے سن میں ہر وقت رات گھر اور دور کے کام کرنا رہتا ہے۔
 "ناگ کرنا۔" انہیں کیوں کیوں کر کہیں تو اس نے بے چارے کی اعلیٰات اچھے میں کیا؟ "جہانے شوخی نہ لے اسے۔"

بچوں کو میرا دست پادار دینا میری طرف سے انہیں بہت ہے کھانے کے کھانے اور ہر کھانے کے کھانا
 وہ چند لمحوں کا وقت ہوتا ہے کہ میرا کھانا کھانے کے سامنے آگئے ہوتی ہے
 سیاہ پھولی دار پر منٹ میں شالار غٹھ رکھ دی تھی کہ انکھوں میں چند لمحوں کے قبل سے والی خوشی کے سینے جل
 رہے تھے۔ پہلے بالوں سے شفاف قطرے ٹپک رہے تھے۔

پھر کھانے کی لاد میں آئے آپہ آکھیر۔ ہر ایک ایک میں جلتے دو سال ہوئے تھے۔ دو سال پہلے وہ اپنی کھیتی کی طرف
 سے جاپان گیا تھا۔ سو سن جب لا حال کا تھا اور ایمان محض چند ماہ کی اور ان کی شادی کو سو سو تیار ہوئے تین سال کا
 عرصہ ہوا تھا۔
 بس اتنی ہی وقت اس کے ساتھ گزار سکی تھی اور اس کی مدت میں اس کی محبت اور چاہت کی وہ ایسی عادی ہوئی
 تھی کہ اس کے بعد وہ بکرا بکرا کر کے لوہیں جھپکتی تھی۔
 تار ہو کر گئے۔ آکھیر کھیتی تو بال بال ان کی ہتھیں میں تھیں۔ فارغ ہو کر بستر جا لیتی تو اس میں اس کے لب
 و لہجہ میں اتنی ہی چیزیں رہتی تھیں تو اس کا نام لپکنا کہنے کے بارے میں ہر جاہلی۔ وہ بے دلی سے میں ہزار کے ڈراؤں کو
 دیکھتی رہتی۔ ابھی چند روز قبل تو اس نے نیک میں چپاں ہزار ڈالے تھے جو تمام گریہ اور خراجاوت پورے کر کے چنے
 کے تھے۔ اس نے پھر مزید رقم بچوا دی تھی۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے ماما" وہ زور بولتی۔ "میرے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ لوٹ آؤ گاتے"
 (دیکھ کر تو بڑا بڑا دل اس کی دینا سے نکل آئی تھی۔ پھر نظر پڑا تو اس نے ایک کرودہ وہ کھول دیا۔
 "اسلام علیکم" جسے ہوسن کو ٹھیک دیکھتا ہے کہ کرودہ اور اسی کھول کر مرکز کوئی تھکتی
 "و علیکم السلام" اس نے مشتاقانہ سے جواب دے کر ٹھیک سال کو سمجھا۔
 "میرا کمال ہے ماما؟" گھر میں داخل ہوئے تھے وہ پہلا سوال اس کے متعلق کرتا تھا۔
 "مفتوحی سے جاؤ اور اس سے جب کہ اس کا قول چوہا۔" آپ کو پیازیں بیچ کر دو گیس کھانا لائی ہوں۔ ماما کو
 بھوک لگی ہے۔
 "کیا کیا ہے ماما؟"
 "آپ کا پیورٹ آلو کوشت۔ شورے ڈالو۔"
 "ساتھ میں چاول پورا ک کیے ہیں؟"
 "ہاں کئے ہیں۔" وہ خوشی سے بولی۔ "آپ کپڑے تبدیل کر لیں بادشاہ سلامت! تو پھر ہم کھانا

کھا کریں۔"
 "ماما! ایمان کو کچا کھیں ماما اس کے لیے چاکلے لٹائی ہوں۔"
 "ماما! پیچھے آئی ہوئی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔
 گھنٹوں سے اونچی بیگ ٹکڑی خراک پیڑ کھاتی۔ مینورور تھی۔
 "دیکھو ہوئی خراش پوری۔" اس نے بڑے خوشی کے ساتھ کہا۔ "آپ میرا ساتھی۔"
 "ہاں ہاں۔" اس نے جیسے کھانے کے لئے کہا۔ "دیکھو کھانا۔"
 وہ ایک کھانے کے لپٹ گئی تھی۔
 "آپ کھانے کے لیے آئی ہیں؟" وہ بڑے خوشی کے ساتھ کہا۔ "آپ کھانے کے لیے آئی ہیں؟"
 "ہاں۔" اس نے بڑے خوشی کے ساتھ کہا۔ "آپ کھانے کے لیے آئی ہیں؟"
 "ہاں۔" اس نے بڑے خوشی کے ساتھ کہا۔ "آپ کھانے کے لیے آئی ہیں؟"



اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ وادی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وادی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ وادی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اس سے ایک خواب دیکھتی ہے کہ وادی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید یاس کے عالم میں اس سے پانی طلب لے لیتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو۔۔۔ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ وادی نے کیا غلطی پر زور ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔۔۔ ایقان۔۔۔ شوقِ حیات اپنی ہوسِ رانی کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بی بی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔۔۔ شوہر عاشقِ ہرگز نہ کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشق کی بہت محسوس ہوتی ہے۔

دوسری قسط

”جی میں ٹھیک ہوں، شکر ہے خدا“ اس نے الجھے میں جی بھر کر شکر کی سموائے ہوئے جواب دیا تھا۔
”شریکِ حیات تو خوش ہوں گے آپ کے، کب لوٹ رہے ہیں خیرے؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
ایقان کوئی جواب نہ دے پالی۔ جڑ بڑ ہو کر رہ گئی۔

Dua

for OneUrdu.com Scanned By



”کہاں تھے آخرت میں! اسی دنوں کے بعد وہ کھائی پتے ہو؟“ شہزادہ حیات نے بیٹی کو مضطرب پارکسنگ کا جویان بنانے کی شہزادی کی خوشی۔

”اچھا ہمارا کیا ہے لیکن جان: کچھ نہ دوسرے کچھ یہاں بڑے ہیں تو کسی ڈال ہے۔“ وہ فطرت سے بھا۔ ”یوں بھی ہم دکھائی دے نہ دکھائی دیں، کون سی نظریں ہیں جنہیں کچھ فرق بڑے کس کی نگاہیں تلاشی ہیں۔“

کرسٹن: سبکی بہن تو یہاں ہے تمہاری۔ وہ تو بھائی کو یاد کر گئی تھی تو کی ہے؟

نخواستہ کہ صاف کرادیتی ہیں۔ اس لئے زنا اور ایک، بمن کرکھی کیا سستی ہے گھٹو بھائی کے لیے۔
 ”تو بیٹا! جب عاقل بنائے ہو، سب کچھ سمجھتے ہو، تو کوئی روزگار سے لگو۔ انکا کچھ ٹھکانا کرنا۔“

بہاؤ خدا کے رسول کی جست میں سے ہو تو اس کی سنت بھی پوری کرلو۔“

”ہم نے تو بہت چاہا لیکن۔۔۔“ وہ ہنسا بھر منہ ہی منہ میں کچھ لگاتے ہوئے۔ ردا نے اس کی طرف بڑھ کر کہا۔

۱۱ اچھا! بل جانے، پہلے تو یہ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا تھا۔ یہ سلام کسی کی ہون سکتھ ہے مگر جاننے کا نام نہ لگا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آمین، میں ابھی سے اسے اذیت دے رہا تھا۔ آپ نے یہ سہارا دیا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں آئے۔

اقتباس نے مجھے اپنے دوست محمد علی سہیل کی طرف سے بھیجی ہوئی سانس برادری کی تھی۔

”تو یہ اے گھوڑے! جس خاندان خانی کو بھیجے نظروں سے کھائی تو جا میں گئے۔“ ناعی نے فریاد کیا۔

”جی نہیں۔ ابھی آپ کا رزلٹ نہیں آیا۔ کیا پتا چسپاس ہوئی بھی ہیں یا نہ تو ہی میں سے پرانے نوٹس دوبارہ

”اللہ راضی تھا کہ آپ کے منہ میں جھاگ نہ رہے بھی اگر اس کا گناہ“ وہ سبک اٹھتی: ”ساری گند ملا صاف

ہو جائے ایک بار میں ہی۔
ایقان ہے سائنس دان کی بھی۔

”فریش سن کرو تو ہری ہری چیز کا خیال آتا ہے پیسوں۔“ علی بھی روشت نازل ہوا۔ ”گھبرا آپ طبیعت ہری کروانے“

الانسان بطبعه كائن اجتماعي

۱۱) اگر لکھنا چاہیں تو لکھنا ہی نہیں سکتے۔

36
Scanned with
Hario

(۱) سربراہ کو ہلا چکا ہے۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب جو ان جنگے ہرجس
 ان میں اضافہ ہو جائے گا۔"
 (۲) نشان زور پکڑے گا تو اس پاس کی سب پھاڑوں کے لئے ہرجس ہو جائیں گے۔ یہ حو تھاہو
 (۳) نیت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔
 (۴) اب کان کر کے رہے تھے۔ وہ کسی کی نام پچھو اور کسی کی ہم عمر خالہ تھی۔ سب نے اس کی
 (۵) آتش فشاں کوں ہے اور اس پاس کی پھاڑیاں کوں ہیں؟ وہ دیکھنے سے بوجھے گی۔
 (۶) سب نے تو نہ ہی پوچھیں پچھو جانی۔ بجلا عہد کی موجودگی میں کوں یہ دیکھ لے گی جرات
 (۷) ارادہ اس پر ہی اندر لے گئے گی؟
 (۸) اس کو اب "مختفیہ حیات" سے پلہ بولا۔ "یہ چار کسی جمع ہو جائیں تو پھر ان کو دیکھ بول ہی نہیں
 (۹) اس اپنے دکھ سمجھ کہنے۔ کتنے دنوں بعد تو میری بیٹی آئی ہے۔ چاہئے کہ سب بھاگو میراں
 (۱۰) "ای نہیں کے"
 (۱۱) ہاں۔ اس قدر عزت افزائی۔ "علی نے دانت نکالے" یہ "مدتے جاواں!"
 (۱۲) "ناعہ نے زبان چرائی۔" چلو مدتے ہی جاؤ!"
 (۱۳) اس بیک کے ساتھ بڑھنے لگے تھے۔
 (۱۴) نے سے پہلے دل لیا کہ نہ ہی شاہی ہی کتنی رہتی ہو۔ "ان کا عہد نہایت درشت تھا۔ سہا
 (۱۵) عام کے بغیر یہ وہ اس کی خبر کرنے میں مصروف ہو گئیں۔
 (۱۶) "یہ ترازو تو ہم سب کا ہی خراب ہے۔" علی نے فن کر بات کرنے کی کوشش کی۔ دیکھ ہی
 (۱۷) آتش فشاں کہہ رہا تھا۔ اور میں زلزلہ پائی کی سربراہ کا لقب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
 (۱۸) کے ساتھ یہ صرخہ بڑاؤ لگے۔
 (۱۹) اچھا ساتھ کہہ رہا ہوں۔ "ان نے بھی باخول پڑنے کی کوشش کی۔
 (۲۰) انہوں کی بو بھجھڑ ہوئی تو فردوس بیگم بھی غصہ کی پڑ کر شاکس اور منہ سے ملے لگیں۔
 (۲۱) ال، اگر کوئی تو سہی۔"
 (۲۲) اس مرتبہ تو تو کوں کی۔ مومن کی بھی جھپٹاں ہیں۔ "وہ اس بیٹا نے لگی۔
 (۲۳) اچھا کہہ کر اپنے پورن میں چلی آئیں۔
 (۲۴) نے ہی کا وہی؟ "ناعہ کے تن بدن میں گویا آگ لگی ہوئی تھی۔ "ان کے ہاتھ لڑکے خواہ
 (۲۵) ان میں خوار کرتے رہیں۔ وہ سزا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور خصوصاً "بھگتے تھو ان کو اللہ
 (۲۶) کوئی بات نہیں۔ ہماری بری ہیں وہ۔ اگر کچھ نہ کہہ بھی دیا تو نظر انداز کرو۔" ورہ نے
 (۲۷) طرہ از کردہ ہیں ہوں۔ "وہ اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔"
 (۲۸) لار کا سیک۔ اب تم نے بات نہ سنے ہو۔ یہ جانتا ہے۔ "راغہ کو ابھن ہوئی۔

عروشہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ماں کی صبح والی بات اسے ابھی اب تک یاد تھی۔
"پچھلے چند جلدی۔ وہ دھماچو کڑی پچھلے لان میں جمع ہو گئے۔ خوب زور زور سے باتیں ہو رہی ہیں۔"
"ارے یا رستہ! ہم کل کی بیت بازی کی تیاری کر رہے ہیں۔" سندھ جھلائی۔ "تم لوگوں کو جاسوسیوں کی پڑی

ہے۔"
"اوئے بد صاحب۔ بڑے مزے مزے کے کراڑا فٹا ہو رہے ہیں۔ اور تو اور عباد اور رہبر بھی آئے ہیں۔"
"ہائے اللہ! ناعم نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "عباد ابھی آیا ہے۔ ہائے میرا دل!"
"ہائے ہائے مری جاؤں میں۔ جو وہ حال دل سے واقف ہو جائے تو سنے وہ شرابی۔"
سب کی سب ترقہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

"پھر جماعت دعا کریں اس سے تمہارے نگاہ کی؟" سدرہ شرارت سے بولی تھی۔
"میری مراد یہ ہے!" ثانیہ نے اسے ایک دھپ لگا کر کہا۔ "ابن کا پر دھوا وے۔ بڑی بہن نہیں دکھائی دیتی تھی؟"
"ایک اور ترقہ لگا۔"
"چلو جی۔ یہاں تو سب کی سب اس کی شہید نکلیں!" ایک طنزیہ آواز سیڑھیوں کے قریب بنے چھجے کے نیچے

سے ابھری تھی۔
"خیر چند بچوں کے لیے وہ سب کی سب ہٹا کر رہ گئیں۔ پھر آواز اور وردہ دونوں کو پہچان کر ان سب کی جان بٹر جان آئی تھی۔"
"ہائے اللہ! وردہ آپ کی سچی ڈر کر رکھ دیا! سدرہ کے حواس بحال ہوئے۔ "آپ کب آئیں گی؟"

لاؤ فیض تو کب سے یہاں بیٹھی تم ست کی کار گزاریاں دیکھ رہی ہوں۔ منہ سب کے کھلے ہوئے ہیں اور آپ کبھی ساروں کی بند نہیں کرتے۔ وہ ان کے قریب چلی آئی۔ "اور جو میری جگہ کوئی لوکا یہاں آجانا تو کیا کچھ کو اس نہ سنتا؟"
"وہ نہیں آئے وائے وہ صاحب پچھلے لان میں جمع ہیں۔ ابھی تو ہم ان کی موشگافیوں کا سروہ چاک کر رہے ہیں۔" عروشہ اطمینان سے بولی۔ "میں آپ کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اور لائٹ آف کر گئے آئی ہوں۔"
"چھپتے چھپ کر دوسروں کی باتیں سننے سے اللہ منع کرنا ہے۔" وردہ نے انہیں عقل دلانی چاہی۔

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" ناعم نے عروشہ کو آنکھ ماری تھی۔
"تم محبت کر رہی ہو یا جنگ؟" وردہ نے اسے منصوبی غصے سے گھورا۔
"اے! اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "میرا اور ذہن جانے کوئی۔" سب کی کبھی کبھی شروع ہو گئی۔
"پچھلے لگتا ہے منہ وہ آئی سے بات کرنا ہی پڑے گی۔" وردہ نے ہنس سے سر ہلایا۔
"ہلے عباد سے تو بات کر لیں۔" عروشہ ہنسی۔ "وہ تو اسے ناعم بھائی کہتا ہے۔"

"تمہیں بھی تو عروشہ باجی ہی کہتا ہے۔" وہ جڑ گئی۔
"ہاں تو میں کب اس کے قصیدے پڑھتی ہوں! وہ باجی چھوڑ مجھے داوی کہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔
"ارے وہ تو کیا مولوی ہے۔ وہ تو مجھے بھی باجی کہتا ہے۔" حالانکہ میں تو یقیناً اس سے چند ایک سال چھوڑی ہوں گی!" سدرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"اچھا ممتی! اچھا! پچھلے دنوں جو کچھ ہاتھ لگتا ہے وہ بھی نکل جائے گا۔" ثانیہ نے جھلا کر کہا۔

سب کی سب سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔
42

ان کے جذبات کا کچھ خیال کر لیتا جاوے۔ بے شک جواب میں چاہت مندیں کہ یہ دل کے ان اہل طرح کے بے مروتانہ القاب! یعنی آپ نے ان کو ہنسنا بلانا؟ اگر نعمت دے تو تمنا ہے

”میں کاتھارن لوگوں کے کہیں جاسوسی پروگرام میں شریک ہونے کا کبھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسی

قیہ رائے نے اس کا ہاتھ دیا۔ "تمہی آنکھوں کے فتنے روشن ہونے والے ہیں یا شاید

"اس نے گھر کر اسے ڈانٹا۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

"اس نے کہا "اب اس نے؟" وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

By HarfeDua for Once

اس نے اپنے بچے سے انداز میں تسکین سے بتایا۔ اس نے اور لڑکے بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔
عاشق کے جانے کے لمحہ میں بے دردی سے شوق سے چند ایک دواؤں کی گانوں کے کیسٹس کے لیے کچھ دیا کلف
دوا دلا ہو جائے گا۔ "اس نے عاشق کو دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا "میں نے اس کیسٹس
کے ذریعہ کھل نکال کر پورے گھر میں پھیلا دیے۔"

فتیل کھانکھار کر سن رہی تھیں۔
مرکزی گیت پر کسی کی گانے اپنا ایک ہی تھیں کی تو اس جانب سیدھی لڑکی کی
دو خاتون اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ میں ایک چارچار سالہ بچہ بھی تھا۔
"وہ کون ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔
"انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی
فتیل کے بول پر مسکرا کر ہنسنے لگی۔
انہوں نے کہا "وہ ایک نیا گھر میں رہ رہی ہیں۔ ان کی بہن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان کی

Scanned By Harf...
وہ پھر آگے بڑھ جاتی۔
پھر وہ کتنی دیر اندھیرے میں چلتی رہتی تاؤ تھک اگلا دروازہ اچانک۔
داوی کی آواز پھر قریب لڑجاتی تہ تھراتی ہوئی، کانپتی ہوئی، لرزتی ہوئی آواز۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھتی۔
کمرے میں جھانکتی مگر کمرہ خالی ہوتا۔
یونہی چلتے چلتے وہ تھک کر چور ہو گئی۔ اس کے لمحوں تلے چھپا ہوا آگے۔ اس کے کاندھے ٹوٹے۔
تب اس نے دیکھا۔
راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا۔ وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ اس میں بالکل روشنی نہ تھی۔ داوی کی آواز شاید
وہ اس کی آخری امید پر آگے بڑھی۔ وہ برصورت اپنی داوی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کب سے ان سے نہیں ملی
تھی۔ اس نے کنب سے داوی کو نہ دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔
”ربیعہ۔۔۔ اور ربیعہ۔۔۔ آؤ!“
آواز اسے بلاتی گئی وہ کھینچتی چلی گئی۔
وہ پھر آگے بڑھتا ہے۔
اندھیرے اندھیرا تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ اندر داخل ہو گئی۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رہی۔ اسے احساس
ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہو رہی ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے
میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا۔ کمرے میں تو کچھ بھی نہ تھا۔
پھر داوی آگیا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
”داوی۔۔۔ داوی کہاں ہیں ایک؟“
اچانک ہر منظر واضح ہو گیا۔ کمرہ آپ ہی آپ تیز روشنی سے بھر گیا۔
تب ربیعہ نے دیکھا۔
خالی کمرے کے ایک کونے میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ
سکتی تھی۔
”ربیعہ کو اس تنہا خالی کمرے کی اس واحد عین سے خوف محسوس ہوا۔“
آخر وہ کون تھی۔
اس عورت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ربیعہ کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ اس کا
آنکھیں۔۔۔ سرخ رنگہ آنکھیں اس کی جھجکی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے بسی تھی۔ اچانک
”ربیعہ! میرے پاس آؤ۔۔۔ ربیعہ!“ وہ بولی۔
ہاں! وہ داوی کی آواز تھی۔
ربیعہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی داوی تھیں۔
”ربیعہ!“
وہ ایک کمرہ تھا۔
”ربیعہ! میرے پاس آؤ۔۔۔ ربیعہ! میرے پاس آؤ۔۔۔“
داوی کی آواز اس کا قابض کر رہی تھی۔
50

۱۲۰۴: ۳۷۰، ۳۷۱
 ۱۲۰۵: ۳۷۲، ۳۷۳
 ۱۲۰۶: ۳۷۴، ۳۷۵
 ۱۲۰۷: ۳۷۶، ۳۷۷
 ۱۲۰۸: ۳۷۸، ۳۷۹
 ۱۲۰۹: ۳۸۰، ۳۸۱
 ۱۲۱۰: ۳۸۲، ۳۸۳
 ۱۲۱۱: ۳۸۴، ۳۸۵
 ۱۲۱۲: ۳۸۶، ۳۸۷
 ۱۲۱۳: ۳۸۸، ۳۸۹
 ۱۲۱۴: ۳۹۰، ۳۹۱
 ۱۲۱۵: ۳۹۲، ۳۹۳
 ۱۲۱۶: ۳۹۴، ۳۹۵
 ۱۲۱۷: ۳۹۶، ۳۹۷
 ۱۲۱۸: ۳۹۸، ۳۹۹
 ۱۲۱۹: ۴۰۰، ۴۰۱
 ۱۲۲۰: ۴۰۲، ۴۰۳
 ۱۲۲۱: ۴۰۴، ۴۰۵
 ۱۲۲۲: ۴۰۶، ۴۰۷
 ۱۲۲۳: ۴۰۸، ۴۰۹
 ۱۲۲۴: ۴۱۰، ۴۱۱
 ۱۲۲۵: ۴۱۲، ۴۱۳
 ۱۲۲۶: ۴۱۴، ۴۱۵
 ۱۲۲۷: ۴۱۶، ۴۱۷
 ۱۲۲۸: ۴۱۸، ۴۱۹
 ۱۲۲۹: ۴۲۰، ۴۲۱
 ۱۲۳۰: ۴۲۲، ۴۲۳
 ۱۲۳۱: ۴۲۴، ۴۲۵
 ۱۲۳۲: ۴۲۶، ۴۲۷
 ۱۲۳۳: ۴۲۸، ۴۲۹
 ۱۲۳۴: ۴۳۰، ۴۳۱
 ۱۲۳۵: ۴۳۲، ۴۳۳
 ۱۲۳۶: ۴۳۴، ۴۳۵
 ۱۲۳۷: ۴۳۶، ۴۳۷
 ۱۲۳۸: ۴۳۸، ۴۳۹
 ۱۲۳۹: ۴۴۰، ۴۴۱
 ۱۲۴۰: ۴۴۲، ۴۴۳
 ۱۲۴۱: ۴۴۴، ۴۴۵
 ۱۲۴۲: ۴۴۶، ۴۴۷
 ۱۲۴۳: ۴۴۸، ۴۴۹
 ۱۲۴۴: ۴۵۰، ۴۵۱
 ۱۲۴۵: ۴۵۲، ۴۵۳
 ۱۲۴۶: ۴۵۴، ۴۵۵
 ۱۲۴۷: ۴۵۶، ۴۵۷
 ۱۲۴۸: ۴۵۸، ۴۵۹
 ۱۲۴۹: ۴۶۰، ۴۶۱
 ۱۲۵۰: ۴۶۲، ۴۶۳
 ۱۲۵۱: ۴۶۴، ۴۶۵
 ۱۲۵۲: ۴۶۶، ۴۶۷
 ۱۲۵۳: ۴۶۸، ۴۶۹
 ۱۲۵۴: ۴۷۰، ۴۷۱
 ۱۲۵۵: ۴۷۲، ۴۷۳
 ۱۲۵۶: ۴۷۴، ۴۷۵
 ۱۲۵۷: ۴۷۶، ۴۷۷
 ۱۲۵۸: ۴۷۸، ۴۷۹
 ۱۲۵۹: ۴۸۰، ۴۸۱
 ۱۲۶۰: ۴۸۲، ۴۸۳
 ۱۲۶۱: ۴۸۴، ۴۸۵
 ۱۲۶۲: ۴۸۶، ۴۸۷
 ۱۲۶۳: ۴۸۸، ۴۸۹
 ۱۲۶۴: ۴۹۰، ۴۹۱
 ۱۲۶۵: ۴۹۲، ۴۹۳
 ۱۲۶۶: ۴۹۴، ۴۹۵
 ۱۲۶۷: ۴۹۶، ۴۹۷
 ۱۲۶۸: ۴۹۸، ۴۹۹
 ۱۲۶۹: ۵۰۰، ۵۰۱
 ۱۲۷۰: ۵۰۲، ۵۰۳
 ۱۲۷۱: ۵۰۴، ۵۰۵
 ۱۲۷۲: ۵۰۶، ۵۰۷
 ۱۲۷۳: ۵۰۸، ۵۰۹
 ۱۲۷۴: ۵۱۰، ۵۱۱
 ۱۲۷۵: ۵۱۲، ۵۱۳
 ۱۲۷۶: ۵۱۴، ۵۱۵
 ۱۲۷۷: ۵۱۶، ۵۱۷
 ۱۲۷۸: ۵۱۸، ۵۱۹
 ۱۲۷۹: ۵۲۰، ۵۲۱
 ۱۲۸۰: ۵۲۲، ۵۲۳
 ۱۲۸۱: ۵۲۴، ۵۲۵
 ۱۲۸۲: ۵۲۶، ۵۲۷
 ۱۲۸۳: ۵۲۸، ۵۲۹
 ۱۲۸۴: ۵۳۰، ۵۳۱
 ۱۲۸۵: ۵۳۲، ۵۳۳
 ۱۲۸۶: ۵۳۴، ۵۳۵
 ۱۲۸۷: ۵۳۶، ۵۳۷
 ۱۲۸۸: ۵۳۸، ۵۳۹
 ۱۲۸۹: ۵۴۰، ۵۴۱
 ۱۲۹۰: ۵۴۲، ۵۴۳
 ۱۲۹۱: ۵۴۴، ۵۴۵
 ۱۲۹۲: ۵۴۶، ۵۴۷
 ۱۲۹۳: ۵۴۸، ۵۴۹
 ۱۲۹۴: ۵۵۰، ۵۵۱
 ۱۲۹۵: ۵۵۲، ۵۵۳
 ۱۲۹۶: ۵۵۴، ۵۵۵
 ۱۲۹۷: ۵۵۶، ۵۵۷
 ۱۲۹۸: ۵۵۸، ۵۵۹
 ۱۲۹۹: ۵۶۰، ۵۶۱
 ۱۳۰۰: ۵۶۲، ۵۶۳
 ۱۳۰۱: ۵۶۴، ۵۶۵
 ۱۳۰۲: ۵۶۶، ۵۶۷
 ۱۳۰۳: ۵۶۸، ۵۶۹
 ۱۳۰۴: ۵۷۰، ۵۷۱
 ۱۳۰۵: ۵۷۲، ۵۷۳
 ۱۳۰۶: ۵۷۴، ۵۷۵
 ۱۳۰۷: ۵۷۶، ۵۷۷
 ۱۳۰۸: ۵۷۸، ۵۷۹
 ۱۳۰۹: ۵۸۰، ۵۸۱
 ۱۳۱۰: ۵۸۲، ۵۸۳
 ۱۳۱۱: ۵۸۴، ۵۸۵
 ۱۳۱۲: ۵۸۶، ۵۸۷
 ۱۳۱۳: ۵۸۸، ۵۸۹
 ۱۳۱۴: ۵۹۰، ۵۹۱
 ۱۳۱۵: ۵۹۲، ۵۹۳
 ۱۳۱۶: ۵۹۴، ۵۹۵
 ۱۳۱۷: ۵۹۶، ۵۹۷
 ۱۳۱۸: ۵۹۸، ۵۹۹
 ۱۳۱۹: ۶۰۰، ۶۰۱
 ۱۳۲۰: ۶۰۲، ۶۰۳
 ۱۳۲۱: ۶۰۴، ۶۰۵
 ۱۳۲۲: ۶۰۶، ۶۰۷
 ۱۳۲۳: ۶۰۸، ۶۰۹
 ۱۳۲۴: ۶۱۰، ۶۱۱
 ۱۳۲۵: ۶۱۲، ۶۱۳
 ۱۳۲۶: ۶۱۴، ۶۱۵
 ۱۳۲۷: ۶۱۶، ۶۱۷
 ۱۳۲۸: ۶۱۸، ۶۱۹
 ۱۳۲۹: ۶۲۰، ۶۲۱
 ۱۳۳۰: ۶۲۲، ۶۲۳
 ۱۳۳۱: ۶۲۴، ۶۲۵
 ۱۳۳۲: ۶۲۶، ۶۲۷
 ۱۳۳۳: ۶۲۸، ۶۲۹
 ۱۳۳۴: ۶۳۰، ۶۳۱
 ۱۳۳۵: ۶۳۲، ۶۳۳
 ۱۳۳۶: ۶۳۴، ۶۳۵
 ۱۳۳۷: ۶۳۶، ۶۳۷
 ۱۳۳۸: ۶۳۸، ۶۳۹
 ۱۳۳۹: ۶۴۰، ۶۴۱
 ۱۳۴۰: ۶۴۲، ۶۴۳
 ۱۳۴۱: ۶۴۴، ۶۴۵
 ۱۳۴۲: ۶۴۶، ۶۴۷
 ۱۳۴۳: ۶۴۸، ۶۴۹
 ۱۳۴۴: ۶۵۰، ۶۵۱
 ۱

[illegible]



اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ واوی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ واوی کے اشراف کے بعد بڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے گھر بلے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ واوی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اتر سے ایک خواب دیکھتی ہے۔ واوی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ واوی اسے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔ شفیقہ حیات اپنی بہو عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔ شوہر عاشق بن کر ہو کر رہے ہیں۔ ایقان کو عاشق کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ایقان میکے آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بھانجیوں کے ساتھ بیٹھی تھی تب ہی وہاں اختر میاں آگئے۔ اختر ارج فرودس بیگم کے بھائی تھے اور ایقان کو بہت چاہتے تھے لیکن آٹھویں پاس بے روزگار نوجوان کو لڑکی دیتا نہیں۔ ایقان کی بھتیجی ہے اور رائمہ اس کی بھانجی ہے۔ ایقان اپنے بھانجوں، بھتیجیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔ اختر وہاں آجاتے ہیں اور اس کو فضول اشعار سناتے ہیں۔

شراب سے بہت فضول باتیں کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ تم ان فضول باتوں کے لیے ہی بھرتے ہو۔
 عالم چلو کہو کہ کیا بات کرتے ہیں، "نہ کیا نادر ہے؟"
 "اُس نے کچھ بھروسہ کیا ہے۔"
 اُس بابہ اور چاروں بعد کیا باتیں ہوئی؟
 (بڑھاپے والے کی)۔
 دوسرے نہیں جان سکتے تھے۔ ہمارا مارغ تو میری جدائی میں بہت گھڑو ڈھکیا ہے۔ میں سڑو پہنچ کر ٹھیک کرنا
 "وہ خوشی سے بولا تھا۔ ایتھان کا اور کاساس اور" مجھے کاساس نے بچہ مر گیا۔ کچھ دن کے لیے اس سے کچھ بولا
 "کا۔"
 "تو یہ باتیں کیوں سو گئے گی؟"
 "شراب کا شرب کچھ کچھ ہے، ہوشیاری نہ رہے ہو۔"
 "ہمارے میں۔" افسانہ میں کتنی خوشی معلوم کر رہی ہوں، کیسے کہوں۔"
 "نہ ہی کوئی تو کیا ہے۔" وہ بچہ سا ہو گیا۔ "ہماری سائیں گہری ہیں، ہمارے آنکھیں کہیں کی اور میں
 عیوں سے جھلکتی ساری خوشی اپنے اندر اٹا رہی گا۔ میرے خون کا انتظار کیا نہیں تھیں، لانا کفر
 "ہم ہمارے کا ٹھیکہ۔"
 "وہ کیا ہے؟" کہیں۔
 "میرے ہیں چاروں بچے۔" وہ بچہ شرمناک تھا۔ "خدا حافظ۔"
 "اُس نے کہا کہ اُس نے بچے سے ملے تھے۔"
 "میری جانب سے رابطہ متقطع ہو گیا۔"
 "ان دنوں ہمارے میں لیے کھڑی رہیں۔ وہ بچے کی خواب کے عالم میں تھی، خوش کن، سرور سے بھرا خواب
 کرتے کرتے اپنے خواب کو ختم کرنے کا خلاصہ مول لیتا نہ جانتی تھی، وہ تو ہمیں بن کر اس حکم میں سے خسرو
 کھڑی سکران رہی۔ یہاں تک کہ ایمان کے رویے کی آواز سننے لگی۔ ایتھان نے جو تک کر یہ بیور رکھا اور
 میں باہر نکل کر بھاگ گیا۔ ایمان کو ناندو میں بھر کر اس نے چٹاٹ اس کے کئی بونے لگا دیے۔
 یہی کرتی کے لگا کر اس کے "میری شہزادی کے بابا" میں نے میری لادلی اپنے آپ کو بچے کی ان سے باتیں
 کی کہ ان سے لاد کر کے کیسے میری کرنا ہے۔"
 "میری بڑا کر کے وہ کسی سوچ میں گھری نادر کھڑی رہی، دادی کے بونے میں کل دو سو روپے باقی تھے۔ اسے
 کہہ نہ تھا کہ اس رقم کے علاوہ کسی داوی اپنے پیسے نہیں اور چھوڑ کر گئی تھی۔ کیا نہیں۔ داوی کی چیزیں اب تک
 یہ کہہ براسی حالت میں رہی تھیں جیسے کہ وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھیں۔
 چھوڑے اب تک ان کی کسی شے کو نہ چھوڑا تھا۔ ان کا کوئی کام چھوڑنا صندق جو کر کے ایک کونے میں رکھا
 کی ضروری سامان اس میں رکھا ہوا تھا۔
 صندق میں بڑے تالے کی چابی داوی اپنے آزار خود میں لپٹا کر رکھا کرتی تھیں۔ وہ
 یہ دیکھنے کے موقع پر جانچنے کہاں رہی تھی۔ اسے اب یاد نہ آتا تھا۔ لادلی میں کی داوی کا

(39)

[illegible]

[illegible][illegible]

[illegible][illegible]

[illegible]

د By Harfe...
for One
du.c

شہلا نے فرمایا تو کہو خدے قریب کر لیا اور اس کی پیشانی پر تھامی۔
”کیا ہے میرا بیٹا!“
”خفک ہوں۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو چھاؤت؟“ ”جو کرا، مگر اسلام لا۔“
”خدا تعالیٰ کے شہلا بل کر لو۔“ ”یہی خواہشات کوئیں کی تھنے؟“
”پھر آپ کہہ دو کہ میں کی نامیرے پاس ڈاکٹر کو تیار کیا ہی نہ تھا ہے۔“ شہلا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔
”کیا بات بتاؤں بیٹا آپ کوئیں!“
”جائیں۔“
”ایک دکان کے گھر والوں کو بہت اذیت کر رہا تھا وہ دوسرے لوگوں کی خاطر اپنے گھر سے کاوت بھی لا کرے لوگوں کو رہنا پڑا ہے جب یہ گاڑی چلتی ہے تو درخت ایک بے چارہ ڈاکٹر کہاں کہاں گئے کہن کو پورا رہے۔“
”اس لئے گھر کا کام کر میں کسی اور کو روٹی ہوں تو اس کا دکھ منھے بھی ہو جائے لیکن دوسرے لوگوں کے وقت کرتا سختی ثابت ہوتا ہے۔“ آپ کو بات کا احساس ہونا چاہئے اور پھر صبح آپ کو ایسا تو نہیں سمجھ رتی تا۔
”بی بی بانو ہیں یں خانہ جاتی ہوں ہیں لیکن کبھی کبھی عمارتوں میں بھی آجاتے ہیں۔“
”تم میرے ساتھ نہیں ہونے ثابت نہیں کے تم نہیں رہا ہوتے ہیں ہمارے گھر میں تو چھائی نہیں ہیں۔“
”جس طرح جاتی ہیں شہلا کے گھر کے کارنگ بدل گیا اس نے اس کی شکل سے عمر خود سے علیحدہ کیا تھا۔
”میں سچا کر کے آنی ہوں پھر مجھے مل کر کھانا کھا میں گے۔“
منہ و دیکھ کر می ساں بھر کر لگتی ہوں لیکن میں ان فیصد سے عمر کے سر چہتا کا کراس کی ناک نہ لگتی تھی۔

om Scanned By H...
Dua for C

خال داغ
جو دال پاکی
اس آنت سے اس کی
خوبوں کو مارنے کی
روا مشیل کی لینڈ ڈانکا ٹیکل پر اندیشہ کے سہارا پر کار کا تھا۔
فرودس یکم تھا کہ کہیں سے آمد ہوگی۔ ”علی احمد چراواہ۔“
”کہہ جو رکھی ہوں ایک بارے کھانا۔“
”تب تک سنتی ہے میرا کانٹا۔“
”اللہ! ہمیں سننے سے قاضی بنانا اور تجھ میں قضاوی کا فخر تیرے لیے ملی۔ علی کی منی نکلی گی۔
”میں سچ کر کہوں گی کہ تم میرا دلکش انسان۔“
”کیس اور جاننا ہے کہ نفیس زینا کو کھلا اور الود شرمت کھچ کر جتنے انداز دیکھنے لگا۔“ ”خود اس کا بھی بھلا“
”خود اس کا بھی بھلا“ نفیس زینا کو کھلا اور الود شرمت کھچ کر جتنے انداز دیکھنے لگا۔
”خود اس کا بھی بھلا“ نفیس زینا کو کھلا اور الود شرمت کھچ کر جتنے انداز دیکھنے لگا۔

rd.com Scanned B...
Du

(46)

تو کیا میں غلام؟ اور اس کا جواب بھی "فرادی جان تو کہیں اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھیں مجھے تو اب ہوش آیا۔ دنیا میں انسان کے اسے رستے نہ پاتے ہوئے جس میرے ذہن نے تو حالات و واقعات کو خود بخود ہی پراختہ کرنا تھا کہ وہی ان کے سوا میرا اس بات میں کوئی شہید نہیں ہے جس میں نے تو مجھ پر انہوں نے کیا کیا؟" "کیونکہ یہ کہانیاں یہ عجیب ایسا کچھ نہ ملتا جو تم انفرادہ کہہ سکتے ہو۔ ان کی بات ان کی بات کو اپنی خط کشی" "کیونکہ یہ کہانیاں یہ عجیب ایسا کچھ نہ ملتا جو تم انفرادہ کہہ سکتے ہو۔ ان کی بات ان کی بات کو اپنی خط کشی"

"میں نے بھی مالوہ دعوت اطالیہ اڑانے کو۔"
 "اللہ۔ آپ سارے مل کے تو ہماری پیش کاروائی کر جائے گا۔ کیا تہذیبی ترقی کے لئے
 "نکل جائے گا؟ نہیں نکلے گا۔" میں نے کہا۔
 "چاہتے ہیں اور سدرہ شمس کی سانس پھرہ لیں۔"
 "جوان تہذیب اٹھ اڑے اور اوروں کو بھی بلا لے۔" شمس کو بھی رکھو، میرا ہوتا ہے بھی مالوہ سب مل کر کھاؤ۔
 "میں نے بھی سب سے کہا۔"
 "جی ہاں! اس نے سر ہلایا اور مجھے ہی سے اٹھ کر چل دی۔"

اس نے اپنی سب کتابیں اور نوٹس وغیرہ نکالے ہوئے تھے اور اپنے بیٹے کو انہیں قلمی سے دیکھ رہی تھی۔ وہاں سب کی درجہ بندی کر کے ترتیب سے رکھنا چاہتی تھی۔ کسی ایک دنوں سے وہ یہ کام کرنے لگا بیٹھ رہی تھی کہ ہر مرتبہ کچھ ہفتی آؤں گے آجائیا کرتی۔ آج اس نے اپنے کام کرنے کا یہی ارادہ کیا تھا۔

یوں بول رہی تھی کہ فارغ ہو چکی تھی کہ فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اڑا رہا تھا کہ کہیں اسے اس کا امتحان اس کے لیے ہو جائے۔

معمولی سی تیاری کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اس کے لیے پورے دن کے ساتھ ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے عمل توجہ کے ساتھ پڑھائی کی ضرورت تھی جو وہ دانی کی اچانک وفات کے بعد سے اب تک نہ کر سکی تھی۔ اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ سوچنے کی بجائے کھلیں مفلوج ہوئی تھیں۔ صواب اور اطمینان اور قلمی سے بیٹے کرنا چاہتی تھی کہ پورا کرنے کا عزم ہے ہوئے تھے۔

دروازہ بجا تو اسے کھٹک توں کہتے ہوئے کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ محلے والے اس کا زمانہ سے زیادہ خیال دیتے تھے کہ چکر میں اس کے آرام اور سکون میں کچھ فرق ہو جائے کرتے

[illegible]

جانتی تھی کہ اب خالہ محمدہ میرے لیے لڑنے والی تھیں۔ وہ تو جانتے جاتے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ کھانا کھا کر لی تھیں۔ کئی مرتبہ ”خدا حافظ“ تھیں اور پھر انہیں کوئی ناخوش خیال چھینر جاتا۔

”اچھا اچھا۔“ دھڑک دھڑک میں تو بوسہ لگا دیا۔ ہمارے علی کمالی نے کہا: ”خدا حافظ! پریشان نہیں ہو، کمالی جی! ہو، بار بار دھیان سہاری طرف جانا ہے۔ میں تو اتنے سکون دے رہی۔ بھلا جاؤ! اچھیں کی خیر سو سکی تو۔“ دھیان تو ہم میں انکار رہتا ہے۔ ”راہبہ! شکر کرو۔“

”کمالی! کمالی! میں خالہ جان! میں نے کتنی مرتبہ پوچھا ہے آپ کو کہ میں بالکل اطمینان سے رہتی ہوں۔“

”کمالی! خوف نہ دور نہ کھانا نہ پینا۔“ آپ کو لوگ میرے اس پاس لے گئے ہیں۔ دروازے دروازے پر بھی

”کمالی! ہوت دروازے کھل کر بند کر کے رہ گئی ہوں۔ یہی آپ کو دروازہ کھانا؟“

۲۔ خوبصورت و مقبول ناول

(*) پیر خواب ریزہ دریا، ماسک 300/- * الامام میلاد عید احمد 180/-
 (*) ایک ڈراما کے لئے، ماسک 300/- * شیر دل کے روزانے کی فروخت 250/-
 چاروں مسائل ایک سنگ تھیں گے پر داک خرچ فلاح
 و خوبصورت بروق، خوبصورت بچپانی، مضبوط پیسلہ، آفٹ پیسر
'شعباع ہوا' کے ٹھنڈی
 جی بی قمر بچی یکسٹال سے حاصل فرمائیں
 سوال نمبر ۱۰۷۸
مکتبہ عمران دا عجیب 57 اردو بازار، کراچی
 2216361 فون

"وادی" امیری کی کسی نہیں؟ ایک قیدی رہے سمجھ دار لڑکی سوال کرتی۔
 "وادی چند محلوں کے لیے بالکل خاموش ہو جائیں گے۔"
 "جہاں تک اچھی نہیں؟ یہاں تک؟" "جہاں تک؟"
 "مربعہ" وادی کی کواڑ میں نشیمن ہوئی۔

یہ سچہ مکمل چپ ہو جاتی۔ چھوڑ دے سوال کراڑی سبیل مٹی۔
 "وادی تپتے ہوئے اب کے اگلے تپتے تپتے؟" کسی رنگ میں اگر پوچھ بیٹھتی۔
 کام کرنا وادی جان کے ہاتھ رک جاتے۔
 "ان کے علاوہ آپ کے کوئی کواڑ نہیں ہوئی؟"

وادی جان کی جانب سے کوئی جواب نہ آتا۔
 ایک ایک لمحے اس پر ہوا کہ وادی جان دوری ہیں۔ ان کے چہرے پر خاموش آنسو رہے ہیں۔
 وہ جلدی سے اٹھ کر ان کے لیے چل جاتی۔

"موسمی بادوں سے نہیں ہو پھول کی؟"
 ایک لمحہ بھی جو بھی نہ ٹوٹی۔ ایک نکل تھا بھی نہ کھلا۔ ایک راز تھا مواب سورا تھا۔ وادی کے ساتھ ان کی

قربیں۔
 رہیہ خط کو پینے سے لگا کر انہیں ہونڈ کر لٹ گئی۔ فی الحال وہ احمد جہاں نسیب کے چند محلوں کے لیے بیٹھی اٹھنے

ایک احساس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔
 "نہ سچے ناشر تھا۔ ان کے چاروں سوں کرتے تھیں تو ان سے اپنی زبان کو روکنا نہیں ہوتا تھا۔ جو آپ

بھول گئے تھے۔ تو آپ کی سکرانٹیک بھی چھلکی لگ رہی ہے۔" "مگر وہ رہا تھا۔
 "خارجینے تپتے ہوئے ساراں کاؤڈ کا تھا اور سارا سبب بھی اپنی کو شہر نہ گھولے۔
 "ڈانٹے کو گھولنا تو نہیں۔ ترس ضرور کیا ہوں۔" اس کے لئے بھی شہر تھی۔

ایقان تیزی ہوئی۔ کن اکھیل سے اس نے حاضرین محفل کے کشیدات ٹول کے پھر نظریں بچا کر اسے
 "مگر وہ رہا تھا۔"

اس کی شہر سکرانٹیک شہر تر ہوئی۔
 ایقان ہاتھ میں تھا ہوا نالہ میں بیک لے جانا بھول گئی۔ مگر سیاہ بھٹکتی آنکھوں کے احساس سے جھجکتی
 ہوئی سیاہ موچوں تلے سکرانٹیک کھلی گونب خاموشی میں بھی تپتے تھے۔ جو کئے ہوئے کو لوگ ان پر دبانے کرتے کریم
 جو کہ احساسات کشدوں سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کئے جانے۔
 وہ سب کچھ بھول بھال کر اسے دیکھ گئی۔
 "اول ہوں۔" وہ کھٹکنا لگا۔

ایقان چونک اٹھی۔ چور میں کن کھٹکنا لگتا ہے؟
 وہ سب کچھ ایک سر سے لے کر دوسرے سر تک ہی نہ پڑھا تھا۔
 "خارجینے کواڑوں سے لے کر وہ لوگ سیدھے "حیات ولا" چلے آئے تھے جہاں شفیقہ حیات بیگم نے ان کے

دوائے بڑی اور وادی سبیلوں (سجیاد و ریحہ) کے والد نامی چار کے بزرگ و قیاسے نہیں پروردہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔
 باہر کے معاملات ان کے چہرہ پر گہرے راز خود ہی ہے اور اس کے لئے ایک پوچنی جاتی ہے جس میں کچھ کاغذات، تصویریں
 اور نوکرات وغیرہ جیسے ہیں ایک تصویر میں اسے اپنی شاہت عموں ہوئی ہے۔
 "وادی کے بھائی کی مال میں نہ کم کے ساتھ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اپنے باپ کے باسے میں اکثر سوال کرتا ہے۔"

چوتھی قسط

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خط میری بھینچو کا ہے۔" وہ نے ایک اشارے سے اس پر پر آشکارا ہوئے جا رہا تھا کہ
 نہ جانے کیوں اس کا ٹیبل رور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر پر آشکارا ہوئے جا رہا تھا کہ
 اس کے فانی رشتے موجود ہیں۔

"آپ کا خط ملا اور ایک مرتبہ چہرہ پر حالات کا اندازہ ہوا۔ جواب میں جو واقعات آپ نے تحریر کیے ہیں وہ حالات کی سنگینی کا
 پتہ دیتے ہیں۔ احمد جہاں نسیب سے کہیں کہ دنیا میں ایک شخص اپنی سب سے بڑی حقیقت نہیں۔ جس کا پوراں کا
 قصہ کے کاش میں آپ کے پاس ہوئی تو وہ حالات کو سمجھانے کی کوشش کرتی یہاں تو حال اپنے کے سانس لینے

سے پہلے ہونے میں اسے اجازت لینا پڑی ہے۔ شہر حال آپ کی جانب سے احمد جہاں نسیب کو کوئی چھوٹا مری کا
 دوائے نہ لے کر آئے تھے۔ یہی ہوں اس کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہے، پھر روز میں اتر جائے گی۔ آپ کا طریقہ

رکھے۔
 "نقد اور تھان نامی اہل کو سلام کھنڈا آتے ہیں۔ ترانہ اور ترنا کو بھی آپ کی جانب سے جنت چار دیا تھا۔ ابھی
 بھی کھینکی پھر رہی ہیں۔ سانی نسیب نہ جوت ہے۔
 آپ کی بیٹی

بیٹیس بافو۔
 "مگر وہ رہا تھا۔"

"مگر وہ رہا تھا۔" وہ نے ایک اشارے سے اس پر پر آشکارا ہوئے جا رہا تھا کہ
 اس خط میں اس کی سمجھ میں آئے کہ وادی کی بات نہ تھی۔ پھر وہیں ہی خط رہتا ہے۔ یہ حد اچھا تھا اس میں احمد
 جہاں نسیب کا ذکر تھا۔ اس خط میں احمد جہاں نسیب کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ خط پڑھنے سے وہ احساس چند محلوں

کے لیے ہی اٹھا تھا۔ چند محلوں کے لیے تھے۔ احمد جہاں نسیب کی اٹھا تھا۔
 "مگر وہ رہا تھا۔" وہ نے ایک اشارے سے اس پر پر آشکارا ہوئے جا رہا تھا کہ
 نام کے آگے کیا نام لکھا جاتا ہے اسے جس انتہائی غم تھا کہ اس کے باپ کا نام احمد جہاں نسیب تھا۔

"وادی" امیر سے آئی ان کو کہاں آج؟" ایک مٹی کی سوال کرتی۔
 "مگر وہ رہا تھا۔" وہ نے ایک اشارے سے اس پر پر آشکارا ہوئے جا رہا تھا کہ
 "وادی" امیر سے آئی ان کو کہاں آج؟" ایک مٹی کی سوال کرتی۔

"وادی" امیر سے آئی ان کو کہاں آج؟" ایک مٹی کی سوال کرتی۔
 "وادی" امیر سے آئی ان کو کہاں آج؟" ایک مٹی کی سوال کرتی۔

”اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارا کون ہوں؟“ وہ اس کے قریب ہوا۔

وہ ہنستے ہوئے قدرے دور ہوئی۔

”میرے ہر جانی ہو؟“

”اچھا چلو پھر۔“ تمہیں اپنی آفاقہ کا یقین دلاتے ہیں۔ ”وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“ میں بھی معلومات برداشت سے نکلے

جاتے ہیں۔“ ”اچھا، یہ سن لیں۔“ وہ اس کے جارحانہ عزائم کی ٹھٹھکیا کر چپکے سے دروازہ کے سمت ہوئی۔

”کیونکہ آج تمہاری تصویر نہیں، تم رو رہو ہو۔“ وہ مزے سے مڑا۔

اپنے پیچھے خالی کردہ دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

”وہ بڑبڑایا۔“

بچوں کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھی اس نے بیرونی دروازہ لاک کیا۔ لیکن

لاٹ آف کی۔ لاؤنج کی ٹیبل لائٹیں آف کر کے زیرِ پاؤں کے بلب روشن کیے پھر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔

”واؤ۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہی رہ گیا۔ استقبالیہ کابینہ انداز اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا۔

پورا اکبرہ سرخ گلابوں سے سجایا ہوا تھا۔ کمرے کا سابقہ نقشہ قطعاً تبدیل شدہ تھا۔ کمرہ اسکیم سے لے کر فرنیچر

کے ڈیزائن اور سیٹنگ تک ہر شے بدل گئی تھی۔

لاٹ گریس اور ڈیل گولڈن کا حسین اشتراک ہر شے میں نمایاں تھا۔ اس پر سرخ گلابوں کی معنی خیز جڑواں کمرے

بھی دل دھڑکاتی تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا معطر فضاؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈیرنگ ٹیبل

تک آ کر وہاں دھنک کارڈز سجے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کارڈ اٹھایا دیکھا تھا۔

”کیا؟“ وہ کہیں بھی نہیں دیکھا۔ ”لوٹا تو مرے پاس آیا۔“

”ہاں؟“ وہ کہیں بھی نہیں دیکھا۔ ”لوٹا تو مرے پاس آیا۔“

عاشق کے لبوں پر ہنسی بھیل گئی۔

اچانک ہی دوبارہ نہایت نرمی سے اس کے گلے سے آ لپٹے تھے۔ اس کی پشت پر کد آؤ وجود کا احساس ممکن تھا۔

”اچھا، چاہئے اس کی کلائی تھامی اور نرمی سے پہنچ کر اسے اپنے مقابل کر لیا۔“

شرعی آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے لبوں پر حسین مسکائی۔ ”یہ وہ ہے؟“ وہ اسے شب اول کی مانند نوخیز اور حسین

نظر آئی۔ روزینک ناکی میں اس کا ہر مرس وجود غضب ناک حد تک حسین اور خطرناک لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس

کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر کوئی شریر خیال اس کے لبوں پر مسکان بن کر بکھرا۔

”ایک ہی رہ گئی۔“ وہ سر ہلا کر تاسف سے بولا۔ ”بائیں پیچھے اوھو رہی ہے۔“

”آں۔“ اقبال جیسے خواب سے چوکی تھی۔ ”کی؟ کیا؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔ ”نجانے اسے کس چیز کی کمی

محسوس ہوئی تھی۔“

”ہاں؟“ وہ کہیں بھی نہیں دیکھا۔ ”لوٹا تو مرے پاس آیا۔“

”اچھا، یہ سن لیں۔“ وہ اس کے جارحانہ عزائم کی ٹھٹھکیا کر چپکے سے دروازہ کے سمت ہوئی۔

[illegible]

Urdu

س کی کاغذی دنیا جانی جانب سے تو اس نے کوئی میٹہ چھوڑی تھی۔

”سب کو بوجھ بن گیا۔“ اس نے پھر اسے چھوڑا۔

”مجھے سہی سہی۔“ اس نے بول کر اسے چھوڑ کر اپنی جگہ کا اظہار کیا۔ کتے اس کو اس کے خود کو سر کیا سنوار کر اس کے قریب آئی۔ اس کی ہمت کا رتی برابر اظہار کیے لیا تھے۔ یہیں ہو گیا تھا۔

ایقان نے خفا خفا نظروں سے اسے دیکھا۔

”اے بھائی۔“ اور تڑو کو کھڑا۔

”میں نہیں بھائی والی۔“ وہ اور چلی۔ وہ کوئی سرکار شے نہیں ہے پکارے کو۔“

”اوہو۔“ بھی سہی سہی دولا۔ ”بھائی“ نہیں ہے برابر اسے جہان بات والا۔ یہ دوسرا ”بھائی“ ہے۔ چلو ”بھائی“ (اچھے) آؤ اب خوش۔“

اسے کسی اچھی شے ہوئے تو اس نے تک چلی آئی۔

”فرمائیے بھائی۔“ اس کے قریب بھی۔

”وہ نہیں لگا ایسے پکارے ہوئے۔“ ماٹھارے کھری لٹکا ہوں ہے اسے دیکھا۔

”یوں۔“ اس نے قریب سے لٹی میں سر ملایا۔ ”پاپہ زنجیر کا یوں پکڑے۔“ چھوڑ دیا۔ ہم تو اس تصور کے تحت سے رہتے ہیں۔“

”یوں تو اس قدر ہے کھری۔“ اس نے سزا لگا کر۔

”جو اپنا کھو نہ کہیں نہیں جانا اور جو چلا جائے تو اپنا نہیں آجوتا۔“ کتے کا حاصل۔ ”ایقان نے اس کی کیا۔

آگھوں میں ٹھانکا۔

”وہ پھر تھماری آنکھیں تو سیاہ ہیں۔“ کتے سرکراتے ہوئے بولی۔ ”کتے ہیں ہر جانور کی آنکھیں براؤں ہوتی ہیں۔“

”تھماری آنکھیں تو براؤں ہیں۔“ نہ بھی سرکرایا۔

”بھائی۔“ کتے ہوں گے۔

”یہی سیاہ بھی ہو سکتی ہیں۔“ اس نے معنوں میں کھرمندی سے کہا پھر دونوں ہی بیٹنے لگے۔

”یہ تو حال ہے بار اس درجے کے لیے نہیں ایک یہی اثرات ملی ہے۔ اتنا خوبصورت کمرہ چلایا ہے اور بائیں کمرہ ہی ہو ہر جانور کی۔“

”جناب۔“ ایقان نے اسے سزا لگا کر۔ ”اس جرم کے وارنٹ آپ کے نام لکھ چکے ہیں۔“

”میں نے تو ایک کی کاڈر کیا تھا۔“ تھمرا نے چکر لائی میں ”کھرم۔“

”بھئی ایک ہی ہے آخر۔“ کھرم۔ ”میں مری بھی نہ سکتی۔“ ایقان نے نہیں ہوتے بھی تعریف نہیں کرتے۔

عورت کی خامیاں ہی دیکھ کر کھرمے ہوئے۔ اچھا بناؤ ڈر کیا کی ہے؟

”ماٹھارے اس کا پانڈو قیام کرانے پر قریب کیا ہے۔“

”وہ تو ان کے زمانے کا سا انجام کیا ہے۔“ وہ کوئی کھلی جوتے لگ رہی ہو اور عوی لباس کی جگہ یہ ناکی بات نہ

”میں یہی کہتی تھی۔“

”اچھی لباس۔“

”ہاں کہاں ہے تھمرا شادی کا ڈرنک۔“ کھرم کیسے کہتا۔

”ہاں۔“

(44)

BY HARF

میت ایک سمندر ہے اس میں ڈوب کر جی اپنی ذات کی گمراہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ موتی لٹے ہیں ہر ساتھ آتے ہیں۔ کتب کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کہاں آگئے ہیں کہاں لکھتے ہیں۔ بار بار غلط محبت کیوں نہیں کرتا؟

راغ نے سنا تو غصہ ہوا جابابہ گئی۔
 "میں کہوں ہوں تو خود جواب دے گی۔"
 "راغ! انتہا محروم شخص ہے تو مجھے احسان ہے۔ بگڑے۔" شام کو تشویش ہوئی۔
 "صبح کالے کالے سنا ہے۔" راغ پر غصہ پڑا تھا۔ "تو نے کالے کو پتہ نہ تھا انسان پر محروم ہی ہیں۔"
 "تو نے اٹھا تو نے۔" باہر نے کھجی کھجی۔ "سیر اندازہ ہے کہ دنیا میں محلوں کو فہم انسان جی محبت کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جانی اٹھا تو نے فہم خود کو بھی دعو کو دے رہے ہوتے ہیں اور ان کے۔" بھی۔

"ہم نے محبت کا کام محروم ہوتے ہیں اور کے؟"
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔

ہوں۔ جن اٹھا تو نے فہم اندازہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اور اصل اپنی ذات کی محبت میں جھٹا ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی طلب کی تسکین چاہیے ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبت سمجھتے ہیں۔ تو جانتا ہے میرے ساتھ یہ معاملہ میں ہے۔ مجھے محبوب کی قرب کی ہوس نہیں ہے۔
 "تو نے شہر سے ہٹا۔" راغ شہر سے ہٹا۔
 "تو نے شہر سے ہٹا۔" راغ شہر سے ہٹا۔

"جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔

"جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔

"جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔

"جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔
 "جس نے محبت کی تو ہی ہے سچائے اپنی بات۔" راغ نے طرے سے دیکھا۔ کوئی راہے لٹے زمین کیا ہیں۔

دو نول چرڈ نے لگے۔ یہ ان دونوں کا معمول تھا۔ صبح سویرے جاگنے کے لیے ساتھ لٹتے تھے پھر ایک گھنٹہ کر کے ایک میں چٹکی ایک سرساز کر کے سات بجے تک گھومتے آتے تھے۔
 باہم حال میں اپنی پرچائی سے فارغ ہوا تھا۔ وہ ایک انجینیئر کی بیٹی سے شکیک ہو گیا تھا۔ لہذا اگر لوٹ کہہ مارا تو کرانے اس چلا جاتا تھا۔

راغ کی اپنی اٹالی چٹیاں تھیں۔ وہ اپنی اٹالی کر رہا تھا۔ پوری کر لیتا تھا۔ مگر کے دوسرے لوگوں کے برعکس وہ دونوں صبح سویرے ضرور اٹھتے تھے۔ خواہ کسی ہی دیر کے سوئے ہوں۔ بارک کا ایک چکر مکمل کر کے وہ اپنی مخصوص جگہ چلے آتے۔ راغ ان کے سرساز کر کے لگا کر وہ خالی پڑ جاتا تھا۔
 "کیا بات ہے اسٹارڈ خیر تو ہے؟" راغ نے اسے پوچھا۔ "کوئے کوئے میرے حشر کا نظر آتے ہیں۔" ہاشم

جس نے کوئی جواب نہ دیا۔
 "تو کھانا چاہ پھر آئے خواب میں۔" وہ ہنسا تھا۔ باہر نے کھانا لے کے دیکھا۔
 "یہ ہمارے خوابوں کے۔" کتب لٹے کہاں سے ہیں بار ایک کھانا ہم بھی خریدیں۔ ایک ایک میں ہی سی۔
 "تو کن راغ؟" وہ پتلا ہوا۔ راغ نے کھانا لے کر اسے دیکھنے کا پھر کارکن کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟"
 "اسی سے بات کی تھی۔"
 "پھر؟"
 "پھر کیا؟" پھر اپنی اتالی کو کیا کہنا چاہتے۔ "وقت چڑھا ہوا تھا۔

"تو نے میرے بار آری۔" راغ نے اس کے کانڈے پر جانا دیکھا۔ "ایک مروتی زندگی کا یہ سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مشکل ترین۔ ایک انجینیئر کی طرف داری کرنے سے محبت اس کے غلی رشتے پر غلبہ ہونے لگ جاتی۔ میں جانتا ہوں کہ خود وہ محلوں میں جانا ہوتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ وہ خود کی تعلیم مصفاہ نہیں ہوتی۔ تو کہہ دل اس سے میں ہوتا ہے تو خود اس کی اپنی لڑکی کا فیور کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا خود میں جیتا تھا۔
 "تو نے میرے کی بات ہے۔" بھی تو ہے کہ وہ لڑکی انجینیئر ہو کر بھی انجینیئر نہیں ہوتی۔ "اس نے اسے دیکھا۔ "تو راغ! وہ مجھے اپنی اتالی ہی کیوں لگتی ہے۔ اس نے تو بھی نظر بھر کر میری جاننا نہ کھا چکے تھیں۔ مجھے تو بات اس کی آنکھوں کا رنگ تک نہیں معلوم ہے۔ پھر مجھے اس سے۔ یار راغ! یہ محبت کیا چیز ہے۔

"تو راغ! اس کے اس درجہ اچھے پر کھڑا ہوا۔
 "محبت؟" یہ بھی ایک مخصوص قسم کی محبت۔ یہ اقرار تھا کہ اس محبت سے تعلق سے ہی ہے ہاشم۔
 "تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی

"تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی
 "تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی
 "تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی

"تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی
 "تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی
 "تو راغ! یہ بھی محبت جی آتی کہ کہو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محلوں میں کیا؟" ہاشم نے اسے عجیب سی

منور میاں کو سب نے عالمِ ہونچکا ہے وہ سخت طیش میں ہیں۔ دن تو دیکھنا ہی تھا کہ میرے ساتھ کچھ براہو اتو
 میری بددعا سے بھی لکھ چین سے نہ جلیے گئے کی بجائے احمد جہاں زب سے امید نہ تھی۔ انسان کو حقیقت
 پسند کرنے کے لیے بہت کچھ تو واسطوں کا ہونا چاہیے۔ اس سے بنا کہ تصور ہو جو کچھ غلط دوس۔ آخر کچھ بھی آگے والوں کو
 فطرت کرنا ہے

خست پشالی کے عالم میں ہوں مگر نہ بے پروا کیجئے

رہے بے رل سے خط کو بار بار پھر کیا ہے جو قضا قضا تھا جو اس نے پڑھا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا
 تھا۔ اچھے جہاں زب سے بلٹیس ہانوں کی آواز آ رہی تھی، اچھے جہاں زب نے آخر کیا کیا تھا، بلٹیس ہانوں سے کہیں
 کوئی خط نہیں، اس کا بار بار اچھے اچھے جائے۔
 اتنے سے شوروں اور آوازوں کا کہ یہ خطوں اس کی پیدائش سے قبل کب لکھے گئے تھے یا شاید اس کے ماں باپ کی شادی

سے بھی قبل دوسرے کسی خط میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔
ایک خط ایسا بھی تھا جس میں پتیس اونٹ لے کر آیا تھا۔ یہی شہر کا پہلا دور شہر کا تھا۔ یہ لے کر آیا جو میری کبھی
دیکھا تھا۔ لے کر آیا اور دیکھنے کا سبب اشتیاق تھا۔ اس نے کئی مرتبہ وادی چان سے لاہور دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔
اس کی فرمائش کے جواب میں کچھ نہ تھیں۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی کا ذکر نہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ میری کبھی
فرمائش کے جواب میں اٹھ اٹھا جاتی تھی۔ یہ پتیس یا تو نامی ان کی ایک بیٹی سے چلا اور شہر میں اس کی مجلس
ایک موقع تھا جو میری سے مل نہ ہوا تھا۔ وادی چان کی وفات سے سوالات سے میری ایک بھاری مجلس ہو گئی
تھی۔ ان کے کاروبار کی جانب مختلف سوالات چکرارے تھے۔ سب سے بڑا سب سے تشدد سوال یہ تھا کہ وادی
جانب سے کسی اسے اس کے گھر پر رہنے کے متعلق کیوں نہ بتایا تھا؟

[illegible]

نہایت ہی دلچسپ اور دلکش ہے۔ اس میں ایک عجیب و غریب اور دلکش کہانی ہے۔ اس میں ایک عجیب و غریب اور دلکش کہانی ہے۔ اس میں ایک عجیب و غریب اور دلکش کہانی ہے۔

[illegible]

"جیتے رہو۔" انہوں نے بیٹے پر شفقت بھری نگاہ کی۔ "توڑھے ماں باپ کو اور کیا چاہیے اولاد سے۔ ذرا سی
 لگاؤت ذرا سی محبت ذرا سا اظہار۔ مشکل گھڑیاں آسان ہو جاتی ہیں۔"
 انہوں نے کڑی پٹائی بھری۔
 "کیسی مشکل اماں!"
 "کوئی مشکل نہیں بیٹا! اللہ کا احسان ہے۔ بس یہ برصہا بذات خود ایک مشکل ہے۔ ساری عمر انسان اپنی
 مشکلات کا سامنا کر کے ان سے جو کبھی لڑ سکتا ہے لیکن جب برصہا آجائے تو اسے آسان بنانے کے لیے وہ کھڑوں
 کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ برصہا ایسی مشکل ہے بیٹا! جسے انسان خود آسان نہیں کر سکتا جب تک
 وہ سرے نہ چاہیں۔"
 "آپ کو کوئی شکایت ہے اماں!" عذرا بیگم نے تیراں کی صورت دیکھی۔
 "جی نہیں رہی ہوں ساری عمر شکایت کیسی۔ میں تو تو کوئی ایک بات کر رہی تھی۔ اللہ کا احسان
 اس نے دے دینے دیے تو بدترین دیں۔ ایک نے دھنکار تو دوسری نے گلے لگا لیا۔ کبھی سوچتی ہوں ایک بیٹا ہو تا اور
 ایک ہی ہو تو میں کہاں جاتی۔"
 "ایسا نہ کہیں اماں! یہ تو نصیبوں کے کھیل ہیں۔ کبھی ایک بیٹے کی ماں بھی صدمہ رہتی ہے تو کبھی گیارہ بیٹوں کی
 ماں بھی! آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔" سلجوق حسن نے خالی پالی بیوی کو تھمتائی۔
 "درست کہتے ہو بیٹا! خدا کا شکر ہے اس نے مقدر میں شکھ ہی شکھ لکھا۔" شفیقہ حیات طہینان سے بولیں۔
 "ہاشم کے لیے لوگیاں دیکھ رہی ہیں بھائی جان! اماں اس لیے فکر مند ہیں۔" عذرا بیگم نے شوہر کو تان کی بے
 سکونی کی اصل وجہ سے آگاہ کیا۔
 "تو اس میں پریشانی کی کیا بات؟" وہ حیران ہوئے۔
 "میں تو یہ کہتی تھی بچے کہہ اپنے گھر بیوی روشنی ہو تو آدمی پر اپنا چراغ نہ لگنے کیوں نکلے۔ ماشاء اللہ ہاشم
 لا دیاں کو دیکھو تو نظرد سے بچاؤ کی دعا یاد آتی ہے۔ میں تو فوراً "پڑھ کر دم کرتی ہوں۔ ایسا اچھا ذہین بچہ! اپنی بچیوں
 میں سے کسی کا مقدر کیوں نہ بنے۔"
 "چھوڑیں اماں۔" سلجوق حسن نے سر ہلایا۔ "ان کا بیٹا ان کی عمر بھر کی نکلانی تمام کیوں اپنی نہیں کھوئی کریں
 جیسے ان کی خوشی ہو۔ خدا ہماری بچیوں کا مقدر بھی جو کائے گا انشاء اللہ۔"
 "بس بیٹا ابو دھی جان ہوں کوئی اور کام تو ہے نہیں شہنشاہی بھی سوچتی رہتی ہوں۔" شفیقہ حیات ہنسنے ہوئے۔
 بولیں۔
 "آپ کے سوچنے سے کیا ہوگا اماں! جو ہونا ہوگا رقم ہو چکا۔" سلجوق حسن بھی ہنس دیا۔ "فکر لا حاصل
 کیا حاصل۔"
 "انہوں نے تائید کی۔" شاید میرا ایمان ہی کمزور ہے۔"
 * * *
 دروازہ نہ رہا تھا اس نے کمر بند کی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔
 "کیفیت طاری کی تار کی بجائے تو کبھی۔" نظرات نے اسے ذہنی طور پر کچھ بیمار کر دیا تھا۔ عمو! اس پر نقاہت کی سی
 "کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
 (50)

دعا کا جو ایک کرہی راز نواسی سے گویا ہو نہیں۔
 "ایک رشتہ بھی لائی ہوں تمہارے لیے۔ میرے جیسے لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ سونگ تو خوشی کے بارے
 چلنے لگے۔ جاؤ گی۔ لیکن وہ لوگ کیا بات ہے۔ پہلے یہ مکان کا کام تو ایک طرف ہو جائے۔"
 راجہ خاموش ہو کر اس کے دماغ میں ناظم کی ایک جگہ رچی تھی۔ خطبے کا اصرار سنائی دے رہا تھا۔
 عرفان شوکت کی سرور چالاک نظر تھی چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس نے ہمارے ہی ہاتھ
 کو خیر خواہ تھا۔
 "بولو بیٹی ایک بار تمہیں تمہیں؟"
 "ہاں، دراصل یہ ہے بولاب۔" "یہ گھر میری بچھو کا ہے۔ ان کے نام سے ہی اس کے گذشتہ
 ہے۔ سوچو یہ سب اور بچھو لاہور میں رہتی ہیں۔"
 "کیونکہ ہوا اور عرفان شوکت کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب
 دیکھا۔
 "بچھو؟" پھر کیونکہ تو بولیں۔ "کیونکہ بچھو؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ تمہاری کوئی بچھو بھی ہیں۔ نہ کبھی
 اتنے سالوں میں تمہاری رادی نے کوئی ذکر کیا۔ ان کی کوئی بی بی ہوئی تو کیا ان کے گھر پر بھی بی بی؟ تمہارا
 شمار کرتی تھی؟"
 راجہ پھر خاموش رہی۔
 "بس اب آپ کو کیا بتاؤں بولاب؟ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ "در اصل یہ ایک بہت برائی چپقلش کا
 نتیجہ ہے۔ جو اسے رادی جان کی لڑائی تھی۔ زمانہ لڑائی۔ دونوں ایک دوسرے کو دھکے دے کر رادادین تھے۔ اسی
 لیے بچھو بھی یہاں نہیں آئیں تھے۔ سب باتیں ان کے خطوط سے پتا چلیں۔ لیکن اب میں نے بچھو کو
 خط لکھا ان کا جواب آیا اور منور پوچھا بہت جلد یہاں پہنچے۔ اس نے شام چوتھہ گھر میں۔ میں آپ کو ان سے
 ملاؤں گی اور یہ سب سناؤں گی۔ آپ کی بچھو بھی ضرور غور کریں گے کیا کتا اپنے آپ کے ایک ساتھ کرے ہاں
 اڑتا ہے۔ بچھو نے لکھا ہے کہ بچھو جان کی بی بی رادادین کی خرد و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ پھر تو بچھو کی بی بی رادادین
 کی بی بی۔
 عرفان شوکت کو گویا ایک
 "چھائی بی، ہم پھر آئیں گے اور بس باتیں نہ کریں۔"
 "میں نے سوچتی ہوئی لگا ہوں سے کیونکہ ہوا کی جانب دیکھا تھا۔"
 "میں نے پوچھا کتنے سال لگا ہوں۔ میں لاکھ۔"
 "میں لاکھ۔" راجہ نے آنکھیں پھیلایں۔ اتنے زمانہ پیے اس بچھو نے؟ گھر کے؟
 "میرے ایک سو تیس گز کا پلاٹ ہے۔" "کیونکہ ہوا سے ساختل میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے راتوں میں
 زمانہ تو اتنا ہی
 "جیسا کہ میں پھر؟" عرفان شوکت نے کیونکہ ہوا سے پوچھا تھا۔
 "ہاں۔" وہ بے نیل سے گھڑی تو گھڑی۔

دعا کا جو ایک کرہی راز نواسی سے گویا ہو نہیں۔
 "ایک رشتہ بھی لائی ہوں تمہارے لیے۔ میرے جیسے لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ سونگ تو خوشی کے بارے
 چلنے لگے۔ جاؤ گی۔ لیکن وہ لوگ کیا بات ہے۔ پہلے یہ مکان کا کام تو ایک طرف ہو جائے۔"
 راجہ خاموش ہو کر اس کے دماغ میں ناظم کی ایک جگہ رچی تھی۔ خطبے کا اصرار سنائی دے رہا تھا۔
 عرفان شوکت کی سرور چالاک نظر تھی چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس نے ہمارے ہی ہاتھ
 کو خیر خواہ تھا۔
 "بولو بیٹی ایک بار تمہیں تمہیں؟"
 "ہاں، دراصل یہ ہے بولاب۔" "یہ گھر میری بچھو کا ہے۔ ان کے نام سے ہی اس کے گذشتہ
 ہے۔ سوچو یہ سب اور بچھو لاہور میں رہتی ہیں۔"
 "کیونکہ ہوا اور عرفان شوکت کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب
 دیکھا۔
 "بچھو؟" پھر کیونکہ تو بولیں۔ "کیونکہ بچھو؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ تمہاری کوئی بچھو بھی ہیں۔ نہ کبھی
 اتنے سالوں میں تمہاری رادی نے کوئی ذکر کیا۔ ان کی کوئی بی بی ہوئی تو کیا ان کے گھر پر بھی بی بی؟ تمہارا
 شمار کرتی تھی؟"
 راجہ پھر خاموش رہی۔
 "بس اب آپ کو کیا بتاؤں بولاب؟ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ "در اصل یہ ایک بہت برائی چپقلش کا
 نتیجہ ہے۔ جو اسے رادی جان کی لڑائی تھی۔ زمانہ لڑائی۔ دونوں ایک دوسرے کو دھکے دے کر رادادین تھے۔ اسی
 لیے بچھو بھی یہاں نہیں آئیں تھے۔ سب باتیں ان کے خطوط سے پتا چلیں۔ لیکن اب میں نے بچھو کو
 خط لکھا ان کا جواب آیا اور منور پوچھا بہت جلد یہاں پہنچے۔ اس نے شام چوتھہ گھر میں۔ میں آپ کو ان سے
 ملاؤں گی اور یہ سب سناؤں گی۔ آپ کی بچھو بھی ضرور غور کریں گے کیا کتا اپنے آپ کے ایک ساتھ کرے ہاں
 اڑتا ہے۔ بچھو نے لکھا ہے کہ بچھو جان کی بی بی رادادین کی خرد و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ پھر تو بچھو کی بی بی رادادین
 کی بی بی۔
 عرفان شوکت کو گویا ایک
 "چھائی بی، ہم پھر آئیں گے اور بس باتیں نہ کریں۔"
 "میں نے سوچتی ہوئی لگا ہوں سے کیونکہ ہوا کی جانب دیکھا تھا۔"
 "میں نے پوچھا کتنے سال لگا ہوں۔ میں لاکھ۔"
 "میں لاکھ۔" راجہ نے آنکھیں پھیلایں۔ اتنے زمانہ پیے اس بچھو نے؟ گھر کے؟
 "میرے ایک سو تیس گز کا پلاٹ ہے۔" "کیونکہ ہوا سے ساختل میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے راتوں میں
 زمانہ تو اتنا ہی
 "جیسا کہ میں پھر؟" عرفان شوکت نے کیونکہ ہوا سے پوچھا تھا۔
 "ہاں۔" وہ بے نیل سے گھڑی تو گھڑی۔

”اس سیکنے کو خناس نے دیوانہ کر دیا؟ آلا حولیٰ ولا قوۃ الا باللہ! ارے یہ نہ سوچا، بے مال باپ کی بیٹی بے چہت کی بھی ہو گئی تو کہاں جائے گی؟ بھلا بتاؤ تمہارے ذہن میں اگر ایسی چالاکی کی بات نہ آتی تو وہ مواتو تمہیں منگ لے ہی لیتا۔ سار سال ٹنگنے کے گھر کی قیمت چار لاکھ لگی تھی لیکن وہ نہ مانی اس کا تو مکان بھی خراب حالت میں تھا۔ تمہارا تو اللہ رکھے ایسی اچھی حالت میں ہے کہ پانچ میں چلا جائے، لیکن میرے منہ میں خاک کیوں جائے بھلا بتاؤ۔“

ربیعہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن عجب بھول بھیلوں میں الجھا ہوا تھا جی

”دیکھیں تو کہتی ہوں بیٹی۔ جھوٹ کوچ کر دو۔“ نفیسہ خالہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”اگر تمہارا دود پرچے کا کوئی رشتہ دار ہے تو خط لکھ کر اسے بلواؤ ان کینٹون کو کچھ نوکان ہوں گے کہ بیٹی تنہا

نہیں۔ یہ تو سمجھ رہی ہیں جیسے لوٹ کا پالان ہے۔ بھلا بتاؤ۔“

ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”دیکھو کچھ کچھ ملا تو ہے ایک خط میں۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں اس پتے پر خط بھیج کر دیکھوں کیا جواب آتا ہے۔“

”تک ان مووں کو یونہی الجھا ہے پر کھوسے ناس بیٹوں کو۔“ پھر انہوں نے بے یاسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ایک بات کہوں بیٹی! برا تو نہیں مانو گی؟“

ربیعہ نے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”نہیں خالہ! رمانے والی بات اول تو ہو گی نہیں اگر ہوئی بھی تو میں ہرگز برا نہیں ہاںوں گی۔“

”تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ خالہ کے دل میں کوئی لالچ ہے۔ جھوٹا منہ بڑی بات والا حساب ہے میرا بیٹا کسی طور تمہارے لائق تو نہیں پھر بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے کہتی ہوں۔ اگر تمہاری مفتی بدر سے ہو جائے تو۔۔۔“

”وڈرے ڈرے تو بولی نہیں۔ پھر انہوں نے ربیعہ کا تیزی سے سفید پڑا چہرہ دیکھا۔

”نہ نہ بیٹی! کوئی زور زبردستی کا سودا نہیں۔ تمہاری اپنی خوشی ہے۔“

”اچھا چھوڑو بیٹی رے دو میں بھی دیوانی ہوں! بھلا بتاؤ۔“ وہ اس کی حالت سے شرمندہ تھیں۔

”نہ جانتے کہیں رکھ دے بہ درازیں الٹ پلٹ کر دیکھ چکی ہوں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینک۔ ایک میری یہ شختہ کمرے میں بھی کتنی بختی کی ماری ہوئی۔ چیزیں رکھ کر بالکل بھول جاتی ہوں۔“

عربہ نے بے فکری سے لی۔ وی دیکھتے ہوئے ایک نگاہ بڑبڑ کرتی ماں پر ڈالی پھر دوبارہ لی۔ وی کی جانب متوجہ

”ان کو دیکھ لو اللہ کا نور۔ ارے میں کہتی ہوں تمہارے داغ اگر یہی رہے تو سسرال جا کر کیا غضب ڈھاؤ گی ان غریبوں پر منہ بھر بھرتے تو سیں گے کہ ماں نے یہی تربیت کی ہے۔“

اس کی بے پروائی دیکھ کر انہیں جلال کی آغیاں آئیں۔

”یہ بھیرے اب مجھ غریب کی شامت آئی۔“ وہ چرخی۔ ”چیزیں آپ رکھ رکھ بھولیں سسرال میں طعنہ مجھے لے لوئی تک بتی ہے آئی!“

”ارے ماں سے دو لفظ نکال سکے تو کہہ سکتی ہو۔ پوچھ تو سکتی ہو کہ کیا کہو گیا۔ کتنے لیے گھنٹہ بھر سے ریشماں

ہو رہی ہوں۔ سناؤ دیکھو! آنا تو علیحدہ بات ہے کہ تم نے کچھ زبان تو ہلا سکتی ہو۔ پھر کے بت کی سی بے پروائی کی ہے۔“

ارے ایک ننگے ان لی۔ وی والوں کو۔ لڑکیوں کو بالکل ہی سکما کر چھوڑا ہے۔ بس فیشن کی باتیں کرنا وہ یہ ”ان“

رہے ہیں تو کہتے ہیں کہ انہی ہوں سسرال میں جا کر خبر ہوگی ”ان“ ہوا ”اونٹ“ ہوگا۔“

Scanned with HarfeDuo

[illegible]

اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔
 کتاؤں میں کسی بھی خوبصورت تھے۔
 بہت سے ان کے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
 پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
 آواز کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے۔
 جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے۔
 شہلانے سر کرکسی کی پشت سے ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ریکارڈ اسے بھی بے حد پسند تھا۔ لیکن ہمیشہ اسے
 رلا دیتا تھا۔ نہ جانے انہی کو یہ ریکارڈ کیوں پسند تھا۔
 انہیں باتیں بہت پسند تھیں کہ ہم کو تکیوں کے، جھنوں کے دیکھ کر دیکھ کر
 ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی قتلہاں آواز دیتی ہیں
 گئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ گھر کی سے بلاتی ہے۔
 ہمیں باتیں بہت پسند تھیں۔
 ہمیں باتیں بہت پسند تھیں۔
 آنسو خاموشی سے اس کی آنکھ کے گوشوں سے بہہ رہے تھے۔
 کسی نے نرمی سے اس کے چہرہ صاف کیا تو وہ چونک اٹھی۔
 ”شہلا! شہلا! یہی! اچھا! دل یوں مت جلایا کرو۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے!“ منہزہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔
 وہ اداسی سے مسکرا دی۔
 ”اگر آپ کو بھی نہ ہوں امیرا دل نہیں جلتا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ یہ تو بس یونہی کہہ رہی ہوں۔ شہلا نے اسے گھور کر
 ”باساں عقل کا دل کو تھپا چھوڑ دیا کرتا ہے۔ ہے نا آئی!“ انہی کو بھی وہاں چلی آئی تھی۔ شہلانے اسے گھور کر
 ”تمہیں بھی کوئی اچھا دل کو ہلا دینا والا ریکارڈ نہیں ملتا۔“
 ”جو ریکارڈوں سے دل کو ہلاتے ہیں وہ خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کیا خود کو دھوکا دے رہی ہیں؟“
 ”جو کہتے ہیں منہزہ بیگم نے اسے جھڑپا دی۔ ”سوچو! تمہیں کوئی نہیں بولتیں۔“
 ”میں تو خوب سوچ، سمجھ کر بولتی ہوں امی!“ اس نے ماں کے گلے میں باہن ڈال دیں۔ ”بعض امراض کا علاج
 نشتر ہی ہوا کرتے ہیں۔ آخر کو میں بھی میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔ یہ اگر ڈاکٹر ہیں تو کیا ہوا بدھ کیا کہا ہے شاعر
 ”اچھا صاحب نے بربادی دل جبر نہیں فیض کسی کا۔“
 ”یہ تو کوئی انہیں مانے گی۔“ منہزہ بیگم عاجز ہو گئیں۔ ”میں چاہئے لے کر آتی ہوں۔“ ان کے جانے کے بعد
 انہی نے منہزہ بیگم سے کہا۔
 ”آئی! آئی! منہزہ بیگم نے منہزہ بیگم سے کہا۔
 ”آئی! آئی! منہزہ بیگم نے منہزہ بیگم سے کہا۔
 ”آئی! آئی! منہزہ بیگم نے منہزہ بیگم سے کہا۔

”جناب کی دوست کی بیوی سن لیا تو انہیں بچہ دی رہی اور ایک ہزار ایک مسئلہ لکھ بیٹھے ہیں اور ایک جلدی سے ان کا
 رسالہ لکھ کر پیش کر دیا۔ ”دور کوئی آگئی۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ ”عشرہ بھائی۔“ ”مسائل بلکہ مسائل کا کتابا کہیے۔“ ناخن دھوتے ہیں عین بیست پڑھ گیا ہے۔
 ”رات پہلے ہیں بابل سفید ہیں۔“ ”یہ لکھ لکھ کر اپنے اور بچل کر میں دستیاب میں ہے۔“

”بتاؤ کیا اس کا کیا ہے؟“ ”میں تو کتا ہوں۔“ ”میں نے تم کو کتا نہیں سمجھا۔“ ”شادی پھر بھی ہو رہی ہے۔“ ”کلی حرج ہے ہوا۔“
 ”اس کا تعلق ہے اسے گھوڑا۔“ ”تم نے کتنے وقت کی مانند بغیر تائے کیے نابل ہوئے؟“ ”مطلوبہ نہیں یہاں
 ”خواتین کے کچھ خاص مسائل دوسرے کیے جارہے ہیں۔“ ”تیماری انہی قطعاً منظور ہے۔“

”اس کے سین کوں ہمارے“ ”عمر لیا۔“ ”سنے آیا تھا۔“ ”وہ چکر لگا۔“ ”یہ تو عرشہ علی کو امی جان کا خاص پیغام
 دے گا۔“ ”تاج میں اسوں نے کئے کر کے کے سینگ قرار دیا ہے۔“
 ”اور تاج میں سینگ کا قرار دیا ہو گا۔“ ”مانگیہ نہیں ہے ہوا۔“

”یہ نہیں۔“ ”مہر نہ چلا۔“ ”میری اماند ہو میں تو ان کے جیسے ارشادات تمہارے گوش گزار کرنا کہہ
 علم ہو گا کہ سن سن کر کوئی کچھ قرار دیتی ہیں۔“

”غائب اور سرد کے چوں کے تمام زمانہ یہ بڑے جبکہ دور نہ بنے گی۔“
 ”کیوں ایک کٹی گئی جب؟“ ”وہ کرسی کیلئے کر بیٹھ گیا۔“ ”زوج جو خاتمیں کے مسائل کا ذکر ہو رہا تھا انہیں تو میں
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“
 ”میں نے اس کو دیکھا۔“ ”تم لوگ بے جا اپنی توانائیاں صرف کھڑے ہو۔“

ڈھیلے ہوئے تھے۔ صورتحال اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا کہ اس کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔
 ”کیا ہوا یا راز اور ایسا جی نے تو۔۔۔“
 ”اپنی روڈ کے کارنر تھا۔ ایک بچی ہانسنے آگنی بائیک سلف ہو گئی۔“ رافع قریب
 جا کر اس کا زخم دیکھنے لگا۔ اپنی دیر میں باقی افراد بھی چلے آئے۔
 ہاشم بھی سوالات کے ہواؤ کی زد میں آ گیا۔
 رافع نے اس کے ماتھے پر وقفہ وقفہ سے ابھرتے والے خون کی بوندوں کو دیکھا۔ اس کی کھنجر بھی اٹھا ہوا تھا۔
 آتا تھا۔ پینٹ کا پانچو اس نے موڑا ہوا تھا۔ ٹانگ پر بڑی خراشیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر چپکے سے اڑا
 اور کسی کی نگاہ میں آنے سے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 ”دادی جان! میں ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ ہاشم، شفیقہ حیات کے نظرات کے اظہار کے جواب میں
 ”ارے! بچے! اتنا پیٹ گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں ہوا! میں کہتی ہوں اسپتال جاؤ۔ کوئی نیک
 لگواؤ۔“ ماتھے کی مرہم پی کر آؤ۔ ان چوٹیوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔“ ہاشم نے لگا لگا کر
 ”ناری وادی! ایوں فکر کرتی ہیں۔“ فردوس بیگم بھی خفگی سے بولیں۔ ”دو دن کہنی دیکھو اپنی۔ کیسی سوچن ہو رہی ہے۔ راز
 تم اسے لے کر جاؤ۔“
 وہ مڑیں پھر حیران رہ گئیں۔
 ”وہاں میں یہ کہاں رفو چکر ہو گیا۔“ نہیں سخت تپا آیا۔ ”تو لگے بھی رہا ہے بچے کی حالت پھر بھی بنا پونٹھے چلے
 کھسک لیا۔ دیکھو آج کل کے لڑکوں کا اجاس زہم دار کی۔“
 ”صبر کرو سو! اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ کسی کام سے ہی گیا ہو گا۔“ شفیقہ حیات نے انہیں تسلی دے کر ٹھنڈا
 عذرا راجیم نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے جذبات قابو میں کیے۔
 اسی لمحے لاؤنج گاؤ دروازہ کھول کر رافع اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ سبھی اس کا
 جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کے پیچھے شہلا حسن علی تھیں۔ اس نے وہاٹ اور آل پشٹا ہوا تھا۔ گلے میں اسٹیکٹر
 تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی ڈیوٹی کے لیے لوٹی۔
 ”السلام علیکم۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سب کو سلام کیا۔
 یہ گھر اور اس گھر کے سکین اس کے لیے کبھی بھی اجنبی نہ رہے تھے۔ رچیپن جسے وہ یہاں آتی جاتی رہی تھی
 ایتان سے اس کی دانٹ کانے کی دوستی رہی تھی۔
 سب ہی نے اس کے سلام کا پرچوش و پر خلوص جواب دیا تھا۔ سوائے فردوس بیگم کے۔ جن کے ہاتھ پر
 شار سلوٹین پڑ گئی تھیں۔ آنکھوں میں محسوس کیے جانے والا تنفر چھلک آیا تھا۔ مارے غصے کے ان کا سانس
 پھولنے لگا۔
 ”کیا ہو گیا آپ کو؟ شہلا ہاشم سے پوچھنے لگی۔
 ”میں صوف انداز میں وہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس بھی کھولنے لگی۔
 ہاشم خواب کے لیے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شہلا کی جانب بھڑکائی اس وقت دیکھا تھا جب وہ دروازہ کھلا
 (48)

شام کرتے ہیں کہ کئی اگر اپنی حرکت سے جائے اور میں پوچھ جائے کہ "میں نے فرست لیا میں اٹھنا چاہا۔
 رات میں آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پاس قلم لیا۔
 "میں آپ کو کھینک چھوڑا گیا ہوں۔"
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

اس کے چہرے میں کچھ ہوئے ہار سنگھار کے لئے اور نہ بھائے ہوئے پھول اٹھے کہ اس لئے دوست ہیں میں
 ڈالے اور اپنی چاکری کر لاری میں لگے ہوئے پھولوں کو اپنی ہاتھ سے
 کئی دن کی تیاری تھے لیکن رات کو خود کو بہت فریٹ اور توانا محسوس کرتا تھا جس کی وجہ سے
 نہ سنا۔ وہ سوتے سے جب لطف محسوس کرتا تھا۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

باہر عرفان شریعت کے تقابہ وارے مخصوص طے میں تھا۔ سفید کلف کا سوت اور گلے میں سرخ دھال سیاہ
 بال نہایت سلیقے سے چھائے ہوئے تھے اور انہوں میں وہی چمک تھی جو کسی خوشنواؤں کے چہرے پر کی آنکھوں میں
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

عزیزان شریعت کا شاید اس قدر آسانی کی ضرورت تھی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

اس کے چہرے میں کچھ ہوئے ہار سنگھار کے لئے اور نہ بھائے ہوئے پھول اٹھے کہ اس لئے دوست ہیں میں
 ڈالے اور اپنی چاکری کر لاری میں لگے ہوئے پھولوں کو اپنی ہاتھ سے
 کئی دن کی تیاری تھے لیکن رات کو خود کو بہت فریٹ اور توانا محسوس کرتا تھا جس کی وجہ سے
 نہ سنا۔ وہ سوتے سے جب لطف محسوس کرتا تھا۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

باہر عرفان شریعت کے تقابہ وارے مخصوص طے میں تھا۔ سفید کلف کا سوت اور گلے میں سرخ دھال سیاہ
 بال نہایت سلیقے سے چھائے ہوئے تھے اور انہوں میں وہی چمک تھی جو کسی خوشنواؤں کے چہرے پر کی آنکھوں میں
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

عزیزان شریعت کا شاید اس قدر آسانی کی ضرورت تھی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔
 "میں نے رات کو اچھا ہی لکھنا چاہا۔" اللہ حافظ۔

"ہاں! کہ میرے علم میں ہے کہ تمہاری بچھو بھی ایک بچہ نہیں پائی ہے۔"
 راجہ نے اپنے باپ کو ایک عجیب سی اذیت محسوس کی۔ اس کے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے چھرنے لگے۔
 تھے اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر اپنے ہاتھوں پر مڑ کر دیں۔
 "مجھے اس سلسلے میں قدرے غلط کام سامنے ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سورا تھامنے ساتھ ہی ملے
 کر لوں۔ پھر میں تمہاری بچھو اور بچھو سے بات چیت کر لوں گی۔ تم تو اس اس کاغذ پر ایک ساکن کر لیتے ہو،
 اس نے آج ایک ہی عجیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا تھا۔
 "تم کتنے سال کی ہو؟" (آج کا کاغذ اس نے دھیان آیا۔ "تمہارا خاندانی کارڈ تو بن گیا ہے نا؟")
 راجہ چندے سے سوچ رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
 "اوہ۔" عرفان شوکت کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔ پھر حال ہی تو بن جائے گا تو مسئلہ نہیں ہے۔
 زرا اس کاغذ پر خط لکھ کر دیتی ہے۔
 "اس پر لکھا ہے؟" راجہ نے کاغذ ہاتھ سے کی زحمت نہ کی۔
 "ہاں، میں نے تجھے اٹھ لکھا ہے کہ تم اس کے پاس آ کر سورا کر کے پرتاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں کہ باپائی کے معاملات
 تمہارے عزیزوں کے آگے نہ رہی ہوں۔"
 "مگر آپ سے کس نے کہا کہ میں اس گھر کا سورا کر چاہتی ہوں؟" راجہ نے کہا اس نے قدرے تندی سے کہا۔
 "اس گھر سے میری پاری وادی کی باپائی وادی ہیں۔ اس کے چچے جی جی پران کے دوستوں کے نشان ہیں۔ اس کے
 دوستوں پر ان کے نقش ابھرے ہیں۔ مجھ سے بات کرتے ہیں۔ ادھر۔ آپ مجھے میری وادی کی کیا دل کے خوش
 ایک معمولی رقم کی پیشکش کر رہے ہیں۔ اس امید پر کہ میں یہ پیشکش قبول بھی کر لوں گی؟"
 "ارے۔" راجہ نے اس قدر غصہ کیا۔ "عرفان شوکت ہر حال میں طور پر مظلوم ہو کر کچھ کر چکے ہیں۔" (تم ہی گناہ دار
 بنا رہے ہو۔ ادھر۔)
 راجہ نے ہلکتے ہوئے دل کے ساتھ بھی رہی۔ اس پر عرفان شوکت کی ہنسی کا کچھ اثر نہ ہوا تھا پھر ایک لذت سی
 خاموشی ہو۔
 "وہ کچھ ہی تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کاغذ پر خاموشی سے دستخط کر دے۔ پھر تم ہی زبان بولنا آتی ہے
 اور تمہارے میں سب سے نرم زبان میں بات کرنا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں اسی لوگوں کی ضرورت ہے۔ اکثر
 ضرورت اور میں اپنی ضرورتوں پر مجھوتہ کر دینا والا آدمی نہیں ہوں۔ پھر تو میں ہر حال میں لے آتی ہوں کہ گات
 تمہاری بھلائی کی ہے اور میں ہی انیال تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں کچھ نہیں میں خوش خور ہوئی ہیں
 اس نے یہ خوف اپنے چہرے پر لانے سے حق الامکان کر لیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر عرفان شوکت کے ہاتھ سے
 کاغذ لے لیا۔
 "مصلحتیں انکھن سے پھر سوچنے لگی تھیں۔" بات بچھو ہوں کہ میں یہ تو خط کر بھی دوں۔
 بچھو۔ بہت رانا میں۔ ان کا گھر ہے۔ ان کی مرضی کا سورا ہونا ہے۔
 عرفان شوکت کے چہرے پر کڑواہٹ کے آنے سے خوفزدہ رہنے لگا۔
 "مجھے بتاؤ کہ اس بات کے بارے میں ان کو مطمئن کرنا ہے یا نہیں۔" کون ہی زمین میں سوار ہیں تمہاری
 یہ بچھو میں سارا ہونے کے لیے نام نہان ہے۔
 راجہ کو گڑبڑ تھی۔

"ہاں! کہ میرے علم میں ہے کہ تمہاری بچھو بھی ایک بچہ نہیں پائی ہے۔"
 راجہ نے اپنے باپ کو ایک عجیب سی اذیت محسوس کی۔ اس کے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے چھرنے لگے۔
 تھے اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر اپنے ہاتھوں پر مڑ کر دیں۔
 "مجھے اس سلسلے میں قدرے غلط کام سامنے ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سورا تھامنے ساتھ ہی ملے
 کر لوں۔ پھر میں تمہاری بچھو اور بچھو سے بات چیت کر لوں گی۔ تم تو اس اس کاغذ پر ایک ساکن کر لیتے ہو،
 اس نے آج ایک ہی عجیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا تھا۔
 "تم کتنے سال کی ہو؟" (آج کا کاغذ اس نے دھیان آیا۔ "تمہارا خاندانی کارڈ تو بن گیا ہے نا؟")
 راجہ چندے سے سوچ رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
 "اوہ۔" عرفان شوکت کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔ پھر حال ہی تو بن جائے گا تو مسئلہ نہیں ہے۔
 زرا اس کاغذ پر خط لکھ کر دیتی ہے۔
 "اس پر لکھا ہے؟" راجہ نے کاغذ ہاتھ سے کی زحمت نہ کی۔
 "ہاں، میں نے تجھے اٹھ لکھا ہے کہ تم اس کے پاس آ کر سورا کر کے پرتاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں کہ باپائی کے معاملات
 تمہارے عزیزوں کے آگے نہ رہی ہوں۔"
 "مگر آپ سے کس نے کہا کہ میں اس گھر کا سورا کر چاہتی ہوں؟" راجہ نے کہا اس نے قدرے تندی سے کہا۔
 "اس گھر سے میری پاری وادی کی باپائی وادی ہیں۔ اس کے چچے جی جی پران کے دوستوں کے نشان ہیں۔ اس کے
 دوستوں پر ان کے نقش ابھرے ہیں۔ مجھ سے بات کرتے ہیں۔ ادھر۔ آپ مجھے میری وادی کی کیا دل کے خوش
 ایک معمولی رقم کی پیشکش کر رہے ہیں۔ اس امید پر کہ میں یہ پیشکش قبول بھی کر لوں گی؟"
 "ارے۔" راجہ نے اس قدر غصہ کیا۔ "عرفان شوکت ہر حال میں طور پر مظلوم ہو کر کچھ کر چکے ہیں۔" (تم ہی گناہ دار
 بنا رہے ہو۔ ادھر۔)
 راجہ نے ہلکتے ہوئے دل کے ساتھ بھی رہی۔ اس پر عرفان شوکت کی ہنسی کا کچھ اثر نہ ہوا تھا پھر ایک لذت سی
 خاموشی ہو۔
 "وہ کچھ ہی تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کاغذ پر خاموشی سے دستخط کر دے۔ پھر تم ہی زبان بولنا آتی ہے
 اور تمہارے میں سب سے نرم زبان میں بات کرنا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں اسی لوگوں کی ضرورت ہے۔ اکثر
 ضرورت اور میں اپنی ضرورتوں پر مجھوتہ کر دینا والا آدمی نہیں ہوں۔ پھر تو میں ہر حال میں لے آتی ہوں کہ گات
 تمہاری بھلائی کی ہے اور میں ہی انیال تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں کچھ نہیں میں خوش خور ہوئی ہیں
 اس نے یہ خوف اپنے چہرے پر لانے سے حق الامکان کر لیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر عرفان شوکت کے ہاتھ سے
 کاغذ لے لیا۔
 "مصلحتیں انکھن سے پھر سوچنے لگی تھیں۔" بات بچھو ہوں کہ میں یہ تو خط کر بھی دوں۔
 بچھو۔ بہت رانا میں۔ ان کا گھر ہے۔ ان کی مرضی کا سورا ہونا ہے۔
 عرفان شوکت کے چہرے پر کڑواہٹ کے آنے سے خوفزدہ رہنے لگا۔
 "مجھے بتاؤ کہ اس بات کے بارے میں ان کو مطمئن کرنا ہے یا نہیں۔" کون ہی زمین میں سوار ہیں تمہاری
 یہ بچھو میں سارا ہونے کے لیے نام نہان ہے۔
 راجہ کو گڑبڑ تھی۔

تغ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر جتنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہوسنی عربی شوق ہے ہوا اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 راجہ متواریک خراب دیکھ رہی ہے کہ دادی کی صحرائیں شہیدیاں کے عالم میں اس سے پالی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ترک میں دیگر کائنات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوا ہے۔
 بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیں یا تو اس کی بچو چو ہیں اور ان کا ایڈریس یا کم از کم کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی باؤس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شلما اپنی مال معنیہ کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

”سبیل ہنا گھر سونا۔“ یہاں ہنا گھر سونا۔“

مغنیہ کی آواز سی دی پلیر سے نکل کر پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ وہ بیڑ پر آکر کچھ گونڈا ہوا تھا۔

گھر والی بے حد سونا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ وہاں محض ایک شخص کی ہی ہونے کی شام کی ملاشت سے وہ

واپس گیا تھا اور ایقان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ آج بھی نہ گھر سے اڑا کر اپنے گھر پر آکر کھانے کی خواہش نہ لگتا

تھا۔ آٹھ کھانے پر سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ سونا گھر سونا دل خالی خالی آنکھیں۔ وہ بے روتے اٹھ کر درختے

میں آکر بیٹھ رہی۔ نیچے سر پر ٹھنکے روال دواں تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی دیکھیں نہیں پھاڑاں۔ راستے کی آبر

کا اعلان ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ سب کی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ سب کے گھروں

میں ان کی بیوی بچے مختلف تھے۔ وہ وہیں کھڑی بے مقصد رہی ہو سکتی تھی۔

کام کاج سے فارغ ہو کر نہایت دلچسپی مناسبتی عورتیں ہر گھروں کی گھر کی کی سمت دیکھتی ہوں

گی۔ یہاں لگے بندھے ٹائم پر گھر لوٹا ہو تو منٹ منٹ کا بھی حساب ہو جائے اور یہ نہیں تو چھوٹا ناچ ہی پوچھ لیتا

ہے۔

”یہاں بھی تک نہیں آئے؟“

مخصوص وقت ہوتے ہی مجھے والی بیل یا انتظام کے تناؤ کو کھینچنا ہوتا تھا اور اس کی کڑواہٹ بھی مجھے ہوتی۔
 ”انسویوں نے ہمارے موتی نہ لائے۔“ کسی ڈی پلینٹر مغربی کی آواز ابھری تو وہ چونکا اٹھا۔
 ”رکنا نہیں سے وقت کا دھارا۔ اسے پل بیل بدلتے جیون پیا راس۔“
 اس نے پلینٹر آف کر دیا۔

وقت کا دھارا اتوار ہی نہیں رواں دواں ہے۔ کبھی بہتا ہوا پانی بھی ساکت لگتا ہے۔ بہاؤ کی فوری نہیں ہوتی۔ گھڑی کی سوئیوں چلتی رہتی ہیں۔ مگر وقت جیسے ایک جگہ رواں دواں معلوم ہوتا ہے۔ انتظار کی جان لیوا کیفیت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کیفیت سے گزرتا ہے۔

”میں نے چار سال کا کانٹریکٹ کر لیا ہے۔“

”چار سال؟“ اس کی کنپٹیاں درد کرنے لگیں۔

”میں تمہاری طرح قنوطی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

اس وقت وہ شدید ترین قوتِ طبیعت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے اندر شدید ترین جس ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی کھڑی ہو جس کے ہاتھ لگا کر وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔

ال بھر میں چار موسم ہوتے ہیں۔ سال گزرتے گزرتے انسان چار موسموں سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔

خیزن میں بس ایک انتظار کا موسم ہے۔ بس کی گھڑیاں تو جیسے بل بھر کے لیے آئی ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی موسم۔

بات دلا کے سب ہی کینوں سے نکل اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ عاشق کوئی آف کرنے کے بعد ان کو "حیاتِ دلا" چلے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور اپنے کچھ چلی آئی تھی۔

اسی اسی زیادہ تھی کہ خود کو اس طور مسملا کے کو بھیجی تھی نہیں ماننا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی رخصتی ہوئی تھی۔

مومن نے اسے پکارا تھا۔

جی بٹا! وہ جو تک اٹھی۔

"ابا، میں نے یہاں پہنچے ہیں؟" اس کا گھل-سلا یا۔
 "آپ اسے یہاں پہنچے ہیں؟"
 "اے جی رانی ہوئی۔"
 "میری شکل بنانا؟" اس نے اُن کی ٹھوڑی چھوئی۔
 "کوئی شکل بنانی؟" وہ کچھ دیر اُسی رہی۔
 "مما! یہ شکل میں کھڑی ہوں گے سر میں درد ہوتا ہے نا تو وہ ایسی ہی شکل بنا لیتے ہیں۔ سب بچے ذکر

میں نے کہا: ”اے میری بہن! یہ تو توہم کو جو کہتے ہیں کہ عورتوں کے لیے ایک سنگسار ہے۔“

”سراپ“ نے یہاں مطلب ہے ”سرور“ کے ناموں کا۔ ”وہ شرازت سے مسکرا دی۔“
 ”سراپ“ مشکل مشکل باتیں کر رہی ہیں۔ ”اس نے منہ نہ ہنکا۔“ ”میری کچھ میں نہیں آتیں۔“
 ”ہاں نیچے۔“ آخر حیوت کس سے ہو۔ ”اس نے مومن کا سر ملایا۔“ ”یہ باتیں تمہاری کچھ میں کیوں آنے لگیں۔“
 ”ہی ہی کی شکل نظر آگئی ہے۔ جتنا ہوا دل کو کھائی نہیں دیتا۔ ہاں۔“
 ”جب کا دل جل رہا ہے مہما! وہ فکر مند ہو گیا۔“
 ”اس نے بھولی سی صورت بنا کر ان بات میں سر ملایا۔“

”مجھے چاہیے؟“

”مجھ سے بھی اسے بچا لے، اسے چلنے ہی دو۔“ اس نے آہ بھری۔

”میں اس کے لیے پانی لا تا ہوں۔“ وہ بچہ کی جانب دوڑا۔

ایقان مسکرا دی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے وجود کا جس ختم کرنے کے لیے ایک کھڑکی کی ضرورت محسوس تھی، اپنے بیٹے کی بھی بھائی باتوں سے اسے احساس ہوا تھا جسے کوئی کھڑکی چیکے سے کھل گئی تھی۔ تازہ ہوا جھونکوں سے عیسیت کی سبیلن زیادہ سنم ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کی پشت سے سر نکالا۔

”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگتی ہو، خیر تو ہے؟“ چائے کا گھونٹ بھرتی سمیعہ نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔

وہ کھٹوں پر ٹھوڑی دھرنے خاموش بیٹھی تھی۔ سمیعہ کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے کیا بولا دیتی؟ اپنی پریشانی کی وجہ اسے تیار کردہ اپنی واحد دوست کو بھونا جاتی تھی۔ وہ اسے کچھ دھڑکا جاتی تھی۔ سیدر مقابلے میں وہ کبھی رعبہ کو چیلنج نہ جاتی۔ ساری بات سن کر وہ اسے کھل میں رعبہ کو تیار کر دیا اور بھراؤں کا ہوا زبان اس کا نظیرا کر لی یا نہ کرتی۔

وہ ساری رات جاگتی رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ بدر کی بات نے اسے صدمے سے دوچار کیا تھا۔ حالانکہ ایک ہی بات فیضہ خالہ نے بھی کی تھی لیکن ان کی بات دوسری تھی۔ فیضہ اور سمیعہ کے مابین قائم بے نام رشتے کا علم نہ تھا پر انہوں نے کھل رعبہ کی ہمدردی میں اور اسے سارا دل کے لیے یہ بات کی تھی لیکن سیدر۔

اس کی سوچوں کے مارو کو سے ٹوٹے لگتے تھے۔ اس نے سمیعہ کے ہاتھ لکھے تھے اس کے سبب جنت بنا پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ دوسری تو سمیعہ زبانی اس کے لکھے ہوئے ڈائریک سنا کر رہتی۔ پڑھ پڑھ کر اسے وہ اذیر جو ہو جاتے تھے۔ وہ ان دونوں کی ہر خفیہ ملاقات سے واقف تھی۔ سمیعہ کے رنگ میں چھپے ہوئے تھا آف کا احوال اسے یہ تھا کہ وہ کب اور کس موقع پر ملے گی۔ سمیعہ نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس سے بیزار ہے۔ رعبہ کو مردانہ سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ذات کے اندر وہ کچھ بازاری سمیعہ نے غریب سمیعہ کے سبب کی حساب کتاب غیر محسوس طریقے سے فیضہ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسے دنیا دکھائی دے رہی تھی۔

”اسے کہاں کوئی ہے؟“ سمیعہ نے اس کا تازہ حالایا۔ ”میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”کیا بتاؤں آخر؟“

”جیسے ہو اکیلا ہے۔“

”کچھ ہوا ہو تو بتاؤں خواہ مخواہ ہی۔“

”اس کی تو نہیں ہو، تم تیرے تو ہے؟“ پھر وہ خوشی سے بولی۔ ”تو کس کسی سے عشق و شوق تو نہیں کر بیٹھی؟ ایسی حال تو میرا بھی رہی ہو۔“ سمیعہ نے اپنی جڑ نہ دینا کا ہوش۔

رعبہ نے منہ سے طعنے سے کہنا۔

”مساووں کے اندھے کو ہری ہری سوچنے لگی؟ ویسے میں عشق کرنا بھی چاہوں تو اس کے لیے ایک عدد شخصیت کار ہوگی اور آج کل تو محض ایک ہی شخصیت کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سمیعہ نے از حد اشتیاق سے پوچھا۔

”عزراں شوکت۔“ وہ کسی سے بولی تھی۔

سمیعہ نے برا سامنا نہ کیا۔

”وہ تو سن چکا ہے کیا سمیعہ بیٹھی؟ اجماعات تو سنو۔“ وہ اس کے قریب ہوئی تھی۔ ”ایک کام کرو میرا۔“

رعبہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”دب دبر۔“ کو ایک پیغام دینا تھا۔ وہ سمیعہ سے ملنے کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اسے کہنا۔

”سمیعہ! رعبہ نے اچانک ہی اس کی بات کاٹی دی تھی۔ ”میں بد سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”دیکھو؟“ اسے حیرت سے جھٹکا گا۔ وہ مگر فکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

رعبہ کو کچھ بچہ پرانا نہیں۔ سمیعہ اس کی بچپن کی کئی کئی سنی تھی۔ اس کو دکھ دینے کا خیال ہی تکلیف دہ تھا۔

”دیکھو! رعبہ سمیعہ سمیعہ اس طرح سے کیوں کر رہی ہو، ناراض ہو کھٹے؟“

”رعبہ! کیلیں تم میرے کو تو آہستہ سے ہی دس۔“

”وہاں! کیلیں! یہ میرا پریشانیوں کی وجہ سے سوئے کچھنے کی اصلاحیں ہی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پریشانیوں نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ زندگی کے جن پہلوؤں پر غور کرنے کی اسے

کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اس پر اسے سوچنا بھی تھا اور فیصلے بھی کرنا تھے۔

”میں زندگی میں سمیعہ کے ساتھ طالع میرے۔“ رعبہ سوچوں میں گم تھی۔ ”جہنمیں تیرا نہیں آتا“ انہیں اٹھا کر

سمیعہ نے پچھلے کی بات سے توجہ دے کر کہا۔ ”تو اب جاؤں گا۔“ وہ بول کر اٹھ کھڑا ہوا۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

سمیعہ نے اس کی بات سے غور کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔ اس کے ہاتھ لکھے تھے۔

”یہ تو اچھی کیا۔“ تم کو کسی ذرا بات دل پر لے گئی ہو۔“ منیوہ بیگم ہنس دیں۔
 وہ اچھا لڑکھوڑا چلا آ رہا تھا۔

”ماما۔“ وہ اگر اس سے لپٹ گیا۔ ”آج آپ گھر پر ہیں، کتنا اچھا دن ہے۔ منڈے بہت اچھا دن ہوتا ہے۔“

”شہلا مسکرا دی تھی کہ عمو! اس کا رستہ ہی ہوتا تھا۔
 ”ہی! کچھ کر سکتے ہو نا کو اور ماما کو سلام کرتے ہیں اور حرا دھر کی ہاتھتے ہیں۔“

”السلام علیکم ہاؤ ماما! اس نے فوراً جھیل کی۔
 وہ دونوں نے ہی جواب دے کر اس کا ہاتھ چومنا تھا۔

”اللہ سلامت رکھے! این ماں کی آنکھوں کا نور ہو۔“ منیوہ بیگم بولی تھیں۔ ان کی پلکیں ہم ہو گئی تھیں، جنہیں انہوں نے مہارت سے چھپایا۔

”آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں ماما! بنگ لڑکے کی طرح لگتے ہیں۔“ وہ اس کا بغور جائزہ لے کر لگا۔ لاٹھن دی۔

”تمہاری خالہ تمہیں مستقل کاشاعر ٹھیک ہی کہتی ہے۔“ اس نے غرا لے کر بچت لگائی۔
 فون کی بیل بج رہی تھی۔ شہلا نے چونک کر فون کی جانب دیکھا۔ فون میں منیوہ بیگم کے پھوہو ہو رہے تھے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منیوہ بیگم اٹھ گئیں۔
 وہ تہذیب کے عالم میں انہیں فون کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں! بات سنیں۔“
 ”ہاں! کو۔“ وہ فون اٹھانے سے قبل اسے دیکھنے لگیں۔

پھر اس کی جانب سے کچھ جواب نہ کیا کہ انہوں نے بچتا ہوا فون اٹھایا۔
 ”ویکس ہالٹ! کو۔“

وہ غائب رہ گئی۔ اس بات کو تا دیکھتی رہی۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا۔ منیوہ بیگم ریسیور دھڑک دھڑکاپس آئیں تو وہ صدمہ میں بیٹھی تھی۔

”افقہ! کیا تھا کہہ رہی تھی دوست کے گھر جارہی ہے، مل کر اسائنمنٹ تیار کرنا ہے۔ رات تک واپسی ہوگی۔“

انہوں نے رک کر اس کا ستا ہوا چودہ کھلا۔
 ”شہلا!۔“ انہوں نے پکارا۔

”جی!۔“ وہ چونکا اٹھی۔ ”کیا بات! افقہ! کیا کہہ رہی تھی؟“
 ”کہ کہاں گئی ہو، بات کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔
 وہ اب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ انہیں ”اس“ کے فون کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔ دراصل اسے خودی

انداز نہ نہ پوچھا تھا کہ ”اس“ نے اتفاقاً ہی فون کی فراہم کیا ہے اس کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ تم کے گھر جارہی ہے۔ دیر سے لوٹے گی۔“

”جی!۔“ اچھا۔“ اس نے چونک کر اپنے اس کیاس دیکھا۔ ”یہ عمر کہاں گیا؟“

”تمہارے سامنے ہی تو اپنے کمرے میں گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے، کہیں ڈوٹیاں بھٹکتا بھٹکتا کر تمہارا دل غمزدہ کر رہا ہے؟“

”نہیں ہو گیا۔“

اس نے ہنس کر سر جھکا لیا۔

”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باتوں میں دھیان ہی نہ رہا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

چائے چہان کرنا، کھینچ کر کوئی کوڑی سے ڈھک رہی تھی جب ان تینوں کی آمد ہوئی۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر آگے بڑھ کر کھینٹ کھولے گی۔

علی ہنسنے اور دفعے سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کاؤنٹر پر بڑے جی ہوئی رکھی تھی۔ کچوڑے، تلے ہوئے پاپڑ، بسکٹ اور مصالحاتی کی ٹیشٹیں ابالابھری ہوئی تھیں۔

”نعمہ! سب کچھ تیار کر کے اب کھینٹ سے چائے کے گم نکال رہی تھی۔ گم ٹرے میں رکھ کر وہ مصروف تھی۔ نماز میں بیٹھتا تو اسے اچانک کسی کی آواز کا احساس ہوا۔

”اے! اس نے بغور ادھر ادھر دیکھا اور پھر بری طرح سے چونکا اٹھی۔ کاؤنٹر سے لوازمات کی ٹرے غائب تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے بین کا جائزہ لیا جیسے اسے اپنی بصارت پر کوئی شک ہو پھر وہ کچھ

کھینچنے پر تیار تھی۔

”اے! اس نے غرا لے کر بچت لگائی۔
 فون کی بیل بج رہی تھی۔ شہلا نے چونک کر فون کی جانب دیکھا۔ فون میں منیوہ بیگم کے پھوہو ہو رہے تھے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منیوہ بیگم اٹھ گئیں۔
 وہ تہذیب کے عالم میں انہیں فون کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں! بات سنیں۔“
 ”ہاں! کو۔“ وہ فون اٹھانے سے قبل اسے دیکھنے لگیں۔

پھر اس کی جانب سے کچھ جواب نہ کیا کہ انہوں نے بچتا ہوا فون اٹھایا۔
 ”ویکس ہالٹ! کو۔“

وہ غائب رہ گئی۔ اس بات کو تا دیکھتی رہی۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا۔ منیوہ بیگم ریسیور دھڑک دھڑکاپس آئیں تو وہ صدمہ میں بیٹھی تھی۔

”افقہ! کیا تھا کہہ رہی تھی دوست کے گھر جارہی ہے، مل کر اسائنمنٹ تیار کرنا ہے۔ رات تک واپسی ہوگی۔“

انہوں نے رک کر اس کا ستا ہوا چودہ کھلا۔
 ”شہلا!۔“ انہوں نے پکارا۔

”جی!۔“ وہ چونکا اٹھی۔ ”کیا بات! افقہ! کیا کہہ رہی تھی؟“
 ”کہ کہاں گئی ہو، بات کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔
 وہ اب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ انہیں ”اس“ کے فون کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔ دراصل اسے خودی

”توبہ تم ہو شیطانو!“ اس نے باہر جھانک کر کہا۔
 وہ تینوں بچے گھاس پر راجمان موج اڑانے میں مصروف تھے۔
 ”ناعمہ سے کہیں چائے پیس دے دے۔“ علی نے اس نے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
 ”ورہ تو ہنسنے لگی تھی لیکن اس کا آدھا خون جل گیا۔“
 ”میں پوری کینٹی تھمارے سروں پر انڈیل دیتی ہوں۔“ اس نے دانت پیسے۔
 ”نور ابلے۔“ خنزہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”ہم سر اٹھا کر منہ کھول لیں گے۔“
 ”بالکل۔“ یہ نافع تھا۔ ”آپ ان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں محترمہ!“
 ”ابھی تم نے میری صلاحیتیں کہاں دیکھی ہیں۔“ وہ تلملائی تھی۔
 ”کیوں نہیں سب کچھ اٹھا لیا گیا ہے۔ یہ پکڑے بنائے ہیں؟ نمک کم، مرچ زیادہ۔ ہر اوصاف بہت ڈال دیا ہے۔“

”اور یہ پیاز؟ آؤ اچھے جلے آؤ اچھے کچے۔“

”مٹھالی اچھی ہے۔“

”ہاں، حلوائی باصلاحیت تھا۔“

”اب چائے پیتے نہیں کیسی ہوگی۔“

”چلو زہر مار کر لو، کچھ کا دل رہ جائے گا۔“

”میں بھی خنزہ ملاؤں گی۔“ ناعمہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

”یعنی دو کی ضرورت طے ہوا۔“ انہیں اطمینان ہو گیا۔

”پھر انہوں نے بھر پور قہقہہ لگایا تھا۔“

”چلو ناعمہ! دو دینے ہوئے بولی تھی۔“ خنزہ نے چلو کائے بہت دیر لگئی ہے۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا ان کا خون پی جائے۔

دونوں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئیں تو راجہ بیگم نے اسے گھبراہٹ سے دیکھا۔

”ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یہاں سے جا چکی ہوگی۔“ خنزہ نے انتظار کر کے بالآخر نماز کے لیے اٹھ گئی ہیں۔

”امی جی۔۔۔ دھم۔“

”چلو اب جلدی سے سب کو چائے دو۔“ انہوں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”اور یہ کیا چیزیں بنائی ہیں۔“

”اوہوری سدھوزی حد کر دی تم نے کتنے پن کی۔“ انہیں اس پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔

”امی جی۔۔۔ دھم۔“ اس کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ بات کرنے سے پہلے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہائیں اب اس میں سوے بہانے کی کیا بات ہے؟“

”بیجے۔“ اقیان بولی۔ ”باجی! آپ نے بلاوجہ اسے رلا دیا ہے۔ اتنا کچھ کر کے لائی ہے بے چاری۔“

”در اصل راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔“ ورہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ قافلہ تو لٹا پٹا آپ تک پہنچا ہے۔“ اس نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”اوہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”تو کیا ہوا؟ وہ بھی ایسے ہی ہیں، دھماجو کڑی کہیں کے کون کون تھا؟“

”علی، خنزہ اور نافع۔“ ناعمہ نے ناک رگڑی۔ ”دیکھ لوں گی میں بھی۔ بدلہ نہ لیا تو ناعمہ علی خان نام نہیں میرا۔“

”اڑے کیا کرو گے اس تھے؟“ بھائی کے جاننے کے بعد انہوں نے بڑے اشتیاق کے پوچھا۔ ”ہے کوئی اس کے کرنے کا کام؟“
 ”ہاں کی بھی، کبھی کی بھی ہوتی ہے بیگم اپنا ہتھ چلانے والا ہونا چاہیے۔“ وہ جوتے اتارنے لگے تھے۔
 ”پھر کبھی اسے تو فلم پکڑا نہیں آتا۔“ وہ فکر مند تھیں۔
 ”فلم پکڑنا اب بھی نہیں ہے۔“
 ”اے ہے؟ کچھ تو کہو۔“

”بیون پچھتی پر گیا ہوا ہے میرا اس کی جگہ بٹھانا ہے۔ چائے کے کپ تو تھما سکتا ہے ناسب کو پانی تو چلا سکتا ہے۔“
 ”ہائے اللہ۔“ انہوں نے کلیجہ تمام لیا۔ ”پھر اس بناؤ گے اسے؟ اڑے یہی اوقات رہ گئی ہماری؟ بھلا ڈوے کا پوچھنے لگائے گا اڑے میری سیانہ۔“ وہ ڈراؤنہ نظاروں نے لگیں۔ ”اڑے کیسے تڑپے گی ابامرحوم کی مدح؟ فاروق حسن! تم نے ساری عمر ہی بٹھایا میرا۔“
 ”ابامرحوم کی روح اس حال میں خوش ہے؟“ وہ طنزاً ”یوں تو ان کے اشعار انہیں بدل ڈالتے تھے۔ رہتے ہیں غالباً۔“ ان کے جھاڑ پونچھا لگانے سے ادب کی دنیا کو کوئی کچا نہیں بٹھکا ہے فکر دین کے جس دن چار بیسے تھوڑے نام پر لیں گے سب سے زیادہ خوش ہو کر سب ہی اچھا۔“
 ”کئی طے کی ہے؟“ وہ نہ لکھنے والے آؤ پوچھنے لگیں۔
 ”انہوں نے کوئی جواب نہ دیا ہے سنا تھہ مگر اب لیوں پر ہو گئی تھی۔“

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ شملانے بستر پر لیٹی سرانہ سے پوچھا۔
 ”وہ ہونے سے مسکرا دی۔“
 ”اب تو ابھی ہونے لگا صاحب!“
 ”بہت پیاری بیٹی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو۔“ وہ بھی مسکرائی تھی۔
 ”بس جی اس کی مرضی۔“ وہ بیکہ اوس ہوئی۔
 ”شمالیا! اتنی ارزاں نہیں۔“ کج کل کی باتیں تو اپنی ہی بیٹی کی زندگی کرنے پر ملتی ہوئی ہیں۔ ”شملہ کو اس کا رویہ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ اس قدر پچھلی مسکراہٹ۔“ پچھلی مرتبہ بیٹھا تھا تو یہ ماں سے وہاں تک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ”مجھے اور بے پچھلے سال کی بات ہے۔ میں نے ہی اپنا ہتھ بٹھائی۔“ ”میرا بھہر خرم نہ ہو گئی تھی۔“
 ”تسے والے لوگ ہی خوش نہیں ہوتے تسے تھوڑا صاحب! ایوں آتے ہیں جیسے تڑپے آئے ہوں۔“
 ”بہنو! ڈم سے پچھا نہیں بھجوتے گا ہمارا۔“ اس نے سانس سے سر ہلایا۔ ”کبھی کو یاد نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیار سے ہی قطعی اللہ علیہ وسلم کو چار بیٹیوں سے ہی نوازا تھا۔ یہ تو زیادہ خوش متانے کی بات ہے۔ ہم اپنا آخری وقت یاد کر کے کانپنے لگتے ہیں کہ انہوں نے تو یہاں کر چلے جانا ہے، یہاں ہوتا تو سارا ہوتا۔ اڑے بھی اکل کس نے دیکھی ہے؟“
 ”بس ڈاکٹر صاحب! ابی کی نصیب سے ڈر لگتا ہے۔“
 ”میں اتنی فضول بات نہ کرتے کہہ دی لوگ! اسے دہرائے جاتے ہیں۔ اتنا کمزور عقیدہ کہ اتنا متزلزل ایمان؟“
 ”جس کے بیٹے ہوتے ہیں انہیں ڈر نہیں لگتا۔ نصیب تو سب کے ساتھ ہے۔“

”وہو! کٹر صاحب! آپ کا فون ہے۔“ ڈیوولی نرس نے اسے اطلاع دی تھی۔
 ”جیسا۔“ میں آئی ہوں۔“
 اس کا راز وہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر زروم کی جانب چل دی۔
 وہ سر ہوجے کا نام تھا۔ عمر اکثر اسے اسکول سے واپس آ کر فون کیا کرتا تھا۔ اس نے اسی ترنگ میں فون اٹھایا۔
 ”ہیلو۔“ بہت کم میں وہ بولی تھی۔
 ”وہ سر کی جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی رہی۔“
 ”ہیلو شملہ! بول رہی ہوں۔“
 ”جانتا ہوں۔“ وہ سر کی جانب سے کہا گیا۔ ”تجربہ جی جان لو کہ میں کون ہوں۔“
 ”شملہ! کامل دھک سے رہ گیا۔“ فوری رد عمل کے نتیجے میں اس نے ٹھٹھ سے رہیہ پور رکھ دیا۔ ایک سنانے کے عالم میں وہ فون کیسے بدل کر اپنا ہوساں رہی تھی۔ جب یہی تیل دوبارہ بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا۔
 ”وہو! کٹر صاحب! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ الزموں شیروں کی طرح مری ایٹ مت کرو۔“ وہو! لوگ لیجے میں کہہ رہا تھا۔ ”بات کرو جس طرح نارملی بات کرتے ہیں۔“
 ”وہ آہستہ سے بول۔“
 ”خاتون عمر! کون رہیہ کرنے پر پابندی لگا دی ہے؟“
 ”ہاں۔“
 ”پھر کیوں؟ تم کیسے لگا سکتی ہو؟ آفٹر اس میں اس کا باب ہوں مجھے اس سے بات کرنے کا حق ہے۔“
 ”تم نے اسے پہلی کمر اس کے کپ ہو؟“
 ”وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔“
 ”اسے کپ سے انور سے ہاتھ اور تم نے۔“
 ”وہیں جس سے اس نے اس کے کپ سے۔“
 ”خاطرات بہت گریں۔“
 ”وہ چاہا پچا کر بولا۔“
 ”میں اسے تمہارے خلاف کیوں بھڑکاؤں؟ یہ مانوس کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟“
 ”خاطرات بہت گریں۔“
 ”وہ چاہا پچا کر بولا۔“
 ”میں اسے تمہارے خلاف کیوں بھڑکاؤں؟“

”میں انور کی بات سے کرو ستر بار رجیالانی مان کے تمہارا کچھ لیٹا رہا نہیں ہے۔“
 ”خاتون! کچھ! وہ طنزاً بولا۔“
 ”میرے ڈاکٹر ہونے سے کبھی تمہارا واسطہ نہیں۔“ وہ بھی طنزاً بولی تھی۔
 ”لیکن اپنے بیٹے سے میرا واسطہ ہے شملہ علی! اس کی لک آفٹر میرا مسئلہ ہے اس کی صحیح طریقے سے کیئر ہو رہی ہے! میں ڈے سینس! اکیلے اطفال میں ہے! میں سب باتوں سے میرا واسطہ ہے اور رہے گا۔“
 ”میں اس کی ماں ہوں ستر صاحب! آپ یہ بھول رہے ہیں۔ اس کی کیئر اس کی لک آفٹر ان سب باتوں کی پروا مجھے سب سے زیادہ ہوتی چاہیے اور بے۔“ وہ اس میں ہوں۔“
 ”وہ نہیں دیا۔“
 ”جب آپ اس وقت اس کے پاس ہیں اسے کھانا کھلا رہی ہیں غوریاں سن رہی ہیں۔“
 ”اس کی ضروریات سے میں آپ سے زیادہ واقف ہوں۔“ وہ تنبیہ کی سے بولی۔ ”بہر حال کام کی بات کرو فون کر کے ہی کیا جی ہے؟“

”میں عمر سے کانٹھیکٹ میں رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارا گھر سے کوئی بھی معترض ہو نہ روئے اٹکائے۔“
 ”میں سوچوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں تمہیں سوچنے کا ناہم نہیں دے رہا ہوں، صرف اطلاع دے رہا ہوں۔“ وہ مذاق اڑانے والے لہجے پر بولا۔ ”تم عاقل، باشعور، سمجھ دار لیڈی ڈاکٹر ہو۔ ایک باپ کے جائز، قانونی حقوق تو سمجھتی ہوگی۔ میری نرمی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔“ اس کے کہنے میں دھمکی تھی۔
 شملہ کا دل اچھل کر اس کے تالو سے آچکا۔ اس کی آواز بند ہو گئی سانس رکنے لگی۔

”گھر جا کر اپنی والدہ صاحبہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا“ میں جب بھی فون کروں، عمر سے میری بات کر اٹے۔“

”ٹھیک، ٹھیک ہے۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”میں فی الوقت اس سے اپنے رشتے کی وضاحت نہیں کروں گا۔ میں بھی اس کے ننھے ذہن کو پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن آہستہ آہستہ اسے سب سمجھ میں آجائے گا۔“
 شملہ نے مرے مرے انداز میں ریلیور رکھ دیا تھا۔

وہ مغرب کا وقت تھا یا فجر کا ایسے صحیح طور پر وقت کی پہچان نہ ہو رہی تھی۔ وہند لکا پور سے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیے اڑے تھے۔ یوں جیسے وہی پو پھٹے کی اور سورج کی جانب سے پھٹکی گئی پہلی کرن رات کو شیشے کی مانند کرچی کرچی کر ڈالے گی یا یوں جیسے سورج اپنی قبا کا پلو پورے بطور پر سمیٹ کر آسمان کا دروازہ بند کر لے گا اور ہر سو کھنگھور اندھیرا چھا جائے گا۔ نجانے وہ کون سا وقت تھا؟
 اسے اتنا احساس تھا کہ وہ اواسی کا وقت تھا وہی حشر کا وقت تھا وہ جس کے زور پکڑ لینے کا وقت تھا۔ اس ملگجے سے اجالے میں صحیح طور پر ہر شے واضح نہ ہوتی تھی۔ ربیعہ گھر میں کھڑی تھی بالکل تنہا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں روئی کے گالے اڑتے پھر رہے تھے۔ بھرے بھرے سرسبز پھل پھلنے لگے یا دل اور سر سے ادھر بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ کھڑی ہوئی اور اٹھانے بڑی حرکت کے آسمان کو دیکھتی رہی۔ آسمان پر تیز رفتاری سے ہوتی ہوئی یہ حرکت توجہ طلب تھی۔ بادلوں میں کھلبلی مچ رہی تھی۔ ربیعہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہی۔

تب اس کے گال پر پانی کا پہلا قطرہ آن کر اٹھنڈا اٹھار قطرہ۔ ربیعہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔ اسے پہلی بار جس کے ٹھنڈے کا احساس ہوا۔ جسم سے سرسراہٹ ہوا کا ایک جھونکا ہولے سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ ربیعہ کو خوشی اور غماضیت سی محسوس ہوئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں پھر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ سرسبز یا دل اب سیاہ ہو رہے تھے۔ سب کے سب بڑی تیزی سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے جیسے کسی نے مٹی بھر سیاہی مالا ب کے پانی میں پھینک دی ہو۔

ربیعہ کو احساس ہوا کہ بادلوں میں سیاہی پھیلنے کی وجہ سے ماحول میں جو ملگجاسا اجالا تھا وہ غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔

پھر یکایک ہوا میں چل پڑیں۔ تند و تیز ہوائیں۔ ربیعہ کا پورا گھر ہواؤں سے بھر گیا۔ سب کھڑکیاں دروازے ہواؤں کی زد میں آکر کھٹاک کھٹاک کھٹنے اور بند ہونے لگے۔ محکم میں لگا ہوا سنگھار کا درخت مست شرابی کی مانند جھومنے لگا تھا۔ اس کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ربیعہ کے وجود سے ٹکراتے اور پورے گھر میں بکھر جاتے۔
 شامیں شامیں کرتی ہوا میں، سرسراتے ہوئے پتے اور بجتے ہوئے دروازے اور وہ گھر میں تنہا تھی۔

"رہیبہ رہیبہ" دادی اسے پکار رہی تھیں۔
 "دادی کہاں ہیں؟" اس نے پریشانی سے سوچا۔ "دادی تو گھر میں نہیں تھیں۔ دادی کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔" آواز بہت دُور سے آ رہی تھی۔ رہیبہ اپنے صحن میں کھڑی تھی۔
 "رہیبہ رہیبہ یہاں سے جاؤ۔" آواز پھر آئی۔
 رہیبہ پریشان ہو کر اندر اصرار دینے لگی۔ آندھی کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ہار سنگھار کا درخت یوں سرخ رہا تھا جیسے ابھی زبیں بوس ہو جائے گا۔
 رہیبہ کا صحن خشک پتوں سے بھر چلا تھا۔
 "کہاں جاؤں؟" اس نے خیال آیا تھا۔ "میں کہاں جاؤں؟"

"رہیبہ رہیبہ"
 پھر وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ہار سنگھار کا درخت جیسے رسیاں تڑوا رہا تھا۔ رہیبہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پتے چڑھ چکے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ کمرے کے لیے کسی محفوظ جگہ پر آ چکی ہو۔
 بند دروازے سے پڑنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑی ہوئی تھی۔ آندھی صحن کی طرف سے آ رہی تھی۔ آوازوں اور ٹوٹ رہا تھا۔ ہوا کی شاخیں شاخیں اور پتوں کی سرسراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ آوازوں کو فرائیو کیا۔ صرف ایک کادل تیزی سے دھڑکتا رہا تھا۔
 "رہیبہ" اس نے بھر آواز آئی۔

"اب کی بار یہ آواز قدرے قریب سے آئی تھی۔ رہیبہ نے آنکھیں کھولیں، سامنے دیکھ کر والی کھڑی تھیں دادی۔ کھڑی تھیں۔ وہ ہار گئی تھیں۔ رہیبہ کو صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔
 "دادی! وہ مجھے کیوں ڈرتی۔"

"رہیبہ رہیبہ یہاں سے۔" دادی نے اسے اشارہ کیا۔
 "کہاں جاؤں؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
 "جاؤ۔" اس جاؤ میں سے کہا تھا۔ "رہیبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جاؤ۔" اس کی بار شدت سے کہا گیا۔
 اس کی آنکھ مچل گئی۔ اس کا پورے جسم پر زلزلہ کی زندگی آیا ہوا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے گھر کے اندر ہے۔
 آنکھ کھل جانے کے بعد وہ کچھ دیر سیدھی جت سٹی پھرت کھول کر دیکھ کر اسے علم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ خود کو اسی کمرے میں محسوس کر رہی تھی۔ صحن کی ٹھنکی میں اس نے دادی کو کھڑا دیکھا تھا۔ اسے شدت سے خوف محسوس ہوا۔ ٹھنکی کی ابراس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ ابھ کر کھینچ گئی اور خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی نہیں تھی۔ وہ حاکم چچا کے گھر میں تھی۔

اسے یاد آیا وہ تو پچھلے کئی دنوں سے یہاں آکر سویا کرتی تھی۔ برابر والی چارپائی پر سمیعہ لٹتی دھم سے خراٹے لے رہی تھی۔ اس نے ذرا آنکھیں کھلیں۔
 رہیبہ کو اپنے حلق میں کانٹے لگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم سینے سے ہری طرح سے بڑھا ہوا تھا۔ چارپائی سے تیز لڑکے وہ کچھ دیر بیٹھی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ ابھرتا تھا۔ آواز دے کر سمیعہ کو جگا لے۔ اسے اس وقت ایک سامع کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔
 "سمیعہ! اس نے ہولے سے آواز دی۔"

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی تعلیمات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا ہر محفلات، جہز، کتاب، درجہ، ان میں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و خوض کیجیے۔

سمیعہ گھوڑے سے بچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کے خزانوں کے لیے میں ذرہ برابر فرق نہ کیا۔ رہیبہ کھڑی ہو گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی اور دیکھا کہ دروازہ کھول کر صحن میں چلی آئی۔ ہر بار والے کمرے میں حاکم چچا اور ملیب سوبا کرتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ اسے خالی صحن سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غالباً "رات کا آخری پر تھا" رہیبہ کو وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ بڑی ہمت سے کھڑی ہوئی۔ اب اتنی اور کتنے سے صاف نکال کر پینے لگی۔ یہاں کی اس نے نگاہیں جگہ پر رکھا اور مڑی۔ اس کے لبوں سے "جی نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے عین پیچھے حاکم چچا کھڑے تھے۔
 "رہیبہ! طمانعت سے بولے۔ "جاگ رہی ہو؟"
 "جی ہاں۔ میں۔ ڈرتی تھی۔" اس کا سانس کنٹرول میں نہ تھا۔
 "کس سے؟"

"اس سے۔" سمیعہ نے اس میں سے عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ چچا جان لودھ میں سے دادی۔
 "حاکم! تم کو رہیبہ! انہوں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔ "اچھا میں لگا۔" رہیبہ کا خوف بڑھ گیا۔
 "اس کی پچھلی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اس کی بڑی وضاحت سے اپنا اندام عیاں کر رہی تھی۔ چچکا اور ملیب نظروں میں چھپ چکا تھا۔
 "وہ خاموش رہا۔ اس نے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

"سمیعہ! اس نے اسے اپنے صحن میں بٹوے کا تھمارا اشارہ۔ یقین جانو، میں ان کا تھوڑا بہت فرق کبھی محسوس نہ کرتی۔" رہیبہ نے اس کے پاس ہاتھ پھیر دی ہوتا؟
 رہیبہ پر شکایت کی کھڑی تھی۔
 "سمیعہ! تم کو میں ایک ماہ میں بیادوں کا اس گھر پر زان کرنا چاہتا تھا۔ خیال میں تمہارا رکھوں گا۔ کوئی دوسرا نہیں رکھ سکتا۔"

انہوں نے مرکز کرکوں کی جانب دیکھا۔ رہیبہ ان کی اگلی متوقع حرکت کا بھیدہ لگتی۔
 "سمیعہ! جاگ رہی ہے چچا جان! وہ بر سکون، مجھم آواز میں بولی تھی۔ "تم بیوی آئی تھی۔"
 "آں! آں! اچھا۔ اچھا۔ میں بھی بیوی بنے آتا تھا۔" وہ آگے بڑھے۔
 رہیبہ آواز اسے ان کے قریب سے گزر کر اندر جانے لگی۔
 "رہیبہ! اسے اسے اس سے خوشامد سے کہا۔
 "میں چچا جان! آپ سے فکر ہیں۔" اس نے سچی سے کہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نہایت سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر پہنچے گا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا کر ہے۔ غصہ نہ کیجی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 رعبہ متواثر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شدید بیمار کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شاہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں بھی بتے پتے نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوا ہے کہ بقیہ نانیوں کی پوچھ پوچھ میں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر اولا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شملہ اپنی ماں منیوہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔
 منیوہ بیگم کے آنسو خاموشی سے ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ شملہ کی دکھ میں بیٹگی ہوئی آواز ان کا دل چیر رہی تھی۔
 ”بیس بائی!“ شملہ نے ان کے ہاتھوں کو ہتھوڑا ”یہ کیسے فیصلے ہیں۔ کوئی حساس آدمی مندر بدل یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟“
 ”جیسی دنیا کے سارے فیصلے اس ایک بار ہی نہیں ہو جاتے۔“ منیوہ بیگم نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔
 ”میں سب فیصلے ایک بار پھر ہوں گے۔ وہاں جہاں کسی کے ساتھ رتی برابر ظلم نہ ہو گا۔ جہاں پر کوئی اپنی رتی برابر سچی سمجھی دیکھ لے گا اور رتی برابر ظلم بھی۔“
 شملہ خاموش ہو گئی۔

”میں نے ابو کا دل دکھایا تھا نا ہی؟“ وہ پوچھنے لگی۔
 ”نہیں بیٹے۔ ایسے نہیں سوچتے!“ وہ محبت سے اس کا سر تھکنے لگیں۔ ”ہب کے ابو کی روح آپ کو افسردہ کر رہی ہے۔ بس یہ سوچ کر خوش رہا کرو۔ انہیں ایصالِ ثواب کرتی رہا کرو۔ دیے ایک بات پوچھوں گی۔“
 شملہ نے اذیت میں سر ہرایا۔

”میں نے آپ کی بات پریشان کر دی ہے؟ میں کچھ دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں لیکن پوچھا نہیں کیونکہ بہا بہا دعوت انسان شخص اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا متعین ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی دوسرے کی ہمدردی کی کیا کارگزاری؟ سب میں نے سوچا تھا جب خود سے سب کچھ کہہ کر لوٹی تب پوچھوں گی بلکہ تم خود ہی بتا دو گی لیکن ان سب میں اس کی فکر افسردہ دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہوں۔ پھر تم نے مجھ سے جس طرح کا حال پوچھا کہ میں غور کرنے کی بات نہ کر سکتی تھی۔“
 ”کچھ دنوں سے جسے ابو کا دل دکھایا تھا نا ہی؟“ وہ جیسی آواز میں بولی۔
 ”اللہ!“ منیوہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”وہ بھلا کر رہی ہے۔“
 شملہ نے علیحدگی سے براہ راست منیوہ بیگم کو دیکھا۔ ”اب تک خفاقی ہیں؟“
 ”جی ہاں۔“ منیوہ بیگم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پوچھتی ہوں تو کتنا انا نکلتی ہیں۔ میرے فریڈ ہیں۔ میں سوچتی رہ جاتی کہ کون سے انگل ہیں جو اسے ہرد سے لڑنوں کو کہتے ہیں۔ تم سے بول نہ کہنا کہ تم پریشان ہو وکی۔ بس پھر بیکل جیتی ہویش لی ٹون اٹھاتی۔ دوسری جانب سے لائن ڈس کنکٹ ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی دس مردوں کیلئے بات ہے۔“
 ”اس نے اسپتال فون کیا تھا اور دو ٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ وہ عمر سے کانٹھ کٹ میں رہے گا۔“ شملہ نے تھکے ہوئے الفاظ میں بتایا۔
 ”پھر تم نے کیا کہا؟“ وہ پریشان نظروں سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں۔“ وہ ہولے سے اس کی دبی ”میں کیا کہتی؟ میں تو ماں ہوں۔ وہ اس کا باپ ہے۔“
 منیوہ بیگم نے کمال کھوٹی تھیں۔
 ”خبر دے! اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کل کو لٹنے کی خواہش کرے گا۔“ شملہ ان کی کیفیت سے بے خبر بول رہی تھی۔ ”پھر میں اسے کھانے پھرانے کی بات کرے گا۔ ادب اور پھر شاید قانونی طور پر اسے ساتھ۔“

نہایت سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر پہنچے گا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا کر ہے۔ غصہ نہ کیجی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔
 رعبہ متواثر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شدید بیمار کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شاہت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں بھی بتے پتے نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوا ہے کہ بقیہ نانیوں کی پوچھ پوچھ میں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر اولا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔
 ڈاکٹر شملہ اپنی ماں منیوہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

سٹاکوین قہقہے

وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا نظریں اس سے اپنے کھیل میں مگن تھا۔ بلاکس کے ساتھ وہ اپنے پندرہ رنگوں کے بلاکس جمع کر کے کسی کھلونے کا ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔
 شملہ آرام کر رہی پر بیٹھی اسے دیکھ کر جاری تھی۔ وہ اپنی کوئی معلوم نام کا میگزین اس کی گود میں اودھ کھلا رہا ہوا تھا۔ پچھلے آرٹے مجھے سے وہ میگزین اس کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس میں سے ایک لفظ سن کر بڑھ سکی تھی۔ اس کا ذہن پچھلے زندگی کے دوران کھنگالنے میں مصروف تھا۔ منیوہ بیگم نے چائے کے کپ اس کے سامنے رکھی مگر وہ دیر سے رکھا تب بد چو لگی۔
 ”حق تکلیف کی امی آپ نے۔“ وہ زبردستی سکرانی ”مجھے کچھ دیر پہلے ہی انقضا ہونے چاہئے بنائی تھی۔“
 ”تمہیں کب اس کی بھائی ہوئی چاہئے پندرہ آئی ہے۔ کیا بات پوچھتی ہیں؟“ وہ محبت سے بولیں۔
 ”سارا دل کام میں لگی رہتی ہیں۔“ شملہ نے ماں کے ہاتھ پر تھام لیا۔ ”دھچکائی نہیں ہیں؟“
 منیوہ بیگم ہنسنے لگیں۔
 ”بوتل کی جان ہو سکتا ہے۔ سب کچھ بھی جانتی ہو ماں نہیں جانتی۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔
 ”ایک بات پوچھوں امی آپ سے۔“ شملہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔
 ”ہاں پوچھو۔“ شملہ نے اجازت لینے کی ضرورت کیوں نہ سمجھی۔ ”وہ سکرانی؟“
 شملہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تو منیوہ بیگم اس کے چہرے پر اضطراب دیکھ کر فکر مند سی ہو گئیں۔
 ”کیا بات ہے شملہ؟ کیا کہہ رہی ہیں تم؟“
 ”پچہاں کا ہوتا ہے باب کا۔“ اس نے ابھی ابھی نظریں ان کے چہرے پر لگا دیں۔ منیوہ بیگم کے چہرے پر سایہ سا رہا۔ وہ اس کی بات کا کچھ جواب نہ دے سکی۔

”پچہاں کا ہوتا ہے۔“ کیوں امی؟ جو ماں تو ماں تک ہر طرح کی تکلیف اُسی جان پر ہٹتے کھیلنے سہہ جاتی ہے اس خوش کن امید پر کہ اس کی گود میں ایک پھول کھل کر اس کے وجود کو گلستان بنادے گا۔ جو ان زندگی کا اہم ترین ٹکڑا ہے۔ جو ان کی کلکاری سننے کی خواہش میں آگ کا دریا سمجھ کر بہا کر لیتی ہے جو اپنی راتوں کی میٹھی نیند سے بخوشی و ستہرا ہوا ہو جاتی ہے جسے اس خوف سے کہ ساتھ رکھا جھولا اگر رک گیا تو اس کا گھٹ جگر اپنی معصوم نیند سے چونک کر ڈر کر روئے لگے گا۔ وہاں ہار جاتی ہے امی؟ وہاں ہار جاتی ہے۔ اس شخص سے۔ جو محض چند لمحوں کی نشاط آفریں جادو کر کے سے باپ بننے کی پر غور سرت حاصل کر لیتا ہے۔ نہ ماں ہار جاتی ہے۔“

اس کی حالت غیروہنگی۔ وہ چودوںوں یا قہوں میں بچھا کر سبکا اٹھی۔

”ششلا! میری جان! دھنیوہ بیگم کھرا گئیں۔“

عمر نے ہاں کو رو ہوا تو کھانا تو باکس روندنا ہوا چلا آیا۔

”ماما! آپ دوری ہیں۔ نانا! آپ نے میری عمر کو کتنا بڑھا دیا؟“ دھنیوہ بیگم سے پوچھنے لگی۔

”نہیں بیٹا! بس اچھا اپنی بیٹی کو کیوں ڈانٹوں گی اور ماما دور نہیں رہی ہیں۔ ان کی آنکھ میں کچھ چلا گیا ہے۔ انہوں نے اسے بھلا ناچا۔“ عمر نے ہاں کے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”نہ کھانا۔ ماما دوری ہیں۔ نانا! آپ کو کچھ بتائیں۔ چلا۔ آپ ایسے ہی کبھی رہتی ہیں۔ بے چاری ماما! وہ چروا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے صاف کر کے لگا۔ ششلا نے اسے سینے سے لگا لیا۔



”میری دور رس نگاہیں کبھی ہیں کہ اگر آپ کے بال کالے ہو جائیں اور آپ چاروہلا رنگ سر جری سے فری کر دیا جائے تو یقیناً پچھو آپ کے سامنے بیٹی بھرس کی ہے۔“

جنرل حقیقتہً حیات کی گود میں سر رکھ لیتا ہوا تھا۔ علی اور نانا بھی ارد گرد موجود تھے۔ وہ سب چٹکی کر چٹکی کر رہی تھیں۔

”جانتی ہوں تمہاری دور رس نگاہوں کو۔“ انہوں نے بیان سے سر پرچٹ لگائی۔ ”رزات“

”جیسے چھوٹی ہیں۔“ علی نے بھی اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا آپ بہت خوب صورت تھیں؟ ایشیائی لڑکی۔“

صورت ہوں گی آپ۔ ”انہوں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”ہاں! اس لیے ایشیائی لڑکی خوب صورت کی کیا ہے۔“

”سچ کلی کی جو بیوی ہے۔“ وہ نادری اُدھ سب فراڈ ہے۔ اور کھانا کی خوب صورتی ہے۔ رزات کو کھڑکی میں تقریریں لڑکیاں بیچ سے چہرے پر مختلف کریمیں مل مل کر ادھ موٹی ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ہلکی سی چمک نظر آتی ہے۔

”چہرے ہیں۔“ چکن میں کام کرتی خانہ اور سدرہ کے کان کھڑے ہوئے۔

”ہمارے عیش کو دیکھ لیں۔“ سہیلی کے گھبرات آٹھ بجے جانا ہے تو سچ آٹھ بجے میں کی یاد دہانی کا جاتا ہے۔ بالوں میں انڈا منہ پر ایشیائی بارڈوں پر ہلچ کر کم۔ ٹھنڈے بھرتو ناخن فائل کرنے میں لگائی ہے۔

”مڑے سے بھرتے کر رہا تھا۔“ خانہ نے سدرہ کو کبھی ماری۔ دونوں منہ دیا کرتے لگیں۔

”یہ ایشیائی بیوی ہے نا! آپ تو بس نما و عو کر لے بالوں کی سادہ سی چوٹی بناتی ہوں گی۔“ نافع نے بھی کھاتے ہوئے فنکشن میں حصہ لیا۔

”اور دادا ابو۔“ اس نے ہانپے۔ ”کہتے ہوں گے صدمہ تو جاواں! علی نے آنکھیں بند کر کے گویا برسوں پہلے زہن میں لانے کی کوشش کی۔

”خفیہ حیات کا چروا اور اسے اٹھا تھا۔ یوں پر بیٹگی بیٹگی مسکراہٹ چلی آتی تھی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ وہ ہلکی۔ ”یہ ایشیائی سیدھے لفٹنٹوں کا رواج تو اب نکلا ہے۔“ لادو کنواری اور نانا ہی گیا۔ اسے منہ سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ایشیائی لادو رکھے، خیر سے شادی شدہ ہو؟ جواب آتا ہے ”نہیں۔“

”ابھی تو مٹی ہوئی ہے۔“ لڑکے خوب مظلوم ہوئے۔

”دیکھیں نادری! ایشیائی کنواری لڑکیاں ناک میں لونگ اپنے اچھی لگتی ہیں؟“ مزہ جو ش میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔“ راجا جانتے تھے لوگ۔ ”انہوں نے ہاتھ دھرایا۔

”دوسرا۔“ اور سہا ایک آپ کرنے کی اجازت ملتی تھی آپ کے زمانے میں؟“ نافع نے کھانا لگا دیا۔

”تمہارے تو اور اتنا خواہو تے تھے۔ گالوں پر سرخی نہیں لگنے دیتے تھے۔ کہتے تھے ہری عورتیں گلی ہیں۔“

”تو بس زبان کھالتی تھی۔ اسی سے ہونٹ سرخ ہو جاتے تھے۔ کرن لگا دینا۔ اوڑھ لیتے تھے سادے سوٹ پر۔ اللہ نہ صلا۔“

”پھر بھی داوی۔“ اچھر بھی آپ اتنی پیاری لگتی ہوں گی کہ کیا یہ آج کل کی فیشن زدہ لڑکیاں لگیا سکیں گی۔ واہ واہ علی زرا تصور کر۔ پیاری وادی ہر اسوت پہن کر کرن ولاد دینا۔ تھے تک اوڑھے پان کھا کر جب مسکراتی ہوں۔

”کیا راز غیب منظر ہو تا ہو گا۔“ بچل بولی۔

”بچل یا سہا۔“ بچل بولی۔ اب تو تصوری محال ہے۔ ہر چیز چلی ہے۔“

”والدہ! بیوی کا زمانہ ہے یا ر۔“ نافع نے بھی باپوسی سے سر ہلایا۔ ”نور رنگ نیل پردس کریمیں کو محض وقتی طور پر را نظر آنے کے لیے رکھی ہوئی لٹی ہیں۔ آپ اسٹک کے ڈھیر میں سے بیچوگ لب اسٹک ڈھونڈنے میں آدھا لگتا ہے۔“

”کس لڑکی کو؟“ پھر ہاتھ بیروں کی باری آتی ہے تو یہ گز بھر کے ناخنوں پر دو دو۔ ”تین تین کوٹ لگتے ہیں ناخن کے۔“

”اگر اسے تو بس لٹی ہوئی ہوں ان بیچوں کو۔“ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بیٹھے خیال بہت بڑھ گئی ہے دنیا میں۔ اب دنیا سستوری ہی ہے۔ ہر نام جیسے سویتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں بے چاریاں قد امت پسند کھلا کر زنجیر کٹ نہ کر دی۔

”خفیہ حیات۔“ لڑکیوں کا بھی تصور کیا۔

”اوتی میں خفا ہے۔“ اس کے میدان میں اتاریکی تھی۔ تانیہ اور سدرہ بچن کے پچھلے دروازے سے کر در کاغذ اور دھڑلے کو لے آئیں۔ ”نہیں۔“ دو منٹ کے رستے میں انہوں نے خوب خوب مرچ مصالحے لگا کر

”کیا میں سناں تھی۔“

”اسلام! علی۔“ انہوں نے آواز دھڑکائی۔ ”اس کی منشا کا مڑہ کر کر ہوا نظر آئے گا تھا۔“

”خفیہ حیات۔“ اس نے ہنسنا شروع کیا۔ ”نہیں۔“ اس کے منشا کا مڑہ کر کر ہوا نظر آئے گا تھا۔“

”خفیہ حیات۔“ اس نے ہنسنا شروع کیا۔ ”نہیں۔“ اس کے منشا کا مڑہ کر کر ہوا نظر آئے گا تھا۔“

”خفیہ حیات۔“ اس نے ہنسنا شروع کیا۔ ”نہیں۔“ اس کے منشا کا مڑہ کر کر ہوا نظر آئے گا تھا۔“

”خفیہ حیات۔“ اس نے ہنسنا شروع کیا۔ ”نہیں۔“ اس کے منشا کا مڑہ کر کر ہوا نظر آئے گا تھا۔“

”ہائیں!“ شفیقہ حیات انہیں گھوڑے لگیں ”چھلنی بولے سوئی سے تیرے پیٹ میں چھید؟ چلو وہ تو لڑکیاں۔
 بالیاں ہیں۔ ان کا تو فطری شوق ٹھہرا بننا سنو رانا تمہارے دباغوں میں یہ کیا فتور پلنے لگا؟“
 ”ارے واڈی جان! کہاں اس بی جملو کی باتوں میں آ رہی ہیں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں ”یہ تو امی! کاربن کا پی ہے۔ بات کا بنگلہ بنانا کوئی اس سے سیکھے۔“
 ”اور نافع بھائی! آپ اپنی کہیں!“ ثانیہ مزے سے بولی۔ ”آپ کے دوست کی منگنی تھی جس دن۔۔۔ آپ مجھ سے کیا کروایا تھا؟“

”چپ۔۔۔ خاموش۔ خبردار۔“ وہ گھبرا گیا۔

”بتاؤ۔۔۔ بتاؤ۔“ لڑکیوں نے شور مچا دیا۔

”فیصل کروا رہے تھے مجھ سے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ نافع پر منوں پانی پڑ گیا تھا۔ شہ حیات ہنس رہی تھیں۔

”دیکھو ان دیوانوں کو۔۔۔ بیٹھے لڑکیوں پر باتیں بنا رہے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ لگا لیا۔“

”آپ سے ادھار چاہیے ہو گا تاکی امی ان کو۔“ ناعملہ نے منہ بنا کر کہا۔ لڑکوں نے خاموشی سے کھسک لینے ہی عاقبت جانی تھی۔

”مما! مجھے ہوم ورک نہیں کرنے دیتی۔“ مومن بڑا گڑا سا بچن کے دروازے تک آیا تھا۔ سالن کی پٹری میں بے دردی سے چیخ بھائی ہوئی ایقان چونکی تھی۔

”لڑکیوں بنا! کیا مسئلہ ہے؟“

”بس کچھ گھسیٹنی تھی بہن ری ہے۔۔۔ میٹری پیڑس پیڑری ہے۔۔۔“ وہ سخت خفا تھا۔ ایقان بچن سے نکل کر بلاؤں میں چلی آئی۔ لالہ فراک میں ملبوس، چھوٹی سی ایمان گھبراہٹ میں لڑکیوں کی طرف بھاگی تھی۔

”یہ میلے۔“ اس نے ایقان کو دیکھتے ہی کہا۔

”آپ کا تعلق ہے؟“ ایقان نے اسے دیکھ کر کہا۔ اس نے واپس دو بھائی گھر۔

”نہیں!“ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”ایمان! تنگ نہیں کرتے بیٹا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”میں نہیں دوں گی۔“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ ایقان نے جھنجھلا کر اس سے جیو میٹری ہا کس چھینا اور اسے چپتے لگائی۔

”خبردار جو بھائی کو تنگ کیا۔ گندی بچی!“ ایمان روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ وہ بیزار بیزار سی واپس بچن آئی۔ اس کے اندر عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔ چوہنے کے قریب آتے ہی اسے سالن کی مہک سخت ناگوار محسوس ہوتی۔ اس نے فوری طور پر ناک پر ہاتھ لیا۔ اسے ابکائی آگئی تھی۔ چند سیکنڈ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن دوسری مرتبہ ابکائی کے آتے ہی وہ تیزی سے سنک تک آئی تھی۔ مسلسل ابکائیوں کے باعث وہ ہڈ ہال سی ہو گئی تھی۔

مومن اس کی غیر معمولی آوازوں سے گھبرا کر بچن میں چلا آیا تھا اور اب اس کا دامن تھامے سوال پر سوال تھا۔

”مما۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ ممایے کیوں کر رہی ہیں۔۔۔ مما آپ نے کیا کھالیا ہے؟“ وہ اسے جواب دینے کے

نہ تجھی اندر کرے ایمان کے رونے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اس کے رونے سے ایقان کا دل مزید خراب ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر اسے پیار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ان کیوں کا سلسلہ طویل ہو تا جا رہا تھا۔ کچھ روز بعد وہ خود گرفتار پائے میں کامیاب ہوئی۔ مگر صاف کر کے ان کے چہرہ صویر اور فرخ سے پائی نکال کر گھونٹ گھونٹ بنے گئی۔ مومن اسے خوف زدہ نہ گاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”مما! آپ تھک ہیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”ہاں جانو! میں تھک رہی ہوں۔“ اس نے چہرے سے اس کا کال پھینکا۔ پھر اٹھ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔

”کھئی ایمان! فرخ پر بیٹھی سنک رہی تھی۔ ماب کی ڈانٹ کو اس نے بہت محسوس کیا تھا۔

ایقان نے اسے بازوؤں میں بھر کر دیا۔ اس کا چہرہ صاف کیا۔

”آپ کندی ماما ہیں؟“ اس نے ناک پر صاعی ”ڈانٹنی ہیں“

”سورہی! وہ صوفیہ مومن تھی۔“

”مما! آپ کو کیا ہوا تھا؟“ مومن کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

”یہ تو مت اچھی خبر ہے۔“ رابعہ بیگم خوش ہو کر بولیں ”ماں جان کو کیا؟“

”تبی ہی تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔“ رابعہ صبروں میں ”آپ جتنا دیکھتے ہیں۔“

”عوشم تب بھی شراؤ کی؟“ وہ جی بھر کر نہیں ”چنانچہ خیر۔“ میں افسوس کے لہجے میں بولی ہوں۔ میں تم یہاں کیوں نہیں آ جاؤ؟“

وہ ایقان سے فون پر محو گفتگو تھیں۔ ورنہ اور ناعمان کی باتیں سن کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو مسہرے اشارے کر رہی تھیں۔

”ماجی! ایک تو مومن کی اسکو ٹنگ کا مسئلہ ہے۔ ہاں سے ہاں کا جواب دیتے رہے۔ پھر کھالی جان کے منظور نظر بیٹھے ایک آنکھ میں بھارت انہوں نے تو مجھ سے میرا کہہ کر بیٹھا ہوا ہے۔ جب آؤں گے وہ دیر سے فیض باب ضرور ہوتا رہے۔“ وہ مل کر بولی۔ رابعہ بیگم کو ہنسی آ گئی۔

”خانی! سنی یا باؤں کو بول رہیں لیا کرتے ایقان! زندگی میں تو جانا ہے کیا کچھ برا دشت کرنا پڑتا ہے۔ تم تو مت نازک مزاج ہو۔“ اس نے ٹھیک ہی کہی تھی۔

”لیجئے! آپ نے ہاں کی ہاں میں ہاں جو بولیں۔“ اس نے ہائی دی ”میں بڑی خود دوست تھیں۔ مگر یہ خیال کرنا ہوں۔“

”وہ ہے تمہارا۔“ وہ مسکرائیں ”جنازیر یہ تو بونی مذاق ہوا۔ میں سنجیدی سے کہہ رہی ہوں تم پہلی آؤ تو اچھا ہو۔ اس حال میں تمہارا باؤں تو شمار نہا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سوامی ضروری ہے۔“

”کچھ نہیں ہو یا باجی! بہت سی عورتیں رہتی ہیں۔“ وہ لا پوائی سے بولی ”میں آؤں گی کسی روز!“

”اچھا!“ اس نے ہاں میں ہاں جو بولیں۔ ”اللہ تمہارا ہو۔“ وہ سری جانب سے رابطہ قطع ہو گیا تھا۔

وہ ہمیشہ ہی اپنے گھر کی سرک کا موزون بنی ہے پورانی سے کاناکر تھا۔ موٹر بائیک کو قفل اسپنڈ سے دوڑاتے ہوئے اس نے جو سی موٹر گاڑا سامنے سے آتے سفید آٹو کے ڈرائیور نے بے حد غلٹ میں ہریک لگائے تھے۔ ہاتھ کو بھی بائیک روکے روکے سینڈز کی دیر ہوئی۔ بائیک گاڑی سے لگ گئی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ

پر سواری کا کٹر شہلا نے جتنا کیشش نیچے کر کے سر نہالا۔

”بہت جلدی ہے آپ کو؟“ وہ پوچھے سے بولی۔ پھر ہاتھ کو پچان کر اس کے تاثرات بدل گئے۔ ہاتھ بائیک سے اتر کر اس کے قریب چلا آیا۔

”معذرت خواہ ہیں۔“ وہ خستہ سی بولی۔ سن گلاسز میں چھپی ہوئی آنکھوں کا تاثر پوشیدہ تھا لیکن اس کے لبوں کے کنارے دم صم سا رخ نمودار ہوا۔

”سورہی! میں نے آپ کو دیر سے پہچانا۔“ وہ بولی ”لیکن غلطی میرا حال آپ کی ہے۔“

”تسلیم! میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”آپ بائیک میں تیز چلاتے ہیں۔ غلط بات ہے۔ اس دن بھی آپ سب ہو گئے تھے۔ میں بار بار متعلقان نہیں کرتی۔“ آپ کی بارود کھل کر مسکرا دی۔

ہاتھ کچھ بول نہ سکا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر وہ گیا۔ اس کے جی میں خواہش ابھری تھی کہ سن گلاسز کے نیچے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں دیکھ سکے۔

”بہت بڑا پنا کر رہیں۔“ اس نے مشورہ دیتے ہوئے شیشہ چڑھا لیا تھا۔ گویا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بائیک سامنے سے گئے۔ ہاتھ مست قدموں سے بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

”کئی۔ یہ روتے ہوئے مجھ سے قطعاً۔“ پندرہ نہیں ہے صاف کہہ دیتی ہوں۔“ وال صاف کرتے ہوئے فریڈس بیگم نے جھنجھکی اڑتے سے بولی کو کہا۔

”آپ اگر ان باتوں سے تمہاری ساس کا مقصد کچھ اور ہے تو انہیں ہماری طرف سے ہر گز سنائی دینا۔“ ہاں۔

ماہر نے خفا خفا اس سے ہاں کو دیکھا۔

”مجھے آپ سے ملنے کے لیے آئی اور آپ نے اس میں برائی دیکھی۔“ زمینوں سے پھل آتے تھے۔ سب رشتہ داروں کا ہاتھ نہیں ٹھیک و ٹھیک کر کے کچھ دی تو کیا اس میں انہوں نے زمین کو بٹھا کر بیٹھا ہے؟ نہیں بیٹھے تو آپ کہتی ہیں اس سے سرکل و سکرل تو بیٹھے ہیں۔“

”مجھے آپ سے ملنے کے لیے آئی۔“ سب کی چارٹریٹل کو بٹھانے لگی۔ جب تک ان کے دماغ میں یہ فتنہ نہ گھسا تھا۔

”مجھے آپ سے ملنے کے لیے آئی۔“ سب کی چارٹریٹل کو بٹھانے لگی۔ جب تک ان کے دماغ میں یہ فتنہ نہ گھسا تھا۔

”مجھے آپ سے ملنے کے لیے آئی۔“ سب کی چارٹریٹل کو بٹھانے لگی۔ جب تک ان کے دماغ میں یہ فتنہ نہ گھسا تھا۔

”تو آئی! اگر ان کے دماغ میں ایسی کوئی بات ہے بھی تو اس پر سوچا تو جا سکتا ہے۔“ زمین اب اتنی گرمی گزری تھی نہیں ہے۔ اچھے بھلے رتے آتے ہیں اس کے۔ وہ تو میرا خیال ہے۔ ہاتھ بھائی کو دیکھ کر خود ہی انٹر سٹل ہو گئی ہے۔“

”وہ ہے! فزوس بیگم! بھلی بی بی! سن گلاسز میں سوچا بھی تو۔ ماشاء اللہ! اللہ نظر دے چاہیے۔ مشاؤون جیسا میرا بیٹا۔“ اس کے لیے وہ پھنسی آنکھوں والی ہی رہ گئی ہے۔“

ماہر کو سخت ناؤ گیا۔

”خدارا! ای! ان غور بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اچھی! لڑکھنک لڑکی ہے۔ آپ کو لے کر اس کی آنکھیں

”ہی نظر آئیں؟ کہتا فیر کا پبلکشن ہے اس کا۔ پھر بھی لکھی ہے اور کیا چاہیے۔“
 ”بس بی! آخر تم نے وہ؟“ انہوں نے ہزاری سے تھاں بچا۔ ”میں خود جو غلطیوں کی اپنے بیٹے کے لیے لڑی۔ دو چار میٹھی باتیں کر کے انہوں نے حمس بھلا لیا۔ تم کل کی بچی ان باتوں کو کیا سمجھو۔“

ماہین ہوش چاہتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔
 حقیقت یہ تھی کہ خود تنہا سے اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور وہ شوہر کی نظروں میں اپنا دلہندہ رکھنا چاہتی تھی۔

”باہم بھائی سے تو بوجھ کر دیکھ لیں۔“ اس نے ایک رہی سہی کوشش بھی کر ڈالی۔
 فردوس بیگم کی تو ریاں جڑھ گئیں۔ چو غصین و غضب کا شاہ کار بن گیا۔
 ”ان سے کیا پوچھو؟ شہزادہ سلیم! انار کلی پسند کی ہے انہوں نے۔ بلکہ انار کلی کیوں؟ مراد النساء؟“
 نور جہاں لقب دین گئے اسے۔ ہمارے سروں پر لا کر بٹھائیں گے ایک بچے کی ماں کو۔ ماہین جیران پریشان لہن کی بے سربا تنگسو گئی۔

”بھری دیشاں! امیں دی ہندہ لگی نظر آئی۔ میں سمجھتی تھی فتور نکلیں گیا ہو گا داغ ہے۔“
 ڈھاک کے تین بات۔

”کیا کہہ رہی ہیں بی! وہ کچھ اچھے ہوئے بولی۔“ آپ بھائی نے بات کی تھی؟“
 ”کی تھی! جب ہی تو سلگ رہی ہوں۔“ وہ اپنا بازو دبانے لگی۔
 ”پھر کیا کیا انہوں نے؟“

”میتا تو رہی ہوں۔ اسی مخصوص جگہ میں ہے۔“
 ”ہائے اللہ! ماہین نے سینے پر ہاتھ رکھا، وہ بھولے نہیں اب تک؟“ فردوس بیگم منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

”پھر بھی؟ پھر بھی آپ ذہن کے رشتے کی مخالفت کر رہی ہیں۔“ ماہین ماں پر غصہ نکالنے لگی۔ ”حالانکہ اس مطلقہ ایک بچے کی ماں سے تو ذہن پر ہزار درجے بہتر ہے۔ کواری تو ہے۔“

”اے تو کیا میں وہی ایک کواری نہ لگتی؟“ فردوس بیگم جمل کر بولی۔ ”باقی سب بھاتا ہو نہیں؟ لڑکی! تیرا داغ ہے کیا ہے؟“

ماہین خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔ اسی لمحے عرشہ کشمائی ہوئی اندرواغل ہوئی۔ بے فکری اور الزہن اس کے انگ انگ سے چٹک رہا تھا۔ جو کیا رنگ کے پنڈ سوٹ میں اس کا سر لیا ہوا دکھلا رہا تھا۔

”کس بی بی پر ہندہ! فردوس بیگم نے اسے کھوڑا۔ ”بھال ہے یہ لڑکی کہ میں گئے؟“ عرشہ نے ماں اور بہن کے شیوہ ملاحظہ سے تو اس کی بے فکری میں قدرے کمی آئی۔ کشمائی بھی رو چکر ہوئی۔

”آئی! آپ کب آئیں؟“ وہ غصہ ہی ہو گئی۔
 ”نہیں دعا سلام کی فرصت مل گئی؟“ وہ بھی مڑی بیٹھی تھی۔ عرشہ نے شرمندہ سی ہو کر حسام کو اٹھالیا اور پیار کرنے لگی۔

”میں ہوتی تو محترم کا داغ درست کر دیتی۔ کمال ہے! اتنا بھی کاغذ نہ لیں۔ آپ میں کہ اس کو کھڑی کھڑی ستائیں۔ شرم عبرت یاد دلائیں۔“ انھیں بھڑکی ہوئی تھی۔ شہلا سکرادی۔

”میں ہوتی تو محترم کا داغ درست کر دیتی۔ کمال ہے! اتنا بھی کاغذ نہ لیں۔ آپ میں کہ اس کو کھڑی کھڑی ستائیں۔ شرم عبرت یاد دلائیں۔“ انھیں بھڑکی ہوئی تھی۔ شہلا سکرادی۔

”یہ غلط کہاں سے لاؤں؟ ایک ڈیڑی سہی اس میں بھلا انتظار عجب ہو سکتا ہے؟“
 ”کمال ہے! ہم کیوں ڈریں؟ ہم نے نہیں ڈکا ڈالا ہے؟ کسی کی چوری کی ہے؟ اسے کوئی ڈر خوف نہیں۔“

اے کے پر شرمندگی نہیں پھینچتا اور نہیں۔ اتنے سالوں بعد یاد آیا کہ کوئی بیٹا بھی پیدا کیا تھا! وہ صاحب بہت خوب! شہلا خاموشی سے سختی رہی اور بے بسی سے مسکراتی رہی۔

”آئے تو سہی محترم کا فون! اب کس بل نکال دیں گی؟“
 ”پلیز انفیقہ!“ شہلا نے التجائی ”کچھ تم کہنا۔ اس کی بات عمر سے کرواؤ۔ دیکھو وہ شرارت کی جون میں ہے۔ کیا خبر کب اس کا داغ اٹل جائے عمر کی محنت میں نہ سہی! ہماری ضد میں وہ اسے اپنی کسٹلفی میں لینے کا دعویٰ کر کر دے۔“

”میں تو مر جاؤں گی انفیقہ! عمر کے بغیر۔“ میں۔ میں۔
 دو چھوٹ چھوٹ کر رو دی۔ انفیقہ کاسب، خوش و خواہ ہو گیا۔ وہ ماتھے پر بل لے اے دیکھنے لگی۔

”جانتی ہیں آپ! عورت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟“ اسو۔ وہ غلطی سے بولی۔

”جانتی ہیں! اس نے ہتھیاروں سے آنکھیں رگڑیں۔ ”میں نے تو انہیں سب سے اچھا دوست پایا ہے۔“
 ”نہ نہ!“ وہ طنز سے نہں دی۔ ”دل کا قصاص! جال کا زلیاں! مینائی کا عدو۔ کیا وہ سچی کرتے ہیں یہ آپ سے؟“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”دل کا غم؟“ انہوں نے رستے نہ نکلے تو شاید اتنا جس اس قدر دوجہ نہ ہر پائے یہ غریب۔ دکھ کی شدت سے پھٹ جائے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

”میں نے کب سے سانس لیے۔“
 ”میں نے کب سے سانس لیے۔“

وہ بہت رخصت اور ہمدرد لڑکی ہے۔ پھر آپ کے بیٹے نے اسے بہت سے خواب دکھائے ہیں۔ وہ ان خوابوں کے سارے جی رہی ہے۔ ہر اس سے غلط نہ سنی وہ ہر سے غلط ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے خالہ کہ اس شخص سے دور رہیں۔" نفیسہ خالہ نے اس کا ہاتھ جو م لیا۔

"پھر میں گی میری بات؟" وہ اس سے بولی۔
 "میں تو بات کرتی ہوں مگر آپ کو برا نہیں لگتا۔"
 "آپ رشتہ لے جائیے گا خالہ۔" باقی جوان دونوں کے نصیب میں اللہ نے لکھا ہوا ہوتا تو یہ ہے۔
 "وہی منائے گی اپنے آپ کو۔ ہم کہیں اس کی نہیں کرتے پھر۔" خالہ پھر جل گئی تھیں۔ جب سے ربیعہ نے انہیں سارا قصہ سنایا تھا گو حکام چچا سے بار بار نفرت اور کراہیت کا اظہار کرتی تھیں۔
 "خالہ! امکان کو نکال ڈال کر اس کی چالی آپ کے حوالے کر جاؤں گی۔" ربیعہ کو حیران آیا تھا "دکانوں کا کرایہ

بھی آپ رکھ لیا کرنا۔ میں نے ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے۔"
 "تم بڑی امانت ہے بیٹی! سب کچھ نہ۔ جب آؤ گی انی امانت پوری پوری یاد رکھو۔" خالہ کی ہلکی سی جھجک گئی۔
 "میں جانتی ہوں تو تمہیں کسی طور نہ دیتی۔" نجائے تمہاری دادی کو اللہ نے اتنی مہلت کیوں نہ دی۔" ربیعہ نے اس کی سانس پکڑ کر کہا۔
 "خالہ! آپ کو یاد ہے کہ اندر مار لے۔"
 "نہیں! یہ بھی کہنے والی بات ہے۔" بھلا بتاؤ۔"
 "ربیعہ! یہ سچی بات ہے۔"

شائے ناہی مندرجہ بالا ہے ہاشم میاں کے لیے "شفیقہ حیات" نے قبیح روک کر پر خیال انداز میں بوسہ دیا۔ وہ ساری شہرت پوری کر رہی تھیں۔ یکدم غری تھیں۔
 "چچا! میں کوئی شہرت نہیں چاہتی۔" وہ بولی۔
 "عزیز! یہ تو ان کی بات ہے۔" وہ بولی۔
 "نہیں! یہ سچی بات ہے۔" وہ بولی۔
 "خالی! یہ سچی بات ہے۔" وہ بولی۔

"بھائی جان! کیا خیال ہے؟" عذرا بیگم پوچھا۔
 "کیا خبر؟" وہ بولی۔
 "عذرا! بیگم! یہ سچی بات ہے۔" وہ بولی۔
 "خالی! یہ سچی بات ہے۔" وہ بولی۔

کے گلے میں انہیں ڈال دیں۔
 "میں جانتی ہوں۔" تینوں میں آپ سب سے زیادہ مجھے جانتی ہیں۔ میں ناامی؟" منیوہ بیگم مسکرا دی تھیں۔ ان کی ہلکی سی ہنسی تھی۔



نفیسہ خالہ دم بخود بیٹھی تھیں۔ ربیعہ ان کے پاس ان کی طرح پتھر کا بتی بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آ گیا تھا۔
 "بھلا بتاؤ!" آخر کار خالہ نے ایک آنکھ مچھڑائی۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 "میں نے صبح فیصلہ کیا ہے نا خالہ جان؟" وہ متذبذب تھیں۔
 "نفیسہ خالہ! جب سے اس کا چہرہ دیکھی رہیں پھر انہوں نے اسے گلے لے لیا۔"
 "خدا! یہ کتنی اہم بات ہے! یہی وہی ہے۔" ایسے ٹھنڈے حوادلوں سے تو بیٹیاں بھلی۔
 "ہو بیٹی! اس لیے خاموش ہوں۔" وہ بولی۔
 "میں جانتی ہوں۔" وہ بولی۔
 "میں جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

"میں خالہ! یہی اور پتھر والا حساب ہے۔" ربیعہ نے نفیسہ کی سانس لی۔
 "نہ بیٹی! یہی اور پتھر کا تو پتھر بھی کوئی جوڑنا ہو۔" یہ تو قرب قیامت کی مثال ہوئی۔ بھلا بتاؤ۔ ان کا ہنسنا چلا تھا۔ وہ کچھ ضروری کر ڈالیں۔
 "آپ کی بات! میں گی خالہ؟" ربیعہ ہونے لگی۔
 "نہں! کوئی بیٹی۔" اللہ قسم میں نے تمہیں دل سے بیٹی سمجھا ہے۔" خالہ بولی۔
 "خالی! یہ سچی بات ہے۔" وہ بولی۔

"آپ! آپ!" ربیعہ کو کہنے میں تامل تھا۔
 "کوئی بات! یہ تو خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
 "آپ ہر کے لیے سمجھنا کار شہناک ہیں۔"
 "خالہ خاموش ہو گئی تھیں۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر وہی اس سے ان کا چہرہ دیکھا۔
 "کیا بات ہے خالہ! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟ آپ کو میری بات؟"
 "نہ بیٹی! یہ بات ہی نہیں تو میری کیوں لگے گی۔ لیکن ان حضرات کو یہ کہ لڑکی تھی ہی اچھی کیوں نہ ہو ہمیں نہ کہیں باپ پر مبنی ہوگی اور باپ تو ایسا ہے کہ پتھر لار کر آنکھ نکال دے اس کم بخت کی۔" اب نہ بھونکا۔ اولاد میں ماں باپ کا اثر تو آتا ہے نا۔

"میں نے تو سنا ہے۔" سمجھنا کہ ماں بہت اچھی عورت تھی۔
 "آہ! ہاں ہاں۔" وہ بولی۔
 "ربیعہ نے اپنے خیال سے نکل کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 "خالہ! سمجھنا کہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔" بچپن سے۔

”رافع والی بات بھولی نہیں ہے وہ۔“

”جانتی ہوں اس میں کیا راز کی بات۔“

”پھر بھی۔ اگر ہم کوشش کریں تو معاملات شاید پھر سنبھل سکیں۔ دیکھو بیٹی! نیک عورتیں ہمیشہ گھر جوڑنے کا ہی سوچتی ہیں، کیا میکہ، کیا سرال ہر رشتہ ناہنہ پڑتا ہے۔“

عذرا بیگم اچھی سی لگیں۔ انہوں نے ساس کا چہرہ دیکھا۔

”بات کیا ہے اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کہتی ہوں رافع کے لیے نہ سہی، نافع کے لیے مانگ لو عریشہ کو۔“ عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔ حقیقتہً حیات ان کو دکھ گئیں۔

”کیا کہتی ہو؟“

”اماں! وہ اب نہیں مانیں گی۔ بے وجہ ہماری زبان بھی خراب ہوگی اور جتنا بھرم ہے اتنا بھی جائے گا۔ باقی آپ کی مرضی۔“

وہ بے دلی سے بولیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ساس کا مشورہ قطعاً پسند نہ آیا تھا۔

”ارتے بیٹا۔ اچھ بڑھی کی کیا مرضی! آج سانس ہے کل کو نکل جائے گی۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ خاندان آپس میں جھگڑے رہیں تو اچھا ہے۔ اپنا لڑکا باہر پھانسی کو پھرتی ہیں، تم اپنے بیٹے کا کہیں نہ کہیں تو کروگی تو کیا ہی اچھا ہو بھائی بھائی! آج کل ایک دوسرے کا بوجھ پائے لیں۔“

عذرا بیگم کے سانس کی بات سچ معنوں میں سمجھ میں آئی تو ان کے چہرے کے زاویے بدلتے۔

”لیکن اماں! ہم نافع کے لیے عریشہ کو مانگ لیں تو کتنا ضرور ہے کہ وہ بھی ہارشم کے لیے ہماری لڑکی مانگیں؟“

”سوچیں گی تو ضرور! میں یقین تھا۔“

”اور جو نہ سوچا۔“

”تو کیا ہوا ان کی سوچ ان کے ساتھ ہمیں کوئی لالچ تو نہیں۔“ تب ہی عذرا بیگم رافع سے دھکیلا اترتا چلا آیا تھا۔

URDU PHOTO

”امی جی! امیری شرت اس کے حلالیں لگائیں دوں گی۔“

”وہ بڑی ہے ذرا سی رہتی ہے کرنے کو۔“

”ہائیں یعنی میٹنگ! ہم ہے۔ شرت ادھوری چھوڑ دی آپ نے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”بائی داوے ہاٹ ٹاپ کیا ہے؟“

وہ دونوں مسکرانے لگی تھیں۔

”اماں کا خیال ہے، نافع کے لیے عریشہ کا رشتہ مانگا جائے۔“ انہوں نے بڑے بیٹے سے بھی تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

”اوہ خالصتاً زنانہ موضوع۔“ وہ بے نیازی سے شرت پر استری پھیرنے لگا۔

”پھر بھی کچھ رائے تو دو۔“ حقیقتہً حیات نے بھی کہا۔

”میں کیا رائے دوں وادی! وہ ہنس دیا تھا۔“ رائے تو صاحب الرائے سے مانگیے! اس کا اشارہ نافع کی طرف تھا۔

”عریشہ اچھی لڑکی ہے نا۔“

”ارے وادی! لڑکیاں سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔“ وہ شرت نہیں کر بیٹن بند کرنے لگا۔

”پھر تم نے انکار کیوں کیا تھا؟“ انہوں نے اسے چھیڑا۔

”لیجئے۔ میرا ذکر کیوں نکال بیٹھیں۔ رات گئی بات آئی ہی! میں ذرا طفیل کے گھر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے گی
 اچھا اللہ حافظ! وہ سہی کی دھن، از سر نو ناز کر لیا ہر نگل کیا۔
 ”ان لوگوں کے لئے تو ان کی دوستیاں اہم ہیں۔ گھلو معاملات اہم نہیں۔“ شفیقہ حیات خفا ہوئیں۔
 ”اہم ہے اس کی ایسی ہی دوستی ہے یہ چاہے تو اس سے بات کر سکتا ہے؟“
 ”نہاں! ابھی نہیں ہاتھ دے گا۔ پھر اچھا چاہی میں لگتا۔“ غدار بیگم نے فوراً ”ان کا خیال مستز کر دیا۔
 ”پھر کوئی فردوس بیگم کے کان میں بات ڈالوں۔“ انہوں نے بات کا تصفیہ کرنا چاہا۔
 ”کر دیکھیے۔“ وہ دیر سے بولی تھیں۔

شہلا نے اس کا پیلی چپک کر کے اپریش بند کیا۔
 ”بہت اولڈز بفر ہے۔ کیا بات ہے؟ نکھانا بیانا بند ہے کیا؟“
 ”کچھ حلق سے اترے تو نکھائیں نا۔“ وہ دیر زاری سے بولی ”نوکھائی ہوئی کسی دقت حلق سے ہیں آج آج!“
 ”برای بات ہے ایقان۔! تم خود کو شش نہیں کرو گی تو آسان سے فرشتے ہیں۔“ انہوں نے سن ڈسٹوبی کے قتال
 لے کر
 ”میں بھی تو یہی سمجھتی ہوں۔“ رابعہ خاتون پولیس ”یہ کسی کی کب سنتی ہے۔ پچھلے ہفتے سے برابر فون کر کے
 بلا رہی ہوں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی۔ کل میں علی کو لے کر گئے چلی گئی۔ وہ کھاتو تقریاً بے
 ہوش پڑی تھی۔ بچوں کی الگ حالت خراب تھی۔ ماں بھیک نہ ہو تو چوڑا کھانہ پوچھ گئے۔ اسے اتنا بھی لگا تھا۔
 نہیں۔“
 ”ڈانٹ لیجئے آپ بھی! وہ ہوئے سے مسکرا دی“ میری سائیڈ کون لے گا؟“
 شہلا نے اسے دوسری کو لیاں لکھ دی تھیں۔
 ”میں اب جاتی ہوں۔“ بیگم ہسپتال بھی جانا ہے۔ تم اپنا خیال رکھو ایقان! تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت
 ہے۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر نہیں توجہ دو۔ اس نے بھی ایمان کا گلاب بیجئے ہوئے لگے۔
 ”عمر کیسا ہے؟“ ایقان نے پوچھا۔
 ”ہوں! اچھا ہے۔“ وہ مسکرا دی ”آج کل عباد کے آگے بیچے پھر رہا ہے۔“
 ”ماموں کا تو دوبارہ ہے۔“ رابعہ بیگم نے بیگم کو کہا۔
 ”ماموں بھی تو اب ہے۔“ بیگم بیگم بیگم لگائی تھی۔ وردہ کو فہمی آگئی۔
 ”کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟“ شہلا نے اس کے لیے ان تک جلی آئی تھی۔
 ”کچھ نہیں شہلا بانی! وہ گڑبڑ کر رہی ہیں۔“
 ”چلو نہیں ہانا تو نہ سہی۔“ مسکرائی ”اچھا بھی! خدا حافظ“
 ”مٹی رہنا شہلا! ایقان ہوئے سے بولی رابعہ بیگم شہلا کا لکھا ہوا نسخہ دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں رافع سے منگو لیتی ہوں دو لائیں۔“ وہ بولیں ”دیکھا حال کر لیا ہے اس لڑکی نے اپنا“
 ایقان نے انہیں ہند کر کے سر تک سے نکالا تھا۔ آنکھوں میں کسی کی مسکرائی صورت پھرے گئی تھی۔
 ”آئی مس یوسن۔ آئی مس یو عاشر! اس کی مندی گلاب میں پانی بھرے لگا۔“

”نہیں۔ میں تو بہت پر پووائے ہوں۔“ ڈراتو نہیں ہوں کسی سے۔“ وہ فون کے تار سے کھیل رہا تھا۔ اس
 کے قریب بیٹھ کر نوٹس ہائی انقیقہ کے احساسات کے سب تار جھنجھٹا رہے تھے۔ وہ مارے صفحے پر بجائے کیا لکھے
 جا رہی تھی۔
 ”خالہ جانی کتنی ہیں“ صرف اللہ میاں سے ڈرتے ہیں۔ بیعت اور پڑھیں تو ہوتے ہی نہیں ہیں۔ سب
 جھوٹ ہے۔“
 ”منیزہ دیکر بظاہر رسالہ دیکھنے میں مشغول تھیں لیکن ان کا دھیان اس کے لفظ لفظ میں الجھ الجھ کر نکلتا تھا۔
 ”میرے بابا؟ وہ تو ہی نہیں۔“ پتا نہیں کہاں ہیں۔ ماما سے پوچھو تو وہ کہتی ہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ انقیقہ
 نے جھنجھلا کر قلم چٹا اور خشکی سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئیں۔

”سب بچوں کے بپا آتے ہیں پیرنس بینک میں“ میری تو صرف ماما ہوتی ہیں۔ میرا دوست ہے ناکہ! اس کے
 پپا نہیں آتے کیونکہ وہ اللہ میاں کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ شاید میرے پپا بھی اللہ میاں کے پاس گئے ہوں۔“
 ”عمر! اس بیٹا۔ اب انکل کو خدا حافظ کہہ دو۔“ انقیقہ نے آہستہ سے کہا۔ اس نے ریمپور کان سے ہٹا کر
 خالی کر دیا۔

”میں نے کہا تو انکل سے۔“

”آپ کیسے ہیں جا رہے راجہ کے ساتھ؟“
 ”نہیں! اس نے سبے نیازی سے جواب دے کر پھر ریمپور کان سے لگا لیا۔
 ”ماں! میں خالہ جانی۔“ یہ ایسے ہی مجھ سے لڑائیاں کرتی رہتی ہیں۔ ماما جیسی؟ نہیں ماما تو لڑائیاں نہیں
 کر لیتی۔ آپ کے کون سے
 ”اچھا جی جگہ۔“ میری اور سہی نے عمر سے ریمپور جیت کر واپس کر دیا۔
 ”بیگم! اس نے پوچھا۔ ”کافی ہے اتنا؟“
 ”عمر خفائی اور فوری سے ہنسا۔ ”میں نے کہا تھا کہ کافی ہے۔“

”آپ کا فرم کیا ہے؟“ ایقان نے پوچھا۔
 ”انقیقہ! منیزہ بیگم نے اسے سر ڈس کی۔ ”پچھتے کیوں الجھ رہی ہو؟“
 ”میں تو باب کا داغ بھی ٹھیک کر دیں ماما۔ لیکن شہلا اپنی کی وجہ سے چپ ہوں۔“
 ”وہ با شعور سمجھ دار ہے۔“ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ باتیں کرتے ہیں۔ وہ راسیت سے بولیں۔
 ”اسنے ایسے انکل ہیں۔“ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ باتیں کرتے ہیں۔ وہ راسیت سے بولیں۔
 ”میں نے بالکل اچھی خالہ نہیں ہیں آپ!“ وہ منہ بسور رہا تھا۔

”اچھا جانی۔“ انقیقہ کا قہقہہ اس کا منہ دیکھ کر فرو ہو گیا۔ ”آپ تو بہت پیارے بھانجے ہو نا میرے۔ آپ اچھی
 لڑکی باتیں کرنا ہیں خالہ سے“ گندری خالہ سے
 ”وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا منہ چوسنے لگی۔
 ”اچھا! مرتبہ جب عباد ماموں آئیں گے نا۔ میں ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا لاہور۔ پھر آپ مجھے یاد کیا کریں
 گی۔“

”آپ بھی مجھے یاد کریں گے جب میں چلی جاؤں گی۔“ وہ مزے سے بولی۔
 ”آپ؟“ وہ الجھ کر بولا۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”سرکار! وہ شہر کر بولی۔
 ”بد تیز!“ منیدہ بیگم کو ہنسی آگئی تھی۔ ”بچے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی ہے۔“

”اے ہور؟“ سمیعہ کی چیخ نکل گئی تھی۔ ”کیوں۔۔۔ کس کے پاس۔۔۔ وہاں کون ہے تمہارا؟“

”میری پیچھو کا گھر ہے وہاں۔“ وہ آہستہ کی آہستہ بولی۔

”لیکن تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ شائد گئی۔ ”ایسے اچانک۔۔۔ چوروں کی طرح۔“
 ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”اے! جب چور ڈاکو سیدناں کر چلے گئیں، دھڑلے سے پھرس تو شریف لوگ یونہی خاموشی سے رہیں۔“
 کی طرح اپنے کام کرتے ہیں۔“

نفیسہ خالہ بتا کر بولی تھیں۔ سمیعہ کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔

”چلو جی۔۔۔ اوقت کہے۔۔۔ انہوں نے اس کا ٹرک سنبھالا۔“

ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر گھڑی ہو گئی۔

”ربیعہ۔۔۔ تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ سمیعہ کو بے حد جھنجھٹ۔ ”اب جاتے جاتے کہہ دی ہو۔۔۔ کس دل سے رخصت کروں تمہیں؟“

”ربیعہ اس کے گلے کی لگ کر رو دی۔

”مجھے معاف کرو۔“ سمیعہ۔۔۔ امیری کی بچھو مجبوریاں تھیں۔ یہ بات میں خود سے جی پھپھاری تھی۔“

سمیعہ بھی ڈارو رفتار رو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں کی طرح تھیں۔

”اب کہاں قات ہوگی؟“

”اللہ کو علم!“ وہ مختصراً بولی۔ ”ہمارا کوٹھے میرے اپنے بل جائیں۔“

اسی لمحے سکندر اندر داخل ہوا۔

”ہاں رکھ آگیا ہے۔“

ربیعہ سمیعہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ نفیسہ خالہ نے دروازے کو لگا ڈال کر چابی اپنے کپڑے میں

اڑس لی تھی۔ ربیعہ نے رکشہ میں بیٹھ کر دھنلائی ہوئی آنکھوں سے اپنا کھرو کھا۔

”ربیعہ۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ ربیعہ! یہاں سے جاؤ!“

اسے رکشے کے شور میں واوی کی آواز آرہی تھی۔ آس پاس کے گاہلوں پر دوانی سے ہمدردی تھی۔

ریل کے پہیوں کی چٹکھاؤ اس کے دل میں سوراخ کر رہی تھی۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔

”خالہ! آپ نے اس سے تیرا بیچ بچا تھا نا؟“ اس نے آخری مرتبہ پوچھا۔

”اے ہاں جی۔۔۔ اے ٹرک رو۔۔۔ تار بچ گیا ہو گا۔ تم اطمینان سے سفر کرنا۔“ میں نے کٹک بھی منگنے والے ڈبے

کالیا ہے۔ اس میں اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے فکر ہو کر اٹھ کر بھروسہ کر کے جاؤ۔“

وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ مجھے بہت یاد آؤں گی خالہ۔“

”تو کیا میں نہ یاد کروں گی تمہیں۔“ وہ گلو کیسرے لہجے میں بولیں۔ ”بھلا بتاؤ!“

”میرے گھر کا خیال رکھنا خالہ! وہاں واوی کی رو رہتی ہے۔“

”جتناس میں ہوئے گا جی! بعد ان بے حس انسانوں کو رسوا کرے گا۔۔۔ جی کو اپنے گھر سے بے گھر ہونے پر

مجبور کر دیا خالہ نے۔ ایسی اندر جگر گری جسے دیکھو وہی دانت کاڑے بیٹھا ہے۔ بھلا بتاؤ۔“ وہ دکھ سے چور ہو رہی

تھیں۔

”میں خط لکھوں گی آپ کو۔“

”کوئی پریشانی ہو تو لوٹ آنا جی۔۔۔ آخر میں تو وہوں تا یہاں۔“

”وہاں کرنا خالہ! کوئی پریشانی نہ ہو۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ کو غور سے دیکھا۔

گاڑی میں بیٹھے اسٹیشن پر کی تھی۔ عبادی فینڈ ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر رہتے سے نیچے آگیا۔ تھرموس سے پانی

نکال کر پینے لگا۔ یہاں سے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”وہاں آؤ! اس کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی۔ وہاں پان سی وہ لڑکی سر تا پایا سیاہ چادر میں لپی ہوئی تھی۔ صرف اس کا

چہرہ اور ہاتھ چادر سے باہر تھا۔

”اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی مصویت تھی۔“

”جواب آلود سیاہ آنکھیں ایک بار اس کی آنکھوں سے

عبادی کی طرف اٹکی۔

”اس کے منہ پر مسکرائش کی پھر وہ باکام ہو گئیں۔“

”یقیناً وہ ہم سفر تو کراچی سے ہی اس کے ساتھ تھی۔“

”وہ لڑکی شاید اسی چھوٹے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ وہ تھا تھی۔ اس کے انداز میں نامحسوس سی

آواز سنائی دیتی تھی۔

”آپ اس کی ایک گود میں رکھو۔ نظریں جھکا کر بیٹھی تھی۔“

”آپ کہاں ہیں؟“ وہ تجھے کیوں اسے مخاطب کیے بغیر نہ سکا۔

”جی! اس نے خوف زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔“ جی جی ہاں! عبادی زری سے مسکرایا۔

”گوئی بات نہیں۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

”اے ہور۔“ اس نے تھوک نکلا۔

”میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”چلیں سفر خوشوار ہو گا! میرا نام عباد ہے۔ آپ کا؟“

”ربیعہ۔“ وہ دیر سے بولی۔

اس کے وہ دیکھیں بے پناہ شش تھی۔ عباد اسے دیکھ گیا۔

”میرا مسئلہ؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ ”یہی تو میرا مسئلہ ہے یا راکہ کبھی مجھے تم پر رشک اور ڈاکٹر شملہ پر سخت
نفس آتا ہے۔ دس ازرا پاؤں کش۔“
”اس کے سبب تو مجھے میں نے بنا۔“ مجید کی تھکن۔ رافع بھی سنبھل گیا۔
”تو وضاحت کرو۔“ پہلی بار اس نے غم کو مجید کی دیکھا۔
”جو تم سب کو رافع! کاش میں بھی تمہاری طرح ہو۔ زندگی کو میں نے اسی نظر سے دیکھا ہوتا جس نگاہ سے اسے
تم دیکھتے ہو۔ چند مخصوص قسم کے مقاصد پر چلتا ہے، اچھی تو کوری کئی ہے، ال باپ کی پسند سے شادی کر کے بچے
پیدا کر کے ہیں ان کو بڑا کر کے ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ اللہ اللہ خرما۔ ذہن میں دھند نہیں بھرتی، آنکھوں میں
خواب نہیں ہے۔ سوچوں میں تلاطم برپا نہیں ہوتا، جذبول میں سمور نہیں پڑتے سب کچھ صاف سیدھا غائب
کے بندے ہو یا رافع! اچھے تم یہ بھی بہت رشک آتا ہے۔“
”یہ کبھی کبھی کی تکرار کرتی ہے کہ بہت کچھ میں افسوس بھی ہے۔“ رافع نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔
”ہاں۔ بس، بس، بس، مجھے تمہارا دو جو بہ مقصد بھی تو لگتا ہے۔“ وہ ساڈل سے ہولا۔

رافع ہنس دیا۔ ”وضاحت کرو۔“
”یابہ۔ کوئی فرق ہو تیل میں اور بندے میں آنکھوں پر پڑی ہند بھی ہے۔ کوئی گول گول ہے۔ کوئی آؤی لہو
رسیاں تڑوا کر بھانگے۔“ ایلین کس بھی کبھی محبت میں نہ کرنا اور ایلین کر کے محبت انسان اپنی پسند سے کرنا
ہے مقدر اللہ تعالیٰ اپنی پسند سے لکھتا ہے۔ جو بھی Clash ہو جائے تو برا نقصان ہوتا ہے بندے کا۔“
رافع مری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ بے دیرت کا کھرا، بھرا، روٹھا روٹھا انداز سے اوجھلا چھانک رہا تھا۔
”اور تم مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو میاں راجے! کہ میرا بھی جی چاہ رہا ہے کسی کو چاہ دیکھنے کا۔“ اس نے جی

جی میں سوچا۔
”اچھا! مجھ کو کھنکھار کر ہولا۔“ اور ڈاکٹر صاحبہ پر کس بات کا غصہ آتا ہے؟
”بشمیر چننوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ رافع نے اس کی آنکھوں میں دھنک سی اترتی دیکھی۔ غالباً یہ محبوب
کے تصور کا مکمل تھا۔
”سو ہونا اس پر غصہ کیوں آتا ہے؟“ وہ مسکرا ہٹ دیا تے ہوئے ہلا۔
”کبھی اس نے دیکھا ہی نہیں میری طرف اتنے اتنے نے سب کچھ میں میں۔“

خود کو سے ہولا۔
”محبت کی تو نہیں ہے یا ہم! لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت کبھی بھی قیمت کی محتاج نہیں ہوتی۔ انمول شے کا
مول کوئی دے سکتا ہے؟ چاہو مگر چاہے جانے کی قربانیت کرو، یہی اصل بنیاد ہے محبت کی۔ جو دام ہائے
کیسا آتش؟“
ہاتھ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

ہاں مگر کوئی تمنا پس واماں وفا
مجھ سے پوشیدہ میرے پیش نظر ہوتی ہے
”محبت کا رنگا رنگ بات ہے شادی کر کے گھر مانا الگ معاملہ ہے۔ ان دونوں کو جوڑتے کیوں ہو؟“
”واہ! ہاتھ نے چمک کر اسے دیکھا۔ ”میاں ابھی گھی نہیں ہے تمہیں دھا کر نہ لگے۔ دو دھ کا دو دھ اور پانی کا
پانی ہو جائے گا۔ محبت کر کے تو انسان خدا بنائے کی تمنا کرتے لگتا ہے۔ وہ محبت کیا جو صلہ نہ لگے۔“

”مجھ کو محبت نہیں ہے۔“ رافع اطمینان سے ہولا۔
”چھوہ کیا ہے؟“
”قرب کی خواہش۔“
”کسی سے قرب کی خواہش کیوں بیدار ہوتی ہے؟ کس جذبے کے تحت؟“
”سمور کے قرب کی خواہش مرنے کو نہیں مگر جی ہے اس لیے۔“
”ہاں شادی بھی عورت سے کام چل سکتا ہے؟“
”ہاں شادی کر کے دیکھ لو بھول جاؤ گے سب کچھ۔“
”ہاتھ جھکے اسے بے یقینی سے دیکھ رہا۔
”تم سنجیدہ ہو؟ یہ خیالات واقعی تمہارے ہیں؟“
”آپ کو رس ہنڈر ڈپر سینٹ۔“

”محبت خواہ کس سے ہونے شادی کر کے اور سے کر کے آدمی ہر بات بھول سکتا ہے؟“
”راہ تو یہی خیال ہے۔“ رافع نے کانٹے کا سیرے اچکا۔ ”بھلا اللہ ہاتھوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“
”شما سے دیکھا کہ آپ اس کی نگاہوں میں کھلی تھی۔
”آپ کے رافع! اتھس بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“
رافع پورے ہنس دیا۔

”ان کیوں میں تیل نہیں۔“ وہ ہولا۔ ”یہ دعا دینے کا شکر ہے!“
”مجھ کو ہوں۔“ ”کونسا؟“ ”یہ دعا دینے کا شکر ہے!“
”آپ کی کس کیوں میں چمک لرائی۔“ میں نے سر حال تھیں ایک مٹی سے مشون دیا ہے۔
”ہاں۔ بہت سے تو دنیا سے بغاوت کرلو
اور وہاں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو
”تینکس!“ وہ سارے سے سارے نقل کیا۔

URDU PHOTO

جھانے تھی ورنہ بعد اسے بھوک نے ستایا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے نوجوان پر ڈالی۔ وہ
آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ جھانے تھک گیا تھا یا سو گیا تھا۔
بڑے میاں پر توجہ پر سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ان کی بیگم متوجہ کرتے ہوئے اوگھ رہی تھیں۔
رہی ہے اپنا چمکاس کھولا۔ نفیسہ خالہ نے بڑے اہتمام سے اس کا کھانا تیار کیا تھا۔ ہلنی چھلی، کشای
کباب، ڈیلٹ اور پراگھے ساتھ میں ان کا وہی مزیدار چارچا تھا۔ جو بیوہ سے پسند تھا۔ ہر رشتے میں ان کی
محبت متک رہی تھی۔
”بڑیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ کیا کس کھول کر وہ جھانے کس بیٹے ہوئے لمبے میں جا چکی تھی۔
”آپ! دعا لکھنا اور۔“
”فوفو بھگ! شکی جلدی جلدی اس نے اپنے سیاہ پوسے اپنی آنکھوں کو گھرا اور یوں اپنا کھانا دکانے لگی جیسے
کوئی بات نہ ہو۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت بے مروت ہیں آپ!“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”جی؟“ اس نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

”انتہا سارا کھانا باندھ لائی ہیں اور آنتا بھی لحاظ نہیں کہ کسی ہم سفر کو جھوٹے منہ ہی پوچھ لیں۔“

”وہ!“ اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”وہ اصل میں مجھے۔“ اس سے بات نہ بنائی گئی۔

”بھوک بہت لگی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کا ادھر اور اجلہ مکمل کر دیا۔

ربیعہ ہنس دی۔

”مجھے ناپکچھ۔“ اس نے خالی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں، بہت کچھ لوں گا۔“ اس نے بے تکلفی سے پلیٹ تھام لی۔ ”لیکن ذرا ٹھہریے۔ غالباً“ میری امی جی

نے بھی کچھ زاد راہ ہمراہ کیا ہے۔“

اس نے اٹھ کر اپنا فن نکالا۔ اندر مزید ارجائیز راس اور فرائیڈ چکن تھے۔

”واؤ۔“ عباد بے اختیار بولا۔ ”جیسی رہے ہاں میری۔ دیکھا آپ نے ربیعہ! ماؤں کو اپنے بچوں کی پسند ناپسند کا

کتنا خیال ہوتا ہے؟ غالباً“ آپ کی امی نے بھی ساری چیزیں آپ کی پسند کے مطابق بنائی ہیں۔ ہے نا؟“

ربیعہ نے نظراٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”میری امی کا انتقال پہلے چھلے سے تھا۔“ وہ رستائیت سے بولی۔

عباد کی جلتی آنکھوں کی جوت ایک دم بڑھ گئی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“

ربیعہ نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا پھر دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

”کھانا بہت مزیدار ہے۔ کس نے پکایا ہے؟“ عباد کو کھانا بے حد پسند تھا۔

”میری خالہ نے۔“

”آپ یہ چاول میں نا۔ اس میں ہاں لے ہاتھوں کی خوشبو ہے۔“

ربیعہ نے فن تھام لیا۔

چاول واقعی بے حد لذیذ پکے ہوئے تھے۔ ربیعہ نے اس طرح کے پکے ہوئے چاول پہلی مرتبہ کھائے تھے۔ وہ

شوق سے کھاتی گئی۔

”آپ کس کے پاس جا رہی ہیں لاہور؟“ عباد نشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اپنی پیچھو کے گھر۔“ وہ چیزیں سمجھنے لگی۔

”کہاں ہے آپ کی پیچھو کا گھر؟“

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذہن میں لکھا ہوا پتہ دہرائے کی کوشش کی اور قدرے کامیاب ہوئی۔

”باغبان پورہ۔“

”اچھا! میرا ایک دوست وہیں رہتا ہے۔“ عباد کو خوشی ہوئی۔

”آپ!“ ربیعہ نے نگاہیں اٹھا کر اس کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔ ”آپ کس کے پاس جا رہے ہیں؟“

”میں پڑھتا ہوں وہاں۔ بزنس ایڈ منسٹریشن میں ماسٹر کر رہا ہوں سہائش میں رہتا ہوں۔“

”آپ رخصتی ہیں؟“
”میں نے رخصتی نہیں کیا ہے۔ اب اسٹراڈ کا ارادہ ہے۔“
”جناب یونیورسٹی سے؟“
”شاید“ چند لمحوں کے بعد اس نے مختصراً کہا۔



عذرا بیگم نے ماتے لائے گا جس نکال کر مشین کا لنگ بکلا اور جس گلاس میں اینڈ پلے لگتیں۔
”بھائی جان! ذرا سانس نکال اور کالی مرچ ملا دیں۔“ اسٹول پر بیٹا روبرو سی بیٹھی ایتقان نے کہا۔
”ہاں ہاں۔ ملائے دیں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ”وہیے تمکے دست کاری ہو تم۔“
وہ گلسٹندی سے بیٹھی آ رہی۔ عذرا بیگم نے جس میں اس کے حسب خواہش اشیاء چلا کر گلاس سے تھما دیا۔
”مومن آیا نہیں اب تک؟“
”نہیں۔“ شہلا کے بیٹے سے خوب گاڑھی چھتی ہے اس کی۔ پہلے اس میں دوستانہ تعاقب اور آواز دہرائی۔
پھر چل رہی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ایتقان کے لیوں پر بھی مسکرا ہٹ چلی آئی۔
”یارے بھائی جان! تو میں شہلا کے کھر میں ہوئی تھی یا شہلا ہاں اسنو خود ہوئی۔“ شہلا نے عذر ووقت گزارنے کا
تو تصور کیا تھا ہمارے پاس۔“
”ہاں تو کیا بھول گئی ہوئی؟“ امتحان تم لوگوں کے ہوتے تھے شامت میری آجاتی تھی۔ کبھی کرے میں کھا کا
منگوا یا جا رہا ہے، کبھی چائے کبھی ٹھنڈا پائام اور داغ بھی مل جاتے تھے تم لوگوں کے ساتھ۔“
ایتقان ہنس رہی۔

”ہاں۔“ وہ پھر قدوبے سجدہ ہو گئی۔
”گاہوں کے سامنے سے کئی منظر کے بعد دیکرے گزر گئے تھے۔“
”یہ ہاتھ کے کے سامنے جانے کوئی لڑکی پسند نہیں کی اب تک؟“
”انڈ جانے کہاں جاتا ہے؟ کارا را رخصتی ہیں۔“ سنا ہے مایاں اپنی۔
”ہے۔“ وہ جھوٹے برتن سک میں جمع کرنے لگیں۔
”جھٹلا“ ایتقان بچھ سوچنے لگی۔ ”ہاتھ تو کیا ہوتا ہے؟“
”اس کو کیا کہنا ہے غریب نے۔ جمال ماں سے کہی ہوئے گا۔“ وہ ساواگی سے بولیں۔
”اتنا بھی غریب نہیں ہے۔“ وہ طنزاً بولی۔

”اے بڑی زور آور ماں ہے اس کی۔ وہیں کرے گی جہاں اس کے جی میں آئے گا۔“ شفیقہ حیات نے ان کی
حقیقتگوں کی بھی۔ سوہ بھی وہیں چلی آئیں۔
”میں تو عذرا سے کہتی ہوں ان کی چھوٹی کو اپنے چھوٹے کے لیے مانگ لو۔ شاید ان کے جی میں بھی یہی آجائے
تو وہ بھی کچھ شیش قدرتی کریں۔ مجھے تو باغی اٹھنا لگتا ہے، جی کہتا ہے کھر کا بچہ یا ہر کیوں جائے آخر کھر کی بچیاں
بھی تو ہیں۔“
”غرض کہ کوئی مانع کے لیے؟“ ایتقان بولی۔ ”ناٹ آئیڈ آئیڈ۔“
عذرا بیگم پر زور دھو کر ان کی جگہوں پر رکھنے لگیں۔

”بھئی میں تو مانع سے پوچھ کر ہی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ جوان بچہ ہے۔ آخرا اس کی بھی کوئی پسند پائند ہوگی۔“
”ہاں ہاں کہیں نہیں۔ جو بھی کرو اور کولی رضا مندی سے کرو۔ لیکن عریشہ میں کوئی خرابی تو نہیں جو وہ انکار
کرے۔ خوبصورت ہے کم سن ہے، پڑھی لکھی، شائستہ بچی ہے۔ آج کل کے لڑکے تو یہی دیکھ دیکھتے ہیں۔ پھر
فردوس بیگم کے گلے شکوے کئی بار ہو جائیں گے۔“
ایتقان گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

اسی لمحے سردار ددوئی آئی۔
”اچھ بھو جان! آپ کے ماسا جی کا فون ہے۔“
ایتقان کا سسٹی سے بھر پور رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ وہ جوس کا گلاس ورتیں رکھ کر فائنٹ دوڑ گئی۔
”آئے ہائے بچی! رازدار! سمجھنا کہ شفیقہ حیات نے اسے تو کا۔“ یوں بھگا رہی ہے جیسے۔ ”یقیناً جملہ امینوں
نے لیوں میں ہی رہا لیا۔“
”ہیلنہ“ اس نے فون کا ریسپونڈ کیا۔ ”السلامو علیکم“
”ہاں ایسی تھی کہ ذرا سا تیر چلنے سے سانس بے قابو ہو رہا تھا۔“
”و علیکم السلام۔“ خیریت تو ہے۔ آخر مریاں کو تو نہیں دیکھ لیا؟“ وہ شرارتاً بولا۔
”اؤ فوہ۔“ ”جھٹلا“ ای توئی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات نہ سو بھی آپ کو؟ اسے دن بعد فون کیا ہے، وہ بھی الٹی
جہاں بول کے لیے۔“

”سوسلی فارام! سوری۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ ”بہندہ معذرت خواہ ہے آپ کا قصور گزرا رہا ہے۔ پر خیر یہ تو
بھائی کے لیے ہے۔“
”اے سوسلی! تم نے وہ فون کس سے پڑا۔“
”بھئی! ان کا؟“
”بہت اچھا ہے۔“ اس نے مسکرا ہٹ دیا۔

”اے سوسلی! تم نے وہ فون کس سے پڑا۔“ وہ بھی ہنس رہا۔ ”یہ تو میرا خواب میں دیکھتے ہیں۔“
”کیا یہ؟“ وہ سوسلی کی طرف سے کھینچنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں
”تم نے میں تمام کھنچا ہے جو خوابوں میں آئی ہے۔ تم ہو تیں تو کیا تمہیں خبر نہ ہوتی۔“
”آپ کا کام تو ہر شے کے بھی ذہن رہا ہے۔ آپ کو کسی کی کیا پروا۔“ وہ چڑچی۔
”نہیں! اب ایسا بھی نہیں۔“ کاہن میں رہا سچا رہا ہے۔ ”وہ شرارتاً بولا۔
”چلا تے رہیے۔“ اس نے برا سامنے نکالا۔ ”ویسے روز خوابوں میں انکھر دیکھتے تو کم از کم میرے حال کی خبر تو
ہوتی۔“

”اوہ۔“ بھی کیا، وہ حال کو؟ خیر تو ہے؟“ وہ تشویش سے بولا۔ ”آواز سے بھی مر جھائی لگ رہی ہو۔ بخلا
ہے کیا؟“
”اول ہوں۔“
”پھر کیا ہوا ہے؟“ وہ فکر مند ہوا۔
”اے سوسلی! تم نے۔“
”ابھی تو مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ وہ معنی خیزی سے بولی۔ اس کے اوصاف سے جملے میں بہت کچھ تھا۔

وہ چند لمبے خاموش رہا پھر اچھل پڑا۔
 ”رنگیل! اتنا آریو شیور؟“ اس کی آواز میں خوشی تھی۔
 ”ہاں۔“

”گڈ نیوز جانو! میرا جی چاہ رہا ہے اور کچھ بچہ جیوں تم تک۔“
 ”ایقان خاموش ہو گئی۔ اس کا دل لڑکائی ہی افسوس کی بھر گیا۔
 ”میرا تو تجھے کب سے یہی جی چاہ رہا ہے افسوس! لیکن محض جی کے چاہنے سے کیا ہو گا ہے۔“ اس نے سوچا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔“ دوسری جانب سے وہ پکارنے لگا۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں، خیریت ہے۔“ وہ بولی۔

”بچے یاد کرتے ہیں مجھے؟“

”ایقان چپ رہی۔ بچے اس کے ہناؤ پر ہنسے گا ہی تھے۔ پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔

”ہاں۔ بہت یاد کرتے ہیں۔“

”اور تم؟“

”وہ محض ہنس دی۔

”اسی کے لائن ڈس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے گہری سانس بھر کر دیکھا کہ اس کی طبیعت پر پھر وہی
 سنی صلابت آ رہی تھی۔

آنکھوں پر سے سن گا سنا کر اس نے متلاشی نگاہوں سے اسے کھوجا۔ پھر وہ اسے دکھائی دے گیا۔ گراؤنڈ
 میں کھینچے ہوئے ست سے بچوں میں وہ اسے دوسرے ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ بچوں جیسا تھا۔ انہی کا ہم عمر تھا۔ انہی کی
 طرح اسکول ڈریس میں بدوس۔ لیکن شملہ کو وہ سب میں منفرد لگا۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔

PHOTO

”اچھا! نہ کھانا کھا کر بیس دی۔“ کوئی خاص وجہ؟“
 ”بہت کتنے ہیں تمہاری مہارت پیاری ہیں۔ بیٹی فلی ہیں۔“
 ”اوب۔“ وہ اتر آئی۔ ”خیر یہ تو ہے۔“

”کیون۔“ وہ کچھ الجھا۔ ”ایک رات ملے رہا تھا۔“

”وہ کیا؟“ اس نے سرگرم ہرے ہاتھ ہاتھ کر اسے دیکھا۔

”نہیں سب کیس بھیا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف مہا ہیں۔“

شملہ نے گہری سانس بھر کر اپنا درحیان نرنگ کی جانب مرکوز کیا اس نے عمر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ

کس اکھیں سے ناں کا چہرہ دیکھا تھا۔

”مہا! اس سے کچھ دیر بعد پکا۔“

”ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”بہترے کوئی بھیا بھی تھے؟“

”جودو۔ اتنا سوال پر اسے بے طرح ہنسی آئی۔

”نہیں تو آپ ذہنیت میں آگے ہوئے تھے۔ میں تو ڈولی۔“ ہنسی پر بخشل قابو پا کر اس نے کہا۔

”بہترے پر اسے ہنسنا کر اسے دیکھا۔

”اس کے اسٹوڈنٹس مہا! وہ فکلی سے بولا۔

”کی پور رسلٹ عمر! شملہ نے سنجیدہ ہو کر اسے تنبیہ کی۔

”مہا! لیکن آپ مجھے کچھ بتائی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ فوج ہوا۔

”بہترے کوئی بھیا بھی تھے؟“ اس نے سرگرم ہرے ہاتھ ہاتھ کر اسے دیکھا۔

”نہیں سب کیس بھیا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف مہا ہیں۔“

شملہ نے گہری سانس بھر کر اپنا درحیان نرنگ کی جانب مرکوز کیا اس نے عمر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ

کس اکھیں سے ناں کا چہرہ دیکھا تھا۔

”مہا! اس سے کچھ دیر بعد پکا۔“

”ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”بہترے کوئی بھیا بھی تھے؟“

”جودو۔ اتنا سوال پر اسے بے طرح ہنسی آئی۔

”نہیں تو آپ ذہنیت میں آگے ہوئے تھے۔ میں تو ڈولی۔“ ہنسی پر بخشل قابو پا کر اس نے کہا۔

”بہترے پر اسے ہنسنا کر اسے دیکھا۔

”اس کے اسٹوڈنٹس مہا! وہ فکلی سے بولا۔

”کی پور رسلٹ عمر! شملہ نے سنجیدہ ہو کر اسے تنبیہ کی۔

”مہا! لیکن آپ مجھے کچھ بتائی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ فوج ہوا۔

”بہترے کوئی بھیا بھی تھے؟“ اس نے سرگرم ہرے ہاتھ ہاتھ کر اسے دیکھا۔

”نہیں سب کیس بھیا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف مہا ہیں۔“

”ہاں، یہ پھر؟“ اس نے مجبوراً کہا۔

”جس کے مہا پادشاہیں ہوں وہ تو بچوں سے الگ نہیں رہتے نا؟“

شملہ نے تجلّالپ رانٹوں سے دیا لیا۔

”پھر میرے پاپا الگ کیوں رہتے ہیں؟“

شملہ کا چہرہ دکھ اٹھا۔ اس نے سن گلاس اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینکے۔ عمر سہم کر رہ گیا۔ شملہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

”تمہارے پاپا اس لیے الگ رہتے ہیں تمہارے ابا کے انہوں نے تمہاری ماما کو طلاق دے دی ہے، ڈاٹائی ورس۔ ڈو یو انڈر اسٹینڈ؟ اب وہ کبھی تمہاری ماما کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ تمہارے پاپا حضور ہیں مگر میرے لیے ایک ابا نہیں ہیں۔ اگر تم اتنے ہی بڑے ہو گے ہو تو سن لو کوان کھول کر۔ اور آئندہ مجھ سے یہ فضول سوالات مت کرنا کبھی نہیں۔“

اس نے ابا کا شرارے برساتا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے محض اثبات میں سر ہلادیا۔ گاڑی سرگرم پور فرارے بھر رہی تھی۔

”ہائے اللہ۔“ عریشہ نے تاعمدہ کو ٹھوکا دے کر متوجہ کیا۔

تاعمدہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ پیریش سیٹھل پہن کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے دھڑکنے والے بے حد تابندہ کیا۔

”کلیاے تمہیں؟ میری پسلیاں چھید رہی ہو مسلسل۔“

سیلز میں سکرانے لگا۔ عریشہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ دکان کے گلاس ڈور کے باہر کھڑے وہ تینوں صاف نظر آ رہے تھے۔ بینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑی بے فکرانہ انداز سے کھڑے تھے۔ ہنس ہنس کر ہنسنے لگے۔

تاعمدہ اور ثانیہ کی پوری توجہ دکان میں بھی سیٹھلوں کی جانب تھی۔ یوں بھی ماریٹک میں پہنچ جانے کے بعد ان کے توجہ حواس کام کرنا چھوڑتے تھے صرف بھلاؤ نا ڈاؤلی سس پھر کتنی رہ جاتی تھی۔

”کتنی ہے؟“ تاعمدہ سفید سیٹھل کے متعلق ان دونوں کی رائے جاننا چاہتی تھی۔

”پناہ پورہ کچھ۔“ ثانیہ نے سرگوشی کی۔ ”میری کلاہ سیاہ کلاگ رہا ہے سفید پٹیل تھیں۔ یوں تھنے کا پتہ نہ ملے گا۔“

اور کے پیرنگے ہوئے ہیں۔“ تاعمدہ نے ہنسنے کا راستہ رکھا۔

”اور کالے پیر دیکھ کر دیکھنے والے کا دھیان تمہاری طرف ہی جائے گا کہ وہ ہو یہ ثانیہ کے پیر ہیں۔“ وہ ترکی پر ترکی بولی۔

”یہ بے لاگ تبصرو تھا۔ اب بھی تم سیٹھل خریدنا چاہتی ہو تو حضور خریدو۔“ اس نے کاندھے اچکا دے۔

”تمہارا عریشہ؟“ اس نے دکان سے باہر ہوتی عریشہ کو دیکھا۔

”اے اللہ۔“ ”وہ چوڑی۔“ ”سچ ہے۔“

”کیا سچ ہے؟“ ”دو چوڑی۔“ تم دونوں کے ساتھ اگر سرت بڑی حماقت کی ہے میں نے اچھا بھلا درد آپ کی ساتھ۔“ ”کتنی جھٹکنا مشورہ ہی نہیں دیتیں۔“

”معاذ تم نے کی ہے نا ابھی اس کا ہنگامہ نہ دیکھ لوگ۔“ عریشہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

تاعمدہ کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے بھی دکان سے باہر دیکھا۔

”ہائے اللہ۔“ اس کا رد عمل بھی ہو بسودہ ہی تھا۔

”مجھ میں آگ۔“

تاعمدہ نے سیٹھل اتار کر برے کر دی۔

”وے دوں آئی؟“ سلازین نے پوچھا۔

”آئی؟“ اس نے سچ باری۔

عریشہ اور ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔

”میں چاہے۔“ وہ جھلک کر کھڑی ہوئی۔ ”چلو لڑکیو۔“

”لے لیں باجی! سلازین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔“ سیل میں مل رہی ہے۔“

”منت تو میں مل رہی نا؟“ وہ تنگ کر بولی۔

”چلو اب اسے لو۔“ عریشہ نے کہا۔ ”یہ تم جنت تو دفعتاً ہوں جب تک۔“ اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ تاعمدہ کا غصہ بڑھ گیا۔

”اب ہاں ٹھیک ہے۔ وے دو۔ ہم اور پیریش لیند کر لیں۔“ اس نے سلازین سے کہا۔

”اور کریں باجی! اس نے سعادت مندی سے ”باجی“ پر زور دیا۔

”وہ کتنی کھاس ٹھنکے لگیں۔“

”یہ کیا صحبت کے پڑ گئی۔ بیٹھے بیٹھے تھکائے۔“ تاعمدہ نے سرگوشی کی۔

”تمہارا اچھو آنا دیا تھا۔“ ثانیہ نے جل کر کہا۔

”یہ کتنے کھول ہیں؟“ وہ پریشان تھی۔

”تم کو تو پتہ نہ تھا، جا بیڑی۔“ عریشہ نے اسے گھورا۔

”خود لگے۔“ ”اے عریشہ!۔“

”کالا۔“ ”تاعمدہ کے خون نے جوش مارا۔“ ”میں ابھی ایک چمڑے کا جوتا خرید لیتی ہوں۔“ وہ دونوں ہنس پڑیں۔

”آج تمہیں ہے شان۔“ اس کے ساتھ شاہک کلر ونگر نام ہا کر گھر سے نکلی تھیں۔ رہتے ہیں ان تینوں میں شہزادہ کا نام تھا۔ وہ کسی میں سوار ہوئے گا تھا کہ وہ کسی کا کر لیا۔ چنانا چاہتی تھی جبکہ ثانیہ اور عریشہ پسند نہیں کرتی تھیں۔

”ار کی کم تھو۔“ اتنے کرائے میں وہ سیٹھلوں آ جا سکیں گی۔“ اس نے انہیں سمجھایا۔

”میں کے اسباب تک وہی سیٹھل ہنسی بھی پڑیں گی۔“ تھکن ہو گئی وہ الگ۔ ”عریشہ اولگی تھی۔ ایسے میں سرگرم کے کنارے کھڑی ہیز اسوک کو دیکھ کر تھانے تاعمدہ کو اچانک کہا ہوا تھا۔

”سیٹھل بھائی۔“ گلف تک چھوڑ دیں گے؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

”دو چھوڑے۔“ ”میں دیکھا ہا۔“ بھر بولا۔

”تف کو اس انٹرفیر کھے۔“

عریشہ اور ثانیہ ہا کایا تھیں اور وہ دروازہ کھول کر بیچلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ مجبوراً ”وہ دونوں بھی گاڑی میں کھسکیں۔“

”یہ کیا حماقت ہے؟“ ثانیہ بڑبڑاتی۔

”خاموش رہو۔۔۔ لفظ ہی لی ہے نا۔“

”کسی نے دیکھ لیا تو جوتے پڑیں گے۔“ عریشہ کو تین عدد جوان بھائیوں کا خوف تھا۔

”کوئی نہیں جھانکتا چلتی گاڑی میں۔“ وہ مطمئن تھی۔ ”دوپٹے آگے کرلو۔“

”اور جو یہ لفظ کہیں اور لے گیا تو؟“ عریشہ بھنائی۔

ناعصم نے اسے کہنی ماری۔

”شی۔۔۔ بری بات ہے۔ بے چارہ اکیلا ہے، ہم تین ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

مجبوراً ”وہ دونوں چپکی ہو رہیں۔“

ایک ایک اس نوجوان نے گاڑی ایک جگہ روکی تھی۔ وہاں انتظار کرتے دو لڑکے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئے۔ ان

تینوں کی سانس گلے میں اٹک گئی تھی۔

وہ دونوں حیران ہو کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور مسلسل مسکرا رہا تھا۔

”ان کی تعریف؟“ آگے سے سرگوشی آئی۔

”کربا مات۔۔۔ پٹ جاؤ گے۔ وہ تین ہیں، ہم اکیلے ہیں۔“ مطمئن انداز میں جواب دیا گیا۔ لڑکیاں تلملا کر رہ

گئیں۔

”تیری قسمت کو کس نے جگا دیا ہے؟“ پھر ایک سوال ہوا۔

”اے ہمارے اچھے نصیب کمال۔“ ٹھنڈی اور بھری گئی۔ ”تیرا بھی سوک کا کمال ہے۔“

”سینے! عاصم! پھر کر بولی۔“ جس روک دیں یہیں۔ ہمیں یہیں اترنا ہے۔“

”منزل تو کچھ اور طے ہوئی تھی؟“

وہ زچ ہوئی۔ ”ٹائٹ۔۔۔ اور عریشہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔“

”میں نے کہا تھا میں یہیں اترنا ہے۔ گاڑی روکیں۔“

”یہ آٹومینک گاڑی ہے محترمہ! سیٹلائٹ سے کنٹرول ہوئی ہے۔ اس خطہ میں نشانہ ہی کرچکا ہوں۔ معاملہ

ستاروں تک جا پہنچا ہے۔ میرے پس میں کچھ نہیں ہے۔“

اگلی سیٹ سے ایک دانا تھا۔ عریشہ نے اسے لڑکیوں کو اس باختمہ ہو گئیں۔

”دیکھیے، ہم دروازہ کھول کر کو جا سکیں گے۔“ عریشہ نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔“

کھٹاک ٹی آواز کے ساتھ دروازے لاک ہوئے۔

”آپ ہرنے کو غلط سمجھ رہی ہیں جناب! آرام سے تشریف رکھیے۔ انشاء اللہ بحفاظت منزل پر پہنچیں گی۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔

دروازے لاک ہوتے دیکھ کر ان کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر گری جاری

تھیں۔ گاڑی کن پرستوں پر دوڑ رہی تھی انہیں خبر نہ تھی۔

جب گاڑی واقعی گلف مارکیٹ کے سامنے جار کی اور آٹومینک لاک سے دروازے کھلے تو تینوں کو ہوش آیا۔

بڑی تیزی سے وہ دروازے کھول کر نیچے اتریں۔

اپنے اپنے پرس سنبھال کر وہ بنا کچھ کے سننے آگے بڑھ گئیں تب ہی پیچھے سے پکارا گیا۔

”اچی سینے!“

فوری رد عمل کے نتیجے میں تینوں نے ہی مڑ دیکھا۔

”لفٹ لینے کا شکریہ۔“ وہ تینوں دانست نکال رہے تھے۔

اور سامن بحال ہو چکے تھے اس لیے انہیں ہنسی آگئی۔ بنا جواب دیے وہ آگے بڑھ گئیں۔ لیکن اب شاپنگ کے دوران انہیں پانا چھڑا کرتے دیکھ کر کھانسنے سرے سے پریشان ہو گئیں۔
 ”اب اگر ان مردوں نے کوئی بد تمیزی کی تو ہماری مارکیٹ میں بے عزتی کر دیں گی۔“ نامعہ بیروالی۔ ”نامعہ علی خان نامہ ہے میرا۔“



اسے بیٹھے بیٹھے کب غنہ آگئی تھی اسے خبر نہ تھی۔
 اس کی آنکھ اب انہی کی چٹھاڑے کھلی تھی گاڑی کسی اسٹیشن پر رک کر اب دوبارہ آگے بڑھی۔ ربیعہ کو حواس بحال کرنے میں کچھ دیر لگی۔
 لیکن اگلے ہی لمحے اس کے رقبے سے اور سامن بھی خطا ہونے لگا۔ اس کے علاوہ کپار منٹ میں دو نمائیت خطرناک قسم کے گومی موجود تھے اور ان تینوں کے علاوہ کپار منٹ میں کوئی نہ تھا۔ بڑی بڑی سوئیچوں اور کانڈروں تک بکے بال لیے وہ دونوں آری اپنی سرخ آنکھوں سے اسے ہی گھور رہے تھے۔ ربیعہ کا دل اس کے لیے اس میں آن لگا۔ اسے پرخم بہر میں پسینہ چھینک لگا۔

اسے وہ پر خلوص نوجوان یاد آیا، جس کی موجودگی اس کے لیے بھانپنے میں باعث توفیق تھی۔ وہ بوڑھے میاں بیوی تھے اس کے ہم سفر تھے۔ جواب کپار منٹ میں بند ہوئے۔
 وہ جالنے لگی دیر سوئی تھی۔ رستے میں کون کون نے اسے اسٹیشن آکر گزر گئے تھے اسے خبر نہ ہوئی تھی۔ کون سے ہم سفر کا ساتھ کہاں چھوٹا تھا اسے علم نہ تھا۔
 اور اب جو وہاں شخص سامنے موجود تھے ان کی نظریں اسے چمیدے ڈال رہی تھیں۔ اس نے اپنی سیاہ چادر کا پلوڑا سارے آگے کھینچ کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔
 وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ربیعہ خست پریشان ہو گئی لیکن وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کی پریشانی اس کے کسی انداز سے عیاں نہ ہو۔ اسے یاد آیا اس کے ہینڈیک میں ایک رسالہ تھا جو اس نے سفر کے دوران وقت گزارنے کے خیال سے سامنے کے ٹریک میں رکھ رکھا۔
 اٹھ کھڑے ہوئے انھوں کو اس نے چادر کے اندر رکھ کر ان کی کمر باندھنے کی کوشش کی۔
 نکال کر ٹریک کی زپ کھولنے لگی۔

اس کی نگاہ اٹھی تو اسے احساس ہوا وہ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ربیعہ نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ سیاہ چادر کے اندر سے سفید کنول جیسے ہاتھ یوں نکلے ہوئے تھے جیسے کھنسی رات میں پادلوں میں سے چاند نکل آئے۔ اس نے فافٹ رسالہ نکالا اور ہاتھ دوبارہ چادر میں لپیٹ لیے۔ اس کا جی ماہر ہاتھ اپنا چرو بھی چادر میں چھپالے لیکن اسے ایسا کرنا حماقت کے ذمے میں آگ۔
 رسالہ کھول کر اس نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ اسے الفاظ و کلمات نہ دیے۔ اس کا دل غاف و غور ہوا تھا۔
 ”میں اس قدر غور نہیں کیوں ہو رہی ہوں؟“ اس نے خود کو کہہ کر نے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔
 ”یہ صرف مجھے دیکھ ہی سکتے ہیں۔“ نگاہوں سے کوئی کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتا۔“
 ”شاید اس کپار منٹ کی بنیادی اور باہر پھیلی سیاہی سے مجھے دو رنگ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں کسی جھگڑ میں تو نہیں ہوں۔“
 اس نے اپنے آپ کو دھیروں تسلیاں دینے لگیں۔

”کہاں جاؤ گی؟“ ٹیکاک ان میں سے ایک آدمی اپنی بھاری آواز اور کرخت لب و لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔
 ربیعہ نے بد مزگی سے نگاہیں اوپر اٹھا لیں۔ اسے انداز مخاطب حد درجہ برا محسوس ہوا تھا۔ ”جی؟ مجھے کتنے کچھ کہا آپ نے؟“
 اسے خود پر حیرت ہوئی۔ خوف کے اس عالم میں بھی وہ اتنے اعتماد سے گفتگو کر سکتی تھی اسے اس سے پیشتر اندازہ نہ تھا۔

”تو چھاپے کہاں جاؤ گی؟“ اس شخص پر ربیعہ کے رویے کا مطلق اثر نہ ہوا۔
 ربیعہ نے اسے کوئی سخت جواب نہ دیا کچھ کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔
 ”لاہور۔“ وہ مختصر ہوئی۔
 وہوں نے اس کا جواب سن کر تجانبے کیوں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی بچائی رہی۔
 ”کیا ہو؟“ اگلا سوال سن کر وہ نے بھر کے لیے گڑ بڑائی۔
 رسالہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر پڑا۔ ربیعہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے وہ سوال سنا ہی نہ ہو۔ وہ ہچک چکا حالہ اٹھانے لگی۔

”کیا ہو؟“ وال پھر دہرایا گیا۔
 ربیعہ نے اس سوال پر سن ہونے لگا۔
 ”جی نہیں میں ہوں ان کے ساتھ“ ربیعہ سے عباد نے سر نکالا۔
 انہیں ان سے جڑی سے اوپر دیکھا اور ان کے چہرے اتر گئے۔ ربیعہ سے بچاؤ کیا۔
 ”بقیہ“ اس نے ٹپ ڈال کر کہا۔ ”جیسے کی جیسوں میں ہاتھ ڈالنے کے اندر ترش لہجے میں بولا۔
 ”ہینڈیک“ اس نے اس کے آسوی بھر آئے اسے دیا صاف نظر آنے لگی تھی۔
 وہوں نے اس کی کمر باندھنے کی کوشش کی۔ ان کے لیے انہیں اچھا اور دیرانی ظاہر کرتے تھے۔ عباد کے امیرانہ انداز سے عیاں ہو رہا تھا۔
 ”کچھ نہیں سنا میں تو یوں ہی لی لی کوا لیکھ لیاں کر کے لکھ لیاں سے کچھ باتیں پوچھ رہے تھے۔“ ایک نے کہا۔
 ”ہینڈیک“ اس نے منہ کر لیا۔
 ”ہینڈیک ہو۔“ اس نے منہ کر لیا۔
 اس سے زیادہ کہنے کے لیے اس کی پاس کچھ تھا بھی نہیں۔
 ”قول کہ۔“ رسالہ سیدھا کر لیں۔ ”اس نے سرگوشی کی۔
 ربیعہ نے ہڑو کر رسالہ سیدھا کیا تھا۔

”مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ اس نے دہائی دی۔
 ”کچھ تو نظر آئے گا۔“ متحرک ہوئے بولا۔ ”پناہوں نمبر امی کو نظر آئے۔ جن کا دل نمبر چھپتا ہے۔“
 ”جدا کے لیے حوزہ ابھری رہی باتیں مت کرو۔“ وہ رو دبا بھی کوئی۔ ”میں نے دن رات ایک کر دیے تھے۔“
 ”میں نہیں ہو سکتی۔“

”صلہ دے جاؤ ان ہی خوش گمانوں میں کوئی چیز نہ کھلاؤ۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”جب انتہائی نفیس ہے تو پہلے منہ میٹھا ہو جائے۔“

”تم دیکھو نا علی! پلیز“ وردہ نے اخبار اسے تھمے کی کوشش کی۔
”وردہ! اپنی امیری کی تعجب کی نظر کرو رہے۔ میں بے وجہی کہہ دوں گا کہ آپ پاس ہیں۔ بعد میں آپ کا مل ٹوٹے گا۔“

”فٹے منہ! ناغمہ نے ہنسا اخبار چھینا۔ ”تو دونوں ہو ہی بد شکوئے! اچھی بات منہ پہ لگی نہیں سکتی۔“
”حقیقت چھپ نہیں سکتی عداوت کے اصولوں سے۔“ اس نے مذہب سے سر ہلایا۔
”کے گھر لایا نہیں کرتے بھی چند ایک پلیٹوں سے۔“ حزنو نے کھڑا کیا۔

ناغمہ اخبار پر جھکا ہوئی تھی۔
”لاؤ ناغمہ! میں دیکھتا ہوں۔“ رافع کے نرم لیے پر اس نے سر اٹھایا۔
”رافع بھائی! وہ خوش ہو گئی۔ ”آپ دیکھیں گے۔ یہ وردہ آپ کی ہے تو اس شخص ہو جاتے ہیں روزانہ کاس کر۔“

اوپر سے بد دونوں بد تمیز افسانوں اور تنگ کر رہے ہیں۔
”بھئی! پورے شہر میں خوار ہو کر تو اخبار لائے ہیں۔ اس کا یہ صلہ ہے۔“ علی نے ان کی طرف اشارہ کیا۔
”منہ بد تمیز بد شکوئے، علی! اب ان لوگوں کو توڑ۔“ حزنو نے منہ پر ہاتھ پکڑا۔

”میری ڈاڑھی بڑی اب نوڈٹ ہے چھوٹے بھائی! نوڈٹ اور نوڈٹ۔“ اس نے سر ہلایا۔
”سما کر! جو! رافع نے رول نمبر نوڈٹ کر اس کے گرد اس کی کھانسی۔ ”فرسٹ ڈویژن ویل ڈن وردہ!“
”ہرے۔“ ناغمہ کے ساتھ وہ دونوں بھی تالیاں پیٹنے لگے۔

”دیکھا وردہ! اپنی بڑی بری باتوں کے بعد اچھی چیز اور بھی ہوتی ہے۔“ حزنو نے عرض کیا۔
”کے سر پر تنگ لگائی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

”جینے والوں کا نہ کالا“ ناغمہ نے منہ چڑھایا۔
”اے جینے والے ہیں ہمارے دشمن۔ لاؤ منگائی کھلاؤ۔“ علی نے آستین چڑھائیں۔ وردہ دوڑی دوڑی گئی اور کہنے سے کھڑک کاڑھ اٹھا کر لے آئی۔

”میں نے دیکھا اگر کھاتا تھا۔“ وہ جھپک رہی تھی۔
”اور تو سہلی آجاتی تو؟ اس کی کہیں سے آنسو پوچھتیں آپ؟“
”میں تالیاں بار بار سہلی کا ذکر۔“ اس کی بارود پر پٹی۔ سب ہی ہنس دیے۔

رائہ بیگم بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کا سر جو کم کمر مارک باڈی۔ ناغمہ رائہ کو فون کرنے بھاگ کھڑی ہوئی۔
”کچھ ہی دیر میں پورے ”حیات ولا“ میں اطلاع پھیل چکی تھی۔ وردہ کو مارک باڈی دینے کے لیے سبھی ٹپے آئے تھے۔ حقیقت حیات نے اسے بہت خوش صورت جو ڈاڑھا تھا۔ قدر ابا بیگم اور فروس بیگم نے پانچ پانچ سو روپے

دیے۔ شاہنشاہ نے نازک سی رسٹ داڑھی۔
”رافع بھائی! جب ڈھکی کرے۔“ علی نے سر کوئی کی تھی۔
”ناگس کی موٹی چیز سے ڈھکی ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”کل صدر میں کٹ گئی تھی۔“
”گنتی تو وہ جو ڈاڑھی ہو۔“ بکے ہیں اسے ڈاڑھی کھتی کیا؟“

سب کوئی گئی تھی۔

”چلو بھئی وردہ! تمہارا گھنٹ اداوار رہا۔“ رافع کو اعلان کر رہا تھا۔
”ادھار! یہ تو کسی قسم کی فتنی کا نام ہے بار!“ حزنو نے کان کھجایا۔
”بد معاش! بھولوں گا تم سے۔“ رافع مسکرایا۔



فاروق حسن نے چائے کا کپ سامنے رکھتی عرشہ کو ایک نگاہ دیکھا۔
ڈارک پریل کپڑوں میں اس کی گلابی رنگت چمک رہی تھی۔ غلابی آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار تھا۔ باپ کو چائے کے گرد اب اپنے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔

”یونیورسٹی کس سے جاؤ گی؟“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔
”بس بابا۔ اگلے ماہ سے کلاسز شارت ہیں۔ پھر مصروفیت ہی مصروفیت“
”بولی! انہوں نے ہنسا اٹھار۔ ”یہ اپنی ناغمہ بھی تو تمہارے ساتھ ہے؟“

”جی ہاں!“ اس نے انابت میں سر ہلایا۔ ”فانیہ اور ناغمہ میرے ساتھ ہیں ان کے اور میرے سبب کھسک رہے ہیں۔“

”اس بڑے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر اندر چلی گئی تھی۔ اور تب ہی کچن سے فروس بیگم برآمد ہوئیں۔
”جی! اس کا مخصوص حق حسن کا اظہار تھا۔

”وہ ان کے سب آتشیں۔“
”وہ ان کا کپ لے کر پتھر کا کپڑا کر کے جوڑو بالکل ہی بے کار ہوئے جاتے ہیں کم بخت۔“ وہ اپنا کاندھا دبانے لگیں۔

”فاروق حسن نے چشمہ ڈسٹ سے انہیں دیکھا۔
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“
”اس نے منہ میٹھا کر کے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”وہ ہنسی میں منہ میٹھا کر رہی تھی۔“

”وقت نے اجازت دی۔“ وہ بڑھاپا۔ ”وقت کا ہنسی تو کھیل ہے سارا شملہ جی!“
گرنے لباس کی چمک تجھ پر اس کی آنکھوں سے اور جھل ہونے ہی اور اس کا ہنسنا مسکراؤ کشیدہ جواس کے
تصور میں ابھر رہا تھا۔

”لیجئے جناب! اسٹیل آئینچی ہے۔ دس منٹ بعد ہملا ہوا اسٹیشن پر کھڑے ہوں گے۔“ عباد نے کہا تو ربیہہ کامل
غیرانوس انداز میں دھڑک اٹھا۔
”جانا سامان چیک کر لیں۔ میں آپ کے لیے بھی ایک عدد قلی ہار کر لیتا ہوں۔“ وہ مذاقاً بولا تو ربیہہ نے اثبات
میں سر ہلایا اور چیریں سننے لگی۔

”کہن لینے آگے تمہیں؟“ ایک اس نے پوچھا۔

”مجھے۔“ وہ انکی۔ ”مجھے شاید پیچھا جائے۔ یا۔ شاید۔ شاید۔“

عباد نے فورے اس کا چہرہ دیکھا پھر خاموش ہو رہا۔

اسٹیشن پر اتر کر ربیہہ کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا۔ ”خالے۔ خالی۔“ عباد نے اس کا سامان قلی سے اٹھا لیا اور وہ
لوگوں و شنگال میں پہنچ گئے۔

رہیہہ بار بار اسے دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے بھیجی تھی مگر وہ کی مانند
تھا۔ وہ اس کے لیے تحفظ کا احساس تھا۔
”تم نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی تھی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ ہنس اٹھا۔
”آہ۔“ اسے اچھٹیا ہوا۔ ”فون وغیرہ میرا مطلب ہے، کوئی دیکھ کر صورت حال؟ کس کو آگاہ ہے؟“
کب آتا ہے؟ تم پہنچاؤ تو ہونا نہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔
”اور وہ تمہیں؟“

سرد بارہ نفی میں ہلایا۔
”مائی گاؤں؟ وہ کاکا کا رہ گیا۔“ پیاس برس پرانی دوشیزا تم کیسے کہاں ہے؟“ وہ لڑکھائی سے
رہیہہ نے جھٹٹھی میں دلی پری اسے تنہا دی۔ عباد کاغذ سیدھا کر کے پڑھنے لگا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے
دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے یہ پتا درست ہے؟“

رہیہہ کا سر پھر نفی میں ہلایا تھا۔
عباد نے سر ہٹا کر لیا۔

دو گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد وہ اصل مکان ڈھونڈ پائے تھے۔ دونوں تھکن سے چور تھے۔ رہیہہ نے بالآخر
اسے اپنی مختصر ترین داستان سنا دی تھی اور عباد اس کی بات اور حوصلے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔
رہیہہ کے پاس موجود یہ ایک نہایت خستہ حال پرانے مکان کا تھا۔ جہاں سے علم ہوا تھا کہ پچھلے کین و مکان

چکر چمکے تھیں۔ عباد کی مستقل مزاجی اور بھرپور کوشش سے آخر کار وہ نیا مکان ڈھونڈ نکالنے میں
کامیاب ہو گئے تھے اور اب وہ دونوں ایک درمیانے درجے کے مکان کے گھر بزرگ کے گیت کے سامنے
کھڑے تھے۔ جس کے دروازے پر ”منور رائیں“ کی تختی نصب تھی۔

”یہی گھر ہے۔“ رہیہہ نے تصدیق کی۔ ”منور امین میرے پیچھا کا نام ہے۔“

”پھر کی۔“ تمنا اطمینان کر لو میں کھرا ہوں۔“ وہ بولا۔

رہیہہ نے اس کی آنکھوں میں موجزن پہلیاں خلوص دیکھا۔

”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھلاؤں گی بھائی! اس کی آنکھیں ڈنڈیا گئیں۔

”بس بھائی کہا ہے نا پھر احسان کیا؟“ عبادی آنکھیں چمکیں۔

پھر اس نے جیب سے کارڈ نکالا۔

”یہ کارڈ رکھ لو اس پر میرا موبائل نمبر ہے اور کراچی میں میرے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی۔ کبھی بھی کسی قسم کی
مشاورت پرے نہ جھنجھانستے۔“

رہیہہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مرکز تیل پر انگلی رکھ دی۔

اس کی شگفتہ کا نام خیر ہو چکا تھا۔
یادش روم میں اپنا حلیہ درست کرنے میں اس نے چند دھن میں منٹ لگائے تھے پھر اپنی کپ سر پہناتے ہوئے

دھناہر چلا۔
بست کے کنارے کی درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی سوچ کسی خاص نقطہ پر مرکوز نہ تھی۔ وہ بس یونہی

چھوٹا ہاتھ پر غور کر رہی تھی۔
پھر اس نے اپنے لیے کچھ جالی نکالتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اس پچھلی

سفید گاڑی پر جا پڑی۔
اس کے لیے یہ گھر کی سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی۔ اس نے کبھی چاہا وہ بارہ جب میں ڈال لی اور قدم اٹھا آنا سفید گاڑی

کا نام تھا۔ یہ گاڑی اس کے لیے ایک بڑا موضوع تھی۔ سفید جالی کے لباس میں لباس نہ ملنے سے سر نکالے چہرے کو
بڑے سے سفید بیٹ سے ڈھانپے بیٹھی تھی۔

یہ شاید نہایت طویل انتظار کا اظہار تھا۔
عاشق نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”بلیک ویل کم سوٹ ہارٹ۔“ یہ سننے سے سر کی آواز آمد ہوئی تھی۔
”ہٹ اسٹوڈیو آؤٹس لرا؟“ اس نے اس کے چہرے پر سے بیٹھنا مار دیا۔ اس نے اپنی خوبصورت مخمور

نگاہوں سے اسے مسکرا کر دیکھا۔
”اسٹوڈیو؟“ وہ ہنسی۔ ”سٹڈیو اپنی ڈارنگ۔“

عاشق نے بے بسی سے سر ہلایا۔

(باقی آئندہ)

خود خالق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب وہ اسے گھر بھیجے گا مشورہ دے رہی ہیں۔ خرید اور ان کا بیٹوہ اور شوکت سے جو اس کے گھر کی نمائندگی کرتا ہے۔ غریبہ خاندان بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ سواڑا ایک خوب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی محراب میں شہید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ دادی کے ٹک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی لگی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت مخصوص ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جیسے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہے کہ بقیہ اس کی پیچیدگیوں اور ان کا ایسا ہیہ کہ وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر اور ان کا خلا کر دیا بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شملہ اپنی ماں منیزہ کے گھر کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا ان کے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شملہ کا جواب دیتی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر کو ان کے آگے اپنے بیٹے سے متنبہ کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بیٹا بیٹا، ڈاکٹر شملہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی کماہ نہیں۔

ربیعہ اپنی خانی اور لوگوں کو بدلے دینوں سے تنگ آ کر اپنی پیچیدگیوں کے گھلا دور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ مرنے والی کے ملاقات عمارت سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا سفر کر رہی ہے وہ از خود اس کی پیچیدگیوں کی رہنمائی کی داری لے لیتا ہے۔

عاشرا (بیان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا کا ڈیو کی نظر سے گزرا۔

لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکلا تو وہ صوفے پر شہم دراز لی وی دیکھ رہی تھی۔ عاشرا سے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا۔

لوزا نے لی وی کا دلیمہ دیکھا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے یوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تم کیوں میرے لیے اتنی زحمت کرتی ہو لوزا؟“ عاشرا نے دیکھ کر پوچھا۔

”تمہارے آٹس سے میری فیملی تک کا روٹ کتنا لمبا ہے پھر ہماری ٹانگوں میں اچھا بھلا فرق ہے۔“

میرے پاس کاربے میں خود یہاں تک آسکا ہوں۔ پھر تمہارے آٹس سے کتنی ہو گیا۔ تمہارا زہن اتنا تیز ہے؟“

”جو وقت تمہارے بغیر گزرے۔ وہ مجھے فضول ہی لگتا ہے عاشرا! یہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تمہارا کھانا کھانے تو پاگل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آٹس سے مجھے دو مرتبہ وار تنگ دی گئی۔ میں اپنا کام سمجھ طریقے سے نہیں کرتی۔ مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پھر تم لوٹ آئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ بالکل ٹھیک!“

”وہ مسکرا دی۔ اس نے سفردانت چمکائے۔“

”تم غلطی کر رہی ہو لوزا! پچھتاؤ کی! وہ اپنی آستین کے ٹٹن بند کرتے ہوئے بولا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر آٹس کی اور اس کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان کے بالوں پر رکھ لیا۔

”پچھتاؤ۔ وہ عاشرا پر غلط کو صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ اس کا بارود سے زیادہ خطرناک سے خطرناک نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے اندازہ ہے۔ پھر بھلا پچھتاؤ کے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔“

پچھتاؤ سے پہلے ہی خود کشی کر لوں گی۔“

عاشرا نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا چلو کافی بناؤں بہت جھجک گیا ہوں۔“ اس نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

وہ اس کے مزید قریب آنے لگی۔

”تو تیرا؟“ عاشرا کے کپے میں سنسنہر تھی۔

”عجیب مرد ہو تم۔“ وہ غلطی ہو کر کپے کے لیے میں ہنسی ”تمہیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی فرق نہیں پڑا؟ شاید تم اپنی بیوی سے بہت زیادہ ڈرتے ہو۔ ذاتی طور پر خوف زدہ ہو۔ ہاں؟“

”ہاں۔ میں اپنی بیوی سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اب جاؤ کافی تیار کر کے لاؤ۔“

وہ براسمانہ سنا کر اٹھ گئی اور دروازے کا صلے پر بے کاؤٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جہاں چو لے نصب تھے اور چند کینڈس نے وہاں چھوٹے سے بچن کی صورت اختیار کر لی تھی۔

عاشرا بڑوں سے پتلا کر لیتا گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ لڑاکے کافی بنا کر لانے تک وہ سوچا تھا۔

ایک ایک کی آنکھ کھلی گئی۔ وہ اس کے اوپر ہنکی ہوئی تھی۔

”یار! میں اتنا تھکا ہوا ہوں۔“ وہ نے ہنسی سے بولا۔

”چپ چاپ بیٹھ رہو۔“ وہ ہنسی میں بولی۔

”یار۔“ عاشرا نے اسے پرے دھکیلا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”میں کو کچھ پر دھواؤ لوجھ سے۔“ کم سے کم یہ احساس

”تمہارے آٹس سے میری فیملی تک کا روٹ کتنا لمبا ہے پھر ہماری ٹانگوں میں اچھا بھلا فرق ہے۔“

میرے پاس کاربے میں خود یہاں تک آسکا ہوں۔ پھر تمہارے آٹس سے کتنی ہو گیا۔ تمہارا زہن اتنا تیز ہے؟“

”جو وقت تمہارے بغیر گزرے۔ وہ مجھے فضول ہی لگتا ہے عاشرا! یہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تمہارا کھانا کھانے تو پاگل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آٹس سے مجھے دو مرتبہ وار تنگ دی گئی۔ میں اپنا کام سمجھ طریقے سے نہیں کرتی۔ مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پھر تم لوٹ آئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ بالکل ٹھیک!“

”وہ مسکرا دی۔ اس نے سفردانت چمکائے۔“

”تم غلطی کر رہی ہو لوزا! پچھتاؤ کی! وہ اپنی آستین کے ٹٹن بند کرتے ہوئے بولا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر آٹس کی اور اس کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان کے بالوں پر رکھ لیا۔

”پچھتاؤ۔ وہ عاشرا پر غلط کو صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ اس کا بارود سے زیادہ خطرناک سے خطرناک نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے اندازہ ہے۔ پھر بھلا پچھتاؤ کے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔“

لڑا نے غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

ان آنکھوں میں ایف چاند جریے کا تصور ابھر رہا تھا۔

برآمدے میں اندر بھاڑ تھا۔ ریجی کی آنکھوں کو سوکھن میرا۔ اس نے پیلس جھپک جھپک کر دیکھا سامنے لائن سے تین کمرے سے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جو لے رہی تھی چیل بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے کافی تیز آگ تھی۔ وہ عورت شاید کچھ کھانے پکانے کے دروازے تک تھی۔ باورچی خانے کے مخالف سمت میں بیٹھوٹا اسٹور تھا۔ جس میں رکھے ہوئے ٹنک دکھائی دے رہے تھے۔

ربیعہ کے ایک شخص نے کوئے والے کمرے سے بے تحاشا کھانستے ہوئے کوئی شخص پوچھ رہا تھا۔
”میں اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔“

”اؤ تمہیں یہی بلارہے ہیں۔“ ان کے انداز میں تضحیک تھی۔

ربیعہ: دل پیڑی سے دھڑکنے لگا۔ ہر دم پر ایک نیا امتحان منتظر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے

کھڑے اس سے کہیں زیادہ بڑے ایک جھونکے نے اس کا سر چکرا دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم

سکھنے کے لئے جوڑے کرنا پڑے۔ جس کے پاس بڑی بنا خالی سے بدلنے کے پچھلے اٹھ رہے تھے۔

مذہب کے لئے جو کچھ ہے چھوڑ دینا۔ ربیب کے عمل نے شاید اسے طیش دلایا تھا۔

اس شخص نے آنکھیں نیچے کر کے دیکھا۔

”کھول۔ کھول۔ کھول۔“ منور امین پر کیا تک یہی کہانی کا دورہ ہو گیا۔
 مینانے آگے بڑھ کر دیوانی اٹھال جو غلاطت کے جوہر سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے کرے سے ماہر لے لگ کر۔

”تم سہ ماہی کیوں آئی ہو؟“

”جی۔ وہ میں۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
”شاید بڑھاپا کر رہی ہو۔“ اچانک ہی وہ ہنسے۔

یہ ایک سنائے میں نہ تھی۔ ان کا جملہ اسے چیرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس پر وہ خطرہ نہیں اسے اچانک ہی

(41)

دروازے کے ساتھ دیوار پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر کنداز الفاظ نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔
جائے کہیں منزل پر پہنچ کر اس عجیبی ہونے کے لیے چل اٹھا۔ گھر کے سب سے سانس بھک کر جانے کو خود پر تھامے جانے
کو شش کرتے ہوئے کل بیل کے منہ پر انگلی رکھی۔ سانس بند کیوں آؤ؟ منہ دباؤ؟ کل بیل شاید بولی ہو کر کہے
ماہیت۔ جن میں ہی نصب تھی۔ ”تھاں“ کی کرخت آواز نے خود کو جیہ کو ہی سنا دیا۔ جاسن کے بیڑ پر بیٹھے ہمارے
پرندے بھی اڑے تھے۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد بھی کوئی پیچیدہ ہوا تو ریحہ نے مقصد بربہ ہو کر ذرا سا مڑ کر دیکھا۔

”وہاں ہے؟“ ایک نال میل سے زیادہ لرخت آواز کے ساتھ فریب لہجہ کی
 رعبہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

شکاک سے دوچار ہوئی ہو۔
جائیس پیہ تائیس کے سن والی وہ عورت سافلی رنجت اور بے کھوئی حاسنہ

خست پائے ہوئے تھیں۔ موٹے موٹے لبوں کے گوشوں پر سخت مزاجی سے گہری سلولیں پر گئی تھیں۔ سبیل
و سفید کا ایسا امتزاج تھے کہ ان کو نظر بھر کر دیکھ لینے سے جھر جھری سی آتی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک خاک مزاج

وہ سید کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ بالکل چھپکا گئے بغیر اسے یوں تسکریں تھیں گویا چتر کی سوں۔

”مکس میرا نام رے بیجہ ہے۔ رے بیجہ جہاز تپ!“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر دی۔
 ”جانتی ہوں!“ اس سے تھکے سے ایک تفریح بھری سرسراہٹ ہوئی۔ آواز پر تلہ ہوئی تھی۔ رے بیجہ چونک اٹھی۔ اس

”آپ؟“ آپ کون ہیں؟“ ریحہ نے اس کی پتھر آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

”نیکمے کوئی نہیں۔“ وہ ہکا کر رہ گئی۔

احساس ہوا کہ اس نے وہاں آکر غلطی کی ہے۔
وہ اب تک ہنس رہے تھے۔ رعبہ کے اندر غم و غصے کا طوفان اٹھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس اپنا سامان کہاں رکھا تھا۔ شاید برآمدے میں ہی بچھوڑ آئی تھی۔
وہ مڑ کر دروازے تک پہنچی تو کابک ان کی ہنسی رک گئی۔
”ہینا! ہینا! بچی کے لیے کھانا بناؤ۔ بے چاری تنگ گئی ہوگی۔“
وہ بیچھے سے بولے تھے۔

فون کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی۔ جھنجھلائی ہوئی عریشہ ہاتھ دوڑے برآمدہ ہوئی۔ اس کے پیچھے سے ہوا تھا کہ اس نے بے جد جلد میں کپڑے پٹنے تھے۔ کیلے بال اس کی میٹھ میں پھنسے ہوئے تھے اور کپڑے سے کیلے ہوئے تھے۔

”ہنگو! اس نے ربیورا اٹھایا۔
”جیو علیکم جیل!“ دوسری طرف سے چپکتے ہوئے کہا گیا۔
عریشہ کچھ بھر کو متوجہ ہوئی۔
”جی! کون؟“ وہ متحاط ہوئی۔
”انتظار کی سولی پر لٹکا جااں باب۔“ سرد آہ بھرتے ہوئے گداز لہجے میں کہا گیا۔
”مجھے تو بھلے کے کھچے پر لٹکے فیوز بلب معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ بچی کہاں چپ رہنے والی تھی۔
”ااا!۔۔۔ بیل سڈ بیل۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مختصر جس مزل بھی رکھتی ہیں! دھرتے سزا گیا۔
”جی میں خدا کے فضل و کرم سے تین عدد جوان بھائی بھی رکھتی ہوں۔“ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی۔

”کوئی بات نہیں۔“ بیٹھے لہجے میں فرمایا گیا۔ ”بھائیوں پر چنداں اعتراض نہیں۔ بس اتنا خیال رہے کہ برداشت نہ ہوگا۔ جیسے دوسراہ کئے ہیں۔“

عریشہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔
”اس بد تمیزی کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ ہیں کون؟“ وہ بچی پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔
”دور حسن پر صد ادا کیا۔“ بھرپور آواز لگائی گئی۔
”فگہا؟“ عریشہ کھٹکھٹا کر ہنسی تھی۔ ”جی ہاں جی ہاں۔ میں نے پہچان لیا آواز ہے۔“
”فراد کی آواز فقیر میں میں شخص سیریں ہی پہچان پائی ہے۔“ وہاں کسی شرمندگی کا شائبہ نہ تھا۔
”ورنہ ہم تو ہفتہ بھر سے کالیں ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کے ٹیلیفون کے دربان کی آواز بہت بے سُر کی ہے شرم یہ کام آپ سنبھال لیجئے۔“

”اے مڑا آپ ذرا اپنی زبان سنبھالیں۔ وہ باتیں کیا کر لیں آپ تو منہ کو آنے لگے۔“
”ابھی ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“
اس کے کانوں میں وہ لہجہ اور وہ جملہ گونج رہا تھا۔ اسے گھٹ ماریک تک کا سفر و آگیا۔
”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے!“
”ہائے اللہ! اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سر پٹ بھاگی۔

ایسے پورشن سے نکل کر وہ اپنی پیچھے کے پورشن کی طرف آئی تھیں۔
”اڑے اسے بچی! کہاں؟“ وہ بڑی جانتی ہے۔ سانس تو لے۔“ ہفتہ حیات دروازے پر ہی مل گئیں۔
”السلام علیکم وادوی جانان!“ وہ بادی کو دیکھ کر کھنکھری۔
”و علیکم السلام۔“ بیتی رہی۔ کون سی مار کھلی؟“ وہ شاید واپس جا رہی تھیں ”یوں لپکتی کاپڑی بھرتی ہو۔“
”وہ! میں تو ناعم سے ملنے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ہاں تو بچی! خدا نے میرے پیسے پر نہیں بے اچلو گمراہی دمت!“ وہ نکل گئیں۔
دروازے پر ہی کلاس۔ لے لی گئی تھی ”اس لیے وہ خود کو قابو میں رکھ کر اندر داخل ہوئی۔ لاٹون میں بیٹھی بیچھو کو سام کر رہی تھیں۔ کون کی جانب بڑھ گئی جہاں دروازے کوڑے مل کر کڑھی میں ڈالتی جا رہی تھی۔
”اے! کڑھی۔“ عریشہ چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول گئی۔
”تم کب آئیں عریشہ؟“ ورنہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا ”ناعمہ کڑھی لے کر تمہاری طرف آنے والی تھی۔“

”اور اس بلی خوشبو سے میں خود نصفی اچلی آئی۔“ عریشہ۔ خالی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”ذرا کھیکھا۔“
”وہ کھانسی۔“ وہ کڑھی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ عریشہ وہیں بیٹھ کر کڑھی کھانے میں مشغول ہو گئی۔
ناعمہ بچن میں راہ لائی ہوئی تو چونک اٹھی۔
”ہاں! میں نہیں دوسرے سے ملنے آ رہی تھی۔“

”ہاں تو کھنکھناتے ہو تو کڑھی کھا کر جا رہی ہوں۔“ وہ انگلی سے خالی پلیٹ چاٹنے میں مشغول تھی۔
”کڑھی کھانے آئی تھی۔“ عریشہ نے اٹھ کر ناعمہ سے اے گھورا۔
”اے! میں نہیں۔“ عریشہ نے اصل بات بیان کی تو وہ سٹپا گئی۔ ”وہ تو میں تھیں۔۔۔“
پھر وہ کھنکھاتی ہوئی۔ ”جی! میں اس نے لکچر آواز فاش کرنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارے سے کہہ دیا۔“

”کیسے دیدے دیکھا رہی ہو؟“ ناعمہ نے کہا۔
”جی! میں اس نے لکچر آواز فاش کرنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارے سے کہہ دیا۔“
”نہیں تو دور آئی۔ میں نہیں تو۔“

ناعمہ دور دور سے ہنسنے لگی۔ دور دور کے میں کڑھی نکال کر عذرا بیگم کو دینے کے خیال سے چل دی۔
عریشہ نے لپک کر ایک دھڑکا ناعمہ کی کمر پر رسید کیا۔
”کیسی! آپ نہیں بتاؤں گی مجھے۔ مٹی رہنا سب سے میں۔ میں جا رہی ہوں۔“
ناعمہ نے کمر کی میں برداشت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ دھکا۔
”اچھا! تم کو بھی غصہ۔ لیکن اسے ہی منہ پر۔“

عریشہ کو ہنسی آئی۔ دونوں بچن سے نکل کر کمرے میں چلی آئی تھیں۔
”اب بولو کیا بات ہے؟“ ناعمہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔
”تمہارے اس ذرا سیر کا فون آیا تھا۔“
”میرا ذرا سیر؟“ ناعمہ دھواقتہ قطعاً ”فراموش کر چکی تھی! لہجہ کر بولی۔

”وہی سوک والا۔“ وہ جل کر ہوئی۔

”اسنے“ ناعہ سے بل تمام لیا۔ ”اس نے کیوں فون کیا؟ اور اس کے پاس نمبر کہاں سے آیا؟“
”نمبر تک پہنچا جو کیا تھا منہ سوں نے۔ نمبر نہ کرنا یا مشکل ہے اور یہی بات کہ فون کیوں کیا تھا تو اس کا ہوا تو وہی دے سکتے تھے سے کیا پوچھی ہو۔“

”تو نے پوچھا ہو نا۔“ ناعہ نے شوق سے اسے پوچھا۔

”اگلی مرتبہ تیرا نمبروں کیسے پوچھ لیا۔“

”نمبر ضرور دیا لیکن جو نے گنا۔“ ناعہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو چٹکے چیزوں کی موصوف کے

ناعہ علی خان نام سے پیرا۔“

”کھتا تھا ہفتہ بھر سے فون کر رہا ہے۔“ عرشہ نے فکر مندی سے کہا۔ ”نبانے اس کی ڈسب کا لڑکھن نے ر

کی ہوں گے۔“

”سی ایل آئی پر نمبر تو آیا ہو گا؟“ ناعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ لیکن موبائل نمبر ہے۔“

”گالیاں دیں؟“ اس نے انوکھا خیال سوچا۔

”جی ہاں۔ اس نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو اسے اعتراف رہ گیا۔“

”زبان کھینچ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی کیسے کہ۔“

”اس فون ہے ہاتھ نکال کر دیکھو یہی تمہاری کھائی مروڑے گا۔“ عرشہ طنزاً ہوئی ”باتیں مٹاتی ہو۔“

ناعہ سوچ میں پڑ گئی۔

”خیر کیا کرے گا؟ دو چار کالیں ہی کرے گا نا۔ پھر علی اور جنوی کی گالیاں سن کر خود ہی ٹھنڈے لڑ جائیں گے۔“

”وہ لڑے کیوں لڑے؟ وہ بھی آج کے دور کے۔ اس کے ہاتھ میں کتنی باتیں چلیں گے اور سر پر چھوڑیں گے اس کے۔“

”تو پھر اسے تاباں اچھا ہے مڑا کرے۔“

”اور جو وہ اس سفر کو استقامت سناؤ لے پھر؟“ وہ جل کر ہوئی تھی۔

”تب کی تب دیکھیں گے۔“ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا قصہ مختصراً ”جلیاں مرنے والے تھے۔“

”ہاں۔“

”آہم۔“ فردوس بیگم نے قلم چلانے میں مصروف تھا جب کہ میں کسی کی آمد سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔

اس نے فون کی زنگ بجائیں اٹھا لیں۔

فردوس بیگم اور ماہین کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلا کر اس کا ہاتھ ٹھٹھا۔ اس نے قلم کو پھر ایسی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

”آہم۔“ فردوس بیگم نے گلا صاف کیا تھا شام کو مجبوراً ”نظریں اٹھا لیں۔“

”آہم ای۔“ بیٹھیں۔ بیٹھو ماہین۔“ اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بیٹھے ہیں۔ بیٹھے ہی آئے ہیں۔“ فردوس بیگم اپنا چیمو جوڑ بیٹھنے لگے ہوئے صوفے کی جانب

بڑھیں۔ ”تم تو اپنے آپ کے ہوئے نا تو کیا لو لانا ہوا۔ تم تو بابر سے تمہارا دورا وہ ہی دیکھتے ہیں اب کٹے

کہ جب کھلے۔“

”بس ای۔“ اس کی طرف سے کام کا کچھ دباؤ سے آج کل۔ ”وہ انہیں چٹانے لگا۔“

”جھا!“ وہ نہیں۔ ”مہم بھی اسی دباؤ کی بنا پر آئے ہیں اب تم ہی کچھ مدد کرو ہماری۔“ وہ دونوں اس کے مقابل

”میں شام نے خطرے کی دھمکی دی تھی۔ سو وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔“

”دیکھا دواؤ؟“

”دوسرے کی سٹاؤں میں۔“ ہمارے باوا کا دواؤ ہے وہ کہتے ہیں تم جان کر بیٹا نہیں بیاتیں۔ جی بھر کر عیش کرنا

”جانتی ہو اس کی کمانی پر۔“ پھر تمہاری دواؤ کی گڈاؤ وہ کانیر کا شیشہ کھلائی ہیں ہماروں ہماروں سے۔ اور اس غریب

کی جان مشکل میں چکی ہے۔“

”انہوں نے ماہین کی جانب اشارہ کیا۔“

”اس کی ساس اپنی صاحبزادی کا جو بھہکا کر کے کو خوشاں ہیں۔ انہوں نے تنہم میاں سے کہلایا ہے اس

لیے صاف صاف انکار کیا را نہیں ہوتا۔ اب ذرا جتنا تو تمہیں کہیں کو کیا جواب دیں؟“

”شام نے نظریں اٹھا کر اس اور اس کے متذہب چہرے کو دیکھے۔“

”میں کو ایک ہی جواب دیتے کہ شام اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اگر اس نے شادی کی تو اس کے

لیے جس شخص ایک لڑکی ہے۔“

”فردوس بیگم نے غور سے پیش میں آ کر بیٹھی کو دیکھا اور کچھ کہنے کو لب داکے۔“

”وہ نے اس کے ہاتھ سے پھر ماہین بول اٹھی۔“ ”کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لیا کہ انسانیت

کے ناطے کی ترس کھانا زیادہ مناسب ہے یا پھر اپنے خوشی رشتوں اور اپنے ماں جاویں کو زندگی بھر کی بچھون اور

”جی ہاں۔“

”شام نے بیٹھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سن کو دیکھا۔“

”ایک با۔“ بیٹھی طرح کچھ لکھ لکھ رہی تھیں۔ ”میں نے محبت ضرور کی ہے اور میں کسی حد تک اپنے دل کے ہاتھوں مجبور

”تھیں۔“ ”میں نے کچھ لکھ لکھ کر اپنے ہاتھوں کی کھلوا کر دیکھا۔“ ”میں ایک واضح اور منطقی سوچ کے

”تحت ابھی دیکھ لیا۔“ ”میں نے اس اور کون گاہ دو سر کی بات یہ کہ میں جذباتی ایک میلنگ کا شکار ہونے کو

”ہست بڑی سے کوئی شے نہیں لکھ لکھ رہی تھیں۔“ ”میں نے کچھ لکھ لکھ کر اپنے ہاتھوں کی کھلوا کر دیکھا۔“

”میں نے کچھ لکھ لکھ کر اپنے ہاتھوں کی کھلوا کر دیکھا۔“

”اور آخری فیصلہ یہ ہاں۔“

”نہجیک ہے۔“ ”وہ آسانی سے مان گیا۔“

”ان دونوں کے چہروں پر قدرے شامشائت آئی۔“

”پھر مجھ سے شادی کرنے کے لیے اصرار مت کیجئے۔“ ”اس کے اگلے جملے نے دونوں کے منہ لٹکا دیے ”علی

اور جنوی اٹھ اٹھ نوجوان ہیں۔ چند ایک سالوں میں شادی کرنے اور گھر مہمان کے قابل ہوں گے شوق سے

”جہاں چاہیں ان کے رشتے بنتے اور اپنے سب ارمان پورے کریں۔“

”اور تم۔“ بے ساختہ ان کے کیوں سے لٹکا۔

”میری خواہش کو اپنی خدشا پر مجھ پر زندگی کی خوشیاں حرام کر دیں۔“ وہ اپنے کاغذات کی جانب متوجہ ہوتے

”ہوئے بے رحمی سے بولا۔“ ”مجھے اپنی سزا قبول ہے۔“

”فردوس بیگم اچانک ہی بھوت چوٹ کر رہ گئیں۔ وہ اپنے کاغذات کو اپنے آنکھوں پر رکھ لیا۔“

”اسے کیا کھول کر لیا دیا اس چیز میں نے میرے بچے کو۔“ کھلا جاؤ کر دیا ہے۔ اسے پوچھتی تو نہیں رات رات

”وہ وہ! اسے لے گیا؟“ بے کیا؟“ بے کیا؟“ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
 ”شعلا! میری بات سن لو! ابراہارے مجھ سے خود بات کی ہے وہ اسے چھوڑ جائے گا۔“
 ”وہ لے گیا اسے۔“ وہاں گھول کی طرح چیخی۔ ”وہ میرا بچہ لے گیا۔“ وہ کئے ہوئے تھے کی مانند ان کی باتوں میں گری۔

”شعلا! شعلا! انہی“ وہ نے طرح گھبرا کر چیخنے لگیں۔

انہی نے کمرے سے نکل کر بھاگی آئی۔

”آپ نے بتا دیا نا! میں نے منع کیا تھا آپ کو۔“

اس نے شعلا کو صوفے پر لٹایا اور اس کے گال چھتھپانے لگی۔

”کیا کہی؟“ ان کے آنسو جھجھرتے تھے۔

اسی لمحے ہار ایک سالانوس ہارن بجایا ساتھ ہی کال بیل بجی تھی۔ انہی نے خوش امید کی سے ماں کو دیکھا۔

”میرا خیال ہے عمر آگیا ہے۔“ وہ اچھ کر گیت کی جانب بھاگی۔

اس کا بھرا زور دست تھا۔ عمر گت پر موجود تھا۔ وہ راجی ایک گاڑی کی سرخ قباں چمک رہی تھیں۔

”ہالا جانی! وہ چکا۔“ وہ میرے پاس تھے۔

انہی نے اسے اس میں بھر کر اندر چل آئی۔

”وہ وہ! آپ کی ماما کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی ماما کو آواز دے چکا وہ نہیں۔“ اس نے عمر کو شعلا کے قریب بٹھا

بٹھا بھیجے میں بچہ کرتی تھی! اسی ایتھان! خدا تیرا بھلا کرے۔ میرے بھائی کی زندگی تباہ کی اور اس۔ پچھل بیٹری کی گھر کا رستہ دکھا کر میرا بچہ پاؤں کاڑا لا۔ اسے میں کہتی ہوں فاروق جس! آؤ! گھو اسے لاؤ! لے کی کل افشانیوں! اس کو پھولوں کا سہرا لٹاؤ! اس منجھو کی کو۔“
 ”کی! ای۔“ ماہی نے انہیں چھوڑا۔ ”خدا کا واسطہ چپ کریں۔“ انہوں نے ہڑبڑا کر مذہبہ آنکھوں سے ہٹایا۔ باہم کاکمرے سے جا چکا تھا۔
 ”مستیاناں! ہو تیرا جادو گئی۔“ وہ بڑبڑانے لگیں۔



سفید آٹو دوپورچ میں پارک کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا اپنا سیاہ ریدرک اٹھایا اور گاڑی سے نکل کر اسے لا کر گئے تھے۔

آج وہ اسپتال سے مارکٹ چلی گئی تھی۔ عمر کتنے ہی دن سے خند کر رہا تھا کہ اسے نئے کپڑے لگا کر مارکٹ چلے۔ سو آج وہ اس کے لیے سارے گاڑیاں سیٹ لیتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھول کر اسے پکارا۔

”عمر! عمر! آئیو! آئیو! آئیو! آئیو!“

اسے پکارتے ہوئے وہ لاؤنج میں پرے سیاہ صوفے پر جا بیٹھی۔ اس نے جنم میں دیکھا احساس تھا۔ خند سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

منیجرہ بیگم بکریں سے نکل کر آئیں وہ صوفے کی پشت سے لٹکے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

”شعلا!“ انہوں نے اسے پکارا۔

وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی پر گئی۔

”جیسے میری ماں!“ وہ خوش ہو گئی۔ ”شربت سے جی چاہ رہا تھا آپ کو! آئیو! آئیو! آئیو! آئیو!“

تھام لیا۔

”یہ عمر کہاں ہے؟ آواز دینے پر بھی نہیں آیا۔ راجہ کی طرف گیا ہے کیا؟“

”ہوں!“ انہوں نے آنکھیں سے ہٹا کر ابھرا۔

”انہی کہاں ہے؟“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرے ہوئے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہے۔“ وہ آنکھیں سے ہٹا کر بولی۔

یکدم اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ اس نے ماں کا چہرہ غور سے دیکھا۔

”کی!“

انہوں نے نگاہیں پڑائیں۔

”کی!“ شعلا نے کب میرے رکھ دیا۔“ وہ دھڑکیں میری طرف۔“

”شعلا! شہادہ ذرا غور سے میری بات سنو۔“ وہ نے کسی سے بلا خر گیا ہوئیں۔

”کی! عمر کہاں ہے؟“ اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”بہاؤد۔“ آج وہ پیراس کے اسکول سے پریشان کافون آیا تھا۔

شعلا کا چہرہ لٹنے کی طرح سفید ہو گیا۔ منیجرہ بیگم کے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت دھبی پڑ گئی تھی۔

”عمر!“ اس کے لب کاٹے تھے۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”اس کا باپ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی پرنسپل نے یہی کہنفر کرنے کے لیے یہاں فون کیا تھا کہ آیا۔“

URDU PHOTO

”منیجرہ!“ عمر نے نئے باتوں سے اس کا چہرہ تھما۔ ”مما! آنکھیں کھولیں نا۔ دیکھیں! میں آگیا۔“ شعلا نے

آنکھیں کھولیں۔ چند لمحوں کے بعد شعلا نے اس کا چہرہ دیکھ کر ہی پھر اسے خود سے چٹا کر زور سے رونے لگی۔

”میری جین! وہ چٹا چٹا! اس کا چہرہ اور اس کے ہاتھ جوئے لگی۔

انہی نے صوفے پر بیٹھی منیجرہ بیگم بالکل ساکت تھیں۔ ان کے خالی ہاتھ ان

کی آؤٹین دھرتے تھے۔ ان کی آنکھیں میں آنسو تھے۔ انہوں نے کمرے پر گری تھے۔

اس نے ان کی آنکھوں پر تصویریں بنیں اور بگڑی تھیں۔

وہ بند آنکھوں کے پیچھے آیا ایک جہان سے گزری تھی۔

کتنی ہی لاتعداد آوازے تھے۔ انہوں نے تصاویر تھیں۔ متحرک تصاویر مرہوط اور غیر مرہوط۔

اس کا چھوٹا سا صحن تھا جس میں ہارستھار کا درخت تھا۔ اس کے پھول ربیحہ کے اور گرہے تھے۔ ربیحہ ہنس

پڑی تھی۔ صحن میں چینی چارپائی پر وادی اور نفیسہ خالہ بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ربیحہ کی خوشی میں خوش نظر آ رہی

تھیں۔

سب سے پہلے دیوار پر چٹھہ کر اسے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ربیحہ اس کے اشارے سمجھ نہیں پائی

تھی۔ ایک دیوار پر زعفران شوکت نمودار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ حاکم پچھا تھے۔ ان دونوں کے چہرے خست اور

آنکھیں لال تھیں۔ ربیحہ کو ان کے ارادے ٹھیک معلوم نہ ہوتے تھے۔ وہ دھڑک بھاگی تھی۔ رن کے کہنے پر بہت

بڑے بڑے تھے۔ ربیحہ کو ان آہنی بچوں سے خوف محسوس ہوا۔ رن چٹھا ڈی ربیحہ کی آنکھ ایک

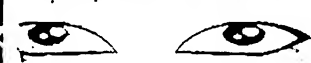
نکتہ کھل گئی۔ اس کا قلع خشک ہو رہا تھا۔ اسے پرنسپل کا احساس تھا۔ اسے پھر سرگوشیاں سنائی دیں۔ کوئی کمرے

”بھیا مرگے۔“ ایک کروہی ہنس اس کے کانوں میں گونجی تھی۔
 ”نہانی اے! یہ بھی نہیں سمجھتا؟“ ترانہ نے اندھیرے میں اس کا چہرہ کھونچنے کی کوشش کی۔
 ”نہیں! نہیں سمجھتا۔“

”معاذ بھی ہو۔ تمہارے ابو کی منگھیر تھیں۔“ ترانہ نے انکشاف کیا۔ ”میری ابو کی شادی کے ساتھ ہی ان کی منگھیر گونجی تھی۔“
 ”بھیا مرگے! تمہیں اس وقت تمہو کی سب ماموں نے اپنی پسند سے شادی کر لی تمہاری ماما سے۔ سو ابو اور ماما ہی کے مابین بہت بڑی رنجش پیدا ہو گئی۔“

اندھیرے میں پیدا ہونے والی آواز نے دونوں کا دھیان بلایا۔ بیڑیوں پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جیسے کوئی بے ساختگی کے سہارے تیز چل رہا ہو۔
 ”نہن بھائی آگئے۔“ ترانہ کا ایک بول۔

چند لمحوں میں اندھیری بیڑیوں پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔
 ”ترانہ! ایک بھاری آواز گونجی۔“
 ”جی ہاں! آجائیں۔“ ترانہ بولی۔
 اسٹک کے سہارے چلتا ہوا سایہ ان تک پہنچا۔ دیوار پر کے چائیں واٹ کے بلب کی ٹانگیں تیار ہو گئیں۔ اس کا سر بالا واپس کرنے کی کوشش کی۔
 وہ ایب پر اسرار قسم کا شخص تھا۔ ربیعہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ کبھی بھنوں کے نیچے چپکے پر اسرار



PHOTO

”نہن! یہ ربیعہ ہیں۔ جہاں ذہب ماموں کی۔“
 ”معلوم ہے۔“ اس نے سن کر بات کالی ”مجھے پتہ نہی۔“
 وہ واپس ٹھیک اسٹک کی آواز لے کر لکھو لکھو ہوئی گئی۔ ترانہ نے ہنسنا شروع کیا۔
 ”معاف کرنا ربیعہ! یہاں سب لوگ بس ایسے ہی ہیں۔ اگھر اندر بزمِ مزاج سے۔ لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں کے گا۔ تم فکر نہ مت ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سمجھو نہیں تمہاری بڑی بہن ہوں یہاں کا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے خوش خدمت سے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔“ وہ ادا سی بولی۔
 ”نہن! نہن! کو کھانا دے دو۔“ وہ آہستہ سے بولی ”میں بھوک لگی ہوئی۔“
 ”ہاں۔“ ترانہ ہنس دی۔ ”میں نہیں بھوک رہی تھی۔“



”ترانہ! اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹیولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے۔ تمہارا اور قصور کبڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی ہی کام کرتے تھے لیکن فالج کے ایک کے بعد وہ تو بس ایک بنگ کی بی بی ہو رہے۔ اب انہیں جھوٹے بچوں کی طرح جانا پڑا رہا ہے۔ لوگوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری اتھری

اس لیے کچھ خرچے ہو گئے ہیں۔ قصور تو خیر سترے اپنی پڑھائی بھی کرتا ہے۔ اسی لیے کافی دیر سے لوٹا ہے۔ لیکن نہن! چلو خیر! روزگار پر لگاؤ کا ہے، مرنے کا تھوڑے تو کیا ہوا۔“

انہوں نے رک کر ربیعہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دھیان لکھ بے دھیانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔
 ”اس گھر میں کوئی کسی کو کچھ دینے کا روادار نہیں ہے۔ لڑکے جو کھاتے ہیں، بیب میں رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ گھر میں سودا والو دیتے ہیں، مینے کا بجلی کی گیس کابل دے دیتے ہیں۔ ترانہ کی تنخواہ تو آدھی سے زیادہ باپ کے علاج پر اٹھ جاتی ہے۔ پھر آنا جانا ملنا رہتا، عید تہوار۔ یہ سب بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اور صولت بے چاری کی تو تنخواہ ہی تنگ تھی۔“

ربیعہ کو اب ان کی بات پر عمل دھیان نہ پڑا۔ ان کا مطلب کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے چائے کا کپ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
 ”ترانہ نے اے کیا ہے۔ ایک جانے والے کے توسط سے اسے یہ نوکری مل گئی۔ صولت بے چاری تو دوسرے سے لگے پڑے ہی نہ سکی۔ ایسے حالات میں آدمی تو پڑا لے لیا کھالے۔ پھر بھی تھوڑا بہت جو بھی ہے اپنا کما لیتی۔ تم نے بھی تو اپنی اے کیا ہے؟“
 ”نہن! نے ہاتھ میں ڈھون کی سی تیزی سے چلی چھری کی چند لمحوں کے لیے روکا۔ وہ پالک کاٹ رہی تھیں۔“
 ”جی ہاں! یہ سب بھولنے سے آدمی صورت نکلا۔“

”ہاں تو سمجھیں بھی مل جائے گی نوکری۔ میں ترانہ سے کہوں گی۔ تمہارے لیے بات کرے!“ وہ اس کا کھٹکا ہوا سر دیکھنے لگی۔
 ”تمہاری بہن نے کیا کہا ہے؟ تمہیں تمہاری ماں کے متعلق؟“ دفعنا ”میں نے سوال کیا۔“

”جی ہاں! میں نے بھی سنا۔“ وہ قدر سے خوفزدہ ہو کر گئی۔
 ”وہ کچھ کہتا ہے کہ میں نے اپنی نظر میں ابھرا تھا اور تھوڑے کچھ ربیعہ کو اندر تک نہن کر رہا تھا۔“
 ”جی ہاں! کچھ تو اسی میں لالچ لیا جاتا تھا۔ ان کا بیج بے حد سخت تھا۔“
 ”ربیعہ نے کہا تھا کہ میں نے ہند کر لیں۔ اسے کہنے کے بعد سارا خوبصورت کار تھا لیکن پھر بھی وہ حتی الامکان جینے کی خواہش مند تھی۔“



وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ نگاہیں غلام میں بٹکت رہی تھیں اور وہ کہیں دور پہنچی ہوئی تھی۔
 ”مہرا! تم نے کیا کہا۔ وہ جو تک انھی۔“
 ”تم سوئے نہیں اب تک؟“ وہ جرات ہوئی۔

وہ تو اسے نہانے کے لیے سوہا ہوا سمجھ رہی تھی۔
 ”میں ماما کی فینڈ نہیں آ رہی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔
 ”شعلا سمجھتی تھی کہ اس کے ذہن میں کیا ہے، مگر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔“
 ”فینڈ نہیں آ رہی تو اپنا خالہ جانی کے کمرے میں چلے جاؤ۔“ وہ آف موڈ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے فینڈ آ رہی ہے اور

تجائیں کیا خاطر تو افسوس کہوں آپ کو لوں گی۔ کھانا بھی تیار ہے۔“
 ”کھانا ہم کھا کر آئے ہیں پیچھو!“ مائین جلدی سے بولی۔ ”اور نکلفات رہے دیں۔ اسی بہت ضروری کام ہے۔“
 ”آئی ہیں آپ کس لیے۔“

اس نے شام کو گودے اتار کر مومن اور ایمان کے حوالے کر دیا جو بے حد اشتیاق سے اس کے پاس کھڑے
 چھوٹے سے حمام کو دیکھ رہے تھے۔
 ”چھائیں چائے بنا لیتی ہوں۔“

”میں جانی ہے چائے بھی“ فردوس بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”تم ذرا دو گھڑی بیٹھو اور پھر بڑا
 وقت نکال کر بہت باہر کر آئے ہیں ورنہ تمہارے گھر کی تو میزبانیوں کے خیال سے ہی میرا لٹی ہو رہا ہے۔“
 ”لیکن جی کیا بات ہو گی۔“ ”یقیناً کہ مندر ہو گی۔“

”سہیلی لی کیا کہیں تمہارے تو نصیب ہی برے ہیں۔ جی کو کوئی نہ کوئی روگ لگا رہتا ہے۔ تم ذرا ایک بات
 بتاؤ مجھے سچ سچ کہ تمہیں بھجوتے ہو یا نہ۔“

ایقان حیران نہ ہوں سے بھانج کی سمت دیکھے گی۔ اس کی کچھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔
 ”یہ تو تمہاری بات ہے، ہم جوں ہے“ وہ کہنے لگی ”اس کا نام شیام کے ساتھ کیا پکڑا ہے؟“ وہ بڑھتی بھانج کی طرف دیکھ رہی
 تھیں۔

ایقان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
 ”کک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں بھائی جان! خدا کا خوف کریں۔ آپ شہلا کی بات کر رہی ہیں نا۔ اس غریب
 کو تو خبر بھی نہیں ہے ایسی کسی بات کی۔“

”رہے ہیں وہ۔“ وہ برائیاں گئیں۔ ”ہم کب اپنی سہیلی کی بات کو مگی! ہم سے بھلا ایسے تو نہیں کوئی کہی کا دیوانہ
 ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی خراب کرنے پر تل جائے۔“

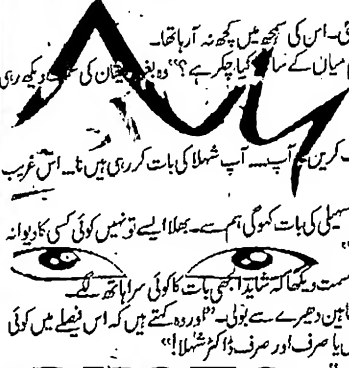
”بات کیا ہوئی؟“ ایقان نے بے بسی سے اپنی کی سمت دیکھا کہ شاید اچھی بات کا کوئی سرا ہاتھ لگے۔
 ”بھائی! ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ مائین دیر سے بولی۔ ”اور کہتے ہیں کہ اس فیصلے میں کوئی
 رد بدل ممکن نہیں ہے۔ باتو شادی کریں گے ہی نہیں یا صرف وہ صرف ڈاکٹر شہلا!“

”مالی گاڑ!“ ایقان نے سرحاقم لیا ”آپ ہم اب تک۔“
 ”چلو اس کی شادی سے پہلے کھانا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کام کے واسطے تھا۔“ اچھی بات لگتی تھی۔ میں بھی
 لگتی تھی۔ اس لڑکے کے تو تیوری پیدا تھے۔ تمہاری دوانت کاٹنے کی دہائی تھی۔ تم سے کیا پوچھ رہا ہے۔“

انہوں نے اشاروں اشاروں میں اسے پچھل باتیں یاد دلایں۔ ”اب، اب ہم کچھ کی بات کو اسے سب سے بڑے
 بیٹے کی دلہن بنا لیں تو کسی بھدا اڑے کی پورے خاندان میں کہ لو! ان فٹوں کو نکال ڈالو۔ اسی بیٹے پر اترا جی بھرتی
 نہیں لے آئیں مطلقہ گھڑوں کی پوری!“

انہوں نے بیگم نصرت سے خود کو ٹوٹنے والے طعنے ملاحظہ کیے۔
 ایقان کیا کہتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے لیے دل کو اس خیال سے راخت سی لی تھی۔ اس کی
 عزیز از جان دوست کا گھر پھر سے بس جا رہا تھا۔ تنہا بھلا ہوتا ایک معصوم بچے کی پاپ کے نام کا سامنا کرنا لیا تھا۔
 لیکن ظالم زمانے کی دیکھیں! اس کی عزت نام بھائی کی بھدا نہ اڑ جاتی پورے خاندان میں اس نقصان کا ازالہ بھلا
 کس طرح ہو پائے۔

”کس سوچ میں رہ گئیں تم۔“ فردوس بیگم پریشان ہوئیں۔ ”سکے کا کچھ حل بتاؤ۔“



PHOTO

ایقان چوکی۔ جو کچھ سوچا تھا وہ نوک زباناں پر لائے کی تاب نہ تھی۔
 ”دیکھیں کیا کہوں بھائی جان!“ وہ کھٹکتا کرتے ہوئے بولی۔ ”جو آپ مناسب سمجھیں!“

”ارے ہمارا کیا مناسب کیا مناسب۔ ہم تو اس لیے آئے ہیں کہ ہماری خاطر ذرا سا بھوت بول دو۔“
 ”جی؟ میں سمجھی نہیں۔“ وہ ابھی۔
 ”آپ ہم میں کو کسی مہمان سے بلا کر بات کر۔ اس سے کہو کہ شہلا نے انکار کر دیا ہے۔ شادی سے۔“

”میں۔۔۔ میں کہوں؟“ وہ گھبرا گئی۔
 ”ہاں۔ اور ادرخ شہلا کو سمجھا دو کہ ایسا کوئی خیال ہے بھی کی میں تو اسے نکال بیٹھکے اس کو کہہ دو ہاتھ کے گھر
 والے کسی بھی اے اور اس کے بچے کو کوئی نہیں کریں گے چاہے زمین و آسمان ایک ہو جائے۔“

”لیکن بھائی جان۔۔۔ میرا یقین کریں شہلا کو آپ کے جذباتوں کا کیا کل علم نہیں ہے۔ وہ قطعاً۔۔۔ بے خبر ہے۔ ایک
 بے قصور شخص کو ایسی کڑی بات کیوں کی جائے بھلا۔“

”اچھا! پھر آپ کو سمجھا دو۔ کسی بھی طور کوئی بھی بھوت بول کر۔ ذرا سیریز لڑا کا ہمارے بس کا تو نہیں۔“ ایقان
 بری طرح چپس کی بھی۔ جانتی تھی بھانج کے دل میں پہلے ہی اس کی جانب سے کتنا جھجھا ہوا تھا۔ وہ اس کی
 جانب سے بے ظن رہتی تھیں۔ سب کوئی اور بچہ خواتین بات اس کے کیوں سے نکلتی تو وہ بالکل ہی اگھر جاتیں۔

”آپ کو کرنا ہی کرنا ہے۔“ مائین نے اسے شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ ”بھائی آپ کی بات مان
 لیں۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ اس کے کرتے ہیں۔“ فردوس بیگم نے بے حد بیٹھے لیے میں کہنے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”تم
 ہی اس بات کو۔“

ایقان کو کوئی بھی نہیں تھی۔ یہی ہر چند کہ اس کا اپنا دل اس کام کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔
 ”فردوس! تم مائین کا ہاں دینا نہ سمجھیں۔“ مائین کے شوہر طیفم کو اس کوٹے جانے کے لیے اتا تھا اور وہ
 ان باتوں سے بے خبر تھا۔ ”ایقان! میں جاننا چاہتی تھیں۔“

”پچھو۔۔۔ پچھو۔۔۔“ ایقان نے بے بسی سے اپنی کی سمت دیکھا کہ شاید اچھی بات کا کوئی سرا ہاتھ لگے۔
 ”بھائی! ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ مائین دیر سے بولی۔ ”اور کہتے ہیں کہ اس فیصلے میں کوئی
 رد بدل ممکن نہیں ہے۔ باتو شادی کریں گے ہی نہیں یا صرف وہ صرف ڈاکٹر شہلا!“

”مالی گاڑ!“ ایقان نے سرحاقم لیا ”آپ ہم اب تک۔“
 ”چلو اس کی شادی سے پہلے کھانا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کام کے واسطے تھا۔“ اچھی بات لگتی تھی۔ میں بھی
 لگتی تھی۔ اس لڑکے کے تو تیوری پیدا تھے۔ تمہاری دوانت کاٹنے کی دہائی تھی۔ تم سے کیا پوچھ رہا ہے۔“

انہوں نے اشاروں اشاروں میں اسے پچھل باتیں یاد دلایں۔ ”اب، اب ہم کچھ کی بات کو اسے سب سے بڑے
 بیٹے کی دلہن بنا لیں تو کسی بھدا اڑے کی پورے خاندان میں کہ لو! ان فٹوں کو نکال ڈالو۔ اسی بیٹے پر اترا جی بھرتی
 نہیں لے آئیں مطلقہ گھڑوں کی پوری!“

انہوں نے بیگم نصرت سے خود کو ٹوٹنے والے طعنے ملاحظہ کیے۔
 ایقان کیا کہتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے لیے دل کو اس خیال سے راخت سی لی تھی۔ اس کی
 عزیز از جان دوست کا گھر پھر سے بس جا رہا تھا۔ تنہا بھلا ہوتا ایک معصوم بچے کی پاپ کے نام کا سامنا کرنا لیا تھا۔
 لیکن ظالم زمانے کی دیکھیں! اس کی عزت نام بھائی کی بھدا نہ اڑ جاتی پورے خاندان میں اس نقصان کا ازالہ بھلا
 کس طرح ہو پائے۔

”کس سوچ میں رہ گئیں تم۔“ فردوس بیگم پریشان ہوئیں۔ ”سکے کا کچھ حل بتاؤ۔“

ایقان نے بیگم نصرت سے خود کو ٹوٹنے والے طعنے ملاحظہ کیے۔
 ایقان کیا کہتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے لیے دل کو اس خیال سے راخت سی لی تھی۔ اس کی
 عزیز از جان دوست کا گھر پھر سے بس جا رہا تھا۔ تنہا بھلا ہوتا ایک معصوم بچے کی پاپ کے نام کا سامنا کرنا لیا تھا۔
 لیکن ظالم زمانے کی دیکھیں! اس کی عزت نام بھائی کی بھدا نہ اڑ جاتی پورے خاندان میں اس نقصان کا ازالہ بھلا
 کس طرح ہو پائے۔
 ”کس سوچ میں رہ گئیں تم۔“ فردوس بیگم پریشان ہوئیں۔ ”سکے کا کچھ حل بتاؤ۔“

”بے قاعدگی ہے؟“ ایقان نے تسبیح کی۔

”کوئی آیا تھا کیا؟“ اس نے لوازمات سے بھری ہلنوں پر نگاہ کی۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر سر ہل گیا۔

”ہاں۔“ پھر وہ بولی۔ ”بوس کی فیملی تھی۔“

”بھیس اچھا ہے، فلٹ سسٹم بڑا کامیاب ہے اسی لیے۔“ وہ جیسی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگا۔

”پچھو کا خیال آگیا کسی کام سے آئے ہو؟“ اس نے کن اکیوں سے اسے دیکھا ”ایسے تو آنے والے نہیں ہوتے لوگ۔“

”راغ نہیں دیا۔“

”ٹھیک، بھیس ڈیڑ پچھو! بے حد ضروری کام سے آئے ہیں۔“ اب وہ سوسوں پر ہاتھ صاف کرتے لگا تھا۔

”لیکن ذرا بیہوش کر بات کرتے ہیں آرام سے۔“

”وفہ، اسی لڑکی کا چکر ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

”راغ کا تھک جانا ہوا ہاتھ رک گیا۔“

”دینا شک اپو آر گریٹ۔“ وہ خیر سے بولا۔

ایقان مسکرا دی۔

اسے اپنے کپے کے کروہ تیلوں تیرس پر بڑی کر سیدی کی جڑوٹشٹا تاروں کے بھر ہوا آسمان اور نیچے روشنیوں سے سچا شہریت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔ ایقان نے دیکھا وہ دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کے اشارے کر رہے تھے اس نے مشکل اسکرپٹ کی اور سنجیدگی صورت ہمار بھی رہی۔

”ہم! بالا خرہ راغ کھنکھارا۔“ ڈیڑ پچھو ایک گھبر سا مسئلہ درپیش ہے جس کے لیے آپ کے رطلوں اور پر زور اتحادوں کی اشد ضرورت ہے۔“

”چھا! وہ اتنا ہی بولی۔“

ان دونوں نے پھر ہنگاموں کا تبادلہ کیا۔

”کچھ بڑے متعلق تو آپ سے سنا ہو گا؟“ راغ پھر بولا۔

”ہاں، تو ہنسی آئی۔ ایقان بھی ہنسی دی۔“

”بد نہیں! ہاشم نے اسے گھورا۔“ ٹھیک طرح بات کرونا۔“

”بھئی میں مسرہ باندھ رہا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کون شکار ہو گیا کوئی کدے تیر کا؟“ ایقان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پرانی بات ہے پچھو جانی۔“ راغ نے مزہ لہ بھری۔ ”لیکن ذمہ ہے کہ بھرتا نہیں بڑیاں شاعر۔“

”بہت محبت بھی ہے کیا“

”جس کو بھولے“

”تم اپنی بات کر رہے ہو یا ہاشم؟“ ایقان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں، رے بابا!۔“ راغ نے کانوں کو ہاتھ لگا دیا۔ ”اپنا تو یہ ڈیڑ ہنٹ ہی نہیں ہے نا۔ عشق کا دیو تاؤنہ ہے۔“

”بیٹھا ہے۔ یہ آپ کا عزیز اذجان بیٹھا۔“

ایقان نے ہاشم کو دیکھا وہ سر تھکے بیٹھا تھا وہ مسکرا دی۔

URDU PHOTO

”اور وہ دوش کون ہے؟“

”میں! راغ نے اب بھڑکنا پکھ۔“ راغ نے اسے گھر کا۔ ”اپنی بارات میں نہیں بیٹھے ہو۔“ ہاشم نے سر اٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں سے کسی بھی۔

”ہاں پچھو! میں محبت میں ہنڈرڈ پینٹ رازداری کا قائل ہوں لیکن اس جذبے کے ہاتھوں ایک مرتبہ بہت سخت قسم کا قصاص اٹھنا چکا ہوں۔ اب تک دل ناواں بھرنا ہے۔“ اس لیے اس مرتبہ بہت مجبور ہو کر اس کا ہاتھ لے

رہا ہوں۔“

”ہاں! ایقان نے چپکے آنکھوں سے اسے دیکھا ”کیا نام ہے؟“

”شہلا!۔“ وہ بے ساختگی سے یوں بولا تھا جیسے لبوں کے جیش سے کنول کھلایا ہو۔ اس کی نظروں سے خوشبو

پھولی تھی۔ چہرے پر سے جیسے کوئی ستارہ گزرا تھا۔ ایقان مسہوت رہ گئی۔

”بہت جانتے ہو نا؟“ اس نے بے ساختگی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”بہت پچھو!۔“ وہ بے بس ہو گیا۔

”کیسی؟“

”ٹھیک ہوں پچھو؟“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”آپ میرے ساتھ ہیں۔“ وہ یقین سے بولی۔

”آپ رازداری؟“ اس نے ہاشم کے ہاتھ دبائے۔ راغ ہونٹوں کی مانند ان دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا وہ تو

کچھ طویل جتن کا سوا کیا تھا مگر اسان تو کچھ بھر میں سب معاملات طے ہو گئے تھے۔ ”پھر میں کیا کروں پچھو؟“

”اوں کوئی بات؟“

”شہلا!۔“ اپنی تو بولی میں گم۔ ”اس نے چپکے بولی۔“

”اپنا پچھو!۔“ راغ نے اس کے گھٹنے میں سنبھل تھی۔

”چل برخواست!۔“ اس نے اس کے پیچھے سے گواہ کیا تھا۔ ”ان باتوں کو تیرا تو یہ ڈیڑ ہنٹ ہی نہیں۔“

رات ہے حد خوب صورت تھی۔ نور سے جلی ہوئی محبت بھری ہواؤں سے کبر ہاشم تادیر روہیے میں کھڑا رہا۔

ایک بانو ٹھنڈی آئی جو کھٹ سے نکالے دوسرا ہاتھ پیٹت کی جنب میں ڈالے وہ نیچائے کیا کچھ سوچے چلا جا رہا تھا۔

ٹھنڈی دوا بار بار اس کی پیشانی پر کھڑے ہاؤں سے اٹھنا چھیلنا کرنے چلی آئی تھی۔

میں اس تک کہ دیوار پر لگے کلاک نے بار بجنے کا اعلان کیا۔ ہاشم نے ابھی ابھی کی نظروں سے کلاک کی سمت

دیکھا۔ چہرہ دوسرے دوسرے قدم اٹھنا ناخن تک چلا آیا۔ ”تو آج یہ دیر پار کر گئی لو!۔“ اس نے خود سے کہا اور ریپور

اٹھا کر ٹھوڑا کل کرنے لگا۔

دوسری جانب بیل جاری تھی۔ ہاشم کو اپنے دل کی دوسرے صاف ستائی دے رہی تھی۔

”میلو۔“ چند لمحوں میں نیند کی بھری آواز ریپور سے ابھری تھی۔ ”ڈا! ٹھنڈا پھنڈو۔“

”میلو!۔“ اس نے دوبارہ کہا تھا ہاشم دوسرے سے مسکرا دیا۔

(بانی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

”خلف خفاقی سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے گھر پہنچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرفان شونک سے جو اس کے گھر کی نمائندگی کرتا تھا۔ غصہ نہ خالی تھا جس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

”بیچہ متواتر ایک خوب دیکھ رہی ہے کہ دادی کی محراب میں شادی پر اس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے رنگ میں دیگر کاندھات کے ساتھ خطوط اور نصاب پر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ یہ سہرہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ شخص بالواس کی بیوی ہیں اور ان کا ایڈریس پاکوہ کی قدر مضمون ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑا ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

”کونسل میں پاپس ہو جاتی ہے۔

د رافع اس کا بار غار تھا۔ دونوں میں کوئی بات چھپی نہ تھی۔ لیکن ہاشم نے اپنے جذبات کی ہوا اسے بھی نہ لگے دی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں اور طرح کے لڑکے تھے۔ ان کے درمیان فرس اور ٹیمسٹری کے مختلف ٹاپکس زیر بحث رہتے یا قدیم شعراء کی غزلیں۔ لڑکیوں کی باتوں سے انہیں سروکار نہ تھا۔ عشق عاشقی کے قصے وہ گفتگو میں نہ لاتے تھے۔

رافع نے حد مختلف تھا۔ اسے آنچلوں کے دھنک رنگ متوجہ کرتے تھے۔ ہی ہنسی کی جھنکار پر وہ کبھی پلٹ کر دیکھتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ نرا کورا اور قدرے بے حس تھا۔ ایسے میں اپنے جی کی بات اس سے کہنا ہاشم کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ شاید اپنے آپ سے گھبرا کر وہ کبھی اس سے کچھ کہہ سکتا تھا۔

لیکن بہر حال خوشبو کہیں نہ کہیں اپنا سراغ چھوڑی جاتی ہے۔ رافع نے ایک دن اس کی چوری پکڑی لی تھی۔ ایقان اور شہلا کا زلٹ آیا تھا۔ دونوں نے بہت اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا تھا اور اب وہ دونوں مل کر سب سیلیوں کو دعوت دے رہی تھیں۔ بہت دن تک دونوں کے مابین یہ جھگڑا چلتا رہا کہ دعوت ایقان کے گھر ہوگی یا شہلا کے گھر۔ پھر حسب معمول ایقان جیت گئی تھی۔ شہلا بحث میں اس سے ہمیشہ ہار جاتی تھی۔

دعوت کا دن آگیا۔ ان دونوں نے کچھ عرصے گھر پر تیار کیا۔ اور کچھ بازار سے منگوا لیں۔ رنگ برنگے آجمل لالان میں لہرائے گئے۔ تقریباً نصف ہر طرف سے بھر رہے تھے۔ ہاشم اپنے گھر سے بیٹھا ایک پرانا ریڈیو ٹھیکہ کر رہا تھا جب چیم چیم کرتی ایقان اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

”ہاشم! ذرا ہماری مدد کر دو!“ ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے ہنسی آگئی۔ وہ دن بھی منور دی گئی تھی گویا کسی شادی میں جاری ہو۔ وہاں رنگ کا جھڑا گھڑی گھڑے سے سجا ہوا تھا۔ پچھلے میں ابجا بھڑوٹے ہوئے تھے۔ گولڈن بالیاں پہنے اور بہت سامیک اپ کیے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہاشم نے ہنسنے پر اس کا ایک بالی جڑھ گنبن۔ اس نے ہاشم کا کان پکڑ لیا۔

”کیوں جھپٹے؟ میں بڑا تو ہوں۔“ وہ نہیں صرف لگ رہی ہیں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔

”اچھا یہ بات ہے؟ بھائی جان سے کہتی ہوں۔“ وہ خطرناک تیور لیے مڑی تھی۔

”ارے پیچھو! میری کیوٹ سی پیچھو! ایسا غضب نہ کریں۔“ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”جو چاہیں سزا سنا دیں۔ کہیں تو منوں حلوائی کی دکان سے کوئی موسٹ فیورٹ آسٹم لا دوں۔“ ایقان ہنس دی۔

”تد تیز کہیں کے“ آج منوں حلوائی کے سارے موسٹ فیورٹ آسٹم نیچے ٹیبل پر موجود ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایک عدد فوٹو گرافر درکار ہے جو ہم سیلیوں کے اچھے اچھے فوٹو بناوے۔“

”وہ نوسہ پلین پیچھو! یہ اپنے بس کا کام نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

لیکن وہ ایقان ہی کیا جو کسی کی معذرت کو خاطر میں لاتی۔ اسے کھینچتے ہوئے حسینوں کے جھر مٹ میں لے گئی جہاں لڑکیوں کو ہنسنے ہنسنے اور صرف ہنسنے کا کام تھا۔

شہلا نے آج پھر اپنی گھٹاؤں کو کسی کے دل پر برسنے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرون، بلنک اور وہاٹ کنفراسٹ کے امیر اینڈ ڈسٹ میں وہ بے تحاشا لپوے رہی تھی۔ میرون آئی شیڈ سے کجی سیاہ آنکھیں چند ایک بار نہایت بے نیازی سے اس کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں اور ایک شناساسی چمک کے سوا ان میں کچھ نہ تھا۔

و خوش تھی۔ بے حد خوش۔ میڈیکل میں اس کا داخلہ یقینی ہو چلا تھا۔ ہاشم نے تصویریں مکمل کر کے کیمرو
ایقان کے حوالے کیا اور دل کے فریم میں اس کی سسرانی تصویر سجا کر بیٹا آیا۔ چند دن بعد رافع اس کے پاس پہنچا۔
”تھیں چھوٹی دوست میں انٹرنل ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔
ہاشم کی شہی تم ہو گئی۔ اس نے گھر کا رادر اور دیکھا پھر جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔
”تمہیں کس نے بتایا؟“ اس نے حواس باختگی سے پوچھا۔
رافع لب بلیچر مگر ساہوا۔
”تمہارے بھوت تھے۔ رات کو میرے پاس آیا تھا۔ شمشلا شمشلا کرتا ہوا۔“
”اے جیسے کہ“ ہاشم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”گوئی سن لے گا۔“
”اور جو کوئی یہ سب دیکھ لے؟“ اس نے ایک لفافہ کی اس کی آنکھوں کے سامنے لڑھکایا۔ ”وہ کیا کہے گا؟“
”کیا یہ ہے؟“
”تمہاری خاموش محبت کا منہ بولنا بلکہ حلق بھاڑ کر چیخا بیٹہ۔“
ہاشم نے لفافہ چھینا اور میز پر الٹ دیا۔ پوری میز پر شمشلا کی تصویریں بکھری تھیں۔ وہ سرسری سب شمشلا کی
تصویریں تھیں۔
”تھیں چھوٹے بچے بعد اصرار بھیجا تھا رول دھولے بچے کے لیے، وہ دعوت نامہ تھا اور دیکھنے کے لیے بے تاب تھی
اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دعوت میں سوائے شمشلا کے اور کوئی شمشلا نہیں ہو سکتا۔ تم کو تو میں یہ تصاویر
پھینک دوں؟“
ہاشم سر تھا ہے۔ بیٹھا تھا۔ اپنی اس بے اختیار حرکت سے وہ خود غلام تھا۔ اس روز وہ شمشلا کو سنا سنو رادیکہ کر رہے
خود ضرور ہوا تھا لیکن اتنا بے خود ہو گیا تھا یہ اسے خبر نہ تھی۔ اس نے حرا و حراس کی تصاویر بنا ڈالی تھیں۔ اپنی
باتوں میں ملن، تھیں لگائی الزود شیرازوں کو اس حادثے کی خبری نہ ہو سکتی۔ البتہ چند ایک گروپ فوٹوز ضرور تھے جو
انہوں نے خاص طور پر ساتھ کھڑے ہو کر کوائے تھے۔
”کیا کہتے ہو؟“ رافع نے اسے گھورا۔
”اب کہنے کو کیا بچا ہے؟“ وہ حراساری سے بولا۔
”یہ سوچو جو توں سے کہے ہو گے۔“
”تم سوچو جو دوست ایسے وقت میں ہی کام آتے ہیں۔“
”وہ تو کسی اس وقت کہاں تھی جب میں رادوئی پال رہے تھے؟“ رافع نے سر جھٹکا۔
”وہ تو کسی سے تو ہے ورنہ تم یہ تصاویر مجھے نہیں پھینک دو گیتے۔“ ہاشم ہنسا۔
رافع نے اسے غصے سے گھورا۔
”شرم تو نام کو نہیں ہے۔“
”شرم ہی تو ہے۔“ ہاشم ہنسنایا۔
”اب یہ تصویریں رگھو کے پاس پھینک دو؟“ اس نے اکتا کر پوچھا۔
اس بار ہاشم نے اسے غصے سے گھورا تھا۔
ایقان کو بلا کر اطلاع دی گئی کہ رول خراب تھا چند ایک گروپ فوٹوز ٹھیک آئے ہیں باقی سب تصاویر ضائع
ہو گئی ہیں۔

PHOTO

ایقان کو مینوں اس حادثے کا غم رہا تھا۔

شمسلا کا داخلہ میڈیکل میں ہو گیا تھا۔ ایقان کو سائنس کے شکستہ سیکشن میں دل چسپی نہ تھی۔ اس نے
آرٹس کے مضامین منتخب کر لیے۔ یوں ان دنوں کی راہیں قدرے جدا ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ملتیں
اتنے ہی وہ امانت دین سے ملتا کرتیں۔ ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کرتے ہوئے۔ آدھی آدھی رات تک
سردی گرمی سے بے نیاز لائن میں چل قدمی کرتیں۔ سرگوشیوں میں باتیں کیے جاتیں۔ ان دنوں ان دنوں کے
انداز بے حد راز دارانہ ہو گئے تھے۔ ان کی باتیں سمجھنے سے نہ آتی تھیں۔ شمشلا کے گھر سے بار بار فون آتے
تھے وہ گھر جانے پر رضامند ہوتی تھی یا ایقان انکس کے گھر گئی ہوتی تو اسے واپس لانا دشوار ہوتا تھا۔
ہاشم سے اکثر شیئر اس کا سامنا ہوتا تھا۔ اس کا حسن ان دنوں دو آئینہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے اتنی اچھی اتنی
خوبصورت لگتی تھی کہ وہ گھر اگر سر جھٹکا کرتا۔
”تک تک بونہی بے وفوں جیسی محبت کرتے رہو گے؟“ رافع اسے سوچ میں گم دیکھ کر پڑ جاتا۔
”مطلب؟“ میں نے کیا بے وفائی کر دی؟“
”اس سے کہہ کیوں نہیں؟“
”کیا؟“ وہ حیران ہوا تھا۔
”وہی بات جو تم میں اتنا دیرینہ رشتہ ہے پہلی یا دوسری ملاقات میں ہی کہہ ڈالتا ہے۔“ رافع ہنسنے سے کہتا۔
”تک بونہی؟“ وہ ہنسنے لگا۔ ”میں نے اب کو اس کی نظروں میں ذیل کر دیوں؟“
”جی ہاں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”میں نے اب کو اس کے سوال پر ہاشم سوچ میں پڑ جاتا۔
ایقان دن ایک ایک سے فوٹو لائی انداز میں اس عیش پوشیہ کا انجام سامنے آیا تھا۔ شمشلا نے اپنے کلاس فیلو
سے کوئی ایکسٹریکٹ کر لیا۔
میڈیکل کے شہرے جہاں میں سائنس سے وقت میں جا کر بڑا ہی کرلی تھی۔ ”حیات دلا“ میں جس نے خبریں
پڑھیں تھیں وہ اب بھی وہی تھیں۔
”سب کچھ جیسے لمبا سیٹ ہو گیا۔ شدید ڈپریشن کے باعث اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔ یوں ”حیات دلا“ کے
ہوں میں جیسے جیسے خبریں ملتی تھیں کہ ہاشم ایقان کی پہلی کو بے حد حساب چاہتا تھا۔
ایقان پہلی پھر کر رہی۔ اپنے گھر والوں کی نگاہوں سے چھٹی پھرتی تھی۔ پھر حراس کا رشتہ کیا اور وہ دنوں میں بیاہ کر لیا
دہس بد حراس کی۔
کچھ دنوں میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ وقت کی دھیرے دھیرے گرتی پھوڑا ہر یاد کو مٹا دلتی تھی۔ لوگ
بھول بھال گئے۔ شمشلا کی لومینج ایقان کا قصہ ہاشم کا ڈپریشن، قصہ بارنہ بن گئے۔ ہاشم ایک بے حد پیچیدہ طبع
نوجوان کے روپ میں اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ تھیں سال بھر بعد خبر ملی تھی کہ شمشلا
ملاقات کے کر اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی ہے۔ وہ ماں بیٹے والی تھی اور اس نے پڑھائی کا ٹونا ہوا اسلئے پھرے
جو زما تھا۔

رات آجی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ بیکر پر کھڑی خود سے اوپر اگل ہوواں سے اچھڑ رہی تھی۔ فضا میں بے حد خنکی تھی۔ اسے سردی لگنے لگی تھی۔ اس نے توجہ نہ دی۔ یونی وندوں کا ہانڈ اپنے گرد لپیٹے ہوئے کونوں کے اوراق پٹنے کی کوشش کر رہی۔

ایک خاموش طبع سنجیدہ سالاکا۔ جسے اس نے کبھی اس بات سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہتا ہے۔ جس میں اس کی عزیز ترین سہیلی رہتی ہے۔
 بس ایک سو سو سالہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے حد اسٹائلش سوٹ سلویا تھا۔ اس کے متاسب جسم پر لباس چمک گیا تھا۔ مگر تک لائے سیاہ بال کو لے کر وہ اپنے کے سامنے کھڑی تھی جب اقبال جلی آئی۔

شملہ نے اسے شہر کے مشہور ٹیل کا نام بتایا۔
 ”دیکھا میں کبھی نہیں ہوں، یہ تو سارا اسلامی کا کمال ہے۔ انہی میری اماں بھی نا، محلے کی دوڑوں کا اچان نہیں چھوڑا۔ میں سمجھ سے کہتی ہوں، ہم خود سلائی کی کھوڑا اپنے کپڑے سیاہی دیکھتی ممدی کی باتیں کر رہی تھی۔ آؤنا شہلا اماں کو تمہارے کپڑے دکھاؤں گی۔ ان سے پوچھوں بھلا ان کی کاروباری سیل سے کتنے ڈولیں۔“
 لیکن اقبال نے کہا۔ ”اس کی بات بولیں ہی نہیں رہی۔“
 وہ اس کا ہاتھ تھا۔ اپنی وجہ میں بولی تھی اسے ”حیات“ کے نام سے ایک شہلا لوبال پلٹ کر جو اس کے بنائے رہا تھا۔ تب وہاں کھڑے ہاتھ کی حرکت کے ذریعہ اس نے اس کے بال چھس گئے تھے۔
 افسانے کس قدر شرمندہ ہوئی تھی۔ بال کھینچنے کے دوران اس کی لمبیں کاٹیں بھی ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن اس نے چارے نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ بے سیدھا سادہ سا نوجوان تھا۔ خوش کن رہنے والا، نیچے نظروں کے ساتھ مخاطب کرنے والا۔ بعد میں جب بھی اس کا سامنا ہوتا تھا تو وہ قیامت پورا کرتا۔ اس کے لبوں پر مسکراتی مسکراتی آجانی لیکن وہ نہ بڑی سی سنجیدہ رہتا تھا۔

اور اب اتنے سال بعد وہ کمر ہاتھ کر اسے شملہ سے محبت تھی بھلا کیسی محبت تھی۔ یہ لوگ اس طرح بھی کسی کو چاہتے ہیں کہ بوند بھر جائے نہ برے؟ محبت تو وہ ہے جو ٹوٹ کر رہے۔ جل تھل کر ڈالے۔ تن میں جھجک جائے۔ ماس میں لینے کی سکت نہ رہے۔

وہ محبت جو ابراہار جیلانی نے اس سے کی۔
 وہ محبت جو شملہ نے ابراہار جیلانی سے کی۔
 کانچ میں پلے، پہلی نگاہ میں اس کا سہرہ ہونے والا ابراہار جیلانی بھی ایسا نہ تھا کہ نظروں انداز کیا جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دونوں پورے کانچ کی گفتگو کا محور بن گئے تھے۔ پھر شہر تو سب کان کی طوفانی محبت سے واقف تھے۔
 وہ دونوں ہر جگہ، ہر مل ساتھ ہوتے تھے۔

ابراہار کا حلق اندرون ملک سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ گاؤں میں ان کی شاندار راجہ تھی جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ ابراہار بڑھائی کی غرض سے شہر میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے والد اسے شہر بھیج کر اس سے بے خبر تھے۔ بہت جلد ان کے عشق کی خوشبو گھر میں پھیل گئی تھی۔
 ”یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟“ ابراہار کی ماں نے سخت احتجاج کیا تھا۔
 ”شہلا بیٹی! اپنے رستے اس سے علیحدہ کر دے۔ ایک دوڑے باپ کی عاثرانہ استدعا ہے۔“ محسن علی صاحب نے تنگے تنگے لہجے میں اس سے کہا تھا۔
 ان دنوں نے بنا سوچے کچھ کورٹ میں کر لی تھی۔ محبت کا زہر نس میں پھیل چکا تھا۔ اسے رگوں سے

نکل کر پھینک دیے کا یاد دونوں میں نہ تھا۔
 ابراہار اسے اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ کالج جایا کرتے، ساتھ لوٹے، دونوں جانب کے خاندان والے حالت کھتے کے حالت میں تھے اور وہ ”کھتے“ کی اس حالت کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔
 شملہ کے باپوں میں پر نہ تھے۔ وہ دیکھتے ہوئے اس میں اڑ رہی تھی۔

اس کا چاہنے والا اسے ہر گھر سرائے والا اب دن رات اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی جھوٹی لٹ کوٹھا کر اس کے کان میں گھر گشتیں کرتا۔ وہ اپنی گردن پر اس کے سانسوں کی محسوس کرتی تھی۔ ساری دنیا اس کی ہتھیلی پر مس تلی تھی۔
 تب ایک دن ابراہار کے والد انہیں لینے آ گئے۔ انہیں اپنی ضد منگی پڑی تھی اب وہ سستہ سستہ کرنا چاہتے تھے۔
 وہ شملہ کو اپنی بہو کے روپ میں قبول کرنے پر آمادہ تھے۔

ابراہار نے بد خوش تھا۔ اپنے باپ کے بغیر وہ کچھ بھی نہ تھا اور اب کے ساتھ بہت کچھ۔
 وہ جیلانی ہاؤس جلی آئی۔ لیکن کی طرح حج سنو کر۔ سرخ جوڑا پر کپڑا ڈھیر سارا زریور بن کر۔ ”جیلانی ہاؤس“ میں اس کا دل ہاتھ لیا گیا۔

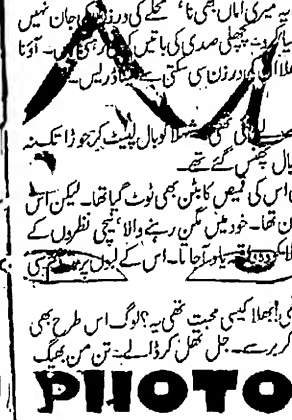
”میری بہو۔“ اسے ایک مہر عورت سے اسے ملواتے ہوئے بتایا گیا۔
 شملہ نے اپنی نظروں کے ساتھ سلام کیا۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر دونوں سے بھر اقبال اس پر سے واڈ کر ملازمہ کو رہا دیا۔
 ”اس سے۔“ شملہ اور عورت اس کے مقابل تھی۔

”خاتون کی بیٹی۔“ ابراہار کی پہلی بیوی۔
 اس کے سر پر کونوں لٹے۔ اسے اسے عورتوں پر دھوکہ ہوا۔
 اس نے کبھی کبھار اس کے کونوں سے بھڑک کر دیکھا جس کے چہرے پر پروانی تھی۔
 ”کوننا؟“ اس نے اس سے کہا۔ ”میں تو ان کے کونوں میں ہوں۔“

”تمہاری موت۔“ ابراہار کی پہلی بیوی۔ ”انہوں نے میرا طہیوان سے بتایا تھا۔“ اس نے اپنی بڑی بہن کی طرح شہلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا۔ اسے بھر کچھ دکھائی نہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا رہیں ہوئیں۔ کس نے کیا منہ دکھائی دی۔ اسے علم نہ تھا۔ اسے صرف آنے والی رات کا انتظار تھا۔

ابراہار جیلانی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اس نے بری طرح سے جھٹک دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خزان ہوا پھر ستر کر دیا۔
 ”یار! پہلے بندے کو کیونہ نس کا موقع تو ہو۔“
 ”اتر بار دھو کا اتنی چیٹنگ! اس کی آنکھیں ڈھانچا گیا۔“

”کون کی دھو کا نہیں ہوگا۔ کوئی چیٹنگ نہیں ہوگی۔ میری ہمت بن کر۔“ وہ معاملہ انداز میں بولا۔
 ”کچھ مجھے نہیں سنا۔ تم کیا میرا سے؟“ وہ پوچھتی تھی۔
 ”ہر سنا۔“ وہ سنجیدہ ہوا۔ ”میں اس پر تو انہیں چلے گا۔ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔“
 شملہ نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔



”میں خود اس کمرے سے چلی جاتی ہوں۔“ وہ تکی سے بولی۔ ”تم مجھے چاہو یا لاؤ؟“

”اوفت!“ اس نے سر قدام لیا۔ ”شہلا! ابراہان کو ڈانڈنا سنیڈ! میری اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ وہ تم میں مجھ سے پورے سات سال بڑی ہے۔ میرا نکاح چودہ برس کی عمر میں کر دیا گیا تھا جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور مجھے شادی بیاہ اور دلوروں کی کچھ خبر نہ تھی۔ مجھے اس انتہا پر تھا کہ میری بہن کی شادی اس کے بڑے بھائی کے بوری سے ہے اس لیے اسے ہمارے گھر آتا ہے۔ تم خود سوچو چودہ برس کے لڑکائی لڑکے کو بھلا ان باتوں سے کہ سروکار ہے مجھ سے مولوی نے ہاں کر لیا تھا میں نے کہہ دیا۔ نکاح تادمہ میرے آگے کر دیا گیا۔ میں نے اپنا نام لکھ دیا۔ کیا تم اس کو دعو کا قریب اور چہنچہنگی کو لگی؟“

”لیکن تم یہ سب کچھ مجھے تب بھی کہتے تھے۔“ وہ آنسوؤں کا گولہ لگتے ہوئے بولی۔

”بیاہو رہا ہوں۔“

شہلا نے شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ فہم دیا۔

”مجھے ڈر تھا شہلا! میں نہیں کھونہ دوں۔ اس معمولی سی بات سے میرا اپنا ہوا نقصان ہو جائے۔ یہ بات ہم نہیں بوری تھی۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس بات کی کسی اور صورت تک پر دست ڈال دیا جائے۔ بہر حال آج وہ سوچ گریڈ۔“

”میں ابراہان کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔“ اس کا دلکھ کھنکھاتا تھا۔

”ہاں میری جان! مجھ سے غلطی ہوئی نہیں میں نے تمہارا دل دیکھا لیکن پھر شہلا باپ کے جہلانہ فیصلوں کی سزا مجھے نہ دی۔ تم اس سے ملی ہو کر دیکھو اب اس سے کہ تم اس سے کوئی خطرہ محسوس کرو؟“

شہلا خاموشی سے سر جھکا کر کچھ مٹی تھی۔

”تم نے اس کے ساتھ ازواجی تعلقات۔ میرا مطلب ہے۔“

”ہاں! ہمارے دوست ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

شہلا نے سر خم کر دیا تھا۔

”لاٹش! جھجھو! میں سونا چاہتی ہوں۔“

”شہلا!“ اس نے اسے جھجھو۔

”ابراہان! پلیر! اس کے اندر آنسو گر رہے تھے۔

وہ آنسوؤں سے پیچھے ہٹ گیا۔



”مجھ کو تو سر حال اسے کرنا ہی تھا اور یہ بات ابراہان جیلائی بھی بخوبی جانتا تھا۔ وہ اسے لانے سے پہلے اس کے پر کٹ چکا تھا۔“

ابراہان کی تھیں دہائی ایک طرف لیکن ”جیلائی ہاؤس“ میں مختار جیلائی کا حکم چلتا تھا۔ شہلا اور خاتون بی بی کے مابین ابراہان کی راتیں اور دن تقسیم کرنے کے لئے تھوڑے عرصہ ایک رات اور ایک دن شہلا کے ساتھ گزارا اور اگلی رات اور اگلے دن اپنی پہلی اور خاتون بی بی کے ہمراہ۔ شہلا میں اب کشتابی کی تاب نہ تھی۔ وہ محض آنسو بہانے پر قادر تھی۔

”دیکھو جانو! چند دنوں کی بات ہے۔“ وہ اسے بولا۔ ”ہمیں شرلوٹا ہے۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنا ہے وہاں ہمارے بیچ صرف اور صرف ہماری محبت ہوگی سب دن سب راتیں ہماری ہوں گی۔“

شہلا روئے دل کو اس کی دلیلوں سے منانے کی کوشش کرتی۔ وہ دانتانہ مانتا مگر شہلا کو ماننا پڑا تالا آخر چھٹیوں کے دن کے کف و بے مزوں تمام ہوئے۔ کالج لکھنے کی تاریخ قریب آگئی شہلا کے چہرے پر بہت دن کے بعد رونق لوٹ آئی تھی۔

وہ اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھی جب حاجیانی بیگم یعنی اس کی ماس کمرے میں آئیں۔

”کیا کر رہی ہو؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”جی!“ وہ سیدھی ہوئی۔ ”اماں کا کالج مکمل گئے ہیں نا۔ اب شہر چاہیے۔ میں اسی کی تیاری کر رہی ہوں۔“

”میں!“ انہوں نے ایک لمبی ”میں!“ کی اور کمرے سے چلی گئیں۔ بیگم مکمل ہوئی تو ابراہان رند کر گیا تھا۔

”شہلا!“ اس کا انداز تھکا تھکا تھا۔

”جی!“

”یہ سامان کھول دو۔ شہر صرف میں جا رہا ہوں۔“

شہلا روبرو ہو گئی۔

”جی! جی! کڑی سزا مت دو مجھے۔ میں۔ میں۔ میرا دل گئی یہاں۔“

”ابراہان! تمہیں پڑھائی چھوڑنی ہوگی۔“ وہ بیزار نظر آ رہا تھا۔ ”اور۔ اور۔ اتنی محنت سے کیا حاصل کرو گی؟ ابلا! میں اس کا کچھ نہیں کر دے گا۔“ ”جیلائی ہاؤس“ کی ہمنواؤں، بیٹیوں کا کام نہیں کہ وہ عورتوں کے سچے بھائی ہیں۔ پھر ٹھیک ہے تو ہے۔ تم اپنا کچھ سنبھال لو یا دھو کی میاں تمہیں ہر طرح کا آرام ہے ہر کچھ کے لیے اس کو نوکر ہیں۔ تم راتیں کڑی کر رہی ہو۔ کون کون چکروں میں غوار ہو رہی ہو۔ میں ویک اینڈ پر آؤں گا۔“

شہلا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ساکت بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ پتا نہ دیکھنے کی یاد میں اس کی جیلائی کے لڑکے کی۔

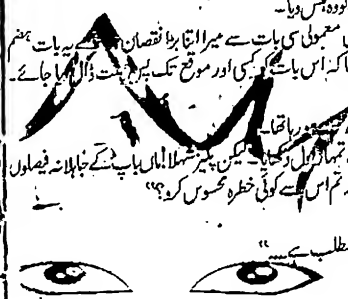
جتنے سے کچھ اور کھانا کھانے کی حالت میں باہر چلا گیا۔

”درو عشق کے بعد“

ماں باپ سا مظلوم رشتہ دنیا میں اور کوئی نہیں ہو تا۔ اولاد ڈھو کر مار کر جاتی ہے اور جب بلیتی ہے تو انہیں دلہیز پر ہی کرنا پڑا پاتی ہے۔ ان میں خود کو سہارا دے کر کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ وہ مولوی قذول کے مرئیں باپ نے اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ماں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی دلجوئی کی۔ کسی نے اسے ایک لفظ ملا تے کا نہ کہا تھا۔

محسن علی صاحب نے اسے تعلقات بڑھنے کا رلا تے ہوئے اس کا تیار دو سرے کالج میں کر دیا۔ شہلا نے بتیہ تعلیم اہل میں وہ کرکٹ میں بھی بے حد تیز ہوئے تھے۔ وہاں کی زندگی بھارتیوں کی آنکھوں کا نور تھا۔ خالد اور ماموں کا چہرہ تھا جتنا تھا۔

اور اب پر سبیل بعد اسے اس بیٹے کی یاد ستائی تھی جسے اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اب وہ رہ کر اسے کیوں پکار رہا تھا شہلا مجھے سے قاصر تھی۔



PHOTO

اشناک سے اسے رب کو پکارنے کے لیے ہسکتا وہ دشو کرتی۔ اہتمام سے لاپشہ باندھتی اور جاء نماز پر بیٹھ جاتی پھر وہ دعا کو پکارتے پکارتے اٹھا کر دادی کے سے انداز میں کہتی۔

”معاف کرے اللہ میاں کی۔ یہ بارے اللہ میاں کی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے اچھے اللہ میاں۔“ وہ کہے جاتی لیکن اس کے ماتھے پر قطرے نمودار نہ ہوتے اس کے گالوں پر پیش محسوس نہ ہوتی۔ وہ منہ ہاتھ پھیر کر جاء نماز سے اٹھ جاتی۔ اس کا بیڑا سی ویر میں ہی اپنے اللہ سے مطمئن ہو جاتا۔

”دادی! میں سمجھتی ہوں کہ آپ؟“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں پوچھتی۔

وہ آہستہ سے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتی۔ وہ دروازے تک پہنچتی تو پیچھے سے ان کی آواز آجاتی۔

”میں دادی۔“ اس کے قدم ہتھم جاتے۔

”جلدی آجاتا۔ میں روٹیاں دیکھ رہی ہوں۔“

”جی اجاڑ دوئی جان۔“ وہ نماز پڑھ کر بڑی سعادت مندی ہوئی ہوتی۔

دروازہ کھول کر بیٹا اندر آئی تھیں۔ ربیعہ اپنے خیالوں سے چونک کر رہ گئی۔ ایک گھری ہوئی عورت کے ہاتھ پر والی اور چند لٹے ہوئے کپڑے تھے۔ بجائے وہ ایسا بول کر کہتی تھیں۔ وہ جب کسی چیز پر نگاہ ڈالتی تھی تو اس کے اندر سے حد و حیاں سے نکال کر لیتی تھیں۔ ربیعہ ان کی آنکھوں میں کچھ نہ سمجھتی تھی۔ ان کے اندر سے کچھ ایسا تھا جس میں وہ پتھر نہیں اسے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیتی۔ ان پتھری نظروں نے اسے بھی غور سے گزر جانے کا اذن نہ دیا تھا۔

”میں نے کہا! بگاڑیں تمہیں۔ دن کے دن کسے پرے تم کو کھڑے کچ کر سوتی پڑی ہو۔ اپنے گھر میں تیرا، دیر تک سوتی تھیں؟“

ربیعہ شرمندہ ہو کر ستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر کو تہ لگا کر لگی۔

”بیابانی بستر مینے لگی تھیں۔“

”آپ رہنے دیں میں کروں گی پیچھو۔“

”پیچھو! وہ بھڑک اٹھیں۔“ میں کس رشتے سے تمہاری پیچھو میں جی پیچھی؟ مجھے پیچھو پیچھو کہہ کر مت پکارتا۔“

ربیعہ کہتا تھا جہاں تھے وہیں رک گئے چہرے پر سفیدی چھائی۔ وہ بے طرح شرمندہ ہوئی تھی۔

”موری۔ آئی۔“ اس نے زہر سے کہا۔ ”وہ ترانہ آپ کو پیچھو کہتی ہے تو میں نے سوچا۔“

”خیر! آئندہ خیال رکھنا۔ جلدی سے منہ دھو لو۔ میں نے تمہارے لیے ناشتہ بنا دیا ہے۔“ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ربیعہ نے آنکھیں بند کر کے بے بسی سے سر ہلایا۔ یہ عورت اس کے لیے ایک عمدہ ثابت ہو رہی تھی۔

بل میں تو دل میں ماشہ والا مزاج سمجھتا اس کے لیے حد مشکل تھا۔

اسے ترانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا اسے بھی اس گھر میں ایک سہارے کی کی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ ربیعہ نے محسوس کیا تھا مینا اور صولت سے مل کر گھر اور اس کے کیموں کو اپنے دباؤ میں اس طرح نے لیا ہوا تھا کہ کوئی بھی ان کے مشترکہ محاذ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک فاج ذہ شخص اپنے گھر میں پرانا کھانا کھاتا۔ کھانا کھا کر تار تار تھا کسی کو اس کی اور اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ دنوں ٹوکے پر اسرارہ شخصیتوں کے مالک تھے کہ تم کو کھانا دیتے۔ کسی سے کہی مخاطب ہوتے۔ اسے میں ترانہ تو حقیقتاً ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ وہ گھر کی واحد ہستی تھی جس نے ربیعہ کی آمد کو بے حد

دشمنی سے قبول کیا تھا۔

منہ دھو کر وہ کچن میں چلی آئی۔ ایک پلیٹ میں پر اٹھا بنا رکھا تھا۔ دوسری پلیٹ میں رات کا بچا ہوا ساں تھا۔ چولہے پر پڑے سلور کے گندے سے ساس پین میں غالباً چائے کا پانی کھول کھول کر اٹوھا ہو چکا تھا۔ ربیعہ کا جی متلایا اسے کبھی ایسی ایسی گندگی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔

داؤ کی صفائی پسندی تو خیر ملے بھر میں مشغور تھی لیکن اس کے آس پڑوس کے گھروں میں بھی گھروں کا عموماً اور بار بار جی جانے کا خصوصاً حد و حیاں رکھا جاتا تھا۔

ربیعہ نے کھانا ہوا پانی میں یک سر گرا دیا اور ساس پین کو ماتھے لگی۔ صاف بہتر ساس پین اس نے چولہے پر رکھا تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

وہ پتھر جی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔

مینا کچھ دیر بعد کچن میں داخل ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ایک نظر اٹھیں دیکھا۔

”تم ناشتہ کر لو تو ذرا! اپنے پھوپھا کا کمرہ صاف کر لو۔“ وہ بولیں۔

ربیعہ کے ذہن میں وہ گھر اور اس کی اشیاء محسوس کیں۔ اس کا نوالہ خلق سے اترا تا مشکل ہو گیا۔

”جی جی۔“ وہ پچھلی پچھلی آواز میں بولی۔

”وہ کچھ دیر بعد کچن میں داخل ہوئی۔ لیکن کھانا پکاتے پکاتے وقت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب تم آئی گئی ہو تو ظاہر ہے مجھے باقی فراڈی طرح تمہیں بھی کوئی نہ کوئی ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔ تم اپنے پھوپھا کا کام کر دیا کرو۔ پانی کا کم تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔ چائے کی پی۔“

”جی۔“ وہ پچھلی پچھلی آواز میں بولی۔

ان کے ذہن میں کچھ دیر سے اسے روز صاف کیا کرو۔ گندگی باہر گلی میں پڑی پانی میں گرا دیا کرو۔ جعدار روز سے روز سے اپنے گھر کے دو کمرے صاف کر کے واپس کمرے میں رکھا کرو۔ وہ بے چارے اب اٹھ کر ہاتھ دھو کر کچن میں آئے۔

”میں نے کچن میں آئی پڑی ان پر۔“ وہ رنب کاجی چاہتا ہے ایسے بستروں میں ہی فارغ ہونے کا یوں تو یہ تاب۔“

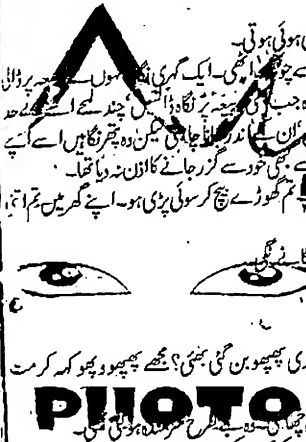
”انہوں نے رک کر اس کی کھال اڑا دی۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کی پلیٹ میں پڑا پر اٹھا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سالن پر

”ان کے بستر کی چادر ہر دوسرے روز تبدیل کر دیا۔ کہ ان کا ایک جوڑا روز استری کر کے ٹانگ دیا کرو۔“ اس کے رات کو آتے ہیں خود ہی تبدیل کر دیا۔ اس کے گے یہ ہم غور توں کا کام تو ہے نہیں۔ باقی یہ ہے کہ ٹب میں پانی بھر کر ان کا ہاتھ منہ دھو کر انہماں کا کام ہے۔ ان کی دواؤں کا حساب کتاب میں تمہیں بتا دوں گی۔ کس وقت کوئی سی دوا سنی مقدار میں پڑی ہے وہیں تھیں کر لیتا۔“

انہوں نے خود ہی چائے چھان کر اس کے سامنے کھ دی۔ ربیعہ کا دباغ سانس میں گرا تھا۔ اس نے کبھی اپنے گھر کا ٹوٹا ٹھنڈا ٹکٹ نہ دھو یا تھا۔ ایسے کاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہیں بھاگ جائے یا پھر حواں دھار روکے بس وہ کام اسے نہ کرنا پڑیں۔ جن کی فہرست اسے سنانی جاتی تھی۔

”اور بال۔“ منور بھائی کو پیاس کی بیماری ہے۔ انہیں ہر وقت بس پیاس کی ہی روتی ہے۔ کہ رو دیا رہتا ہے ان کے کمرے کا۔ خیال رہے۔ کبھی وہ کور خالی نہ ہونے پائے ورنہ سمجھو تمہاری شامت ہے۔ تم نے بھی رسی ہو میں کیا کر رہی ہوں؟“ وہ بھلا میں۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلایا۔ سر اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی



تھیں سوہا نہیں اپنے آئینہ دیکھا سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ انہیں حلق سے اندر لے کر کوشش میں مصروف رہی۔
 "میں نے ترانہ سے کہا ہے۔ تمہارے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرے۔" وہ پھر گویا ہوئیں۔
 ربیعہ کا دل اچانک مطمئن ہوا مگر اسے باہر کی نوکری یقیناً ٹھیک نہ لگتی تھی۔ اس نوکری سے بستر ہوئی۔ اسے اپنی عافیت کی ایک راہ نظر آئے گی۔
 "لیکن میں نے اس سے کہا ہے کہ نوکری شام کی ہونی چاہیے۔" انہوں نے مزید کہا۔ "جس میں تو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں اس کی گھر میں جان کھا کر اوروں کو روک دیتی ہوں۔"
 وہ اطمینان سے چن سے باہر نکل گئیں۔
 ربیعہ نے سوال دیا۔



وہ کرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر جانے کے لیے کڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا اور اندر داخل ہو گئی۔
 "کھول کھول کھول۔" بستر پر والا چاروہ دوسری طرح ٹھانسنے لگا۔
 ربیعہ کے اندر ہندوئی اور غلوں کی لڑائی تھی۔ وہ ان کے قریب سے گزرتی تھی۔
 "چلو بھاگ جاؤ۔" وہ ان کے پاس بٹھے گی لیکن اس کے دل میں اسے ایسی آواز تھی۔ ان کے نفس وہ بستر پر بیٹھا۔
 "ایسا آسان کام نہ تھا۔ بستر کے نیچے کی ہوئی باہر کی پرکھیاں۔" انہیں اور اس کی بدلو سے دبا چھایا تھا۔
 پلے در پلے انکھوں سے ربیعہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ اچھ کر ایک لمحہ سے پشیمان ہو کر باہر نکل گئی اور دروازے سے ٹیک دیا کہنا چلی گئی۔
 "یا اللہ۔" اس کے دل سے دررو کی ضرورت لگا تھا۔ "مجھے مہمانت کر۔"

ابستہ گلوں پر پیش کا احساس ہوا۔ اسے تھپے پھیندے پھوٹ نکلا۔ خدا کو یاد کرنے پر جواب اگر اسے قریب سے ملے تو کیا کیفیات ہوتی ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا۔

اس نے ایک نگاہ پھر کرنے کے اندر ڈالی۔ بستر پر پڑا وہ شخص ایک انسان تھا۔ اس کے اندر بھی حیات کام کرتی تھی۔ اسے بھی اچھے برے کی تیز گراں نہ رہی تھی۔ وہ کبھی نہ کبھی گھبراہٹ سے بھر جاتا تھا۔
 اور آنکھیں بند کر کے اندر گھس گئی۔ ذہن کو بالکل خالی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ باہر کی آوازوں اور تقریبات سے بچنے کی کوشش کرتی۔ باہر کی کئی کئی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ اندھا کریدہ تیزی سے ٹوٹا کٹ میں چلی گئی۔ وہاں بڑے برش سے اس نے اچھی طرح اس کی ہڈی پانی کو صاف کیا تھا۔
 اسے دھو کر اس نے ٹوٹا کٹ میں رکھا۔ بالکل چھڑکا اور کچھ دیر کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ پھر وہ واپس کرنے میں چلی آئی۔

وہ گروہم اور کباؤ خانہ زیادہ معلوم ہوا تھا۔ فرش ایسا معلوم ہوا تھا جیسے برسوں سے اس پر جھاڑو نہ دی گئی ہو اور نہ ہی کبھی کاو اٹھا کر وہ دروازے سے گھر کے کوصاف کیا کرتی تھیں۔

ربیعہ کو وہ سب کچھ صاف ستھرا کرنے میں دیکھنے سے زیادہ وقت لگا۔ اس نے دواؤں سے اپنی ہونٹوں سے صاف کی۔ جس میں پانی، خالی اور بھری شیشیاں تھیں۔ ایک چائے بنو جانے والی دواؤں تھیں۔ ضروری اور غیر ضروری سب کچھ اس نے بے حد محنت سے وہ بڑے صاف ستھری کر کے منور امین کے سرہانے رکھی۔ دیواروں سے ملٹی اور جالے صاف کیے۔ ڈسٹنگ کر کے دیگر اشیاء کو چھایا۔ جھاڑو لگا کر کچرا سمیٹا اور رگڑ رگڑ کے پوچھا لگا کر

"مگر انہیں چکانے کی اپنی سی کوشش کی۔ کوڑ میں رکھا ہوا پانی بدلو دے رہا تھا۔ غالباً اس کو لڑکھائی دے رہی تھی۔
 صاف ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ ربیعہ نے کوڑ کا پانی پینک کر کے اچھی طرح دھوا کچھ کر صاف کیا اور آواز پانی میں رنڈا ل کر اسے واپس کر کے میں پینچایا۔
 پھر وہ بستر پر پانی بھر کر کر کے میں لے گئی تھی۔
 "چھو بھائی! بھتیجی منہ دھو لیں۔"
 انہوں نے پینچ پینچ آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسی ہی پینچ پینچ آنکھوں سے وہ اسے پچھلے دو دھاتی کھنٹے سے جان توڑ محنت کرنا دیکھ رہے تھے۔
 "میں صابن اور تیل لاتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے گئی تھی۔



رات کو ترانہ اپنے باپ کے لیے پھل لاتی تھی۔ اسے غالباً آج تھوڑی سی تھی۔ اس کے چہرے پر تانگی سی تھی۔

منور امین کو کھنٹے کے مطابق گولیاں کھلا رہی تھیں۔ ترانہ کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹھٹک کر رک گئی۔
 اس نے غلطی کا احساس لکھا تھا۔ پھر اس نے جراتی سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو یقین دلایا کہ اس میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ واقعی اپنے باپ کے کمرے میں ہی داخل ہوئی تھی۔
 خلاف سحر کے بستر پر اس کا باپ صاف ستھرا کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گروہم معلوم ہو رہا تھا۔ فرش بالکل صاف اور آوازوں سے پاک تھا۔ کمرے میں شاید اگر کئی جلائی گئی تھی۔ بالکل ہلکی، بھین بھین خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔
 اسے آہستہ آہستہ ہونے لگا۔ آئی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی ثبت تھی۔

ربیعہ نے اسے دیکھا۔ اس نے پلے در پلے اس کی پینچ پینچ آنکھوں سے دیکھا۔
 "ممنوعہ! میں نے یہاں کا گلاس خالی کر دیا۔"

ان کا دایاں حصہ کام نہ کرتا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے وہ اپنے تقریباً سبھی کام کر لیا کرتے تھے۔ ترانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے پھلوں کا لفافہ باپ کے سرہانے رکھی بیڑ پر رکھ دیا۔
 "ٹھیک پور رہو۔" وہ مومنیت سے بولی۔
 رات کو وہ دونوں چھت پر چلی آئی تھیں۔ صولت صحن میں ماں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے بھی چھت پر چل کر قریبی کچن میں لے گئی۔ جسے اس نے ناک چڑھا کر روک دیا تھا۔
 "میں کھانا کھا کر سوؤں گی۔" وہ در کھائی سے بولی تھی۔

اس کے اندر میں باہر کا سا انداز تھا۔
 "میں کس منیر سے تمہارا کھانا کھاؤں اور کب سے۔" میں ان کی بیٹی ہوں لیکن یقیناً مانو سکتے ہوں۔ میں اس کام کے لیے ہمتیں جمع کر رہی تھی جو تم نے پک چھکاتے میں کر دیا۔ ابو کا کورا نہیں ہوں صاف ستھرا دیکھ کر میرے دل سے بے اختیار تمہارے لیے دیا لگتی۔ جس گندگی کو صاف کرنے کی ہمت میری اور بہن میں نہ

”چلو ہوا میرے منہ پر سبزوں کے نام لکھے ہیں کیا؟“ وہ رہا مان کر بولی۔
 ”جی نہیں“ میرے منہ پر لکھے ہیں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”مے دیکھتے ہی آپ کو سبزی مار کر تباہ کر دیتا ہوں۔“
 ”انہیں ہنسی آگئی۔“

”اب بھلا بیٹوں سے اسے کام نہ کوں گی تو کس سے کوں گی۔“ انہوں نے دلار سے اس کی ٹھوڑی پھونکی۔
 ”بیٹوں کے ابا سے کہہ کر دیکھیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”وہ بھی کبھی انکار نہ کرے گا۔“
 ”خیر نہیں گا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہار سے جپت لگا لی۔ ”اب کچھ عقل سیکھ لو۔ بیاہ کر دیں تو سال بھر میں باپ بن جاؤ گے اور باتیں سنو تو عمر لڑکوں کی سی۔“
 ”اب بیاد سے پہلے تو لڑکا ہی رہے دیں امی!“ وہ ہنسا۔
 ”اس بات کے لیے تو کچھ نہیں۔“ وہ جھپٹتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئیں۔ ”مفتی کر ڈالیں تمہاری؟ کوئی اعتراض تو نہیں؟“
 ”وہ ہنسا کر دیا۔“

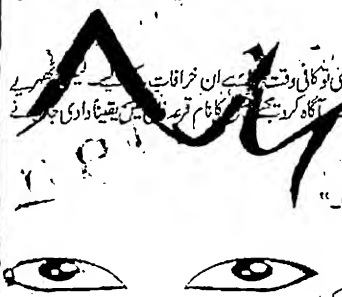
”آپ سنجیدہ ہو جائیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اور ابھی تو کافی وقت ہے ان خرافات کو بھولنے کے لیے۔“
 خدا راس سے پہلے مجھے اس خوش قسمت کے نام سے آگاہ کر دیتے تھے کہ کلام قرآن میں کتنا زیادتی ہو کر ہے۔
 ”نکالا ہے۔ کون ہے وہ؟“
 ”عمریشر۔“

”وہ فوہ۔“ اس نے آنکھیں میچیں۔ ”جس کا ڈور تھا۔“
 ”تو کوئی برائی ہے کچھ میں؟“ انہیں برا لگا۔
 ”سو اسے پھینچنے کے۔“ وہ کہہ رہے ہوئے بولا۔

”تم میں کم ہو چکنا تو کو۔“ انہوں نے نظریے سے دیکھا۔
 ”دو دے مل کر آپ کو بہت ستائیں گے امی افضلے پر نظر پڑا کی اچھل ہے۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا۔
 ”نافع بنیاد میں تو کتنی ہے۔“ انہوں نے اسے نکالا۔ ”کیونکہ میں صاف صاف پوچھ رہی ہوں تم سے پھر تمہاری دوا کی بات آگے بڑھا میں گی۔ ابھی اگر دل میں کچھ اور کچھ کہو تو میں اسے بھولتی ہوں۔“

”نہیں کوں گا۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 ”انہیں اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے تم ہی ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اسے شانوں سے تمام کر دیکھا۔ ایتقان مسکرا دی۔
 ”تبادلہ کی ہوں آئی؟ اب اتنی بھی مولی نہیں ہوتی ہوں۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 ”یہاں نہیں ہو۔ کسی بیماری ہو۔“ یقین اس لیے نہیں آتا کہ دونوں بعد اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے باہر رستہ ہی بھول گئیں۔“ منینوہ بیکہ ہار سے بولیں۔
 ”رستہ کب بھولتا ہے آئی ابھی پچھن کی ہم بولیں گے گھر کا رستہ۔ آپ کو بھی اب تک یاد ہوں گے اپنے



PHOTO

پچھن کے سبب رستے۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔
 ”منینوہ بیکہ چلتے چلتے رک سی گئیں۔“

”ششلا گھر پر نہیں ہے؟“ ایتقان نے پوچھا۔
 ”ہاں آئے والی ہے۔ تم جھوٹے تلک ہم باتیں کرتے ہیں۔“
 ایتقان ان کے ساتھ لاؤنچ میں بڑے صوفوں پر بیٹھ گئی۔
 ”جہاں رہتا ہے تم کا بہت اچھا دوست ہے۔“ وہ خوش ہو کر بتانے لگیں۔
 ”جی ہاں۔“ وہ ہنسی دی۔ ”یہاں آئے ہی آپ کے گھر بچا لٹا ہے کہ عمر سے مل کر آتا ہوں۔“
 ”چلو اچھا ہے۔“ اس نے بچوں کو روکے میں بہ دوٹی دی ہے۔ چائے بناؤں تمہارے لیے یا ٹھنڈا پو کی؟“
 ”کھانا کھاؤں گی۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”لیکن ششلا کے آنے کے بعد۔“
 ”ششلا کچھ ہی دیر میں آئی گی۔ ایتقان کو کچھ کرو خوشی سے کھل اٹھی۔
 ”تمہاری یادداشت کون آئی ہے ایتقان؟“ وہ اس سے لپٹ کر خوش ڈلبے بولی۔
 ”اب سب کچھ یاد آ گیا ہے۔“ وہ شرفی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ مانتی تھی۔“

”تمہیں یاد ہے کہ ایتقان کی بات میں گمراہی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ

”میں لپٹ بدل کر آئی ہوں۔“
 ”نہیں۔“ ایتقان نے سرکاری۔
 ”ششلا لپٹ لے کر گئی۔ ایتقان کی توجہ سے کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کافون
 ”وہ کس کی تھی؟“ ایتقان کو قائل کرنا چاہتے تھے لڑنے سے کہ نہ تھا۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ
 ”اب نہ ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”کسے خیال آ گیا؟“
 ”جی کوں تو مجھے بھیجا تھا۔“ ایتقان نے لڑی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
 ”نہیں جانتیں میں۔“ ایتقان نے واٹنا۔
 ”ایتقان پلیر! ششلا نے لیا مدت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تمام لیے۔ ”میری زندگی میں کسی مرد سے تعلق
 جو نہ کسی مرد کی برابر جگہ نہیں ہے۔ تم مجھ سے جہاں بھری باتیں کر لو لیکن پلیر! یہ بات مت کرنا۔ میں ہاتھ جوڑتی
 ہوں۔“

ایتقان دم بخور ہو گئی۔ اسے واضح انکار کے متعلق اس نے سوچا بھی نہ تھا۔
 ”ششلا! اس کے لبوں پر اس کا نام دم توڑ گیا۔“

(باقی آئندہ)



خیال رکھتے ہیں۔ دودھ کاٹیں اور ایک گھراس کی ملکیت ہے۔ حاکم پچا کو کوانوں کا کراریہ لاسنے کی ذمہ داری ہے
 قدرے فکر۔ حاش سے آزاد ہو جائیے۔ یہ اور سیکشن بھی بڑوں ہونے کا حق ضرور پڑھتے سے ادا کر رہی ہیں
 ان کی گفتگو میں رجبہ کو خطا حق سے انکاشی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھنہ تپے کا مشورہ دے رہی
 خریداران کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نمائندگی کم قیمت لگا ہے۔ نقصانہ حالہ بھی
 غیر خواہش میں ہے۔

رجبہ متوا۔ ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں شدید بھاس کے عالم میں اس سے پانی مان
 ہیں۔ اسے دادی کے رنگ میں دیگر کافذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اس
 شایستہ محسوس ہوئی ہے جو سیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوئی
 خطوط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بلیکس یا لورس کی پوجہ میں اور ان کا لائبرس یا کروہ کی قدر مطہر ہو جائی
 کے انتقال کی خبر اور خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جائی ہے۔

ڈاکٹر شملہ اپنی ماں سفیدہ دیکھنے کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا ان کو اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا
 ڈاکٹر شملہ کو بتلاتی ہے اور اس کا ساتھ شوہر اس کے گھر فون کر کے ان کو اپنے گھر سے لے آتی ہے۔ ان کے
 فردوس بیگم کا بیٹا شام کو ڈاکٹر شملہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ خط لکھتا ہے۔
 رجبہ اپنی شادی اور لوگوں کے بے پرواہیوں سے تنگ آ کر اپنی پوجہ کے گھر لائبرس جانے کا فیصلہ کر لیتی
 میں رجبہ کی ملاقات عمارت سے ہوتی ہے۔ یہ جہان کو دیکھ کر کہہ سکتی ہے کہ وہ از خود اس کی پوجہ کے
 رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

گیارہویں قسط

ایقان دیکھ کے احساس میں ڈوبی بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ شملہ اپنے آنسوؤں کی گھاس
 ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں یا بہن کے دل میں ان آنسوؤں کو دیکھ کر استغناء پیدا ہو اور بات
 بڑھ بے اصرار کو مزید افراد کی کمک حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کو محسوس اپنے اور ایقان کے مابین ہی ختم کر
 چاہتی تھی۔

”تم نے اسی سے کچھ کہا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے۔“
 ”ہاں۔“ ایقان سر جھکاتے ہوئے اس سے بولی۔ ”میں صبح سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا
 تھی۔ شام نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کی بات سن کر فون بند کر دیا تھا۔ اسے کوئی جواب دینا ضروری نہ تھا۔
 کو تمہاری رضامندی پر محمول کر دیا ہے۔ وہ بہت بہت خوش ہے۔ شملہ ان کے ایک بڑے غلط
 سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سمجھ رہی ہو، جبکہ اس کی خوشی تمہاری ہانگ کی افشاں بھی بن سکتی
 تمہارے بیٹے کے سر کا سنا بنان میں سکتی ہے۔ بے وقوفی منت کو۔ شملہ زندگی کی حسن ترین تمنائے
 ہاتھ تمہاری طرف بڑھا ہوا ہے۔ اس غما کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو اور اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ میں ایک
 دوست کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ یہ رجبہ کی زندگی کی سب سے بڑی بات ہے۔ آئینے میں اپنا
 کبھی غور سے نہیں دیکھا تم؟ عمر کے جس دور سے تم گزر رہی ہو وہاں ہمیشہ ایک سماجی کے مضبوط سہارے
 ضرورت ہوتی ہے شملہ! میں۔ میں۔ اور کیا کہوں تم سے؟“

ایقان نے کسی سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر لہو۔ شملہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی پیکوں پر غمی اور بول
 اس مسکراہٹ تھی۔

”دیکھ مت کہو ایقان! جو کچھ تم کہہ رہی ہو سچ ہے۔ الفاظ لفظ معتبر ہے کہ تم مجھے تمہارے غلطوں سے پرہیز
 برابر بھی شک نہیں ہے۔ لیکن ایقان چروچا ہے جو سچے آنکھیں خواہ کچھ بولیں، انسان مجبور محض دل کے ہاتھوں
 ہوتا ہے اور مدت ہوئی، میرے دل سے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ کچھ نہیں کہتا گونا گونا ہو گیا ہے۔ اس کی خواہشات سوتی
 نہیں ہیں کہ میں ان کے جانے کے امید رکھوں۔ ساری خواہشات مرگتی ہیں ایقان! اس ایک تمنائی جلتی ہوئی لو
 سے میرے راکھ ہونے کے ساتھ کچھ دوستی ہے۔ یہ میرا میری ہر امید کا واحد مرکز میری زندگی کا واحد وجہ
 میرے ہونے کا کلواختوت۔ میں کسی مرگی زندگی میں شامل ہو کر اسے کچھ نہ دے پاؤں گی ایقان! کچھ بھی نہیں
 دے سکتی میں۔ میں اس کے لبوں پر بھی ایک مسکراہٹ تک نہ لاسکوں گی، پھر میں کیوں خود کو اور اسے یہ سزا
 سناؤں؟“

ایقان نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔
 ”محبت بولتی ہو تم شملہ! زندگی میں نشیب و فراز سب کے ساتھ ہیں۔ حادثے بہت سوں کا مقدر رہتے ہیں
 لیکن لوگ ہنسا بولنا، مینا مینا چھوڑ دیتے۔“ آئندہ تو ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے لگا ہیں
 کہسے کہتی ہو تم؟ تمہارا ”آئندہ“ تمہارے بیٹے کا ”آئندہ“ کہا سوچا ہے تم نے؟ والے کل کے بارے
 میں تمہاری بہن بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے گی، تمہارا بھائی اپنی زندگی کی شروعات کرے گا۔ اس گھر میں اس کی
 زندگی کے کچھ بچے لے لے کر اور تمہارا چاچا قابل قبول ہوں گے۔ وہ اپنے بچے کا تمہارے بیٹے کو نظر انداز نہ بھی
 کرے گا۔ تمہاری بہن نہیں ضرور ایسا محسوس کرے گی۔ اس وقت کیا کوئی شملہ! جب اس گھر میں تم خود کو س فٹ
 ”تصور کرو گی۔“

شملہ کا گھر کرسی سے سہا پڑنے لگا۔
 ”مجھے تمہارے لیے اس قدر اہمیت نہیں تھی کہ میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔“ ایقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 تمہارے لیے میں نے کچھ نہیں ایقان! لیکن اپنے ”آئندہ“ کو محفوظ کرنے کے لیے اسے ”کل“ کے مفاد
 کی خاطر کسی بھی چیز کو قربان کر دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے
 پانے کا جینا۔ پھر اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے
 باب کے نام کا سنا بنان میں سکتی ہے۔ بے وقوفی منت کو۔ شملہ زندگی کی حسن ترین تمنائے
 ہاتھ تمہاری طرف بڑھا ہوا ہے۔ اس غما کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو اور اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ میں ایک
 دوست کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ یہ رجبہ کی زندگی کی سب سے بڑی بات ہے۔ آئینے میں اپنا
 کبھی غور سے نہیں دیکھا تم؟ عمر کے جس دور سے تم گزر رہی ہو وہاں ہمیشہ ایک سماجی کے مضبوط سہارے
 ضرورت ہوتی ہے شملہ! میں۔ میں۔ اور کیا کہوں تم سے؟“

”آزادوں یا اپنی بے مری کو؟ دوست کی محبت میں تم جیتنے کے ساتھ کچھ زیادتی نہیں کر رہی ہو ایقان؟
 میری ہانگ سناؤں سے بھر کر اپنی آرزوؤں کے وہب چلانے کو وہ مجھ سے کچھ نہ چاہے گا؟ میرے اندر جذبوں کے
 اور سرور و خاموشی ہو چکے ہیں۔ بلی کی چنگاری بھی نظر نہیں آتی۔ میں اس کے جذبوں کی گرمی کے جواب
 میں اسے کیا دے پاؤں گی؟“
 ایقان بولنے لگا ”خاموش رہو گی۔ اس بات کا کوئی جواب اس سے سن نہ پانا۔
 ”مرگی محبت نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے ایقان! اتنا دکھ کہ اب میں بھی سچی ذہنی طور پر کسی مرگی محبت کو قبول
 نہیں کر سکتی۔ مجھے مجبوریت کو بیل پر اپنی بات میری اور میرے بیٹے کے مستقبل کا خود کا ٹکڑے کہ اس نے
 ایک بہتر زندگی عطا کی ہے جو وہ ہر روز کی خدمت میں گزر رہی ہے۔ مجھے اتنا آسرا بہت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اچھا

ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر چل پڑی۔ ”یہ یاد رکھنا ہاشم! کہ فیصلے میں ہاں، ناں کا چانس نفی فتنی ہوتا ہے اور محکمہ لوگ ناں کو سیونٹی فائیو پرسنٹ دیتے ہیں تاکہ نتائج کا اثر مثبت ہی رہے۔ دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اگر وہاں سے انکار ہوا تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی اور مینے بھر میں بیاہ کر دوں گی تمہارا ہاں۔“

ہاشم وہیں کھڑا رہ جاتا دیکھتا رہا۔

”اللہ آپ کا حفظہ سلامت رکھے۔ پتہ نہیں ہمارے پھوپھا سے اتنی محبت کیسے کر لی آپ نے؟“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



”آج کیسے سیلی کی یاد جاگی من میں غیر تو ہے؟“ شفیقہ حیات نے اسے آتا دیکھ کر اپنے پاؤں سیٹے۔ وہ سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑا سا چلنے سے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ”یاد تو خیر ایسی چیز ہے اماں! اپنا ٹکٹ کے جب چاہے چلی آتی ہے لیکن اس حال میں اتنا چلنے کی ہمت کہاں تھی مجھ میں ہاشم کے اصرار پر گئی تھی۔“

”ہاشم کا اصرار؟“ ان کا ماتھا ٹھک کا ٹھک پہرے پر اصرار کرتا ہے؟ تمہارے وہاں جانے سے اس کا کیا تعلق؟“ ”بھول گئیں آپ شہلا نے جب برابر جینالی سے شادی کر لی تھی تو کیا حال ہو گیا تھا اس کا؟ مرنے والا ہو گیا تھا۔ اب بھلا اس سے شادی کے لیے اصرار کیسے جانی توں یاد اس کی سولی وہیں انکی ہوئی ہے۔ کہتا ہے شہلا سے ہی کرے گا۔ مجھے بھیجا تھا اس کی راز سے کہنے کے لیے۔“

شفیقہ حیات تھوڑی برا نگلی رکھے حیرانی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ ”اس نے مجھے اوروں کی طرح گھسیٹا؟“ ”ارے لڑکیاں! بچوں والی ہو گئی ہے۔ کلب منتقل کیے گی ایقان؟“ ایقان چونک سی گئی۔ قدرے عقل سے اس نے ماں کو دیکھا۔ ”لیجئے بے عقلی کا کون سا مظاہرہ سرزد ہوا مجھ سے؟ وہ اس سے شادی کا خیال کیا ہے؟ تو اس میں میرا کیا ہاتھ؟ اور

URDU PHOTO

اس میں برائی بھی کیا؟“ ”جو بھی برائی ہے وہ اس کی ماں تمہارے کھاتے میں ڈال دے گی سیدھے سیدھے۔“ وہ بگڑ گئیں۔ ”بڑی قابل بنی پھر رہی ہو۔ ہاشم سے کہا ہوتا اپنی ماں بسن کو بھیجے اس کے گھر۔ وہ جا کر رشتہ ڈالیں وہاں۔“ ”ہاں“ ہوئی تو ہم بھی شرکت کر لیں گے منگنی بیاہ میں۔“

”جی ہاں۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”وہ بھیجے گا اور وہ چلی بھی جائیں گی۔ اتنی ہی سیدھی ٹھہریں آپ کی ہو بیگم۔ زمین و آسمان ایک کر ڈالیں گی پہلے تو پھر جا کر ڈھیر صلواتیں سنا آئیں گی اس غریب لڑکی کو جس کا رتی برابر قصور نہیں اس سارے قصے میں۔“

”اب تم سننا وہ ڈھیر صلواتیں۔“ وہ چل کر بولیں۔ ”اور تمہارے واپس ہم بھی سن لیں گے۔“ ”افوہ اماں! ایسا کچھ نہیں ہوا، چپا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”کون سا رشتہ جوڑ آئی ہوں میں۔ ذرا سی رائے معلوم کرنے گئی تھی وہ بھی قطعاً مثبت نہ ملی۔ بھابھی کو تو پتہ بھی نہ چلے گا۔“

”اچھا۔“ شفیقہ حیات کو قصے میں کچھ دلچسپی نظر آئی۔ ”منع کر دیا اس نے؟ چلو تو ٹھیک ہے۔ اب اسے اپنا بچہ پالنے کی فکر ہونی چاہیے کہ نو عمروں کے سے شوق کرے گی۔ ہاشم کا تو داغ چل گیا ہے۔ گھر میں ایک سے ایک ہیرا لڑکی ہے لیکن وہی بات ہے دور کے ڈھول سہانے۔ گھر کی مرغی وال برابر۔“

ایقان چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔

”چھانناں! آج کچھ نہیں، شملہ کی جگہ میں ہوئی تب بھی آپ ایسا ہی کہتیں؟ میرے مستقبل کو اندھا شیشہ کی طرح دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی اسٹ سے نکال دیتیں جنہیں جیسے کی تمنا کرنی چاہیے؟“

”جو موت“ وہ غصہ ہو گئی۔ ”میرے منہ کو نہ آؤ، اچھی بات کرو کوئی اور بیٹا ہاں ابھی زندہ ہے، کچھ کرنے سے پہلے صلاح کر لیا کرو تاکہ بعد میں مشکلیں نہ اٹھانی پڑیں۔“

مال بچی کی بحث کے دوران عذرا بیگم کی بلی اُٹھ گئی۔

”خیر تو ہے؟“ وہ ہنس کر پوچھا۔ ”کس بات پر آج ایقان کو بہت دن بعد ڈانٹ پڑی ہے؟“

”ڈانٹ تو مجھے ستر برس کی عمر میں بھی پڑی ہے، سوچتے ہی سوچتے بے ہوشی جاں!“ اور بے شک پڑے۔ میں محسوس نہیں کرتی۔ اماں ہیں میری نارنجی بلی کی تو کوئی بات نہیں، لیکن میں وہ کرکڑی ہوں جو صبح اور سحر بجانب بچھتی ہوں۔“

”تو جیسا سوچتے ہو؟“ اس نے کہا۔ ”مجھے شہر کے کہاں کہاں کو روانہ کرے۔ ہمیں کیوں اتنی دور سے بھیج لایا ہے؟ اور اگر ماں بہن راضی نہیں تو پھر یہ سوچ کر بھیجے کہ وہاں کو تو مٹائے۔ ماں سے توجہ نہ لے کر کھائے یا دوسری مرتبہ کوٹ میں گرواے گا تمہاری سہیلی سے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ایقان چند لمحوں کے لیے چیختی رہی، پھر بولی۔

”مجھ میں اگر کدے سے زیادہ جست ہو جاتی ہے خود بھی باتیں کرتی ہوں، ہمیں بھی سنواتی ہوں۔“

”دیکھیں نا بھائی! ایقان نے بے بس ہو کر کہاں کہاں سے کھانا کھا کر کے بھیجا مجھے کیا نہ جاتی؟ یہ اس سے کوئی رشتہ نہیں بننا؟ اگر وہ اتنی شدید خوش رہتا ہے شملہ کے لیے تو اس کی ذرا سی اخلاقی نذر سے مجھے انکار کر دینا چاہیے؟ اماں کہاں ان معاملات کو سمجھ سکتی ہیں۔ دل کے معاملات سے تو انہیں یوں بھی بیخبر رہا ہے۔“

عذرا بیگم نہیں۔ شفیقہ حیات کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

”ہاں بیٹا! درست کہا، ہر بار ہے مجھے ان معاملات سے کچھ نہیں یاد رہتا، عاشر میاں سے ساتھ۔ کوئی زور زبردستی نہ کی کہ بلی خوش رہے؟ ہمیں اور کیا چاہیے۔“ ایقان ہنس کر ان کے گلے لگ گئی۔

”نیک ہی تو ہے۔“ عذرا بیگم بولیں۔ ”زندگی کا شرم کو گوارا ہے۔ اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو ہم بھی بیگم کو روڑے نہیں لگانے چاہئیں۔ کیا حال ہوا تھا اس کا؟ بھول گئیں کیا وہ؟“

”آپ کا بیٹا؟“ ایقان نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”میں بے وہ تو نہ، نازک احسانات سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ مجھے کہتا ہے۔“ بیٹا تو یہ ڈار ٹنٹ ہی نہیں۔“

”اسے تو کہتا ہے۔“ شفیقہ حیات جل کر بولیں۔ ”مب غل ہے داغوں کا۔“

ایقان نے بے بسی سے ان کو دیکھا۔

”آپ کا بیٹا؟“ ایقان نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”میں بے وہ تو نہ، نازک احسانات سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ مجھے کہتا ہے۔“ بیٹا تو یہ ڈار ٹنٹ ہی نہیں۔“

”اسے تو کہتا ہے۔“ شفیقہ حیات جل کر بولیں۔ ”مب غل ہے داغوں کا۔“

ایقان نے بے بسی سے ان کو دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ ڈورستہ ڈورستہ اس نے کہا تھا۔

اس شخص میں سوائے ترانہ کے اسے ہر قسم کی مخاطب کرتے ہوئے بے حد خوف محسوس ہوا تھا۔ یہاں کے سب ہی افراد عجیب پر اسرار۔ کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو بلیوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر آئی ہو۔ جہاں الفاظ اپنا مسموم بدل چکے ہوں اور رویے اپنی سوت کو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا

ایک تھا۔ ربیعہ کو پانا آپ جنسی گلے لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ منور امین کو دھاکا کران کے گلاس خالی کرنے کی منتظر تھی۔

”پوچھو۔ ضرور پوچھو۔“ انہوں نے خالی گلاس اسے تھمایا۔ ”پوچھنا چاہیے تمہیں۔“

”آپ۔“ انہوں نے کیوں پتے ہیں؟“

اس کی بات پر انہوں نے قدرے حق کی اور بے حد افسوس سے اسے دیکھا۔ ”عالیا! وہ کچھ رہے تھے کہ ربیعہ ان سے اپنی بچگی زندگی کی کوئی بات چاہنا چاہتی ہے، ایسی ہی انہوں نے بے حد بڑے پن سے اسے اجازت دی تھی اور اب ان سے غصے سے دیکھ رہے تھے۔“

”کچھ گئی ہے میرے اندر۔ آتش فشاں ہے آتش فشاں! اسے بجھا رہا ہوں۔“ اس کی لڑکی۔ یہ سوال پوچھا ہے۔

”احقانت۔ بھلائی کیوں پتا ہوں۔ کھوں کھوں کھوں۔ پانی کوئی کیوں پتا ہے؟“ ڈاکٹر نے بولا ہے، ”نیاہانی پوچھ اس لیے پتا ہوں۔ تم کیوں پانی پیتی ہو؟ نہ فی کر دیو خود راؤ دن۔ لگ پڑے تھے۔ ذرا سا کولر میں پانی بھرا کر دیا تو میرا پانی پتا ہوا لگتا ہے۔“

”کھوں کھوں کھوں۔“ مت دیکھنے پانی نہ۔ یہاں سارا رو اور کھیں کی گئی تھی۔ جو۔ آخر کس باپ کی بیٹی ہو۔ یہاں سارا رو لگے۔ کھوں کھوں۔“

”سراسر لینا محال ہو گیا۔ وہ بھبرا کر تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ جب اسے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے بل میں توجہ نہیں دے کر کمرے سے اس سوال پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ خواہ دن بھر نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی لڑکی یا لڑکا اس کے جڑے درد کرنے لگتے تھے۔ دل بھرنے لگتا تھا۔

ایک بار وہ کمرے میں ایک سوئی کی بات کرتی تھی کہ کسی نے کس بات کا بھی رد عمل سامنے آتا تو ابھی سامنے صولت کو

ایک بار وہ کمرے میں ایک سوئی کی بات کرتی تھی کہ کسی نے کس بات کا بھی رد عمل سامنے آتا تو ابھی سامنے صولت کو

ایک بار وہ کمرے میں ایک سوئی کی بات کرتی تھی کہ کسی نے کس بات کا بھی رد عمل سامنے آتا تو ابھی سامنے صولت کو

ایک بار وہ کمرے میں ایک سوئی کی بات کرتی تھی کہ کسی نے کس بات کا بھی رد عمل سامنے آتا تو ابھی سامنے صولت کو

تیب برابر والے کمرے سے اسٹارٹ کر سہارا دے دیتا ہوا تو دن باہر کیا۔ ربیعہ نے اٹھنے کے متعلق سوچا لیکن وہ

تیب برابر والے کمرے سے اسٹارٹ کر سہارا دے دیتا ہوا تو دن باہر کیا۔ ربیعہ نے اٹھنے کے متعلق سوچا لیکن وہ

تیب برابر والے کمرے سے اسٹارٹ کر سہارا دے دیتا ہوا تو دن باہر کیا۔ ربیعہ نے اٹھنے کے متعلق سوچا لیکن وہ

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ ڈورستہ ڈورستہ اس نے کہا تھا۔

اس شخص میں سوائے ترانہ کے اسے ہر قسم کی مخاطب کرتے ہوئے بے حد خوف محسوس ہوا تھا۔ یہاں کے سب ہی افراد عجیب پر اسرار۔ کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو بلیوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر آئی ہو۔ جہاں الفاظ اپنا مسموم بدل چکے ہوں اور رویے اپنی سوت کو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ ڈورستہ ڈورستہ اس نے کہا تھا۔

اس شخص میں سوائے ترانہ کے اسے ہر قسم کی مخاطب کرتے ہوئے بے حد خوف محسوس ہوا تھا۔ یہاں کے سب ہی افراد عجیب پر اسرار۔ کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو بلیوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر آئی ہو۔ جہاں الفاظ اپنا مسموم بدل چکے ہوں اور رویے اپنی سوت کو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا

سب لوگ غصے میں رہتے ہیں سوائے ترانہ کے۔ قصور بھائی تو کبھی کبھی بات کر بھی لیتے ہیں لیکن آپسے۔ تو اسے عجیب سے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ، جینپ کر خاموش ہو گئی۔

”دو ذرا سایا دوڑتا ہے۔ مجھے میں شاید تین برس کی ہوں کیا چار برس کی۔ تمنا آپنی مجھ سے دو برس بڑی تھیں ہم گھر کے صحن میں بھاگتے پھرتے تھے۔ دھندلے دھندلے سے خاک کے پتے ہیں ذہن میں اور مٹ جاتے ہیں پیچھو پھرتا تھیں کہ آپنی کو اچانک ہی شدید بخار ہوا۔ اتنا تر بخار کہ لگتا تھا بدن کسی آگ سے جل رہا ہے۔ دن کی کیفیت طاری رہی۔ امی ان کی چار پائی کی بیٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ انہیں آپنی سے بے حد محبت تھی۔ دن تک نہ آپنی کے منہ میں دانہ گیا نہ ہی اس نے کچھ کھایا۔ پھر اسے دن آپنی نے تڑپ کر جان اور دی۔“

ترانہ گلو گریں بیٹھی۔

ربیعہ بھی افسردہ ہو گئی۔ وہ دونوں بڑے سے پرانے رنر گدی کی چھائوں تلے بیٹھ کر بیٹھی تھیں۔ ایک گھر کے نزدیک سی تھا۔ آج ترانہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چل قدرتی کہتے ہوئے یہاں تک چلی گئی کہ ”اور پیچھو؟“ ربیعہ نے سو گوار سے پوچھا۔

”امی، آپنی کی موت کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہیں جانیں آپنی کا کھانا کھانا دھو رہی رہا کرتی تھیں، اکثر کرتیں، اندر ہی اندر کھلتی گئیں۔ وہ امی کی وفات سے تھوڑے بھائی کے داغ پر برا اثر پڑا۔ انہیں راتوں میں چلنے عادت ہو گئی۔ آدھی رات کو نیند میں اٹھ کر کھٹ پڑ جاتے تھے۔ ایک دن سڑکیوں سے گرنے کا شاک کی فوٹ گئی۔ لیکن سڑ پر بڑے رہے لیکن ابائی۔“ وہ ایک گری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

”ابائی بھی ہمارے بس اپنے نام کے ایک ہیں۔ بیٹا سڑ پر سے دن بھر تھک رہا لیکن ابائی کو اپنی عیادت سے فرصت نہ ملی۔ پیچھو ہی ترس کھا کر ایک دن کسی چراغ کو لالہ لیس سانس نہ لے سکی۔ جی پی کر کے اپنی بیٹی کی اور چلا بنا۔ بعد میں ہڈی کی طور سیدھی نہ ہوئی، ہیٹ کا نقش رہ گیا۔“

ربیعہ کے ذہن میں منور امین کا چہرہ اور ان کے الفاظ گھوم گئے۔

”آخر کس باب کی بیٹی ہو بیٹا سامی، بارو کی۔“ وہ اپنے باپ سے متعلق کچھ نہ جانتی تھی لیکن وہ الفاظ اس کی زبان میں سرزد ہوئے۔

”ترانہ! وہ کسی سوچ میں گم ہو کر بولی تھی۔

”ہوں، کمو؟“ وہ اپنی سوچ سے لگی۔

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟ میرے امی، ابو کے متعلق؟“ وہ اپنی نے مجھے کبھی کبھی نہیں بتایا۔“ ترانہ کچھ دیر سوچی رہی۔ وہ کھاس کا تھکا چبانے میں مگن تھی۔

”میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی ربیعہ! میں مجھے یہ علم ہے کہ بیٹا پیچھو، تمہارے ابو سے منسوب تھیں۔ اجو جہاز برب سے۔ میرے اموں سے۔ پھر ماموں نے اچانک تمہاری امی سے شادی کر لی۔ تمہاری امی نے۔“

”ہاں۔“ ترانہ نے اسے پکارا۔

اچانک ہی اس کا ذہن دوسری جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی بیٹی پر عباد بیٹا۔ اپنے کسی دوست کے

ساتھ باقیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی نگاہیں ربیعہ کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں پھر اس نے چند لمحوں بعد نگاہ بدلی تھی اور اپنے دوست کی جانب دیکھنے لگا۔

ربیعہ کا دل بڑے ذہن سے دھڑکا تھا۔ اس کے پورے جسم میں منہ کی لہروں دوڑ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے عرصے کے بعد کسی اپنے کو دکھا ہو۔ خوشی کی سنسنائی لہر کے زیر اثر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عباد نے اسے دیکھا تو اسے تھوڑے دیر کے بعد ایک بار دیکھا تو اس کی نگاہ بڑھ کر اس کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

”آپ عباد آپ یہاں۔“ ربیعہ کا لہجہ بے قابو ہو گیا۔

”میں۔“ اس نے ایک مختصر نگاہ پیچھو پر پڑی تھی۔ ”میں روز یہاں آتا ہوں ربیعہ!

”مسئلہ؟“ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”وہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ترانہ ہے۔ میری چھوٹی زاد بہن۔ وہ اتنا اچھی ہے۔ آپ کچھ محسوس نہ کریں۔“

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

”مجھے یہ بتائی ہی تھی۔“ تھیک گاؤں کے آپ کو خبریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نبھانے کیوں ربیعہ! میں میں دیکھتا ہوں آپ کے انجیل منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان چاہے کتنی چیزوں پر ہمارے دلچسپی میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی پتہ نہیں میں۔ آپ کے نبھانے میں اب نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستانے کے میں نے ایک چھوٹی سی، مضمون سی، فرشتوں جیسی لڑکی کو اپنے ایک انجیل میں نہیں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خبریت دریافت کروں لیکن پھر خیال آتا کہ اگر آپ کا تعلق یہ کیا ہے؟ چند مضمون کا ساتھ بھلا کہ اتنا تحقیق بخشتا ہے۔ کسی نے کچھ غلط سمجھ لیا تو آپ کو کتنی ہوجا سکتی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔

ربیعہ نے چند لمحوں سوچا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال مٹا کا آیا۔

”میں ترانہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ ہم کچھ دن بعد پھر آئیں گے یہاں۔“ عباد مسکرا دیا۔

”ہمارے معلوم کیوں رہیں؟“ اچھے جیسے ایسا ہوا کہ قدرت نے ہمیں یوٹی ٹی وی نہیں ملایا۔ میں سوئے سوئے تمہارا خیال سے جاگ اٹھتا ہوں۔ جیسے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سونپی ہو خدا نے مجھے۔ بس اسی احساس کے زیرِ اثر میں نے تمہارے آنے کے متعلق پوچھا ہے۔“

”مجھے کوئی دہم نہیں ہے عباد بھائی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھر۔ میرا نہیں ہے۔“

”اُس اوکے! اچھی لڑکی۔ اب چلا ہوں پھر ملیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“

وہ مکر پر اپنے دوست تک گیا پھر دونوں اٹھ کر پارک کی عقیبتی سمت چل دیے۔ ربیعہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”کوئی تمہاری؟“ ترانہ کی آواز میں بھرپور حیرت تھی۔ ”یہاں لاہور میں تم کسی کو کیسے جانتی ہو؟“ ترانہ اس کے پیچھے آگڑی ہوئی تھی۔

”ہم ٹیڑھ میں تھے، ساتھ ہی لاہور اترے تھے اور تمہارا کھانا کھانے میں اپنے آپ نے میری کٹی تھی، ورنہ میں تو شاید دونوں بعد پوچھتی تھی تمہارے گھر۔“ ربیعہ پیش دی۔

”اُد“ ترانہ معنی خیزی سے بولی۔ ”وہ ربیعہ حضرت یہاں سے کس وقت آئی؟“

”میرے لیے۔“ ربیعہ بھرپور اطمینان سے بولی۔ ”میں پاکستان کو مختصر ۱۳۰ گھنٹے متعلق آیا تھا۔“

”گھر آنے کی ہمت نہ ہوئی جناب کی؟“ ترانہ کی شوخی معنی رکھتی تھی۔

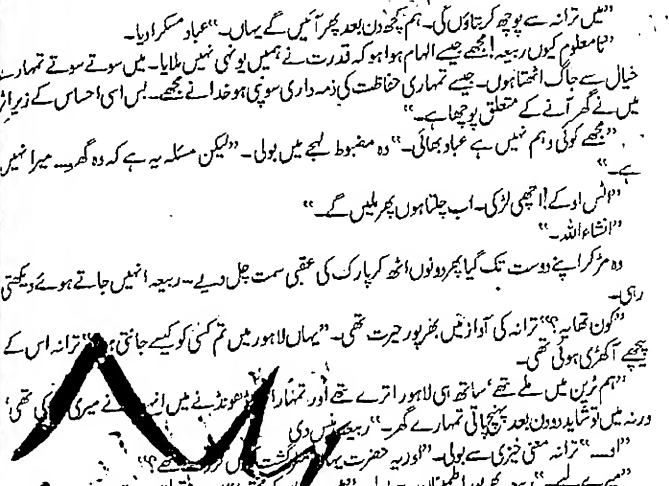
ربیعہ چہنچہاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”مالی ڈیئر ترانہ بی بی! اپنے یہ بڑے بڑے کان صاف کر کے سننا۔“

”ہوں۔ بھائی۔“ ساتھ ہی۔ ”عباد بھائی۔“

”وہ وہ نہیں۔“ ”مٹی“ ”مٹا ہے؟“ ”اس نے ناک چڑھائی۔“ ربیعہ مسکرا دی۔

”چلو گھر چلیں۔“



”میں ترانہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔“

”ہاں؟“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”ہاں کیوں؟“

”عباد! ہاں؟“ ترانہ جینپ کر بولی۔ اس کے گل سرخ ہو گئے تھے۔

”پاکستان کی کابلی؟“ ربیعہ نے شرارت سے پوچھا۔

اس نے شرعیے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دی تھیں۔

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

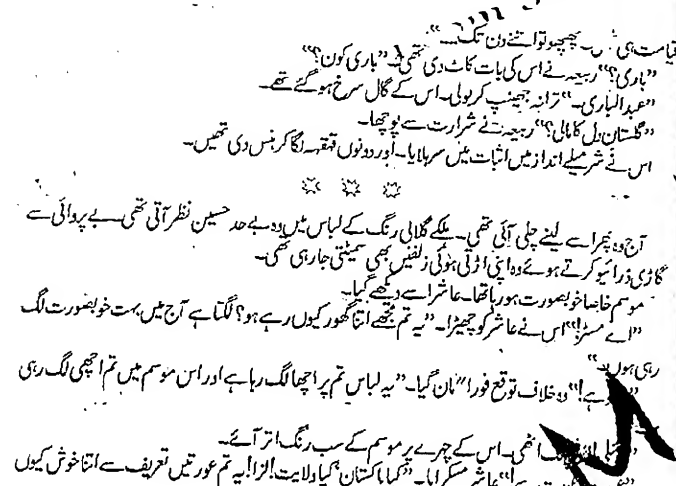
”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“

”یہ گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔“

”آج جو بھڑاٹے لینے چلی آئی تھی۔“



برابری کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مغرب کی عورت گھر بنانا نہیں جانتی، بسنا نہیں جانتی بچے نہیں پالتی، کیا نہیں کرتی مغرب کی عورت؟ تمہاری عورتیں تو جنت میں رہتی ہیں اپنے گھروں میں ملاؤں کی طرح حکومت کرتی ہیں۔ کام ملازموں کے سپرد ہوتے ہیں اور گھر چلانے کی ذمہ داری مرد کی ہوتی ہے۔ ہم تو گھر میں بھی کام کرتے ہیں اور گھر سے باہر ملک چلانے میں بھی مرد کے شانہ بشانہ ہوتے ہیں۔ سبھی تو ترقی یافتہ ممالک کے عوام کہلانے کا لطف اٹھاتے ہیں۔“

”وٹس اٹ۔۔۔ وٹس اٹ!“ عاشر نے تالیاں بجائیں، ”بھئی لا جواب کر دیا تم نے تو! ویسے ایک بات پوچھو۔ لڑا؟ تم اکیلی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والدین، بہن بھائی؟“

”میں بتاتا تو چکی ہوں تمہیں۔ ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے دو بہنیں ایک بھائی بھائی بچی ازم سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مارا مارا پھرتا ہے اور میری بہن یو کے میں ہی سیدھی ہو گئی۔ مجھے کمپنی نے یہاں بھیج دیا اور یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہی اسٹرائیکنگ موڑ ہے زندگی کا۔ اس سے آگے اب کچھ دیکھنے کی تمنا اگر ہے تو وہ ہے تمہارا ملک، تمہاری بیوی۔“

”سنو عاشر! مجھ سے شادی کر لو؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں بہت زیادہ سیریس ہوں تمہارے لیے۔“

”ہلڑا! تیری بیوی مجھ سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری زندگی مکمل ہے اس میں کسی رنگ کی کمی نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ بہت سوں کے لیے بہتر ہے۔ تمہارے لیے بہت ہیں، ادا ہے یہاں ہوں رہیں گے۔ بس! اس سے زیادہ میں افرور نہیں کر سکتا۔“

”وہ کچھ دیر بالکل خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد عاشر کا کہہ آ گیا۔ لڑا نے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی۔“

”سنو عاشر! چائیک وہ بولی۔“ ”تم نے کہا تمہاری بیوی سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔ میں منتظر رہی کہ تم کہو گے، میں بھی اس سے بے پناہ عشق کرتا ہوں۔ میری زندگی میں اس سے بے پناہ عشق ہے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کہا۔ جانتے ہو کیا؟ میری محبت بے در کا گند نہیں ہوتی۔ اس میں ہمیشہ پورا دروازہ ہوتا ہے۔ اگر تم مجھے اس دروازے سے بلاؤ گے میں تم سے کبھی اجاڑوں گی۔ میری بات یہ ہے کہ تمہارا گھر۔“

وہ گاڑی ریوٹس کر کے تیزی سے لے گئی۔ اور عاشر اس کے الفاظ پر غور کرتا رہ گیا تھا۔



کروٹیں بدلتے بدلتے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اسے کسی طور آرام نہ آتا تھا! نجانے من کو کیا بے کلی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر دروازے تک چلی آئی۔ باہر لاؤنچ میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اوپری کمروں کی بتیاں بھی گل ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل علی اور حمزہ کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ لیکن اب وہ بھی بجھ چکی تھی۔ سب بتیاں گل ہو گئیں تو عیشہ کے من میں ایک چراغ غم کی روشنی ہوئی۔ اندھیرا پھیلنا تو اس نے جانا کہ دل کو آج لگی ہوئی ہے۔ کسی نے دل لگی میں اس کا دل، تھمھ لیا تھا۔

چھوٹی سی بھی تو فروس بیگم دن رات رافع کے قصیدے پڑھا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی خوبوں کا ذکر کرتیں۔ اس کا لانا قدر نہیں بھاتا تھا اس کی خوبصورتی کی وہ مذاح تھیں۔ اس کے ادب و آداب سے وہ بے حد خوش رہتیں۔ عیشہ کا ذہن ماں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اسے بھی رافع اچھا لگنے لگا۔ محبت و جنت کی اسے سمجھ تھی نہ

”آج آپ بولیں گے اور میں سنوں گا۔“ وہ جیسے اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھا تھا۔ ”بول بھی میں تمکا ہوا ہوں۔“ جانتی ہیں آپ کریمن پور سے چھ گھنٹہ لیٹ کبھی اور میں نے فکر ہی کیا ہے۔“

”آپ کا سواٹس کیوں آف تھا؟“ وہ شکایت بولی۔

”آپ نہیں تھا، چارن نہیں آف تھا میں نے۔“ مسکرایا۔ ”لیکن اتنا علم ہو گیا کہ آپ نے بھی ایک کال ضائع کر کے متعلق سوچی اور نہ تو بہت بخوش ہیں آپ، میسوں کی بھی اور لکھنؤ کی بھی۔“

”آپ کو کس نے کہا میں بخوش ہوں؟“ وہ بڑکی۔

”جینتی کاہل تو اکثر بھاجاتی ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”عریشہ بنی دی۔“

”اور لکھنؤ میں تو اپنی ڈنڈی مار لی ہیں کہ بس۔“

”اب میں بتاتے ہیں آپ۔“

”مستی جائے۔“ وہ ہنسا۔

عریشہ نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ کلمہ اکر الہیہ کانوں میں گونجتا رہا۔

تو اگر فارغ ہو تو رات کے لیے چاول بناؤ۔“ مینا نے کمرے میں جھانکا تھا۔
راہی بھی اچھی پکھا کر صاف کیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ مشین لگا کر سب کے کپڑے دھو رہی تھی۔ صبح
سے اسے کچھ سیدھی کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ فارغ ہو کر کچھ دیر لیٹنے کے ارادے سے
کمرے میں آئی تھی کسی جب اسے نیا حکم ملا۔

”جی ہاں،“ وہ اتنا کہہ بیٹھی۔

وہ حسبِ معمول پنکھوں کو چار دیوگانوں سے ٹٹولتی رہیں کہ کہیں کوئی داویہ بگڑا ہو جائے یا ایک آدھ خشکن کا
پانی ختم ہو گیا ہو۔ وہ ہر دو گزرنے سے باہر نکلتی گئیں۔

سواری کی حالت بہت ہی اُست بہت ہی تقریباً “بتنی کام اس کے تاواں کا ندھوں پر ڈال دیئے تھے۔ وہ
صبح بستر سے اٹھتی تو پھر جسے رات گئے نہیں جا کر سیدھی کرنا نصیب ہوتا ہے پھر جیسا کہ کام کا زمانہ اب نیل کر
جاتے ہیں۔ اس کے پاس دائرے میں کمرے کے کچھ افراد کے کام اُلٹ گئے تھے۔

وہ دن میل لگاتی رہی۔ چاول والے نو بجے سے چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ چاول نہایت سے قسم کے
نئے ان میں بے حد کٹر پڑتے تھے۔

ریجہ بچن کی رو پار سے ٹیکہ لگا کر بتشی چاول صاف کر رہی تھی۔ اسی وقت مینا بھی بچن میں جل آئیں۔
”تم اور ترانہ کل کہاں گئے تھے؟“ انہوں نے جھوٹے برتن سنگ میں جمع کرتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

”جس؟“ ریجہ جو گنگے ”کل؟“

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تو اسے کچھ یاد نہ آیا۔ وہ لوگ بھلا کہاں آتی جاتی تھیں۔
”اب کوئی یہاں سوچ رہی ہو شاید۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”کل تم دونوں پارک گئی تھیں نا؟“

”پارک؟“ بچی اس پارک تو گئے تھے۔ یونیورسٹی ڈراما چیلنج کرنے کے لیے۔“

”ہوں۔“ وہ دیکھ کر تروکورس۔ پھر بولی۔ ”کوئن بلا تھا وہاں؟“

ریجہ کو جواب سن کر گنگے گیا۔ اس کی سیجھ میں نہ آیا وہ اسمیں کیا جواب دے۔ اسے ترانہ کی تنبیہ یاد آگئی تھی۔

پہچان۔ بس انتاظم تھا کہ وہ اچھا لگتا تھا۔ یہ تھا کہ اس ایسا جانتی ہے بھر فردوس شکم کے تیر ویا چاکلی بنی مگر
راغب نے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ تو اس کے لیے مانیہ اور سیدہ جیسی ہے۔ اس نے پیٹہ
پھولی۔ بہن کی طرح سمجھا ہے۔ عرش کے معصوم سے دل کوں سا ہوا تھا۔ آئینے کو عین مل گئی تھی۔ لیکن وہ
روانی اور بے نازی کی عمر بھی چند دنوں میں وہ سب کچھ بھول بھل گئی۔ اس نے کدورت کو بڑی حفاظت سے
کے نماں خانوں میں سینت سینت کر رکھ لیا تھا لیکن سیدیوں اور ہم جیول سے مل کر اپنے اپنے وقتے
عرش کو بیات یا بھی نہ دیتی تھی۔
لیکن اچانک ہی جیسے کوئی کلمہ تمیز نہ یاد آیا تھا۔ دل کو پھر آج مل گئی تھی۔ وجوہ میں جلابی کنول تیر نے لگے
کسی کی شہنشاہی آواز نے دل میں نصب لگائی تھی۔
”چند دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ واپس آکر یاد کروں گا آپ کو۔“ اس نے کہا تھا۔ عرش کو انڈاز نہ
تھا۔ یہ چند دن گزارنے کے لیے قدر مشکل ہو جائیں گے۔ اس کا جی بہلتا ہی نہیں تھا اور آج پورا ہفتہ ہو گیا تھا اسے
گئے ہوئے۔
عرش ہار گئی تھی۔ بس نے بھی اسے فون نہ کیا تھا۔ عرش بے نازی کی چادر اوڑھ کر باہر گئی جیسے چند لفظ
بولی کہ احسان کیا ہو۔
آج جی کہتا تھا کہ اس کا احسان اسے اگر اس کی آواز سن پائے۔ کتنی اچھی نہیں کرتا تھا وہ، خائب شک
کھری ٹھکری ٹھکری کرس بلکا بھٹکا ہوا تھا۔ عرش کے دل میں سے اس کا کیا کرنا تھا۔
اس نے بالآخر خلاؤ میں کرس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ موبائل آف تھا۔ اس نے بایس ہو کر فون رکھ دیا۔ آنکھوں
میں آنسو بھرا آئے۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔
اس نے ایک مرتبہ پھر فون نہ کیا۔ مگر تیر وہی تھا۔ اس نے روبرو رکھ دیا۔
”گھر گھر۔“ بلکی کی تیر لگی تھی۔
وہ یوں اچلی جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ سناٹے میں تیر کی آواز بھی کافی تیز لگتی تھی۔ اس نے فون

PHOTO

عزیز! آپ کی رہی میں تامل! اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر رہی بولا۔
”جی ہاں! سن رہی ہوں۔ آپ بولتے رہیں۔“ اس کے من نے شہزاد کی۔
”کیوں نہ ہی؟ یہ فون ہے یا ریڈیو؟“ وہ بولا۔
”وہس پڑی تھی۔ ایسی شفاف فحش کہ خود اسے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔

پھر وہ نولں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

موتوب سے انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ہولے سے کہہ کھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے ہمت جھنجکی۔

"ابو جی! آپ نے بلایا تھا؟"

فادوق حسن نے جیشے کی ادا سے اسے دیکھا اور کتاب بند کر دی۔

"آئیے! میاں صاحبزادے! بیٹھے! گاماں ہوتے ہیں آج کل؟"

گھر ہی میں ہوتا ہوں ابو جی۔" وہ ان کے مقابل چاہیٹھا۔

"ماں تو آپ کی آپ کے ذکر پر بڑبڑاتے لگتی ہیں۔" انہوں نے غور سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ "بیویوں کے باب میںوں کے متعلق اندازہ ان کی ماؤں کے انداز سے لگاتے ہیں ہاشم! آج کل آپ کی اماں آپ سے خوش نہیں ہیں۔ کیوں؟ وضاحت کریں آپ کے آپ؟"

ہاشم نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں کیا وضاحت کروں ابو جی؟ اسی نے مجھ سے تو یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا اپنی ناراضی کا مال! اگر آپ ہاشم کی وجہ میں بتائیں تو میں ضرور وضاحت کر سکوں گا۔"

"آپ کے سر پر سرسرا جانے کی خواہش مند ہیں وہ اور آپ کی لڑائی؟" وہ توجہ سے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"میں گھر لڑائی نہیں ہوں ابو جی! میں تو خود شادی کا خواہش مند ہوں۔"

"چچا! خانیہ سے شادی کریں تمہاری؟"

"جی۔۔۔" حملہ اچانک ہوا تھا، وہ گڑبڑا گیا۔ "میں ابو جی! میں غلطی سے گھر لڑ شادی نہیں کر سکتا۔"

عشرہ عیسٰی سے وہ۔۔۔

"نہیں ابو جی۔۔۔" اس نے سر جھکالیا۔

"وہ مجھے عشرہ عیسٰی جیسی لگتی ہوگی۔" اچھا۔۔۔ انہوں نے چشمہ اتارا۔ "ڈاکٹر شمس کے علاج کوئی ملک۔۔۔ مجھے کوئی ایک لڑکی جو عشرہ عیسٰی نہ لگتی ہو نہیں۔"

"بو ابو پیر۔۔۔" اس نے سر جھکالیا۔ "میرے جذبات کا فراق مت اڑائیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ آپ نے سچ کہا میں ڈاکٹر شمس کے علاوہ کوئی نام نہیں لے سکتا۔"

"متم فصلہ کر کے ہو؟" انہوں نے کب بھینچے لیے۔

"جی۔۔۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

دو چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ ہاشم کو اپنے چہرے پر ان کی نظریں، بخوبی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ حتی الامکان سیات چڑے بے ہوشا رہا۔

"اس لڑکی کا ہاشم ٹھیک نہیں ہے ہاشم! دفعہاً! وہ تجھے لہجے میں ہولے

ان سب باتوں سے کہیں۔۔۔ نتیجہ نہیں نکلا کہ اس کا ہاشم درست نہیں تھا۔ خدا خواستہ وہ کوئی کرپٹ لڑکی تھی۔ اس نے غلطی کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے قدرت کی جانب سے غلطی کی سزا مل گئی۔ اب وہ آئینے کے مانند صاف، چمکدار کر دار دیکھتی ہے گھر سے ہوئے پانچ سال اس بات کا ثبوت ہیں۔ بابا! ایک مطلقہ! بچے کی ماں سے شادی! مگر کوئی بری بات ہوئی تو ہمارے نتیجہ بری زندگی میں اس کا نشانہ نہ ملتا۔ ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں پھر ہم کیوں ایسا کامان رہیں؟ بعد اسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس چیز کو غلط سمجھے برا کرے۔

فادوق حسن کی نظریں میں اب جس در آئی۔ جیشے کی کمانی منہ میں رہا ہے وہ اسے دیکھتے رہے۔

"تمہاری ماں کو کون بھانجے گا؟ وہ اس لڑکی کا نام منہ میں نہ نہیں کرتی۔"

"ہیلے! "اس" جانب سے کوئی مثبت جواب آجائے بابا! وہ آہستہ سے بولا۔ "اسی سے پھر بات کر لیں گے۔"

"وہاں کسواہر کیے ہو؟" انہوں نے اسے گھورا۔

وہ گڑبڑا گیا۔ پھر متبھیل کر بولا۔

"وہ چھوڑو! بھیجا تھا تو نبی زارا سے معلوم کرنے کے لیے کوئی رشتہ تو نہیں بھجوا لیا بابا میں نے۔"

"وہ رشتہ بھی بھجوا دو تو ہم کیا کر لیں گے پر خود را۔۔۔" انہوں نے چشمہ پھر لگالیا۔ "مہر حال اپنی والدہ صاحبہ کو

آپ کا نام سے مجھ سے یہ درو سر نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

چند لمحوں کے لیے۔۔۔

بابا! ان کی ماں کو سوچ کر آئے گی۔ ہمارے گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے کوئی زیادتی ہو جائے۔"

چشمہ پھر نہ لگایا۔ اس نے روشن کیے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ راقھا۔

گھر کے کمرے میں بیٹے نے۔۔۔ "میرا" میں کھوئی ہوئی تھی۔ سادہ نمیل پر بھاپ اڑانی کافی ٹانگ رکھا جو۔۔۔

افیدہ کمرے میں داس۔۔۔

"فون ہے۔" وہ سخت بگڑی ہوئی تھی۔

"میں کا باپ ہیٹل سے ہے؟" اس نے چادر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"پاکل خانے سے ہے۔" میٹل باپ ہیٹل سے۔ داغی مریض آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔" وہ بھیجی ہوئی شینی لگ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ دم صم سی ہوئی۔ "برابر کا فون ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا کہتا ہے؟" اس کا دل انہوں کا شکار ہوا۔

"مگر کوئیے آ رہا ہے۔ کہتا ہے تیار کروں۔"

شملہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر وہ بھڑکا کٹھی۔ تن فون کرتی وہ فون تک پہنچی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ وہ فون اٹھا کر دھاڑی۔ ”کیا چاہتے ہو اور ار جیلانی؟“ مجھ سے میرا بچہ جیسن لیتا چاہتے ہو۔
 اپنے سات جنرل کے بدلے جگانا چاہتے ہو؟ تو پھر کیا کر؟ میری بے بسی کا تمنا کر کے کر جان لیتا چاہتے ہو میری
 ٹھیک سے میں بھی دیکھتی ہوں تم کہاں تک جا سکتے ہو؟ لے جاؤ۔ تمہارا بیٹا ہے ناؤ، میری بے
 ہستی پر تمہاری فوادش کے کھوں کا ٹھیک۔ ٹھیک ہے لے جاؤ۔ میں سسک سسک کر جان دے دوں
 لیکن تم سے رحم کی ٹھیک نہیں مانگوں گی۔ دو دو گرانڈھی ہو جاؤ گی، لیکن تمہاری چوکھٹ کو سجدہ نہیں کر
 سکتی۔“

وہ دم بخود اس کو سن رہا تھا۔
 ”شٹلا! اسے خاموش ہونے پر وہ آہستگی سے بولا۔ ”اٹنی ایم سو ری، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا
 یقین جانو میں ایسا کچھ نہیں چاہتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ بخدا میں تو صرف تمہری محبت سے مجبور ہو کر چند گنہگار
 کے ساتھ گزار کر سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس طرح سے سوچو گی مجھے اندازہ نہ تھا۔ بھلا میں تم سے کر
 بات کا بدلہ لوں گا؟“

وہ چپ ہو کر گریے گریے سانس بھر رہی تھی۔
 ”کہاں تھے تم؟“ پھر بولی۔ ”اٹنے سائوں سے کہاں تھے؟ وہ؟“ اہوا اس نے گھٹنوں پر جھپٹا لیا۔
 ”میں اٹھا لیا کھانا کھا کھانا اپنے گشہ دار کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا اتنے عرصے میں کہاں تھے ابراوہ؟“
 اب تمہیں اس کی یاد آئی جب اس کا معہوم ذہن ہر طرف سے کھانے کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔
 اس کے سوالوں کا جواب نہیں کر آتے ہو؟ یہ محبت پہلے کس کی تھی؟“
 اس نے گہری سانس بھر لی تھی۔

”شٹلا! پچھلے سال باپا سارا میں رہے اور چند ماہ قبل اماں بھی رخصت ہو گئیں۔ بابا نے مجھے حسودی تھی تم
 سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کی، وہ تمہاری اولاد کو اپنی جائیداد میں سے کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے تھے۔
 میں مجبور تھا۔ لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ میں اس سے مل سکتا ہوں۔ اسے پھر کر سکتا ہوں۔ اسے اس کا باپنا
 حق دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں باقی زندگی بھی دل پر چھڑو کہ کر گزارا
 دے دوں۔ تم خوش رہو۔“
 شٹلا کا گلا رندھ گیا۔

”بہت پروا ہے تمہیں میری خوشی کی؟“
 ”بالا ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم یقین کرو یا نہ کرو۔ جس بیٹے کو میں نے بھی دیکھا ہے چوانہ تھا۔ اس کی محبت نے مجھے
 اتنا عرصہ کیوں پریشان رکھا۔ اس بات کا جواب میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں۔ تم بھی خود سے پوچھنا دیکھو کیا جواب
 ملتا ہے۔“

شٹلا سے کچھ بولانا چاہا۔
 ”میں فون کر رہا ہوں۔“ وہ بولا۔
 ”تیار کر دی ہوں اسے۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لے جاؤ۔“
 اس نے گہری سانس بھر لی تھی۔
 ”اب تک کی ہی ہو۔“

شٹلا نے ریسپورڈ کر رکھا۔ لیکن اب اسے تماشا درد محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں بے حد وحساب چلن تھی۔ وہ آ
 دی کھڑی اپنی سکیوں کا گلا کھو کھو رہی۔

PHOTO

”السلام علیکم۔“

”ابا! ماراؤ؟“ حقیقتہً حیات اور غدارا بیگم دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”فردوس بیگم! اپنا بھاری بھر کم خود سنبھالے کی جلی آ رہی تھیں۔“

”وہ علیکم السلام۔“ بیٹی رزد۔ ”حقیقتہً حیات شکر میں۔“

”شکر ہے۔“ وہ بیٹھ گئیں۔ ”میں یہ جو رتبہ کارہوئے ہوئے ہیں ایک ہی گھر میں رہ کر۔“

وہ بیٹھیں، بیٹھیں، ہوسکی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم صورت کو ترستے ہیں ایک ہی گھر میں رہ کر۔“

”اگرے! اب اس عمر میں کیا روٹھنا؟“ انا اسے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہاں دن کئے کہ وہاں کئے بس چل
 چلاؤ کاروبار۔ تم میری سناؤ فاروق حسن کیسے ہیں؟ وہ دو۔ ”تین تین دن مال کو پوچھتے نہیں آتے؟ بیٹھے سے اچھے

میرے پوتے ہیں۔ دن میں دس چکر لگا لیتے ہیں۔“

”اب بی بی کے بیٹے ہیں وہ؟“ میری تو ایک نہیں سنتے۔ ”وہ پتہ زاری سے بولیں۔“

”ابھی بھی میں علی کا پتا کرنے آئی
 تھی۔ بیٹھنے کے بل کی آخری رائے ہے وہ لگ جائے گی کیا کہتے ہیں جرمانہ سونڈیہ اوپر بھرنا پڑے گا۔ ابھی تو باوا
 بھرے تھے تو لکھ نہیں پائیں اپنی جیب سے بھرے گا تو میا یاد آئے گی۔ اسے ہاں۔“

وہ اب اس پر اسے لکھیں۔

”اگر وہ علی کی نظر میں آ رہے؟“ انہوں نے گھر میں گھمائی۔

”وہ دونوں پوچھ کر لے گئے ہیں۔“ غدارا بیگم نے جواب دیا۔ ”علی اور مزو کی کلاس میں شروع نہیں ہوئیں؟“

”کیا پوچھو؟“ وہ بولیں۔ ”جواب کی جاگیر ہوئے۔ جب جی ہوا نہ اٹھا کر چل دیتے ہیں ورنہ بے
 تھے تیل کی طرح چپڑے ہیں۔“

”اچھا! پچھلے دنوں میں غدارا بیگم سے اجازت چاہی۔ وہ شکر اکر رہ گئیں۔“

”بہر حال اسے بھی ہوسکی ہو کر۔“

”بہر حال اسے بھی ہوسکی ہو کر۔“

”اگرے! ابھی۔“ علی نے کہا۔ ”ابھی میں غدارا بیگم تم سے اپنے نافع کے لیے۔“ وہ بیٹھے ہوئے بولیں۔

”کوئی اعتراض ہو؟“

”اندرو آئی وہی عامہ کے قدم وہیں رکھنے۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے لگی۔ فردوس بیگم تذبذب کا شکار
 تھیں۔“

”اب اماں! اسے چلتے پھرتے کیا جواب دوں۔ آپ کے بیٹے کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ پھر ہی کچھ کا سوال
 کی ویسے مجھے تو نافع بھی پسند ہے اپنا کھرا کچھ ہے۔“ انہوں نے سامنے ہی پلا بڑھا۔ ”لیکن پھر بھی۔“

”ہاں ہاں فردوس! تم سلی سے سوچو۔“ حقیقتہً حیات نے انہیں مطمئن کیا۔ ”ہم تو یونیورسٹی ڈراڈ کر کر رہے تھے تم
 سے تم سوچ بوجھو۔“

ناعمل پلٹ کر بھاگی۔ ایک اچھی خراس کے ہاتھ لگی تھی۔

(باقی آئندہ)

خیال رکھتے ہیں۔ دود کاٹیں اور ایک گھاس کی ملکیت ہے۔ حکام چچا کو کانوں کا گرایا لے کر داری مونس کردہ قدرے فکر، غاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سکینہ بھی بڑوں ہونے کا حق پر غور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں رجبہ کو تاخیر خالق سے لگائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب دوسرے یہ گھر بننے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہنسی غراں شوکت ہے جو اس کے گھر کی منایت کم قیمت لگتا ہے۔ نفسہ خالہ بھی اس کے فرخواریاں میں ہے۔

”رجبہ متوا! ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید بیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے رنگ میں دیکر کافورات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی لکھی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے ایک شہت محسوس ہوئی۔ بے بوسہ خطوط میں پتہ بھی نام اس کی ٹکڑے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوئی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقیں باؤں کی پوجو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر کو خط پڑھ کر بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شلما اپنی ہاں سینہ بیکم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا پانی اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شلما کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے بات کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا پڑا بیٹا شام ڈاکٹر شلما سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ فلسی ٹکڑے لے کر رہی ہے۔ رجبہ اپنی بھائی اور لوگوں کے بدلے لے رہی ہیں۔ ننگ انہی پچھو کے گلا ہو جانے کا اندیشہ رہتی ہے۔ رجبہ نے ان کا قاتل عمار سے ہونی ہے۔ بیان کر کر کہ رجبہ کو گرا کر رہی ہے۔ انڈیا کی پتہ پچھو کے گھر تک رہنمائی کی نزد داری لے لیتا ہے۔

۱۲

بائیں چوہین قید ہے

”فداسنگ نیرنہ“ وہ چلا ننگ لگا کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ چائے پتی ہوئی راجہ بیگم اور کڑھائی کرتی ہوئی وردہ چونک اٹھیں۔ ”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”چھاوہو کیا؟ چپک چپکی حاضر ہاںک جبکہ غائب! ابھی تو تم مانیہ کی طرف تھی۔“ ”جی! میں اسے جان بیا لکل گئی تھی۔ وہیں سے تو لائی ہوں۔ چپسی خیر اس نے بچا رہا۔“ ”ہاں۔“ ”دیکھ کئی ہوئی کوئی نیا سوٹ مائی ڈش۔“ ”وردہ اسے اسے نظر گھر کر کھلا۔ ”تمہارے لیے تو یہ بھی ”خیر“ ہوئی ہے کہ مانیہ نے بہت اچھا سوٹ سلوایا ہے اور پھر اس ”منبر“ کے ساتھ ایک حدود فرمائش نالک کرا می کو ستا رہی ہو۔“

”جی نہیں جناب! اس بار میں اصلی سے جی خیر لائی ہوں۔ میرے ان بے گناہ کانوں نے خود سنا ہے۔ لیکن جانئے! میں نہیں سنا کی آپ لوگوں کو یہاں تو کسی کو کوئی دل چھینا ہی نہیں۔“ ”ہاں! میں سنا ہے۔ میں پائے کھڑوں کی باتوں میں دل چپس!“ راجہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے چائے کا مٹھو نہ بھرا۔

”پرایا کہ؟“ ”اسی نے احتجاج کیا۔“ ”میں سلجوق ماموں کی طرف گئی تھی۔ وہاں تانی امی اور فردوس مامی۔ خیر“ ”جائے میں نہیں تانی۔ رائے تانی، تو میں باہر آتا ہوں ذوق و شوق سے پوری بات سنیں۔“ ”وردہ آپ کو بالکل ہی لاوار“

اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔

”اچھا چلو۔ کوک!“ اس نے سگراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں بے حد دل چپس سے سن رہی ہوں۔“ ”اسے کیا۔“ وہ پھر چوتھ ہو گئی۔ ”تانی امی عزیزہ کا رشتہ مانگ رہی تھیں تابع بھائی کے لیے۔“ ”اچھا! وردہ چونک اٹھی۔

”تانی؟“ راجہ بیگم نے بھی دل چپس لی۔ ”پھر بھائی جان نے کیا کہا؟ تو بڑی خفا خفا رہتی ہیں عذر راجہ بھائی

”انہوں نے کوئی خفیہ ذلکی نہیں دکھائی۔“ ”وہ مزے سے بولی۔ ”بلکہ ان کا قول چاہ رہا تھا فائنٹ“ ”ہاں! کہہ دیں۔ بس ضبط کر گئیں۔“

”بذخیر!“ ”وردہ ہنس پڑی۔ ”تم نے ان کے اندر بھانک کر دیکھ لیا؟“

”میں نے تو کمرے میں بھی نہیں جھانکا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”ماہر ہی کھڑی تھی۔ لیکن ان کی آواز میں جو بے آبی اور خوشی تھی میں اس سے کچھ بھی نہ سمجھتی کہ ممانی جان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔“

”اب!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”نہ تم ساری گفتگو چھپ کر سن رہی تھیں؟ کہاں تھیں تم؟“ ”ای۔ جی! امی کو کئی ارادہ تھا وہاں ہی تھا جب کہ سننے کا۔ میں تو قہر چٹ مانیہ سے ملنے ہی گئی لیکن جب میں کمرے میں آئی تو وہاں نے کئی تو مجھے ممانی جان کی آواز آئی۔ وہ تو میری صورت سے چڑتی ہیں۔ اسی کے میں نے دایں آئے گا اور کیا تب ہی کچھ مجھے میرے کان میں بڑکنے۔“

”وہ معلوم! میں کڑھائی میں دے گئی، لیکن راجہ بیگم اسے کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وردہ کے لبوں پر سہرا بہت لڑکھائی ہو رہی تھی۔ ”کیا جان متوجہ ہو گئی جس پر وہ پھول کاڑھ رہی تھی۔“

”غصہ! امی! یہ سب دیکھ کر؟“

”جی! میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

”اگر!“ راجہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھائیوں کے گھر کی پوری سیریل کے لیے۔“

ورد مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں گویا جھپٹنے لگی۔
 ”بھئی عرشہ کیسے پاس جاتی ہوں۔“ چاکلی اسے نہ خیال ہو جھا۔ ”نیکوں تو“ علم سے یا نہیں۔“
 ”منجھو آرام سے۔“ ”ابہ تیکم سے پھر وائٹ پائی۔“ ”تم بھی کیا بات سمجھائی ہے میں نے اس کان سے کنی اور
 ذرا سا غور کیے بغیر اس کان سے نکال دی۔ خروار جواب اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو۔“
 ”لیکن اسی اسے تو چاہو وہاں چاہیے۔“
 ”ہاں تو اس کی ماں تائیں۔“ باب تائیں گے۔ تم کس خوشی میں روزی بھاگی جاتی ہو؟ دیوانی کہیں کی۔ اس پر
 باعجب اور پیچھے کی کہ تمہیں کس فرشتے نے اگر اطلاع دی تھی تب کما سے کہ چھپ کر بات سنی تھی۔ انچیز
 عزت افرونی ہوگی تمہاری۔“

”کبھی اڑائی ہے پتنگ؟“
”نہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”سورہی ہیں۔۔۔ کیوں؟“ اسے اس کے انداز پر تعجب ہوا۔

”صورت؟ وہ کیا کر رہی ہے؟“

”صورت تو گھر پر نہیں ہے۔ اسکول سے اب تک نہیں لوٹی۔“

ترانہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

”اچھا میں آتی ہوں۔“ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

ربیعہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے برآمدے میں چلی آئی۔ ترانہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جس کو خوبصورتی سے پیک کیا گیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ ربیعہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”کتنی۔۔۔ خاموش!“ وہ سرگوشی میں بولی۔ اور سیدھی اپنے باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پیکٹ اس نے الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا۔ منور امین اپنے بستر پر آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے ان کا زیادہ تر وقت اسی انداز میں گزرتا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔

”تم نے کھانا کھا لیا؟“ ترانہ نے شکفتہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔ مجھے تو بڑا بھوک لگی ہوئی تھی تمہارے لیے کھانا نکالوں؟“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہیں نما

آچکی تھیں۔۔۔ مسکرائیں۔۔۔ میں برگر کھا کر آئی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ ربیعہ سادگی سے بولی۔ ”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“

”ہاں چائے پیوں گی۔ لیکن تھوڑے کچن کا نقشہ بنا رہا ہے کہ تمہارا اسکاؤٹ آج یہیں تمام ہوا ہے۔“ ترانہ نے نگاہیں چاروں طرف بھٹوٹے۔ لکڑی۔

”یہ دھلی دھلائی برنیاں اور بوتلیں۔ صاف ستھرے شیٹیں بھونچے بیٹھے ہیں۔ اور یہ چمکتا ہوا چولہا خوب محنت ہوئی ہے۔“

”مجھ سے گزرا۔۔۔ میں براہ راست نہیں آتا۔۔۔ وہ منہ دینا۔۔۔ اس نے کہا نہیں تھا یہ سب کچھ کرنے“

”لیے۔ بس وقت گزارنے کے لیے کوئی مصروفیت تو ہونا چاہیے نا۔“

”ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب کم از کم میں تمہیں چائے بنا کر تو بلا کر

ہوں نا؟“

”نہیں۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں بناتی ہوں چائے۔ ذرا یہ چولہا صاف کر لوں۔“

”تم سے نہیں جیت سکتی۔ چلو میں تب تک کپڑے بدل لوں پھر چھت پر چلتے ہیں۔“ وہ کچن سے نکل گئی۔

ربیعہ نے مسکرا کر ایسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ آج ترانہ بے حد خوش تھی۔ وجہ غنیمت

اسے معلوم ہونے والی تھی۔ چھت پر اسے لے جا کر ترانہ بھی چھت کی طرح ہو جاتی تھی۔ کھلی کھلی اور روز

روشن۔ ربیعہ سے وہ اپنے دل کی سب باتیں کہہ دالتی تھی۔

ربیعہ نے چولہا صاف کر کے چائے کا پانی رکھ دیا۔ باورچی خانے کا اجلا پن اس کا من اجال رہا تھا۔ سب

صاف ستھرا اور نکھرا ہوا دیکھ کر اسے روحانی خوشی مل رہی تھی۔ اسے محسوس نہ ہوا کہ کچن کے دروازے پر کھڑا

ترانہ مسکراتے ہوئے اسے اپنی محنت پر خوش ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”ہمت خوش ہو؟“ اس نے پوچھا تو ربیعہ چونک اٹھی۔

”ہاں!“ وہ ہنسی۔ ”لیکن تم سے زیادہ نہیں۔“

ترانہ چونک کر اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا میں خوش ہوں؟“

ربیعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اور چائے کا کلمہ اسے تمنا دیا۔

”تم کوئی ایکن پست پر چل کر۔“

ترانہ جینپ کر بیٹھ گئی۔

”آج میری سالگرہ ہے۔ عبدالباری نے مجھے لچ کر پایا اور گفٹ بھی دیا ہے۔“ اس نے چمت پر چل مٹی

کرتے ہوئے اسے بتایا۔

”پندرہ گرتی ہو تم عبدالباری کو؟“ ربیعہ نے اس کی آنکھوں کی چلتی ہوئی جوت دیکھی۔

”جو“۔ ”ترانہ نے اسے گھورا۔ ”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے نہیں؟“ پسند نہ کر لی تو اس کے

پہرتی گئے تھے خواہ مخواہ میں۔“

”شادی کیوں نہیں کر لیتے تم دونوں۔ اس سے کونایا آٹھنسی سے بات کر رہی۔“

ترانہ کی آنکھوں کی جوت مدھم مدھم پڑ گئی۔ وہ اداس سی ہو گئی۔

”میں نے شادی کر لی تو ابو کا کیا ہوگا ربیعہ! اچانکوں کے متعلق تو تم جان ہی گئی ہو۔ انہیں گھر سے جتنی

دلچسپی ہے وہ وہی جتنی بیٹی بات تو نہیں۔ روز تو کہہ دیتے کہ راتیں بے آگاہی میں اور بس! ابو کی وہ انیاں دیگر اخراجات

یہ سب کچھ میری تنخواہ سے چلتا ہے۔ پھر اچانک باری کی پوزیشن بھی اتنی اسٹوگ نہیں ہے۔ ہم کچھ عرصہ تو

شادی کا سوچ بھی نہیں کئے۔“

”میں آٹھنسی جاتی ہیں اس کے متعلق؟“ ربیعہ نے پوچھا۔ ”وہ مجھ سے کسی پوچھ رہی تھی ہاں کی کہ جتنی

”ہاں۔“ معلوم ہے مجھے یہ صولت ایک نمبر کی جاسوس ہے۔ میں بھی بھلا اس سے اسے بدل کی کہ نہ نہ کی تھی۔

مجھے علم نہ تھا کہ یہ میسنی پچھو کو پوری رپورٹنگ کرتی ہے اس نے انہیں خوب ہڑکایا۔ پچھو نے مجھے

دیکھ کر دی کہ اگر میں نے باہر کسی لڑکے سے روایا رکھے تو وہ ضرور انہیں کہتا کہ میری خوب نمکائی کرواؤں

ربیعہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد لاہر والی سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔

”لیکن سو۔۔۔ اتنی سخت کیوں ہیں ترانہ؟“

ترانہ زور سے ہنسی۔

”وہ ظالم سانچ ہیں ربیعہ! ظالم سانچ محبت کے گھالی سینوں سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کہہ کی آنکھوں میں

رنگین سینے دیکھ کر ان کا پس نہیں چٹکا کہ وہ ان آنکھوں کو کوچ کرانہا کر دیں۔ لوں پر کتنی ہنسی ہے ان کے

کانوں میں زہر بھر کر لگتا ہے۔ آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کا پس نہیں چٹکا کہ وہ ایک ایسا قانون پاس کروا

دیں جس کے تحت محبت کا نام لینے والوں کی زبانیں کھینچ دی جائیں۔ خواب بننے والی آنکھوں میں سلائیال

پتھر بادی جائیں۔ دیکھنے والے کانوں میں سیر ہو جائے۔“

ربیعہ دم بخود رہ گئی۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے،

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی تعلیمات میں امتداد اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ یہ کتاب اسلام آباد پرنٹرز سے لہذا صحیفہ ہر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق یہ سترہ سنی سے عزت رکھیں۔

ترانہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی۔

”جتنی سخت حکومت اتنی سترہ سنی بغاوت۔ اتنی سختی بات نہیں سمجھتیں ربیعہ! میرا سانس لینے کو روزانہ میسر نہ ہوتا تو اور بس ڈھادی جاتی ہیں۔“

ربیعہ کو باغی ترانہ سے خوف سا محسوس ہوا۔ اچانک ہی وہ چونک کر بیڑیوں پر اس نے بالوں کی سیاہی دیکھی، پھر

اسے لال کیڑوں کی جھنک نظر آئی۔ کوئی چھپ کر وہاں جا رہا تھا۔

”اے لالہ! کس نے تمہاری ہاتھیں سی ہیں۔“ وہ اچانک ہی ڈھکی۔

”اے لالہ! کس نے تمہارے سر کو روک لیا۔“

”کون تھا؟“

”سرخ کیڑوں کی جھنک تھی۔“

”تعلیم!“ ترانہ نے لب سکڑے۔ ”یہ لڑکی کسی دن نقصان اٹھائے گی میرے ہاتھوں۔“

”مجھے زنگ لگتا ہے ترانہ!“

”بڑا لالہ ترانہ سے گھبرا۔“

”سنو رول!“ جلدی سے سونا ہمراہ کو چمت پر گفٹ کھولیں گے۔ پتا نہیں باری نے میرے لیے کیا خریدا

وہ اپنے ہاتھ سے مقلعہ سوچا۔ ”جنگل ربیعہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔“

”رات کے کھانے پر پہنچو۔ تیار ہو کر کھانا لے کر آؤ۔“

”سنو رول! اچانک سے چہرے کھل اٹھے۔ عمر نے خوشی سے گھول لیا۔“

”عزاداموں! ہرے ناؤ میں انہیں اپنے بھیا کے بارے میں بتاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

”سنو رول! اپنی پلیٹ پر جھک گئی، جبکہ انیقہ کی پیشانی پر لب پڑ گئے تھے۔ منیزہ بیگم نے پیار سے ساتھ بیٹھے ہوئے

اواسے لگا لگا دیکھا۔“

”ہانا! اس نے پھر کچھ بولنا چاہا۔“

”عزاد! شملہ نے اسے ٹوک دیا۔“ خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“

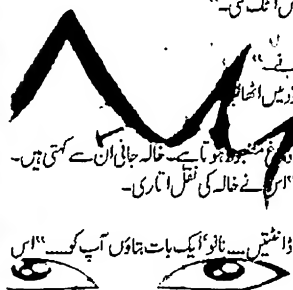
”کیوں جھگڑتی ہو کچھ کچھ بار بار۔“ منیزہ بیگم نے دیکھ کر اسے اسے ٹوکا۔ ”اس کے معصوم ذہن میں بگڑ گائیاں

نہیں آکر۔“ لہلہ رہا ہے۔ بولنے دو۔ کیا لیتا ہے تمہارا۔ ہر طرح کے حالات کو ذہنی طور پر قبول کرنا کچھ تو شملہ بیٹی! افسانہ پھرتا پریشان نہیں رہتا۔ جتنی دھاراکے ساتھ بیٹھو سب کو۔“

شملائے نشوے منہ صاف کیا۔
 "یٹھا لے لو" وہ اس کا ارادہ بجانب کر بولیں۔ "تمہیں تو بے حد پندرہ بادام کا حلوہ۔"
 "بس ای! ابھی موڑ نہیں ہے۔" وہ ڈانٹنگ ٹینل سے اٹھ کھڑی۔ "انہی قدموں لیے چائے بناؤ تو مجھے بھی دنا
 ایک کپ۔"
 "جی یا! اس نے بھانجے کے سر پر جیت لگاتے ہوئے کہا۔
 "نانو۔" وہ اس کے جانے کے بعد بولا۔ "مما کو کیا ہوا ہے۔ مجھ سے ناراض ہی رہتی ہیں۔"
 "نہیں بیٹا! وہ پیار سے بولیں۔ "وہ تو آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ماں تو اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتی۔
 ماں تو اپنے بچوں کو بہت چاہتی ہے۔"
 "اور یہاں؟"

"انک تو اس کی سوئی! انہی نے وائٹ پیس۔" انک جی تو بس انک جی۔
 "نہ کرو انہی! پیسے۔" انہوں نے خفگی سے دیکھا۔
 "پیسے نہیں ہے ای! پورا پورا پیسہ ہے۔ میں تو چلی چائے بنانے۔"
 وہ جی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ منیڈر بیگم نے عمر کو گود میں اٹھا لیا۔
 "بادام کا حلوہ کھاؤ اس کو؟" وہ دولا سے پوچھنے لگیں۔
 "نہیں نانو۔" ماما روخ کھلائی ہیں۔ ماما بھی ہیں اس سے وہ منہ بوجھ ہوا ہے۔ خالہ جانی ان سے کتنی ہیں۔
 اس کا ہاں تو پہلے ہی بہت تیز ہے یا۔ اسے مزید تیز نہ کریں۔" اس نے خالہ کی نقل اٹاری۔
 "ہاشا! اللہ! کیوں نہ ہو۔" انہوں نے اس کا ہاتھ دبا۔
 "نانو۔ آپ سب سے اچھی ہیں۔ آپ مجھے بالکل نہیں ڈانٹیں۔ نانو! ایک بات بتاؤں آپ کو۔" اس
 نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں ہاں بتاؤ! وہ اس نے بہتر تکی لے آئیں۔
 "میرے بھائی مجھے بالکل نہیں ڈانٹتے۔"
 "جی! وہ خاموش سی ہو گئیں۔
 "جائے نانو! وہ مجھے ذرا بھی لے کر گئے تھے۔ سنا ہوا بھی لے کر گئے۔
 مجھے آکس کریم کھلائی۔ کتنے اچھے لہا ہیں میرے۔"
 منیڈر بیگم نے کسی سانس بھری تھی۔
 "اب سو جاؤ عمو! صبح اسکول جا جائے گا۔"
 "ہاں نانو! میں ضرور اسکول جاؤں گا میں اسے سارے فریڈز کو بتاؤں گا اپنے بھائے کے بارے میں۔"
 "نعم۔" کمرے کے دروازے پر شملہ کڑی تھکی۔ "چلو میں سلاؤں تمہیں۔ ای کے قابو میں کہاں آنے
 والے ہو۔ خود بھی جاگو گے ساری رات! انہیں بھی چکاؤ گے۔"
 وہ بہتر سے چلا لنگ لنگا کر ان کی گود میں لٹک گیا۔
 "نانو! شب بخیر! اس نے ہاتھ ملا یا۔
 "شب بخیر میری جان! انہی محبت سے مسکرا دیں۔
 شملہ اسے گود میں لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے محبت سے اسے بہتر پیچیدہ اور خود اس کے



وہ کھڑا تھا۔ شملہ کے کانوں سے

گھڑی کرنے لگی۔
 "دشطان کیس کے شکایت لگاتے ہو ماما کی نانو سے ہاں۔ ماما نفعی ہیں تمہیں۔"
 وہ ہنسنے ہنسنے حال ہو گیا۔
 "مما! ماما میری بات سنیں۔"
 "ہاں نانو۔" اس نے ہاتھ روکے۔
 "میں بھی آپ کی شکایت نہیں کرتا۔ مجھے تو آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ بتاے کتنی؟"
 شملہ نے مصومیت سے ٹپ ٹپ میں سر ہلایا۔
 "جی۔" اس نے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جی الامکان دور کیے۔ "بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ بھیا ہے
 بھی زیادہ۔"
 اس نے کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ شملہ مسکرا دی۔
 "مگر مجھے تمہارے بھیا بالکل پسند نہیں ہیں۔ تم میرے سامنے ان کا ذکر مت کیا کرو، سمجھ۔"
 اس کو پورا اثر کیا۔ وہ اپنی مصوم نگاہوں میں جڑی بن کر اسے دیکھنے لگا۔
 "بھیا تو آپ کو گستاخانہ کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے آپ کی باتیں کرتے ہیں۔"
 شملہ کا دل بھرا۔ انداز میں دھڑکا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو گئیں۔
 "مما! ان سے میری باتیں مت کیا کرو عمو! وہ اس سے دور ہو گئی۔
 وہ بھی اچھی کر رہی تھی کیا تھا۔
 "کیونکہ ماما! یہ ہیں: کڑوں؟" اس کے انداز میں ضد تھی۔ "میں اچھا لگتا ہے آپ کی باتیں کرنا۔"
 یہ بھی شملہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دانتوں سے لبوں کو چٹکنے لگی۔
 "مما! اچھا! میں آپ کو آکس کریم بہت پسند ہے۔ میں نے کہا بھوت! میری ماما تو کبھی آکس کریم نہیں
 کھا۔ یہاں تک کہ کوئی کریم پسند ہے۔ میں نے کہا غلط! میری ماما کے پاس ایک بھی ڈریس ریڈ نظر کر نہیں
 ہے یہاں تو۔"
 وہ کھڑا جا رہا تھا۔ شملہ کے کانوں سے کتنی آوازوں کی آوازوں سے بہت دور ہوتی چلی گئی۔ وہ کس اور جا پینچی
 کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ خالہ کے منظر کو گزرتے تھے۔ ذہنی کے گالوں جیسے منظر۔
 "اچھا! کتنے اچھے پیرا برا۔" اس کی ہنسی کی جھجکا سے پورا گروہ کو ہنسا رہا تھا۔
 وہ بھنڈی ہنڈی آکس کریم اس کے گالوں پر مل رہا تھا۔
 "اچھا! نہ نماؤ۔ پوری ختم کر۔" مجھے رات کے ڈیڑھ بجے آکس کریم لینے بھیجا ہے تاہم نے اب کتنی ہو
 کھائی میں جاتی۔ ختم کرو۔"
 "برا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔
 اس نے اسے اس کا لالہ آکھل پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑے اس کے گلے سے لکل کر اس کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ وہ اسے رو دیا۔
 کی طرف گلے میں باندھ کر بیٹھ گیا۔
 "اب نے کو کھانا۔"
 "بہت برے ہو تر۔" وہ ہتھیلیاں سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔
 "چیکو! گورو۔" اس نے شرارت سے آنکھ چمکی تھی۔ "ایسے ہی کرو یا۔"

شہلانے اسے زبان پر لائی۔

”اے تمہاری زبان تو سفید ہو رہی ہے۔ پاس آکر دکھاؤ۔“ وہ ڈاکٹری جھانٹا۔

”آپ ہی کے جتنی ڈاکٹر ہیں سبھی ہوں جناب۔“ وہ انگوٹھا دکھائی۔

”اے! تمہارے تو ناخن بھی پیلے ہیں۔ چلو کٹو کھواؤ۔“

وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

”مہاشہ! تمہارے اس کا کاندھا ہلایا۔“ کیوں ہنس رہی ہیں آپ؟“

شہلا جیسے کیم ہوش میں آئی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لاشہ بچھا دی۔

”کچھ نہیں، بیلوسو پاؤ۔“

”اماں راہ! کتنی ہی تمہاری شکایت کر رہی تھیں مجھ سے۔“ انہوں نے گاؤں کے کرموں پر ڈال

دیا۔ فاروق حسن بستر پر لیٹے رک گئے۔

”پہلے کہا ہوتا۔ میں مل لیتا جا کر۔ اب رات کے دس بجے بتا رہی ہیں۔ اماں تو سوچتی ہوں گی۔“

”اماں تو سوچتی ہوں گی لیکن تمہارا جاکو۔“ وہ اپنا کپڑا کھینچ کر دوسری کھانسی آ کر بیٹھیں۔

”ایک مشورہ دو۔“

”انہوں نے سوال کیا ہوں سے بیگم کی جانب دیکھا۔

”عذرا نے تابع کے لیے عرشہ کا خیال ظاہر کیا ہے۔ میں نے کہا عرشہ کے باپ کی صلاح کے بغیر میں کچھ کر

نہیں سکتی۔ اب تم کو مجھے تو مناسب ہی معلوم پڑا ہے۔ سچی ایسے گھر میں ہی رہے گی، لگاؤ ہوں گے سامنے۔ ماہین

کو غیروں میں بیٹھا دیا۔ تقسیم میاں تو بہت بھلے ہیں مگر ان میں غصہ بھی ہے۔ ماہین کا اپنا سہرا بھی ہے۔

دعہ کا سارہ رہا ہے۔ جی کو ہر وقت۔ سچی اپنوں میں جانے تو اتفاقاً وہ نہیں ہوتا۔ چلو رافع نے کسی تابع سہی۔ وہ بھی بھلا

ناس ہے۔ بڑھ رہا ہے ابھی تو کسی قابل ہو ہی جائے گا۔“

فاروق حسن کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ابھی بچی کی بات آئی تو آپ کو خدا کا اچھا لگا ہوا شہر کے لیے لے گیا۔ اور وہ عرشہ کا شہر ہے۔

کہ خاندان میں نہیں کرنا۔ اب کہیے اپنی ہی ماں بن کر سوچو تو کیا کھانا؟ عذرا اور رابعہ بھی تو ایسا ہی سوچتی ہوں

گی۔“

فردوس بیگم خفیف سی ہو گئیں۔

”اے ماں! ہم تو تائید پر بھی راضی ہیں اور تمام پر بھی۔ ہماری اپنی بچیاں ہیں۔ غصے میں بھلا برا منہ سے نکل

جی آتا ہے مگر تم تو بایں کاندھے پر سوار ہو رہا ہے۔ قاف اندراج کرتے ہو۔“

فاروق حسن مسکراتے رہے۔

”تمہارا راضی کر لو تو جس کو کھو گے یہاں لاؤں گی، سر کے مل جاؤں گی۔“

”جیسی نیت دیکھی مراد۔“ وہ جرتے ہوئے۔ ”خاندان کی لڑکی نہ لانے کا مصمم عزم ہے جیسی تھیں آپ خدا

نے آپ کی مراد پوری کی۔ اب آپ باہر سے ہی بھولا لیں۔ خیر بات کچھ اور ہو رہی تھی۔ آپ عرشہ کے خلیفہ

پوچھ رہی تھیں تو میرا بھی خیال ہے جو آپ کا ہے۔ پھر اماں نے رشتہ جوڑا ہے اللہ نے چاہا تو بہت اچھا رہے۔

جا۔ آپ ہم اللہ کہہ کر کہاں کیجئے۔ الٹے عرشہ کی رضامندی معلوم کر لیں۔“

”ہماری لڑکیاں بروں کے سامنے نہیں بولتیں۔“ وہ ہاتھ نیچا کر بولی۔

دور وہ انہوں نے شوہر کو چھوٹی مندی کی بابت یاد کروایا تھا۔

”تابع! خود بصورت سمجھا ہوا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لڑکیاں ہی کچھ چاہتی ہیں۔“ وہ بھی رمانیت سے بولے۔

فردوس بیگم بھی ان کا مطلب بھانپ کر خاموش ہو رہیں۔

”اسم کا کیا کروں؟“ وہ پھر بے بسی سے گویا ہوئیں۔ ”آپ کچھ سمجھا نہیں اسے۔“

”مجھے اس کی حالت یاد آ جاتی ہے۔“ وہ بھی دھیرے سے بولے۔ ”وہ سید حساس لڑکا ہے بیگم! اندر زبردستی

نہ کیجئے گا۔ اگر اس کے اصرار میں واقعی ناسخ کی سی شدت ہے تو میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس کی مرضی کے آگے سر

خلاف نہ کریں۔“

”لوگ کیا نہیں گئے۔“ ان کا گھارندہ گہما۔ ”ہمو کے ساتھ تو تا بھی ملا ہے۔“

”لائے! آف کرویں۔“ انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

فردوس بیگم غم زدہ انداز میں تائید پر بیٹھیں۔

عمر گزرتا تھا۔ معصوم بچپن کی معصوم نیند تھی شکوک و شبہات اور دوسروں سے پاک نیند، جہاں آئندہ

کے اندیشے تھے۔ نہ بے نیکی بل پر چھایاں۔ سکون ہی سکون تھا۔ اطمینان ہی اطمینان تھا۔ وہ سکون و اطمینان کے

ساتھ سے گزرتا تھا۔

شہلا نے کراس کی پٹائی چوڑی اور اس کے بکھرے بال ہاتھ پر سے سمیٹے ہوئے اس کا چہرہ غور سے دیکھنے

اس کی سیاہ آنکھیں۔ جیسے۔ بال بھی ماں کی طرح کانٹے اور گھٹے تھے۔ ناک کی اپنی ہی وضع تھی۔

چہرے کی کھل کی سکون نبھوں۔ ”ابو! بالکل باپ کا ساتھ ہے تو اس کے بائیں گل میں گڑھا پڑا تھا۔ ایسا گڑھا

شکلا کے حال میں گڑھا پڑا ہوا ہوا تھا۔ یہ خصوصیت اس نے ان اور باپ دونوں سے لے لی۔

شہلانے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ کمر کی کمر بھرے ہوئے بسترے اتر آئی۔ اور بک شیف کے قریب

اس کا دل تڑپا دیا اور آٹھ اور ایک خاص سوچ اس فرار کا تعاقب کر رہی تھی۔ کتابوں پر انگلی پھیرتے ہوئے

آکے چل آئی۔ کھڑکی کے پاس آکر اس نے کھڑکی کا سلائیڈ تنگ ڈور کھول دیا۔

باہر لان میں اندھیرا تھا۔ رات کی رانی اور جنگلی گلاب کی ملی جلی مہک دھیرے سے کمرے میں در آئی۔ شہلا

نے سید گل کو کھڑکی بند کر دی۔

”کتنی بچہ کہا تھا اس نے اتفاق سے۔ کس قدر بھوت بولنا پڑا تھا اسے۔ اور وہ ایقان! وہ کس قدر دوست تھی۔

کتنی دین تھی۔ اب اس نے شہلا کا بھوت بکڑا تھا۔

شہلا آئینے کے سامنے چلی آئی۔ سامنے اس کا عکس تھا۔ وہ ایقان کی نظروں سے اپنا آپ کھو جتے لگی۔

”اپنی سیاہ آنکھیں غور سے دیکھو۔“ اس نے کہا تھا۔ ”اپنے تراشے ہوئے لبوں پر دھیان دو۔ اپنی ان سیاہ

زلفیں سے پوچھ دیکھو۔ انہیں ایک چاہنے والا، سرائے والا اور کار ہے۔“

شہلانے آنکھیں بند کر لیں۔

”شہلا! اس کے کانوں میں بھولی مری سرگوشی جاگی۔“

شہلانے سم کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

”دیکھا! آئی نالاج اس تصور سے؟“ ایقان کہہ رہی تھی۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو شہلا کہ جذبول کے الاؤ سرد پڑے ہیں۔ رخساروں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بولتی۔“

”ایقان! اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔“ کیسے سمجھاؤں تمہیں یہ بات تو میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ جذبول کے الاؤ سرد نہیں ہیں مگر چنگاریاں جو چھپی ہوئی ہیں۔ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس پر تپ رستے پر بس ایک مسافر ہی منزل تک پہنچا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ منزل کو منزل نہ سمجھا۔ وقتی پڑاؤ سمجھا۔ لیکن اس کے قدموں کے نشان آج تک۔۔۔“

وہ سسک پڑی۔

”اب تک ویسی ہی ہو۔“ کسی نے ہنس کر کہا۔

شہلا ڈر گئی۔ یہ کس نے جی کا چور دیکھا تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جالی کے سفید پردے چپکے چپکے مسکرا رہے تھے۔



”یہ ایریولین کی تصویر یہاں لگاؤ اور یہ ٹرین یہاں۔“ ایقان بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔

”مما! یہ ایمان لہری لگاؤ (Glu)۔“ من نے اس کی توجہ منہی ایمان کی جانب مبذول کروائی۔ ”تو نکال نکال کر کاربٹ بر لگا رہی تھی۔“

”ہائیں۔“ وہ جلدی سے اٹھی۔ ”گندی بجی یہ کیا کیا تم نے کاربٹ کا ناس مار دیا۔ اب یہ کیسے صاف ہو گا۔ تمہارے ابا جاپان سے آئیں گے یہ صاف کرنے۔“

ایمان ہنسنے ہوئے اٹھ کر بھاگی۔ ایقان اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے چائے کی کمر میں درو کی شدید لہر اٹھی تھی جس نے اس کے پورے وجود میں آگ سی بھردی۔ وہ سینے سینے ہو گئی۔ اس کا خاص شگ ہو گیا۔

”مما!۔“ مومن جو غور سے ماں بیٹی کے درمیان ریس ملاحظہ کر رہا تھا چونک اٹھا۔ ”مما! کیا ہوا؟“

ایقان بمشکل ہنسنے لگی۔ ”مومن! اس نے غور کیا تھا۔ ایمان پردے کے پیچھے جا چھپی تھی۔“

”مما! آپ کی طبیعت خراب ہے؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

ایقان محض اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔“

”میں پانی لاتا ہوں۔“ وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر رہا تھا۔

دفعۃً ”فون کی بیل بجنے لگی۔ مومن نے جا کر فون کا ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ جی ہیا۔ میں مومن ہوں۔“

ایقان اچونک گئی۔

”مما کی طبیعت خراب ہو گئی ہیا! میں انہیں پانی پلا رہا ہوں۔“ اس نے اپنی مستعدی کے متعلق بتانا ضروری خیال کیا۔

ایقان اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فون تک گئی۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

"ایقان! کیا ہوا ہے یا؟" وہ فکر مند رہی سے پوچھنے لگا۔
 "جی نہیں جانتا، اس اچانک سی کمر میں فحش کی آنکھیں لگی ہیں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہی۔
 "تم نے کون کسے راضی کیا یا ہم کو بلاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

"مجھا! اس نے کہا۔
 اس کی بکلیں غم ہو گئیں تھیں۔ لب کا پینے لگے تھے۔ جب موسم تھوڑا ہوا تو وہ بڑی زندگی پر محیط دکھائی دیتے تھے اس کو۔ "تمھیں کون سے کب تک خود کو تسلیاں دیتی ہو۔" ایقان نے اس کے لئے خود کو بے حد نثار اور ملول محسوس کیا تھا۔

"ایقان! ایقان! یہ۔" وہ آواز اس دے رہا تھا۔
 "ہاں! اس نے خود کو قابو پانے کی کوشش کی۔ "میں سن رہی ہوں ماما شرا!"

"تمہی بلو جانا!" یہ بھی گون گلی دینے کا انداز تھا۔
 ایقان کی تسلی اب اس جملے سے نہ ہوتی تھی۔ درد بہت عرصے تک وہ وہی سہ لفظی جملہ سن رہی تھی۔
 کرتی تھی۔ دل اب ہی لفظوں کی بھرا کر آقا۔ خوش خوش پھر کر گئی تھی۔
 وہ سری جانب سے سلسلہ منتقل ہو گیا تھا۔ ایقان نے سر سے اٹھائیں زینب اور رکھ دی۔ دل کو اب وہیں کی تسلی کافی نہ تھی۔ جی بھر کر رو لینے کے لیے ایک کاندھا دیا۔
 "میں پھر آگئی تھیں۔" "حیات دلا!" کاندھا اٹھ کر رکھنے لگی۔ "میں مگر انداز میں نہ تھا۔"

"بیلو بھائی جان!" وہ بولی۔ "ایقان بات کر رہی ہوں۔ جی میری طبیعت کچھ اچھی معلوم نہیں۔ وہی کمر میں درد ہو رہا ہے۔ جی راضی ہو کر بیٹھ دوں۔ بھائی جان کی گاڑی لے آئے۔ جی اچھا۔" اس نے زینب اور رکھ دیا۔
 "ہم بے چاری عورتیں!" حوٹے کی پشت سے سر ٹکا کر سوئے گی۔ "اکیسویں صدی کا نوجوان کچھ خصوصی آزادی کی باتیں کر رہی ہیں۔ سیدھا ہوتے ہیں۔ پھر زبے جاتے ہیں۔ پھر نہیں ہوتی ہیں۔ آزادی کی باتیں کرتی ہیں۔ عورت آزاد ہے عورت کے سارے کی محتاج نہیں عورت اسل دے سکتی ہے، پہلے سکتی ہے نوکری کر کے اپنا کھ چلا سکتی ہے۔ سب ہی کچھ کر سکتی ہے بے چاری خواہ اب کچھ کر کر رہی ہو۔ مگر آدم کے لئے سے آج تک اپنا دل آزاد نہ کر پائی۔ آزاد خود کے اندر قیدی دل لے چکی ہے۔ وہاں سے کھنک ایک جملہ کہہ کر فرض پورا ہو جاتا ہے۔ آئی بلو جانو! اس کی بڑی بات ہے۔ نا ہی بول رہی تھی۔
 دیوانہ ساری ساری رات اسی ایک جملے کا تھاق کر رہا ہے۔ یہی سننے سننے رہے کی خواہش میں غمگین رہتا ہے۔ اور بے چاری عورت! کہتی ہے میں آزاد ہوں! جن کا دل زنجیر کی پھینک کا غلام ہو۔ ان کے وجود آزاد نہیں! کرتے دیوانی عورتوں!"

"حیات دلا!" چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے دس پندرہ دن بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی تھی۔
 "تو عمر تو لکھیں بایلوں کی طرح تو اچھلتی کودتی پھرتی ہو تم!" حقیقت حیات نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "خوش رہو رہیں میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ ہمیں تو ہر روز داری بھائی ہے۔ اپنا خیال خود نہ رکھوں تو بی بی! خدا فرشتے تو آ رہے گا نہیں جو بیل تمہارا ہاتھ پکڑ کر سارا دن۔ ہر لی کی سی ملا نہیں بھرتے میں نے ہاں۔ دیکھا ہے کہ جس بے میرا جی ہو کر حرکت کرتا ہے پر ہم بے حرکت چلا لگ لگاتی ہو یہاں سے وہاں تک کی۔" وہ کچن لینے بیٹھی رہی۔

"میرے منہ میں خاک! ایچہ الناسیدھا ہو جانا تو میاں سے کیا کہتیں؟"

"اوسہ! میں نے فحش لیا ہے۔ تا جب کچھ سیدھا سیدھا رکھنے کا۔" وہ جھٹلائی۔ "میاں ہمارا دل الناسیدھا آؤ! ترجمان اب یہ کچھ ہو جاتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور اوسہ! عورت اپنے دل سے مرد کی باغی ہے۔ اسے مردی بھانسا ہے ہر وہ میں بھائی ہو، بیٹا ہو، اور تو اور داد ہو۔ بس وہی صحیح ہے۔ آپ کو بیٹی کی فکر نہیں! ملائی سوچی کوشش ہے۔ حد ہو گئی۔"

"ارے ارے کیسی ناقص ہو رہی ہو، تم۔" انہوں نے بیٹی کو گھورا۔ "وہ ہمیں ہی سوچ کر گیا ہے تمہاری خبر گیری۔ مگر نہ کریں گے کیا؟ اور ہمیں یہ کہنے کا بہت سوار ہے؟"

"جانتی نہیں! اس غصہ آ رہا ہے ہر کسی پر۔"
 "بیٹی! وہ نرم ہو گئیں۔" گیل جان بکھان کے رکھتی ہو۔ چار پہلے کمانے پر دس گیا ہے بچہ۔ آجائے گا۔ ساتھ بیٹے کیلئے کو عمر بڑی ہے۔"

"اے! میں۔" جال سے حال ہوئی بیٹی کے احساسات سمجھ گئی۔
 "تمہی درد نہ تھا کمال! اب میرے پریشاں لگے ہوں گے اور میں بیٹنی بچوں کی لاشی کے سارے۔"
 "میں کھانا کھا کر نہیں دس۔" اس کے لیے شیک بیک کر لائی تھیں۔
 "اے! نام کی بات ہی ہے۔" حقیقت حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

فرانک! چن میں رکھے ہوئے کبابوں کو احتیاط سے پلٹتے ہوئے انہوں نے ایک ٹکاہ عمار پر والی۔ کچن میں پڑی تھی۔ کباب کی پڑی پڑی۔ مڑے سے پلاؤ اور رشتے کا لطف اٹھ رہا تھا۔
 "شاہی کباب! یہ کباب کھانے کا کمال کرتے آئیں۔ اس کے سامنے بیٹ رکھ دی۔"
 "کمال! میں کھانے کو کمر کر م شاہی کباب کھاتے ہوئے ہوں۔" جس نے بھی کماج کما کر معد دل سے پکے کباب کھائے۔
 "کون کون کھائی ہے۔" "اسی راہ" سے گزر کر کبابی ہے۔ "میں تب ہی تو راج کر رہی ہیں بیٹوں کے دلوں پر۔ کھانا کھانا! میں کھانے کے لئے آئی ہوں۔"

"ایقان! یہ کباب کھانے کا کمال کرتے آئیں۔ اس کے سامنے بیٹ رکھ دی۔"
 "کمال! میں کھانے کو کمر کر م شاہی کباب کھاتے ہوئے ہوں۔" جس نے بھی کماج کما کر معد دل سے پکے کباب کھائے۔
 "کون کون کھائی ہے۔" "اسی راہ" سے گزر کر کبابی ہے۔ "میں تب ہی تو راج کر رہی ہیں بیٹوں کے دلوں پر۔ کھانا کھانا! میں کھانے کے لئے آئی ہوں۔"

"جیسے ای! جی! اس بار آپ کے فریڈ رائس اور چکن نے بڑا لطف دیا رہے ہیں۔" اسے اپنا سفر ادا کیا اور ساتھ ہی ہم سفر ہو گئی۔

"وہ کچھ کچھ کمر میں ڈالنا بھول گیا۔ منیجر بیگم نے غور سے اسے دیکھا۔
 "کیا بھول گئے؟" انہوں نے ٹوکا۔
 "اس نے جلدی سے، کچھ منہ میں ڈالا اور مسکرائے لگا۔
 "بھول نہیں گیا، کچھ یاد آ گیا تھا۔" اس نے کھینچی۔
 "اچھا! میں بھی رہتے ہیں کچھ بھول آئے۔" وہ مطمئن ہو گئیں۔
 "جی! جی! اس نے کچھ دیر میں پکارا۔"

"کون ہے؟" وہ اب اس کے لیے چائے دم کرنے لگی تھیں۔
 "ایک لڑکی ملی تھی اٹھارہ بجے تھی۔ میں نے اس کے ساتھ بھی میرے روبرو نام ہے اس کا۔"
 "اچھا! ان کے ہاتھ رکھ گئے۔ لیوں پر مٹی خیر مسکرا ہٹ جاگ اٹھی۔"

"اسی۔" وہ سوچ میں گم ہو گئی۔
 "میں نے یہ تم اس کے ہاتھ گھسنے کے انتظار میں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر کھنکھاریں۔ وہ چونک اٹھا۔ کچھ
 کے بارہ دو بارہ اپنی پیٹ پر جھک گیا۔ وہ بھی چائے بنانے لگیں۔
 کھانے اور چائے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول ان کے کمرے میں چلا آیا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹے
 گیا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پیلائے لگیں۔
 "میری راجی! وہ بہت اچھی ہے۔" وہ جھٹک کر کہہ دیتے ہوئے بولا۔ "بہت حوصلہ مند خود اور باوقار اس کی بات
 چیت میں ہے حد شائستگی ہے، مسکراہٹ میں، بچوں کی ہی معصومیت، آنکھوں میں وہ روشنی جو صرف کردار کی
 بلندی سے ہی ملتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت سختی برتی لیکن وہ عمر اور بہت کی مثال ہے۔ مجھے اس نے
 بہت متاثر کیا ہے۔"

میں نے یہ تم مسکرائی رہیں۔
 "جیسے ہی اسے اپنی منزل کا علم نہ تھا پھر بھی وہ اس کے کسی سے بدلہ دار خواست کی بات نہ کر سکتی تھی۔
 مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خود پر ترس نہیں کھاتے۔ ان کی نظر دنیا کے احساس سے روئے نہیں گئے
 بہت سے افسانہ کار زندگی کی آنکھوں میں انہیں ڈال کر موت کا قلعہ قبول کرنے والے لوگ۔"
 "میں نے جیسے کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں پرتھالیوں سی پھر گئی تھیں۔
 "جیسا کہ اس کے دل پر اس نے بہت اور حوصلے کا شیر کا سا خول چڑھا رکھا ہے۔ دل تو قدرت عطا کرتا ہے نا! ا
 اس پر کس نہیں مگر غفل انسان خود چڑھتا ہے۔ یہ تعریف کا اختتام کون کیسی کرتی ہے؟
 "ہاں! وہ چونک اٹھیں۔ "ٹھیک کہتے ہوئے۔ مگر وہ ہے کون؟"
 "رہیدہ! وہ سارگو ہے بولا۔
 "کہاں رہتی ہے؟ کہاں ہے اس کی؟"
 "ابھی تو میں خود ٹھیک طرح سے نہیں جان پایا۔ بس جو انہوں نے کہا تھا کہ ایک کھانا کھا کر آئے۔"

پتا ہوا۔
 "آج معلوم کر لو تو تمہارا رشتہ لے جاؤں" وہ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔
 "رشتہ؟" وہ الجھ کر بیٹھ گیا۔ "ہائی گاڈ! میری پیاری بھولی بھالی اسی جان ہستادوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔
 آپ یہ یہ کس فرشتے نے کہہ دیا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے؟"
 "تعریفیں تو ایسے ہی کیے جارہے ہو" وہ ہرمان کر بولیں۔
 "اسی جی۔ اسی جی۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "جیتا ہے آپ کو مجھے اس میں سب سے زیادہ کس شے
 متاثر کیا؟"

وہ متاثر ہو کر اسے دیکھتی رہیں۔
 "اس کی آنکھوں میں روشن بلند کردار کے جگنوؤں نے اور جاتی ہیں یہ جگنو میں نے اور کہاں دیکھے ہیں
 آپ کی ان پاری پاری پاری آنکھوں میں۔ اس کی جا بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے آپ کی آنکھیں یاد آئیں۔ اور
 رخصت ہوتے سے اس نے مجھے پکارا۔ عباد بھائی۔ مجھے بہت بہت اچھا لگا۔"

دل کے کا۔ جب یاد آیا
 "جیسے ہی اس نے اپنی منزل کا علم نہ تھا پھر بھی وہ اس کے کسی سے بدلہ دار خواست کی بات نہ کر سکتی تھی۔
 مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خود پر ترس نہیں کھاتے۔ ان کی نظر دنیا کے احساس سے روئے نہیں گئے
 بہت سے افسانہ کار زندگی کی آنکھوں میں انہیں ڈال کر موت کا قلعہ قبول کرنے والے لوگ۔"
 "میں نے جیسے کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں پرتھالیوں سی پھر گئی تھیں۔
 "جیسا کہ اس کے دل پر اس نے بہت اور حوصلے کا شیر کا سا خول چڑھا رکھا ہے۔ دل تو قدرت عطا کرتا ہے نا! ا
 اس پر کس نہیں مگر غفل انسان خود چڑھتا ہے۔ یہ تعریف کا اختتام کون کیسی کرتی ہے؟
 "ہاں! وہ چونک اٹھیں۔ "ٹھیک کہتے ہوئے۔ مگر وہ ہے کون؟"
 "رہیدہ! وہ سارگو ہے بولا۔
 "کہاں رہتی ہے؟ کہاں ہے اس کی؟"
 "ابھی تو میں خود ٹھیک طرح سے نہیں جان پایا۔ بس جو انہوں نے کہا تھا کہ ایک کھانا کھا کر آئے۔"

تم بہت روئے دہ جب یاد آیا
 "تو میری آنکھوں میں آنسو آجائے ہیں۔ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟"
 "میں کہا جاؤں۔ اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔" وہ دھیرے سے بولی۔
 "آنسو کتنے ہیں دل سے پوچھو۔" وہ شرارت سے بولا۔
 "ہاں تو ٹھیک ہے دل سے پوچھو۔"
 "پوچھو تو رہا ہوں۔"
 "عزیز کے گل تپ گئے۔ کان کی لوسن پر مٹی۔
 "بولو نا میرے دل۔ کوئی جواب؟"
 "فرانس۔ پیرا لے متاں کرو۔" وہ جھینپ کر بولی۔
 "ہم کب ملیں گے عزیز؟" اس نے اس کی کیفیت بھانپ کر ٹھیک بولا۔ "اب تو تم گلف مار کٹ بھی نہیں

NOTE

پتا ہوا۔
 "آج معلوم کر لو تو تمہارا رشتہ لے جاؤں" وہ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔
 "رشتہ؟" وہ الجھ کر بیٹھ گیا۔ "ہائی گاڈ! میری پیاری بھولی بھالی اسی جان ہستادوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔
 آپ یہ یہ کس فرشتے نے کہہ دیا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے؟"
 "تعریفیں تو ایسے ہی کیے جارہے ہو" وہ ہرمان کر بولیں۔
 "اسی جی۔ اسی جی۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "جیتا ہے آپ کو مجھے اس میں سب سے زیادہ کس شے
 متاثر کیا؟"

وہ متاثر ہو کر اسے دیکھتی رہیں۔
 "اس کی آنکھوں میں روشن بلند کردار کے جگنوؤں نے اور جاتی ہیں یہ جگنو میں نے اور کہاں دیکھے ہیں
 آپ کی ان پاری پاری پاری آنکھوں میں۔ اس کی جا بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے آپ کی آنکھیں یاد آئیں۔ اور
 رخصت ہوتے سے اس نے مجھے پکارا۔ عباد بھائی۔ مجھے بہت بہت اچھا لگا۔"

جانتیں؟“

”جاتی ہوں مگر اپنے خرچ پر۔“ وہ کھکھلائی۔ ”ایک مرتبہ کا تجربہ کافی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”اس طرح کا تجربہ تو بس ایک ہی ہونا چاہیے لائف میں۔ ایک ہی تجربہ جیب پر بھاری ہے۔ موبائل کا خرچ دو گنے کو کراس کر چکا ہے۔“

”تو مت کرو خرچا۔ کس نے کہا ہے۔“ وہ بے نیازی۔

”عریشہ! میں نے اپنی بہن کو تمہارے متعلق بتایا ہے۔ اس کا نام فریحہ ہے۔ میں اسے تمہارے گھر بھیجوں؟“

”ہائے اللہ!“ وہ گھبرا گئی۔ ”لیکن تم نے اسے کیوں میرے متعلق بتایا؟ اور اور میرے گھر کیوں بھیجوں گے اسے؟

فراز میرے تین بھائی ہیں اور تینوں مل کر میرا گلا دبا دیں گے اگر کچھ ایسا ویسا ہوا تو۔۔۔ اور میری امی بہت سخت مزاج

ہیں۔“

”ہاں تو مجھے علم نہیں ہے کیا۔ ان ہی کو تو میں تمہارے ٹیلیفون کا دربان کہتا ہوں۔ وہ ”ہیلو“ کہتی ہیں تو میرے

کانوں میں خارش ہونے لگتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے ایئر ڈرائس ڈالنے پڑتے ہیں۔“

”بہت بد تمیز ہو تم۔“ وہ جھٹلائی۔ ”میری امی کے بارے میں ایسے کہہ رہے ہو؟“

”قسم لے لو۔ میں تو اپنی مستقبل کی باتیں کے متعلق گواہ افشانی کر رہا ہوں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”اور یار! تم تو

ایسے ڈر رہی ہو جیسے میری معصوم سی آنکھوں میں آتشوں کے جھپٹے چلی آ رہی ہوگی۔ ارے وہ تو تمہاری سہیلی بن کر

آئے گی تمہیں دیکھنے اور۔۔۔ تمہاری امی کو میرے متعلق کچھ کہنے نہیں آ رہی۔“

”لیکن ابھی نہیں پلینے۔“ اس نے منت کی۔

”اوکے بابا! جب تم کہو۔“ وہ مان گیا۔

”اچھا میں فون رکھتے ہوں۔“

”یہ مہربانی کیوں؟ ابھی میرے کارڈ میں چند روپے باقی ہیں۔ اس۔۔۔ ٹھنڈی ہے بھر کر کما۔

عریشہ کھکھلا کر ہنسی اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر وہ وہیں بیٹھی رہی مگر اس سے زیادہ اس کو کتنی دیر اس کی میٹھی میٹھی باتیں کانوں سے ابتر کر اس کے

دل میں گونج رہی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اس نام اور اس گواہ کی ویڈیو کی ہو گئی تھی۔ جس دن وہ محبت بھرا

لجے، شرارت بھرا انداز سنائی نہ دیتا وہ بے کل بے کل پھر اکر لی تھی۔

اس کی باتیں یاد آئیں تو اس کے من میں ایک خیال ابھرا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے سلیپر زپنے اور دوپٹہ

ٹھیک کرتے ہوئے فردوس بیگم کے کمرے تک چلی آئی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔

”امی جی!“ اس نے دھیرے سے پکارا۔

”ہوں!“ وہ کچھ غنودگی میں تھیں۔

”میں ناعمہ کے پاس جا رہی ہوں۔“

”ہوں!“

وہ جیکے سے باہر نکل آئی۔ بڑا سا صحن عبور کر کے وہ پھوپھی کے پورشن میں چلی آئی تھی۔ رابعہ بیگم برآمدے

میں بیٹھی لیوی دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم پیچھو۔ ناعمہ کیا کر رہی ہے؟“

”و علیکم السلام۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”ناعمہ شادی۔“

ان کے الفاظ لبوں میں ہی رہ گئے تھے۔ ناعمہ بچپن سے نکل کر چلی آئی۔

”آگے۔ چھپرے ستم اس نے لیا۔“ ضرور کوئی خبر سنانے آئی ہوگی۔“

”ناعمہ! رابعہ بیگم کے لیے میں ابھی بجلی تیار کر رہی تھی۔“

عرشہ کے چرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ جلدی سے ناعمہ کو کمرے میں کھینچ لائی۔

”کیا ہو گیا؟ یہ تم بچھو کے سامنے کیا کر رہی ہو؟“ وہ اپنے دل کے چور سے ڈر گئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ ناعمہ نے غصے سے بازو جھڑپایا۔ ”میں نے اسی کے سامنے ایسا کیا کہہ دیا؟“

”تم نے مجھے چھپا کر ستم کیوں کیا؟“

”دعوت ہو۔“

”کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟“ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

ناعمہ نے بولنا چاہا پھر اسے مان کا چرویا رہ گیا۔ جنھوں نے سختی سے کچھ نہ کہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ آنکھیں

مٹھا کر مرنے لگی۔

”بولو۔“ عرشہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں بولی تھیں چھپرے کوئی چاہ رہا تھا۔“ وہ بات بدل کر

عرشہ کی جان میں جان آئی۔ وہ تجالے کیا سمجھتی تھی۔

”اور یہ ستم کیوں رات کے دس بجے اٹھاؤ وغیرہ دوڑی۔“ عرشہ نے اس کا

جواز دینے ہوئے کہا۔

”مولی بیگم! عرشہ نے اس کے بازو میں چپکی بھری۔“ کی پکڑ کر نہیں۔ وہ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ

تمہارے پاس میں نور جہاں کی دو دلی غزل ہے۔ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔“

”تمہارا دل دھڑکنے لگا ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

”ہاں ہاں دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ اس کے آگے بڑھی۔ ”اس کو سمجھو کہ یہ سب دے دو۔“

”کس کی بات ہے؟ ناممکن کام ممکن ہوا۔ پہلے یہ بتاؤ۔“

”ناعمہ جاؤ! میں تمیں بولتی ہوں۔“ وہ ہنسا ہوئی۔ ”ہاں کی کھال اٹارتی ہوں۔“

”اچھا! اچھا! جی بول۔“ وہ احسان کرتے ہوئے بولی۔ ”وہی تمہاری مت سمجھنا کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اندر

اندر جو کچھ ہو رہی ہے نا۔ اس کی خبر نہ مجھے۔“

عرشہ جو کچھ کہتی ناعمہ کو سنا۔ ”میں نے بھی پھر پڑھا نا۔“

”تمہیں کس قسم سے ناعمہ کو سنا؟ کیا بتاؤ؟ کیا بات ہے؟“

”اور نہ۔“ اس نے ریک میں لگی۔ ”کیسٹوں میں سے مطلوبہ کیسٹ کھینچ کر نکالی اور اس کے حوالے کی۔“ ”جیسے

جانتے نہیں۔“ وہ طنز پر بولی۔

عرشہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ ”فحش ہے سر جھکاؤ اور جانے کے لیے مڑ گئی۔“

”مجھوں کی بیٹا تم سے۔“ وہ اس کے جانے کے بعد بیڑ ڈالی۔ ”ناعمہ علی خان ہے نام میرا۔ دل دھڑکنے کا

سبب یاد آیا۔“

حقیقت حیات بھی سترت سے بھر پور انداز میں مسکرائیں۔

”جیتے رہو! میرا دُعا غور ہو تم لوگ! بوڑھے لوگوں کو اور کیا چاہیے جتنا مان تم لوگ مجھے دیتے ہو میری عمر

بڑھا جاتا ہے۔“

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے! آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی اس گھر کے سب افراد

ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔“ فاروق حسن مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور اللہ نے چاہا تو آپ کے

بوڑھے ہوئے ان رشتوں سے بہا بھی اتفاق اور محبت برحق ہی رہے گی۔“

”بس بیٹا! میں نے اسی لیے تم لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہے کہ ایک ہی ہمارے سب کی رائے معلوم کر لی جائے۔“ ہال

کمرے میں حقیقت حیات فاروق حسن، فردوس بیگم، بلوچ حسن، عذرا بیگم، رابعہ بیگم اور ایقان موجود تھے۔ سبھی

کے چہروں پر مسکرائیں تھیں۔ ماحول بے حد خوش گوار تھا۔

”عرشہ سے بھی پوچھا ہے کس نے؟“ ایقان کو خیال آیا۔

”ہاں پوچھ لیا ہے۔“ فردوس بیگم نے انتہائی سے بولیں۔ ”ہماری بیٹیاں ہمارے سامنے نہیں بولتیں۔“

حقیقت حیات کے چہرے پر سایہ سار اُڑ گیا۔ ایقان ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ فردوس بیگم کی ایک جو کوئی موقع

ابتداء دینے لگی۔

”دُعاؤں کے سوا جانے کا طمینان کر کے پھت پڑی آئی تھیں۔“ جلیس واٹ کے بلب کے ملگج روشنی میں

ترانے نے حد بے حد بے وہ یکٹ کھولا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھی لیکن پوری احتیاط کے ساتھ رپہا رپہا

تھی۔ مراد کو اس نے سمجھ گیا۔ شاید اسے وہ رنگ بصر بھی عزیز تھا۔ رعبہ سوچ کر مسکرائی۔

”کھٹ کے کھٹ ایک عام کافور کی بیس سوٹ تھا جس کے مدھم مدھم رنگ رعبہ کو تھیک طرح سے

پنڈ کا خیال آ رہا تھا۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”دیکھا رعبہ تم نے! اسے کس طرح میری

”بول! رعبہ! مسکرا کر! کیا کہہ سکتی۔“

”بول! رعبہ! مسکرا کر! کیا کہہ سکتی۔“

”ملا اب! یہ نہ جانے کا۔“

رعبہ نے اشکات میں سر ملایا۔ وہ ترانہ کا چہرہ دیکھنے جا رہی تھی جس پر بکھرے ہوئے رنگ سوٹ سے زیادہ واضح

اور خوبصورت تھے اور جلیس واٹ کے بلب کی ملگج روشنی میں بھی بے حد صاف نظر آتے تھے۔ ترانہ کا پورا

دھیان سوٹ کی جانب تھا۔ وہ بار بار اسے کھنکھاتی لہجی طرح سے دیکھتی۔ کبھی قیاس کا پرنٹ دیکھنے لگتی تو کبھی

”بے شک۔“

”تھکایا راسوٹ ہے نارعبہ۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر بے حد اشتیاق لیے بھوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں! بس! کیسے کول! پارا ہے! پوٹو خوبصورت ہے۔“ رعبہ ہنسنے لگی تھی۔

ترانہ نے فحش سے اس کی جانب دیکھا۔

”ملاقات ڈاڑھی ہو؟ انا۔“ پھر اچانک سی وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

”اے رعبہ! ایک بات بتاؤ۔“ کسی لڑکے نے بھی نہیں گفت دیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”کسی نے محبت کا اظہار کیا؟“ وہ شرقی انداز میں پوچھ رہی تھی۔
 ریحہ کی نگاہوں کے سامنے سے کیے اور دیگر سے نکلنے کی خاطر گزر گئے۔ اس نے متفرق سے سر کو جھکا۔
 ”جیسے تیرا لہجہ ہزاروں سے اس لفظ محبت سے گراہیت آتی ہے جب کوئی مروٹا ہوں میں ہوس ناکی بھر کر
 عورت کو کہتا ہے۔ اور اس سے نفرتی جیسے پوچھنا شروع کرتا ہے۔“
 ”اسے بدعوا“ تیرا خواہو گئی تھی۔ ”کیا کو اس کیے جاری ہو؟ میں محبت کی بات کر رہی ہوں ریحہ! ہوس کی
 نہیں۔ تم محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟“

”جیسو نے اپنی محبت کو اپنی جان کا روگ بنالیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ جیسو نے محبت کی کروٹوں کا رنگ نفرت کے
 دھوس سے سیاہ کر دیا۔ بالکل سیاہ۔ چتا ہے ریحہ! آپ جیسو میں محبت بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادہ۔ لیکن سیاہ رنگ کی
 ہے۔“

”تم مجھ باتیں کرتی ہو ترانہ۔“ ریحہ بولی۔ ”مجھے تمہاری باتیں کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔“
 ”تم کی سمجھ میں ابس منع سے کر نہیں پھوٹنے کی دیر ہے؟“ اس نے معنی تیزی سے سر ہلایا۔
 ”مجھے نیند آ رہی ہے ترانہ۔“ اس نے جھپٹی۔
 ”چاہے ریحہ! مجھے آج ساری رات نیند نہیں آئے گی۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کی ہے۔ بہت زیادہ کی ہے۔ اپنی داری جان سے۔“ وہ آڑوہ ہو۔
 ”بس! اے نامع۔“ نکل رہی ہے نا کہیں سے تو انا کی لیے ہی ایک دوسرا منع سے۔ میں پھوٹیں گی۔ اور
 رچا کی کر نہیں۔ لیکن پھوٹیں کی ضرور ہے۔ وہ خوف لڑی۔ ”تو انا کی کے اندر محبت ہے۔ وہ تو انسان زندہ کیسے رہے؟“
 ریحہ مسکرائی۔
 ”تمہاری پھوٹیں جیتی ہیں؟“ وہ آڑوہ تفتش بولی۔ ”تم کو کبھی ہو! میں محبت کے نام سے نفرت ہے تو میر
 کس تو انا کی سے کی رہی ہیں بھلا؟“

ترانہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں اس کی نا سچی کے لیے ثابت تھا۔
 ”تم کیا سمجھتی ہو ریحہ! پھوٹوں کے اندر محبت نہیں ہے؟ انہوں نے کبھی کسی کو چاہا نہیں ہے؟ انہوں نے
 تمہارے ابو کو چاہا تھا۔ بے خود بے حساب۔ لیکن۔“
 ”لیکن کیا؟“ ریحہ نے جیسے ایک خواب کے عالم میں پوچھا تھا۔
 ”لیکن ریحہ! تو انا کی کو اگر کچھ طرح استعمال کرنا نہ آتا ہو تو نقصان پہنچاؤ۔“

لیکن وہ ٹھیک طرح سے اس کا مفہوم نہ جان سکیں۔ انہیں جلدی لگی۔ ”تو انا کی کو اگر کچھ نقصان پہنچاؤ۔“
 بجائے اس سے اپنے ہاتھ جلا لیے۔
 ریحہ کو اس کی گفتگو بے مقصد اور طویل معلوم ہونے لگی۔ لیکن ترانہ کسی اور ہی تصور میں کھو گئی تھی سواں
 نے ریحہ کی آکھاٹ محسوس نہ کی۔
 ”چاہے ریحہ! اگر عبدالباری تمہیں دیکھے اور تم سے متاثر ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟“

ریحہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔
 ”میں خوشی خوشی تمہیں اس کی دیکھنا ہوں۔“
 ”تیرا!“
 ”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انا کیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھوٹوں
 محبت کی جلدی سے اپنا دل جلا لیا۔ اب انہر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔
 بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے چہرے کی ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں بچہ

رکھتے ہیں۔ دو کا میں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چا کو دو کانوں کا کر لے لے کر اپنے کی زندگی داری سو نہ کر وہ دوسرے فکر معاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ہوا سیکڑ بھی بدوس ہونے کا حق محمود طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں وہ بوجہ کوئی خاص فرق سے اچھی ہے سو اب کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ بھی کہتا ہے کہ مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت کا ہے۔ نفیسہ خالد بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ منواریک خوب دیکھ رہی ہے کہ رواد کی سخی خرمائیں شہید بیاس کے عالم میں اس سے پانی ناکہ رہی ہیں۔ اسے رواد کی ٹرک میں دیگر کانڈرات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ وہ سیرہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس یا اس کی بچہ بچو ہیں اور ان کا ڈیرس پکا مگر وہ گھر میں نہیں ہو جاتی ہے۔ عرفان کی انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی باخوش ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شمشلا اپنی مالی معیذہ بیم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شمشلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کے اکثر اپنے بیٹے کے ہاتھ میں فروس بیم کا پرانا ہاتھ مار ڈاکٹر شمشلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ خطی آمادہ نہیں۔

ربیعہ اپنی شمال اور لوگوں کو بدلتے دیووں سے تنگ آ کر اپنی پیچھو پیچھے ملا ہو کر جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہیں میں رمیدہ کی ملاقات عمارت سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ جیسا کہ گری ہے ڈاکٹر شمشلا اس کا بچہ پوچھ کے گھر تک رہنمائی دے دے۔ رواد کے لیے لیتا ہے۔

عاشرا ایقان کا شوہر اپنے دفتر سے نکلا تو رواد گڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

تیسویں قسط

”کیا ہو گیا ہے ایقان تمہیں؟“ وہ جیسے اسے چکارتے ہوئے تھا۔ ”میری لینڈ لڈی ہیں۔ اکثر آتی ہیں۔ والہاں براہم پار؟“ ایقان خاموش ہو کر گھر کے کمرے میں بھرنے لگی۔ کیا بتائی اسے کہ چند گھنٹوں میں ہی وہ اپنی باتوں پر کیا کچھ بہت حد تھا۔ اس کی قیمت میں کئی دوسری عورت کے وجود سے احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی کئی باتیں اپنے بل بھر میں لفظوں کے سامنے سے نکلتی نظر نظر گئے تھے۔

اس کا ہاتھ کرنا اس کا سسرانا اس کا وہ گھر کی نگاہوں سے دیکھتا کہ وہ سمٹ کر رہ جاتی۔ زیر لب وہ شرر مسکرائیں۔ ”جین کی بچو اور اس کا من بھگوانی۔ وہ سب کچھ ایک دوسری عورت کے قریب تھا۔ ایقان تصور سے ہی جھلس کر رہ گئی تھی۔

”ایقان! جسے جانو۔ بولونا کچھ؟“ وہ پریشان ہو اٹھا۔

”عاشرا! اس کی آواز بھیگ گئی۔ ”میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا ہے۔ مجھے ہر وقت رونا آتا ہے۔ عاشرا۔“

وہ بچ بچہ نہ لگی تھی۔ عاشرا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اداس تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بول بول رہا تھا۔

”ایقان! ایک است ایسی یاد رکھنا۔ وہ تم؟“

”میں! ماں جان کی طرف ہوں۔ اس نے سسکی بھری۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”تھک ہے۔ ڈاکٹر نے رشت کے لیے کہا تھا اسی لیے یہاں آئی۔“ اس نے بیٹکی بیٹکی آواز میں بتایا۔

”بچے بچے کیسے ہیں؟ ایمان کیسی ہے؟ اور مومن؟“

”سب تھک ہیں۔ خیریت ہے۔“

”اور اس نے گھر کی سالی بھری۔ ”پھر میری جان، دو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا ہے گڈے؟“

ایقان یکدم چپ ہو گئی۔ برسوں بعد اس نے اس انداز سے پکارا تھا۔ ایقان کے لبوں پہ پل بھر میں مسکراہٹ کی جوت تھا۔ اچھی۔ وہ بہت محبت سے برس جانے کے موڈ میں اسے یوں پکارا کرتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی یاد کار تھیں۔

”مس گڈے! اور مس آؤ۔“ ایقان غصے میں بھی ہوتی تو نفیس پڑتی۔

اس وقت بھی کی ہوا تھا۔

”جیسے بار۔“ وہ ریکس ہوا۔ ”تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ بھلا اتنی دیر سے اس انداز میں پریشان کر دو تو کیا ہو گا۔ پہلی فرم میں ٹکٹ مل کر ڈاکٹر ڈاکٹر اٹھا کھلا گا۔ نو کر ہی جائے بھائیو میں۔“

”ڈاکٹر ڈاکٹر! کچھ ہے۔“ وہ شانت ہو گئی۔ ”میں روز نوئی پریشان کر دیں گی۔“

”بھڑے کا شور؟“

”تمہارے ہو؟ ایسے ہوتے ہیں بندے؟ اتنے سالوں سے میرے حوصلوں کو یوں آزما رہے ہو جیسے میری فوجی زندگی ہے؟“ اس نے ہندی کا شور مچا دیا۔ ”دن سے کچھ کرات کرتی ہوں اور رات کو کچھ کر دیں۔ کب ختم ہو گا؟“

”کب تک؟“ وہ نے زکھر نہیں ہے کیا؟ لوگ رہتے نہیں ہیں؟ کماٹے نہیں ہیں؟ جا کر بیٹھ گئے ہوتی ہو۔“

”جیسے کہ میں سے لیا۔“ وہ بچہ بڑی سے اترنے لگی تھی۔

”ایقان! تمہارے رشتوں کو کیا ہوں تمہاری خیر گیری کے لیے۔ یہاں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس میرے بچے تمہارے ہیں۔“

”تمہاری خود ساختہ۔“ وہ نے زکھر نہیں ہے کیا؟ لوگ رہتے نہیں ہیں؟ کماٹے نہیں ہیں؟ جا کر بیٹھ گئے ہوتی ہو۔“

”ایقان! تمہارے رشتوں کو کیا ہوں تمہاری خیر گیری کے لیے۔ یہاں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس میرے بچے تمہارے ہیں۔“

”ایقان! تمہارے رشتوں کو کیا ہوں تمہاری خیر گیری کے لیے۔ یہاں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس میرے بچے تمہارے ہیں۔“

”عاشرا! میری جان پر ہی ہے، تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“

”کیوں پریشان ہوئی ہو؟ جانو! آج اس انتظار تھا۔ وہ اس صبر بھر سارا وقت ہمارا ہو گا۔ سب خوشیاں ہماری ہوں گی۔ پریشان نہ ہو! تمہارے لیے اور بچوں کے لیے ہی کر رہا ہوں مناسب کچھ۔ میرے صدمے میں۔“

”تو مت ڈاکٹر ایقان!“

اس کی آواز میں مسکراہٹ در آئی تھی۔ ایقان خاموش ہو گئی۔

”موسیٰ! عاشرا! پھر وہ بولی۔ ”میں نے یوں ہی تمہیں پریشان کیا۔“

”میں نے کچھ پریشان نہ ہو گیا تھا۔ آئندہ اس طرح روئے ہوئے فون مست کرنا ایقان۔“

”اُن کے چہرے گدھے کی اولاد۔ کتوں کتوں کتوں۔ ناخلف مردان۔ کتوں کتوں کتوں۔ تو کھتا کیوں نہیں؟ تیرے دماغ میں اس بالی سے زیادہ گند بھرا ہوا ہے۔ کینز ہے تو۔“ منصور امین غصے کی شدت سے کہنے لگا۔

جاری ہے۔
 ”ہاں! کمینہ ہوں۔ ہوں میں کمینہ۔ میری زندگی تم نے تباہ کی ہے۔ تم۔“ وہ نفرت سے پتکارا۔
 ”دیکھیں! ایک بات یاد رکھنا جو سچی ہوں، تمہارا بیٹا ہوں۔ میں روم نکلا کروں گا۔“
 ”تو میری قبر کھودنا۔ میری قبر کھودنا اگر اس میں سے نکلے گی رقم سمجھا تو۔“
 ”کھودوں گا۔ قبر بھی کھودوں گا لیکن پتھر ڈالوں گا نہیں۔“
 رہیں گے قدم کن من، من بھر کے ہو گئے۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپے جا رہا تھا۔ ہاتھ تھر تھرا رہے تھے اور
 سانس دھوکتی بناوا تھا۔

وہ بڑی مشکوک سے اپنی چار پائی تک پہنچی تھی۔ رات کے تین بجے ہوئے زامی اس فتنے کو کے پس منظر سے
 ناواقف تھی، لیکن فریقین کے تورا اور انداز سے اس راں کر گئے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تنہا اسے شروع
 سے اسرار معلوم ہوا تھا۔ وہ کسی بدروح کی مانند لگتا تھا جو انسانی جسم میں طویل کر گئی ہو۔ اس وقت بھی اپنے
 پاس اس کا طرز خطاب نہایت جارحانہ تھا۔ یہ بستر پر تھیں اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک
 اٹھا۔ اس کا دل بھر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنا خواب بھول بھال کر اب اس واقعے پر غور کرنے لگی

چکن پک کر کھول کر اسے دیکھتے ہوئے وہ بار بار پانی مانگ رہے تھے۔
 مرید نے اس کو پانی پانے کی کڑج ہو گئی تھی اسی سبب سے اسے بار بار وہ لندی ہالٹی ٹوائٹ میں لے جا کر خالی
 کھانا کھا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا پیٹ بڑھ چکا تھا۔ وہ پوچھتا تھا کہ کیا اسے کھانا دیا جائے گا؟ لیکن
 ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پوچھتا تھا کہ کیا اسے کھانا دیا جائے گا؟ لیکن
 دے جاتے تھے۔

”ہاں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ تجھیں اپنی بوڑھی والدی یاد آ رہی ہے شاید۔۔۔ کیوں؟“

”میرے خاوش رہنے میں ہی عافیت جانی۔“

”ایلی بھگوڑی ماں۔۔۔ اماں۔۔۔ جس کی کیوں؟“

”کیا؟“ وہ نے اس کے ساتھ ساتھ کہا۔ ”ہاں، یہ سچ ہے۔“
 ”یہ ہے اسے چونک کر ان کی صورت دیکھی، جس پر طنز کیا چھایاں تھیں۔ وہ بے یقینی سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے کیا کہا ہے۔“
 ”کیا۔“ کیا آپ نے انہیں اس کے بعد سے پوچھا۔ ”میری اسی کے متعلق؟“
 ”ہاں؟“ اسی نے اس کے دھڑکنے والے دل میں کھلی ہوئی بات اس کی کہ اسی جان کو اس کو گھبراہٹ ہوئی۔

[illegible]

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اب فون بند کرتی ہوں۔“

”بس ایسے ہی؟“ وہ مسکرایا۔

”آئی لو یو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

“لو یو یو یار—”

ایقان کے ریسپورڈر لکھ دیا۔

دوسری جانب وہ گہری سوچ میں تھا۔ کارڈولیس کا الہینینا دانتوں میں دبائے نہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ لڑا اس کے

عاشق نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی بات کے مغموم پر چند لمحے غور کرنے کے بعد وہ مسکرا دیا تھا۔

پھر وہی دھند تھی وہی سراب کی کیفیت۔

ریحہ ننگے پاؤں گرم ریت پر دوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھتی تھا۔ خفافہانی۔ ریحہ دوڑتی جاتی تو اس کے سر پہ لاجپاتا۔

“یانی—یانی—یانی—”

ربیعہ دوڑتے دوڑتے تھک گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں میں ہلکتا نہ رہی تھی، وہ گرنا چاہتی تھی، تھمک کر ڈھیر جانا چاہتی تھی۔

”محبت نہیں کی کیسے؟“ اترانا نہیں کہہ چکا تھا۔
سوال اس کے چاروں طرف جکرا نے لگا تھا۔ لفظ نہیں رہے تھے۔
”محبت نہیں کی؟ نہیں کی؟“ اسے نہیں کہہ سکا۔

”کی ہے۔ بہت کی ہے۔“ ریحہ نے دوڑنا جاری رکھا۔ ”میں پانی لاتی ہوں، دادی جان! میں لاتی ہوں، میں“

PHOTO

ریجہ نے ایک جنگ لکھا اور سکت ہو گئی۔ بھٹی بھٹی آنکھوں سے وہ جنت کو گھومتی رہی۔ بچے کی گھر گھر
 بہت دور تک سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ گھر کا بیٹہ گئی۔

اس کے بار بار وہ چارپائی پر ترائے پر خبر سوری تھی۔ سہانے سینا کا ٹیلک تھا۔ مینا کے پلنگ کے برلی ٹرف پر پڑے ہوئے پر صولت تھی۔ رچیہ پوچھ کر دیکھ رہی تھی۔ سب کو پر سکون نیند کے مزے لوٹا ہوا دیکھتھی رہی۔ پھر دم دم دھچکے۔ اسے آواز سن آ رہی تھیں۔ ٹھٹھی ٹھٹھی آواز سن جن سے متعجب و مسحور ہوا تھا۔ وہ آواز کسی کی نہیں، گلوں کی تھیں گلوں کا رہتا تھا اسے اندازہ نہ ہوا۔ پھر اسے پیچھا کا خیال آیا۔ کہیں وہ پکا تو نہیں رہے؟ کیا نہیں کہہ دے؟ غور کر تو نہیں۔

یہ خیال آئے، ہی وہ چٹکی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اپنا دوبہ سنبھال کر وہ ترانہ کی علی اپنی کے قریب سے نکلتی چلی۔
 ٹی۔ جیمز کٹر نہایت قدموں سے وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی، مگر پھر اندر سے آئی ہوئی آواز پہچان کر وہ پٹاک
 ش میں بول گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ضدی لہجے میں بولتا یہ تمدن تھا۔ ”آپ کو رقم دینا پڑے گی۔“

وہ کچھ دیر تنگ کے پاس کھڑی رہی۔ باہر صحن میں مینا کے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کسی کام سے پڑوس میں گئی تھیں اور اب واپس آچکی تھیں۔
 ربیعہ نے بے وجہ ہی چوہا جلا لیا۔
 ”کیا کر رہی ہو؟“ انہوں نے اندر جھانکا۔

”چائے بنا رہی ہوں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”اچھا۔ ایک کپ سے زیادہ نہ بنے، پتی بہت مستکی ہے۔ بار بار چائے کا شوق کوئی اچھی لت نہیں۔“ وہ چیل گھسیٹے ہوئے باہر چل گئیں۔
 ”پچھپھو کے اندر سیاہ رنگ کی محبت ہے۔“ اسے ترانہ کے الفاظ یاد آئے تھے۔
 ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔ اب وہ ترانہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ یہ کہ ترانہ کے باپ کے اندر کس رنگ کی نفرت ہے؟ ربیعہ کے ذہن میں گہرا سبز رنگ آیا تھا۔



اسے غم زندگی، کچھ تو دے مشورہ
 میں کہاں جاؤں ہوتا نہیں فیصلہ۔
 اک طرف اس کا گھر، اک طرف مکتبہ
 مغنی کی آواز سناؤں، جھنکار کے ساتھ گونج رہی تھی۔
 ”یہ ہر وقت غم خیز لگتا ہے۔“ وہ پتہ چھوڑ کر بولی۔
 ”نہیں پسند نہیں؟ مجھے تو بہت پسند ہیں۔ مجھے یہ آج کل ہلکے بے سُرے باپ سگرز ایک آنکھ نہیں بھالتے،
 اس پر عجیب قسم کی تنگ بندی۔ کم از کم اسے شاعری تو ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ شاعروں کی ارواح دوبارہ اجتماعی خود کشی کر لیں اگر باپ سگرز کو سن لیں تو۔“
 عریشہ کو اس کی بات پر بے حد ہنسی آئی تھی۔
 ”ارواح اور اجتماعی خود کشی؟“
 ”ہاں! ارواح کے اجتماع کا کوئی بڑا طریقہ تو ہو گا۔“
 ”مجھے تو سب سگرز پسند ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”جو بھی نئی کیسٹ آئے میں شوق سے خریدتی ہوں۔“
 ”ارے بے حد بد ذوق ہو۔“

”تب ہی تو تم سے باتیں کرنے لگی ہوں۔“ وہ برجستہ بولی۔
 ”صرف باتوں سے کام نہیں چلے گا جناب بد ذوقی کا پورا پورا اثبوت دینا پڑے گا۔“ وہ مزے سے بولا۔
 ”یعنی؟“
 ”یعنی شادی بھی کرنا پڑے گی مجھ سے۔“
 عریشہ بے ساختہ شرما گئی۔ ”یہ تم یکا یک ٹریک کیوں بدل لیتے ہو؟ شادی یا ادوی کی باتیں مت کیا کرو۔“
 ”کیوں؟ شادی بھی نہ کروں تم سے؟“
 ”فراز پلینس۔“
 ”میں سیریس ہوں عریشہ! لو ان فریٹ سائٹ کا شکار ہوا ہوں۔ تم مجھے اسی دن بہت اچھی لگی تھیں۔ تمہارا انداز بالکل مختلف ہے۔“
 ”اس دن تو ہم تین تھیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”تم نے کیسے جان لیا کہ میں وہی ہوں؟“

”تمہاری آواز سے۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اور پھر اسے دنوں سے ہم باتیں کر رہے ہیں ایک دوسرے کو اپنی طرح سمجھ گئے ہیں۔“
 عریشہ پر افسردہ رہی تھی۔ اچانک ہی وہ جو گئی۔ بیٹھے کے دروازے سے باہر کھڑی شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دکھائی دے رہی تھیں۔

”اچھا۔ سنو، کل بات کریں گے۔“ اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔
 پھر دیا، پھر ایک سے اٹھ کر تیزی سے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔
 ”السلام علیکم دارا جان۔“ بچی جان۔“ اس نے جھکتے ہوئے سلام کیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام۔“ بیتی رہو۔“ دونوں اسے دیکھ کر جھل سی گئیں۔
 ”(ا) کیا کر رہی ہیں تمہاری؟“
 وہ صوفوں تک آگئیں۔

”یہ شاید اب وہ ہیں نہیں ملاتی بول۔“ وہ غصے سے گئی۔
 ”اچھا۔ سنو۔ رگوزرا۔“ شفیقہ حیات نے اسے پکارا۔
 ”اچھا۔“ بیتی بچن کر دیکھو، یہی ناپ ہے تمہارا؟“
 ”نگو بیتی؟“ اس نے دیکھی ہے اس کے ہاتھ میں ملی ٹھیکس ڈیو کیا کر رہی تھی۔
 ”اے! اب دروازہ کھولنا ہی دیکھ لے۔“ وہ فوراً ناپا کر بے حد خوش ہو کر روت پڑی۔
 ”اؤ۔“ کس قدر خوبصورت اور یونیک فٹم کا ڈیزائن ہے! لپٹ لٹکا ہے۔ کس کی انگوٹھی ہے یہ چچی جان؟“ وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔

”میری منگنی کی ہے۔“ شفیقہ حیات ہنس دیں۔ ”برسوں سے منت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے ایسے ہی کسی موقع کے لیے۔ اب میری پاتی پتے کی۔“
 ”کون سی پاتی؟“ وہ شوق سے نہی۔ ”میں بھی تو پاتی ہوں آپ کی یہ نظر کرم مجھ پر کیوں نہیں؟“
 ”اے ہاں تو کیا تمہارے خوشنوں کی بات ہے۔“ انہوں نے اسے کھجوراً۔ ”تمہاری منگنی کا سامان ہی کرتے ہیں۔ عذرا تو آئی انگوٹھی کا کہہ رہی تھیں مگر میں نے کہا۔ اتنی اچھی اور قیمتی چیز مگر میں منہ دے تو الگ سے کیا بیسے خرچ کرنا۔ وہی کسی اور مصروف میں آئے گا۔“
 عریشہ تک سمی سمی ہو کر رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزرتی تھیں۔
 ”ہم نے سوچا تمہاری رائے بھی معلوم کر لی جائے۔ آخر بچپن کے بھی وہ شوق ہوتے ہیں، لیکن تمہیں تو ہم سے زیادہ پسند آئی۔“ وہ ہنس۔ ”اب تم اسے جو اسے اور جوئی کا ناپ دو۔ ہمیں۔“ ثانیہ سمدرد دھڑکی آئی تھیں کہ ہم لاسٹے ہیں اپنی بھانجی کا ناپ۔ انہیں ڈانٹ کر بٹھایا کہ وہ بی بی ہانڈی کر دیکھیں۔ ہمیں تو قسم کی باتیں اور بھی پتا کرنا ہیں۔“

PHOTO

انہوں نے متلاشی نگاہوں سے اور حوا صد دیکھا۔
 ”آخر کیا تمہاری ساری س کوئی نہیں ہے؟“ تب ہی فردوس بیگم اسٹور سے برآمد ہوئی تھیں۔ عریشہ اپنا بے جان دو جوتے کھینچے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے کان سامنے سامنے کمرے تھے۔ کچھ بھائی بندے نہ رہے تھا۔
 بے دم کی ہو کر وہ ستر پر گر گئی۔ اس کے کانوں میں کسی کی شوخ ہنسی گونج رہی تھی۔ بے اختیار ہیکلوں پر ایک فکھوہ آن نکلتا تھا۔

بھی نہیں سوچتا ہوں۔ ایک سہانی صبح ایسی ہو کہ جب میں نیند سے جاگوں

تو بل بچو
 مری آنکھوں کے آگے نور کی دیوار بن جائے
 قدیم رکھوں زین پر تو کوئی کچھ کوٹا مانا ہو
 مری ہستی کے چاروں اور اک طرز بن جائے
 بدھ جھکاؤ کے جگنو مرے دامن سے لپٹے ہوں
 کسی کی مسکراہٹ ہی مری رفتار بن جائے
 صبح کے نور سے روشن نگاہیں مجھ سے گھبراہٹیں
 نظران سے لے تو دفعتاً ”شرما کے جھک جائیں
 گنہگار سے تو میں لہراتے آنکھوں میں سٹ جاؤں
 شایاں کے سر میں بیکری خوشبو سے لپٹ جاؤں
 لم آنکھوں میں رہا ہے نہ تار صغیر پر ابھری ہوئی تحریر کو دیکھتا رہا۔

بوسے کے کلمے سے سرزد ہوا تھا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کسی کیس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ موسم نہایت دلچسپ تھا۔ آسمان سیاہ گھاٹوں سے ڈھک گیا تھا اور وہ اوستی بھری جنگلی سے گزرتی تھی۔ اس کی اوستی سے کاشی پھولوں والی تیل کرے میں گھنسا جاتی تھی۔ تیل کی حرکت سے کاشی پائی کا ایک آدھ قد بچہ کاشی سے تپتا ہوا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں لکھا۔
 ”یارو رو۔“ بیتی بچت۔ ”نہیں کرتا۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا جملہ گونجا۔
 ”بندہ کیا کر رہا ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے ایک عجیب سی بے کلی کو جنم دیا تھا۔ اس کے اندر اس کے پرہیزگاروں کے ہر سانس میں وہ کاشی پھولوں والی تیل سے بہت سیالیاں پھواری صورت میں اندر پہنچ رہی تھیں۔
 ”اے خوشامیاد ہو۔“ اس کے کانوں میں کاشی پھولوں والی تیل سے بہت سیالیاں پھواری صورت میں اندر پہنچ رہی تھیں۔
 ”اے خوشامیاد ہو۔“ اس کے کانوں میں کاشی پھولوں والی تیل سے بہت سیالیاں پھواری صورت میں اندر پہنچ رہی تھیں۔

PHOTO
 اس نے اس سے کوئی کام نہ کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں گھما اور پھاڑا اور لٹا پٹا۔ ان خرافات کا وہ قائل نہ تھا۔ باہر بارش کی جھپٹا جیم میں تیزی آئی تھی۔ کاشی پھولوں والی تیل سے بہت سیالیاں پھواری صورت میں اندر پہنچ رہی تھیں۔
 جلدی سے وہ صفحہ قلم میں رکھ دیا اور پھر کھینچ کر بند کر دیا۔ آسمان پر سیاہیاں گہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ہواؤں کا شور بڑھنے لگا تھا۔ رافع کوئی بندہ نہ کر سکا۔ پاپا اسے بھگور رہا تھا۔ اس کی کھینچ کے کھلے ہوئے تھیں۔ بہت سیالیاں اس کے سینے کو بھگور گئیں۔ اس کے ہاتھ پر بکھرے ہوئے بال بھیک گئے۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوٹ پر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی چھٹی طرح بھیک جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رو رو کر اس کی حالت غیر ہو چلی تھی۔ آکھیں سونج کر آتھیں۔ ”بندہ ہی ہو گئی تھیں۔ وہ مشکل بیماری پھولوں کو اٹھاتی تھی۔ فردوس بیگم بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ ان سے اور کچھ نہ بن پڑا تو ماہرین کو بلا دیا۔ بیجا۔ وہ بھی خبر سن کر ڈوڑی بھاگی آئی اور اب اس پر پرہیز ہو رہی تھی۔
 ”آپ نے بھی ستر سو تیس صدی کی ماؤں کو مات کر دیا ای جی! ہم ان کو اس غریب کے کان میں بات تو ڈال دی

اپنے سوٹ کس میں رکھی ہوئی ہیں۔
 "سوٹ کس کو لاک رکھتی ہو؟" رائے بے کل ہوئی تھی۔

"ہاں بالکل چلی میرے پیٹ میں ہوتی ہے۔"
 "ٹھیک ہے۔ دیکھو ریجیڈ! میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتی لیکن ہمارا گھر اس معاملے میں کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ پیسے تو یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے انہیں راتوں رات پر لگ گئے ہوں اور خفیہ چور کا بھی علم نہیں ہوا تاکہ تم آج سب سامان حفاظت سے رکھو۔ میں جلد از جلد تمہارا اینٹ اکاؤنٹ کھلاؤں گی ہوں تمہیں اپنی رقم ٹیک میں رکھنی چاہیے۔"
 "ہوں۔" ریجیڈ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلایا۔

"اورسے! پیچھو کو اپنی رقم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ قدرے شرمساری سے بولی۔ "جو کچھ تم ہمارے لیے کر رہی ہو۔ وہی بہت ہے۔ مجھے بھیس بھیس لڑنا بھی پڑ جائے تو میں تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔"

"مڈم۔ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔"
 وہ ایک مریض کی کیس، سٹریٹور دیکھ رہی تھی جسے جیسا کہ کسی نے بتایا تھا۔ شہلا۔ "میں سٹریٹور اسٹاف کو تھوکتی اور ڈنگا ہوں لیکن ابھی کے باہر کی سمت چل پڑی۔
 ہاسپٹل کے لیے کوئی ڈور میں چلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس سے ملنے کی ضرورت کس کو پیش آئی اور وہ بھی ہاسپٹل میں۔

اپنے کمرے کے دروازے پر وہ رک گئی تھی۔ آئے والا دروازے کی جانب پشت کے کھڑا تھا۔ شہلا اور وائے پر ہی کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہی۔ اس کی چل بیل کی ایک جگہ پورے بارڈر میں کوئی بھی مریض ممکن نہ تھا کہ وہ اس کی آمد سے بے خبر ہو جائے۔

"ایک سیکیورٹی۔" وہ اندر چلی آئی۔ "آپ۔"
 وہ آہستگی سے مزاح شہلا پھری ہوئی۔ میروں جیٹن شرٹ اور فان وکر کی چھین میں وہ اڑا چلا تھا۔ شہلا کی آنکھیں آہستگی سے چلیں پھر ان میں پانی بھرے لگا۔ اس کے منہ میں ایک نظر سے لگا۔ وہ اس کی ایک تک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی نمی اور چہرے پر شرمساری تھی۔ شہلا چند قدم آگے بڑھی اور اس کے مقابل کھڑی ہوئی۔ ابراہام کی نظروں اس کے وجود پر چھلکیں۔

فیورڈی جیٹن ساڑھی اور سفید اور آبل پٹے، گھٹے میں اٹھتھو اسکو پانکائے بالوں کا سامنہ سا جو ڈانٹا ہے وہ آج سے پانچ برس پہلے کی شہلا سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

"بہت بدل گئی ہو۔" وہ آہستگی سے بولا۔
 "کیوں آئے ہو؟" اس کے لبوں سے سرکشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔
 ابراہام کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ انگلی سے سینہ کی سطح کی گئیں بنائے لگا۔
 "جاؤ یہاں سے ابراہام۔ پلیز۔" شہلا نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔
 "شہلا میں تمہیں خود پر قابو رکھ سکے۔ میں بس ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا تمہیں عمر تمہاری باتیں کرتا ہے مجھ سے صرف تمہاری ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں نے میرے سن میں خلش کی پیننگاری کو لاؤ میں بدل والا

جے میں نہیں تم سے معافی مانگتے آیا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شہلا۔"
 شہلا کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ گر کر اس کے اوپر گل میں جذب ہو گیا۔

"اب سب کچھ بچہ اور وقت اور بچہ اور زمانہ تیار ہے ابراہام! میرا مذاق مت بناؤ دنیا کے سامنے۔ اب ان باتوں کی بھی محتاج نہیں رہی زندگی میں۔ جاؤ یہاں سے اور بھی دیر دمت آنا۔ پلیز۔"
 ابراہام نے ایک نگاہ میں اس کے سیاہ بالوں کو اس کی پتیلی آنکھوں کو اور شدت غم سے سرخ پڑے چہرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہی سمجھتی ہو تم۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ انجینی ایک دو سرے سے مل سکتے ہیں لیکن ہم تو نہ شہلا سے نہ انجینی۔ چلا دوں۔"
 وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا تھا۔ شہلا کو بوسے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ سر تھام کر میز پر جھک گئی۔ ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے تھے۔



"ایسا ایسا کمانا ایسے ختم نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اسے ایک فل انشاپ دینا ہو گا۔" انڈر پشٹانی نے کہنے لگی۔
 شہلا دوں باپ کو دیکھ کر دیکھ کر بالکل بے بسی کے عالم میں بیٹھی تھی اس کے ذہن نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بس کے سامنے اپنی بائیکا کرنے کا سوچا تھا۔ اس نے اپنی سب پریشانی اس کے سامنے رکھ دی تھی اور اب خالی دماغ لیے بت بنی بیٹھی تھی۔

"جیسا کہ اس نے اپنا کیا ہے اور آپ جانتی ہیں وہ دل مارنے کا عادی نہیں ہے۔ جو سن میں آئے مگر گزرتا ہے۔ بس اس میں کچھ اور ہی سودا سایا ہوا لگتا ہے۔"
 "میں بس اس کے پیچھے چاہتی ہوں انقیدہ۔" وہ گلو کیر لہجے میں بولی۔ "میں کسی اور شہر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر پر گھر کی شہلا۔" اس سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ بس یہی ہے میرے بس میں۔ عمر نہ ہو تاؤ شاید میں مرنے کی بجائے کسی اور جگہ کی زندگی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی میں۔"

"ایسا۔" انقیدہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ "ایسا! ایک بات کہوں آپ سے؟" شہلا چپ چاپ بے بس رہی۔
 "انقیدہ! تم میری سے شادی کر لیں۔"

"انقیدہ! شہلا جانتی تھی۔" کوئی ڈھنگ کی بات ہے جو کرو۔"
 "ایسا! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے وہ ایک مخلص انسان ہے۔ اس کا ہاتھ تمام کر زندگی کی ہر انجمن کو سمجھا لیں۔ پھر انجینی کی کوئی پرچہ میں کالی کی طرح آپ کا رستہ نہیں کاٹے گی۔ ایک جی ٹیڈی جی راہ چل پڑیں ایسا۔ یہی ہر مسئلہ کا حل ہے۔"

"میں انقیدہ۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری زندگی میں اب کسی مرے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں سب سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ میں عمر کے ساتھ لاہور چلی جاؤں گی۔ میں کبھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گی۔ میں عمر کے ساتھ یہاں سے دور رستہ دور چلی جاؤں گی۔ ضرورت پڑی تو یہ ملک بھی چھوڑ دوں گی۔"
 "میں حل ہے آپ کے مسائل کا۔" انقیدہ نے دھکیلے اسے اسے دیکھا۔
 "شہلا۔" وہ بڑبڑائی۔ "یقیناً۔"

ربیعہ چونک اٹھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں تصور کھڑا تھا۔
 وہ تو نجانے کب سے وہاں کھڑا تھا۔ اپنے کام میں مگن ربیعہ نے بے خیالی میں ہی نگاہیں ادھر اٹھائی تھیں۔
 ”تصور بھائی۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”وہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں آپ!“
 وہ مسکرانے لگا۔ اس کی نظروں میں پیغام تھا۔ ربیعہ کی چھٹی جس بیدار ہو گئی۔ اس کے ابو تن گئے۔ وہ چولے
 کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی میں چلی آئی۔
 ”تصور بھائی۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

”ہول۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔

”آپ کو کچھ کام ہے یہاں؟“

”کام؟ نہیں تو۔“ وہ مسکرایا۔

ربیعہ نے کھڑکی زور سے بند کر دی۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ پھر سے چولے کے پاس آئی لیکن اسے یاد نہ
 آیا وہ ہانڈی میں کیا ڈالنا چاہتی تھی۔
 ”ربیعہ۔“ دروازے سے آواز آئی۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابو دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ گویا گوند سے چپکی ہوئی تھی۔
 آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اب معدوم ہو چکی تھی۔

ربیعہ جنور لے کر نکلتی رہی۔
 ”آپ کچھ لیتے کیوں نہیں۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”کیا کام ہے آپ کو یہاں۔“
 ”مجھے چائے بناؤ۔“ وہ کچھ جھینپ گیا۔

”اچھا“ بنا دیتی ہوں۔“ اس کے ابو ہنوز تنے ہوئے تھے۔ ”کیا کیا آپ چائے بننے تک بیٹھیں کھڑے رہیں
 گے؟“

وہ شرمندہ سا وہاں سے ہٹ گیا۔ ربیعہ نے ہانڈی کے نیچے سونے کی کڑی اور چائے کی پانی دو سرے چولے پر رکھ
 دیا۔ اس کا ذہن بٹ گیا تھا ورنہ وہ بے حد لگن سے سالن بنا رہی تھی۔ سوچوں میں گم رہے۔ ایسے اس نے چائے
 بنائی تھی۔

”تصور بھائی!“ پکن سے نکل کر اس نے آواز لگائی تھی۔ ”چائے لے لیں۔“
 جواب نہ دارو تھا۔ ربیعہ نے کیے بعد دیگرے تینوں کمروں میں جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں
 تھامے ہوئے وہ حیران پریشان سی برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔
 پھر اسے خیال آیا کہ وہ یقیناً چھت پر چلا گیا ہوگا۔ نجانے کیوں وہ گھر کے افرو سے چھپتا پھرنا تھا۔ وہ پیالی لے کر
 صحن میں نکلی۔

”تصور بھائی۔“ اس نے پھر آواز لگائی۔ ”یہ چائے لے جائیں۔“
 مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ربیعہ کا جی چاہا، چائے کسی کیاری میں گراوے اور جا کر اپنا سالن پکانے لگے۔ پھر خود پر جبر
 کر کے وہ بیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اپنی بیٹنگوں کے پاس بیٹھا تھا۔ ان میں سوراخ کر کے دھاگا پور ہا تھا۔
 ”یہ کیسے اپنی چائے۔“ ربیعہ نے چائے اس کے قریب رکھ دی۔
 ”سنو ربیعہ۔“ اس نے آواز دی تھی۔

”اچھی بات ہے، بہت اچھی بات ہے۔ شریف لوگوں! اب باپ کی عزت کا خیال رکھنے والے دنیاوی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ گھر میں سادہ رہ کر گزند کو بھانجیوں کی طرح سختی میں لیکن بے شادی ایک بالکل علیحدہ قسم کا بندھن ہے۔ لایا بندھن جو بندھنوں میں دلائلیوں کو ایسا ثابتا سنا دیتا ہے کہ ساری زندگی کے لیے اعظام اور اعتبار کا تحفظ میسر آتا ہے۔ سوچتے بیٹا جب وہ اچھی ایک دوسرے کے متعلق بالکل نئے انداز سے سوچتے ہیں تو آخر اس رشتے میں کوئی ایسا ہی چھوٹی بات ہوتی ہوگی۔ انسان کی سوجوں کو ایک بالکل نیا سرغل جانا ہوگا۔ اچھی نافع کے حوالے سے آپ کے خیالات ایسے ہیں تو قابلِ تندر ہیں۔ لیکن یہ بات کاتین کر کہیں کہ بعد میں آپ کے ذہن میں کوئی گروائی نہ رہے گی۔ ایسا ہی محسوس کریں گی جیسا ایک شریکِ حیات کے لیے کرنا چاہیے۔ بچوں کو بہت سی باتیں اپنے والدین پر چھوڑنا چاہئیں۔ وہ نقل اور تجربے میں اولاد بہت آگے ہوئے ہیں۔ بہت آگے آگے کا سوچتے ہیں۔ ہم آپ کا گھر سے گزر چکے ہیں۔ سمجھ کے ہیں کہ آپ کے کہا احاسات و جذبات ہوں گے آپ

خات طیش کے عالم میں وہ ان کے قریب آکر بیٹھی تھیں۔
فارق حسن سوئے کے ارادے سے چٹھا آٹا رہی رہے تھے۔ مگر ان کے تئیں بھانپ کر دو رکہ گئے۔ بغور انہوں نے اپنی بھاری بھر کم بٹیک کے بگڑے بگڑے انداز زندگی اور گہری سانس بھری۔
”ہاتھم کے پاس سے آ رہی ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف سے بے حد سچ نشاندہ باندھا تھا۔
”میں اس جس کے پاس پہلے چاہا اس کی اپنی ہی کہانی ہے۔ آوی کس کس کو پورا پڑے۔ اے ہاں، اپنی تو عمر بیت جی سب کی ملو پیڑ کر کے کرتے۔“
”کس نے کیا کہہ دیا؟“ وہ سونا چاہتے تھے اور کس قسم کی مدد کی کہ داستان سننے کے قلعہ ”مومنین“ نہ تھے۔
”نبیاء رانی سے پوچھو جنہیں ہری ہری سوجہ دی ہے۔ سنے سنے شوشے نکال رہے ہیں اس گھر میں تو۔“
فارق حسن اپنی اولاد سے تمہی نمٹوس کے رہتی ہوں۔“

ہماری عمر کو نہیں چھینیں، آپ نگاہ کی اس نگرانی کو نہیں جان سکتیں۔ آپ کے ہاں یاب نے آپ کے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو عمر کا کچھ حصہ گزار کر ہو گا اور ضرور ہو گا۔“
انہوں نے غمخیز کرکے کاچھو دیکھا۔ فردوس بیگم ان کی گفتگو سے خوش ہو کر بات میں سر ملانے جا رہی تھیں۔ لیکن عرشہ کے آثار کی سختی ہمزبور قرار تھی۔ وہ مارے باندھے بیٹھی تھی جیسے اس کا پس چلا تو اٹھ کر کرے سے بھاگ جاتی۔

”اور ایک آخری بات۔“ اب ان کے لیے جس فخر اور خوشی اور آئی۔

عرشہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زبان دے چکا ہوں میں جانتا ہوں بیٹا اگر آپ کی ماں نے آپ سے پوچھے بغیر ”ہاں“ اگر آپ کے ساتھ زبان دے لی ہے لیکن اب جو ہو گیا ہو گیا ہے۔ کوئی بات ہی بات بھی نہیں ہے جس کے لیے پورے خاندان میں رجسٹر کی ایک ہی گرد ڈال دی جائے۔ آپ کے دل کو اگر نہیں پہنچی ہے تو آپ کا یاب آپ کے سامنے کھڑا مذہرت خواہ ہے۔“

”یاب!۔“ اس کے لب کاٹے۔

”لیکن اب آپ کو اپنے یاب کا بیان رکھنا ہو گا۔“ انہوں نے اس کی طرف جھکے ہوئے سر ملانے کا ہتھ رکھ دیا۔ عرشہ نے اپنے سر پر ایک بے حد گراں اور قیمتی شے محسوس کی۔ اس کی آنکھیں پھلکیں اور دل ہر خوشی سے خالی اور دست بردار ہو گیا۔

”مائی گاؤ۔“ ہاشم کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی۔ اس آنکھوں میں حیرت تھا۔ چہرے پر خوشی کی الوہی سی چمک تھی۔

”بہت اچھے بیٹھے۔“ اس نے کانٹہ لیرایا۔

”راغ حنیب کرم فرما۔“

”لیکن یہ ”لو شیدہ ہستی“ ہے کون؟“

”چائیں۔“ اس نے سر جھکا۔ ”میں نے تو یہی خواب میں بھی نہیں دیکھا کہ کسی کی“

”بھیرے سب کچھ کس فرشتے نے لکھوا یا تم؟“ یہی کوئی تو عمر کا ایک دن میں تھا۔

”تحریک تو مجھے تمہارے عشق سے ملی ہے۔“ وہ قلم کو انگلیوں میں بھانسنے لگا۔ ”یہی بات ہے۔“

”گویا اوجھار کے جذبات ہیں؟ پھر تو یہ نظم مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنے نام سے پیش کرنا چاہیے۔ یار

راغ!۔“ دست بھرے انداز میں بولا۔

”راغ نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔“

”یاب! چند ایک نظمیں ایسی اور لکھ دو مجھے۔ میں شغفہ ہو گیا ہوں۔“

”اے!۔“ راغ نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرے جذبات کو دھڑکنے سے اوجھار کا کہہ کر مذاق اڑانا ہے اور مجھ سے

میری ہی نظمیں مانگ رہا ہے۔ اوجھار ہے یا بد۔“

”بھئی۔ میرے جذبات ہیں نا پس منہم میں۔“

”الفاظ تو میرے ہیں۔“

”مجھ پر تو میری ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”تم تو یہ نظم کسی کے نام بھی نہیں کر سکتے۔“

”ارے واپس۔“ مجھوہ کے محبوب، ”وہ تھکا۔“ ”میں بیٹاؤں کا لیکن یہ چیخندگی نہیں کر دوں گا۔ مجھوہ تمہارے پاس ہے۔ جذبات تمہارے پاس ہیں۔ نظمیں بھی لکھ لو۔“ الفاظ کسی فرد واحد کی ملکیت تو نہیں ہوتے۔“ ”غفلت کے شاعر صاحب! ایک نظم کیا نام کی تم تو طوطا بن گئے۔“ اس نے سر ملایا۔ ”ہم کبھی کسی روٹی کی دکان پر ایک آدھ غنجد ضائع کر کے کوئی شہر بارہ ڈسٹریکٹس لیں گے۔ کسی مرحوم شاعر کی عقیق میں نہ کرنا پس کی۔“

راغ نے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اور مزو آجائے جب ڈاکٹر صاحب کی کسی ڈانری میں پہلے سے وہ شہر بارہ محفوظ ہوا۔“

ہاشم بھی ہاس تصور سے لطف اندوز ہو کر ہنس پڑا۔

”یار!۔“ ”راغ حنیب!۔“ ”بہو! کیا؟“

”کبھی تک تو ہی اور دلال دونوں جہاں خاموش ہیں۔“ اس نے آہ بھری۔ ”دیکھو گویا سی جلتی ہے۔“

”تم نے ہجرات نہیں کی؟ کیا فوراً حصر بھی انتظار کی کیفیت ہو کہ دوبارہ انتشار ہو تو جواب دیا جائے۔“

ہاشم درے سوچ میں پڑ گیا۔

”میں نے تو معاملہ پیچھے ڈھکیا۔“ وہ بولا۔ ”انتشار تو اب ان ہی کو زیب دیتا ہے۔“

”دوسری بار۔“ راغ بولا۔ ”تمہارے کہنے کی بات اور ہے۔ صنف نازک کے نازک احساسات کو تقویت ملتی ہے۔ غفلت تو کی کو حال کر تادیکہ کر دیں میں شگوفے پھیلنے میں تو لیوں پر۔“ ”ہاں۔“ ”آتی ہے۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

”یار!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“ ”راغ!۔“

محبت اور شادی کی جو محبت کے رستے کی معمولی تکلیف نہ سہہ پائی بھلا زندگی کی دشوار گزار راہوں میں وہ ہاتھ بٹام کر کہاں تک چل سکے گی۔ میں غصے میں تھا میرا ذہن کام نہ کر رہا تھا۔ سب اچھی سوچیں تم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”بہر حال! شہلا نے آنسو پونچھے اور خود پر قابو پایا۔ ”محبت کے تناور درخت کو ہم نے خود مل کر کاٹ دیا اس کی بکری ہوئی شاخوں۔ یہ اپنے سے کیا حاصل ابرا! اب ان شاخوں پر نہ پھل ہیں نہ پھول۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اور تم جس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں شہلا! وہ دوسری جانب تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ احساس مجھے جینے نہیں دے رہا ہے۔ میں ماضی میں چل رہا ہوں شہلا۔“

”ابرا! ابرا! تم مجھے کیوں نہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا! اس کی جڑیں بہت اندر تک پیوست ہیں۔“

”ابرا! وہ اس کا مطلب سمجھ کر سکتے ہیں رہ گئی۔ ”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہم پھل جاتے ہیں شہلا!“

”فار گاڈ سیک! اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انہوں میں نکلا تھا۔ ”تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“

”اس لیے کہ دنیا میں ایسا بنتا ہے۔“ اب اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”پتھر چکا تھا۔“

”ہوتا ہو گا۔“ وہ بے رخی سے بولی۔ ”میری زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”شہلا! وہ الجا جنت سے بولا۔ ”صرف۔ صرف عمر کے بارے میں سوچو، موت سوچو میرے بارے میں موت سوچو اپنے بارے میں اس بچے کا سوچو، جو میرے لیے تھا، اور انہوں کے درمیان جینا چاہتا ہے۔ ذرا سا

کٹ اٹھا لینے سے اگر روٹھی خوشیاں پھر سے مل سکتی ہوں تو میں اٹھا لینا چاہتا ہوں۔“

”تم مجھے مرنے کے لیے کہہ دو ابرا!“ اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں محاولں گی۔“

”میں ہمیشہ تم سے پیار کرتی رہی ہوں شہلا۔“

اس کے لہجے میں بے تحاشا چ تھا۔ شہلا پتھری ہو گئی۔

”شہلا! وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا ایک دوست ہے وہ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سب

کچھ تیار ہے شہلا! بس تمہاری ایک ”ہاں“ چاہیے۔“

شہلا نے فون بند کر دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔



”پھوپھو۔ پھوپھا جان بلار ہے ہیں۔“ نافع نے کمرے میں جھانک کر شرارت سے کہا۔
آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں گجرے ٹانگی ایتقان کا ہاتھ کانپا اور دل عجب انداز میں دھڑکا۔ وہ بے تابی سے

مڑی۔

”نافع!“

”جی ہاں۔ مگر فون پر!“ اس نے دانت نکالے۔ ”میں وہاں دو لہا بن رہا ہوں پھوپھا مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔“

”بد تمیز کیس کا۔“ اس کو ہنسی اور غصہ ایک ساتھ آئے۔ ”لے کر دل دھڑکا دیا میرا“ میں سمجھی۔“ وہ سر

جھٹکتی پروا تے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے ریسپونڈ کیا۔

”مبارک ہو، شیخہ بیٹی کی منگنی۔“

”خیر مبارک!“ وہ تازے ہوئے۔

”منہ تو تھکا کر اؤ۔۔۔“ دوسرے شرارت ہوئی۔

”گندھی خچہ ماروں؟“

”ہائے کرے ستم ظریف!“ اس نے غصہ کیا۔ ”کس کی صحبت میں رہ رہی ہو جان من! اتنا اتنی ظالم تو نہ تھیں۔“

”بے پروا میں کوئی قصاص تو آکر نہیں بس گیا؟“

”تو کس کی صحبت میں ہیں؟“ وہ جواباً بولی۔ ”بہت خوش مزاج ہو تے جا رہے ہیں۔“

عاشق گدگد خاموش ہوا۔

”اچھا یہ بتاؤ کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں تم؟“ پھر وہ خوش دلی سے گویا ہوا۔

”اپنے دل سے پوچھو۔۔۔ پوچھ کر دکھاؤ۔“ وہ ہنسی۔

”اچھا!“ اس نے گویا بھر گھوسا۔ ”سنہری سنہری سی لگتی ہو۔“

ایقان کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے سامنے سے ہونے آئینے میں اس کا عکس دیکھا اور اپنے گولڈن کرپڑے دیکھے۔

”بہت بے ایمان ہو عاشق تم۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

دوسری جانب اس نے قہقہہ لگایا۔

”کڑی لکھنا۔ اچھا یہ بتاؤ میرے بچے کیسے ہیں؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس!“ اس کا مڑبڑہت خوشگوار ہو گیا۔

”صوب کو سلام کہنا۔ دولہا پر بس کو مبارک مبار۔“

”اوکے سر!“

”اپنا خیال رکھا کرو۔“

”ہوں!“ وہ ہنسی۔

”خدا حافظ۔۔۔ لوبو!“ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایقان بہت دیر تک ریسپونڈ لے کر بیٹھی رہی۔

”پہچھو۔۔۔“ نافع کمرے میں جتنا تک کہ منمنایا۔ ”مجھے یہاں تیار ہونا ہے۔“

”اوہ۔“ وہ اپنے خیالوں سے چوکی۔ ”ہاں! ہاں! آجیاد نافع! میں نے بات کر لی ہے۔ تمہارے ”پھوچھا“ بہت

بہت مبارک بادوں سے رہے تھے۔“

”مجھے نیک پو۔۔۔ ویسے مجھے مبارک بادوں سے کچھ تھے۔ وہ۔“ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”اچھا!“ وہ ہنسی۔ ”اور کہا کہ رے تھے؟“

”پوچھ رہے تھے تمہاری پیچھوئے کون سے کلر کاڈریس پہنا ہے۔ میں نے بتایا گولڈن کلر کا۔“

”اے۔۔۔“ ایقان کا منہ کھٹکا کھٹکا رہ گیا۔ ”بے ایمان۔“

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔



PHOTO

آنسو جھرجھر کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ جھٹکا جا رہا تھا۔

”میرا ایک دوست ہے۔۔۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے۔۔۔“

”آج قربانی میری کاہنے ہو۔ اور نام اپنے دوست کا لیتے ہو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”یہ نہیں

سوچا کہ مجھ پر کیا بیٹے گی۔ جو خوش رنگ پہنے دکھارے ہو! ان تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے تلووں کو لبو لبان کرنا

ہوگا اور اسی آئینے کے منہ پر ہانگ بھر کر مجھ پر احسان کرو گے۔ ابراہیم جی! ان تم مرد لوگ عورت کو محض ایک حقیر

مخلوق سمجھتے ہیں۔۔۔ تو کتنا محض اس وقت تک کشش رکھتا ہے جب تک دوسرے سے دور ہو۔“

اس کے تپ۔۔۔ رکھا کاڈریس پر پہننے لگا تھا۔ شملہ ارشاد ہو اٹھی۔

”کیا جانتا ہے یہ شخص۔۔۔ یہ مجھے سکون نہ پہننے دے گا نہ مرے دے گا۔“

اس نے فون اٹھ لیا۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہاں تم عرض کر رہا ہوں!“ سلیجے ہوئے شائستہ انداز میں کہا گیا تھا۔

شملہ دھماکا کرت ہوئی۔

”اے۔۔۔ آپ مجھ سے کھانا ہو گی ہیں کیا؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگا۔

”نہیں۔۔۔“ اس کا ذہن حاضری تھا۔

”پہچھو۔۔۔ میں؟“ پیچھو بھی آپ کی منتظر ہیں۔۔۔ اوس میں بھی۔“

”ہاں تم! وہ کچھ وقف سے بولی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ورنہ میں ضرور آتی۔ پلیز آپ اتنا نہ کہجے گا۔“

اور اپنے۔۔۔ یہ ای شورو معذرت کر لے کر میری طرف سے۔“

”آپ۔۔۔“ اس نے راسخا سمجھا نہیں لگا ورنہ آپ ضرور آتیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ

نہیں جانتیں۔۔۔“

”فاس! کاش کہتے جاؤ۔۔۔“ وہ اب دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سب لوگ رستہ میں بیٹھ گئے۔

عرشہ کو نافع کے برابر لا رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے حد تک پہنچ کر بیٹھی تھی۔ معمولی سی مکان کی جھلک تک لیوں

میں جوں جوں۔۔۔ سرکارا تھا۔۔۔ دوست احباب کے چٹکوں کا جواب دے رہا تھا۔

غنیقہ حیات دو انگوٹھیاں سنبھالتی دولہا و لہسن کے پاس آئیں۔۔۔ دونوں جانب سے انگوٹھیاں انہیں ہی پرستانی

تھیں۔

”بسم اللہ کہتے اہاں جان! فاروق۔۔۔“

”ہاں! نافع!“ ایقان اور باہین دولہا و لہسن کے منہ کی پشت پر کھڑے سب کارروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ سب

کے سب پہننے نرس تھیں۔

”نفسا! ہونٹ کی نگاہیں اٹھی تھیں۔ خوشبو کے ایک۔۔۔ مانوس جھوٹے نے اسے چوڑا کر دیا تھا۔“

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

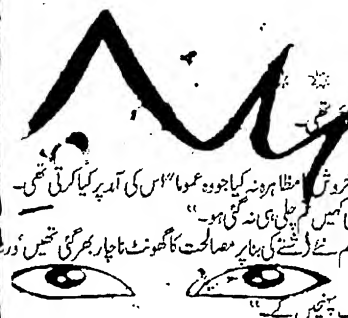
۔۔۔

38

ہوئی۔ اس غبار کو جسم سے نکال بیٹھنا روح نکال دینے کے مترادف لگتا ہے۔ جذباتوں کے الاؤ میں شدت کی چیز ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اس کھٹی میں تپ کر ایسی مغیوب صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں توڑو نہ ٹالو کی رگوں کو ٹک دینے جیسا لگتا ہے۔
وہ ایسی ہی اذیت میں مبتلا تھی۔ جسم سے روح نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔
فون اپوس دونا مرادو بو کر خاموش ہو چکا تھا۔ عریضہ کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ اٹھ کر مہتر جاگری اور نکتے میں منہ چپا کر روئے تھی۔

بیٹھ کر سایہ چل میں جا بیٹھ۔
م بہت روئے دہ جب یاد آیا۔

”جب یہ اشعر آتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“
”میں کیا جانوں اپنے آنسوؤں سے پوچھو؟“
”آنسو کتنے ہیں دل سے پوچھو۔“
”عریضہ کے دل سے آنسو گر رہے تھے۔“



”السلام علیکم، بھائی کھلی ہی ایتقان اندر داخل ہو گئی تھی۔“
”و علیکم السلام“ فردوس تبسم خشکی سے بولیں۔
”کیسی ہیں پیچھو؟“ ”ہاں نے بھی اس خوش و خوش مظاہرہ نہ کیا جو وہ عموماً اس کی آدھر کیا کرتی تھی۔“
”فرسٹ کلاس“ تم کیسی ہو۔ میں دوسری کلاس میں پہلے ہی نہ گئی ہو۔“
”تمہارا کات کو تسلیم میاں کا فون“ ”فردوس تبسم نے ہنسنے کی بنا پر مصالحت کا گھونٹ ناچار بھر گئی تھیں اور وہ اتنی جلدی کی کہ اس کی خطا میں نہ بخشی تھیں۔“
”مکتے تھے تیار رہنا“ لینے آؤں گا۔ دیکھو رات تک بیچیں گے۔“
”کچھ دن اور رہ جائیں۔“ ایتقان محبت سے بولی۔
”اے اس کے سر لائی بڑے کمزور ہیں۔“ فردوس تبسم ہر بات کا جواب بذات خود دینا ضروری خیال کرتی تھیں۔
”و چار دن کو چھوڑ دیا وہی ان کی مسمانی ہے۔“
”ہفتہ بھر تو ہو گیا ہے ای“ ”ہاں بولی۔“ ”اب مہینہ تو رہنے سے رہی۔ سن کی کسی شادی ہوئی تو باہر دو مہری کی۔ اسباب ہر بھائی کی کہیں بات ٹھہرے تو دیکھیں۔“
”ان کی تو ٹھہری ہی پیچھو۔“ ”فردوس تبسم نے چلے بیٹھے انداز میں کہہ کر کن اکھیں سے ایتقان کو دیکھا۔
”اس دن تیار رہنا نہ دیکھی تھیں۔ یہاں کی ماٹو مخمل ٹوٹے آئی تھی۔“
ایتقان قدر سے ہنسنے ہوئی۔ بھانجے کے تیور پہلے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ اس نے بولے سے کھنکھارا گا صاف کیا۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ ”انہوں نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔“
”جی۔ اب اچھی ہے۔“ ”اس کا بازو اب بڑھ رہا تھا۔ بات شروع کرنے کا سراپا تھوڑا آ رہا تھا۔“
”تمہاری سہیل تو لگتا ہے جی جان سے تیار بیٹھی ہے، دوسری مرتبہ دہن بیٹے کو۔ کیوں؟“ ”انہوں نے زہر لے جانے میں بات کا آغاز کر کے گویا اس کی مشکل بھی آسان کی تھی۔“

ایتقان خود را بخیر لای پھر قدر سے سنبھل کر گویا ہوئی۔
”بھابھی جان! تو بے خبری کی باتیں کر رہے ہو۔ بد خاموشی سے“ ”سہرے جو خرام تھی۔ اسے تو بار بار چونکا گیا ہے۔“
”سہرے بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب بھی اس کے انداز میں خوشی کم اور مجبوری زیادہ ہے۔ آپ بھی عورت ہیں۔“
”جی ہاں، ایک مجبور اور دیکھی عورت کا درد دیکھنے کی کوشش کریں۔ کم از کم لفظوں کے استعمال میں تو کچھ احتیاط کرتیں۔ اسے دوسری مرتبہ دہن کے روپ میں دیکھنے کے لیے آپ کا صاف جزا نہ ہی بے قرار ہے“ اس نے تو ایسی کسی بات پر توجہ نہ کیا۔ ایتقان نے ہنسنے کی۔
”فردوس تبسم بھنا آتیں، تمہارا بھائی کچھ سنبھل ہی گئی۔“
”میں غلط کہہ رہی ہوں یا نہیں؟“ ایتقان نے تائیدی انداز میں ماہن کو دیکھا۔

ماہن جزبزی ہوئی۔
”نہی تو اب بھی غلط نہیں ہیں پیچھو! اس کا کہہ ہی کھوٹا ہو تو دوسرے سے کیا شکوہ کرنا۔“
”اے بے رحم میں خاک سوچ کچھ کر لو۔ میرا بچہ کیوں کھوٹا ہونے لگا۔ بے چارہ بھولا ہے، کم عمری میں ہی بچس گیا اچھا جادو گر کی لائیں میں۔“

”میں میرا مطلب یہ نہیں تھا ای“ ”ماہن نے جاری ماں اور پیچھو کے درمیان فٹل ناک کی طرح پچھن کر گئی۔“
”میں نے کتنے کتنے تہذیبی تھکے شہلا آئی کی طلب، ہمارے بھائی کے دل میں جب اس قدر شدید ہے تو ہم شخص میں کیا کر سکتے۔ وہ تو نے سنیں حق بجانب ہوں گی کہ سمجھنا ہے تو اسے بھائی کو سمجھالو۔“
”اے ماں! تمہارے سمجھنا میں نے جب ان کا جادو سہرے نہ کر لے گا تو۔“ ”فہرہ بڑا نہیں۔“
”دونوں کا جادو بھائی جان؟“ ”ایتقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر بولی۔“ ”اس کو راضی کرنے کے لیے کا شمشاد نے اور کئی اور کوششیں کی ہیں۔“ ”وہ تو کسی صورت راضی نہ تھی۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”اپنی قیمت بدھوا لی ہیں۔“ ”وہاں سے اٹھ گئیں۔“ ”بہر حال ہم تو مجبور ہیں۔“
”ہم کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”اے ہمارے کوششیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“

”ایتقان نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“

”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“
”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“ ”میں نے کتنے کتنے کوششیں کی ہیں۔“

”بس تو تیار رہنا شام کو اوھر چلتے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔

ایقان کا روم روم مسکرا رہا تھا۔ اس کے تصور میں ہاشم کا چمکتا ہوا چہرہ تھا جس کی پر خلوص تمنا کا جھنڈا محبت کے قلعے پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔



وہ پانی کا کولر بھر کر کمرے میں لائی۔ فل سائز کا کولر پانی سے بھرا ہوا، اونے کے باعث بے حد وزنی ہو رہا تھا۔ ربیعہ نے اسے ہشتکائی تمام اٹھا کر میز پر رکھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بار بار یہ بھاری کولر کیجن سے کمرے تک لانا دن بھر کا مشکل ترین کام تھا۔

”پانی پلاؤ لڑکی۔“ منور امین بولے تھے۔

ربیعہ زچ ہوئی۔ پانی پانی کی تکرار سے وہ عاجز ہو چلی تھی۔ ان کے اندر نجانے کون سا توردن رات وہ کا کر تھا۔ کس احساس کی پیش ان کے جسم و جان کو جلایا کرتی تھی۔ وہ کون سی جھلکتی ہوئی سوچ تھی جو ان کے تعاقب میں لگی رہتی تھی ربیعہ سمجھ نہ پاتی۔

وہ بس نگاہیں بھر بھر کر انہیں دیتی رہتی کولر لمحہ بہ لمحہ خالی ہوتا چلا جاتا۔ گندی پانی لٹخہ بہ لٹخہ بھرتی جاتی۔ ربیعہ کمرے کے چکر لگا لگا کر تھک جاتی تھی پانی پانی کی تکرار ختم نہ ہوتی تھی ان آنکھوں کی سرخی کم نہ ہوتی لہجے کی گرمی باوجود برقی ٹیبلٹوں کے پیش برقرار رہتی تھی۔

ربیعہ نے نگاہیں بھر کر ان کے رویہ کر لیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ایک سانس میں اسے خالی کیا۔ ”نشا باش۔“

پھر وہ بولے۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“



ربیعہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ اس کے تپنے ہوئے احساس میں اسے گویا ایک گرہ کھلی۔ اتنی سخت مشقت کے بعد بھی وہ ان کے سامنے سے کسی سخت فقرے کی منتظر رہتی تھی۔ وہ بل میں قلم میں پین میں ماشہ تھپان صفت مزاج کے حامل۔ ان کی منظر پر طبیعت ربیعہ کو ہر وقت سبے چین رکھتی تھی۔ گڑھوں میں نیزی سے حرکت کرتی پتلیاں، لبوں کے پھڑکتے ہوئے گوشے اور ہمہ وقت تپنے ہوئے نتھنے ان کے اندر ایک تے لاوے کا پتا دیتے تھے۔ ربیعہ کو کبھی کبھی دھواں اگلنے اس آتش فشاں سے سخت خوف محسوس ہوتا تھا۔ کب وہ کون سا روپ اختیار کریں، کوئی گارنٹی نہ تھی۔

”آپ کے لیے چائے بنا لاؤں پیچھا جی؟“ ربیعہ کو ایک تعریفی جملہ سرشار کر گیا تھا۔ ترسی ہوئی مٹی بارش کی چند لونڈوں سے ہی ممک دے اٹھتی تھی۔

”میرے بہانے تم پینا چاہتی ہو تو بنا لو۔“ وہ بے نیازی سے بولے۔ ”میںنا کہتی ہے تم چیزوں کا بے دریغ استعمال کرتی ہو۔“

ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ باؤل کسی دوسری طرف جانٹکے تھے۔

”جی مجھے تو طلب نہیں۔“ وہ آسٹگی سے بولی۔

”ہا۔۔۔۔۔۔“ وہ نجانے کیوں خوش ہوئے۔ ”بہت چالاک ہو تم، اپنی وادی کی طرح۔ سازشیں کرنا تمہیں خوب آتا ہے۔۔۔۔۔۔“

ربیعہ ہکا بکا ہوئی۔ اس نے بھلا کوئی سازش کی تھی۔ وہ تو اس قدر مجبور تھی کہ وہاں سے نکل بھاگنے کے بھی کوئی سازش نہ سوچ سکتی تھی۔ نکل بھاگنے کا نہ کوئی ذریعہ، نہ خانیہ، نہ سرا کوئی تھا۔ نہ وہ ایسی پرکھ چڑھا تھی کہ اس کے لیے بھرنے کے سلاخیں دستیاب نہ کر سکتی تھیں۔

”اے ربیعہ! ترانہ کی آواز پر وہ چو گی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے ثبات اور خوف تھی۔“

”ادھر آنا زرا۔“

ربیعہ سب کچھ بھول بھال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ترانہ کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔

”پتلا چھت پر چلیں۔“ ترانہ بولی پھر اسے خیال آیا۔ ”بچھو کہاں ہیں؟“

”مارکٹ گئی ہیں تصور بھائی کے ساتھ۔“

”میدان صاف ہے گویا۔ اور صولت؟“

”تمہاری ہے۔“

”آجاؤ پھر۔“ وہ جوش بھرے انداز میں بولی۔

ربیعہ بھی تجسس کی اس کے پیچھے پیچھے بیڑیاں چڑھ گئی۔

”میں تمہارے لیے ایک چیز لائی ہوں۔“ اس نے خانی لٹافانہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ربیعہ نے لٹافانہ

کھول کر دیکھا۔ اس میں یونیورسٹی کا پراسپیکٹس اور فائونڈیشن

”ہاں۔“ بے حد خوشی کے عالم میں اس کے لبوں سے نکلا۔

”شام کی کلاسز کے لیے جو سیمیٹکس۔“ پس ”ان میں سے جو کچھ کر کوئی سلیکٹ کر لو پھر میں تمہارا فائونڈیشن

کروا دوں گی۔“

”اور پیچھت۔“

”اوہو۔۔۔ پہلے داخلہ تو ہو لینے دو! بات بعد میں دیکھی جائے گی۔“ پچھت نے ایک مرتبہ معزکہ ٹوکر پارے کا

اس میں ابھی رہے۔“

ربیعہ خوش خوشی پر اس پراسپیکٹس دیکھنے لگی دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو اُڑنے لگے۔ ترانہ دلچسپی سے اس

چہرہ دیکھنے لگی۔

”جینکس یو ترانہ! وہ ممنون تھے میں بولی۔“

”جینکس فارورڈ! جو کچھ تمہارا ہے لے کر آتی ہو ربیعہ! اس کے شکرے کے اظہار کی یہ انتہائی

صورت ہے بلکہ اس نے شکرے کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ یہ سب کچھ تو تمہارا اپنا حق ہے گورو جو پچھت ہمارے

تم کرتی ہو وہ تمہارا احسان۔“

ربیعہ خوش دل سے مسکرائی۔

”احسان کیسا ترانہ! اپنی جائے تیار کا خیال تو ہر کوئی رکھتا ہے۔ تم یہ ہر وقت احسان احسان کی راگنی مت

کرو۔ اچھا اب جائے پلاؤ میں تم تک گئی ہوں۔“

”ہوں۔“ ترانہ خوشی سے مسکرائی۔ ”آج تو ہرگز جائے نہ پلاؤں گی۔ آج تو چاہیے بیوں گی تمہاری اس بے

خوشی کی قیمت تو وصول کروں گی۔“

ربیعہ اچانک ہی زور سے چوکی۔ یہ بیڑیوں پر تیلے والوں کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

”صولت نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔“ وہ تنبیہ دہ کر بولی۔

ترانہ نے سر اُٹھایا اور کچھ سوچنے لگی۔

”وہ ابھی ابھی گئی ہے۔“ ربیعہ فکر مند ہو رہی تھی۔ ”میں نے خود کہا ہے۔“

”ہوں۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری سوچتی ہو گی! میں ہی چاہے نہ لالہ۔ یہ دونوں تو راضی نہیں ہیں۔“

ربیعہ کو زور سے ہنسی آئی۔

”تمہیں کسی بات سے ڈر نہیں لگتا ترانہ؟“

”یہ کہ میری شادی بادی سے نہ ہو سکے۔“ ترانہ نے خوشی سے اس کے گال پر چٹکی بھری۔ ”اور تو ایسی کوئی

بات نہیں جس سے میں ڈروں۔“

ربیعہ نے رشک سے اسے دیکھا۔



میںا کے انداز حد درجہ خشک تھے۔ ربیعہ اپنی جگہ پر چوری رہی ہوئی تھی۔ صبح سے وہ انہیں کی بار مخاطب کر کے

دیکھ چکی تھی لیکن وہ اپنی خشک مزاجی پر ہنوز مصر تھیں۔

ربیعہ کان سے اور ان کی ناراضی سے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

”وہاں سے تو کچھ نہیں بچھتا کریں۔“

”دیکھتے ہیں تو کتنا معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھٹی۔“

”میں نے کیا کیا ہے آئی؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

بات بچھری ہوئی کی

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

انتظار کرتی ہوئی کی

”کون سی چیزیں؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

”جی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری بار اس کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھ پکائی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر



PHOTO

”دوڑاؤ؟“

”جی ہاں، تھکوں کے ڈیراؤں۔ ترانہ نے اپنا سوت ملنے کو دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اگر صولت نے دیکھ لیا تو یہ ساری ڈیراؤں کو خاں کی خد کرے گی، اسی لیے وہ مجھے چھپ کر لکھا رہی تھی۔“

”یہاں سے کچھ دیر تک نظروں سے اس کا چہرہ ٹولا۔ ربیعہ نے جلدی سے اپنی نظر اس جھکا کر دانتوں سے نچلا کر لیا تھا۔ وہ اس کے اثرات نہ جان پائیں۔“

”اچھا! مجھے وہ ڈیراؤں کا کھنڈ پرا کر دو۔“ پھر وہ بولیں۔ ”میں صولت کو اس سے پہلے وہ ڈیراؤں سلوا کر گی۔ وہ سمجھتی کیا ہے۔ چارپے زیادہ کمالیتی ہے تو ہم سے بہت اونچی ہو گئی ہے۔ ہم اس کے جیسے گہرے نہیں

کے کیا؟“

وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک کالی اٹھالائیں۔

”اور دیکھو لو! بڑا ذرا وہ ہوساری مت دکھانا۔ بالکل ویسا ہی ڈیراؤں بناؤ، رتی برابر فرق نہ ملے، ورنہ مجھ سے کوئی نہ ہوگا اور ترانہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے میں کل ہی صولت کو اپنا سوت سلوا کر دیا۔“

ربیعہ نے بے حد مشافی سے ایک خوبصورت گھنے کا ڈیراؤں کالی کے صفحے پر انار دیا۔ ”خوش ہو گئیں۔“

نے اسے کئی مرتبہ بتایا تھا کہ صولت دو سڑیوں کی پرشے کی حرکت پر غور کرے۔ خواہ وہ پیر میں بھی چلی جائے گی۔ ترانہ اس کی اس عادت سے حد درجہ بیزار تھی اور اس طرح اسے گہروں کے کپے اور ڈیراؤں اس وقت چھپائے رکھتی تھی جب تک بہن نہ نکلتی۔

ربیعہ کے ذہن کی کسی گوشے میں بڑی ہوئی بات کھولنے کے کی مانند خوش قسمتی سے چل گئی تھی۔



”ارے کیسی... ناشتہ ہی کروادے۔ میں گھنٹہ بھر سے بیٹھ کر اس کیے جا رہی ہوں۔ ایک تکیہ باغ ٹھیک طرح سے جواب نہیں دیتی ہو پھر چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔“

ناععہ ٹانہ کیے لے کر توجہ محسوس کر کے سبک اٹھی تھی۔ ”مفتی! پڑھ سکیں کرنے کے لیے وہ عالم اشرف میں صبح اٹھ کر کھانا کھائے بیٹھے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ٹانہ کیوں میں مصروف تھی سو وہ بھی بڑے اسلوا

پہنچ کر اس صبح شروع کر چکی تھی لیکن اب اسے خیال آیا تھا کہ اس کے پاس تو کچھ اور بھی ہے۔

نئی روٹ اس سے اس کی کسی قسم کی خاطر مدارت کرنا بھی ضروری نہیں لگتا تھا۔

کاؤنٹر پر لگاؤ سڑ پیر کی ٹانہ چوکی۔

”اچھا! تم ناشتہ بھی کر کے نہیں آئیں۔“ وہ عام سے انداز میں بولی۔ ”غصہ نہیں بناتی ہوں چائے۔“

”تم بھی تو اکثر تغیر ناشتے کے آ جاتی ہو۔“ ناععہ اس کی بات سے مزید خفا ہو گئی۔ ”مہم بھی تو تمہیں پوچھتے ہیں۔“

ٹانہ کو ہنسی آ گئی۔

”ارے بھئی! تو کہہ رہا ہوتا تھا میں پہلے ہی کروا دیتی ناشتہ تمہیں۔ اتنی دیر سے خواہش تھی میں ہی وہاں بیٹھی اور اطلاع عرض ہے مختصر۔ اگر میں جب بھی ناشتہ کیے تمہارے ہاں آتی ہوں تو اس بات کا خیال ہمیشہ وردہ کرتی ہیں۔ تمہیں بھی یقین نہ ہوئی۔“

”تمہیں تو کرنا ہی ہے خیال۔“ اس نے دیدے سے دھکائے۔ ”ویسے تمہاری عدم توجہی مجھے بہت کھل رہی ہے۔ چاہتا ہے تمہاری گدڑی پر ایک مگالگوں اور گھر چلی جائوں۔“

وہ پھر بیٹھے ہوئے چائے کا پانی رکھنے لگی تھی۔

”میری گدڑی پر ہی یہ کرم نوازی کیوں بھیجی؟“

”یہ کیا خیالی نظارہ کر رہے ہوئے گدڑی ہی اڑتی ہے نا، اس لیے۔“

”میں نے کیا یہ نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ سو وہ پٹے کے پلو سے اچھوٹے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”بہ رنگ باتیں، وہ بھی غائب دماغی سے۔ جواب یوں دے رہی ہو جیسے کوئی احسان کر رہی ہو۔“ باغی کاغذی خفا ہو چکی

ٹانہ قدرے شدید ہوئی۔

”ناععہ! تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، میرے شر کے متعلق؟“

”کیا؟“ وہ چوکی۔ اچانک ہی گفتگو میں دلچسپی دور آئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے وہ اس نے تعلق سے ناخوش ہے۔“ ٹانہ نے کہا۔ ”یہ لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ٹانہ نے

”ہاں۔“ اٹھا۔ ”کہے؟“ ناععہ نے اپنا سر اس کے قریب کیا۔ ”یہ لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ٹانہ نے

”سچو اور۔“ ٹانہ نے اپنی شاش شاش سن کر اس میں بیٹھا ڈالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تجسس سے سوال! الفاظ کے بعد یہ تائید کا کیا قصہ؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”میرا۔“ ٹانہ نے یہ اندازہ کیے لگایا تو میں نے لگا۔ ”وہ کھسائی ہو کر بولی۔

”اس لیے کہ میرے پاس بھی ویسی ہی آنکھیں ہیں جیسی تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری ذرا گول ہیں، میری لمبی۔“ وہ جل کر دیا ہوئی۔

”گول ہوں! لمبی! آٹھ گول تو ہیں۔ شکر ہے خدا کا۔“ وہ قدرے برا مان کر بولی۔ ”دیکھتے ہیں ہم۔“

”جائے۔“ کا رویہ نہ تھا۔ ٹانہ نے چائے چھان کر کپ اس کے سامنے رکھا اور نوٹ میں سلاسل ڈالنے کی۔

”میں نے کیا کیا؟“ ٹانہ نے چائے پر فراٹنگ ہیں رکھ کر فریج سے اٹھوٹا لے لگی۔

”اس کی آنکھیں رونا کیوں لگیں؟“ ٹانہ نے اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تنک نہ جاگی۔

”اندازہ جلدی نہ کرے گی چائے کھائی ہو رہی ہے۔“

”بڑھتی ہے کھانے کا کپے۔“ ہاں دیکھ رہی ہو میں مسلسل اسے کہہ رہی تھی کہ یہ منشی کے دن تو

”کیا بات؟“

”میں نے کیا یہ نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ سو وہ پٹے کے پلو سے اچھوٹے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”بہ رنگ باتیں، وہ بھی غائب دماغی سے۔ جواب یوں دے رہی ہو جیسے کوئی احسان کر رہی ہو۔“ باغی کاغذی خفا ہو چکی

ٹانہ قدرے شدید ہوئی۔

”ناععہ! تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، میرے شر کے متعلق؟“

”کیا؟“ وہ چوکی۔ اچانک ہی گفتگو میں دلچسپی دور آئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے وہ اس نے تعلق سے ناخوش ہے۔“ ٹانہ نے کہا۔ ”یہ لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ٹانہ نے

”ہاں۔“ اٹھا۔ ”کہے؟“ ناععہ نے اپنا سر اس کے قریب کیا۔ ”یہ لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ٹانہ نے

”سچو اور۔“ ٹانہ نے اپنی شاش شاش سن کر اس میں بیٹھا ڈالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تجسس سے سوال! الفاظ کے بعد یہ تائید کا کیا قصہ؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”میرا۔“ ٹانہ نے یہ اندازہ کیے لگایا تو میں نے لگا۔ ”وہ کھسائی ہو کر بولی۔

”اس لیے کہ میرے پاس بھی ویسی ہی آنکھیں ہیں جیسی تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری ذرا گول ہیں، میری لمبی۔“ وہ جل کر دیا ہوئی۔

”گول ہوں! لمبی! آٹھ گول تو ہیں۔ شکر ہے خدا کا۔“ وہ قدرے برا مان کر بولی۔ ”دیکھتے ہیں ہم۔“

”جائے۔“ کا رویہ نہ تھا۔ ٹانہ نے چائے چھان کر کپ اس کے سامنے رکھا اور نوٹ میں سلاسل ڈالنے کی۔

”میں نے کیا کیا؟“ ٹانہ نے چائے پر فراٹنگ ہیں رکھ کر فریج سے اٹھوٹا لے لگی۔

”اس کی آنکھیں رونا کیوں لگیں؟“ ٹانہ نے اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تنک نہ جاگی۔

”اندازہ جلدی نہ کرے گی چائے کھائی ہو رہی ہے۔“

”بڑھتی ہے کھانے کا کپے۔“ ہاں دیکھ رہی ہو میں مسلسل اسے کہہ رہی تھی کہ یہ منشی کے دن تو

”کیا بات؟“

”میں نے کیا یہ نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ سو وہ پٹے کے پلو سے اچھوٹے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”یقین نہیں آتا۔“ اس نے کتاب بند کر کے ہاشم سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے فیضی سر ہلایا۔

”مجھے خود نہیں آتا۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”یاد رہا ہاشم! عاشق تو کر رہا ہے اور خوشبو مجھ سے پھوٹنے لگی ہے۔ یہ

ایسا چرا ہے؟“

ہاشم خالی انداز میں اسے ستار رہا۔ رافع اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ کاسنی

چھوڑوں سے لدی ہوئی تیل باس کے سامنے جھوٹے لگی۔

”میں تیرے عشق کے جذبے سے متاثر ہو گیا۔ یہ سچ ہے ہاشم! مجھے تیرے رشتے آنے لگا۔ تیری آنکھوں سے

پھیرتی ہوئی حنائیں، روشنی مجھے سسزاؤ کرنے لگی۔“ تھکے لیکن۔ لیکن یہ سب کیا ہے؟ ہمیں یہ سب کچھ

یہے لگتے ہیں؟ ایک۔ ایک ان جالی خوشبو ہے ہاشم! جو مجھے کچھ نہیں ہے۔ میرا ہاتھ تمام کراس میں کام ہوتی ہے۔

میرے دل کی گریں کھلے گئی ہیں۔ مجھ میں جذبے پیدار ہونے لگتے ہیں۔ میں ان جذبات کو نہیں پہچانتا۔ میں

نے اب سے پختہ نہیں سمجھ سکتا۔ میں محسوس نہیں کیا۔ بس لگا ہے خوشبو خوشبو ہے۔ میرے تیرے اندر۔ میرے ہاں۔

ان جذبات میں محسوس خوشبو کا نام ہے سکا۔ وہ ان سے میری بس اتنی ہی شناسائی ہے جتنی کسی انجانی مگر محسوس

کرتی ہوئی خوشبو سے ہو سکتی ہے۔ یہ خوشبو مجھے مغلوب کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لکھتا چلا

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان جالی ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان جالی ہے۔“

”کیا ہے شک؟“ اس نے ڈر سے پوچھا۔ ”میرا جی چاہتا ہے، میں ان احساسات کو کھینچ کر خود

عالم کے اندر سے اس طرح سے سوچتا ہوں جیسا کہ چاہتا ہوں۔“

”تیرے اندر سے اس طرح سے سوچتا ہوں جیسا کہ چاہتا ہوں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

”میں ان جالی ہے۔“

پھر اس کا چل ہوا منہ رکا دیا اسے گھورنے لگی۔

”کیا مطلب؟ میں انتہائی نہیں سوچ سکتی۔ تم آخر کتنے کتابے وقف کر دیتی ہو؟“

”بہت ضرورت بات کسی تم نے؟“ ثانیہ ہنوز سوچ میں تھی۔ ”میں ہوا ہے۔ لڑکیاں منگتے ہیں کہ نام پر کوئی

چاہتی ہیں جسے کسی نے پہلے نہ دیکھا ہو جو ایسا ہو کہ بس پھر بس ہی اسی کو دیکھیں۔ وہ وہ وہ۔“ لڑکے کی میٹھا

قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ لڑکی کی قسمت پر سالوں رشک کیا جائے۔ میرا معصوم سا بھائی ابھی اپنی عمر کے حساب

سیدھا سا اس لیے۔“

”مجھ سے مخزن۔“ ثانیہ نے فوراً کھڑا کیا۔

”میں نے پھر اسے بری طرح گھورا۔“

”میں کچھ دے ماروں کی تمہارے سر پر۔“ اس کا تعلق جواب دے گیا۔ ”کیوں؟“ وہ نے لگا میرا بھائی مخزن؟

”میں تو سب ہی لڑکے کرتے ہیں اس طرح۔“

”اچھا۔“ ثانیہ نے کام بھرا کر دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا۔ ”فرض کرو تمہاری نیت علی سے

کر دی جائے۔“

”کیا؟“ وہ بھڑکی۔ ”یہ کیا فضول بات کی تم نے؟“

”اگر ایسا ہو جائے تو کیا ہے خوش ہوئی تم؟“

”تم کرو تا اس جو کرے۔“ میرا نام کیوں لے رہی ہو۔“

”ناعمہ نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔“

”دوسروں کے بھائی جو کر رہے ہیں اور تمہارا بہت دینا ہے اور شانت کیوں؟ اسے کوئی مسخو نہیں کہہ سکتا۔“

”تو سب کے تو ہیں سارے۔“

”دیکھیں علی؟“ ثانیہ کو تصور سے ہی الجھن ہوئی۔ ”نہیں۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“ ثانیہ نے کہہ دی۔

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

”تب ہی وہ بے چاری رو رہی تھی۔“

PHOTO

”میری چادر گرے۔“ بن میرا ہر خواب بے رنگ ہے شرم

میری ہر نگاہ بے سمت ہے۔ میرا ہر شام کا ہر ایک رنگ ہاں چلا ہوا تڑپے شک سنگ

یہاں رہ گئے ترے مختصر یہ اجاڑ اجاڑ سے بچم و در

مرے ہر زخم کا علاج تو مری ہر خوشی میں شریک تو

تو ہی رہی تو ہی راستہ تو ہی رہی تو ہی رہی ہم سفر

جو نہیں ہے تو تو تیری قسم یہاں کوئی دل سے نہیں مرا

میری ہم قدم میرے ساتھ آکر کہ ویران ہے مری رہ گزر

ہاشم پریشانی سے صفحے پر ابھری تحریر دیکھتا رہا پھر اس نے نگاہوں میں حیران اور الجھن پھر کراس کی سمت دیکھا

”یاد رافع! یہ تو نے لکھی ہے؟“

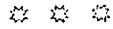
”نہیں۔“ ہاشم نے سر ہلایا۔ ”میں نے لکھی ہے۔“

”نہیں۔“ ہاشم نے سر ہلایا۔ ”میں نے لکھی ہے۔“

”نہیں۔“ ہاشم نے سر ہلایا۔ ”میں نے لکھی ہے۔“

دیکھ پا کر کہہ لے جو یقین نہ ہو تو۔۔۔
 "ہاں ڈونٹ ٹیل می۔" وہ استغناء سے دیا "میں بندر مارنا چاہتا ہوں۔ میں عافیت چاہتا ہوں۔"
 "میرے پیارے! اٹھام گزے سے پیر پھیلنا کر بیٹھ گیا۔" مرزا غالب بڑے کام کی باتیں جاتے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
 روافض کچھ سوچنے لگا تھا۔ اور ہاشم کے لبوں پر مسکان تھی۔



وہ دروازے کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ایسا اس نے دانستہ کیا تھا کیونکہ وہ ترانہ کے لئے ہونے پر انہیں
 کا مطالعہ کر رہی تھی۔ سو وہ نہیں جانتی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے کسی بھی فرد کی نگاہ اس پر
 وہ بے حد دلچسپی اور جستجو سے صفحات پلٹ رہی تھی۔ جب اسے اپنی پشت پر لیا گیا تو اس نے
 ہوئی۔ ربیعہ نے جستجو پر ایکسٹریکٹ کیے کے لئے سر کا دایا۔ نتیجے میں ایک گہرے سرمئی رنگ کی نظر
 صفحات پلٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے متعلق قیاس کر رہی تھی۔ کچھ دیر گزر کر
 والے نے اپنی آنکھ شاید خفیہ رکھنا چاہا تھا۔ ربیعہ کو اس کی آنکھوں میں سے جھپٹ کر دیکھا تو تصور بننے لگا۔
 "تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں آیا ہوں۔ لیکن تمہیں یہ بھی نہیں ہے نا۔"
 ربیعہ کو کوفت بھری آنکھوں نے آئینہ اس گھر کے سب سے پہلی ایک خاص طرز فکر کے حامل شخص
 ترانہ کے ترانہ کو کچھ اس کی تعلیم نے اور کچھ اس کی جاودا اذیت نے۔ یہ کس تبدیلی کر رہا تھا۔
 "تصور بھائی! میں ذرا مصروف ہوں پلیز۔" اس نے غصہ سے منہ پھیر کر کہا۔
 دوسرے نظروں میں اس نے مذہب انداز میں شمار ہے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تصور وہیں صوبے پر

گیا۔
 "میں تمہیں کوئی کام تو نہیں بتا رہا بیٹھا ہوں بس۔"
 اس گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک مکمل طور پر منورہ کے ساتھ۔
 سے بنا آٹھ گزے کمر تھا کہ میں وہاں کے کمرے میں۔
 وہ سرگرمیوں کے نام تھا۔ تصور اور تمدن دن میں تو اکثر موجود نہ ہوتے تھے البتہ رات کو دونوں ایک ہی
 شینر کرتے تھے۔ تیسرا کمرہ ترانہ محمول اور میز استعمال کرتی تھیں۔ سواب ربیعہ بھی ان کی چوتھی روم میٹ بن
 تھی۔

ربیعہ کا پیچھا کہ وہ تصور کو عافیت طور پر دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہ لیکن وہ بے حد
 لڑکی تھی۔ ہر معاملے میں وہ وہاں تک جھک گئی تھی، جہاں تک جھک جانا اس کے اختیار میں ہوتا تھا۔
 "اچھا۔ آپ نہیں میں چلی جاتی ہوں۔" وہ آرام سے کہتے ہوئے اٹھنے لگی۔
 "میں کیا تمہیں کاٹ رہا ہوں۔" وہ تنک کر لولا۔

ربیعہ چند ثانیوں کے لئے رکی۔
 "میں کچھ دیر سکون سے رہنا چاہتی ہوں تصور بھائی! ایسا محض تنہائی میں ہی ممکن ہے ورنہ مجھے آپ
 میرا پیچھے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"تم خود کو کچھ سمجھتی ہو۔" وہ قدرے خشکی سے بولا۔ "تم سے جتنا پیار سے بات کرو تم اتنی ہی بھاتی ہو۔ آخر
 میں ساری کیا ہے۔"
 ربیعہ ایک سانے کے عالم میں رہ گئی۔ تصور اس سے کیا چاہتا تھا اس کے سامنے بالکل واضح ہو گیا۔ اسے سمجھ
 نہ آئی کہ وہ کس رد عمل کا اظہار کر رہی۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے بد یاد آیا "حاکم بچا
 آئے نفسانی خواہش کی کچھ لہجہ سے لہجہ سے مراد۔ اسے تصور سے کراہیت محسوس ہوئی تھی۔
 اسی لمحے صولت اندر آئی۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا۔ اس نے تصور کو کچھ کر بڑی کاٹدار نظروں سے ربیعہ
 دیکھا۔ غائب رہا غشی کی کیفیت میں جھلا۔ ربیعہ اس کی نظروں کے تیرے سمجھ پائی۔
 "مجھے جانے چاہیے۔" وہ غصے سے بولی۔ "میرے سر میں سخت درد ہے اور تم یہاں تھی بیٹھی ہو۔ بیٹھ بیٹھ کر
 ساری کر نہیں رہی تھی۔"

"تم خود کیوں نہیں چائے باتیں؟" تصور بھی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ "ہذا حرام کیس کی۔ دو چار گشتے باہر گزار کر تم خود
 بہت قابل سمجھنے کی ہو۔"
 "میں۔۔۔ آپ سے بات نہیں کی۔" وہ خرد کر بولی۔
 "میں۔۔۔ تو دونوں کا شمار۔" وہ غریبا۔
 "تم کس کس سے باہر نکلتی ہو اور کچھ میں اگر چاہے بنانے لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ اس
 نے اپنی بیٹھنے کے لئے بالکل ناوہی اور نا قابل برداشت تھی۔
 چھری کی دھبے میں باہر ناکھٹ کھلنے اور پھر ہند ہونے کی آواز آئی۔ تصور شاید گھر سے چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد
 دولت بھی میں آئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
 "مجھے نا۔۔۔ یہ معاملہ کیا۔ صولت کھڑی کمرے گھر سے سامنے لے رہی تھی۔
 تم ہر وقت میری رعایت کے سوا کسی کیوں کر رہی ہو؟" وہ بدتمیزی سے بولی۔
 "مجھے۔۔۔ یہ بھی کیا کہہ رہی ہو تم؟"

دیکھو۔۔۔ یہ وہی ہے جس نے اس کے ساتھ چھت پر خوش گپیاں کرتی ہو تھی وہ تمہارے ساتھ بچپن
 میں کھے ہوئے ہوئے۔ یہی ہے جس نے اس کے ساتھ کھیل کر دیکھی بات ہے۔ تم گھر میں نہ ہو سکتے ہوں گے تو
 میں۔۔۔

میں۔۔۔ اس میں ہفتے کو اس کے گھر پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔
 "کیوں بند کر کو کہنی لڑکی۔" وہ ترانہ بھی جو بخانے کے دیوان آئی تھی۔
 صولت کھل کر ہاتھ رکھے اسے بھی بیٹھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ربیعہ کا کھڑی تھی۔ کبھی وہ صولت کے
 غائب پر نور کرتی، کبھی ترانہ کے تیروں پر، کبھی صولت کے کھل پر پڑنے والے کھپڑ پر۔
 "تم نے مجھے مارا ہے؟" صولت غرائی۔
 "ولی شک ہے تمہیں؟" وہ اطمینان سے بولی۔ "اگر ہے تو بتاؤ۔"
 "میں۔۔۔ میں ایسی کو بتائی ہوں ساری بات۔ آنے دو ورنہ ایسی کو اس محنت کے کر تو ت بھی بتاؤں گی میں رکھنا
 یہ دیکھو۔۔۔ وہی ہے۔"
 وہ بچپن سے باہر جانے لگی۔ اچانک ہی ترانہ نے اس کے بال منہ میں جکڑے اور اسے دایرہ باندھ کھینچ لیا۔
 "مذہب صولت! اگر تم نے اپنی غلطی زبان سے ربیعہ کے متعلق کوئی کواں کی تو میں تمہارا شکر کروں گی اور تم
 اس معصوم کے کون سے کر تو ت کرواؤ گی؟ کر تو ت تو پھر میں تمہارے گواہوں کی سب کو یہ مت سمجھنا کہ مجھے کسی

بات کی خبر نہیں ہے۔

صورت پتھر کی ہو گئی۔ ترانہ نے اس کے بال چھوڑ دیے تھے لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے غصہ کا نور ہو چکا تھا۔

”اگر بچھوئے مجھ سے یا راجہ سے اس واقعہ کے متعلق کوئی استفسار کیا تو اور کہنا۔“ ترانہ نے دھمکی لہجے میں کہا تھا۔ ”میں انہیں سب بچھتے ہوں گا۔“

صورت بے حد تیزی سے بچن سے باہر نکل گئی۔ ترانہ نے جیسے کسی بھرے ہوئے غبارے کو سوئی لگی تھی۔

”یہ بچے کیلئے ہر ایک بچکنے لگے۔ ترانہ نے اسے خود لگا لیا۔

”یہ پتھر نہیں مارنا چاہیے تمہارے پیٹ پر۔“ وہ بولے۔ ”ہے حقوق پینڈا اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ راجہ خاموش کھڑی آسویں رہی۔ اسے کسی کے سامنے روٹا ہٹ متھل لگتا تھا۔

”چائے نہ کھو رہو۔ اور صولت نہیں ہو گئی ہے۔“ ترانہ آگستھی سے بولی۔

مسئلہ ابھری ہوئی نالی چائے دیکھ کر راجہ کو جسی آئی۔

”تو تلو دہائی۔“
”تم نہیں سدھو گے۔“ شملہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”سہرا میاں بھی یہی کہتا ہے۔“ وہ مزے سے بولی۔

شملہ کی نگاہ خاموش بیٹھی باہر پر پڑی۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ باہر کی جو ابلی مسکراہٹ میں رکھی انداز تھا۔

”یہ بی بی خوش دلی مفتوح بھی۔ شملہ کا دل لڑکھڑکی۔“ وہ بچکنے چکے انداز میں بولی۔

”اگر اجازت ہو تو میں بیٹھ کر کہوں؟“ وہ بچکنے چکے انداز میں بولی۔

”جی نہیں۔“ ایتھان نے اسے ہاتھ پیچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”کوئی اجازت و اجازت نہیں ملے گی یہاں سے۔“

”خوش دلی اور ان کیڑوں میں بھی ٹھیک ہی لگ رہی ہو۔“

پھر اس نے رک رک کر موس اور عمر کو دکھا۔ ایمان کو وہ عزرا ایتھم کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

”ہیٹا۔“ آپ لوگ باہر کیوں نہیں کھینچتے کان میں بہت مزہ آئے گا۔“

وہ دونوں جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ کھکھلاہتے ہوئے باہر کی سمت ہو لیے۔

”دشملہ!۔“ منینڈو بیکم بے حد حجاب خوش نظر آئی تھیں۔ ”یہ لوگ تمہارے لیے پروڈل لائے ہیں۔ باہر کے بچہ۔“

”جی ہاں اور ایتھان کے بیٹے صاحب کا۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی انہیں۔ برسوں سے آئی جاتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ساری خود اعتمادی ہوا ہو رہی تھی۔ وہ حد حقت کا شکار تھی۔

”ہیٹا۔“ وہ اپنے فضلے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔ ”میں بھی سوچنے کو کچھ وقت درکار ہو گا لیکن انیقہ۔“

”میں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

شملہ ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ہال کا منظر اس لیے۔ وہ اپنی بولی کر کے ابھی اٹھ لی تھی۔ اپنی سفید آنسو سے اتر کر وہ نے چھائی کے عالم میں تین میز چھائی چڑھ کر۔

ی لاؤن میں داخل ہوئی تھی اور پھر دروازے میں ہی ٹھہر گئی۔

اندروں سے بڑے بیرون صوفوں پر بٹھل جی ہوئی تھی۔

سامنے ہی ایتھان بیٹھی کھکھلا رہی تھی۔ اس کے پیٹھ پر ایک اور عریضہ ایک کلاں۔

مرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایتھان کے دائیں جانب پڑے ہوئے دو صوفوں پر باہر اور منینڈو بیکم پر ایمان تھیں۔ وہ دونوں بھی کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔

انیقہ سینئر ٹیبل کے پاس فلور کشن رکھے بیٹھی تھی اور کیوں میں چائے لاندل رہی تھی۔

اس خوش رنگ ماحول کو دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ بچے یوں اچانک تو ہوئیں کہتے تھیں۔“

”یہ گولڈن چانس ہے آئی اسے من نہ کریں۔ تقدیر نے آپ کو آپ کی سابقہ خطائیں معاف ہو جائے
نگل دیا ہے۔ ریاضت کا صلہ مل رہا ہے۔ فوراً“ سے پیشتر ہاتھ بڑھا دیں۔“
”شملائے نظریں چراغیں۔“
”ہر طرح کی الجھنوں سے چھٹکارا مل جائے گا آپ کو۔ مجھے آپ کی راہوں میں دور تک گلاب پیچھے دیکھائی
رہے ہیں۔“

”ہنس بنگ! شملائے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”راہ تو بس وہ ہیں نظر آتی ہے جہاں پر قدم ہوتے ہیں۔ نہ
آگے کیا ہے۔ گولی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم نے دور دور تک تب دیکھ لیا۔“
”کیا امکان تو اچھا رکھنا چاہیے نا۔“ وہ رمانیت سے بولی۔ ”تمنا کے گزار میں ہمیشہ خوش رنگ پھولوں کا
ہونا چاہیے۔ یہی جینے کی اساس ہے۔“

”تمنا کا گھڑا“ وہ اواس ہوئی۔ ”تمنا کا گھڑا تو صحرانوردانہ ہے۔ لنگ اس کی حد سے بڑے دُور دور
جھٹکا ہوا رنگ نازک۔ تمنا کا گھڑا روہم ہے، دھوکہ ہے۔ حقیقت و گیزارِ شمشاد کی طرح اچانک گھٹاؤ کے سامنے
ہے۔ پھول ”چنے“ پودے پانی سب سراب ٹھہرتا ہے اور انسان عمر بھر اسی سراب کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔“
”یہی سراسانی ہے سب کو۔“

”او فوہ۔“ اس نے شملائے کا ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ”تم جی جی باتیں کرنا۔“
انسان جینے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ گزارِ تمنا جینے کا ہی نام ہے۔“
”ایسا تو پھر زیکرِ تمنا زندگی ہے۔“

”موقوفیت کی انتہا۔“ انقضاء نے اسے بری طرح گھورا اور ایک ٹون بدل لی۔
”او تمہارے شملائے حسن علی صاحبہ! تقدیر اس دیکر اڑے باحفاظت گزرنے کے لیے آپ کو ایک عدد ٹکڑاؤں
فراہم کر رہی ہے۔ میرا اشارہ جناب باغِ ناروقِ حسن کی جانب ہے۔“
شملائے پھول کے ساتھ اچانک ہی ہنس دی۔ ”اس کی شش بس سناختہ اور شفاف،“
”ایک انقضاء نے اسے ہنساؤ کی طرح سکون کا سانس لیا۔“

”انقضاء! شملائے ایک سنجیدہ دوش۔ ”تمہیں بہت سمجھ دار پڑا ہے اور اب تو وہ اپنے باپ سے بھی مل چکا ہے۔
مجھے اندیشہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے ذہن کو متاثر کر سکتا ہے۔“
”جناب! عمر سے زیادہ سمجھ دار باہم فاروقِ حسن ہیں جو اس کے پاس ہیں۔“
”کے ہیں۔“ وہ ذہنی طور پر ان کے قریب ہو چکا ہے اور نیچے اکثر ان کی باتیں بتاتا ہے۔ مجھے یقین ہے عمر اس نے
رشتے کو دل و جان سے قبول کر لے گا۔“

”وہ کتنے کتنے رک گئی۔ شملائے اس کی جانب دیکھا۔
”بڑا ٹھیکہ۔“ وہیں سے گزرتے ہوئے کسی کو شش نہ کی جائے۔“
”اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے۔“ شملائے سر جھٹک لیا۔
انقضاء کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن موج ابھری تھی۔

ف
فکاس دور کے باہر باغ نظر آ رہا تھا۔ لیکن سے نکلی عیشہ لحو بھر کے لیے رکی پھر اس کے اندر سخت
پابندی کی ایک لڑائی تھی۔

وہ مرکز دوبارہ بچکن میں گھس گئی۔ فردوس نیلم سے پلٹ کر اسے دیکھا۔
”لو کی! ایس کتنی ہوں ملی کوچکا۔“ وہ اس نے کہا تھا بارہ بجے دکانے کے لیے۔“
”چکا چکی ہوں۔“ وہ ہیرا ری سے بولی اور دروازے کی جانب پشت کھڑی رہی۔
”اے۔“ وہ متحجب ہوئیں۔

اسی لمحے دروازے میں تاج نمودار ہوا تھا۔
”السلام علیکم آئی امی! آؤ کچھ جھینپا جھینپا کھا لی رتا تھا۔“
فردوس نیلم کے آثارِ آثارِ واحد میں تبدیل ہوئے تھے۔ وہ اساتذہ کی سلوٹس چپکار مسکراتے لگیں۔
”وہ علیکم السلام پر خوروا۔“ جیتے رہو۔ خیر سے ہو جی۔“

”نیلم۔“ اس نے بے سرشت بے خبر گاہ کی۔ ”صلی اور غزوہ کماں ہیں نا کی امی! ہمیں یونیورسٹی جانا تھا۔“
”کب سے تو کہہ رہی ہوں اس لڑکی کو! تمیں جگاؤے، جگاؤے۔“ سنی ہی نہیں ہے۔ ”وہ ہیرا ری سے بولیں پھر
تو کٹخت انہیں کچھ خیال آیا۔“ اے ہاں بے چاری مصروف بھی تو ہے صبح سے میرے ساتھ گلی ہوئی ہے
تو کٹخت اس کے ہاتھ میں ہیں، اٹھ کر نہیں دیتے جاؤ بیٹا! تم خود ہی دیکھو نا تمیں! اوپر اپنے کمرے میں
تو کٹخت اس کے ہاتھ میں ہیں، اٹھ کر نہیں دیتے جاؤ بیٹا! تم خود ہی دیکھو نا تمیں! اوپر اپنے کمرے میں

”جی جی۔“ غائب ہوا۔
فردوس نیلم نے اس کا پیچھلا چروا غور دیکھا مگر انجان رہ کر کینٹ میں ہاتھ مارنے لگیں۔

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“
”بڑی شرمیلی۔“

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)



میں اتنا بھی کمینہ نہیں کہ میں ایک ماں سے اس کے جینے کی امید چھین لوں۔“ وہ انہیں بچانے سکون کا سانس لیا۔

سانس میں ابراہیم کی قوت کے احساس کا اعتراف تھا۔ وہ مسکرایا۔

”ہم سب ہم لوگوں نے ایسا کچھ شے کر لیا ہے۔ وہ بھر جتنا ہے والے انداز میں بولی۔ مبادا ابرار نے
 ہو۔“ کچھ ہی عرصے میں باقاعدہ رخصتی عمل میں آجائے گی۔“

”جی۔ جی ہاں، مشکلوں سے سہی، لیکن مان گئی ہیں۔“ انھوں اب تک اس کے لیے کے اتار چڑھاؤ۔
کنفیوژ ہو رہی تھی۔
”چھا! وہ کھنڈے اور یکے چٹکے انداز میں بولا۔ ”یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔“
”آپ آپ کے اعتراض سے ہر چند کہ کوئی فرق نہ ہو، لیکن میں پورے غلط فہم کر رہی ہوں۔“

اس سے پہلے وہاں بولے۔ آپ یوں اپنی زندگی شروع کرنے کی اجازت میں ۱۰۰ بار ہوا۔
 جسے اسے انقیاد سے اس سچو کوئی کی امید ہو۔
 ”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
 ”آپ عمر کی کشتی کا دو عوانوں میں کریں گے؟“ یہ دیکھ دے دے ہوئی۔
 وہ چند لمحے اس کی کیفیت سے ملاحظہ ہوا۔
 ”اگر کر دے گا؟“

”میں نے دراصل یہ بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ یہی اصل سبب ہے۔“

”تم نے خود جبر کیا تھا۔“ وہ بات کاٹ کر بلکے سے ہنسا۔

اب میری کن زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھانے دیتے۔ لیکن پھر بار بار یہی امیں جانتے جو دردِ خواست کرتی تھی۔ وہ آپ کے اعتراف سے پیسے چھوٹے تھے۔ لیکن پھر بار بار یہی امیں جانتے جو دردِ خواست کرتی تھی۔ وہ آپ کے اعتراف سے پیسے چھوٹے تھے۔ لیکن پھر بار بار یہی امیں جانتے جو دردِ خواست کرتی تھی۔

اپنے لیے پریشان ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعا دیتے ہیں اور اپنی جان دوسرے کے ہونے سے ہیں اس کی سانسوں سے جیتی ہیں اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں اگر آپ بھی قسمی قسمی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بہن اس خیال سے مر جائے گی۔ ہونے کے ہونے اس کا نام

م لکرمیت کوئی! وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں آپساکے نہیں کروں گا جیسا تم سوچتی ہو۔ شہلا کوئی زندگی
تمہارک ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے۔“

اندھیرا تھا۔ کونے میں رکھے ڈیک سے غزل کی مدہم سی آواز ابھر رہی تھی۔

حال دل ہم بھی سناٹے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا
دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

عریشہ نے آگے بڑھ کر لائنس آن کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ناعمہ جھجکتے ہوئے اس کے مقابل پر تھی۔ عریشہ نے ریوٹ سے ڈیک آف کر دیا۔ کمرے میں ایک لخت خاموشی چھا گئی۔ چھت پر گھومتا ہوا پتھر سی آواز سدا کر رہا تھا۔

ناعمہ کو تادیر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے گیا ہو۔ عریشہ اس کے مقابل بیٹھی تھی لیکن اس سے ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں کوئی خفتہ کہانی کہہ رہی تھیں۔ ناعمہ کا ذہن اس بولی کو سے قاصر تھا۔

”عریشہ“ بالآخر وہ بولی۔

”ہوں!“ اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ”کہو“

”تمہاری طبیعت۔“

”ٹھیک نہیں ہے“ اس نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اطمینان سے کہہ دیا۔
ناعمہ کو سوائے اس کی میز و دم آنکھوں سے طبیعت کی کوئی اور سراغ ہاتھ نہ آیا۔
”کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی جس میں نہ غصہ تھا نہ شکایت۔
ناعمہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت دیکھی۔
”کیسے آنا ہوا؟“ بظاہر اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”دوبل میں۔“ ثانیہ۔ ثانیہ اور میں۔ اور سدرہ۔ وہ۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ بہت“

تمام بولی۔

”اچھا!“ عریشہ اسی سٹون سے بولی۔

”ہم لوگ۔۔۔ سب باتیں۔۔۔ باتیں کر رہے تھے۔“ ناعمہ کو لگتا تھا وہ کسی انجان ہستی کے مقابل بیٹھی ہے۔
یہ وہ عریشہ تو نہ تھی جسے وہ جانتی تھی۔

”اچھا۔“ ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کہو باتیں۔“

”تمہ۔۔۔ تم چلو نامیرے ساتھ۔“ اس نے بے حد جھجکتے ہوئے کہا۔

عریشہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن بے حد واضح انداز میں۔ ناعمہ کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑا۔
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا۔“ وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ ”میں چلوں؟“

”خدا حافظ!“ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔

ناعمہ ایسے ڈر کر کمرے سے نکلی جیسے عریشہ اسے مارنے کے لیے پیچھے دوڑے گی۔ تیز قدموں سے لاون چار کیا تھا کہ فردوس بیگم کی آواز نے اسے مزید سہا دیا۔

”اگرے ٹھہرو تو لڑکی! کہاں بھاگے جاتی ہو۔“ وہ لیکن سے نکل کر اس کی جانب آ رہی تھیں۔

”جی جی ممانی جان! وہ غمگین ہے۔“
 ”ہو گئی بات؟“ انہوں نے کھینچ کر دیکھا۔
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اٹاتے میں ہلایا۔
 ”کیا یہ میرا مطلب ہے کہ کیا بات ہوئی؟“
 ”جی؟“ ناعمد کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔
 آج سے پچتر انہوں نے بھی دونوں سیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا تھا۔

”دوست! میں اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکٹھی اکٹھی سی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“
 ”جی ممانی! ٹھیک ہے۔ اب میں چلوں گا۔“ وہ مڑی تھی۔
 ”بات سنو ناعمد! انہوں نے پھر اسے یاد کیا۔
 ”جی؟“ وہ بلی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔
 ”وہ بیٹا۔ عیشہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ بڑے خفت سے بولی تھیں۔ ”کیا اودن کی سنبھل جانے کی۔“
 ناعمد کی آنکھوں کی حیران میں یک نیت کی واقع ہوئی۔ یہ وہ کچھ سمجھ ہی۔
 ”جی ممانی جان! اس نے دھیرے سے کہا۔

”ترانہ ایک بات کہوں تم سے، تم ہر بات کو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اواسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب حیران تھی۔ ترانہ اس سے دیکھنے لگی۔
 ”میرا کسی باطل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اچھے بھائی پورے کر لوں گی۔“
 ”ربیعہ! ترانہ نے ایک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اتر رہے تھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔
 ”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے جے جے مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے۔ تم سے۔“
 ”میں ہوتے ہیں، میں اپنے خسرین ہی کسی باطل میں کسی دامن میں جکڑ چکی ہوں۔ لیکن اگر وہی کی خوشبو بہت برا اثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی دیتے ہیں انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کھینچ چلی آئی۔ اپنی کی تلاش میں اپنا نیت کی خاطر۔“
 ”وہ یہاں تمہیں غیر محبت ملی، دکھا۔“ ترانہ نے سر جھٹکا کر کہا۔
 ”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سارا رویہ دھندلا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ پیار سے بولی۔ ”تم نے مجھے ایک بس کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ! وہ اواس ہو کر بولی۔
 ”مجھے میرا انداز بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غور میرے کردار کی بلندی ہر شے سے بڑھ کر یاد دلا رہی ہے۔ میں اپنے دامن کو اتار نہیں دیکھ سکتی۔“
 ”تمہارا دامن کوئی معمولی سا داندرا بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ خوش سے بولی۔
 ”ترانہ تم بڑھتے ہوئے تمہیں روک سکتی ہو! اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ سکتی ہو لیکن چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارا اختیار

”جی جی ممانی جان! وہ غمگین ہے۔“
 ”ہو گئی بات؟“ انہوں نے کھینچ کر دیکھا۔
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اٹاتے میں ہلایا۔
 ”کیا یہ میرا مطلب ہے کہ کیا بات ہوئی؟“
 ”جی؟“ ناعمد کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔
 آج سے پچتر انہوں نے بھی دونوں سیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا تھا۔
 ”دوست! میں اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکٹھی اکٹھی سی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“
 ”جی ممانی! ٹھیک ہے۔ اب میں چلوں گا۔“ وہ مڑی تھی۔
 ”بات سنو ناعمد! انہوں نے پھر اسے یاد کیا۔
 ”جی؟“ وہ بلی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔
 ”وہ بیٹا۔ عیشہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ بڑے خفت سے بولی تھیں۔ ”کیا اودن کی سنبھل جانے کی۔“
 ناعمد کی آنکھوں کی حیران میں یک نیت کی واقع ہوئی۔ یہ وہ کچھ سمجھ ہی۔
 ”جی ممانی جان! اس نے دھیرے سے کہا۔
 ”ترانہ ایک بات کہوں تم سے، تم ہر بات کو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اواسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب حیران تھی۔ ترانہ اس سے دیکھنے لگی۔
 ”میرا کسی باطل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اچھے بھائی پورے کر لوں گی۔“
 ”ربیعہ! ترانہ نے ایک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اتر رہے تھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔
 ”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے جے جے مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے۔ تم سے۔“
 ”میں ہوتے ہیں، میں اپنے خسرین ہی کسی باطل میں کسی دامن میں جکڑ چکی ہوں۔ لیکن اگر وہی کی خوشبو بہت برا اثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی دیتے ہیں انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کھینچ چلی آئی۔ اپنی کی تلاش میں اپنا نیت کی خاطر۔“
 ”وہ یہاں تمہیں غیر محبت ملی، دکھا۔“ ترانہ نے سر جھٹکا کر کہا۔
 ”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سارا رویہ دھندلا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ پیار سے بولی۔ ”تم نے مجھے ایک بس کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ! وہ اواس ہو کر بولی۔
 ”مجھے میرا انداز بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غور میرے کردار کی بلندی ہر شے سے بڑھ کر یاد دلا رہی ہے۔ میں اپنے دامن کو اتار نہیں دیکھ سکتی۔“
 ”تمہارا دامن کوئی معمولی سا داندرا بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ خوش سے بولی۔
 ”ترانہ تم بڑھتے ہوئے تمہیں روک سکتی ہو! اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ سکتی ہو لیکن چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارا اختیار

ربیعہ نے کہا۔ ”جی ممانی جان! وہ غمگین ہے۔“
 ”ہو گئی بات؟“ انہوں نے کھینچ کر دیکھا۔
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اٹاتے میں ہلایا۔
 ”کیا یہ میرا مطلب ہے کہ کیا بات ہوئی؟“
 ”جی؟“ ناعمد کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔
 آج سے پچتر انہوں نے بھی دونوں سیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا تھا۔
 ”دوست! میں اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکٹھی اکٹھی سی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“
 ”جی ممانی! ٹھیک ہے۔ اب میں چلوں گا۔“ وہ مڑی تھی۔
 ”بات سنو ناعمد! انہوں نے پھر اسے یاد کیا۔
 ”جی؟“ وہ بلی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔
 ”وہ بیٹا۔ عیشہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ بڑے خفت سے بولی تھیں۔ ”کیا اودن کی سنبھل جانے کی۔“
 ناعمد کی آنکھوں کی حیران میں یک نیت کی واقع ہوئی۔ یہ وہ کچھ سمجھ ہی۔
 ”جی ممانی جان! اس نے دھیرے سے کہا۔
 ”ترانہ ایک بات کہوں تم سے، تم ہر بات کو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اواسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب حیران تھی۔ ترانہ اس سے دیکھنے لگی۔
 ”میرا کسی باطل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اچھے بھائی پورے کر لوں گی۔“
 ”ربیعہ! ترانہ نے ایک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اتر رہے تھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔
 ”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے جے جے مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے۔ تم سے۔“
 ”میں ہوتے ہیں، میں اپنے خسرین ہی کسی باطل میں کسی دامن میں جکڑ چکی ہوں۔ لیکن اگر وہی کی خوشبو بہت برا اثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی دیتے ہیں انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کھینچ چلی آئی۔ اپنی کی تلاش میں اپنا نیت کی خاطر۔“
 ”وہ یہاں تمہیں غیر محبت ملی، دکھا۔“ ترانہ نے سر جھٹکا کر کہا۔
 ”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سارا رویہ دھندلا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ پیار سے بولی۔ ”تم نے مجھے ایک بس کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ! وہ اواس ہو کر بولی۔
 ”مجھے میرا انداز بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غور میرے کردار کی بلندی ہر شے سے بڑھ کر یاد دلا رہی ہے۔ میں اپنے دامن کو اتار نہیں دیکھ سکتی۔“
 ”تمہارا دامن کوئی معمولی سا داندرا بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ خوش سے بولی۔
 ”ترانہ تم بڑھتے ہوئے تمہیں روک سکتی ہو! اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ سکتی ہو لیکن چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارا اختیار

مردوں کو گرجن میں دے رہے تھے اس وقت وہاں کی حالت تھی۔

”واؤ! زبردست! ترانہ نے سرگوشی کی۔“ ابھی بھی سوچ لے رہی تھی۔ اُنہ بولا بھائی بھی کوئی ارشہ بھلا؟“
 ”رہیجہ نے اس کی بات کانٹنی جواب نہ دیا۔ وہ اُنھ کے عباد کی سمت بڑھی۔
 اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر عباد کھڑا ہو گیا۔ رہیجہ اس کے متقابل پہنچ گئی۔
 ”السلام علیکم۔“ وہ سرگوشی کی۔ ”کیسے ہیں عباد بھائی؟“
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ جواباً مسکرایا۔ ”میں ٹھیک ہوں تم یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا۔ خیریت سے ہو؟ کسی

پیشانی تو نہیں ہے؟“
 ”میں ٹھیک ہوں!“ نجات دیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔
 ”رہیجہ! عباد کے دل میں جیسے کسی پین پیچھو دی۔“ رہیجہ اصرار دیکھو۔
 رہیجہ نے جلدی سے انگلی کی پور سے پکڑ کے کنارے صاف کیے اور مسکراتے گئی۔
 ”آپ کی اس قدر اہمیت! ابھی کتنے ہی عباد بھائی اس اور کوئی بات نہیں۔“
 عباد نے لمبی سانس بھری اور جھڑکی میں ہاتھ ڈال کر ہر اصرار دیکھنے لگا۔
 ”خیر! ابھی کہہ کر رہا تھا۔“ رہیجہ نے کہا۔ ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”جی ہاں۔ شاید! وہ سوچ کر بولی۔ ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”کچھ کہتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“
 عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔
 ”فلاس غیبتنا تمہیں پسند نہیں ہیں اور بات ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا قافار غیبتنا پسند

ہو؟“
 رہیجہ اس کی بات پر غلغلے سے ہنس بڑی۔
 ”جھانسنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے شیخ پر رکھے شاپر کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر

تمہیں کوئی پراہلنہ فیس کرنا پڑے۔“
 ”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”دیکھو عباد بھائی! یہ زحمت کیوں؟“
 ”یار بھائی! ابھی کتنی ہو اور یہ زحمت کا ذکر نہیں۔“
 عذاب میں رہتی ہیں ہر وقت ہم کیسی ہن ہن؟“

رہیجہ ہنس دی۔
 ”پھر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس ستمی کا شکار ہو جاؤں گی۔“
 ”ہاں۔ اگر مجھے اور فقہا بھائی نہ سمجھو تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی ہن نہیں جو بھائی کا لایا ہوا تحفہ

شکر ادا کرے۔“
 رہیجہ کی اس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔
 ”اوسکے!“ وہ بولی۔ ”تھک چکا ہو بھائی!“
 ”یو آؤ ملگ۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔
 ”ترانہ مجھے زلزلہ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔
 ”کیا بات ہے؟“ وہ بے نیاز سی بولی۔
 ”یہ سب بھاری بھر کم شاپر دیکھا میں گے سب سے؟“

ترانہ نے سرگوشی کی۔
 ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”کچھ کہتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“
 عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔
 ”فلاس غیبتنا تمہیں پسند نہیں ہیں اور بات ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا قافار غیبتنا پسند

ہو؟“
 رہیجہ اس کی بات پر غلغلے سے ہنس بڑی۔
 ”جھانسنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے شیخ پر رکھے شاپر کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر

تمہیں کوئی پراہلنہ فیس کرنا پڑے۔“
 ”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”دیکھو عباد بھائی! یہ زحمت کیوں؟“
 ”یار بھائی! ابھی کتنی ہو اور یہ زحمت کا ذکر نہیں۔“
 عذاب میں رہتی ہیں ہر وقت ہم کیسی ہن ہن؟“

رہیجہ ہنس دی۔
 ”پھر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس ستمی کا شکار ہو جاؤں گی۔“
 ”ہاں۔ اگر مجھے اور فقہا بھائی نہ سمجھو تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی ہن نہیں جو بھائی کا لایا ہوا تحفہ

شکر ادا کرے۔“
 رہیجہ کی اس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔
 ”اوسکے!“ وہ بولی۔ ”تھک چکا ہو بھائی!“
 ”یو آؤ ملگ۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔
 ”ترانہ مجھے زلزلہ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔
 ”کیا بات ہے؟“ وہ بے نیاز سی بولی۔
 ”یہ سب بھاری بھر کم شاپر دیکھا میں گے سب سے؟“

ترانہ نے سرگوشی کی۔
 ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”کچھ کہتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“
 عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔
 ”فلاس غیبتنا تمہیں پسند نہیں ہیں اور بات ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا قافار غیبتنا پسند

ہو؟“
 رہیجہ اس کی بات پر غلغلے سے ہنس بڑی۔
 ”جھانسنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے شیخ پر رکھے شاپر کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر

تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ عمرو عیار کے جیسی ایک زنبیل میرے پاس بھی ہے جس میں
 بوں کاٹنا رکھتا ہے۔ میں ابھی اپنی زنبیل میں سے ترکیب نمبر چار سو بیس نکالتی ہوں۔“
 ”جتنے چاہئے۔“ ایک مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔
 ”کہن؟“ اندر سے آواز آئی۔
 ”اہاں! میں ہوں ترانہ!“
 دروازہ کھل گیا تھا۔ اندر تیرہ چھتر برس کے سن کی ایک عمر رسیدہ بلورچی عورت کھڑی تھی۔
 ”ماں! یہ سامان رکھ رہی ہوں! پاپا۔“ ترانہ نے اندر گھس کر وہ شاپر زایک طرف کو رکھ دیے۔ ”رات کو کسی

لے جائیں گی۔“
 ”آج! اس عورت نے سر ہا ہا کیا تھا۔“ یہ کون ہے؟“
 اس نے رہیجہ کی بات استفسار کیا۔
 ”یہ میری ماموں زاد بہن ہے۔ رہیجہ! اچھا! ماں! دروازہ بند کرلو۔“ ترانہ جلدی میں تھی۔
 رہیجہ اس کی اس ترکیب پر حیران تھی۔
 ”اے! کیا تھا؟“ اس نے رہیجہ سے پوچھا۔ ”یہ ماں کون ہے؟“
 ”ایک خوبصورت عورت ہے۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاریاں تن تنہا رہتی ہے۔ بیٹا افغانستان کی جنگ میں شہید

ہو گیا۔ ابھی باؤ کر سمرال جا رہی تھی۔ یہ یہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ میں اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ
 لی رہتی ہوں۔ سب محنت والے اس کا خیال رکھتے ہیں۔“
 ”اؤ! رہیجہ کو نجانے کھل وادی جان یا یاد آئے۔ وہ اواس ہو گئی تھی۔
 ”مجھے چیز پیچیدہ اور صوفیہ ہے پوشیدہ رکھنا ہو۔ وہ میں یہاں ماں کے پاس رکھواؤں گی ہوں پھر مناسب وقت پر

لے جاؤں گی۔“
 ”مثلاً؟“ رہیجہ نے ہنس کر پوچھا۔
 ”مثلاً! باری۔“ ترانہ نے کہا۔ ”وہی ایک دلکش راز ہے میری زندگی کا۔“
 ”اسے شاپر زکس وقت؟“ رہیجہ نے پوچھا۔
 ”آج ہی! لاؤں گی مختصر۔“ پھر وہ ہنس کر بولی۔ ”مجھے خوابے حد اشتیاق ہو رہا ہے۔ پیچھو اور حوصلت کے

سوتے کا انتظار کرنا ہو گا۔“
 رہیجہ نے سر ہلا دیا۔
 ”مگر شیخ کر ترانہ نے سامنے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ رہیجہ کیکن میں جلی آئی۔ بیٹا جیکم نے ٹوٹتی

نگاہوں سے اسے گھورا۔
 ”یہ تم لوگ روزانہ باہر کیا کرتے جاتی ہو؟“ وہ کچھ بد مزگی سے بولیں۔ ”تو کیوں کو زیب دیتا ہے؟“
 رہیجہ تو جانتے پر رضامند تھی نہ تھی۔ ترانہ اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔
 ”وہ آئی۔ روئیاں ڈال لوں؟“ اسے کچھ اور نہ سوچنا۔
 ”ہاں!“ وہ برسیں۔ ”اور کم مت پکنا۔ روز تمہاری ہیکل ہوئی مٹی کی پوتی ہے۔ بے چاریاں حوصلت کو اکثر اپنے

لیے آٹا گوندھ کر مٹی پکاتا رہ جاتی ہے۔ تمہیں تو احساس نہیں کسی کا جو تو گری کرتے ہیں ان کے دل سے پوچھو۔“
 وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

ترانہ نے سرگوشی کی۔
 ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”کچھ کہتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“
 عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔
 ”فلاس غیبتنا تمہیں پسند نہیں ہیں اور بات ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا قافار غیبتنا پسند

ہو؟“
 رہیجہ اس کی بات پر غلغلے سے ہنس بڑی۔
 ”جھانسنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے شیخ پر رکھے شاپر کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر

تمہیں کوئی پراہلنہ فیس کرنا پڑے۔“
 ”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”دیکھو عباد بھائی! یہ زحمت کیوں؟“
 ”یار بھائی! ابھی کتنی ہو اور یہ زحمت کا ذکر نہیں۔“
 عذاب میں رہتی ہیں ہر وقت ہم کیسی ہن ہن؟“

رہیجہ ہنس دی۔
 ”پھر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس ستمی کا شکار ہو جاؤں گی۔“
 ”ہاں۔ اگر مجھے اور فقہا بھائی نہ سمجھو تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی ہن نہیں جو بھائی کا لایا ہوا تحفہ

شکر ادا کرے۔“
 رہیجہ کی اس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔
 ”اوسکے!“ وہ بولی۔ ”تھک چکا ہو بھائی!“
 ”یو آؤ ملگ۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔
 ”ترانہ مجھے زلزلہ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔
 ”کیا بات ہے؟“ وہ بے نیاز سی بولی۔
 ”یہ سب بھاری بھر کم شاپر دیکھا میں گے سب سے؟“

ترانہ نے سرگوشی کی۔
 ”میرے پرکھنے والے ہیں۔“
 ”کچھ کہتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“
 عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔
 ”فلاس غیبتنا تمہیں پسند نہیں ہیں اور بات ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا قافار غیبتنا پسند

ہو؟“
 رہیجہ اس کی بات پر غلغلے سے ہنس بڑی۔
 ”جھانسنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے شیخ پر رکھے شاپر کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر

ربیعہ خاموشی سے اٹا نکال کر گوندھنے لگی۔ مینا بیگم کو آج کچھ زبان ہی غصہ تھا۔

”صحو! بھی تو بچہ، مجال ہے جو بے وجہ کسے نکلے کا نام لے۔ تاہم بے جاتی ہے، تاہم پر آتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے جیسے مار کر دے گی۔“ لڑکیوں کو یہ آوارہ گردی زیب نہیں آتی۔ مار کر نہ ہوا مصیبت ہو سکتی۔ وہ پرزائے جاری تھیں۔ نکل خانے کی چٹختی کرنے کی آواز آتی تو ان کی زبان میں لگام پڑی۔ وہ سالن کرنے لگیں۔

”اپنے بچہ کو کھانا کھلا کر دو! ان کے دے دینا تاہم پر۔“ وہ بولیں۔

”جی۔“ ربیعہ نے شخص اٹھائی کہا۔

عباد سے ملاقات سے اس کو کچھ پچھلا کر دیا تھا۔ اسے ان کی باتیں بھی بری نہ لگ رہی تھیں۔ بلکہ وہ ان کی اسنے دھیان سے سن بھی نہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عباد تھا۔ اس کی پر غلوں نگاہیں تھیں۔ جن میں اپنے تھی محبت تھی۔ اس کے پیچھے لیے جس عبادار اس سے رشتہ جتنا اور اس رشتے کے حوالے سے پانچا حق جتنا اور کومت اچھا لگا تھا۔

”یہ تم مسکرا کیوں رہی ہو؟“ مینا بیگم نے اسے چونکا دیا۔

وہ خفیف سی ہو گئی۔ وہ کھوتی لگا ہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

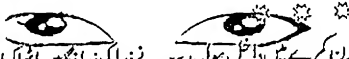
”کیا بات ہوئی؟“

”ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا پیچھا۔“ ربیعہ کو لائے آخراں سے جان چھڑنے لگا۔

”یہ میں آئی سے پیچھا کیسے ہو جاتی ہوں؟“ وہ بھڑکی۔ ”ہمت نیسی لڑکی ہو۔“

”جی پیچھا۔“ شاید اس نے مسکین سے اعتراف کیا۔

وہ تنگ کر با دبی خانے سے نکل گئیں۔



وہ منور امین کو دروازوں سے رہی تھی جب تمدن کرے میں داخل ہوا۔ ربیعہ نے ذرا کی ذرا انہیں اٹھا کر دیکھا اور منور امین کو پانی کا گلاس اٹھانے لگی۔

”تمہارا کھانہ میں کس لڑکے سے باتیں کر رہی تھیں؟“ اس نے اچانک دھا کا کیا۔

ربیعہ اچھل کر رہ گئی۔ تمدن کا کھلا اس قدر اچانک تھا کہ اسے ”بولو!“ وہ اسٹیک کے سارے چہرہ قدم آگے بڑھ گیا۔ ”کون کا؟“

”جی سہ! وہ“ ہر مجرم کی طرح سر جھکا کے کھڑی تھی۔

”تم نے یہاں کس سے پیار لے لیا ہے؟“ وہ درشت لہجے میں بولا۔

”تمہارا بھائی۔“ ترانہ اس کی آواز سن کر وہاں اٹھ گئی۔ ”مجھ سے پوچھیں۔ کیا پوچھنا ہے۔“

”ممنوع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ اس کی جانب گھوم کر بولا۔ ”ہمت دادا کو تیری تھی۔ میں ربیعہ سے پوچھ رہا ہوں اور یہی جواب بھی دے گی۔“

”تمہیک ہے۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں جواب دے دیتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ منہ بولا بھائی۔ ہم لوگ مرین بن لے تھے۔“

”مرین میں۔“ ہمت نے تمہارے سے ہنکارا بھرا۔ ”چند گھنٹوں کے سفر میں بھائی بہن پیدا ہو گئے۔ جب اتنی آسانی سے رشتہ جوڑ سکتی ہو تو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تمہارا بھائی۔“ ترانہ جیتی۔ ”خدا کا خوف کر سچ کچھ۔“

تمدن نے مرکز اسے زوردار اسٹیک ماری۔ وہ ابلا اٹھی۔ ربیعہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ منور امین زور زور سے مانتے لگے۔

”ارے بے غیرت۔ بہن پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کتے۔ کھوں کھوں۔ ارے تو کیوں ہمارے سینوں پر ناگ بن کر ٹپا ہے۔ کھوں کھوں۔“

”خیر وار جو آئندہ پارک کا رخ کیا تو دونوں نے۔“ وہ لال آنکھوں سے انہیں گھورتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

”ارے اس لڑکی کو نکالو، میں کتا ہوں۔“ منور امین کھک کھکے۔ ”ارے یہ اپنی ماں سے دھاتھ آگے۔ کھوں کھوں کھوں۔ میں کتا ہوں۔ کوئی شاداؤ لا کر رہے گی۔“

ربیعہ منہ چھپا کر کرے سے نکل گئی تھی۔



لان میں کھڑی کیا رہوں کا جائزہ لیتی انیقہ چونک اٹھی۔ چند لمحے وہ قہر کے عالم میں کھڑی گیت سے اندر داخل دے۔ ”اے افروزی آمد کے مقصد کے بارے میں خیال آرائی کرتی رہی، پھر جیسے ہی اس کی نظر دروہ کے ہاتھ میں تھا۔“

”میں نے یہ پوچھا تھا کہ بارے میں خیال آرائی کرتی رہی، پھر جیسے ہی اس کی نظر دروہ کے ہاتھ میں تھا۔“

”السلام علیکم۔“ اس نے پوچھا کہ لاؤج کی میز پر قدم دھرتی خفیفہ حیات اور ان کی ہمراہی فرودس بیگم اور عذرا بیگم کو پھوٹتی ہوئی سانسوں سے سلام کیا۔

”و علیکم۔“ بیگم نے جواب دیا۔ ”خفیفہ حیات نے اس کی پیشانی چومی۔“

”وہ بیگم سے ہاتھ کی انیس صاف لگی جاسکتی تھیں۔ عذرا بیگم خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔ ان سے پچھلے میں ان فیہ الی سربراہی دروہ اور راہیہ بیگم تھیں۔“

انیقہ نے لڑکی کا ہاتھ پوچھا۔ ”انیس لاؤج میں لے آئی۔ بھاری بھر کم خواتین صوفوں میں دھنس کر سانس ٹھیک کر رہی تھیں۔“

”جاگ دھا۔“ انو تو بیگم کا اظہار تھا۔ ”تمہارا منہ مسکرا رہا ہے پوچھا۔“

”آئی۔“ بیگم نے جواب دیا۔ ”انکس کرتی ہیں۔“ آپ کا گھر ہے یہ بھی اور اسے گھر تو کسی وقت بھی آیا جاسکتا ہے اور رہائے کا سوال؟ میں تو بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں آپ کو بول کر دیکھ کر۔“

”وہ تو گھر کی بی۔“ فرودس بیگم نے ہی میں منہ بدلتی تھیں۔ ”سر کا بوجھ اتر رہا ہے۔“

”ای کو لاؤجی! خفیفہ حیات بولیں۔“ اور یہ شملہ کیا کر رہی ہیں؟“

”ای ہمراہی ہیں۔ شملہ آئی ڈیوٹی سے آکر سو گئی تھیں۔ میں چٹائی ہوں انہیں۔“ وہ خوشی سے منال ہوئی جاری تھی۔ مرکز گروں کی جانب تیزی سے بڑھ گئی۔

”تاہم میاں نے بھی کہاں ہی کیا ہے۔“ خفیفہ حیات اس کی بتلی کر کو دیکھتے ہوئے حسرت سے سانس بھر کر بولیں۔ ”میں کا خیال تھا تھا۔“

ایقان پر نگاہ ڈال کر وہ باقی کے الفاظ ادا نہ کیا۔ وہ برا سامنے بنائے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اندرونی کرے کا دروازہ کھول کر شملہ باہر آئی۔ سب کی نگاہیں تجسس انداز میں اٹھیں تھیں۔ سویا بوا روپ لیے شملہ نے کسی نگاہ کو مایوس نہ کیا تھا۔

وہ شاید نہا کر سوئی تھی۔ سیاہ بال نہایت محسوس ہوتی چمک لیے اس کے کانڈھوں پر پریشان تھے۔ نیند کے
سے لبریز نگاہیں معصوم اور پرکشش لگتی تھیں۔ قدرتی گلابی لب نرم انداز میں ہلکی سی جھینسی جھینسی
لیے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی کاسیاء مل جگمگا رہا تھا۔ نکھر نکھر روپ اپنی بہار پر تھا۔
کسی کو کچھ غلط سوچنے کا موقع دستیاب نہ ہوا۔

”یہاں آؤ بیٹی! ہمارے پاس۔“ شفیقہ حیات نے اپنے اور فردوس بیگم کے درمیان جگہ بنائی۔ وہ دیر
دیر سے چلتی ہوئی وہاں آکر بیٹھ گئی۔

انہوں نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی چومی اور اپنی چند لمحوں پہ شروابی سوچ پر شرمندہ ہوئیں۔ اس کی
پر شرم و حیا کا نور تھا۔ اس کے وجود سے اب تک البرود شیرازوں کی مہک اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ سر سے
تک بہار ہی بہار تھی۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی۔ کوئی داغ نہ تھا۔ گولی جھول نہ تھا۔

”معاف کرنا بیٹی!“ وہ بولیں۔ ”بہندو معاشرے کے درمیان ایک طویل عرصے رہے ہیں نا۔ ہماری سوچ
اب تک ان کے غلط نظریات کے اثرات میں ہے۔ حالانکہ مذہب اسلام تو خود سونے جیسا ہے۔ یہ تو اپنے
رہنے والوں کو سنہا کر دیتا ہے۔ ہندوؤں کو ہمارے ساتھ رہ کر احساس ہو گیا کہ ان میں کیا کچھ غلط ہے۔ وہ بیا
کے حقوق کی بات کرنے لگے ہیں۔ انہیں مردوں کے ساتھ جلاؤالنے سے باز آگئے ان کی دوسری شادی کے
خود میں چمک پائے۔ اور ہم سچان سچان انہیں اپنی اچھی باتیں دے کر ان کی غلط سوچیں اپنے دامن
تبرک کی طرح لیے پھرنے لگے۔“

ہمارا مذہب تو کتنا دینی کا مذہب ہے۔ وسیع النظری کی بابت پڑتا ہے۔ وہم، نحوست، سب کچھ شدت سے
کرتا ہے۔ بیواؤں کو، مطلقہ عورتوں کو دوسری شادی کی پرزور تائین کرتا ہے۔ پورے معاشرے کو پابند کرتا ہے
وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں کوئی عورت تنہائی کی، تنہا کی، بستر نہ کرے۔ مرد کی حفاظت اور ذمہ داری
رہے۔ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تو کہتے ہو کہ آئے تو اگلے پھر جاتے ہیں۔“

ناسف سے بولتے ہوئے ان کی نگاہ منیڈہ بیگم پر پڑی تھی۔ منیڈہ بیگم نے سانسے کھڑی ان کی گفتگو
رہی تھیں۔ سلیقے سے دوشے اوڑھے، مہربان سی منیڈہ بیگم انہیں بہت بھائی ہیں۔

”اے منیڈہ بیگم! یہ سب باتیں جو کہتی ہو، وہ جلد ہی اسے الٹ دے گی۔“

”السلام علیکم۔“ منیڈہ بیگم نے مسکرا کر حاضرین کو سلام کیا اور شفیقہ حیات سے معاف کرنے لگیں۔
فردوس بیگم بھی ساس کی تقریر کے زیر اثر دیا ہوا مسکرائی تھیں۔ وہ بھی اٹھ کر منیڈہ بیگم کے گلے لگیں۔
ملانے کے مراحل طے ہوئے ہی تھے کہ اذیت ناک گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب لیے چلی آئی۔ اور سب کو
کرنے لگی۔

”ہم بتا کر نہیں آئے۔ معافی چاہتے ہیں۔“ شفیقہ حیات نے مفرح شربت کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”در اصل
لوگ اکٹھے ہو کر رشتے کے متعلق بات کر رہے تھے تو لڑکوں نے شور مچا دیا کہ جب سب ہی کچھ طے ہو چکا ہے تو
کیسی۔ آج ہی انگوٹھی ڈال کر آئیں اور برات کا دن طے کر لیں۔ پھر یہ ہماری صاحبزادی۔“
انہوں نے ایقان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ مسکرائے لگی۔

”ان کے مغز میں کچھ سما جائے تو نکلتا مشکل۔ بچوں کی طرح دیوانی ہو کر ضد کرتی ہے۔ بھاگم بھاگ ہاشم میاں
کے ساتھ جا کر انگوٹھی اور مٹھائی لے آئیں۔ آدھے گھنٹے میں سبھی کچھ ہو گیا۔ ہم نے بھی سوچا کیا روم و رول
اس قدر پابندی کرنا۔ عمریت گئی یہی سب کرتے کرتے حاصل نہ وصول۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو آؤ۔“

ہم بھی بچوں کی بان کر دیکھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ دیں۔ پر انہیں۔
 ”سربراہ! وہ وہ کلاب باکر بولے۔“
 ”اے ہاں ویسی۔“

سب ہی ہنس دیے۔ شہلا سمیت، وہ از حد مطمئن و کھائی و قی تھی۔ پیچھے دنوں کا وہ سارا اضطراب سب پر چھوٹی ہوئی تھی۔ وہ خود کو ہلکا چھلکا اور مسرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک پیچھے پر پہنچنا، بھنورے کنارے پر پہنچنا۔
 لگتا تھا۔

”جائزت ہے، ہن؟“ انہوں نے پرس میں سے تھلیں ڈھیر نکال کر منیوہ بیگم کو دکھا۔
 ان کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ انہوں نے ہنشل خور کا قابو پر آ کر اشیائے میں سر ملایا۔
 شفیقہ حیات نے ہم اللہ بڑھ کر انگوٹھی شہلا کی انگلی میں ڈال دی۔ شہلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ بلیکس بھاری ہمارے
 لگے لگی تھیں۔ لیوں پر شرمیلی مسکان کا راج تھا۔ گالوں پر گلال پھیل رہا تھا۔

”ہائے اللہ! ایشیا نے بیٹھالی پر ہاتھ مارا۔“ کمر تو ٹھول ہی آئی میرا۔ اب ہاشم لڑے کا بچہ ہے۔“
 ”ہاں جی! اولاً خشتا ہو تو ہم۔ تم سے یہی امید۔“ شفیقہ حیات شہلا کی ہتھیلی پر لفافہ دے رہی تھی۔
 ”یہ تمہارے جوڑے کے پیچھے ہیں۔ برا نہ مانا، ہم نے انہی کو تان سالی تاکہ کیسے لگتے ہیں۔“

”یہ لہجے اچان آئی! آپ کے مسئلے کا حل۔“ انہی نے کمر لڑا۔ اسے تھمایا۔
 کچھ زیادتی ہوئی۔“

سب ہی ہنس دیے۔
 ایشیا جلدی جلدی تصویریں کھینچنے لگی۔
 اچانک ہی سب کی توجہ عمر نے اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ غالباً ”ماں کے ساتھ سویا ہوا تھا اور اب اسے ساتھ نہ پا کر
 پریشان ہو کر ہار چلا آیا تھا۔ اتنے لوگ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گیا اور جلدی سے شہلا سے لپٹ گیا۔“

شہلا اپنی کیفیات سے بچک جھپکتے میں باہر آئی۔ عمر کے گرد بازوؤں کا مضبوط حصار بنا کر اس نے اس کی پیشانی پر
 بے ساختہ پیار کیا۔

حاضرین خاموشی سے ہو گئے۔ فروس بیگم گہرا بھلن جھانک رہی تھی۔
 جاری تھی۔ منیوہ بیگم نے آگے بڑھ کر عمر کو شہلا سے علیحدہ کرنا چاہا۔
 ”کوئی بیگم، تانویا اس آؤ۔ میں آپ کو اولو لئیں، بنا کر دوں۔“
 ”نہیں۔“ وہ بھلا۔

”رہے تو ای سو کر اٹھا ہے نا۔“ شہلا نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔
 ”اب ماما کو تھوڑا فری ٹائم دو۔“ عذرا بیگم نے ہنس کر ماحول خوشگوار کرنا چاہا۔ ”سب آپ اپنی نانو کو تنگ کر
 کرو۔ تمہاری ماما کو تو ہم نے جاس میں سے اپنے ساتھ۔“

عمر نے کچھ جواس نہ دیا۔ وہ شہلا سے لپٹ کر گھر نہیں دیکھ گیا۔ اس کی نگاہوں میں خوف در آیا تھا۔ شہلا
 کے چہرے پر سے سایہ گزرا تھا۔ فروس بیگم ہائی انداز میں بیٹھ گئی تھیں۔

”ناشا اللہ! چشمہ بددوس۔“ نظریں گھونڈے میاں کے تیس اور تیسوں سے جی مسکراہٹ کو۔
 ہاشم مسکراتے مسکراتے چوک اٹھا۔ ہنسا ہوا رافع متقابل تھا۔ ہاشم جینپ گیا۔

”اوسے تم کب آئے؟“
 ”جب آپ چاند میں محبوب کا کھنڈر دیکھ کر فحش ٹائم مسکرا رہے تھے۔“ وہ ہنشل خور کا قابو پر کھولا۔ ”ہائی وا
 کے لیے نسبت طے ہوتے ہی شرمیلی لڑکیوں کی طرح آپ نے چھت کا رخ کیوں کر لیا؟ خیالی پلاؤ کی بیگ کیا چھت
 سے ہی پکے ہے؟“

”چل! باندھو۔“ ہاشم نے خفت مٹانے کو اسے مٹا سید کیا۔ ”تو کیا سمجھے ہم سے دیوانوں کی دماغی کیفیت کو۔
 میاں! احساسات کو سمجھنے کے لیے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر تجربے سے نہیں گزرے تو احساسات کا
 انداز نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ دانت اندر کرو۔“

”تجربے سے کیسے نہیں گزرے؟“ رافع معنی خیزی سے بولا۔ ”تجربے سے تو الحمد للہ ٹھیک ٹھاک گزرے
 ہیں۔“

”ہاں تو؟“ ٹھیک ٹھاک ”گزر گئے نا۔ مسئلہ یہی ہے۔“ ٹھک سے لگی نہیں تھیں۔ ورنہ تم بھی یونہی دانت
 نکھٹے چاند کو دیکھ کر۔“ ہاشم اپنی شرمندگی پر قابو پا چکا تھا اور اب اسے کھلے دھڑکا تھا۔
 رافع ”مسکراہٹ بلی ہوئی اور منفرد بدلنے لگی۔ اب وہ کچھ سوچتا ہوا نظر آتا تھا۔

”یا۔“ ہاشم نے بلکروے لیتی، وا کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہا۔ ”یار! ایک لقم میرے لیے۔“ رافع
 ”کیا مطلب؟“

”یار! عجیب سی کیفیت ہے میری۔ اتنی بڑی خوشی سے گزر رہا ہوں اور۔۔۔ اوسے مجھے خود سے ڈھیر ساری باتیں
 سننے کا جی چاہا۔ بات۔ ہوا کی بانوں میں بانیں ڈال کر چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی مجھے
 اور۔۔۔ سے پن کا۔“ اس سٹالٹ سے بیسے نہیں کوئی کی ہے۔ جیسے خوشی پوری طرح سے کھل نہیں رہی۔ جیسے میں
 خود۔۔۔ ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ یار! ایسے عالم میں ایک چیز سارا دیتی ہے۔ جانتا ہے کیا؟“

”رار۔۔۔ کے چہرے پر کھنکھناتی جھانک رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ پایا۔
 ”شاعری۔۔۔ میں۔۔۔ ہنسنے لگی۔ میں نے اپنے الفاظ سے کیفیات کی تشکیل کرتے ہیں۔ یار رافع! قدرت نے
 مجھے ہم سے دیوانوں کے۔۔۔ اتنا ہی تشکیل کرنے کا ذہنک دیا ہے۔ ہمارے جذبات کی تشکیل کا ہنر ہے۔ تجربے
 یا۔۔۔ بار۔۔۔ کہ۔۔۔ کچھ سنا۔۔۔ ایسی باتیں جو دل سے نکلے اور دل میں اترا جائے۔ مجھے سن کر یوں
 سے۔۔۔ میرے جذبات کو زبان دے دیتی ہو جو بات میں خود سے نہ کہہ پایا۔“ وہ بات کہہ دے میرے
 دوست۔“

”کیا کوئی؟“ رافع ہنس دیا۔ ”کیا کہنا چاہتا ہے تو خود سے؟“
 ”اپنی خوشی کا مکمل احساس دلانا چاہتا ہوں خود کو۔ اس کے تصور کو حقیقت کی سطح پر لا کر اپنی خوشی شیئر کرنا چاہتا
 ہوں۔“ فرخ کر رافع اٹھتے ساتلوں تو کسی کو دیوانہ وار چاہتا ہو اور اچانک مجھے اس کی ہر اس کا اعزاز حاصل ہونے
 لگتا۔ ”کیا کہنا؟“

رافع سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھنڈی متوالی ہوا اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے گزری۔ بابل کے عین غلاف
 کو بنا کر چاند نے تھما ہوا اور مسکرایا۔ جنگلی گلابوں کی ہنسی ہوئی خوشبو کسی جھوٹے گلے کا ہتھ تھام کر اس کے بے حد
 قریب سے گزری۔ اس کی رافٹوں آنکھیں دور دیکھنے لگی تھیں۔ اس کا خیال چاندنی کے ساتھ ساتھ لگنے لگا۔

”اس کی ہر اس! ہاشمہ تمہاری بے لوث چاہت کا پتہ لگا رہا ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”جب اس سے ملو تو بتانا کہ۔۔۔“

تری آنکھ کی یہ روشنی میرے خون؟ دل کی لکیر ہے
ترکی زلف کی یہ چاندنی مرے خوابوں کی تعبیر ہے
یہ کشش تھی میرے خیال کی جو یوں ختم گئے ہیں تیرے قدم
یہ تیری ادائے دلبری میری چاہتوں کی اسیر ہے
میری بے بسی میں سوال ہیں ترا نقش نقشِ جواہر
مری مے رو کوئی بات کرا تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے
”دوست! دروغ!“ ہاشم نے پھینک دیا۔ ”شریہ!“
دافع جبران پریشان کھڑا تھا۔
”میں کیا بل ہوا جاؤں گا؟ وہ ہر دوا کا؟“ یہ سب کیا ہے؟
خوشی میں ہاشم نے کچھ نہ سنا تھا۔

”میری مے رو کوئی بات کرتی نہ ہے نہ تصویر ہے۔“ شکر مسکرایا۔ وی لی لی سی بھولان کی مہی ہوئی تھی
اعلان کر کے دیکھ رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر شہلا کا شرمیلیں اسٹ سے سجایا ہوا چہرہ چمکا رہا تھا اس کا
قد رے جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے درپے یوں پر یوں شکر کی آنکھوں میں ہاشم کو بے کلی محسوس ہوا
ان نگاہوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ محض ایک شرمیلیں شکر کے ہر سوال کا جواب نہ تھی۔
”دیکھ کر یوں گے یہ چند روز تمہارے بغیر۔“ وہ پڑھایا۔ ”میں ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں شہلا! اجا
میرے کی تیری برسی نہیں۔ مجھے ان لمحوں کا سراغ چاہیے۔“
اس کے موبائل کی لمپ بجنے لگی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ آئی جگہ سے اٹھ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب آگیا۔ اس کے
روشن نمبر کے ساتھ شہلا کا نام درج تھا۔ ہاشم کے دل کی کلک سنائی دیتی تھی۔
”ہاشم میاں! قبولیت کا وقت ہے مانگ لو اور کچھ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگا
”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی دھم گواڑ آئی۔ ”تعارف کی ضرورت تو شاید نہیں ہے۔“
”جی نہیں۔ میرے موبائل نے آپ کا تعارف کر دیا ہے۔“ شکر نے شکر سے لہجہ میں عزائم کی سی
”جی۔ شکر ہے۔“
”خوش ہیں آپ؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔
”معتذر ہوں!“ پھر وہ بولی۔
”طے!“ اس نے سانس بھری۔ ”میتا بھی بہت ہے۔“
”مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی ہاشم صاحب! ابے وقت آپ کو زحمت اسی لیے دی ہے۔“ وہ مختصر انداز
اختیار کرنے لگی تھی۔
”کمانی گاؤ!“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”شہلا پلیر! اجنبیت کی اس دیوار میں اب تو کوئی در و در پچ واکر لیتے ہیں
سے شناسائی جھانکے، دوستی مسکرائے، معنویت یا نہیں کرے۔ آپ تو بے مہر کی حد کرتی ہیں۔“ اس کے
میں بے پناہ شکایت تھی۔ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔

”ہاشم! معافی چاہتی ہوں۔“
”ایک اور اجنبی ہنسے۔“ وہ فوراً بولا۔
وہ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہی ہو گئی۔ ہاشم نے چند لمحوں کے لیے اس کے بولے کا انتظار کیا، پھر تھک کر بولا۔
”جلنے کیجئے۔ کیا کہنا چاہتی تھیں آپ۔ آپ کو شناسائی کی زبان نہیں آتی تو اجنبیت کی بولی میں ہی بات
کریں۔ لیکن بات تو کریں۔“
”ہاشم صاحب۔“
”صاحب بتا دیں۔“ کچھ وہ بے حد حق کے ساتھ بات کر رہا تھا۔
”جیسا ہاشم۔“ وہ کھینکا۔ ”گویا کسی کی احساس ہوا تھا۔“ ”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں
کہ عجب عمر کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟“
”وہ سب کچھ جو عمر کے متعلق آپ سوچتی ہیں!“ وہ ہنسا۔ ”عمر کے معاملے میں کبھی بھی خود کو مجھ سے علیحدہ
کر کے نہ سوچے گا۔“

شہلا نے جیسے پرسکون سانس بھری تھی۔
”سے اپنے ساتھ رکھوں گی ہر جگہ۔“ خواہ وہ میری ماں کا گھر ہو یا آپ کا۔“
اجا۔ جی ہاشم۔ ”دش ہوا تھا۔ فاروق حسن کے چند الفاظ دماغ کے کسی خفیہ گوشے سے نکل کر حافظے کی سطح
پر ابھر آئے۔
”اس میں ہماری نسل پر دان چڑھ گئی۔“ وہ سخت الجھ وٹھوس اور حتی بات۔
وہ کبے بھول گیا تھا۔ ”ہاشم! یہاں تو خیالات کا سخت ٹکراؤ ہونے جا رہا تھا۔
”آپ خاشا کیوں پھرتے؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔ ”دیکھیے آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور خیال ہے تو ابھی کلیئر
کر لیں۔ اتنا بات کہ میں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“
”شہلا! میں اس میں دخل دے رہا ہوں۔“
”شہلا! میں اس میں دخل دے رہا ہوں۔“

”گاہ اور یہ تو آپ کی زندگی کا ایک لمحہ ہے۔“
”کوئی شکر۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں نے اپنے آپ کو پہچاننے میں یہ پوائنٹ کلیئر کر دیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”بعد
میں ہی تم کی برائی ہو۔“

”بہتر جواب!“ وہ پشیمت سے مسکرایا۔ ”مزید کوئی حکم؟“
”یہ حکم نہیں گزارش ہے۔ عاجزانہ التماس ہے۔“
”او۔“ اس نے بے بسی سے آنکھیں پھا لیں۔ ”وہی غیریت سے بھرے الفاظ۔ آخر آپ کب اپنی لگنیں
گی؟“ شہلا نے جیسے ہر کون ہند کر دیا۔
وہ بے حد احتیاط سے فارم نقل کر رہی تھی۔ اپنے پیچھے ڈاکو میٹنٹس وہ اپنے ساتھ ہی لائی تھیں۔ ان میں سے
ضروری ڈیٹا اور بہت سارے نمائندہ کے ساتھ فارم پر منتقل کر رہی تھی۔
”محنت کھٹ کی آواز نے تھمن کی آواز کا پتہ تھا۔“ ریہ نے ڈر کر جلدی جلدی سارے کاغذات تکیے کے نیچے
کر دیے اور اوپر رسالہ رکھ کر پڑھنے لگی۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کمرے کی طرف بے ہوش ہو کر وہ
اس کی مصروفیت کا انداز کرتا رہا۔ ریہ رسالے میں پوری طرح جھوٹا کھائی دیتی تھی۔

”پچھو کہاں ہیں؟“ بالآخر وہ بولا۔

”جی!“ اس نے سر اٹھایا۔ ”پچھو سبزی خریدنے گئی ہیں۔“

”ہوں!“ اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

پھر اس کی نظریں تکیے کے نیچے سے جھانکتے کاغذ پر پڑی۔

”ایک کپ چائے بنا دو۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے آنکھیں میچیں۔ وہ دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے کسی کام سے اٹھا نہ دے۔

”جی اچھا!“ وہ چند لمحے رک کر بولی۔ ”ابھی بنا دیتی ہوں تمدن بھائی!“ تمدن وہیں کھڑا رہا۔ ربیعہ کسمسما کر رہ گئی۔

”اٹھ بھی جاؤ۔“

ربیعہ نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چیل پہننے لگی۔ وہ چاہتی تھی اس سے پہلے تمدن کمرے سے نکل جائے۔ اسے وہ کاغذات وہاں سے اٹھالینے کا موقع مل جائے لیکن ایسا ناممکن لگنے لگا۔ وہ ہنوز وہیں کھڑا اس کے آنکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ربیعہ کو وہاں سے ہٹے ہی نہ تھی۔

اس کی جانب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر کچن میں چلی آئی۔ بے کلی اور اضطراب کے عالم میں اس نے جلدی جلدی ساس پین بٹھکال چائے کا پانی چوبیس پر رکھ دیا۔ باہر صحن میں گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ شاید مینا سبزی خریدنے کے لیے آئی تھیں۔ کونجہ کو مزید کوفت نے آگھیرا۔ وہ باہر سے آکر چند لمحوں کے لیے ضرور کمرید ہی کرنے کی غرض سے لیٹتی تھیں۔ ان کے تکیے کے نیچے اس نے گویا پٹا خے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں ان پٹا خوں کے جلنے کی آوازیں ابھی سے گونج رہی تھیں۔

مینا کچن میں چلی آئی۔ ان کے ہاتھ میں نوکری تھی۔ ربیعہ نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے نوکری لے لی۔

”سب سبزی دھو کر رکھنا ہے۔ فیمنہ بھی لاتی ہوں۔ دھوا کر فرزریں رکھو!“

”جی!“ وہ مرل انداز میں بولی۔ ”چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں۔ مجھے یہ وقت کی جائے پسند نہیں۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”مممم میں تمدن بھائی کے لیے یہاں ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ مینا بیگم نے گھور کر اسے دیکھا۔

”دلیموں لاتی ہوں۔“ پھر وہ بولیں۔ ”مجھے سکنجبین بنا کر دو۔“

”جی اچھا!“ وہ فرماں برداری سے بولی۔

مینا نے چائے اور مینا بیگم کے لیے سکنجبین کا گلاس لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ اس کی گویا روح قبض ہوئے تھی۔

تمدن ان کا فارم ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کاغذات اس کے سامنے پڑے تھے۔

”تمدن بھائی!“ ربیعہ جلدی سے بولی۔ ”یہ میرے ہیں۔“

تمدن نے خشمگیں نگاہیں اٹھائیں۔

”کس نے لا کر دیا ہے یہ؟“

”ترانہ نے۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کیوں منگوایا ہے تم نے؟“ وہ غرایا۔

عربہ شائع کے رشتے کا سنتے ہی منگنی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بھجھا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔
 رابع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے اور دوبارہ تعلقات کی استواری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی دنگ رہ جاتی ہے۔
 ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے شرمناک مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصویر کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو پھینک مارتی ہے اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دیتی ہے۔
 انیدہ ابرار جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔
 یارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے بارگ جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور منڈ کے ساتھ جاکر شہلا کو منگنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں، شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس بات مان لیتا ہے۔
 تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
 لیکن اس پر تم کا بھرا اس وقت لگتا ہے جب بیٹا بیگم تمدن کے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۶

سولہویں قسط

ترانہ کو اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ صبح صبح بیٹے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بیٹا کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ تیرے لیے بولی۔
 خوشی اور مرضی کا نام تو نہیں ہے۔ شادی تو بندھن ہے دو افراد کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کسی ایک شخص کی مرضی کے تحت بندھن نہیں بندھ جاتے۔ ربیعہ کی مرضی جانے بغیر آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔

بیٹا بیگم نے ربیعہ کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بے پناہ تھکیر تھی۔
 ”اس کی کیا مرضی ہوگی؟ اکیلی لاوارث لڑکی، جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہم ہی ہیں اب اس کے سرپرست۔ اور مشنری لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے سامنے زبان نہیں کھولتیں۔ اسے تو سہارا ہی چاہیے، سوچھپانے کو چھت پناہ ہے کھانے کو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ مل رہا ہے نایاں اسے یہ سب کچھ۔ پھر رشتہ جوڑنے میں اعتراض کیسا؟ یوں تو یہ کوئی ہاشل ہے نہ دارالامان، تمدن سے اس کا نکاح ہو جائے تو لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔ اسے عزت مل جائے گی۔ بندے کا نام مل جائے گا۔ ابھی یہ ہے کیا؟“

”چھپو!“ ترانہ از حد تاسف سے بولی تھی۔ ”یہ ایک مکمل ذات ہے، اگر اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں یا ماں کی نرم گود اسے میسر نہیں تو اس سے اس کی ذات ادھوری نہیں ہو جاتی۔ یہ ایک وجود ہے، کھوس حقیقت۔ اس کو جو کچھ مل رہا ہے یہ اس کی پائی پائی کا حساب چکا رہی ہے۔ جسمانی، روحانی، ذہنی، تنہا۔ ہر طرح سے قیمت ادا کر رہی ہے یہ اس عظیم احسان کی جو اس کو یہاں رکھ کر کر رہے ہیں۔ اور کن لوگوں کی زبانوں کی فکر ہے آپ

”تو تم بچ لو نا،“ وہ مسکرائیں۔ ”لوگ کہاں اپنے دل کی باتیں اپنی سیلیلوں سے ہی کرتی ہیں۔ اور اسے عرصے سے تم دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کہتی آ رہی ہو۔ جانتی ہو ایک دوسرے کو کبھی سمجھتی ہوں؟“ ایک دو اس موضوع پر کھل کر باتیں میں گفتگو کر لو۔ تمہارے بھائی اور آپ کی طرف سے اپنی سیلیلوں کو قائل کرنے کی شش کرو۔ جملہ گونجی ایسی باتیں ممکن بات ہے؟ ہر کوئی جبراً ”گو نکاح نہیں“ دعووں میں ہے۔ ”ٹھیک ہے۔“ ترجمان بولی ”مگر تمہاری بات“ پھر میں آپ کو اس کا جواب بتا دوں گی۔“ ”ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر مر لایا۔

جاتے جاتے درپردہ کے سر پر دست شفقت پھیر کر گھٹی تھیں۔

[illegible][illegible]

”نہایت سے“ اس نے ذر کہلوں پر زبان پھیری۔
 ”مگر کچھ تو؟“ وروہ نے اسے بری طرح سے ٹھوڑا۔
 ”اے! سو تو کتنی کے دوسرے دن کیا بات ہے۔“ وہ منہائی۔ ”ہم تو ممکن ہی پر کوشش کر رہے تھے۔ میں نے تو
 کچھ بھی نہیں کیا تھا، شاید یہ بھی کچھ کہ عرش کا ممکن ہی کے دن رویہ نارمل نہیں تھا۔“
 ”ہاں۔۔۔“ وہ ہڑبائی۔ ”یہ تو کوئی دھکی چھپی بات نہیں۔ سب ہی نے محسوس کر لیا تھا، لیکن زیادہ تر افراد
 نے اسے تسلیم نہ ہی کیا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ عرش سر پھر ہی لڑی ہے، ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن
 اتنے دن بعد بھی وہ نارمل نہیں ہوئی،“ تب یہ فکر کیا بات ہے۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ اگر اسے باغ پسند نہ تھا تو
 اسے ایسی ہی نہیں بھرنے چاہیے تھی۔“

کو؟ یہ سنے والے؟ چند ایک دور دراز کے رشتے دار جو محض کسی کے مرنے پر مشکل پر سر دیئے پہنچتے ہیں۔ اگر ان ہی لوگوں کی بات کرنی ہیں تو آپ کی یادداشت بہت کمزور ہے۔ سچ بھولا! ان ہی لوگوں نے صولت کے بھی۔۔۔“

[illegible]

”جھگڑے سے کیا بچت کر رہی ہو کم“ وہ دانت چٹکیا کر پوچھ لیں۔ ”اپنے بھائی سے کیوں نہیں پوچھ لیں جا کر جو تباہ ہو رہا ہے۔ پھر اپنے باپ سے پوچھو جس نے اس لڑکی کو برباد بنانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ یہاں رہتے جیسے تو سونے کے انڈے نہیں دیتے۔“

”ضرور ہو بیچوں کی۔“ ترزا پتھر کو بولی ”رہی کہ مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔“ ترزا سیر لاپا جھائی بے تاب
 ”یا یہ۔ یہ ایک جیسی جاکتی ماس لیکن باخوش لڑی ہے۔ اور یہ بڑے دور کا گڑبہ۔“
 ”تھیک ہے۔“ عینا مٹا قدرے سہولت کے بولیں۔ ”لے لے تم رہی کہ مرضی تو ہو لوں گا کبھی جسے اسے
 رشتے پر اعتراض نہ ہو۔ تمہیں میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔“ ترزا نے پتھر سے چھانٹا تو اس کے مزان جوتھ کے بھر کیلے ہوئے تھے ہی چڑ
 شادی کے بعد سہی ہو بیٹے پر جاتے ہیں۔ بیوی کی ماس لگتے ہیں۔ ”تم مرنے لگیں۔“

”پھر یہی بات اور ہو کہ ہم سب رومیہ کے لٹنا پیا کر رہے تھے۔ یہ تو ہم سب کی ضرورت تھی۔ تمہارے ابو تو اس کے بغیر کھانا کھاتے ہیں نہ دولتی ہیں۔ تم سے اور صولت سے اس کی بہنوں جیسی وہ ہے۔ تمدن تو قیاس کے گن گنا ہی ہے۔ تصور بھی برے نہ کوئی ہے اس سے۔ بھرا ہوا ہے اس کی ہونٹ تو ہم پر کھر کھیں اور برائی ان جانی لڑکی بیاہ کر اپنے گھر لا کر تو یہ تو کھیں بے وقوفی ہی ہوگی نا! اچانک سے آنے دولتی کیسی ہو لول سے اس کا ہر ماؤ کیا ہو۔ رومیہ تو ہم میں بالکل کھل گئی ہے۔ خون اپنا تو جو محبت کی خوشبو تو محسوس ہوئی ہے نا! ایشیائی تو ہم نے رومیہ کی بھی کرنا ہے اور تمدن کی بھی۔ پھر کیوں نہ رہے تو لڑکی جو مزید سے بخود کہا جائے گی! آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

ان کے لیے میں اصرار تھا۔ ترانہ اب کسی سوچ میں گم تھی۔ مینا بیگم نے سر ہٹا کر بیٹھی رعبیہ کو ایک نظر اٹھا پھر ترانہ کے آغوش جانے کی کوشش کی۔

”ہم اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ اچھا! جو کہ بھی ہو، اس کی خوشی کے مطابق ہونا چاہیے۔“
 اپنی مرضی سے، بنا کوئی نارشتہ توڑے بھی رہنا چاہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اور اگر اس کی سوچ میں تبدیلی
 نہ تو یہ بھی اس کی مرضی ہوگی۔“

”بے چارہ نافع!“ ناعمہ نے تأسف سے سر ہلایا۔ ”بچھن گیارہی طرح ہے۔“
 ”بس، فضول ہی بولنا تم۔ مجھے تو تمہارا ہی خوف رہتا ہے ہر وقت کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بدیتی ہو اور پھر اڑا
 کیو بائیں سنناڑتی ہیں۔“ وردہ نے اسے فوراً ڈانٹا۔

”رائہ آئی کی شادی پتا نہیں کیوں پہلے کردی امی نے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”تپ کی کردیتیں تو میری از
 پیشینوں سے جان چھوٹی۔ بہن سمجھ کر میں اپنے دل کی باتیں کرتی ہوں، آپ فوراً ڈانٹنا شروع کر دیتی ہیں۔
 رائہ آئی اتنی دیکھی سے میری باتیں سنتی ہیں۔ خوب ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور اگر میں کوئی نئی نازی نہ سناؤں
 ان کا تودن ہی بے کار جاتا ہے۔“
 وردہ کو بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

”میں تمہارا اپنی بدھوین اسکو اڑا ہوں، اس لیے۔“ اس نے خفا بیٹھی ناعمہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔
 ”سمجھتی تو کچھ ہو نہیں سوجھتا تمہیں ویسے ہی نہیں آتا۔ بی جملو بی پھرتی ہو اور اپنی اس ڈیوٹی پر بہت خوش
 رہتی ہو۔“

”اچھا۔ تو محترمہ عقل کل صاحبہ! ذرا سی روشنی بھیکے اپنی عقل کے پینار سے اور بتائیے کہ میں نے کون سے
 بدھوین کا مظاہرہ کیا ہے۔ عریضہ نافع بچے منگنی کر کے خوش نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کیوں فکر
 زباں بندی اس قدر شدت سے کر رہا ہے۔“
 وردہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

”جانی ہونا اس گھر کے بزرگوں کو گھر کے رشتے گھر ہی میں ہوڑنے کا کتنا کر بڑ ہے۔ لڑکوں کے خاندان سے باہر
 جانے کا قصور ہی ان کے لیے کتنا روح فرسا ہے۔ شاہم بھائی بے چارے ابھی تک سخت تنقید کی زو میں ہیں۔ اسی
 حساب سے لڑکیوں کی باتیں بھی یہی کچھ ہے جتنی ہیں۔ نافع کے لیے عریضہ کو تمہارا دونوں نام زیر غور رہے ہیں پھر
 بزرگوں نے فیصلہ عریضہ کے لیے ستایا۔ کیونکہ۔“ وہ کہتے کہتے منجھی کے کوچہ تم جانتی ہو۔ اب اگر تمہارے
 منہ سے یہ پرو بیگندہ کسی نے سن لیا کہ عریضہ اس رشتے سے ناخوش ہے تو جانتی ہو اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلے گا؟ سب
 یہ کہیں گے کہ تم جلد میں سے نکال دو۔“

”ہائے اللہ! وہ خطی سے اسے دیکھنے لگی۔“ ”مجھے کیا جبر علی میں جواب شکرانے کے نقل پڑھوں گی۔“
 وردہ کو ہنسی آگئی۔ ”کیوں یہ نافع اتنا برا تو نہیں ہے بے چارے۔ تم لڑکیاں اتنا بدک کیوں رہی ہو۔ خوب
 صورت، خوب سیرت، سلجھا ہوا لڑکا ہے۔“

”بھئی مجھے خاندان میں شادی کرنے کا قضا“ شوق نہیں ہے۔“ اس نے ناک سکڑی۔ ”بچپن سے جنہر
 دیکھتے آ رہے ہیں، انہیں بڑھاپے تک برداشت کیے جاؤ کوئی سزا ہے یہ ہماری؟“

”یہ آئینہ فلزم ہی تو مار رہا ہے اس دور کی لڑکیوں کو۔“ وردہ کو غصہ آیا۔ ”میڈیا نے اور غضب ڈھایا ہے
 لڑکیاں خود کو جانے کون سی مخلوق تصور کرنے لگی ہیں۔ ناک کے نیچے کوئی ساتا ہی نہیں، بی وی اسکرین توڑتا ہو
 کوئی ہیروز زندگی میں آگھے اور ہاتھ پکڑ کر واپس فلمی دنیا میں لے جائے جہاں ڈوٹ سا نگر ہوں اور عشقیہ ڈانٹا لگا
 یہی چاہتی ہونا تم لوگ؟“
 ناعمہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”اب سب آپ کی طرح تو نہیں ہوتیں، اللہ میاں کی بکری۔“ وردہ کو غصے کے باوجود ہنسی آئی۔

”یہ مثال کو کیا ہوا؟“

”اب آپ کو گائے تو کہنے سے رہی۔ بائیس انچ کی کر ہے۔ آپ کے لیے یہی مثال مناسب ہے۔“

”اور جو کچھ میں نے عرض کیا تو دیر میں وہ چلے پڑا آپ کے؟“ اس نے تسبیہی انداز میں پوچھا اس نے معصومیت سے سر ہلایا۔

”میں پوچھتی ہوں اب کتنے دن سوگ مناؤ گی اپنی مری ہوئی ماں کا؟“ فردوس بیگم کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔
 وہ فن کر گئی اس کے سر پر آگھڑی ہوئیں۔ ”کیسی فتنہ لڑکیاں۔“ تو یہ تو سب لوگ یونی تو نہیں زندہ کاڑھتے
 جتنے خبر ہو کر بولی انہیں کہ جوان ہو کر مند کو آئیں گی یا بشت بشت بھر کی چھو کر یاں۔ سرواں میں خاک ڈالیں
 گی۔“

عریشہ ماں کے تورو کیہ کر اندر سے سہم گئی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک ہفتہ سے وہ نہ دھنکے
 کھائی تھی کبھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ منہ دھونا بال نہ مٹا نہ کپڑے بدلنا سب ہی چھوڑ رکھا تھا۔ گلابی رنگ
 پہلی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ طعنے لگے تھے۔

فردوس بیگم جیسے چچو توباب کھائی وہیں پھر اس کی صورت دیکھ کر نظریں چراتے ہوئے بڑبڑاتے تھیں۔
 ”بھراؤر حوصلہ تو ہوا ہی نہیں لڑکیوں میں۔“ ناگھڑی سی ناگھڑی ارے ایسا کون ہے چاؤ تو زوریا ہم نے
 تمہارے سر پر۔“ مٹی کی گدی ایک دیکھے بھالے بچے سے۔ وہ بھی کڑو محبت سے کہ بچی کو لاؤں گے۔
 پالا ہے، میں اور بچے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ ہماری بچی ہماری کھانے سے کئی۔ ہماری آنکھیں اور کچھ
 فٹھڑا رہے گا لیکن بچی نے تو ہانا اندھیرا والا۔ اونی کھائی ہے بڑی سے سو پڑی ہے اب ہمیں چاؤ ہم کہتے
 کریں؟ تاکہ رگڑیں؟ پیریزیں تمہارے؟ اپنے سر پر جو تاریں؟ گماں کریں جو خوش ہو جاؤ؟“

”ہمت خیال رکھا آپ نے میری خوشی کا۔“ شکر۔ ”وہ بھرا ہوا تو اواز میں بولی۔“ اب مزید میں کیا چاہوں
 گی؟ اپنی آنکھیں، اپنا کلیجہ فٹھڑا کرنے کا سوچا تھا میرے سر کا۔ حال ہی میں تو سب سے شکریہ
 ہیں اور بیش سلیکٹی۔ میرے قصور کی دنیا میں لگ لگ گئی ہے۔ اب جتنے کسی سے کیا؟ آپ خوش ہو گئیں۔

آپ کو مبارک ہو اب میرا خیال نہ کریں۔“
 ”کیسے نہ کریں خیال؟ تمہارا خیال نہ کریں اپنی عزت کا تو کریں گے بات پہلے کی تو ہماری رسوائی ہوگی۔
 تمہارا خیال کیا جائے گا۔ تم وہ بیرونی بی کو نہ میں پر ہی ہوگی۔ لوگوں کو تو یہ نہ ہو کہ میں نے
 کا سارے بچے ہماری لڑکی پر؟ اورے بیٹا! چھوڑو یہ ڈارے۔ ماں باپ کی عزت کا تو بچہ لحاظ کرے۔ اورے نہیں کہل گئی تو
 منع کر دیں باپ کو۔ اب ہو گئی تو بھگت لو۔“ وہ بیرونی ہوئی گھر سے نکل گئی تھیں۔ عریشہ بیٹھی ہوئی چٹائی
 رہی۔

اتنا جلدی کیسے بھول جاتی۔ دل کی زبا بیٹے سے پہلے ہی اجاڑی گئی تھی۔ ابھی تو آنکھوں نے خوش رنگ بنے
 بننے کا تقاضا کیا تھا۔ ابھی تو دھڑکنوں نے نئی تل پر دھڑکن شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی
 وقت کی گزرا تھا۔ پینا مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے چھوڑ کر جگا رہا تھا اور اب حواس بھال نہ ہونے کی
 شکایت بھی کی جا رہی تھی اس میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ کتنی کے رنگ اس کی آنکھوں پر نہ تھے۔ ان رنگوں کو مٹنے
 کے لیے کچھ عرصہ درکار تھا۔

ماں باپ بھی کبھی کبھی تنہا سے مروت ہو جاتے ہیں۔ جس اولاد کی خوشی کا لمحہ خیال کر کے اسے پروان
 چڑھاتے ہیں بیٹے شروع سے احساس دلاتے ہیں کہ تمہاری خوشی ہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اسی اولاد کی رگ جاں
 سے سب سے خوش کن احساس کو نوچ کر پلیدہ کر ڈالتے ہیں۔ زندگی بھر چھوٹی چھوٹی خوشیاں ذخیرہ کرتے رہتے ہیں

اور جہاں زندگی کی سب سے بڑی خوشی کا معاملہ آتا ہے وہاں مذکورہ جاتے ہیں۔ زبان کے سسکے کھڑے ہوتے
 ہیں، غرتوں کی بات ہوتی ہے۔ خاندان سے تعلق یاد آتا ہے اور جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اسے
 بھول جاتے ہیں۔

زبان۔ ہر شے سے بڑھ کر اور دل؟
 عزت۔ ہر شے سے زیادہ اہم اور جڑ ہے؟
 خاندان۔ وجود کی بنیاد اور دل؟

دل، جذبات، روح، جاسے رہ جائیں۔ زبان، عزت، خاندان، خون، ٹکڑے اپنے ہونے کا خزانہ تھیں۔
 دل کی ناقابل برداشت اذیت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئیں تو یہ لایٹنگ قرار پائے۔ ذرا مومن میں، فلموں
 میں، انصوں میں، گناہوں میں، انسانوں میں کیا کچھ بھیج جاتی ہیں؟ آنسو کب جھوٹ بولتے ہیں؟ زبان، جھوٹ
 بول سکتی ہے لیکن آنسو پیش کیے نہیں۔

عریشہ جتنا سوچتی، اتنا اچھی تھی۔ اسے بھولا جاتا تھی لیکن وہ آواز خوابوں میں بھی اسے ستاتی تھی۔ وہ
 جتنے سوچے تھے جاتی، مگر اب بھی کاہر باہتہ نہ آتا۔ اسے کیسے فراموش کرے نئی زندگی کی ابتدا کیسے کرے،
 نیا کوئی کام کر سبھالے؟ اس وقت جذباتیت، شوریدہ سری اور غم غصے کا شدید غلبہ تھا۔ وہ کچھ فیصلہ کرنے کے
 قابل نہ تھی۔

”اوشر تہ ناہوں؟“ منیہ وہ بیگم نے انیفہ کو محبت سے دیکھا۔
 ”کون سے؟“ اوشر اور بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ شوخا تار کر لاؤ بیچ میں ہی عمو نے گداز پرن کا لطف
 اٹھا رہی تھی۔ پتہ نہیں کی رفتار سے چل رہا تھا۔
 ”آپ نے نہیں دیکھا؟“ اس نے سراٹھایا۔ ”میں خود یکن میں آئی ہوں، بھوک لگی ہے۔“

”کیا؟“ اس نے شملہ کی بابت استفسار کیا۔
 ”آج بہت محنت رہی۔“ اوشر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں چل رہی ہے۔“
 ”تو کونسی؟“ اس نے پوچھا۔ ”پتہ نہیں چل رہی ہے۔“ اوشر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں چل رہی ہے۔“
 ”کیا؟“ اس نے شملہ کی بابت استفسار کیا۔

”وہ تو جوانی کے آگے تھی۔ دونوں ماں بیٹا سو رہے ہیں۔“ وہ بتاتے ہوئے چکن کی طرف بڑھ گئیں۔
 سالن کا ڈانگا ناٹیکر دیو اوشن میں رکھ کر وہ تازہ روٹیاں پکائے لگیں۔ انیفہ سے پیچھے سے انکار کی گردن میں
 لاؤ سے باوجود حائل کر دیے۔

”مارواں لگی رہتی ہیں، ہم سب مل کر کتنا ستاتے ہیں آپ کو۔“ وہ ان کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔
 ”اس کا کام یہی ہے۔“ اوشر لگی۔ ”مجھے بیمار پڑ جائوں تو خدمت بھی تو تم لوگوں کو کرنا ہے۔ ماں کی زندگی
 اپنی اولاد کے لیے ہی ایک ہوتی ہے اور اولاد کی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔“

”پھر بھی کیسے؟“ اوشر نے پوچھا۔ ”مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوگ بہت تنگ کرتے ہیں آپ کو۔“
 ”پاکل لڑکی۔“ وہ سن دیں۔ ”چلو میز پر سالن رکھو، اور کھانا شروع کر دو۔ باتوں میں ہی تمہنے سب کچھ سننا
 کر دیتا ہے۔“

”بوسے لاؤ ہو رہے ہیں بھی“ شملہ کی آواز پر دو دونوں مڑی تھیں۔
وہ بولیں۔ ”سکرا ہٹ لیے بچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ آج کل یہ ہر وقت مسکراتی نظر آتی تھی۔

”جی ہاں!“ انھیں مزے سے بولی۔ ”ای اب پوری طرح سے میرے تصرف میں آئے والی ہیں۔ عبادی اللہ لاہور میں اور آپ سرال میں۔ میں اور ای خوب جی بھر کر باتیں کیا کریں گے“
”باتیں تو میں اب اپنی بوسے کروں گی، تمہیں تو میں پڑھائی مکمل ہوتے ہی بنیادوں کی۔“ انہوں نے ہات پات تیز رکھ کر ہنسنے سے کہا

”ای! انھیں نے احتجاج کیا۔“ ناٹ فخر ایچھے کچھ تو لطف اٹھانے دیں، آپ کے پورے پورے پیار کا۔“
شملہ بھی گھٹکے لطف اندوز ہوتے ہوئے تیز پر بیٹھی تھی۔
”بھئی تم کیسے لطف اٹھا سکتی ہو۔“ وہ بولیں۔ ”میرا نواسا جو ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے، وہ کہاں تمہیں لاؤ کرتے دیتا ہے۔“

شملہ ان کا مطلب سمجھتی تھی مگر مدد منجیدہ ہو گئی۔
”شملہ!“ منیندو بیگم نے اب اسے مخاطب کیا۔ ”بیٹا! وہ لوگ کل شام آ رہے ہیں ان کا نام منیندو بیگم ہے کل تمہارا آف ڈے ہے تا اس لیے میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ بولیں کہ تمہیں کیا کام مناسب نہیں ہے میں اب دن نو ٹیگنل بل کر رہی ہوں۔ کبہ مبارک کھڑی ہو کر اور میں تمہیں کچھ دیکھوں گے۔“
”ای!“ وہ پچھو پچھو بول رہی تھی۔ ”میں عمر کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“
منیندو بیگم نے پچھو پچھو سوچا پھر مسکرا دیں۔

”شرعیہ میں تو مناسب معلوم نہیں ہو تا بنی اب اہم میاں شاہد اللہ سلجھے ہوئے، نیک طبیعت آدمی ہیں پھر بھی ان کے بھی جذبات و احساسات کا خیال نہیں کرنا ہو گا نا۔ ہاں چند روز بعد جب زندگی کی گاڑی ایک منظر طے کرے راستے پر چل نکلے تو آہستہ آہستہ اس گھر میں عمر کی جگہ سیدہ مولیٰ بیگم کی عمر کا یہی منظر خیال فرمائیں گی جیسا تم خیال کرتی ہو۔ میں اس کی ماں نہیں ہوں، منجھے اس کی نانی نہ۔ محبوب، بیشبہ سے وہ تم سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارا ہے۔“

شملہ کی پکوں پر نمی تھکنے لگی تھی۔
”میں اس کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟ ساری رات بیچھے اس کا حین خواب۔ وہ دھوکہ لگاؤ میرے بغیر ہی صورت نہیں رہتا۔“

”بہل جائے گا پچھلے تم کوں سا معلول دور جاری ہو، دن میں دو بار آسکتی ہو اسے دیکھنے۔“
”میں زیادہ دن اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بس ہفتہ بھر میں لے جاؤں گی اسے۔“

”بھئی!“ منیندو بیگم مسکرائیں۔ ”میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟۔“
”آپ کا اعتبار نہ ہو تا تو مجھے ہائی نہ بھرنی۔“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔
”چھاپہ بتاؤ! اگلے چاند کی تاریخ تمہارا؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔
”جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے سر جھک کر کہا۔ ”اس راہ پر چلتا ہی ہے تو سوچتا کیا؟“
انھیں غور اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی تھی۔

”تو پھر ملے ہے ہن!“ اگلے چاند کی بوس تارین؟“ شفیقہ حیات نے مسکرا کر پوچھا تھا۔
”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ منیندو بیگم کے روم دوم سے صہرت کی لہر نکل رہی تھیں۔
”جلیے پھر تم بیٹھا کرتے ہیں۔“ انھیں نے ڈانٹنگ ٹینل کی جانب اشارہ کیا، جمال ہاس نے بے حد پر تکلف قسم کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

سی گرین کمر کے کڑھائی والے لباس میں شملہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ سر پر آئینل لپے، نگاہیں جھکائے وہ خالصتاً ”سٹریٹ لوکیوں کے انداز میں بیٹھی کا روئی ملا خطہ کر رہی تھیں۔ وہ وہاں آئے سے بھی گریزاں تھی اور اپنے کمرے میں ہی بیٹھنے پر مصر تھی ٹینل ایقان اور انھیں ماسے کچلا لاتی تھیں۔
ایقان چند گھنٹوں میں ہی اپنی بیٹی بھر کر اس کے قریب آئی بیٹھی تھی اور اب بے حد شوق سے ایک رو کر کھا رہی تھی۔ شملہ کے لبوں پر مسکراہٹ دو گئی۔ ”مگر بڑے رنگ کے لباس میں بے حد بھرے بھرے گداؤں کی ہم کی مالک“
روشن و شاداب چیز لے کر دست خوبصورت لگ رہی تھی۔ شملہ چند لمے اس پر سے نظر نہ ہٹا سکی۔

”وہ بھی کھاؤ نا۔“ ایقان اس کی توجہ محسوس کر کے بولی۔ ”ہم کی کیسی تنجک، ہم تو سب تمہارے جانے پہچانے کے بھائے ہیں۔ یہ وہاں اب جاسن میرے ہاتھ سے کھاؤ۔“
”ای!“ بیٹی میں کچھ کھا جاؤں گا جاسن! اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھوس دیا۔ بیشتر حاضرین محفل مسکرانے لگے۔
”تمہارے خفتے سے آگے دیکھتے ہوئے نشوونے صاف کیا۔“

”تم ایقان کی بیٹی۔“ وہ بولی تھی۔ ”سندھو کی نہیں۔“
”جگہ میرے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔“ ایقان ہنسی۔
اس کی مجلس میں صہرت تھی۔ شملہ اسے پھر سے غور دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ دوا قیست باری لگ رہی تھی۔
وہ غالباً ہم شے سے انصاف کرنے کا تہہ کیے ہوئے تھی۔
”کچھ روز بعد میرے گھر میں؟“ ایقان نے شرار مارا۔ ”پوچھا۔“
شملہ بیٹھیں۔

ایقان اپنی بیٹی مزید کرنے سے روکے۔ ”بھئی تو فردوس بیگم وہاں آئیں گیں پھر انہوں نے غور سے شملہ کی بات دیکھی تو دم کی۔ جان بٹاؤ! بولیں کر کر کے کیسی دہلی ہو رہی ہو۔“
شملہ اس کی خاموش ہو گئی۔
”اب ابھی بھئی تو کوری تو تم پچھو تو گئی نہیں۔ نہ ہی تم کوئی زور زبردستی کریں گے، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ کمانا چاہتی ہو تو شوق سے کماؤں کین چھپائیں لے لینا، ماہو، دای۔ آخر ہمارے بھی تو بچہ ارمان ہیں۔ پہلا پسلا لو کا ہے تمہارا۔ کچھ تو شوق پورے کر لیں۔“

انہوں نے حسرت سے سانس بھری تھی۔ شملہ خفیف سی ہو گئی۔
”فوس۔“ وہ بے وجہی کھنکھار دی۔ ”موریشہ نہیں آئی؟“
”اسے ہاں۔“ آج کل کی لڑکیاں اپنی مرضی کی مالک، ہم نے تو ہتیرا کما، ہن نے سمجھایا۔ وہ منہ لپیٹے پڑی رہیں بے چاری کی طبیعت خراب ہے کافی دن سے۔“
”خیر تو ہے۔“ شملہ بولی۔ ”کہا ہوا ہے؟ آپ نے آئیں تو میں پیک اپ کر لیتی۔“
”ارے نہیں۔“ وہ مزید گھبرا سیں۔ ”میں کوئی خاص بات نہیں، سرور دی شکایت کرتی ہے۔ میں نے کہا نظر پیک کرالو۔“

انہوں نے جلدی سے بات سنبھالی پھر موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہر کہاں ہے؟“

ربیعہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

”تم۔ عباد کو چاہتی ہو؟“ ترانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں تجر تھا۔

”ترانہ! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے بالآخر لب کھولے اور گلے میں گھلتی نمی کو محسوس کیا۔ ”میں

بس اتنا جانتی ہوں کہ میں مردوں سے الگ ہوں۔ کیوں؟ کب؟ کیسے۔۔۔ ان سوالوں کے جواب نہیں ہیں میرے

پاس۔ بس میں شادی نہیں کر سکتی۔ میں یہاں اس گھر میں ساری عمر بتانے کو تیار ہوں ترانہ! میں۔۔۔ میں پیچھا

جان کی خدمت کروں گی۔۔۔ جب تک ان کی یا میری زندگی ہے، میں تمدن بھائی اور تصور بھائی کی شادیوں کے گیت

گاؤں گی، ان کی دہانوں کے چاؤ اٹھاؤں گی۔۔۔ پیچھو کے لیے صولت بن جاؤں گی لیکن پلیر ترانہ! مجھ سے شادی

کے لیے اصرار نہ کرو۔ مجھے اس سے بچاؤ ورنہ۔۔۔ ورنہ شاید میں مراؤں گی۔“

وہ سسکا اٹھی۔ ترانہ اس کی پشت سے ہلانے لگی۔

”پگلی۔۔۔ میں تو نجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ مجھے لگتا ہے ربیعہ! تمہاری زندگی میں کچھ ایسے حادثات گزرے ہیں

جنہوں نے تمہیں مردوں سے متنفر کر دیا ہے، ورنہ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم اس قدر گہرائی سے ان معاملات کا

تجزیہ کر سکو۔“

”کچھ بھی سمجھ لو۔“ ربیعہ گلو کیسے میں بولی۔ ”تم تمدن بھائی کو سمجھاؤ ترانہ! انہیں بہت اچھی لڑکی مل سکتی

”تم بھی تو بڑا اچھی ہو ربیعہ!“ ترانہ نے محبت سے کہا۔

ربیعہ چونک کر ترانہ کی جانب دیکھنے لگی۔ گویا اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”دیکھو ربیعہ! اگر بات یہ ہوتی کہ تم تمدن بھائی کو ناپسند کرتی ہو، میں کسی کو بھی تم سے زبردستی نہ کرنے دیتی یا

اگر تم کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہو، میں آتش بند ہو جیتی جیسا کہ عباد سے۔۔۔ تب بھی ایک ٹھوس وجہ بنتی

لیکن محض اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ تم شادی نہیں کرو گی۔ یہ بات اسے نہ ملے گی۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ

قدم اٹھانا ہی ہو گا تو پھر آج ہی کیوں نہیں اوسے اور اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی چیز نہ ہو تو کیوں تیار نہیں ہے تو

پچھو۔“

وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اب کی بار سراٹھا کر اسے نہ دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ترانہ کا مطلب کیا

ہے۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے ہاتھ تھام کر خوشامد سے بولی۔ ”ربیعہ! تم اس گھر کو سنبھال سکتی ہو، سنوار سکتی ہو۔

تمہاری ”ہاں“ اس گھر کا مقدر بدل ڈالے گی، مجھے یقین ہے۔“

ربیعہ کے اندر آنسو گرنے لگے۔ طوفانی ہوائیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کا دل شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا

لیکن وہ ساکت بیٹھی رہی۔

”پیچھو نے حقیقتاً“ میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نظر آنے لگا کہ اس گھر کی خوشیاں صرف تمہارے وجود

سے وابستہ ہیں۔ یہاں چاہتوں کے گل و گلزار محض تم کھلا سکتی ہو۔ اتنی محبت، اتنی طاقت میں نے تم میں پائی ہے

ربیعہ! تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو۔ اس گھر کے معمولی افراد کو اپنا کر غیر معمولی کر سکتی ہو۔ میں جانتی ہوں ربیعہ! میں

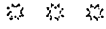
بہت زیادہ طلب کر رہی ہوں لیکن محض تمہارے اندر موجزن بھلائی کے سمندر کے سہارے میری اتنی ہمت

ہو پائی ہے۔“

ربیعہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ترانہ دونوں ہاتھوں سے اور نہایت شدت سے اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اس سے

سے بچرتے ہوئے باہل اپنا رنگ تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے پھر اس کی نگاہ سامنے سے آتی مشلا پڑی۔ اس کے ساتھ آجھٹا کو آتے چلا آ رہا تھا۔
 ”اسلام علیکم اکل!“ وہ اس کے قریب آکر بٹھکر رہا۔
 سفید شرت اور گلابی نیکر میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہاشم نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے جھک کر اسے پیار کیا پھر سیدھا ہو کر مشلا پر ایک نظر ڈالی۔
 لائسنس پبل سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔
 ”کیسی ہیں آپ؟“ ہاشم کی آنکھوں نے شام کے سب سے ہی رنگ چرا لیے۔
 مشلا کو ان نظروں سے نظر نہ آتا تھا۔
 ”جی میں ٹھیک ہوں، شکر ہے اللہ کا۔“
 ”آئیے اور بیٹھتے ہیں۔“ ہاشم نے سنی بیٹھنے کی جانب اشارہ کیا۔
 عمر قد سے ذیل سے پھیلے ہوئے بچوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں بیٹھ کر آہستہ سے مشلا کے سر پر سنجیدگی کا چھاپ لگے۔
 ”وہی بانڈاز سے ظالم کاربائے والا۔“ ہاشم نے ہماری سانس مچھڑا دیا۔
 ”مجھے کچھ کہنا تھا۔“ مشلا اور بھائی نے سر اٹھاتے ہوئے بولی۔
 ”میں ہمدن گوش ہوں۔“ اس نے بازو دینے پر باندھ لیا۔
 ”آپ کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہیں کہ میں عمر کوئی نہیں پاس پچھو ڈینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ اس نے سر جھکا کر ہونے بات کا آغاز کیا۔
 ”حالا نکہ میں نے بطور خاص آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ اس سلسلے میں سر کی غلط فہمیاں اور کر دیتے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے کسی سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا۔“ وہ پچھو دینے کے لیے خاموش ہوئی ہاشم اس کی بات ختم ہو جانے کا منتظر تھا۔
 ”ہاشم صاحب! اتنا طے ہے کہ میں سب کچھ پچھو ملکی ہوں، بس اسے حرکت میں لے کر آپ تک زندگی میں صرف ایک خوش بانی ہے اور میں آخری سانس تک اسے خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔ میں عمر کے بغیر آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔“
 ہاشم نے اس کے سب سے سر پر ہر لگا دی۔
 ”آپ۔“ صرف اپنے جذبات کی پروا کرتی ہیں مشلا! وہ ہاشم سے بولا۔
 ”میں مارچن تو نے دیکھ کر سن لیا۔ جذبہ ہمدردی کے تحت ہی سی۔“
 مشلا نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیں کہ میں کیا چاہتا ہوں کیا سوچتا ہوں، میری تمنا کے دائرے میں کیا کچھ آتا ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ عمر کے لیے میں وہی سوچتا ہوں جیسا آپ اس کے لیے سوچتی ہیں۔ کیا یہ الفاظ آپ کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہیں۔“
 ”نہیں۔“ وہ بے صبری سے بولی۔
 ہاشم اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
 ”مشلا پلے آجھٹے اتنا تو تمہیں بتا رہی نظر آتا ہوں۔ اندر اترنے کی بات تو علیحدہ ہے اس کا تو میں آپ سے تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ شاید بخانا ہو گیا تھا۔
 مشلا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔

”سوری۔ سوری ہاشم صاحب!“ پچھو بولی۔ ”میں شاید کچھ نا انصافی کر گئی آپ کے ساتھ۔“
 ”کوئی کمی بات ہے؟“
 مشلا بٹھ کر رہی۔ ہاشم نے چند لمحوں کی شرمندگی کا ماحظ کی پھر مسکرایا۔
 ”آپ کی بہتی جیسی مشلا میں آپ کے ایسے وجود کو حاصل کرنا چاہتا ہوں جس میں ”دل“ نہ ہو، نہ یاد دہی کے جسم کی کڑا کرکشن، نہ سستی ہے میرے لیے ”خود“ اور ”جسم“ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں دل اور روح کے رشتے کا قائل ہوں اور میں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک ماں کے لیے اس کی اولاد اس کا ”دل“ بھی ہوئی ہے اور ”روح“ بھی۔ آپ عمر کے ساتھ آئیں گی تو آپ میں زندگی ہوگی، روح ہوگی، دل ہوگا۔ عمر کے بغیر تو میں نہ آپ کی پاپا سکوں گانہ خود کو۔“
 اس کے الفاظ ٹوٹ سے گئے تھے۔
 ”وہی سوری ہاشم! مشلا کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ ”میں نے آپ کے جذبات کو نہیں پہچانی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“
 ”اتنا ضرور ہے مشلا! کہ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں اس موضوع پر کسی سے اس لیے بات نہ کی۔ میں اتنے اہم موضوع پر نا انصافی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں ایک مرتبہ ہم سب کو اپنی خوشیوں میں شریک کر کے اپنے بندھن کا گواہ بنیں پھر زندگی ہماری ہوگی۔ فیصلے بھی ہمارے ہوں گے۔ جذباتیت کے جو مظاہر بھی وقت ہو سکتے ہیں، تب ان کا اظہار فضول اور بے مصرف ہو گا۔ لہذا ہمارے ارد گرد کے لوگ ان پر اپنا وقت نہ خرچ کریں گے کیا خیال ہے؟“
 مشلا مسکرائی۔ ہاشم کی نگاہ نے جو رنگ جانی ہوئی شام کے آجیل سے چرائے تھے وہ مشلا کی مسکراہٹ کو دیکھ کر دے۔



”میں نہیں بدلتی تو روز تو کرا کر رہا ہوں۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ میں تو روزانہ اپنے فریڈز کو آپ کی باتیں جانتا ہوں۔ سب سے پہلے میں نے فون نہیں کیا“ مجھے گھمانے کے لیے بھی نہیں ملے گئے۔“
 ”ضرور لے کر جائے گی۔“ یار لائپ کو اپنے جان جگر ہو۔ بس آپ کے پیلا تھوڑے مصروف ہو گئے تھے۔
 ”ان باتیں مجھے اپنے تھوڑے سے ملنے آتے ہیں۔“
 ”ایسا! میں سب باتوں کا اور میوزک بھی اور سمندر دیکھنے بھی جائیں گے۔ آپ مجھے بہت سارے ٹواٹز لے کر دیتے تھے گا اور۔“ جاکلیٹس۔“ عمر نے ساری فرمائشیں دہرا دیں۔
 ”آئی پراس مالنی سن! ابو آپ کو گے لیا لے کر دیں گے۔“
 ”نیک بویا! امیر آپ کو کس (Kiss) کرنے کو بل چاہ رہا ہے۔“
 ”ہاہاہاہ! اس نے قہقہہ لگایا۔ ”سو نا کس آف یو وار لنگ۔“ سمجھو یا آپ کی کس (Kiss) مل گئی ہے۔“
 ”پھر ہم کس چٹیں گے لیا؟“
 ”سنڈے کو۔ ٹھیک ہے؟“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا تھا۔
 ”آپ کی تمنا کہاں ہیں؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔
 ”ہامپٹل۔“ وہ مختصراً بولا۔
 ”اچھا۔“ وہ مختصراً انداز میں بولا۔ ”مما سے میری باتیں کرتے ہو؟“



”آپ۔“ صرف اپنے جذبات کی پروا کرتی ہیں مشلا! وہ ہاشم سے بولا۔
 ”میں مارچن تو نے دیکھ کر سن لیا۔ جذبہ ہمدردی کے تحت ہی سی۔“
 مشلا نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیں کہ میں کیا چاہتا ہوں کیا سوچتا ہوں، میری تمنا کے دائرے میں کیا کچھ آتا ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ عمر کے لیے میں وہی سوچتا ہوں جیسا آپ اس کے لیے سوچتی ہیں۔ کیا یہ الفاظ آپ کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہیں۔“
 ”نہیں۔“ وہ بے صبری سے بولی۔
 ہاشم اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
 ”مشلا پلے آجھٹے اتنا تو تمہیں بتا رہی نظر آتا ہوں۔ اندر اترنے کی بات تو علیحدہ ہے اس کا تو میں آپ سے تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ شاید بخانا ہو گیا تھا۔
 مشلا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔

”نہیں۔“

”کیا کرونا یا رہا کام کے بندے نہیں ہو تم۔“

”معاذِ اللہ کرتی ہیں نا۔“ وہ منمنایا۔

”کیا کہتی ہیں؟“

”وہ کہتی ہیں مجھ سے پاپا کی باتیں مت کیا کرو۔ وہ تمہارے پاپا ہیں مگر میرے کچھ نہیں ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

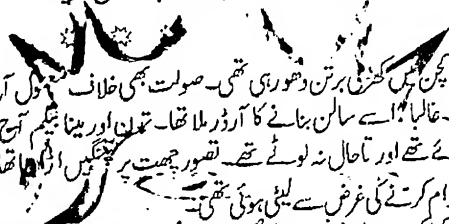
”اچھا!“ لگتا ہے تمہیں وکالت سکھانا پڑے گی۔ خیر ہم بھی تمہارے باپ ہیں یا رہا کیا یاد کرو گے تم اور۔۔۔ تمہاری ما۔۔۔“

”پاپا میں لیپ ٹاپ (کمپیوٹر) لوں گا۔“ موضوع تبدیل ہونے سے وہ بیزار ہوا تھا۔ ”میرے سب فرینڈز کے پاس ہے اور چھروں والی گن بھی۔ ما مجھے نہیں دلائیں۔ وہ کہتی ہیں، تم کسی کو زخمی کرو گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دلاؤں گا۔ ویسے تو بہت سافٹ ہارڈ ڈیسک تمہاری ماما، مگر ہمارے کیس میں تو۔۔۔“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”خالہ جالی آگئیں۔“ عمر نے سیڑھیاں اترتی انیقہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

”اوسکے جانو۔ خدا حافظ۔“ اس نے فی الفور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔



ربیعہ کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ صولت بھی خلاف اصول آن کچن میں نظر آ رہی تھی۔ وہ آلو پھیل رہی تھی۔ غالباً اسے سالن بنانے کا آرڈر ملا تھا۔ تمدن اور مینا بیگم آج بڑے خفیہ انداز میں خوش خوش کہیں روانہ ہوئے تھے اور تاحال نہ لوٹے تھے۔ تصویر چھت پر لٹکی ہوئی تھی۔ زانہ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر آئی تھی اور کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی۔

کچن کی کھڑکی سے لال فرش والے صحن کا منظر نظر آ رہا تھا۔ فرش خشک تھا۔ لالہ ہوا تھا۔ ”برتن دھو کر صحن میں جھانک لگاؤ۔“ ربیعہ نے صحن میں دیکھ کر کہا تھا۔ ”اچانک ہی اسے اپنا کچن یاد آ گیا تھا۔ جہاں ہمارے گھر کے گھر پہلے پھول بکھرا کرتے تھے، جنہیں وہ روز سیمٹی تھی جن کی خوشبو اسے دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ بچپن میں بھی وہ ان پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر پھرا کرتی تھی۔“

ربیعہ کو وادی جان یاد آئیں۔ ان کا چمکتا چہرہ، شفیق مسکراہٹ، مہربان لمس، شناسا خوشبو۔

ربیعہ کسی اور منظر میں جا بیٹھی تھی۔ جب گیٹ کھلنے کی آواز سے وہ حال میں لوٹ آئی۔ تمدن اپنی موٹر سائیکل اندر لا رہا تھا۔ مینا بیگم ہاتھوں میں کئی شاپر ز تھاے اس کے ہمراہ تھیں۔ ”امی آگئیں۔“ صولت مسرت سے چلائی۔

ربیعہ کو اندازہ ہوا کہ وہ ان دونوں کے ایک ساتھ کہیں جانے کے مقصد سے واقف تھی اور بات کچھ ایسی تھی کہ وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ وہ جلدی آلو پرے کھسکا کر کچن سے نکل گئی۔ ربیعہ گوگو کی کیفیت میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا پھر مینا بیگم نے کچن میں جھانکا۔ ان کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو ربیعہ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

”ربیعہ۔ ذرا یہاں تو آؤ۔“ وہ کمال مہربانی سے گویا ہوئیں۔

عرشہ تابع کے رشتے کا سنتے ہی ممکن ہی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بجا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔
 واقع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے۔ اور دوبارہ تعلقات کی استوری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی رنگ رہ جاتی

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شملہ ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

توانہ رجبہ کو بیور شئی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں عسالت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ رجبہ پر کھٹاؤ لے لڑا اٹھ گئی ہے۔ جس پر توانہ عسالت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے عقین نتائج کی دھمکی دیتی ہے۔ انبیعدہ ابرار جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

یاد رکھیں: یہ کہانی ایک حقیقی روایت ہے، تو یہ ہے۔ تمدن۔ یاد رکھیں کہ عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے یاد رکھ جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو 'جتنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں' شہلا، 'ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تقدیر ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اگر عمر کا سواڑ اس وقت آتا ہے جب یہ فارم اس سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

ستریون قسط

ایک کراہ کے ساتھ اس نے دھیرے دھیرے کھینچیں۔ اس بل اس کے لبوں سے چند بے
معنی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اس کے سر میں وہاں کے سے ہو رہی تھی۔ بھری ہوئی موجوں کی
مانند اس کے احساسات سے پوری شدت سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔
ربیعہ کی ادھر کھلی تکیہ میں نظر پڑا۔ اس نے دیکھ کر اسے رعبہ نظر آئی۔ ترانہ کے
چہرے پر تأسف اور فکر مندی واضح تھی۔ ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے بولنا چاہا تو کراہ کر رہ گئی۔
”ترانہ ترانہ“ یہ بھٹکتی بولی تھی۔

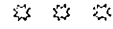
”ہاں ربیعہ!“ اس نے اپنے ہاتھ کو ترانہ کے گرم، پر خلوص ہاتھوں میں پکایا۔ ”میں ہوں تمہارے پاس۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری، تم تھک چکے ہو، تو ہونا سو روز یا وہ تو نہیں ہو رہا؟“

ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر ترانہ کا چہرہ دیکھتی رہی جس پر اب ایک مہربان، پر خلوص مسکراہٹ تھی۔

ابھی ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے تمہاری مینڈج کی اور انجکشن بھی لگایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمہارا بلڈ پریشر بہت زیادہ لو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔“

”کیا بات ہے ربیعہ۔ تمہارا بلبل دیر بشر آخر اتنا لوگسے ہو گیا؟ کیا تم نے کھانا دینا چھوڑ رکھا ہے؟ یا۔۔۔ تم نے

بست زانو میٹھن ہے؟ کیا بات ہے مجھے تو بتاؤ۔
 راجہ کی ہند پیلوں سے ایک نظر نکل کر اس کی کپڑی سے ہوتا ہوا اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس
 ہونٹ دھڑکے دھڑکے دھڑکے وہ شاید خود سے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترانہ اس کا ہاتھ ہو
 ہو لے بھٹکتے ہوئے پر سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

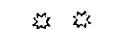


”مجھے پتا تھا مجھے پہلے ہی پتا تھا ای! جس دن میں نے اس چیز کا یہ سفید چروہ دیکھا تھا“ اسی دن میرے
 میں ایک سوئی کی کھب گئی تھی۔ آخر وہی ہونا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ہونا تو یہی؟ صولت فریا نکال تھی۔
 ”جل! اب بند کر اپنی کواں۔ کوئی آسمان نہیں ٹوٹ رہا تیرے سر پر۔“ مینا بیگم کی تند آواز گئی۔
 دودھ کا پالہ راجہ کی نگاہوں میں کانپ کر رہ گیا۔ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی ترانہ پر ایک ہتھی تھکی سی نگاہ
 ڈالی۔ ترانہ نے اس کی نظرس محسوس کیں لیکن اس نے نگاہ اٹھا کر راجہ کو نہیں دیکھا۔ وہ مسلسل کسی سوچ میں
 ڈوبی ہوئی تھی۔

”اور میرے ٹوٹا ہے؟ آسان؟ وہ ڈائن میرا کچھ بوجھ کر لے گئی اور یہ کہتی ہیں کہ۔۔۔ شہزادہ کی وجہ سے
 صولت کی آواز میٹھ گئی اس سے بولا نہ گیا۔
 ”نہ مہم نہ مہم ہو جائے گا تب کچھ ٹھیک۔“ راجہ بیگم نے اس بات سے بولیں۔ ”اور حاکم تو بیٹ
 ہے ای! اور حاکم بھی پتہ نہ چلا گیا۔“

”کیسے کیسے ہو گا تب کچھ؟ وہ تو کہتا ہے صرف اسی جھوٹے شادی کرے گا۔“
 ”یہ سنا تمہارا کام نہیں ہے صولت! ہم بیٹھے ہیں کہ لوگوں کے سروں پر۔ اتنا لگ کر مند ہونے کی ضرورت نہیں
 ہے۔“ مینا بیگم کی بار بار قدرے صولت سے بولیں۔

”شادی کر کے بھی وہ تو اسی کا دم بھرے گا۔ مجھے کب پوچھنا تھا۔ مجھ سے تو دل بھر گیا اس کا۔ اب تو
 ہواؤں میں اڑنا چاہتا ہے یہ دن رات سامنے رہے گی تو۔“
 ”مرا کیسے؟“ مینا بیگم اب ایک دشت ہو گئیں۔ ”پھر کھالے زہر سے۔ یہاں ہم پہلے ہی ریٹائن بیٹھے ہیں
 تجھے ماتم سو رہے ہیں۔ کہ جو دوا تب ٹھیک ہو جائے گا پھر کچھ ہی دن رہیں گے۔“
 صولت غالباً اس کے جارحانہ تیور دیکھ کر قسم کی پھر اس کی سسکیاں بھٹی اچانک ہی ختم گئیں۔ ترانہ ہونٹ
 چبانے لگی تھی۔ راجہ کو تجالے کیوں ترانہ سے بھی ڈر لگا تھا۔ اس نے جلدی سے ہلادی کا پالہ لایوں
 سے لگا لیا۔



”سوٹ کا کڑا شہم سے پوچھ لیتا جاوے۔“ راجہ شوش ہوئی ایتان فرودس بیگم سے کہ بیٹھی پھر فوراً ”اسی ٹھنڈی پر
 مٹی۔ انہوں نے از حد ہونٹوں سے جھوک نکالا تھا۔

”میں پیچھو۔۔۔ زہر سے استہزا پیش کیا ہے آپ نے۔“ راجہ اندر چلا آیا تھا۔ ”دو لہا میاں کا سوہا میرا خون برید
 جائے گا اس انتشار پر۔ گالوں پر گال پھر جائے گا۔ آنکھوں میں ایسی قدیں روشن ہوں گی کہ شادی میں
 لافٹنگ وغیرہ کی قطعاً۔“ کوئی ضرورت نہ پڑے گی اور چشم تصور سے وہ شہلا بھیجی کو وہ رنگ پڑا دیکھیں گے تو۔

”وہ۔۔۔ واپس۔۔۔ واپس۔۔۔ ان کا اپنا چروہ دیکھنے۔ دیکھنے۔ والا۔۔۔ میرا مطلب ہے؟“ ہم!۔
 تب ہی اس کی نظر بھی اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی فرودس بیگم کے خون آشام اثرات اور ایتان کی
 نیچسی نظروں پر پڑ گئی تھی۔
 ”نہ! آہیں پیچھو آپ!۔“ وہ ایک ہی موضوع بدل کر خوش گواری سے یوں بولا جیسے چند لمحوں قبل وہ کچھ
 کہہ رہی نہ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ ایتان سے مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔“ میں۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی۔۔۔ بھائی جیلم کا فون آیا تھا کہ
 ہاشم کی بری کی تیاری کرنا ہے۔ چند ایک روز کے لیے آگئی ہوں۔ میں زائرہ اور دور درمل کر شاپنگ کر لیں گے۔“
 ”اور ہم۔۔۔ ہم کیا کریں؟“ قاطرہ جوش سے کہتے ہوئے آگئی تھی۔
 ”تم جو رکھو۔ بھانجے گا۔ اب دن ہی کہتے ہیں شادی میں۔۔۔ گنتی کے پچیس دن ہیں۔ کتنے سال بعد
 اس گھر میں خوشی کا ایسا موقع آیا ہے۔ جم کر منا سیں گے۔“

راجہ نے حد خود نظر آتا تھا۔ چوری چوری اس نے اپنی بات کا تو عمل فرودس بیگم کے چہرے پر دھونڈنے کی
 کوشش کی۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بہ مشابہ آگے بھری اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”راجہ! راجہ! میں اسے توچ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایتان! پھر یوں کرو بازار جانے سے پہلے
 شادی کر لیں۔“
 ”مجھے کتنے فراموش سے پہلے ہوئے وہ کہے سے باہر نکل گئی تھیں۔ راجہ اور ایتان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ
 ملائے۔ جب کہ قاطرہ چہرے سے ہی بڑبڑاتے لگنے لگی تھی۔

”راجہ! راجہ! میں اسے توچ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایتان! پھر یوں کرو بازار جانے سے پہلے
 شادی کر لیں۔“
 ”مجھے کتنے فراموش سے پہلے ہوئے وہ کہے سے باہر نکل گئی تھیں۔ راجہ اور ایتان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ
 ملائے۔ جب کہ قاطرہ چہرے سے ہی بڑبڑاتے لگنے لگی تھی۔

”وہاں کیوں کہتے ہو؟“ راجہ نے آواز دھڑکے۔ ”میں نے اسے پہلے ہی پہنوز لپس و شریر مسکراہٹ تھی۔
 ”راجہ! راجہ! میں اسے توچ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایتان! پھر یوں کرو بازار جانے سے پہلے
 شادی کر لیں۔“

”میرا کچھ پوچھو اور اپنی گفتی پوری کر لیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک آدھ دن کہیں بس نہ ہو جائے بائے راوے“
 کہ دن کی شہلا سے لارے ہیں پھر پتا ہو غصہ؟“
 ”تمہارے منہ میں کتنی شکر۔“ ایتان نے اس کا کان چھو کر گمری سانس بھری۔ ”مجھ تک تو ہاں سے ایسی
 کوئی خبر نہیں آئی۔“
 ”پھر یہ کون سے دانے پڑھ رہی تھیں آپ؟ میرا مطلب ہے کیا میں دی تھیں۔“ عاشرہ عاشرہ کا غصہ تو نہیں
 بتاوا کسی ”باسے“ نے؟“

”اے چار سو بیس لوگوں پر یہ جگہ پھلکے پھلکے وظیفے کام نہیں کرتے۔“ وہ چہچہائی۔
 ”چار سو بیس؟ یعنی بائیس سو؟“
 ”جی نہیں تمہارے پچو یا موصوف۔“ وہ جلی بیٹھی تھی۔
 ”تھکے تھکے۔ بہت افسوس کی بات ہے ڈیر پچو! آپ کی محبت سے مجھے اس ”جلی کبی“ کی امید تھی۔“

”محبت نامی ”جلی“ اور ”دکنے“ کا ہے ڈیر بیٹھے! تمہیں تو خوب خوب تجربہ ہے۔“
 ”بھائی فرمایا لیکن ہم نے بھی ڈاکٹر صاحبہ یعنی آپ کی دوست موصوفہ کو اس طرح نمبر سے یاد نہیں کیا۔“
 ”بھئی نہیں زیب بھی نہیں دتا کہ تم میری بیوی کی دوست کو اس نمبر سے یاد کرو۔ یہ تو تمہارے پچو یا جیسے۔
 مروت لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ آج پورا آکھواں دن ہے پلٹ کر خبر نہیں لی کہ بیوی! بیٹی ہو یا موتی۔“
 ”میری بات۔ یعنی میری جوتی سے۔ میں جلی کلاں کی پروا کرتی ہوں۔ خوش خوش تمہاری کھجور کی تیار یوں میں مصروف ہوں۔“
 ”سچ کہا۔“ اس نے شرارت سے سر ہلایا۔ ”لکھنوں پر بجائے۔“
 ”آپ کو کیا پروا؟“
 ”چائیں کیا بات ہے عاشق! وہ ڈاکٹر صاحبہ ہی سنجیدہ ہو گی۔“
 ”میرا دل اچانک ہی گھبرائے لگتا ہے۔ جب عاشق مجھ سے یوں غفلت برتنے لگیں تو میرا کچھ بیڑ میں نہ دل جاتا ہے نہ دھیان آتا ہے۔ بجائے کب پوری ہو کر یہ سزا کی مدت۔“
 ”اسم نے چند لمحے بعد اس کا چہرہ دکھا کچھ سوچا پھر دکھا کہ وہ لہجہ بدل کر بولا۔
 ”یار پچو! سنا ہے آپ ڈاکٹر صاحبہ کا ویڈیو گنگ ڈور میں لے کر جا رہی ہیں۔“
 ”ایقان جو کسی خیالی میں مبتلا تھی۔
 ”چوکنک لگی۔“

”آلہ! ہاں۔ بھائی بیگم نے اس لیے تو بلوایا ہے مجھے۔“
 ”تو پھر ایسا لباس لے آئیں جس میں دھنک کے سب ہی رنگ ہوں۔“

”ہاں۔“ ایقان نے برا سامنے بنایا۔ ”یہ تمہیں ٹیکنی کلرڈ لباس دیکھیں۔“
 ”میں نے لگتے تھے ہمیں۔“

”بائے پچو! اب میں آپ سے کیا چھاؤں۔ جو رنگ بھی سوچتا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحبہ کا قصور ہے۔
 جیسا کہ بائی سب ہی رنگ اپنی قدرو قیمت کو بیٹھے ہیں پھر اچانک ہی ڈاکٹر صاحبہ کی اور رنگ میں نمودار ہوتی ہیں تو بس پھر ہر سووی رنگ چھٹا جاتا ہے۔ اے میں کسی ایک رنگ کا انتخاب تو بہت مشکل ہے نا؟“
 ”ٹیکنی کلرڈ! ایک سچی سے ڈراڈرا سا کپڑا ہر رنگ کا لے لیں پورا لباس تیار ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟“
 ”ایقان کے لب مسکرائے تھے۔“

”اب اگر تمہارا بھی کر رہے ہو تو میں ضرور تمہارے ساتھ ہی کرنے والی ہوں۔“
 ”عزیز!؟ میں حدودہ سنجیدہ ہوں پچو!۔“
 ”بس تو سمجھ لو کہ تمہاری دامن کے عروسی لباس میں ایک سو ایک رنگ ہوں گے۔“
 ”ہاں۔ ہاں۔ قصور میں ایک دنیا آباد کر دی آپ نے تو۔ کیا خوبصورت جملہ بولا ہے۔“

ایقان بس بس کر رہی ہو گئی پھر اس نے ہاتھ کو ایک دھپ لگائی۔
 ”اور بے چاری ڈاکٹر صاحبہ کا کیا قصور ہے جو اس کو ایسی عالی شان سزا دی جائے اتنی سوز اتنی دینیت کی میری لگاؤ کی اویس۔ اور۔۔۔“ ایقان کی ہنسی کی طور نہ ٹھہر رہی تھی۔
 ”شباباش ہاتھ مٹاؤ۔“ ہاتھ نے چشم قصور سے خود کو پھینکی دی۔



”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“
 ”ربیعہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تمدن سامنے کھڑا تھا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔
 ”ربیعہ نے محسوس کیا کہ نرم بچے اور نرم بات کے پس پردہ ایک نامحسوس سی پیش تھی جیسے وہ کوئی خاص بات محسوس کر کے یہ سب کچھ کہہ رہا ہو۔
 اس نے نگاہیں اٹھا کر تین کو دیکھا۔ وہی نامحسوس سی پیش اس کی نگاہوں میں بھی تھی۔
 ”بابا! تو کچھ بھی نہیں ہے توں بھائی!۔“ وہ رسائیٹ سے بولی۔ ”ترانہ جاری کی کہ میرا بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو گیا ہے۔“
 ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“
 ”اب۔۔۔“ وہ دیکھ کر اگلی اور پکڑ کر چلا رکھا ہو تو اب بھول جاؤ اسے۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ربیعہ

”وہ کھڑا ہوا۔“
 ”اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔“
 ”اس کے دل کے لڑکے نے آکر کوئی سامنے خواب دکھائے ہیں تو یہ مت سمجھ لیا کہ وہ خواب کبھی حقیقت نہیں بنیں۔ تمہارا حقیقت بھی تمہارے۔“
 ”اس کے لیے ایک نیا دل جلانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ایسی مسکراہٹ ربیعہ اکثر نمودار نہیں

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“
 ”اب۔۔۔“ وہ دیکھ کر اگلی اور پکڑ کر چلا رکھا ہو تو اب بھول جاؤ اسے۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ربیعہ

URDU PHOTO

مشقۂ معمولی قرآن مجید کے خوب
 کھانا پکانے کی مزیدار
 ترکیبوں کے
 رنگارنگ کتاب

نانوت کا
 دسترخوان

شاہزادہ کوثر

مکتوبہ کاہنہ: ۳۰، آصف آباد کراچی

رسیدہ کے کالوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے اس کا وجود کسی بہت پرانی عمارت کا کھنڈر ہو۔

”میرا خیال ہے۔ سنہری۔ رسالہ کا کارنامہ۔ شہروانی کار کے ساتھ۔ اس پر دل گولڈن امیر انڈری۔ کیوں علی؟“ ”خود نے کھینچا کہ رے نظر تھا کران دونوں کو یاد۔“ ”صدقے جاؤں۔“ اس نے ذات نکالے۔ ”مستازہ ندی“ میرا مطلب ہے سراہندی کی رسم آپ کی سرانجام نہیں پاری۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ نافع اسے مزید ملبوسات دیں۔
”رسم نکاح میں آپ کا نام ہرگز نہیں بکارا جائے گا۔“ علی نے غلظا جوڑا۔
”کوئی ملتی شہنشاہی کا جگر بھی بی الحال نہیں ہے۔“ نافع مزید بولا۔
”تو پھر گولڈن کرنا؟“ علی غلظا۔
”گولڈن امیر انڈری؟“

”قسم خدا کی۔“ ”خود نے ذات نکھائے۔“ ”تم میرے بھائی۔ اور میرے بھائی۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”پھر اس دو سو روپے کی کیناٹاگ کا کیا ہو گا؟“ ”ایک ایک علی نے دہائی دی۔“ ”یہ کیوں خریدی گئی؟“ ”یہ رقم چونکہ اس کی جیب سے ادا کی گئی تھی اس لیے درہاسی کے دل میں اٹھتا تھا۔“ ”خود نے کھینچا کہ رے نظر تھا کران دونوں کو یاد۔“ ”صدقے جاؤں۔“ اس نے ذات نکالے۔ ”مستازہ ندی“ میرا مطلب ہے سراہندی کی رسم آپ کی سرانجام نہیں پاری۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“ ”نہی آپ کا سر اٹکھا جا رہا ہے۔“

”تم ناراض ہو مجھ سے؟ کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟“ عریضہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور آنکھوں میں ایسا گہرا دکھ تھا کہ نافع اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر پلٹ کر اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ نافع کمری سوچ میں غم تھا۔



”مما! یہ سب کس کے کپڑے ہیں؟“ وہ آنکھوں میں حیرانی کے سبب ہی رنگ بھرے رنگے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ انیقہ مسکرا دی۔

”یہ سب کپڑے آپ کی ممما کے ہیں۔“ اس نے عمر کو بانہوں میں بھرا۔
 ”اتنے پیارے کپڑے۔۔۔ چمکیلے۔۔۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میں نے کبھی ممما کو اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ میری ممما کیا دلہن بنیں گی؟“

شہلا کے چہرے پر سنجیدگی تھی لیکن منیضہ بیگم اور انیقہ مسکرا دیں۔
 ”ہاں عمر! آپ کی ممما دلہن بنیں گی بہت خوبصورت لگیں گی۔“ انیقہ نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا تھا۔
 ”اور دولہا؟“ اگلا سوال برق رفتاری سے آیا تھا۔

”دولہا۔۔۔“ ابھی انیقہ کی بات اس کے لبوں میں ہی تھی کہ عمر نے اچکل لی۔
 ”دولہا تو میرے بڑے بھائی کی بیوی ہے۔“ ممما دلہن کو اٹھا کر دولہا سے غلاما! اس نے تالیاں بجائیں۔ شہلا کے چہرے نے لمحہ بھر میں ہزار رنگ بدلنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ منیضہ بیگم نے تاسف سے اسے جاتا ہوا دیکھا۔ انیقہ سے سوچ، کہ عمر کو دیکھا تھا۔

”تمہاری یہ دو آنکھ کی زبان قابو میں نہیں رہتی تمہارے؟“ وہ چڑھ کر بولی۔
 ”میں نے کیا کہا ہے نانو؟“ وہ حیران ہوا۔ ”خالہ جانی تو مجھ سے لڑتی ہی رہتی ہیں۔ ان کو تو میں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔“
 اس کی معصوم آنکھوں میں بانی اترتا دیکھ کر انیقہ سب کچھ بھول بیٹھی۔ اس نے چٹاٹ اس کے گالوں کے کتنے ہی بوسے لے لیے۔

”آپ تو خالہ جانی کی جان دے دیں۔“ وہ بانی کو پیٹتے ہوئے کہنے لگی۔
 ”کوئی نہیں لگتا۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھا تھا۔ ”ابھی آپ نے مجھے ڈانٹا ہے۔“
 ”نہیں چاند! میں نے آپ کو نہیں ڈانٹا۔“

”مما بھی یہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ انہیں بھی میری باتیں بری لگیں، اسی لیے اب میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔“ وہ مزید روٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی ممما نے کتنی بار آپ سے کہا ہے عمر کہ ان کے سامنے اپنے پیاز کا زکرت کیا کرو۔“ انیقہ نے اسے ہلکے ہلکے انداز میں سمجھانا چاہا۔ ”پھر بھی آپ۔۔۔!“

”کیوں نہ میں پیاز کا زکرت کروں؟“ وہ اکڑا۔ ”وہ ممما کے کچھ بھی نہیں ہیں مگر میرے تو بھائی ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں ضرور ان کا نام لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ اور بھی لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ آپ کو بھی میرے پیارے لگتے ہیں نانو؟“

اسے لڑائی کے دوران اچانک ہی منیضہ بیگم کا خیال آگیا۔ اس نے از حد معصومیت سے سب کچھ بھول بھال کر پوچھا تھا۔

منیزہ بیگم اور انبیہ بے اختیار ہی اس کے بھول پین پر مسکرا دی تھیں۔

”میں بیٹا دو سنی گورے نہیں لگتے۔“ منیزہ بیگم نے اسے گود میں بٹھالیا۔ ”وہ آپ کے اچھے ہیں۔ وہ آپ اچھے لگتے ہیں تو ہم سب کو اچھے لگتے ہیں۔“

”چہرہ آپ لوگ! میں دو لہا کیوں نہیں بناتے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ میری ماما کے دو لہا بس میرے چہرے میں نہ رہے۔“

منہ ذہنیہ ہوتی ہے ہر کافر اپنے کو دیکھنے لگیں۔ تو اسے کابے اندازاں کے لیے نیا اور بے حد حیران کن تھا۔ انہیں نے اس کی گہرائی بولی صورت دیکھی تو جھٹ کھڑی ہوئی اور عمر کو گویا اٹھایا۔
”مطلوبان میں چل کر پھیلیں۔ ہاں میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی۔“ وہ اسے جو چاہے ہوئے وہاں سے چل دی۔

منہزہ بیگم اپنے چاروں طرف بکھیرے ہوئے چڑوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں۔ وہ اور انبیقا بھی ابھی شہلا کی شادی کے لیے خریداری کر کے لوٹی تھیں اور شہلا کو کپڑے دکھا رہی تھیں۔ عمر کے غیر متوقع تبدلے نے ماحول رنگ برنگ یوں ڈالا تھا۔

”بھائی! ایک بتاؤ۔“ اس نے عمر کو یہ دیکھ کر ہنسی اور غصہ اس کے سر پر بیٹھ گیا۔ ”کیا جانکر ہے؟“
 ”نہ تو سن جا کر؟“ اس نے اپنے کمر خالہ کی صورت دیکھی۔ ”آپ کو مجھے اپنے ساتھ لینے کے لیے لانی تھیں۔“
 ”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی تھیں یا میں۔“ اس نے ہنسی کرتے ہوئے کہا۔ ”نہ کہ مجھے پہلے انداز میں پوچھنے

”کیوں بتاؤں؟“ وہ میڑا۔ ”بھانے منع کیا ہے۔“
 ”وہ؟“ انجیہ کو گھڑی کا احساس ستانے لگا۔ ”دیکھیں، ہم لو اب آپ کو مع نہیں کرتے بات کرنے پر مجبور ہیں۔“

”نہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی اور نانو کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ وہ مزے سے ٹانگیں نے لگا۔ ”اس لیے آپ کو تو بالکل سب سے چھپانا پڑے گا۔“

”چھاس“ انہی قلمبے اختیار ہی اس کی صورت دیکھی۔ ”ایک دن کو تھام سے کھینچ کر لے آئے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے پرتو در انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ تو کہتے ہیں اپنی مٹا سے میری کیا باتیں کیا کرو، انہیں مہمابت پسند
 نہ آئے۔ مٹا ان کی بہن جو ہیں۔“

انقبہ کو دم نکلنے کا احساس ہوا۔ نگہباز اگر کھڑی ہو گئی اور میٹر حریاں اتر کر لان میں چلی گئی۔ عمر بھگتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ مجھ کو پیچھے سے اگر اس سے پت گیا۔

”یہ۔۔۔ دلہا اور دلہن۔۔۔ کی باتیں تمہارے بچا کرتے ہیں عمر؟“ اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔

”ہاں۔ نہیں۔ آپ کو کیوں پتاؤں؟“
 انصاف، بری طرح سے اچھی۔ اس نے زپٹ کر اسے برہمی سے دیکھا پھر فوراً ”ہی اپنا انداز بدل لیا۔ اس بچے کا
 سارے معاملے میں وہی بھرپور تصور نہ تھا۔ وہ جبک کر اسے جوئے لگی۔

”چرا تم آئی اور وہ آئی اپنے کو مجھے سخت بور کر رہا ہے کیا تھا گریہ آپ سے بڑی ہو تم ہی باجھران کی شادی پہلے جاتی تھے۔ حالات حاضرہ پر متفکرو تو امیں بائکل پیسہ نہیں۔ کرنٹ آفینڈر کی بات کرو تو یہ کرنٹ مارنے پر آمادہ جاتی ہیں۔ ہمیں سے الٹی الٹی کوئی سن کر لے آؤ تو یہ اس ”ڈوٹی“ کے سارے پر کاٹ کر بندے کے ہاتھ میں لٹا دیتی ہیں کہ اباب بیجگر کر شرمندہ ہو۔ خود خدا کی ہفتصفا کا مہر غارت کر دیتی ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ آئیں۔ سخت بوری ہو گیا کبھی ان کے ساتھ رہو کر۔“

[illegible]

”بھائی چھوڑتے رہنا نہیں۔ وہ عقلی دماغ کے لیے عرش سے جولا قات، ہوائی تھی تمہاری؟ ایک تو ہر بات و صورت کو دیکھ کر ہی بات شروع کر دیتی ہو۔ تمہاری یہ عبادت مجھے خست ناپسند ہے۔“

”جی ہاں، یہی سب کچھ کہہ کر وہ آگے سے خست ڈانٹ بڑی تھی پھر وہ آگے کی بات بکلی بکلی ہاں تو یہ ہے۔“

”ناعمینہ بھرتے بھرتے رہا تھو پھر۔“

”میں نے یہاں آباد کسی اور کو پسند کر کے ہے؟“ راسم کا تجسس اپنے عروج پر تھا۔
 ”میں جیسے اس تو کو کئی بات نہیں ہے۔ ایسی بات ہوئی تو کیا مجھے علم نہ ہو؟“ میں تو اس کی رگ رگ سے
 واقف ہوں۔ جس کے پاس اس کا چکر ہے۔ عرشہ اپنے آپ کو ”کچھ“ سمجھتی ہے۔ تاہم تو اس کے معیار پر نافع
 نہ ہو رہا ہے۔“

چھپا کر۔ ”میں نے اس کا سر سمجھ داری سے ہلایا۔ ”مجھے بھی شک تو ہوا تھا اس کا جیسا جیسا چروہ لکڑی۔“

”میں جی سچے سچے ہوں اور یہ سچہ سچہ پتھر ہے۔ میں کوئی بی جھگڑا ہوں۔ میں نے کوئی کمالی بات نہ کی۔“

”ہاں بالکل جی نہیں کسی تم نے کسی سے اور مجھے تو بالکل پتا نہیں ہے کہ کیا بات ہوئی۔“ دروازے پر درجن

”اے لوہے بڑی بہن ہوں اس کی اور تمہاری بھی۔ کوئی بڑا نہ تو نہیں ہوں جس سے تم لوگ پروہ داری۔

”یہ بات نہیں ہے ایسا!۔“ درود اندر چلی آئی۔ ”یہ بات میں اس کو پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ عریضہ والے

گھٹے میں اس قانون کا عکس مناسب نہیں ہے۔ خدا کو خواستہ عمل ملاں تو کوئی اور بیچ ہوگی ہوساری برائی اس سے گھٹے میں آئے گی۔ یہ سبھی ہی نہیں ہے۔

”تم تو دروازہ باز ایسا کرتا کہ اگر سر پہ کچھ آتا ہے تو سر پہ لگا دیتا ہے، غریب بیکار آدمی کے پاس سے روٹی چوری کر لے گا تو اس کی جڑیں کاٹ دیں گی۔“

سے بولیں۔ ”اور ہم کون سا اصول مانے پیٹ رہے ہیں۔ تپس میں ملکی پھلکی تنگ کو کر رہے ہیں نا۔“

دروہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

”تم نے میری نہ کو کسٹرز دکھلایا؟“ رائے نے بات بدلی۔

”جی ہاں؟ سے ای کے پاس سلا دیا ہے میں نے۔“

”اچھا یہ لیں۔“ ناعنہ نے پیاز کی نوکری اس کی جانب بڑھائی۔ ”برائی کی پیاز بھی میں نے کٹ دی ہے گوشت بھی دستو کر فرنگ میں رکھ دیا ہے۔ برائی بنانا آپ کا خاص الحاصل دھپار ٹنٹ ہے۔“

”یوں کہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں تاکہ تم سبھی کو کاٹنا نہ پڑے جو ڈسکو۔“ وہ مسکرائی۔ ”چلو ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں۔“ پھر یہ نوکری تمام کر کے سے نکل گئی۔

”ہاں اب بتاؤ!“ رانمہ نے پیر پھیلانے کے ”یہ ممالی جان کا قصہ کیا ہے؟“

”ہو ایوں کہ ایک دن عریضہ سے ملنے گئی۔“ ناعمہ مزے سے شروع ہوئی تھی۔

✱ ✱ ✱

مصلحت نے رورور کر آگئیں سجائی تھیں۔ مینا یتیم سخت براہم تھیں، لیکن یہ انداز نہ ہو۔ اور اصل ان کی

تاریخ سے وہی الحال احراز ہوتی رہی تھیں کیونکہ راجہ کی اپنی خاص سب زبان خود بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

کلا واحد مرکز تھی۔ مواس پر اٹھتا غصہ بھی وہ اپنے اندر دبا کرے پر مجبور تھیں۔ ترانہ تو کئی دن سے ہر پہ بلب بلب کر رہی تھی۔

صولت سے شادی سے علی الاعلان انکار کر کے وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ اور اب تبینِ دل سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ

عالمِ حقیقت نے محبوب کی جدائی کو از حد دل پر لیا تھا۔ اور وہ نہ صرف دردِ دل ہی نہیں بلکہ کھائے ہوئے میسرے پر گریز پاں بھی۔

سے رہ رہ کر یہ غصہ اتارنے کا ہوش چڑھتا تھا اور وہ جو منہ میں آتا سو کہنے لگتی تھی۔ شروع شروع میں یہاں تک کہ اس نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی پھر وہ بھی بار بار مان کر حریف ہو گئی تھیں۔

ربیعہ کو اس وقت آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔

کچھ دیر کے بعد اسے پھر نئے سرے سے جوش چڑھ جاتا۔

ہے۔ آج کل کے چل رہے ہیں آدھے۔ یاد رہے مجھے خیال آتا ہے کہ جانے کس وقت میں اس نے کیا منتر پڑھ کر بیٹوں کا

”کیا بات ہے؟ کیا بکواس ہے؟“ گھر میں ایک کبکب توہن کی ترش آواز گونجی تھی۔

وہاں کسی یاد کے گھر نہ چھپائے۔ چار دن اور گزر رہے تھے۔ بے غیرتی سے چلا آئے گا۔

صولت پھر خاموش ہو گئی تھی۔ اسے خاموش ہونے کے لیے ایسے ہی کسی بیوی بچوں کی ضرورت پڑتی تھی۔
 ”جی تو کیا ہو تا تمہارا!“ مینا بیکم قدر سے سہولت سے بولیں۔ ”غصے میں گھر سے گیا ہے۔ جوان خون سے کچھ

بیا، یہ سنا کر بیٹھے۔“

50

”ماما ماما۔۔۔“ تہن کو یہ بات کافی پُر مزاح لگی۔ ”جوان خون! پچھو جوان خون ہونا ہی کافی نہیں ہے۔“

خون میں غیرت بھی ہونا چاہیے۔ جو اس بے چارے کے پاس بالکل نہیں ہے۔ سالا بد معاش ہونے والی بھابی پر

صورت بھروسوں بھول کر کے رونے لگی تھی۔ مینا بیگم اور تمدن نے اس مرتبہ اسے بالکل لفٹ نہ کروائی۔

چند محلوں بعد وہ دلوں میں پہنچے۔ اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔

”آرام کرو“ تمدن بنی نری سے بولا۔ ایں آرام کی ضرورت ہے۔

”پچھو! اپنی کمال اس سے گھروں کا کوئی کام نہ کروانے لگتا۔۔۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہے۔ شکل سے ہی

”اب خیر میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں۔“ مینا نیگم کو برا محسوس ہوا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے قدرے ظالم

ہونے کا انحراف بھی کیا۔
 ”مگر کے چمپ جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ہمدرد اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حس پر رسیدہ لکٹی ہوئی

ریختے جب کہ خود کو سمیٹا۔ وہ بالکل پرے ہو گئی۔ تمدن نے ایک سرسری نگاہ اس کی حرکت پر ڈالی تھی۔

”میں نے سب دوستوں کو مدعو کر لیا ہے اور اپنا پروگرام بدلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس موقع کو میں میلوں کے لیے اس سال کا گھر میں ہی نکال چڑھوا لیں گے۔ چند دوستوں اور رشتہ داروں کو بلا کر ہلکا پھلکا اور شہر کو میں میلوں کے لیے اس سال کا گھر میں ہی نکال چڑھوا لیں گے۔ چند دوستوں اور رشتہ داروں کو بلا کر ہلکا پھلکا اور شہر

تو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ کسی صحرائی طوفان میں جا پھنسی۔ تو ان اس کی کیفیت سے بے خبر

یوں ہی کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی۔

”لیکن تم ان“ میرا یہ“ ”تصویر کے نہ ہونے پر بہت تائیں نہیں گی۔ یوں بھی جن لوگوں کو

میں نے انہیں دیکھا کہ انہوں نے اس کے لئے ایک کھانا تیار کیا تھا۔

”بچہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ خود غرضی سے بولا۔ ”وہ ساری عمر نہ لوٹے تو کیا میں اور یہ ساری عمر اس

”اپنے نہ کو تو دل نہ اتنے خود غرض نہ بنو۔“ مینا بیگم خود پر مزید جبر نہ کر سکیں۔ یوں بھی تصور ان کا ہو۔

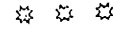
واللہ اعلم۔ سو تمدن کی نسبت وہ اس سے زیادہ انیسیت رکھتی تھیں۔
 ”اس میں خود غرضی کی کیا بات؟ حقیقت پسندی ہے یہ۔ اور یوں بھی اگر آپ غور کریں تو ہمارا نکاح ہونے۔

اس معاملے پر اچھا اثر پڑے گا۔ تصور کی امیدوں پر پانی پھرنے کا تو وہ خوردی چلا آئے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب تو یہ ہو نہیں سکتا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔

51

”نوفید کی بات ہے پیچھو! ربیعہ سے مایوس ہو کہ ضرور صولت سے شادی پر تیار ہو جائے گا۔ آپ دیکھ لیتا۔ وہ دوسرے دن اسی صولت صولت کرنا چلا آئے گا اور پھر ہم تو سب کچھ مدت سادگی سے کریں گے۔ سارا دھوم دھکار کسبل و کسبل صولت اور نصور کی شادی پر ہو جائے گا! کیوں ربیعہ؟“
اس نے پکی پیار سے ایک جھپٹی جاسی گئی کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن ربیعہ اب خودی مقام قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ پتھر کا پتھر کی ہنسی دے رہی۔
”تھک ہے!“ مینا بیگم نے تمدن کے پروگرام پر تصدیق کی مرہبت کی۔ ”میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی ہو۔ تو پھر اس مجھے کوٹے سے بہ نکال۔“
”بالکل بے!“ وہ کھل کر مسکرایا۔
مینا بیگم آنکھیں بند کر کے لٹی ہوئی ربیعہ کو دیکھنے لگی تھیں۔



”کتنا اچھا ہوتا اگر عرش بھی ساتھ ہوتی تو۔“ ناعمہ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے افسوس سے بولی تھی۔ وہ نے اسے جی بھر گھورا لیکن وہ اپنے ارد گرد کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔
”کتنا تو کما تھا۔“ ناعمہ بھٹی۔ ”اب کیا گوش اٹھا کر کہہ سکتے ہیں اس کی عادی میں ایسی ہے کہ جی کسی کی۔ جب سے یہ رشتہ طے ہوا ہے۔ میرا تو دل بڑا تڑپتا ہے۔ تو تو تھائی ہیں۔ کسے کون سے دل بھار دے ہیں جو ایک کپڑے کی بھانجی پر مہر کر کے بیٹھ جائیں۔“
”جائے دو ٹائیس۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ورہ نے ناعمہ کو ٹھنڈا کرنا چاہا اور ناعمہ کو جی بھر کر آنکھیں دکھائیں۔
ناعمہ کا اس کی آنکھیں دیکھنے کا قلقلہ ”کوئی موڈ نہ تھا۔ وہ اپنے فیورٹ شاپنگ ایجووہم میں آکر ایسے خوش تھی جیسے چاند گاڑی سے اٹھی ابھی چاند پر اتری ہو۔ مختلف ٹکڑوں کی تھیں۔ دیکھ کر اس کا اپنا چہرہ مسکھڑھن کی طرح جھگڑا نہ تھا۔“
”بائے اچا سب مرگئی میں تو۔“ اچانک ہی ناعمہ کی زرد رنگ صدا ابھری تھی۔
ورہ اور ناعمہ گھبرا کر مڑیں۔

PHOTO

”کیا ہوا ناعمہ۔“ ورہ نے جلدی سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔
”دودھ کیوں وہ یہ دن لنگا۔ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔“
ورہ کی جان میں جان آئی۔ اب کی بار اس نے نظروں سے کام لینے کے بجائے ہاتھ سے کام لیا اور نظریں بچا کر ایک صوبہ اس کی پشت پر سید کر دی۔
”کیا بد خبری ہے؟“ وہ آواز دا کر غلٹی تھی۔
”بہ خبری۔“ وہ مسکائی۔ ”لوٹا ہے ایسا!“
”بالکل انسان ہی جاؤ اب۔“ ورہ اگلی مرہبت میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔“
ورہ کی دھمکی میں ہنست جان تھی۔ ناعمہ شرافت کا سمجھتا نظر آنے لگی۔
وہ تینوں آج شام کی شادی کی تقریبات میں بیٹنے کے لیے کپڑوں کی خریداری کرنے نکلی تھیں۔ انہوں نے عرش سے بھی ساتھ طے کے لیے حد اصرار کیا تھا لیکن وہ صاف انکار کر رہی تھی۔
”ماہین آپلی کی کریں گی میری شاپنگ بھی۔“ وہ بے زاری سے بولی تھی۔ ”مجھے نہیں جانا کس۔“ ناعمہ اور

ناعمہ خاموشی سے چلی آئی تھیں۔
ورہ نے ناعمہ کے اصرار پر بیرون لنگا خریدنے کی کوشش کی لیکن اس کی قیمت ان کی قوت خرید سے دو گنی تھی سو وہ اسے لے کر وہ سری شاپ پر چل آئی۔
ناعمہ کی حسرت بھری نظریں بار بار اوپر کاہری طواف کر رہی تھیں۔



”جی ای۔“ میرا تو فی چاہتا ہے کہ اؤ کر بیچ جاؤں۔ مجبوری ہے ابھی کا سز آف ہونے میں چند دن باقی ہیں۔ کس طرح سے یہ دن گزریں گے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا یہاں بالکل دل نہیں لگ رہا ہے۔“ عبادت بیزار تھا۔
”کوئی بات نہیں بچے! چند دن اور سی۔ دل لگا کر کھائیں لو اپنی۔“
انفیتہ نے بے مہری سے مینا بیگم سے رہ پوچھ لے لیا تھا۔
”صبر بھائی! مجھے بالکل مزہ نہیں آ رہا ہے آپ کے بیروہ بس آپ جلدی سے آجائیں۔“
”کیا آپ کی خوش ہیں انو؟“ وہ جانے کیا سوچ کر بولا۔
”ابا خوش ہیں۔“ آپ کو تو پتا ہے نا۔ کتنا چھپا چھپا کر رکھتی ہیں اسے دل کی بات۔ کہیں سے بھی ایک آؤٹ لٹ لٹ کر نہیں۔ پھر بھی۔ اتنا انداز تو ہے مجھے۔ بہت مطمئن نظر آتی ہیں وہ اس فیصلے پر ”مطلب خوش ہیں۔“
”بول۔“ اور عہ؟ اسے کس نے برف کیا؟“ وہ خوش دلی سے بولا۔
انفیتہ کھجکھج کے لے کر خوش ہوئی پھر کھنکھار کر بولی۔

”بھائی! میں ان بھائی اسے ان باتوں کا زیادہ پتا نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے حالات سے واقف کرے۔“
”میں ان باتوں سے واقف نہیں ہوں۔“ اسے ہی تو نہیں وہ خود کو ”میں نہیں“ کہتا ہے! اسے ذہنی طور پر اس حقیقت کے لیے تیار کر دینا۔ لیکن اس کی اسٹ کر کے شملہ اپنی مغرب ہو سکتی ہیں۔
”اب آپ کی باتیں سنیں۔“ آپ کو جلدی تھی آجائیں۔ سب ان میں آپلی کچھ بھی نہیں کپاری ہیں۔
”میں جلد سے جلد بیٹنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کلاہور سے کیا کیا خرید کر لاؤں؟ میں نے تمہارے اور شملہ آپلی کے لیے کچھ ڈھنسن لے لیے ہیں۔ امی کے لیے گرم شالیں لی ہیں۔ اور کچھ چاہیے تو بتاؤ۔“ انفیتہ مسکرا دی۔

”اب آپ کی یہاں موجودگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں اور امی جی بھر کر شاپنگ کر چکے۔ ضرورت سے زیادہ ہی خرچا کر لیا ہے۔ ہم نے ایک ٹانگھٹ میں۔“
”خرچے کی پروا تم کو تو۔ اسے عرصے بعد تو خوشیوں نے ہمارا دواؤں کھٹکھٹایا ہے۔ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم کرے۔“ وہ ندر سے جذباتی ہو گیا۔
”تھیں۔“ انفیتہ آہستہ سے بولی تھی۔
”سب کا خیال رکھنا انو۔ میں جلد آ رہا ہوں۔“ اس نے رابطہ منقطع کیا تھا۔



وردہ ہری طرح سے جھٹلا گئی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا تمہیں کچھ لینا ہے۔ تمہاری سوئی اسی لہنگے پر لٹک چکی ہے۔ سب نشريات اپنی اپنی جگہ رہ گئی ہیں۔ اب تم سکون سے بیٹھو اور مجھے اپنی شاپنگ کر لینے دو۔“

”تو آپ کریں ناشاپنگ۔ میں نے آپ کو منع کیا ہے۔“ ناعمہ کچھ نفاسی ہو گئی۔

”میں نے سوچا تھا، پہلے تم سے منٹ لوں۔ پھر وہ لکھوں کیا بچتا ہے میرے لیے۔“

”اتنا سیکریتا زہ نہ کیا کریں وردہ آپلی صحت کے لیے معزز ہوتا ہے۔“ وہ طنز سے بولی۔ وردہ اور ثانیہ کو اس پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اسے مزید ناؤ گیا۔

”میں اپنے فیورٹ سائزر کی سی ڈیزلے رہی ہوں۔ اس شاپ پر ہوں۔“ ناعمہ نے اشارے سے بتایا۔

”چلو تھیک ہے۔“ وردہ نے اس کے پھولے ہوئے منہ کے پیش نظر سہولت سے اس کی بات مان لی۔ وردہ

عموماً ”وہ مارکیٹ میں بھی کسی لڑکی کو تنہا کسی شاپ پر نہیں جانے دیتی تھی۔ وردہ اور ثانیہ کپڑا دیکھنے لگیں۔ ناعمہ سی ڈیزلے دکان کی جانب بڑھ گئی تھی۔

سیلز مین سے کالی ساری سی ڈیزلے نکلا کر وہ بہت دھیان سے ان کے گانوں کے بول پڑھ رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ناعمہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ وہ اس کے قریب اس طرح سے کھڑا تھا جیسے وہ اسی کے ساتھ ہو اس کے چہرے پر اپنی پُریش نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ وہ اس کے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ان کی برسوں کی شناسائی ہو۔

جیسے اس کا بہت قریبی رشتہ ہو۔

جیسے وہ کئی بات پر اس سے بے حد خفا ہو۔

جیسے اس کو نہیں لگی ہو۔ جیسے وہ آزرہ ہو۔

ناعمہ سے نگاہوں جھانک جھانکی گئیں۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

”کیوں کیا میرے ساتھ آیا۔؟“ اس کا لہجہ بھی آج آواز تھا۔

وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جی۔۔۔ اکی۔۔۔“

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزار رہی تھی؟“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

ناعمہ نے پیسنہ پیسنہ ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔ چند لڑکے اپنی پسند کی سی ڈیزلے رہے تھے۔ سیلز مین انہیں ڈیل کر رہا تھا۔

”آپ۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے حسب معمول ہتھیلی کی پشت سے پیشانی صاف کی۔

”جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارے اس طرز عمل کی وجہ۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

ناعمہ سخت پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟ کیا بگاڑا ہے آپ کا؟“

”اپنے دل سے بوجھو۔“ وہ طنز سے ہنسا۔

ناعمہ کو اس کی کھٹک دیکھی سی لگی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ اس دیوانے کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

وہ بھی بے حد غور سے اس کا نقش دیکھ رہا تھا۔

”اسی بھول پن پر مرنا تھا میں۔۔۔“ پھر وہ بولا۔ ”کیا خبر تھی کہ بھول پن کے پردے میں کتنا فریب پوشیدہ

”ہے“
 ناعصہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ کیا کرے۔ مدد کے لیے کسے پکارے۔
 ”فرانس!“ کسی لڑکے نے آواز دی تھی۔
 ”کم آن باس!“

فرانس نے ایک بے بس نگاہ اس کے پیٹ پر پڑھ کر دیکھی اور بالیٰ نے جگہ چھوڑ دی۔ شاہی سے نکلنے سے پہلے کسی اس نے بتائی ناعصہ پر نظر ڈالی تھی۔

”مہاراجہ!“ عمر کے حد غصے میں معلوم ہوا تھا۔
 شہلا چونک اٹھی۔ وہ پندرہ دن کی چھٹی کے لیے تحریری طور پر درخواست تیار کر رہی تھی۔ بچوں ایک طرف رکھ کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔
 ”جی صاحب مجھے!“ وہ مسکراتی۔ ”خداہ جانی سے لڑائی ہو گئی ہے شاید۔“
 ”آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھ کر کے رکھے۔
 شہلا دم خم مسکراتی پھر اس نے عمر کو اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھایا۔
 ”میں آپ کی مہماؤں جانوں۔ مہاراجہ جانو کو چھوڑ کر جاتی ہوں۔“
 ”نہیں۔ آپ جا رہی ہیں۔ مجھے سب بتا چیل گیا ہے۔ آپ باہر نکل کے گھر جا رہی ہیں ان کی دوسری بہن کے۔“
 مجھے نانوں نے بتایا ہے۔ میں یہاں ناؤ کے پاس رہوں گا اور آپ ادھر شہلا نکل کے پاس رہیں گی۔ ہے نا۔“
 وہ منہ بسورنے لگا تھا، شہلا کو اس پر ٹوٹ کر ریا کر آیا۔ اس نے اسے خوش سے پہنایا۔ اس کا تھا چورا پھر اس نے بال سوار لگے۔

”عمیدہ! میں آپ کو یہاں ناؤ کے پاس صرف ایک ہفتے کے لیے چھوڑوں گی۔ میری جان بالیٰ پر اس میں بیشہ آپ کو اپنے پاس رکھوں گی۔“
 ”کہاں؟ کہاں رہیں گی؟“ شہلا نکل کے گھر؟ میں وہاں نہیں رہوں گا۔“
 شہلا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی ہاتھی میں کھل دیا ہو۔
 ”کیوں؟“ اس نے گزور سی آواز میں پوچھا۔ ”میں نہیں رہوں گا۔“
 ”وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ مومن کا گھر ہے۔ میں اس کے گھر میں کیوں رہوں؟“
 ”یہاں!“ وہ بڑبڑاتی۔ ”وہ تو مومن کی نانوں کا گھر ہے۔“
 ”تو اسی کا گھر ہوا نا؟ یہ میری نانوں کا گھر ہے تو میرا گھر ہے نا۔“
 شہلا کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیسے سمجھائے۔
 شہلا نے جواب نہ دیا۔ صرف استغماہی نگاہیں اس کے چہرے پر نکالیں۔
 ”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے پیار کا گھر ہو نا ہے۔“
 شہلا کو یوں لگا جیسے جنت اس کے سر پر آگری ہو۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جو میرے گھر ہیں نا۔ ان کا نام پرار بیٹائی ہے۔ انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے۔ اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے یہاں کی دوسری بہن جاسیں تو ہم تینوں یہاں رہیں گے۔ میں آپ اور بھائی اکتانہ آئے گا نا۔“
 شہلا کا سانس اس کے گلے میں چپکس گیا۔ اس سے آواز کا ناہوش شکل ہو گیا۔ اپنی ہتھیلیوں کو اس نے تمہو

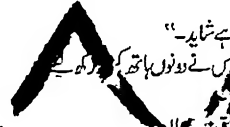
محسوس کیا۔
 ”مہاراجہ!“ اس نے شہلا کو بلایا۔ ”جیساں نا! آپ چلیں گی نا اسلام آباد!“ شہلا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ بنا سوچے سمجھے اس نے ایک طمانچہ اس کے گل پر دے مارا تھا۔
 ”نہرو کرو کو اس۔ کس نے سکھایا ہے تمہیں یہ سب کچھ۔“ وہ بھینکا رہی۔
 عمر گل پر ہاتھ رکھے سخت خوف زدہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

کانڈر براس کا قلم نہایت برق رفتاری سے رواں تھا۔ چند اسائنمنٹ تھے۔ جنہیں چند ایک روز میں پورا کرنا ہے۔ حد ضروری تھا۔ اس کا پورا پورا دھیان اپنے کام کی جانب تھا۔
 اس کے موبائل کی بجلی ختم ہو گئی تھی۔ سخت کوفت ہوئی۔
 اس نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا۔ اسے اندازہ نہ ہوسکا کہ کال کون ہے۔ اس نے منہ بنا کر کال ریسیو کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے نوٹس کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 ”ہو!“ ”عبدالباری نے اس کا گھر منہ چرو دیو کیا۔“
 ”جی جی۔“ وہ کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا ہے، موبائل تو اس کے پاس ہی ہو گا نا۔“ ترانہ نے فکر مندی سے کہا۔

”شہلا! عمت ہو، ہو سکتا ہے وہ دوش روم وغیرہ میں ہو۔“ عبدالباری نے اسے تسلی دی۔
 ”نہیں! میں جانتی ہوں! ڈس انٹینٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ ورنہ ہم اس سے ملنے چلے جاتے۔ میرے پاس صرف اس کا موبائل ہے۔“
 ”ڈونٹ ڈو! ترانہ! ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”ڈونٹ ڈو! اب جیسی سرور اور ایک مرتبہ پھر نمبر ملے گا۔“

اس نے اپنے نوٹس دیکھے۔ لیکن اب اس کی روشن اسکرین اطلاع دے رہی تھی۔ کہ کال کرنے والا بات کرنے پر مصر ہے۔ سراسر ہتھکڑی ہے۔ اس نے سچین رکھ کر فائل بند کی اور موبائل آن کیا۔
 ”جی جی!“ اس نے سچین میں ترانہ کی بات کر دی۔
 ”ترانہ! اسے ریت ہوئی۔“ میں نے آپ کو بچایا نا۔“
 ”میں ریجی کی کنز ہوں۔ اکثر آپ نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔“
 ”لوہہ! جی جی! میں کئی فائیکٹ! اسو سو سو ترانہ۔ میں اس وقت کسی اور دھیان میں تھا۔ جی کہجے کہجے مزلان ہیں۔ ریجی کیسی ہیں۔ ایوری تنگ ازل رائٹ نا؟“
 ”جی نہیں!“ ترانہ دھکے سے بولی۔ ”میں اچھے بھی ٹھیک نہیں ہے۔ عباد! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کہنا ہے۔“
 ”کہجے۔“ وہ بڑی طرح سے چونکا تھا۔
 ”عبدالباری! آپ۔ ریجی سے شادی کر لیں۔ فوری طور پر۔ آج ہی آپ کو منظور ہے؟“
 ”ہاں۔“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



PHOTO

ایقان کے دوبارہ استخار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رخصتی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونہی رشتے کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصویر کی حرکتوں کی نظر میں جاتی ہیں۔ جم ایروہ ربیعہ پر ٹھانڈے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صورت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین منہ پر دھکتی دیتی ہے۔ انیسوا، ایروہ جیلان کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے بارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور منہ کے ساتھ جا کر شہلا کو مصحفی کی انگوٹھی پہناتی ہیں شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم بھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پھار اس وقت ٹوٹتا ہے جب یہ بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۸

URDU PLOT

اس نے ایک خطرناک نگاہ گرد پیش پر اور دو سری اپنی رشتہ واپس چڑھائی تھی۔ باری مسکرا دیا۔ پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے ترانہ کے ہاتھ پر دھکے سے اسے اٹھا ہاتھ رکھا۔ ترانہ چونکا اٹھی۔ ”ریلیکس۔“ باری نے اسے تسلی دی۔ ”تم بہت شین نظر لگ رہی ہو۔“ ”شینس ہوں تو۔“ نظر بھی آؤں گی۔ ”وہ ہو کے سے مسکرائی۔ ”واحد مسلمان ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔“ اتنا وقت میں اسی لیے کٹ پائی ہوں۔ پتا نہیں وہ آئے گا بھی یا نہیں۔“ ”غیر اعلیٰ کی سبھی اپنی رشتہ واپس دیکھی ہے۔“

URDU PLOT

”وہ آئے گا ترانہ۔“ میں ”شینس سے کہتا ہوں۔ یوں بھی ہم اس کے لیے ہوتے وقت سے بہت پہلے ہی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس نے پانچ بجے آئے کو کہا تھا اور ابھی صرف سو پانچ ہوئے ہیں۔“ ”پتا ہے باری۔ جو کچھ میں کرنے جا رہی ہوں اس کے لیے بہت ہمت درکار ہے۔ مجھے یہ ہمت نبھانے کس چیز نے دی ہے۔ شاید۔ شاید میرے احساس جرم نے۔ یا پھر اس محبت نے جو میں ربیعہ کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ جب سے میں نے اسے تمدن بھائی سے شادی کرنے پر فورس کیا ہے میں ایک عجیب سی خلش ایک ناقابل بیان احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ یہ جانتے بوجھتے کہ کسی بھی طرح تمدن بھائی اس کے لائق نہیں ہیں۔ میں پھپھو کی باتوں میں آکر اسے ایک آگ کے دریا میں دھکیلنے لگی تھی۔ وہ گھر ہی آگ کا دریا ہے باری! میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر بھی پھر بھی میں ربیعہ کو وہاں عمر قید کی سزا سنانے والوں میں شامل ہو گئی۔ ربیعہ تو موم کی گڑیا ہے۔ وہ کیسے جی پائے گی وہاں؟ کھل کھل کر مر جائے گی وہ۔“

باری کمال کے نیچے ہاتھ رکھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ترانہ بات مکمل کرتے کرتے جھینپ گئی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاری؟“ ”سوچ رہا ہوں! وہ واقعی سوچ میں گم تھا۔“

”کیا؟“ ترانہ نے اچھپنے سے اسے دیکھا۔

”ایسا ہی ایک آگ کا دریا میرے گھر میں بھی بہتا ہے ترانہ۔ یہ کیسی حقیقت ہے؟ ہم انسان اپنے روتیوں سے آگ کے دریا کیوں بناتے ہیں؟ ہم پر سکون ٹھنڈی میٹھی جھیلیں کیوں نہیں بناتے ترانہ؟ ابھی تو جب یہ سب کچھ کہا تو میں۔۔۔ میں بھی ایک احساس جرم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ کہیں میں بھی تمہارے ساتھ نہ تو نہیں گزرا۔“

ترانہ مسکرا دی۔

”نہیں باری! دونوں چیزیں بہت فرق ہے۔ ربیعہ اس سیٹ اپ کا دائمی حصہ بننے پر آمادہ نہیں ہے۔ نے کبھی ایسے ماحول کو نہیں برتا۔ وہ بالکل الگ نیچر کی لڑکی ہے۔ جب کہ میں تو ہمیشہ سے ہی آگ کے دریا کی ہوں۔ مجھ پر جگمیس بدلنے سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ پھر میں خود اس بات پر ذہنی طور پر رضامند ہوں۔ کہ میں ترانہ ہوں، موسم کی گزریا نہیں۔“

باری اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ تب ہی ان کی نگاہ گلاس ڈور کھول کر اندر آتے عباد پر پڑی تھی۔ وہ اندر اب متلاشی نگاہوں سے مختلف میزوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ترانہ کو باری کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا۔ تو ان طرف بڑھا۔

ترانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ باری عباد کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم آگے بڑھا۔ ترانہ بھی کچھ کھڑکی کی طرف دھاڑا۔ وہاں کے مریضوں کے لیے تین اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے تھے۔ ترانہ جا چکی ہوئی نگاہوں سے عباد کو دیکھا۔ گرے شرٹ اور گرے جینز میں وہ ہمیشہ کی طرح فریش اور خوبصورت لگ رہا۔

شرٹ کی آستینیں کنبیوں تک موڑے وہ قدرے کچھ پوچھا۔ ”شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا اور اس گلے میں پڑا ہوا سیاہ اتویڈ دکھائی دیتا تھا۔“ ترانہ نے چشم اقصیٰ سے اسے ربیعہ کے ہمراہ دیکھا اور خوشی سے مسکرا دی۔ ربیعہ جیسی خوبصورت نازک احساس لڑکی کے لیے ایسا ہی شاندار سا بندہ ہونا چاہیے تھا۔

”جی مس ترانہ۔“ وہ مسکرائے۔ ”جی بھرتی ہوئے ہوئے بالآخر عباد نے گفتگو کا آغاز کیا۔“ ”تو اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

ترانہ نے ایک نگاہ باری پر ڈالی اور ہولے سے کھکارتے ہوئے بات شروع کی۔

”عباد! میں نے آپ سے فون پر ایک درخواست کی تھی۔“

”اور ایسی باتیں فون پر تو ہر گز نہیں ہوتیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے

زحمت دی ہے۔ اچھا ہوتا کہ آپ ربیعہ کو بھی ساتھ لے آئیں۔“

”وہی الوقت ایسی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ ترانہ افسردگی سے بولی۔ ”اور پھر اسے تو بالکل علم نہیں ہے کہ میں

نے آپ سے ایسی کسی بات کے لیے رابطہ کیا ہے۔“

اس نے عباد پر نگاہ ڈالی، وہ سوچتی نگاہوں سے اس کی گفتگو میں تسلسل آنے کا منتظر تھا۔

”دراصل عباد! بات یہ ہے کہ میری پیچیدہ اور میرے بڑے بھائی تمدن نے ربیعہ سے زبردستی کی رضامندی

کر اس کی شادی تمدن بھائی سے طے کر دی ہے۔ اس۔۔۔ اس جمعہ کو ان کا نکاح ہے۔ شروع میں تو میں بھی سوچتی

تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید ہمارے بد قسمت خاندان کو ایک بہت اچھی، سچی ہوئی، یار سال لڑکی عیسیٰ مدوی

ناعمہ کو بار بار جیسے کچھ یاد آتا تھا پھر ذہن پر بننے والے یاد کے نقش کی دوسری سوچ کی امیر میں ہر جاتے تھے۔
کون تھا وہ؟ پہلے کہاں دیکھا تھا اسے؟ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ اس سے نکلیا کیوں تھا؟ پھر اس کا نام۔۔۔ شناسا۔۔۔
جانتا پھر اس کا۔۔۔

”خواب!“ اس کے کانوں میں بار بار آواز گونجتی۔
اس کا مکرر ناعمہ کو بے بسی سے دیکھنا اور باریں بٹھانا وہاں سے ہٹنا۔ ناعمہ کے دل و دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا
تہا۔ پھر اس کی دواؤں کی سی باتیں۔۔۔ نہ سمجھ میں آئے نہ روکی جانے والی۔ کچھ مطلب تھا ان بے سرو پا
باتوں میں۔۔۔ کوئی ڈور بھی تھا جسے وہاں آجانی دوسری مصلیٰ ہو جاتے۔۔۔ لیکن وہ ڈور۔۔۔ اس کا سر۔۔۔ کہاں تھا؟

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں؟“
”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزار رہی تھی؟“
”اسی بھولن پر مر رہا تھا میں کیا خبر تھی کہ اس بھولن کے پروے میں کتنا فریب پوشیدہ ہے۔ کیا خبر تھی؟“
کیا خبر تھی؟

ناعمہ نے ارگرد اس کے الفاظ میں چھپی بے بسی چکرانے لگتی۔ اس کی سوچ کی پرواز نہ حال ہو کر گر پڑی۔
اس نے دوسری پشت سے ہٹ کر آنکھیں موند لیں۔

”اگر آپ نے وقت بیکار میں طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ دیکھ کر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے
کوشش کی۔ ”میں ٹھیک ہوں ایسا۔۔۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے؟ آپ نے جبت کو نظر انداز کر کے مجھے میری پسند کا لباس
دوا دیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔“
”ہائیں۔۔۔ ورد و دشت۔۔۔“ ”یہ تم ہی ہو ناعمہ؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔ یہ تمہیں کیا
ہو گیا ہے؟“

”میری طرف سے بھولنا۔۔۔“
”یہاں تک کہ آپ کو کسی اور کا گمان ہوئے لگا۔ آج سے پہلے کیا میں نے بھی کسی
بات پر آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا؟“

شکستہ محمود کا غریب کے خوف نے

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

نگوئے کاہتہ: ۳۷، سندھ بازار لاہور

حاصل ہو جائے گی۔ شاید اس کے ہمارے خاندان کا حصہ بن جانے سے خوش قسمتی کا کوئی درجہ ہوا
لیے بھی کھل جائے۔ لیکن گزشتہ چند روز میں مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل غلط سمجھتی اور سوچتی تھی۔
خاندان واقعی اس قابل نہیں ہے کہ وہاں ریبہ جیسی معصوم و فزنی صفت لڑکی اپنی تمام زندگی کسی ناکردہ
نا قابل معانی سزا کے طور پر گزار دے۔ وہ گھر تو کالے پانی کی سڑا۔۔۔ میں بچپن سے وہیں رہی ہوں۔ لیکن
دروہ دار میں میروم کھٹنا ہے تو ریبہ۔۔۔ تو بہت ناؤں سے بلی ہوئی ”زرم و نازک تیل جیسی لڑکی ہے۔ وہ تو
وہوں میں مرجھا جائے گی۔“

عباسیات چہو لیے اپنی نگاہیں ہلکتی ہوئی ترانہ پر جمائے ہوئے تھا۔
”وہ سزا کوئی آپشن میرے بارے میں ہے یا نہیں تھا۔“ ترانہ نے نظریں جھکا کر جیسے اسے جرم کا اعتراف
تھا۔ ”اور ریبہ بے چاری کے ذہن میں تو ایسا بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو ایک بھائی کی طرح مخلص
مددگار سمجھتی ہے۔ لیکن عباسیات پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ ریبہ کو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ایک غیر
رشتے کی ”ایک مضبوط سارے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی نظریں منہ بولے رشتوں کی طرف ہوتی ہیں۔
اگر میں کسی طرح ریبہ کو اس کھرے نکال بھی لاتی ہوں تو مجھے ایک سائبان چاہیے۔ ایک محفوظ در
چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔“

ترانہ نے نظروں میں اس بھر کر اسے دیکھا۔
”میں جانتی ہوں عباسیات اس نے لیوں پر خاموشی کی مہر لگائی ہوئی ہے لیکن اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس
آنکھیں خشک ہیں مگر اس کے احساسات خشک بار ہیں۔ وہ اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ بیٹھے گی۔ اس کے
چہرے کی اس اگر نہیں موجود بھی ہوئی تو میرا ظالم احساس ہے کہ کسی شمع کی لوکی مانند ایک ہی چھوٹک میں بجھائے
چلیز عباسی! آپ۔ آپ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی ہے۔
آپ اس سے شادی کریں۔“

عباسی نے ہلہلا۔۔۔ چند لمبے خاموش رہ کر اس نے جیسے صورتحال پر غور کیا تھا۔
”لیکن ترانہ! آپ کے گھر والے؟“ ”میں کون ذیل کرے گا؟“

”کوئی نہیں!“ وہ سیات انداز میں بولی۔
”کیا مطلب؟“ عباسی کو اب سمجھ نہ ہوئی۔ ”ریبہ آپ کے گھر میں ہے۔ اس کا جہہ تو نکال ہے ایسی صورت
میرا اس سے شادی پر ہائی بھر پاس درجہ حماقت کے زمرے میں آئے۔ آپ کا آپ کو احساس ہے؟“
”عباسی!“ ترانہ کو اس کی بات سمجھ نہ گئی۔ ”میں آپ سے کوئی بارگاہ و غیرہ لانے کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں۔
میں تو آپ سے ریبہ کو بچا کر لے جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”وہاں!“ عباسی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
عباسی الباری نے بڑی مشکلوں سے اپنی مسکراہٹ مضبوط کی تھی۔

اس کا پسندیدہ میروم لڑکی اس کی نظروں کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور مرکوز تھا۔
سوچ میں کہ میں نے اپنی چھٹکی کا ناخن دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ بجائے کون تھا وہ اب بھی جودل کو بے چینی کا عار
رہے گیا تھا۔



شائستہ رحیمی

وردہ کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے ناعمہ کے سامنے بڑے لباس پر ایک نگاہ ڈالی۔
 ”ویسے ڈریس تو واقعی اچھا پسند کیا ہے تم نے۔ بہن کر دیکھا ہے؟“
 ”نہیں۔ ابھی تک تو نہیں!“ وہ کسلمندی سے بولی۔

وردہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں پوری طرح سے کھول کر اسے دیکھا۔
 ”ناعمہ۔ تم مجھے واقعی بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔ یعنی کل سے تم نے اسے بہن کر ہی نہیں دیکھا۔ کہاں تو
 تمہارا لب نہیں چل رہا تھا کہ تم اسے وہاں ایسہو روم میں ہی بہن کر کھڑی ہو جاتیں۔“
 ناعمہ کو بہن کی باریک بینی کا احساس ہوا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا دی۔
 ”میں ابھی آپ کو بہن کر دکھاتی ہوں۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی۔
 وردہ بے ساختگی سے مسکرا دی۔



”کیا بات ہے عریشہ! سچ بتاؤ مجھے!“ ماہین سب کام سمیٹ کر اب بے حد فراغت سے اس کے سامنے یوں
 آکر بیٹھی تھی کہ فرار کے سبب ہی راستے میں دو تھے۔ عریشہ نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر نظریں چرا
 کر لب کاٹنے لگی۔ ابھی بغور اس کے آٹھ لہجہ ملاحظہ کر رہی تھی۔
 ”آپ کیسا جانا چاہتی ہیں!“ وہ دھڑکے سے بولی۔

”تمہارے لب بالکل بدلے ہوئے رویے کی وجہ! اور آج میں جان کر رہوں گی۔ دیکھو عریشہ! گزرا گزرنے سے
 کھیلنے کی عمر گزر گئی ہے تمہاری۔ زندگی کو کچھ سنجیدگی سے لو۔ اگر تمہارے ساتھ کہیں کچھ غلط ہوا ہے، کوئی
 زیادتی ہو گئی ہے، ہم سے تو بتاؤ ہمیں۔ تمہارے لب آزاد ہیں۔ کیونکہ انہی گویائی کو قید کیا ہوا ہے تم نے۔“
 ”کیا بات ہے ایسا!“ وہ پھسکی سی ہنسی نہیں دیتی تھی۔ ”آج تو بہت فلسفیانہ گفتگو کر رہی ہیں آپ! اتنے دنوں بعد آج
 آپ کو یہ خیال آ گیا کہ میرے لب آزاد ہیں۔ اور لبوں کے آزاد ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ گویائی کی طاقت ہونے
 سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو ساعتوں کی ہے ایسا۔ سننے والوں نے ساعتوں کے درمیان گزرتے ہوئے گویائی کی بے اثر
 ورسک ان پر اثر انداز نہیں ہوا۔ ان کے لب اس ساعت میں پتھر بن گئے۔“
 ماہین نے ہمدردی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”عریشہ! بہت ڈسٹرب لگتی ہو تم مجھے۔ تم یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں نافع پسند نہیں ہے یا پھر تمہیں کوئی اور
 پسند ہے؟“

عریشہ کا لب یکبارگی کسی اور تال پر دھڑکا تھا۔ ”کوئی اور“ نے عجب طرح سے احساسات کو چھوا تھا۔ اس کی
 پلکیں لرزنے لگیں۔

”بولو۔ جواب دو۔ میں تمہارا جواب سننے بغیر یہاں سے اٹھنے والی نہیں ہوں۔“

”ایسا۔ کیوں رکھ کرید رہی ہیں۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”سب چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔“
 ”جھوٹ۔ غلط۔ پورا الاؤ روشن ہے یہاں تو۔ اس کی تیش باہر والوں تک نہ پہنچے“ اس بات کا خوف ہے
 ہمیں۔ عریشہ! یہ خاندان کا معاملہ ہے۔ اور وہ خاندان جو برسوں سے ایک ہے۔ تمہاری کسی بچکانہ حرکت سے
 اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچا تو ساری عمر پچھتاؤ کی تم بھی۔ اور ہم بھی۔ ابھی وقت ہے، فیصلہ ہمارے ہاتھ میں
 ہے۔ اس لیے جو کہنا ہے وضاحت سے کہہ دو۔ تمہارا یہ رویہ گھر والوں کو تکلیف دے رہا ہے اور باہر والوں کو

عکس میں مبتلا کر رہا ہے۔ سب لوگ تمہارے اس برتاؤ کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ جب سے نافع سے تمہاری مہلت ہوئی ہے تم نے کسی سے بھی کلام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تم کہیں آگیا جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس کی شادی کی تاریخ بھرتی ہے اور تم نے اس معاملے میں بھی رتی برابر دلچسپی نہیں لی تھی۔ خاندان کی سب ہی لڑکیاں بہت شوق سے اپنی تیاریاں کر رہی ہیں اور تم دلوہا کی بہن ہوئے ہوئے بھی لائقیت سے کوئی نہیں پڑھ رہی ہو۔ آخر کیوں؟

عزیز نے سر ہٹا کر ہنس دیا۔ کیا بتائی وہ کسی کو؟ اس سارے قصے میں بتانے والی آخر کی بات تھی؟ بس صرف اتنی سی بات تھی کہ اس کا دل اس کی گھڑی کی ٹیک میں چپن لینے رہتا تھا۔ اسے انکس یا آئی تھیں۔ اسے باتیں یاد آتی تھیں۔ اور وہ یوں پھول پھولتی تھی جیسے کسی لالہ پر بیٹھی ہو۔ ماہرین اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”نافع سے کوئی شکایت ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔
 ”نہیں!“ وہ حلو کی طرح لہجے میں بولی۔ ”اس میں بے کیا چارہ لگتے کو۔“
 ”لوہ!“ ماہرین اچانک ہی جیسے کسی پیچھے پڑی تھی۔ ”عزیزہ! اجازت کی پیچھے کی۔“
 وہ نافع سے بولی تو عزیز نے اس کی نظر اس کا سر سے اٹھ کر اس کے دھڑکنے والے دل پر پڑی۔
 ”بس۔ نہیں پسند ہے۔“ وہ مدد سے بولی۔

”مجھ کو تو درس سیکھائی؟“ ماہرین نے محسوس لہجے میں پوچھا۔
 ”جس میں اس کے ساتھ کسی روئی پناے رکھو گی تو پچھنے نہ ہو جائے۔“
 عزیز لب چبانے لگی۔

”بولو۔ جو لب دھس سکتی ہو تو میں بھولوں سے بات کروں۔“ ایتان کو بچھو کو بچھ میں ڈال کر میں بول رہی تھی۔
 بات پیچھا دیتی ہوں۔“
 عزیز نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے الفاظ ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے۔ چشم تصور سے اس نے ایک مضبوط ہاتھ کو اپنے سر پر آتے اور شہرے دیکھا تھا۔ اس ہاتھ کے دیاؤں جو ماں تھا جو مجروحہ اور جو اعتبار تھا۔ عزیز کا رواد رواں اسے محسوس کر سکتا تھا۔

”بولو عزیز۔ جواب دو۔“ ماہرین جھنجھلا گئی۔ ”ہاشم بھائی کی شادی بعد سے ہوتی رہی۔“
 توڑا لے لیں یہی ہے۔ مگر جب تم ہی خوش نہیں ہو۔“
 ”نہیں کیا۔“ وہ کانپتے لبوں سے بولی۔ ”اب کچھ نہیں ہوگا میں۔ میں خوش ہوں۔“
 ماہرین نے گہری سانس بھری اور کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔

”چہرہ اپنا دیکھو۔ درست گرد۔ انسان بن کر رہو۔ اب کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور باں کل ہم تمہارے کپڑے لینے جارہے ہیں۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک تمہارے ہی کپڑوں کا کام رہتا ہے۔“
 عزیز چپ رہی اس کی پکڑوں پر کی تھی۔

نما دعو کر وہ بہتر بہت آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن وہ بہن، جس کی آرام کا اثر قبول کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ وہ بے حد منتشر لڑکیاں کا شکار ہو رہی تھی۔ بالوں سے پٹپٹے پالی سے خنک ہوئے بہتر اس نے کرٹ بدل دی اور

”ایک بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کیا راز تھا اس سارے قصے کے پیچھے۔ انیقا کا ذہن جیسے کسی خفیہ راز تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ عرصے گفتگو نے اس کے ذہن کو بے حد الجھا دیا تھا۔“
 ”وہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ اس کے کانوں میں عمر کے کہنے والے الفاظ گونجنے۔

”اور مگر کوئی بتانے سے منع نہیں کرتے؟“
 ”نہیں! وہ تو کہتے ہیں اپنی مائے میری باتیں کیا کرو۔ انہیں مہم بہت پسند ہیں نا!“
 انیقا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ صورت حال سے بہت کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر نتیجہ واضح طور پر سمجھنے ہوئے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اسے ابرار جیلانی سے اپنی گفتگو یاد آئی اور گفتگو کے دوران محسوس ہوتی ابرار کی بے بنیاد خوشی بھی۔
 ”کہوں ہے وہ خوش قسمت؟“ اس کا وہ مسکرا ناہوا سوال۔
 انیقا ہر طرح سے الجھ کر رہ گئی۔

”کیا؟ کیا؟“ انیقا کو یقین نہ آتا تھا اور کوئی تھا جو اسے اس بات کا یقین دلا۔
 ”نہیں!“ اس کا جواب تھا۔ وہ بہتر سے اترا آئی اور کھٹکے کھٹکے انداز میں کہنے میں لگنے لگی۔
 ”مگر وہ کھٹکے کھٹکے میں شریک ہیں تو وہ بہت غلط کر رہی ہیں۔ ایک بار آئے ہوئے شخص کو دوبارہ آنا سوائے غلطی سے اور کچھ بھی نہیں۔ اور اس مرتبہ اس غلطی کا نتیجہ بہت برا ہو سکتا ہے۔“ انیقا کا دل پیچنے لگا۔

اسے یہ صورت حال دیکھ کر اس کے لیے ایک سامع کی ایک ہمدردی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کا دھڑکنے والا دل بھی سننے پر ہاتھ باندھ کر کھٹکے ہوئے خود ہی سے باتیں کرتی رہی۔
 ”ہاشم بھائی! یہ شخص مجھ سے شادی کرنے والا بیویوں کا ساتھی بن جائے۔“ انیقا نے اس کے سامنے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور اس شخص کے حالات سے ایسا گزری ہیں۔ اس طرح کے حالات کے بعد تو یہ ایک عجیبہ ہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ شادی کے حالات میں اس کی غلطیوں کی معافی مل جائے گا اشارہ ہے۔ واضح اشارہ۔

شادی آج ہی اشارہ ہے۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن شادی کے وقت کچھ کرنا پڑا رہی ہیں یا پھر یہ یا پھر یہ ان کے قدم ایک بار پھر اسے رستے سے ہٹا کر رہے ہیں۔“

انیقا۔ بیٹا۔ وہ تو وہ کر کے کا روزانہ بدل کر رہا ہر کل گئی۔

جالی کے سفید پردوں کو خالی اللہ ہی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ بیڑ پر دونوں انگلیوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی وہ تجناے کیا کچھ سوچے جارہی تھی۔ کچھ دن بعد اس کی سولی اڑی ناگ پھر سے تجنے والی تھی۔ تھیلیوں سے روٹی ہوتی مندی کے رنگ پھر سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ سرخ زرد نار آچکے پھر سے لہرائے کو تھا۔ لیکن روٹھا ہوا دل سناں گزرتا تھا۔ تجناے کیا چاہتا تھا۔ لیکن شادی کے اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔ اسے خود سے باتیں کرنے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

عمر کی باتوں نے اس کے دل کو آج کی لگا دی تھی۔ تجناے وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔ شادی جانتے بوجھتے بھی بے نیاز دے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی کوشش کچھ ایسی کامیاب نہ ہو پائی تھی۔
 ”بھول کر گھر وہ ہوتا ہے ہوا ان کے ہاتھ لگا کر ہوتا ہے۔“
 ”انہوں نے میرے لیے بہت اچھا کھانا دیا ہے۔ اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے ہاتھ کی دلسن بن جائیں تو ہم

متنوں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور یہاں۔ کتنا مزہ آئے گا۔!

شہلا نے بے ساختہ ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا ہو۔

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا!“ اس کے کانوں میں ابراہیم جیلانی کی آواز گونجنے لگی تھی۔

”میرا ایک دوست یہ قربانی دینے کو تیار ہے۔ ہاں کہہ دو شہلا! ہاں کہہ دو۔۔۔“

شہلا کے لبوں سے بے اختیار ہی سسکی نکلی تھی۔ وہ تکیہ میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ گئی۔ قسمت نجانے کیوں ہر موڑ پر آزمائے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس نے مطمئن اور پرسکون رہنے کے لیے ایک راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے راہ نہیں دورا ہا منتخب کر لیا تھا۔ سامنے تو دورستے کھلے ہوئے تھے پوری وضاحت کے ساتھ۔



دوڑتے دوڑتے وہ حسب معمول روٹ گیا تھا۔ رافع کافی آگے نکل گیا پھر وہ بھی رکا اور پلٹ کر واپس آنے لگا۔ ہاشم دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس پر سفید مارشل سے بنے پٹے کو دیکھ رہا تھا۔ پام کے خوبصورت پودوں سے سجا ہوا ٹیرس فی الوقت سنسٹان تھا۔ کئی پھولوں سے لکڑی ہوئی ٹیل کے پتوں کی تنگ جا رہی تھی وہ کھڑکی بھی بند تھی۔ اس کے تیشوں لگے پیچھے پڑے دبیز پردے نظر آتے تھے رافع اس کے قریب آکر رکا اور اس کی حد درجہ خوبصورت دیکھ کر مسکرا دیا۔

”میاں رانجھے! کہا سوچنے لگتے ہو یہاں تک پہنچ کر تم۔۔۔“

ہاشم نے رافع کو دیکھا۔ اس کے لب مسکرائے لگے۔
”اب تو خیر سے شاعر ہیں جناب!“ وہ بولا تھا۔ ”اب تو میرے جذبات بہت حساسات نہیں بغیر میرے کچھ کے بھی سمجھ لینے جائیں۔ شاعر تو انسانی احساسات کے سب سے زیادہ بوجھنا ہوتا ہے۔“
رافع نے اس کے کھلتے چہرے کو مسکراتے لبوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کے دائمی ہونے کی دعا مانگی۔ دونوں اب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

”یار رافع!“ ہاشم نے اس کے کندھے پر اپنا بازو رکھ لیا۔ ”وہ جو لڑکی ہے تیرے خیال میں حقیقت میں وہ کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ رافع نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”جو خیال میں ہے وہ خیال میں ہے۔ حقیقت سے خیال کا واسطہ ہی کیا؟“

”نہیں یار! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تو نے“ اسے ”ہی اپنے خیالوں کا پیکر بنایا ہے۔ لاشعوری طور پر اتنی بڑی حقیقت تیرے سامنے ہے اور پھر بھی تو اس سے انکاری ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔“

”نہ مانے دل!“ رافع مسکرایا۔ ”اسے منانا میری ذمہ داری تو ہے نہیں۔ اور میاں رانجھے! تمہیں یہ گمان کب سے ہوا کہ میں تم سے کچھ چھپاتا ہوں۔“ اس کا وجود میرے خیالوں کی اس ماورائی دنیا میں نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔“

ہاشم کو ابجھن نے آگھیرا۔ دونوں اب پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک بیچ پر بیٹھ کر رافع گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے صبح کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمو نے لگا۔

پجاری کی طرح تمہارا خون بہا کر اس گھر کے لیے عافیت مانگ رہی تھی۔ ربیعہ! بہت بڑی زیادتی کرنے جا رہی تھی میں تمہارے ساتھ۔“

”ایسا نہ کو ترانہ! ربیعہ! ہسنگی سے بولی۔ ”میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا، کوئی شکایت نہیں کی۔ پھر تم کیا ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں جانتی ہوں ربیعہ! تم کتنی صابر، شاکر، معصوم اور نیک فطرت لڑکی ہو۔ اسی لیے تو میری نیت میں بھی فرق در آیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گھر اور اس گھر کے مکین اس لائق ہی نہیں ہیں کہ تمہاری جیسی بے غرور اور بے لوث لڑکی اپنی خوشیوں کی قربانی دے۔“

ربیعہ خاموش رہی۔
”مجھے معاف کرو ربیعہ! لیکن تم سے پوچھتے بغیر ہی میں تمہارے مستقبل کے بارے میں ایک فیصلہ کر بیٹھی ہوں۔! ترانہ قدرے شرمندگی سے بولی۔
”میں تو یہ فیصلہ کب کا قبول کر چکی ہوں ترانہ! ربیعہ نے گہری سانس بھری۔ ”تم اب اس بات کا ذکر کیوں کر رہی ہو؟“

ترانہ نے سر اٹھا کر محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔
”نہیں ربیعہ! میں کسی اور فیصلے کی بات کر رہی ہوں۔“
”اور فیصلہ کیا ہے؟“

”ربیعہ! کل سنا تھا رات کو اسی وقت ہم لوگ خاموشی سے اس گھر سے نکلیں گے۔“ ترانہ مدھم آواز میں بولنے لگی۔ ”ہم لوگ۔“ وہ بول جاں گے۔ یہاں عبادہ ہمارا انتظار ہوگا۔“

ربیعہ حیرت سے بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔
”ربیعہ! ہوٹل میں باری اور باری کے ایک دوست کے ساتھ عبادہ تمہارا انکل چڑھوایا جائے گا۔ پھر ایک گھنٹہ بعد تم دونوں رات میں بیٹھ کر کراچی پہنچے جاؤ گے۔“ وہ بولنے لگی۔
”ترانہ! ربیعہ بمشکل بول پائی تھی۔ ”تم۔“ تمباگل ہو گئی ہو یا نہیں۔
”نہیں ربیعہ! میں اب مکمل بخیر ہوں جو اس میں آچکی ہوں۔“ وہ بولنے لگی۔ ”میں بہت دنوں میں پہلے ہو گئی تھی۔“ ترانہ سکون سے بولی۔

”جانتی ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کرنے جا رہی ہو؟ تم اس گھر کا ایک فرد ہو ترانہ! تمہارا ہر قدم اس کی بہتری اور بھلائی کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اور تم۔ یہاں آگ لگا دینے والا کام کرنا چاہتی ہو؟“ ربیعہ جذباتی ہو گئی۔
ترانہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ہاں ربیعہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچھ دن پہلے تک میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرا ہر قدم ہر عمل صرف اپنے گھر کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اب میں جان چکی ہوں کہ صرف اپنے گھر کے متعلق سوچنے والے خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کی خوشی کے لیے کسی معصوم کی زندگی بھونک دنا سخت ترین خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں خود غرض بن کر جینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”اور میں ایسا کچھ بھی کرنے پر تیار نہیں ہوں ترانہ! ربیعہ! ہسنگی سے بولی۔ ”مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”ربیعہ! ربیعہ! ترانہ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”تم باگل مت بنو! اس گھر میں کوئی تمہارا ایسا خیر خواہ نہیں ہے جو تمہارے اس ایثار اور خلوص کے بدلے تمہیں کبھی چاہت اور محبت کا ایک لفظ بھی خیرات میں دے

دے۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھ سے۔ میں نے اس گھر کی بنیادوں کو اپنا خون جگر دیا ہے۔ اور اگر آج میری طرف سے رتی برابر بھی کوتاہی ہو جائے تو یہ لوگ میرا خون پیئے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے خونی رشتوں کو بخوبی جانتا ہوں۔“

”جو بھی ہے ترانہ۔! اب یہی میرا مقدر ہے۔“ ربیعہ آنسو پی کر بولی۔ ”ان باتوں پر سوچئے اور بولنے کا وزن گزر چکا ہے۔ اب تو فیصلے پر عمل درآمد ہونا پائی ہے۔ سو ہو جائے دو۔ اور پھر میں تمدن بھائی سے شادی کر رہی ہوں، لیکن عباد بھائی سے۔ کبھی نہیں۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ اور وہ۔۔۔ وہ کیسے مان گئے؟“ ربیعہ کی آنسو بہا گئی۔

”آنسوؤں نے اپنی رضامندی تمہاری رضامندی اور خوشی سے مشروط کی ہے ربیعہ۔! ترانہ نے جیسے کسی گناہ اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اور میں قطعاً رضامند نہیں ہوں۔“
”ربیعہ! یہ تو قوتِ متِ غصہ تم کھائی میں گرنے جاری ہو۔“ ترانہ جیسے گڑگڑائی تھی۔
”یہ رستہ تم نے ہی تو چنا تھا ترانہ! وہ یاسیت سے بولی۔ ”اب یہ کنویں کو جائے یا کھائی کو۔ میری قسمت۔!“

ترانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ! ٹپ! ٹپ! کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

وہ یوں روئے روئے انداز میں چلتی ہوئی فون تک آئی تھی جیسے دوسری جانب وہ دیکھ ہی رہا ہو گا۔ چند لمحوں میں اس نے ریسپور کو غصے سے گھورا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی، پھر ریسپور اٹھا کر کان سے لگایا۔
”ہوں۔!“ وہ بولی تھی۔

”ہیو۔!“ دوسری جانب صورتِ حال سمجھنے پایا۔
”ہوں۔!“ اس نے اصرار کیا۔

”بھئی یہ“ ہوں کیا ہے؟ نہ وعادہ سلام۔ منہ میں کچھ رکھا ہے کیا؟
”ہاں! غصہ رکھ ہے۔“ منہ میں کچھ رکھا ہے کیا؟
”ہاں! غصہ رکھ ہے۔“ عاشر نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ ”بے وجہ غصہ تو نر و ماغی کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ہماری پیاری سی بیگم صاحبہ خروغ ہو گئی ہیں شاید۔“

”ایقان نے ایک ہاتھ سے ریسپور سنبھالا ہوا تھا دوسرا ہاتھ اس نے لڑنے والے انداز میں کمر پر رکھا تھا۔
”اس وقت اگر تم میرے سامنے ہوتے نا۔!“ اس نے دانت میسے۔
”اچھا! پھر کیا کرتیں؟“ اس نے بہت سارو مانس لہجے میں سمو کر پوچھا۔
غصہ سے بھری ہوئی ایقان دفعتاً ہی مسکرا دی تھی۔
”عاشر تم!“

”ہاں بھئی۔۔۔ ایسے خوبصورت جملے ادھورے نہیں چھوڑا کرتے۔“ وہ مسلسل اسے چیخنے کے موڈ میں تھا۔ ایقان کو اپنی بے بسی پر رونا ہی آگیا۔ اس کے آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔
”ہیلو۔ دیکھو تمہاری خاموشی بھی خوبصورت ہے بیگم۔! لیکن میرا بل اگر تمہاری کھٹکتی آواز سے سب سے تو زیادہ اچھی بات ہے۔“

ایقان نے زور سے ”سوں“ کیا تھا۔ بصورت دیگر اسے علم ہی نہ ہوا تاکہ وہ رد رہی تھی۔

”ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ اوہ۔۔۔ دیکھو ایقان! یہ بہت بری بات ہے۔ تم مجھے اتنی دُور ہونے کی سزا تو موت دے۔“
 ”سزا تو تم مجھے دے رہے ہو عاشر! شاید اس محبت کی جو میں تم سے کرتی ہوں۔ آخر تم مردوں کو بیوی کر لینے میں کیا لطف آتا ہے۔“ وہ سبک کر گئی۔

”ہاں یا ر! مزہ تو خیر آتا ہے۔ لیکن آنسوؤں کا سارا لطف تو قرب میں ہے انہیں اپنے ہاتھ سے نہ صاف کر
 تشنگی نہیں جاتی۔ اس لیے تم ان آنسوؤں کو میرے آنے تک سنبھال کر رکھو۔ فون پر تو بس تم ہنسی ہوئی ان
 لگتی ہو۔“

”اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا تم نے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”میں یہاں نہیں تھا یا۔۔۔ کمپنی کے کام سے تانسواں گیا ہوا تھا۔“

”وہاں فون لاسز نہیں ہیں؟ کوئی گاؤں ہے؟“ وہ بھڑکی ”یا میرا نمبر بھول گئے تھے تم؟“ عاشر کو ہنسی آگئی۔

”ایسا کچھ نہیں تھا جانو۔ میں بڑی بہت زیادہ تھا۔ اب معاف بھی کر دو۔ ساری کال تو تم نے لڑنے میں
 ضائع کر دی ہے۔“

”عاشر! تمہیں میرے جذبات کا بالکل خیال نہیں ہے۔“ اس نے خود پر قابو پایا۔ ”جس طرح کی صورت
 حال سے میں گزر رہی ہوں۔ اس میں یوں۔۔۔ اٹلا اور پریشان رہنا کتنا مشکل اور کتنا خطرناک ہے۔ تمہیں اس بات
 بھی احساس نہیں ہے کہ ایک کمانے کے چکر میں پڑ کر تم ہر طرح کی فکروں سے بے نیاز ہو گئے ہو۔ مرد کا کام صرف
 اور صرف کمانا ہی تو نہیں ہے عاشر!“

عاشر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ ایقان کا لفظ لفظ سچا تھا۔ وہ اپنی سچائی کہاں سے پیش کرتا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ایقان!“ پھر وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ ”میں واقعی اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گیا

ہوں۔ شاید تم پر بے پناہ یقین کا مظہر ہے کہ میری ایقان مجھے سب کچھ بہت احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔
 ”ہاں۔۔۔ بس ایک اپنا دل ہی نہیں۔۔۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ حالات کی کیا پوزیشن ہے؟ ہاشم میاں کے ان کے کتنے بیٹے ہو رہے ہیں؟“

”اچھے ہفتے بار تاحات ہے۔ بس اب کسی بکارتیا بولوں میں گئے ہوئے ہیں۔“

”میرے بچوں کے کپڑے بہت اچھے ہوتے جاہلیں۔ اور یہ ویسی۔۔۔“

ایقان نے گہری سانس بھرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”اپنا خیال رکھنا۔ اور بچوں کا بھی۔ سب کو سلام کہنا۔ خدا حافظ۔“

لائن ڈس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے بے دلی سے ریسور رکھا۔ الفاظ جیسے اپنے معنی اور اپنا اثر کھوئے
 جا رہے تھے۔



نافع اور علی ڈھول کا ایک ایک سائیڈ بری طرح سے پیٹ رہے تھے اور حمزہ کھڑکی والی ڈال رہا تھا۔ لڑکیوں کی ڈال
 رستے میں ہی رک گئی تھی اور اب حیرت اور غصے سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”یہ یہ پھاڑ دیں گے اس ڈھول کو۔“ ثانیہ قدرے حلق سے بولی۔ ”جنگلوں کی طرح سے پیٹ رہے
 ہیں۔“

”اوس۔ اوس۔ اوس۔“ حمزہ نے اس کی بات سن کر افریقی قبائلیوں کی سی تان لگائی۔ علی اور نافع نے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و خوض کیجیے۔

بھی کا گواشا نکل اپنا لیا۔ اب حمزہ قبائلیوں کا مخصوص رقص پیش کرنے لگا۔

”بھئی کیا بد تمیزی ہے یہ۔۔۔“ ورہ بھنا کر آگے بڑھی۔ ”ہم نے یہاں یہ سارا اربن منٹ تمہارا یہ جنگلی راز دیکھنے کے لیے نہیں کیا ہے۔ واپس دو ہمارا ڈھول۔۔۔ ہمارا بہت اچھا موڈ ہے اس وقت۔ اسے خراب مت پلین۔“

”ان سب کو درختوں سے باندھ دو۔ اور لاؤ روشن کیا جائے!“ علی نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر پڑھا۔ انداز میں باندھ لیا۔

”یہ ایسے نہیں ماننے والے۔“ ماہین نے حسام کو گود سے اتارا اور آگے بڑھی۔

علی اور حمزہ بڑی بہن کو خطرناک تنہائیوں سے اپنی جانب آتا دیکھ کر بدک کر بھاگے۔ نافع بیٹھا مسکراتا رہا۔ وہ اپنا رشتہ بخوبی پہچانتا تھا۔ ماہین کے کپڑے مسکرا رہے۔

”متم کیا سمجھتے ہو؟ بہت لمبا ناکوں کی میں سارا ہے؟“

”کرنا تو چاہیے!“ وہ سر زارت سے ہنسا۔

ماحول کی خوش گواریت محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک شریر سی نظر لڑکیوں کے درمیان کھڑی عریشہ پر ڈال دیا۔ عریشہ کے گال سرخ ہو گئے۔ اس کے اندر ناگواری کی بہت منہ زور لہر اٹھی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”اے عریشہ! جب تک!“ اب ماہین قدرے رسوائیت سے بولی۔ ”نہیں تو ہم آپ کے جوتے چھپا دیں گے۔“ ایک قہقہہ لگا۔ نافع چیخ مچ بہت تجل ہوا تھا۔ کان کھجنا وہ لڑکیوں کے درمیان سے نکل گیا تھا۔

”جیو تان سین کی شاگردوں تان لگا۔“ ماہین نے ڈھول بجا لیا۔ عریشہ نے ہی اس ساز کو بجانے میں مہارت رکھتی تھی۔

اس نے ایک ساتھ ڈھول پر مارا اور اگلے ہی پل دکھ سے چلائی۔

”کیا ہوا ہے؟“

لڑکیاں چونک اٹھیں۔ ڈھول کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔

بہت دیر تک وہ فون کے پاس ہی کھڑی رہی تھی پھر اسے دھیان آیا۔ لڑکیوں کا ارادہ تو پچھلے لان میں جمع ہو کر گانے بجانے کا تھا۔ وہ بھی رائتمہ کے ساتھ وہیں جا رہی تھی جب عذرا انیکم نے اسے عاشر کے فون کا بتایا۔ فون کے پاس سے ہٹ کر وہ رافع کے کمرے سے نکل آئی۔ بے دلی اور بے دھیانی کے عالم میں اس نے پورا سیڑھی پر نجانے کس طرح سے قدم رکھا تھا کہ پیراس کا بوجھ نہ سہا پایا۔ ایقان ایک دردناک چیخ کے ساتھ لوٹنے ہوئے آخری سیڑھی پر آگری تھی۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شمسلا، ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ، ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ، صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نشانج کی دھمکی دیتی ہے۔

انیتھا، ابراہ جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شمسلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شمسلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور سہیل کے ساتھ جاکر شمسلا کو منگنی کی انگوٹھی پسنا تی ہیں، شمسلا، ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو لے کر ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن، ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے، اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پازا اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

19

سوسائٹی

”اٹھو بیٹی۔ یہ ذرا سی سخی بی لوس۔“ شفیقہ حیات نے بہت محبت سے اسے نکارا۔

ایقان نے بے دلی اور جھوٹے زاری سے سخی کا پیالہ دیکھا پھر اس نے نفی کی سرکھائی کی۔

”نہیں اماں! بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔ صبح بھی بھاگتی جاں لے کر زبردستی ایک پیالہ پلا دیا تھا۔ اب تو ذرا بھی من نہیں ہے۔“

”نہ بیٹی! انہوں نے اسے کھانا دیا تو وہ من نہیں دیکھتے، جسے وہ جاننا چاہتا ہے وہ نہیں دیکھتا۔“

اتنی ہی جلدی اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ گی اپنے پیروں پر۔ شاباش۔

ایقان چند لمحے چھت کو گھورتی رہی۔ دنیا بھر کی بے زاری اور کوفت اسے اپنے اندر بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی سے کلام کرنے کوئی نہ چاہتا تھا۔ آنکھیں موند کر لیٹے رہتا ہی ہر غم کا علاج محسوس ہوتا تھا۔

شفیقہ حیات اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ ان کے انداز میں محبت بھرا اصرار تھا۔ ایقان کو محبت سے منہ موڑنا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔ وہ ناچار اٹھ کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”اے بچوئے موئے حادثات تو عورت کے مقدر کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں بیٹی! ان کو اس طرح دل پر لے لینا اچھا نہیں ہے۔“

انہوں نے موقع غنیمت جان کر اسے سمجھانا چاہا، ورنہ وہ تو پچھلے چار دن سے کسی سے دو لفظ بولنے پر آمادہ نہ تھی۔ کسی بے جان لاش کی طرح دن رات آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔

ایقان نے پیالہ لیوں سے ہٹا کر ماں کو ایک نظر دیکھا۔ اس کی نظروں میں افسردگی اور عجیب سا گلہ تھا۔ شاید ان کی بات اس کے دل پر لگی تھی۔ شفیقہ حیات اس کی نگاہوں کی زبان سمجھ گئیں۔

”اٹھ اولاد اس ہوئی تھیں میری، چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ان میں سے صرف چار نے زندگی پائی۔ اللہ تم چاروں

”شعلا کی زندگی میں پھر سے ہمارا لوٹ آئے اس کے لیے اس کی مخلصانہ کوششوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر خوشی منانے کو تو میرا دل بھی ہائی نہ بھرتا اور شعلا۔ وہ کہاں مانتی تھی دن بعد نہ سہی دوں ملن بعد کسی۔“

”انفیکہ نے نظروں کا زادیہ بن کر انہیں دیکھا اور دھڑے سے مسکرا دی۔

”کہنئی تو آپ ٹھیک ہی ہیں۔ ایقان آپ کی کاہت ہے ہاتھ ہے یہ رشتہ یوں آسانی سے طے ہو جائے میں اور ان کے بغیر خوشی میں ہاگل بھی موند نہ آتا۔“

”شعلا کہاں ہے؟“ منیوہ بیگم نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھ سے کمرے سے ہی نہیں لگتی۔“

”بیگم! ہوں گی اور اس شاعری کی کوئی کتاب کھولے۔ عجیب ہی مخلوق ہیں قسم۔ میری شادی اتنی قریب ہو تو میں صرف شادی کے گاؤں کی کتاب دھووں اور اچھے اچھے گانے سلکٹ کروں، انہیں تو کوئی دل چسپی ہی نہیں ہے۔ میں نے اتنا اچھا باطن لاکر دیا تو یوں۔ مجھے اس کی خوشبو سے سخت اڑی ہے۔ مندی کے ڈرائن دکھائے تو یوں۔ کہنئی کی ہلکا سا زبانی ہو زیادہ میل بولنے نہ ہوں۔ ان کا بس طے تو سفید رنگ کا ٹیگ ڈریس پہن کر بیٹھ جائیں۔ ان کی شادی والے دن۔ کہہ دیں گی کیا فرق پڑنا ہے۔ سب کل تو اس جملے کی رٹ لگاتی ہوئی ہے انہوں نے۔“

”انفیکہ! جل کر مر رہی تھی۔ منیوہ بیگم مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے دیکھتی رہیں۔

”ہاں! تو تو سہی۔ کہنئی ہی ہیں سفید لباس بھی۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”مجھے تو خود سہ پند ہے سفید لباس۔“

”اب میری کاہت ہے۔“ ان کی صورت دیکھی۔ ”کمال ہے ای۔ اچھا! آپ نے کون سے رنگ کا لباس پہنا تھا ان دنوں؟“

”سفید بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انفیکہ! تیرا ہونا ان کی صورت دیکھ کر ہرگز نہ ہو گا۔“

”اس سے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے عماد و موس کو دیکھا پھر مسکرا دی۔ وہ نہا کر اوش دوم سے نکلی تھی۔ سبیلے باولوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی تک چلی آئی اور۔ وہ ہنا کر سلائیڈنگ ڈور کھٹکا دیا۔ باہر منظر خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے سرخسی ٹکڑے چل دی کر رہے تھے۔ کہنیں چھپے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے کناروں کو رو بہلی نیل لگا دی تھیں۔ ہوا میں باقاعدہ سی خوشبو تھی۔ شعلا کی خوبصورت سیاہ آنکھیں باولوں سے پرے دیکھنے کی جستجو کر رہی تھیں۔ پاس رکھے موبائل کی بھپ بھپتے گلی تھی۔ اس نے ہاتھ دھوا کر موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو شعلا۔“ دوسری جانب مؤذ خوشگوار تھا۔

”شعلا! کہاں لکھ بھر کے لیے اس کے سینے میں مقید ہوا پھر پھر پھر کر لگا۔ اس سے کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔

”شعلا! ابراہیم اب کر رہا ہوں۔“

”یہ۔ یہ۔ یہ۔“ وہ دکھائی۔

”کو سلامت رہے۔ میری آنکھوں کی خشک ہو تم لوگ لیکن جو چار نہ رہے۔ ان کا دکھ آج تک سینے میں محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس زمانے میں نہ تو یہ ان کیوں کا طریقہ تھا۔ نہ ہی دوسرے جدید علاج نکلے تھے بیمار یوں کے چار بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑنے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے آنکھوں سے آگے بھیجا ہے۔ جتاو بھی اپنی آنکھوں سے نہیں جھپٹتے ہیں۔ کلام کرتے ہیں۔ تم لوگوں کی خوشیوں اور تندرستی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تم اس حالت کے کو روک گئے۔ یہ بھی ہو۔ بچے تمہارے ارد گرد پھر پھر کر پائوس ہو کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ ان کا خیال کر انہیں بار بار دہاتی ہو۔ عجیب ہوتے ہیں پھر تھے ہیں دونوں۔“

ایقان کو ان کی باتوں سے کچھ گونہ نہ لگی۔ اس کے دل کو قرار آیا۔

”کہاں ہے ایمان؟ کس کے ساتھ ہے؟ اور موس کیا کر رہا ہے؟“ اس نے بے چین سے ہو کر پوچھا تھا۔

”شفیقہ حیات مسکرا دیں۔

”ایمان کو دورہ اپنے ساتھ لے گئی ہے اور موس کو شعلا ساتھ لے گئی تھی۔ جب کہ اس نے اس فون آیا تھا کہ رہی تھی کھانا کھا کر عرس کے ساتھ ہی سو گیا ہے۔

ایقان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اس نے بھی کچھ نہ بولا۔ سلائیڈنگ ڈور کھٹکا دیا۔

”دیکھا سوچتی ہو کہی شعلا بھی اور یہ چار ہاں شام اس کے خوش تھا۔ اپنی بڑیت کے شعور سے۔ میں نے اس۔ اور انوں کو مزید اختلاف کی سرا ساری۔“

”اے لہ۔ اچھی کی۔“ انہوں نے برامان کر اسے دیکھا۔ ”بیٹی! ابھی پر کس کا زور؟ جس وقت ملنا لکھ دیا ہے۔ اسی وقت ملیں گے۔ نہ گھڑی بھر آگے نہ گھڑی پچھلے۔ تم سے بھلا کسی کو کیا شکایت ہوگی۔ تم تو خور و وقت سب کی توجہ اور ہمدردی کے لائق ہو۔ لا حول ولاقوتہ۔ یہ کیا کچھ خرافات سوچتی رہتی ہو تم۔ یہ بھڑکے برات چلی جائے گی۔ ہمارے ہاں حد شکر کہ شہر گھر یوں کا فضول کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی لمحے غدا پر بیگم جس کا گلاس کے گرد داخل ہوئی تھیں۔ ایقان کے لبوں پر نہ چاہتے تھے۔ یہ بھی اوس ہی مسکراہٹ دہاتی۔

”بیگم! کئی شفت تیار ہے۔“ وہ بولی۔

”شفیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

”بے چاری ایقان!“ منیوہ بیگم تاف سے شعلا کے کپڑے اپنی کس میں رکھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”مگر قدر خوشی خوشی شادی کی تیار یوں میں تھے۔ رہی تھی اور کابانی حادثہ پیش آیا۔“

”بس ای کی!“ انفیکہ نے کمری سوچ کے اثر سے نکل کر سانس بھری۔ ”میرا دل تو لکھ بھر کے لیے چھپے کسی مٹی میں دیوچ لایا تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اچانک ہوا کیا ہے۔ جس تاریخ کا تھے دن سے شدت سے اختلاف تھا۔ وہ تین روز بعد ہے لیکن اب۔“

”دل برا نہ کہو۔“ منیوہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”انہوں نے زیادہ دن آگے نہیں بڑھائے۔ صرف ہفتہ بھر کی سلت لگ چکی ہے۔ ایقان صحت یاب ہو جائے، کسی خوشی شادی میں شریک ہو تو ہمیں بھی خوش ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔

”عمر نے تپا تھا۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔

”نہیں، لیکن آپ کو اس طرح سے مجھے فون نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے خشکی سے بولی۔
 وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہا۔ ”تمہیں برا لگا؟“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔
 شملہ اس غیر متوقع سوال پر جھنجھلا سی گئی۔

”بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے برا برا۔ ہمارے بچ کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔

”شملہ! بہت سے لوگوں سے ہمارا کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی ہم ان سے ملتے ہیں بات کرتے ہیں۔“

”برا برا جو تعلق بن کر ٹوٹ جائیس ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔“

”گنجائش نکال جاسکتی ہے شملہ!“ وہ قدرے لجاجت سے بولا۔ ”جتنی سبک دل کیوں بن رہی ہو؟“

”برا برا لینے۔“

اندر قدم رہتی انقیہ ٹھٹک کر رک گئی۔ دروازے کی جانب شملہ کی پشت تھی۔ انقیہ بھی اسی سمت سے ایک طرف ہو گئی۔

”شملہ! کچھ ناگ تو نہیں رہا ہوں تم سے میں صرف چند خوشگوار لمحوں پر جو یہ سوچے بغیر میری شہر کے جاسٹس کے کون سا تعلق تھا، کون سا ہے کون سا ہو سکتا ہے۔“ اس قدر غلامی میں آ کر کیوں سوچنے لگتی ہو اور پھر ہمارے درمیان ایک تعلق ایسا جو ٹوٹنا ناممکن ہے۔ میں دور تم ایک دور میں بندھے ہیں اور اس دور کا نام عمر ہے کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو؟ کیا یہ سچ نہیں کہ تم جس بچے کو دیکھ کر جیتی ہو، میں اس بچے کا باپ ہوں۔“

شملہ حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک آنچھٹا آنچھٹا آواز میں رواں ہوئی۔

”برا برا! تم۔ تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”شملہ! میں تو صرف تمہیں۔ نئی زندگی کی ابتداء کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”تین دن بعد تم کسی خوش قسمت کے درویدوار سے مل جائے جا رہی ہو۔ میں نے سوچا، تمہیں دیش کروں۔“

”تین دن بعد نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”ایک مسئلے کی وجہ سے میں یہ نہیں کر سکتا۔“ وہ فوراً ہی بولی۔

”چھپا۔“ وہ گویا مسکرایا تھا۔ ”مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سانس میرے حلق میں پھنسی ہوئی ہو۔ تم نے کچھ رلیف سارا ہے یہ خبر نہ کرنا۔“

”برا برا! پلیر، مجھے اس طرح ڈسٹرب مت کرو۔“ شملہ کو روکنا آنے لگا۔

”وہ کسے۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”تم ڈسٹرب مت ہو۔ میں تمہیں بالکل بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

”خدا حافظ۔“ شملہ حتی انداز میں بولی تھی۔

”عمر کا خیال رکھنا شملہ!“

”تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ ”میں اس کی ماں ہوں۔“

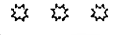
”جانتا ہوں۔“ اس کا کاجہ مٹھاس لیے ہوئے تھا۔

شملہ پھر خشکی تھی۔

”پھر بھی۔ میں یہی کہوں گا۔“ عمر کا خیال رکھنا۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ نیک کیمز۔
 رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ شملہ نے گہری سانس دیکر موبائل سامنے پر رکھ دیا۔

ابراہم کے انداز غیر متوقع تھے۔ شملہ کو کسی گزربڑکا احساس ستانے لگا تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد ابراہم کو پر شوق انداز میں دیکھ رہی تھی اب ان ہی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سو سوچیک لٹت ہی بدل رہا تھا۔

باہر کوئی انقیہ ایک عجیب کش کش میں گرفتار آئی، ہی سوچوں سے جنگ کرتی اپنے ہی واہموں کی لٹی کرتی مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔



موسم پر اثر آ رہا تھا۔ ربیعہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اسے انداز نہ تھا کہ اچانک ہی ماحول میں اس قدر تبدیلی آجائے گی۔ وہی بادل جو کچھ دیر قبل خوشگوار سرسری رنگت لیے ہوئے تھے، ایک کالے سیاہ ہو گئے۔ کول، متوال ہوا نے اچانک ہی چولا بدلا اور کچھ بڑوں کی شکل اختیار کرنے لگی۔ پانی کے موٹے موٹے قطرے ابل کے اوپر اور پھر چاروں طرف گرنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے اوپر چھت سی بنانے کی تاک میں کھڑی ہو گئی۔

”اچھا۔“ وہ ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں جلتے جلتے نہ آبادی سے بہت دور نکل آئی تھی۔ وہ تو جیسے کسی سنسان سی جزیرہ کے لیے آئی ہو۔ اس کے آس پاس آگے پیچھے بھڑکے کے ڈھیرے ہوئے تھے۔ دور کسی جھلک کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مشکل فطری میں کہاں جائے، کس سے مدد مانگے؟ بارش آہستہ آہستہ شدت پکڑنے لگی۔ سڑکوں کے چھڑکے لگے۔ ماحول کی لاسیہا ہو چلا گیا۔ سارے منظر جیسے لگا ہوں سے مچل ہو گئے تھے۔

”میں کہاں جاؤں؟“ ربیعہ کے دل نے دہائی دی۔
 ”میں کہاں جاؤں؟“ وہی آواز اب اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہونے لگی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

”میں کہاں جاؤں؟“ وہی آواز اب اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہونے لگی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

”ربیعہ۔ ربیعہ! یہاں آؤ۔ یہاں۔ میرے پاس۔“ دعوت میں اصرار تھا۔
 ربیعہ مزید پریشان ہو گئی۔ اس کا ذہن آواز سے شناسائی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ کس کی آواز تھی اسے پوری طرح سے انداز نہ ہو پایا تھا۔

”واؤ۔ واؤ۔“ ربیعہ نے زور سے پکارا۔ ”واؤ۔ یہ آپ ہیں؟“

اس کی آہنی ہی آواز کی گونج کا کام ہو کر پلیٹ آئی۔ دعوت دینے والی آواز اب غائب تھی۔

”واؤ۔ واؤ۔“ اس کی آواز اب کہاں کہیں؟ ”آپ کہاں ہیں؟“ وہ چلائی۔
 چاروں طرف اب گہرا سناٹا تھا۔ ربیعہ نے محسوس کیا بارش اب ختم ہو چکی تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کبھی کبھار کوئی بوند ٹپک کر سناٹا توڑتی تھی۔ اس ٹپ ٹپ کی آواز میں عجیب سی تنہائی کا احساس اور خوف تھا۔ ربیعہ کو شدت سے خوف محسوس ہوا۔

”ریجہ! کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کمرے سانس لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا وہاں وہاں کھڑا تھا۔ اس کا حلق و حویں میں پڑے ہوئے گھرنے کی مانند خشک ہو رہا تھا۔ بدن میں ارتعاش تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اس طرح لیٹی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھی۔ اپنے منہ سے ہاتھوں کو آپس میں مل کر اس نے بدن کے ارتعاش اور سردی کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی پھر بیروں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ آہستہ سے چائیاں سے اتر کر اس نے چادر کو انہی طرح سے اپنے ارد گرد ڈھیلنا اور باہر کی جانب قدم بڑھانے کمرے سے باہر نکل کر وہ یکن میں جانا چاہتی تھی، جب اس نے منورائین کے کمرے سے آتی ہوئی آواز سنی۔

ریجہ کو چند لمحوں تک ان سمجھی سمجھی آوازوں کا مفہوم سمجھ میں نہ آ سکا پھر وہ قدرے تیزی سے ان کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اگلے ہی لمحوں میں وہ دروازے کے ایک طرف، کئی کئی کمرے کا منظر ناقابل برداشت اور ناقابل یقین تھا۔

تو ان نے منورائین کو گردن سے پکڑا ہوا تھا اور وہ انہیں جھٹکے ہوئے رہا تھا۔ ریجہ نے اپنی جی کو اندر سے گھونٹنے کے لیے لبوں پر ہنسی سے ہاتھ رکھ لیا۔

”تمہیں درد تمہیں درد پڑنے لگی۔ سمجھتے تھے تم۔ وہ کئی کئی سالوں کا خیال لے لوں گا میں تمہاری۔“

تو ان بہت دبی دبی لیکن نہایت درشت آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ کھانسنے اور ہانپنے لگے۔ تھے۔ ریجہ نے خوف زدہ نظروں سے ذرا کی ذرا اندر دیکھا۔ وہ کمرے کے گرد گئی تھی۔ ساتھ وائٹ کے لمب کی زور دی روشنی میں تو ان کی دیوانے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے بال کھڑے ہوئے تھے، آنکھیں چڑخی ہو چکی تھیں اور سر ہلکے تھیں۔ لبوں سے گویا جھاگ سا نکل رہا تھا۔

”بڑ بخت! کہنے، نا فرمان! منورائین نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ ”تو کیا جھٹکتے ہو میری جان لے کر تو وہ رہ گیا ہے! کچھ بھی نہیں مروا۔ کچھ نہیں۔“ لے لے لے تو میری جان۔ باروے مجھے۔ میں دیکھتا ہوں کیا طے کرے۔ چڑا کی بیٹ بھی مل جائے تو کتنا ناخلف۔“ وہ کچھ کہنے لگا۔ ”تو میرا بڑا بھائی۔“

”ابو نہ! تو تنہا لے کر چلا۔“ ”تمہاری فکر کر رہا ہوں! ایسے میں جانتا نہیں تمہاری یا رسائی کمرے تمہاری قبر میں کیا کچھ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

وہ اپنی چٹری ڈھونڈنے لگا تھا۔

ریجہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ترانہ کھڑی تھی۔

”ترانہ۔ ترانہ! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ وہ کانپتے ہوئے بول رہی تھی۔ اسے جیسے بخار چڑھنے لگا تھا۔ ترانہ نے متانت نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے اپنی مثال انار کا سے بہادری۔

وہ دونوں بچت پر ہنسی ہوئی تھیں۔ چار بجے کا عمل تھا۔ اتر پر اب پوچھنے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ بلاشبہ

رک رک کر چل رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا ریجہ! لیکن تم نہیں مانتیں۔“ ترانہ بولی۔ ”جانتی تھی میں۔ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ تمہارا نازک دل ان حالات کو برداشت کرنے کے لیے نہیں رہا ہے۔ مرچاؤ کی تم یہاں۔ کتنا سمجھایا میں نے تمہیں۔ لیکن تم نہیں مانتیں۔“

”پلیز۔ پلیز ترانہ۔“ وہ اپنی انداز میں بولی۔ ”میں نے اس وقت جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میں اگر یہاں رہی تو یا تو مر جاؤں گی یا بچ جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے بچنے دو، ہمیں دور بھیج دو۔“

ترانہ اپنے لب کانپتے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھی۔

”کس کی بہن کی شادی تھی؟“ پھر وہ بولی۔ ”ہو سکتا ہے وہ کراچی چلا گیا ہو پھر تو کیا کیاؤں گی میں تمہارے لیے۔ یہ لوگ بدترستی تمہارا کراچ رہواؤں گے۔“

ریجہ کی نظروں میں تو ان کا دھشت ناک چہرہ گھم گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ترانہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ ریجہ کھنکھناتی تھی۔

”مت روؤ ریجہ! جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مت روؤ۔“ ترانہ نے اسے تھپکا۔

”میں نے بچوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا۔“

”ترانہ! میں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں۔ عار بھائی مجھے مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

”ترانہ! یہ راز ہے۔“ ترانہ بولی۔ ”وہ تمہارے لیے ہے۔ بد فکر نہ تھا کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ تمہارے لیے۔“

”ترانہ! میرے لیے جو بھی بہتر سمجھتی ہو وہ کرو۔“ ریجہ نے گویا بارہاں کر کہا تھا۔ ”اتنا طے ہے کہ میں تو ان بھائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں۔ میں کیا جانتی تھی ترانہ۔ کہ وہ اس

”اب۔ اپنی بات مکمل نہ کر۔“ آنسوؤں سے اس کا گھلا رہا تھا۔ ترانہ کسی سوچ میں گم تھی پھر اس نے سر اٹھا لیا۔

”اگر وہ نہیں لایا۔ میں نے اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اپنا سامان اس طرح سے سمیٹا کہ کسی کو رتی برابر بھی شک نہ ہو۔“ ریجہ نے اس کے پاس چھوڑ کر منورائین سے مخاطب رہا۔ وہ ایک فہر کی جاسوس ہے۔“

”السلام علیکم۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

ایقان نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور کسل مندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کا اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا پھر کئی اخلاقی تقاضے بھاننے کے خاطر وہ اٹھ بیٹھی۔

”دونوں اس کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔“

”کیسی ہیں پیچھو اب آپ؟“ رابع اس کے پاس پڑے ہوئے انکو رکھانے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔“ ایقان نے ایک خرمندہ خرمندہ کی نظر اٹھ کر ڈالی۔

”بہت بہتر دی اور اپنا تیت سے مسکرا رہا تھا۔ ایقان نے آنکھوں میں بھرتے والے پانی پر قابو پایا اور پلکیں جھپکے لگی۔

”بھئی پیچھو! یہ بھانے نہیں چلنے والے۔“ ہاشم دفعتاً بولا۔ ”آپ نے تو گھر میں دیرانی پھیلا دی۔ انوالی

کھوٹا لے وہ کیا ہوتا ہے یا راہ لے کر پڑ گئی ہیں۔ انھیں بھی۔ وہ کہاں کی پیچیدہ ہیں خیر۔ کوئی ذہول تاشے کوئی گانے شائے یا۔۔۔

ایقان چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول بھال کر مسکرانے لگی۔
 ”ہاں پیچیدہ! وہ کون سا گانا تھا جو آپ سلائی مشین کا ڈیہ بجا کر گایا کرتی تھیں اپنی گزریا کی شادی میں؟“ رافع ذہن پر زور دینے لگا۔

”میں لکھ لکھ بیچوں بتا شے میں۔“ ہاشم کو ٹکرایا دیا گیا۔
 ”اللہ ہو بھی۔“ ایقان کو لے کر شرم آئی۔ ”کون کون سی باتیں یاد کر رہے ہو بے وقوف۔“
 ”ہاں ہاں۔ کیا تھا۔۔۔ میں لکھ لکھ بیچوں بوتل میں سیال آؤ گے کون سے ہونٹ میں۔“ رافع کو پورا مصرعہ یاد آ گیا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔
 ”پیچیدہ! یہ گانا تو ضرور سننا ہے آپ سے۔ آخر آپ کی عزیز اذ جان سہیلی کی شادی ہے۔“ ہاشم خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”ابے رائے۔“ رافع نے اسے چھیڑا۔ ”تو عزیز اذ جان بھتیجا بھی کہہ سکتا تھا لیکن وہ کیا کہا ہے شاعر نے بات کوئی ہو تیرا ذکر پیچیدہ دیتے ہیں۔“
 ہاشم کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے مائی رنگ بکھرے۔ ایقان اب دل چسپی اور شوق سے ان کی باتیں سنتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

”ہر بات میں پیچیدہ کی سہیلی کا ذکر نکال لیتا ہے یہ۔“
 ”ارے ہاں! ہم زبان بندی کی اس قدر طول سزا بھگاتی ہے اسی کا رد عمل ہے یہ۔“ ہاشم نے بات کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔ ”اندر اتنا اشاک جمع ہے وقت فوقتاً نکلتا رہتا ہے۔“
 ایقان چند لمحوں محبت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہتی پھر اس نے بولی سانس بھری تھی۔

”تم بھی سوچتے ہو گے ہاشم! اچھی بھلی طے شدہ تقریب میری جو جیسے۔“
 ”افسوس! یہ تو میرا نہیں۔“ ایقان نے اس کی بات کا دلچسپی سے جواب دیا۔ ”میں نے سب کوئی بھی ایسا سوچ سکتا ہے؟ آپ ہماری ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔ خیر یوں کی سی بات کیوں کی آپ نے۔ ہمارے دکھ لکھ خوشی غم، تکلیف راحت سب مشترک ہے یا راہ اور پھر خوشی کو تو ہم اپنی منہی میں قید کر چکے ہیں۔ اب یہ بھاگنے والی نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”اور جھٹ پٹ بھلی چنگی ہو کر ذہول سنبھالیں۔ وہ گانا ہم نے ضرور ہی سننا ہے۔“ رافع نے مزے سے فرمائش داغی۔

”کوئی نہیں سننا گانا وانا۔“ ایقان نے صاف انکار کیا۔ ”میں ہر گز اتنے پرانے گانے نہیں گاؤں گی۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ یہ اتنی پرانی خاتون ہیں۔“
 ہاشم اور رافع نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔ اس مرتبہ ایقان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔



”مائی امی! اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ پر شوق انداز میں اندر جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 زیورات کی جانچ پڑتال کرتی ہوئی فروس بیگم نکلتی ہی بوکھلا اٹھیں۔

ہوئے جھنجھلا کر مڑی تھی۔ پھر اگلے ہی بل وے جیسے پتھر کی ہوئی۔

سامنے مسکراتا ہوا عاشر کھڑا تھا۔

”نہا۔ شہ۔“ ایقان کے لب کاٹے۔

عاشر ایک دم آگے بڑھا تھا۔ ایقان کی قدم دوڑ کر اس کے سینے سے جا ملی۔

”نہا شہ۔“ اسارے بند ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔ ایقان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”بس جانو!“ وہ اسے جھٹکے لگا۔

ایقان کا بس نہ چلتا تھا وہ ساری کی ساری آنسوؤں میں بہہ جاتی۔ جائے کہاں کہاں سے کون کون سے گلے،

شکوے، شکایتیں، دکھ، ٹکٹے۔ آنسوؤں کی زبان میں نکلتے چلے آ رہے تھے۔

”بس ایقان! بس کرو یا۔ میں بہہ جاؤں گا۔“

ایقان نے سراٹھایا۔

”شرقی آنکھوں کو بخشی کر کے مزید ظلم نہ ڈھاؤ۔“ وہ مسکرایا۔

”بہت برے ہو تم۔“ اس نے ایک مکاں اس کے سینے پر مارا تھا۔ ”تمہیں بس باتیں بنانا ہی آتی ہے۔“

”ظلم فحشی ہے تمہاری۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”ہو پور سے۔“ ایقان نے اسے دھکیلا اور اس کے پیچھے رافع کو بٹھنے لگی۔ پھر اپنی طرف مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”اطلاع، بہت اچھی ہے کیا؟“ اس نے اطمینان سے بیڑ پونیم کوراڑو توتے ہوئے ایک پرسکون سانس کھینچ کر

”سیر لہارت لیل ہو جانا پھر۔“ وہ ہنسی۔

”ہارت تمہارا سپاس ہو تاؤ یقیناً انتہائی کٹھا ہو تا۔ وہ تو شہ سے پیسے چاہتا ہے۔“ وہ آنکھوں کو دباتے ہوئے

بولا۔ یقیناً وہ بے حد ہڈھکا ہوا تھا۔

ایقان اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”حمزہ انہیں قریب پارک لے گیا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ مجبور ہو کر بولے۔

”تمہیں کیسی ہو؟“ اس نے دیکھا اس کا ہاتھ تھا ماطلیت ٹھیک ہے؟“ ایقان نے غصے سے اس کی آنکھوں کو دیکھا اور پھوٹ

کاٹنے لگی۔

”یونوسہ رولونا ایقان!“

”بس عاشر! کچھ مدت ہو چھوٹ!“ وہ زرقی آواز میں بولی تھی۔ ”وہ مجھے پھر سے رونا آجائے گا۔“

”ہم شام کو اپنے گھر چلیں گے۔“ وہ نڈرے اداسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے نا؟“

ایقان نے اشارت میں سر ہلایا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک دے کر شفیقہ حیات اور عذرا بیگم اندر چلی آئی تھیں۔ دونوں کے چروں پر خد شگوار

مسکراہٹ تھی۔ عاشر ان کے ران دونوں سے ملنے لگا۔

ایقان یکدم ہی دست بٹکی پھٹکی اور خوش باش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک آئی تھی جو پہلی نظر میں

ہی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے پورے گھر کو دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر بوس نکالا مل رہا تھا۔ ظلم و ستم نے ایک

بار پھر ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔

رہیہ نے درحقیقت اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بچپن سے جوانی تک غریبی رشتوں کی محک

سے اپنے پیاروں کے لمس سے محروم رہی تھی۔ سو اس نے ان کو بھی اپنا سمجھنے کی غلطی کی تھی جو اس کے اپنے نہ

تھے۔ نتیجتاً اس کے حلقے میں صرف خصلوں اور روک تھام ہی آئے تھے۔

ترانہ اسے آفس جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ملتیں کر گئی تھی کہ وہ اپنا سامان وغیرہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس

میں رکھتی رہے اس طرح کہ بیٹا بیگم ماصول کو در برابر شک نہ ہونے پائے۔ ترانہ آج بیک سے اس کی نرم

اور زور وغیرہ بھی نکلا کر لانے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے رہیہ کو آج عبادتے شک کرنے کا اور پروگرام بنا رکھا

تھا۔ رہیہ کی اپنی ذہنی کیفیت تھی کہ وہ جذبات کی دویں بہہ کر کہاں سے ہیہ کے لیے چلے جائے گا اور ان کو کر

چکی تھی لیکن اب اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ کیوں جانا

ہے۔ وہ کہیں اور جا کر آخر کیا کرے گی۔

بہتیت میں قضا غائب دماغی سے چلتے ہوئے منور امین کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بستر پر پڑے اور گھ

ٹھکتا ہوا چوٹ اور اس کے بعد ہونے والی کمزوری کی بنا پر کچھ دن سے ان کے کمرے کی صفائی وغیرہ نہ

کرتی تھی۔ اس وقت ان کا بستر خان کا لباس اور کمرے کی ہر شے پر زبان خورد رہیہ کی غیر ماضی کی کمالی سناری

رہیہ اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ منور امین نے قدرے نفرت سے اس کی جانب

دیکھا۔ اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ منور امین نے قدرے نفرت سے اس کی جانب

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

”تھرا۔“ وہ بھیست خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ پوچھ کر اسے

نے انہیں دیکھنے لگی۔

قدر گری ہوئی ہے۔ اس سے مجھے یہی امید ہونا چاہیے تھی۔ تمہارا انتخاب کر کے اس نے مجھے حیران نہیں کیا۔

اب کی بار ربیعہ نے سر اٹھایا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اس ظالم شخص کے لیے لمحہ بھر کے لیے شکایت چمکی پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”تم بھی۔ تم بھی اپنی ماں بولی روایت دہراؤ گی۔ دیکھ لینا۔ بھاگ جاؤ گی ایک دن کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے سر پر انہوں نے آسمان لا کر لیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”میری ماں! آس کے لب کانپے۔“

”ہاں ہاں تمہاری ماں!“ وہ نفرت سے پھنکارے۔ ”دو کوڑی کی عورت۔ جسے تمہارا باپ کہیں سے اٹھا لایا تھا۔“

ربیعہ کو چکر آنے لگے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”مسلمان نہیں تھی وہ۔ اور اسے مسلمان کیے بغیر ہی تمہارے باپ نے اس سے شادی کر لی تھی۔“

اسی گناہ کی پیداوار ہو تم۔“

ربیعہ کو یوں لگا جیسے ابھی اسے الٹی ہو جائے گی اور اس کی آنتیں منہ کے رستے باہر آ جائیں گی۔

”پچھ جا جائے۔!“ وہ بمشکل بولی تھی۔ اس کے لیے خاموش ہو جائیں۔“

”ارے سنی کیوں نہیں ہو اب۔ بوجھ ہے وہ سننے کی ہمت پیدا کرو خود میں۔ بھاگ کر آئی تھی کہیں سے اور

تمہیں پیدا کر کے پھر بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے لیے آج وقت ہلنا بھی محال تھا۔ پھر بھی وہ ہمت ہمت کر کے اٹھی اور مردہ قدموں کو گھسٹتی ہوئی

کمرے سے نکل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں اگر وہ منہ کے بل چار پائی پر اوندھی گری اور سکسکیاں بھرنے لگی۔ آج اس کے کانوں نے

اس کی پوری زندگی کی بدترین بات سنی تھی۔ یہ جتنی ہی سے وہ اپنے ماں کو بپ کے متعلق جاننے کے لیے ہمت پر شوق

رہا کرتی تھی۔ وادی سے کرید کرید کر ماٹیں پوچھا کرتی تھی۔ جہاں کہیں اس کے بپ کے کچھ لفظ۔ ربیعہ کے کان

کھڑے ہو جایا کرتے۔ لیکن اب اسے اس نے بدترین ہمارے اس کا کچھ پھر لفظ لگا تھا۔ ربیعہ سخت ترین ذہنیت

کا شکار تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

آج اس نے جانا تھا کہ کیوں وادی جان ہمیشہ ہی اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں رہا کرتی تھیں۔ ربیعہ کے ماں

باپ کا ذکر ان کے لیے تکلیف دہ کیوں تھا؟ وہ اسے اس روحانی تکلیف سے بچانے کی سعی کرتی تھیں جس سے

اسے منور امین نے دوچار کیا تھا۔

آج ربیعہ کو علم ہوا تھا کہ کیوں مینا بیگم اور صولت اسے اتنی حقارت بھری نظروں سے دیکھا کرتی ہیں۔ کیوں

ان کے انداز میں ربیعہ کے لیے اس قدر نفرت ہو تا ہے۔

آج جیسے اسے اپنی ہستی کے بے وقت ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ اسی دوران اس

نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔

اس کے وجود کے ساتھ جو کہانی جڑی ہوئی تھی اس نے ربیعہ کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اس دنیا میں سر

اٹھا کر ایک باعزت زندگی گزار پاتی۔ اور جب اپنی ذات مٹا کر بھلا کر، مہربان کر زندگی گزارنا تھی تو اس کے لیے یہ

گھر دنیا میں سب سے موزوں تھا۔

آنکھیں موندے وہ گویا جنت کے کسی باغ میں لیلیٰ ہوئی تھی۔ اسے اپنے بالوں میں دھیرے دھیرے چلنے لگنے کی گدھڑی محسوس کرنا احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی آنکھیں نہ کھولے۔

”ایقان! عاشر نے محبت سے اسے پکارا۔

ایقان نے آنکھیں کھول کر عاشر کو دیکھا اور مسکرای۔

”کیا سوچ رہی ہو۔ میں تو سمجھا تم سو گئیں۔“

”جنانے کون سی حالت میں ہوں عاشر۔ نہ یہ سینہ ہے نہ ہمداری ہے نہ خواب ہے نہ حقیقت نہ کوئی سوز ہے نہ احساس۔ بس سکون ہے اتنا کراہا اتنا گھنا اتنا خاموش سکون کہ ان چند لمحوں میں پوری زندگی جتا دیتے مگر جی چاہتا ہے۔“

عاشر نے گہری سانس بھری اور کچھ سوچنے لگا تھا۔ ایقان نے نمور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا وہ متوجہ نہ تھا۔

”کیا سوچنے لگے اب۔ کس وہ موٹی نوکری تو نہیں یاد آنے لگی؟“ اس نے جل کر پوچھا تھا۔

عاشر نے ساختہ ہی ہنس دیا۔

”کمال کرتی ہو یا۔ اس قدر خاتون بن۔ میری وہ چلی۔ شرارتیں ایقان کمال ہے۔“ عاشر نے کراہا کرتا تھا۔

”تمہاری جذباتی کے غم میں گھل گھل کر ختم ہو گئی ہے جاری! ایقان نے آہستہ سے کہا۔ ”اب تو یہی بھاری محرم خاتون نہ۔“

”جی۔ اسی سے کام چلاؤ۔“

”کام تو میرا ہی باخیر عمر تک چلا میں گے۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”لیکن کام میں دل تو لگے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ گھڑی۔ ”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کتنا چاہتا ہوں جانو۔ کہ۔“ موٹی نوکری“ اور ”موٹی بھینس کر۔“ اسے اپنے ہنرے کا دھیان جمنا پڑتا تھا۔

خاتون کو کافی حق کرنے پڑتے ہیں۔ تم جانتی ہو تمہارا ہنرہ کس قدر سن پرست اور حق پرست ہے۔ میں ایسا نہ ہوں۔ وہ اسے چڑانے کے موڈ میں لگتا تھا۔ ایقان اٹھ کر بیٹھ گیا اور کڑے توروں سے اسے گھورتے لگی۔

”اب یہی کہہ لو۔“ وہ فوراً بولا۔ ”مشاری سے پہلے تم نے مجھے اتنی بری شکل بنا کر نہیں کھوڑا۔ اور اب تمہیں پروا ہی نہیں ہے کہ اسے کھوڑے ہوئے تم گنتی بری لگتی ہو۔“

”میں اب تمہیں بری بھی لگنے لگی ہوں۔“ وہ دہری صورت بن کر بولی۔

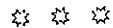
”میں تو صرف کھوڑے وقت کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ چکارنے والے انداز میں بولا۔

”تم کچھ بدل گئے ہو عاشر! وہ مختلک ہوئی۔ ”پہلے تو میں تمہیں کسی صورت بری نہیں لگتی تھی۔“

”ارے جانو! وہ بڑا۔“ مذاق بھی نہیں سمجھتیں تھے۔ ”مجھے تمہاری لگتی تو یوں ہنسا چلا آتا۔ میرے لیے تو تم تھا طیس۔“

”اب عاشر! وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ ”مزاج خیر ہیں!“ شملہ دھیمے سے مسکرای۔

”جی!“ وہ آہستہ سے بولی ”اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا ہے خیریت سے ہیں!“



”آداب عرض!“ وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ ”مزاج خیر ہیں!“ شملہ دھیمے سے مسکرای۔

”جی!“ وہ آہستہ سے بولی ”اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنا ہے خیریت سے ہیں!“

”بس جناب۔ گھٹنا پر گئے ہوئے ہیں۔ دن ہوں کہ بل ہو۔ کزرتا مشکل!“ شملہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

”ایقان کیسی ہے اب!“ اسے خیال آیا۔

”فرسٹ کلاس۔ اپنے میاں جی کے ساتھ ہنسی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ یہاں سے وہاں۔“ وہ ہنسا ہنسا انداز میں بولی۔

”ہاں! عاشر صاحب! آئے ہیں!“ شملہ نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں! آئے ہیں۔“ چھپو کے بارے میں سنا تو فوری چھٹی کی درخواست منظور کروا کر وہاں کے لیے آئے ہیں۔ ہاشم نے اسے اطلاع دی۔

”جلیں تو بہت اچھا ہوا۔ ایقان تو بہت خوش ہو گئی۔“

”کیا خبر!“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اب زیادہ بہتر ہو سکتی ہیں۔ سیاں جی کی آمد پر کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟“

شملہ کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اب آپ بائیں مت!“ وہ دھیمے سے بولی۔ ”ان باتوں کا تو اچھا پہلا تجربہ ہے آپ کو۔“

”اب کو اگر اندازہ ہے تو میرے لیے تو یہ احساس بھی بہت ہے۔ کم از کم ہمارے متعلق کچھ سوچتی تو ہیں۔“

”اب! آہ! خوش ہوئے کی جرات کی۔“ وہ رنہ یہ بے چارہ دل تو عجیب خدشات کا شکار رہتا ہے۔“

”اب! عاشر صاحب! انداز میں دھڑکا۔“

”خدا شانت!“ وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔ ”کیسے خدشات۔“

”جنانے نہ سمجھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب پرانہ مان جائیں۔“

”تمہیں نہیں۔“ اب کہہ دیتے جو جی آپ کے دل میں ہے۔ ہاشم صاحب! میں بعد کی بدگمانیوں سے بے خبر ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! اس قدر گہرا نہیں۔“ چلیے یہ بھی اچھا لگا بھیس۔ یعنی باخیر کی آپ کے نزدیک کیا ہے۔“

”خواتین وصال دے گئے۔“ اس نے کھانسی کا اشارہ کر دیا۔ ”میرا دل بار بار فون کرتا۔ تاکہ تو نہیں کزرتا آپ کو؟“

”اب! عاشر صاحب! کتنی مشکل! میں کزرتا ہوں ہاشم آپ؟“

”بعد میں بتائیں گے آپ کو ایسی باتوں کا مطلب۔ ایک شاعر خیر سے یاد فرار ہے۔“

شملہ کے لیے تو ”بعد میں“ ہی کافی تھا۔ وہ جیتے نہ تھے۔

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اب! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”جی! عاشر صاحب! زیادہ نہ سمجھتی ہوں۔“

”اچھا! تو مجھ سے خدا حافظ!؟“ اس نے اجازت چاہی۔

”ہمارا آپ کا سب کا اس نے گڑباز کی بات سمجھی۔

سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ شملہ ریمپور آسکے سے کیٹل پر ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

بے حد کوفت اور بد نظری سے وہ سامنے بڑے ہوئے لاکٹ سیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ عام سا، نقلی گیلوں کا لاکٹ اور ساتھ چھوٹے چھوٹے سے بندے اس کفٹ باکس میں سے بس کی کچھ پر تہہ ہوا تھا۔ عرشہ کا کوفت سے برا حال تھا۔ اسے نابھ پرورہ کر غصہ آ رہا تھا۔

”حد درجہ احمق اور بد بظن شخص کو میرے سر قحوب دیا ہے سب نے مل کر“ وہ ہونٹ کانٹے ہوئے سوچنے لگی۔ ”یہ بظن جس بندے کا ہو گیا وہ پائے کا سامری زندگی وہ مجھے اسے توڑھٹک سے دو لفظ بولنا نہیں آتے۔ نہ کوئی شخصیت نہ کوئی شہرت نہ۔ ہونہ۔ کسی کو سختہ دینے کا سلیقہ نہیں ہے یہ نقلی گیلوں کا لاکٹ۔ میری چوٹی پینے کی اسے۔“

اس نے جھنجھلا کر دو لاکٹ اور بندے واپس باکس میں ٹھونپے اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔

”ریجہ!؟“ ترانہ نے پریشان سے اسے پکارا۔

ریجہ چھت پر کھڑی در سے آتے ہوئے باہلوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ترانہ کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں کوئی ایسی بات سمجھی کہ ترانہ نے حد پریشان ہو گئی۔

”ریجہ!؟ میں تم سے کیا کہہ کر گئی تھی۔ تم نے تو نہ تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اب تک تمہارا سالانہ پونجی رکھا ہے اور تم خود؟“ اس نے ریجہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”تم نے کچھ نہ کیا۔“ ”میں نے ریجہ!؟“ وہ اور غصہ ہو گئے آہستہ آواز میں بولی۔

”دیکھ کر آواز کم کی۔“ ”میں عبادت بات کر کے آ رہی ہوں۔ وہ میں سے لانا ہو میں۔ ہماری خوش قسمتی سے اس کی بہن کی شادی چند دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ عباد آج رات کی گاڑی سے کراچی جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں ریجہ کو ساتھ لے کر آؤں گی۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں ترانہ!؟“ وہ گھر سے دھکی دھکی کر گئی۔ ”میں نہیں رہیں گی۔ جب تک خدا نے میری زندگی لکھ دی ہے میں۔ میں اپنے گناہوں کی سزا اچھ کر اسے یہیں گزار دوں گی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ترانہ نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”ریجہ!؟ بہنیں باہر بار کیا ہو جاتا ہے۔ تمہارے رویے میں یہ تبدیلی کیوں آجاتی ہے؟“

ریجہ نے آنسوؤں سے بھری نظروں اس کے چہرے پر جاویں۔

”ترانہ!؟ میں اپنے ماں باپ کے گناہوں کا جتنا جانتا ثبوت بن کر کہاں جا سکتی ہوں بھلا؟ کسی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم کون ہو؟ اس سے ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیا جواب دوں گی؟ ترانہ میں۔“

ترانہ جتنے دیکھ سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم ہر سوال کا جواب خود ہو ریجہ!؟ تم ایسی لڑکی ہو جو خود کسی کا قابل فخر حوالہ بن سکتی ہے۔“

حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ ریجہ خود بخود بول پانچا۔ خود کو عزت دے۔ تم اپنی بیچان آپ ہو۔“

”ترانہ!؟“ مجھے بھلائی کی کو شش مت کرو!؟“ ریجہ نے منہ پھیر لیا۔ ”میں اگر یہاں سے گئی تو سب کی کہیں گے کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی۔ کسی کے ساتھ۔“

اس کا گارندہ گیا۔ اس سے آگے بولنا چاہتا۔

”ریجہ!؟“ ترانہ نے اس کا بازو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر زور سے دبا دیا۔ ”لوگوں کے کہے کی پروا کر کے اپنی زندگی خراب کرنے کے تصور سے نفرت ہے مجھے۔ میں تمہیں کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں

”ترانہ!؟“ اس نے بولنے کی کوشش کی۔

”میں ریجہ!؟ ایک نہیں سنو گی تمہاری۔ کل تک تم مجھے سمجھاتی تھیں، آج میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔“

کل تم اپنی مرضی سے یہاں سے جانا چاہتی تھیں تو میں نے تمہیں بہن کہہ کر روکا تھا۔ آج تم کرنا چاہ رہی ہو تو

میں تمہیں ہر صورت یہاں سے بھیجوں گی۔ کیونکہ تم مجھے ایک بہن کی طرح عزیز ہو اور میں اپنی بہن کو اپنی

زندگی تباہ کرنے سے ضرور روکوں گی۔“

ترانہ کے انداز میں حد درجہ حتیٰ بین تھا۔ ریجہ اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

”تمہارا سوٹ کس ماں کے گھر رکھ کر آ رہی ہوں ریجہ!؟“ وہ سر کوئی میں بولی۔ ”تم اس میں سے ابھی

لے کے لے کر پڑے نکال لو اور پتھر دم میں چلی جاؤ۔ میں موقع ملتا ہی تمہارا سوٹ کس وہاں چھوڑ آؤں

گی۔ اور مجھے کچھ بے ہمدونوں گھر سے نکالیں گے۔ سمجھیں تم!؟“

”ترانہ!؟“ ریجہ نے سنا۔ اس سے لپٹ گئی۔ ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”مجھے سب سمجھ میں آ رہا ہے ریجہ!؟“ ترانہ نے محبت سے اس کا سر سہلایا۔ ”زور نہ کھو۔ اب ہمارے پاس

اتفاق ہے۔ سب سے کہہ دیا ہے تمہارا انکار کیا جا سکے۔ نہیں کراچی جا کر۔“

”میں نہیں!؟“ ترانہ نے اٹک ہو کر اسے دیکھا اور حتیٰ انداز میں بولی۔

”وہاں اسیر لے لے گا۔“ ”میں کراچی ایسا نہیں سوچ سکتی۔ میں تمہارے کہنے پر جاتو رہی ہوں لیکن وہاں جا کر میں

کسی بوشل میں رہ کر آؤں گا۔ اور وہاں بھی سے کہہ کر کوئی نوکری دے دو تو بھلاؤں گی۔“

”ریجہ!؟“ وہ گھر سے لے کر آ رہی تھی۔ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں سمجھتی تھی۔“ ”میں شاید کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔“

اور ان کا نام لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں سولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گھٹاؤ نے
 اس پر راند سولت کو بھیڑا رہتی ہے اور اسے ستمیں نہان کی دھمکی دیتی ہے۔
 اور ابانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شملہ کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے
 کہ اسے نہیں جھینے گا۔

ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس
 کے سامنے پر پابندی لگا دیتا ہے۔
 سیمک اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شملہ کو ستمی کی انگوٹھی پہناتی ہیں 'شملہ' ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ
 بہت عرصہ کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

ربیعہ کو نیوروشی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کا فارم چھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
 اس پر تم کا پرہیز اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا سیمک تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔
 جب اترانہ سے الٹھا کرتی ہے کہ وہ کسی طرح اسے عباد بھائی تک پہنچا دے۔ ترانہ تمام پروگرام ترتیب دے لیتی ہے۔
 اترانہ کو اس کی سالگرہ پر تحفہ دیتا ہے۔ عرشہ بے حد بے اعتنائی سے پیش آتی ہے۔ نافع کو اس کے قویے پر انوس

ماٹری کا چانک پاکستان آمد پر ہے۔ خاندان کو سوسر لگ دیتی ہے۔ مائیم ایان اس لمحے دیکھتے ہیں کہ تبدیلی محسوس کرتی
 اور امین کی منتخب بائیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ لیکن ترانہ اس کی کچھ نہیں سنتی۔ جس پر
 یہ کو تیار ہونا پڑا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

UrduPhoto.com

بیسویں قسط

ربیعہ بے اختیار ہی گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہیں سے نظر پڑی تھی نظروں میں پُر سکون رہنے کے لیے کہا
 ہر وہ دونوں تمدن کا چہرہ دیکھنے لگیں جو کمر پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چونک کر
 ان کی جانب متوجہ ہوا اور ایک گہری نگاہ ربیعہ پر ڈالتے ہوئے ترانہ سے مخاطب ہوا۔
 "ترانہ! اسے تیار کر دو۔"

ربیعہ اور ترانہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 "تیار کر دو؟" پھر ترانہ اچھٹے سے بولی۔ "یہ کہاں جا رہی ہے؟"
 تمدن ایسے ہنسائیے ترانہ نے کوئی بہت بڑا جات کی ہو۔
 "کیسں جا نہیں رہی ہمیشہ کے لیے اس گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ میرا ایک دوست نکاح خواہ اور گواہوں کو
 لے کر پہنچ رہا ہے۔ اسی وقت میرا اور ربیعہ کا نکاح ہو گا۔"

اس نے پھر ایک گہری نظر ربیعہ پہ ڈالی جس کا چہرہ یکدم شعلے کی زد میں آئے ہوئے پھول کی مانند کھلا گیا۔ ربیعہ
 نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے لیا ورنہ شاید وہ گر ہی جاتی۔ ترانہ کے چہرے پر از حد فکر مندی اور
 تمہوں میں بے حد گہری سوچ کے سامنے ابھرے تھے۔ ایک ٹک تمدن کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تم تو کہیں کو سانپ کیوں سو گھومو کیا؟“ تم نہ دے رہا تھا۔ ”میں نے وہی کچھ کہا ہے جو تلے شہبے کو ان بات تو تم کیوں کی۔“

دوسرے کمرے سے نکل کر وہ بیٹیکم اور صولت بھی چلی آئیں۔

”ایک بات ہے تم ان“ بیٹیکم نے داخل میں تازہ سادہ گرمی باری سب کو دیکھا۔

”کچھ نہیں پوچھو رہا تم نے شاید ان لوگوں کو بتایا نہیں کہ میں کب سے یہاں آئی ہوں۔“ صولت نے بڑی کڑی سی ہنستے ہوئے کہا۔

”جی نہیں نے انھیں کچھ نہیں بتایا۔ میں چاہتی تھی انھیں یہ خوش خبری یا چاہیے دی جائے۔“

”کیا۔ کون سی خوش خبری۔ کیا وہ رہا ہے؟“ صولت نے سوائے انداز میں پوچھنے لگی۔

”شاید بیٹیکم نے جسے خبری لے لے پوچھ دیا ہو۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔

”کچھ نہیں صولت! تم خاموش رہو۔“ بیٹیکم نے اسے غمزہ سے ”جیسا ایسے معاملات میں ہونا چاہیے کہ تم اچھی نہیں لگتیں۔“

”خدا کے لیے امی۔“ بیٹیکم نے۔ ”اپنے یہ سو سال پرانے اصول اپنے باپ کی بنیاد پر کر رکھیں۔ مجھے بتائیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے لگتا ہے تم ان بھائی ایک لے اپنی بات کو لپیٹ کر رہے ہیں۔ میرے اور قصور کے مسئلے کی بے بسی نہ کسی کو نظر سے رہا اور کہیں کسی کو پورا ہوا ہے۔“ جب بیٹیکم نے کہا تو وہ بڑی دھم دھم سے کہنے لگی۔

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”صولت! تم ان کی خوشامی ہو کر کسی کچھ نہیں سمجھتے۔“ صولت نے بڑی دھم دھم سے جواب دیا۔ ”میں نہیں ہر ہر سوچنے۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

”اگر وہاں۔“ میں اس چیل کو کیا کر رہی ہوں؟ تم شفیق سے اسے جتنا مرضی چاہو۔“

کا احساس ہو گیا۔
 ”بطلو۔ ورنچ چلیں۔ بونے فونز کرتے ہیں۔“ ولانمت سے بولا۔
 ایقان نے پلوں پر چستی نمی کو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔



شور عچاتی ٹرین تیزی سے منزل کی جانب محو سفر تھی۔ عباد نے ایک نگاہ رعبہ کے سستے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر مسکرا دیا۔ وہ حدودِ جبر پریشانِ نظر آ رہی تھی۔

”ربیعہ“ وہ اہل شکی سے بولا۔

رہیچہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”نیک اث ایزی۔ تم بہت زیادہ گھبرارہی ہو۔ ریلیکس۔“

”عبدال بھائی... ہم۔ ہم کہاں جائیں گے؟“ وہ کچھ سوچ کر گویا ہوئی تھی۔

”کہاں جائیں گے؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“ ”ذہانت سے اسے دیکھنے لگا۔“ ”ارے بھئی، ہم اپنے گھر جائیں گے،“
 دہاں میری امی ہیں۔ میری بہنیں ہیں۔ ایک پارا سا کیوٹ سا بھانجا ہے۔“

رہیہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

”کیا سوچ رہی ہے؟“ علی کو اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ تھا۔

”عباد بھائی! میں یہاں کسی کا سامنا نہیں کرتا چاہتی۔“ نگوگیر لہجے میں بولی، ”کسی کا بھی نہیں، آپ اپنے گھر جانے پہلے مجھے کسی ہاسٹل میں۔“

آواز زندہ جانے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر کچھ دیر اسے خود پر قابو کرنے میں

”مے ہں میرے“ **Rediff.com** لائی گئی ہے کہ لوں کہت

”ریجہ۔“ بھارتیہ سے بولا۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے میرے تمہیں ہاسٹل میں چھوڑاں گا؟ شاید تمہیں تک مجھ پر بھروسہ نہیں کرنا ہو۔“

”عباد بھائی! ربیعہؓ نے یہاں بھی ”خدا کے لیے ایسا تو مت کیس۔ میں نے اسی دنیا میں محبت صرف چند ایک لوگوں سے سانی ہے اور اب ان لوگوں میں شامل ہوں۔“

”پھر تم نے ایسا کیوں کہا؟“

”اس لیے عباد بھائی کہ میں۔ میں لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں، میرے ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار سب کون ہیں، کہاں ہیں۔ میں کسی بھی سوال کا جواب

سے دے سکتی، نہیں دے سکتی۔ اس نے

”کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا، بیٹا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تمہارا احوالہ صرف اتنا ہو گا کہ تم میرے ایک

”یہ کافی نہیں ہے عباد بھائی۔ انسان کے لیے رشتوں کا حوالہ ضروری ہے۔ خصوصاً لڑکی کے لیے۔“

”انسانیت کا رشتہ ہر رشتے سے بڑا ہے۔ رعیت! محبت، خلوص، رواداری۔ یہ سب انسانیت کے رشتے سے

آتی خوشبو کے نام ہیں۔۔۔ اور میرے گھر کے افراد میں تمہیں یہ خوشبو ملے گی۔ میری بات کا یقین کرو۔“

”عباد بھائی! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کسی مشکل کا شکار ہوں۔ میرا آپ کے ساتھ آپ کے گھر

جانتا ہے دوسروں کو جنہوں سے ملتا ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔
 "میں کچھ دباؤں دیتا ہوں لیکن پھر کسی میں جس میں بے وقت خفا کے رحم و کرم پر میں چھوڑ سکتا۔
 انسان کے لیے اگر رشتوں کا حال ضروری ہے تو پھر یہ خوالہ کہ ہر جگہ طلب کیا جائے گا۔ اور اگر تم اپنے رشتے
 رشتوں کو اپنا حال دیتا نہیں چاہتیں تو سنئے رشتے بناؤ نہ یہ محبت اور غلوں تم یاب کسی لیکن نایاب نہیں
 ہے۔"

"دعا بھائی کیا کہوں گی آپ کے گھر والوں سے کیا باتیں کیں گی؟
 "میں نے کہا تھا میرے ایک افسانہ دوست کی کہ وہ جو چند روز بہت بے باک ہوا تھا میری ذمہ داری میرے
 سپرد کر کے باہر چلا گیا ہے۔ اور میں اس سے آگے کہہ سکتی ہوں کہ میں پوچھتا ہوں کہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے
 اپنے گھر والوں کو میں خود سمجھاؤں گا۔ دینے میں یہی ہاں میری نہیں ہمت اچھی ہیں۔ تم ان سے مل کر تو
 دیکھو۔"

"یقیناً کہوں گی ان سے ملنے نہیں بھی میں جانتی ہوں۔" وہ بڑی مہذبہ مسکرائی۔
 اس کے دل کو جیسے قہر مارا گیا تھا اس نے مطمئن ہو کر اپنا سر سینے سے ڈھکیا اور وہ نکلیں سو رہی۔

ہاتھ لے اپنے سامنے ہے ہوئے زورات پر ایک ہوس کی لہریں تھیں۔ سلاز میں نے کاؤنٹر پر ختم زورات
 کے زورات کا انبار لگایا تھا۔ لیکن ہاتھ کی بے چین متلاشوں کا کوئی بھی چیز مطمئن نہ کیا تھی۔ واقعے نے
 گھنٹی مٹا دی تھی۔ میرے ہونے تو نہیں کاؤنٹ بھرا۔
 "یہ میں نے گڈوڑک کا نہیں ممبر کاؤنٹ بھرا ہے میں نے خود ہی تو بھرا ہے۔" وہ بڑی بے پرواہی سے
 رہا ہے۔ دیکھتے چائیس منٹ ہو چکے ہیں میں تمام رقم خرچ فرما چکی۔ لیکن اس کے سر میں ہوں رہا ہوں
 میں بے جا دلچسپی ہائے زیادہ خواہش اٹھایا ہے اپنے آئینے سے اور تو ہے کہ۔
 ہاتھ لے اسے مٹھو۔

"جسے انداز میں کے لیے زور کی کا پھاؤ ختم ہو چکا ہے۔ تو میری کوشش کی تو کیا کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ
 سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لاپرواہی کی۔"
 "کیسے یاد رکھو گی میرا افسانہ اس نے میرے۔۔۔ آخر میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ گھنٹی بج چکی ہے۔"
 "یہ اتنا بھاری گھنٹہ نہ دکھائی میں ہے ہوں؟" ہاتھ پر ٹیکہ "یہ شام تو آتی تھی یہ بڑا کڑا شام تھا۔"
 پاسوں ہیں؟

"میں خود بخود روتے ہیں سو یا۔" اس نے خفا کی۔ "شادی تو یہی ہے؟ خدائی میری۔"
 "دوستوں کے لیے خدائی میں نہ معلوم ہے۔" ہاتھ میں اس حالت سے بے نیاز شوخیاں میں آکا بھائی کرنے
 لگا۔ پھر ایک اس کی نظروں میں ایک سی آنکھی۔

"یاد رانے۔" اس نے لاکٹ پر پہلے لگا دیکھ کر بڑی بڑا دھکا۔
 سلاز میں بے دل کی شکل کا ختم ہوا کٹ پھل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہاتھ نے خفیہ سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔
 "یونی فٹ۔" ہاتھ بولا۔ "میں تم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
 "سوئے کابل میرے کے ہوا؟" رانے نے ہنسنے کے پھر ایک عجیبی۔ "زور کی گڈ۔"
 "دل تو ہمارا سونے کا ہے۔" ہاتھ نے دانت نکالے۔ "اور ان کی محبت اس میں میرے کی مانند رک رہی"

"یہ سارا ہونے تک کیا جذبات کے اظہار کا۔"
 "یہ بھی میری بڑی چاہتا ہے۔" وہ بڑی بڑا دھکا۔
 "یاد رانے۔" ہاتھ بولا۔ "میں تم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
 "سوئے کابل میرے کے ہوا؟" رانے نے ہنسنے کے پھر ایک عجیبی۔ "زور کی گڈ۔"
 "دل تو ہمارا سونے کا ہے۔" ہاتھ نے دانت نکالے۔ "اور ان کی محبت اس میں میرے کی مانند رک رہی"



ہاتھ لے اپنے سامنے ہے ہوئے زورات پر ایک ہوس کی لہریں تھیں۔ سلاز میں نے کاؤنٹر پر ختم زورات
 کے زورات کا انبار لگایا تھا۔ لیکن ہاتھ کی بے چین متلاشوں کا کوئی بھی چیز مطمئن نہ کیا تھی۔ واقعے نے
 گھنٹی مٹا دی تھی۔ میرے ہونے تو نہیں کاؤنٹ بھرا۔
 "یہ میں نے گڈوڑک کا نہیں ممبر کاؤنٹ بھرا ہے میں نے خود ہی تو بھرا ہے۔" وہ بڑی بے پرواہی سے
 رہا ہے۔ دیکھتے چائیس منٹ ہو چکے ہیں میں تمام رقم خرچ فرما چکی۔ لیکن اس کے سر میں ہوں رہا ہوں
 میں بے جا دلچسپی ہائے زیادہ خواہش اٹھایا ہے اپنے آئینے سے اور تو ہے کہ۔
 ہاتھ لے اسے مٹھو۔

"جسے انداز میں کے لیے زور کی کا پھاؤ ختم ہو چکا ہے۔ تو میری کوشش کی تو کیا کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ
 سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لاپرواہی کی۔"
 "کیسے یاد رکھو گی میرا افسانہ اس نے میرے۔۔۔ آخر میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ گھنٹی بج چکی ہے۔"
 "یہ اتنا بھاری گھنٹہ نہ دکھائی میں ہے ہوں؟" ہاتھ پر ٹیکہ "یہ شام تو آتی تھی یہ بڑا کڑا شام تھا۔"
 پاسوں ہیں؟

"میں خود بخود روتے ہیں سو یا۔" اس نے خفا کی۔ "شادی تو یہی ہے؟ خدائی میری۔"
 "دوستوں کے لیے خدائی میں نہ معلوم ہے۔" ہاتھ میں اس حالت سے بے نیاز شوخیاں میں آکا بھائی کرنے
 لگا۔ پھر ایک اس کی نظروں میں ایک سی آنکھی۔

"یاد رانے۔" اس نے لاکٹ پر پہلے لگا دیکھ کر بڑی بڑا دھکا۔
 سلاز میں بے دل کی شکل کا ختم ہوا کٹ پھل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہاتھ نے خفیہ سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔
 "یونی فٹ۔" ہاتھ بولا۔ "میں تم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
 "سوئے کابل میرے کے ہوا؟" رانے نے ہنسنے کے پھر ایک عجیبی۔ "زور کی گڈ۔"
 "دل تو ہمارا سونے کا ہے۔" ہاتھ نے دانت نکالے۔ "اور ان کی محبت اس میں میرے کی مانند رک رہی"

ہاتھ لے اپنے سامنے ہے ہوئے زورات پر ایک ہوس کی لہریں تھیں۔ سلاز میں نے کاؤنٹر پر ختم زورات
 کے زورات کا انبار لگایا تھا۔ لیکن ہاتھ کی بے چین متلاشوں کا کوئی بھی چیز مطمئن نہ کیا تھی۔ واقعے نے
 گھنٹی مٹا دی تھی۔ میرے ہونے تو نہیں کاؤنٹ بھرا۔
 "یہ میں نے گڈوڑک کا نہیں ممبر کاؤنٹ بھرا ہے میں نے خود ہی تو بھرا ہے۔" وہ بڑی بے پرواہی سے
 رہا ہے۔ دیکھتے چائیس منٹ ہو چکے ہیں میں تمام رقم خرچ فرما چکی۔ لیکن اس کے سر میں ہوں رہا ہوں
 میں بے جا دلچسپی ہائے زیادہ خواہش اٹھایا ہے اپنے آئینے سے اور تو ہے کہ۔
 ہاتھ لے اسے مٹھو۔

"جسے انداز میں کے لیے زور کی کا پھاؤ ختم ہو چکا ہے۔ تو میری کوشش کی تو کیا کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ
 سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لاپرواہی کی۔"
 "کیسے یاد رکھو گی میرا افسانہ اس نے میرے۔۔۔ آخر میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ گھنٹی بج چکی ہے۔"
 "یہ اتنا بھاری گھنٹہ نہ دکھائی میں ہے ہوں؟" ہاتھ پر ٹیکہ "یہ شام تو آتی تھی یہ بڑا کڑا شام تھا۔"
 پاسوں ہیں؟

"میں خود بخود روتے ہیں سو یا۔" اس نے خفا کی۔ "شادی تو یہی ہے؟ خدائی میری۔"
 "دوستوں کے لیے خدائی میں نہ معلوم ہے۔" ہاتھ میں اس حالت سے بے نیاز شوخیاں میں آکا بھائی کرنے
 لگا۔ پھر ایک اس کی نظروں میں ایک سی آنکھی۔

"یاد رانے۔" اس نے لاکٹ پر پہلے لگا دیکھ کر بڑی بڑا دھکا۔
 سلاز میں بے دل کی شکل کا ختم ہوا کٹ پھل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہاتھ نے خفیہ سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔
 "یونی فٹ۔" ہاتھ بولا۔ "میں تم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
 "سوئے کابل میرے کے ہوا؟" رانے نے ہنسنے کے پھر ایک عجیبی۔ "زور کی گڈ۔"
 "دل تو ہمارا سونے کا ہے۔" ہاتھ نے دانت نکالے۔ "اور ان کی محبت اس میں میرے کی مانند رک رہی"

ہاتھ لے اپنے سامنے ہے ہوئے زورات پر ایک ہوس کی لہریں تھیں۔ سلاز میں نے کاؤنٹر پر ختم زورات
 کے زورات کا انبار لگایا تھا۔ لیکن ہاتھ کی بے چین متلاشوں کا کوئی بھی چیز مطمئن نہ کیا تھی۔ واقعے نے
 گھنٹی مٹا دی تھی۔ میرے ہونے تو نہیں کاؤنٹ بھرا۔
 "یہ میں نے گڈوڑک کا نہیں ممبر کاؤنٹ بھرا ہے میں نے خود ہی تو بھرا ہے۔" وہ بڑی بے پرواہی سے
 رہا ہے۔ دیکھتے چائیس منٹ ہو چکے ہیں میں تمام رقم خرچ فرما چکی۔ لیکن اس کے سر میں ہوں رہا ہوں
 میں بے جا دلچسپی ہائے زیادہ خواہش اٹھایا ہے اپنے آئینے سے اور تو ہے کہ۔
 ہاتھ لے اسے مٹھو۔

"جسے انداز میں کے لیے زور کی کا پھاؤ ختم ہو چکا ہے۔ تو میری کوشش کی تو کیا کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ
 سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لاپرواہی کی۔"
 "کیسے یاد رکھو گی میرا افسانہ اس نے میرے۔۔۔ آخر میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ گھنٹی بج چکی ہے۔"
 "یہ اتنا بھاری گھنٹہ نہ دکھائی میں ہے ہوں؟" ہاتھ پر ٹیکہ "یہ شام تو آتی تھی یہ بڑا کڑا شام تھا۔"
 پاسوں ہیں؟

پہنچنے پر اسامہ نے ہنگامہ مچا کر ایک ہنگامہ لگا دیا اور لوگوں کو روک دیا۔
 "مگر کتنے لوگ آ رہے ہیں، آج کے دن کو تو بھر گھر میں بیٹھے ہیں۔"
 "تم ساری باتوں کی خوشبو میں بھی کچھ نہ بوجھاؤ گے۔" فاضل نے تکیہ لے کر دوا چھل دیا۔

پہلی کی گزرا سویت، ایک اور آدمی کو دے ہوئے بالکل ختم تھی۔ عباد نے چہرے پر سے اخبار اٹھا لیا۔ اور نیند بھری آنکھوں سے ریہہ کو دیکھنے لگا جو تھیلے میں سہل دی تھی۔
 "ریہہ! ہماری منزل آگئی ہے۔" عباد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
 "جی عباد بھائی! آگے چلے جیے۔" ریہہ نے کہا۔
 "ابھی تو دیکھ رہا تھا ہوں، تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ کچھ لے لوں؟" عباد نے پوچھا۔
 "میں کچھ نہیں مانگتا۔" ریہہ نے اس کا دل دیکھ کر کہا۔
 "جی عباد، کچھ کھانے کی چیزیں لے کر آؤں۔" ریہہ نے کہا۔
 "میں کچھ نہیں مانگتا۔" ریہہ نے کہا۔
 "میں کچھ نہیں مانگتا۔" ریہہ نے کہا۔

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

ریہہ نے فرما دیا۔ میرا دوست احمد دوست احمد کے ساتھ ہے۔ یہ کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری تعلیمات اور دینی تعلیمات یہ ہیں۔
 "فراز مسکرائی نظروں سے لے کر رہا تھا۔ وہ ریہہ سے کہا۔
 "جیسے؟" فرزانے نے کہا۔
 "یہاں تک کہ وہ ریہہ سے مل گیا۔"

”ہاں! ٹھیک کہا اے تیرے“ شہلا سرکائی۔ ”میں بھی کیا سوچ رہی تھی۔“
 ”تپ جانی میں نہ! اس لیے میں ایک بہن اور لے گیا۔“ عبادان کوگوں کے قریب آتے ہوئے خوش دل سے بولا۔
 ”جیت اچھا کیا۔“ شہلا کل کر سرکائی۔ ”اور یہ تو اتنی چھوٹی سی لگتی ہے کہ تمہارے بچے جانے کی فوراً دوستی کر لیتی تھی اس سے۔“

عباد نے اختیار نہ کیا۔
 ”کیونکہ وہ بے گناہ ہے۔“
 ”سو رہا ہے۔“ منینڈیکر پولیس۔ ”مناشیہ کر لو تو اسے ڈکالیں۔“
 سب لوگ ڈانٹک تھیل کی جانب بڑھ گئے تھے۔ رہید کو سب بعد سکون کا احساس ہوا تھا اسے اچانک سی بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

”کل شام اپنا کوہاؤں نہ تھامیں گے ساتھ ہی رہی رسم مندی بھی ہے۔ پر سولہ بج گئی ہے۔“ اقلندہ رہید کو پروگرام سے آگاہ کر رہی تھی۔ شہلا خاموشی سے نیچی سرکاری تھی۔
 ”اکیس بج رہی مندی پر سولہ نکاح۔“ رہید نے حیرانہ سے شہلا کو دیکھا تھا۔ ”لو سن کو تو کم از کم ایک بخت پلے پائیں بھانجے ہیں۔“

”اہں! بھانجے تو ہیں۔ پر یہ ہماری اپنا۔“ انگریز نہ ہو تھی۔ ”اقلندہ نے آگ بھوں چڑھائی۔“ یہ بھی دیکھو۔ کون کون سے آمر واپس کر لی ہیں۔ لن کی بیاں کو تو بھول گئی۔“
 ”انہیں تو اس کی جو جانی ہے ان سے۔“
 ”رہید منکر کر شہلا کو دیکھنے لگی۔
 ”تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”نہیں۔ اب تم انہیں زیادہ مت سراہو۔“ رہید یہ سولہ تیار ہوئے تھے۔ ”مگر ہو جائیں۔ کہ بچے کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ اقلندہ مندی کے لیے جیش کی کنواری اور تھا لیا۔ ”بھوکہ پڑی تھی۔ خود خاص طور پر خرید کر لائی تھی۔“

”مگر تم انہیں کتنا اچھا پسندو تم۔“ شہلا نے اسے گھورا۔
 ”پیش کرنا ہے باطل۔ آپ جو کوئے گا کر شوق سے کھاتی ہیں۔“
 رہید ہنس دی۔ اسے ہنوں کی ٹوک بھونک اور اس میں بھیجی جیت کا احساس لطف دے رہا تھا۔ اسی وقت عباد اور عروہ نے ہانکے کرے میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں ہنس رہے تھے۔
 ”ماما۔“ عروہ شہلا کے گلے میں بانڈا ڈالتے ہوئے نڈر سے بولا۔
 ”میرا اپنا! شہلا نے اسے جیت سے چڑا۔

رہید جو بھر کے لیے شہلا رہی تھی۔ اسے یہ جملہ قہار کہا ایک جہانیا ہے لیکن اپنی سوچ میں ابھی اس نے بھی ایسا بات پر غور نہ کیا تھا کہ عمر کی کنواری کون ہو سکتی ہے۔ اب اس وقت اسے اچانک ہی تم ہوا تھا کہ شہلا ایک بیٹے کی ماں بھی ہے۔

”اے! اے!۔“ نڈر جانی اور آگئی ہیں۔ ان سے طوبہ رہید حال میں تپ کی۔ ”شہلا! عمر کو اس سے۔“
 ”تپ جانی! کیا اور کچھ حیرت اور شوق سے اسے دیکھنے لگا۔ رہید نے منکر اکراہتہ بھالیا۔ عمر نے ہنس دیا۔
 ”نیکو۔“ ہوئے تھا تو رہید نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ پھر اس نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مارے ہو تپ کیا نام ہے تمہارا؟“
 ”مر۔“ وہ سرکایا۔ ”تپ میری خال جانی ہیں؟“ رہید نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”کھلے آئی ہیں؟“
 ”کو بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ دیگر افراد نے اب تک اس سے کوئی استفادہ نہ کیا تھا لیکن اب عمر نے اسے اسے اچانک سی آواز نہ ہوا تھا کہ بچے کے سوالات صحت آگے تک جا سکتے تھے۔
 ”میری ماں ہے۔“ ”مارے آگے بڑھ کر عمر کا بی بی جانب کھینچ لیا۔

”اتہ قتال کے پس ہے۔“ اس نے حیرانہ سے رہید کا جان لیا۔ ”یہ اتنی بڑی ہو کر بھی اتہ قتال کے پاس کی کراہتی تھیں؟“
 ”او۔“ رہید نے اسے ہنس دیا۔ ”بچہ کرے میں داخل ہوئے منکر کی تھیں۔
 ”نہا کر رہا رہید۔ اب تمہارا دل کچھ بھالے گا۔“ شہلا نے اسے خبردار کیا۔
 ”بیسے اچھا کھا گیا ہے۔ ہماری بابا بیٹہ راز کی تھیں۔“ ”عباد بڑھتے ہوئے بولا۔

”مارے آگے بڑھ کر عمر کا بی بی جانب کھینچ لیا۔“
 ”نہا کر رہا رہید۔ اب تمہارا دل کچھ بھالے گا۔“ شہلا نے اسے خبردار کیا۔
 ”بیسے اچھا کھا گیا ہے۔ ہماری بابا بیٹہ راز کی تھیں۔“ ”عباد بڑھتے ہوئے بولا۔
 ”تپ میری دوست نہیں کی؟“ ”مگر پھر اس نے چلا گیا۔
 ”بھول۔“ رہید نے منکر اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”خالد سے دوست نہ رہے ہو؟“
 ”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“
 ”یہ بھلائے تو ہمیں بھلائے۔“

”مگر تمہارے بچے کو کھانا کھانے سے کد کر لیا۔“
 ”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“
 ”یہ بھلائے تو ہمیں بھلائے۔“
 ”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“

”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“
 ”یہ بھلائے تو ہمیں بھلائے۔“
 ”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“
 ”یہ بھلائے تو ہمیں بھلائے۔“
 ”خالد جانی تو اتنی ہی غلامی آپ نے انہیں نہیں تو تپ کی انہیں کی۔ اس لیے دوست نہ رہا ہوں۔“ پھر آپ بھلا انہیں کی تھیں۔ اور ہمیں بھلائے کیمر کھلا کریں گے۔“

ہو اس وقت۔ کہاں جا رہے تھے؟“
 اختر میاں نے سرخ سرخ نگاہیں اٹھائیں اور سوکھے لہیوں پر زبان پھیری۔
 ”تہا اسلام علیکم۔“

”ارے وعلیکم۔ میں پوچھتی ہوں کہاں سے چلے آ رہے ہو؟ حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ جیسے گز سے نکل کر آئے ہو۔ چلو اٹھو۔ مکے نما کر آؤ۔ پوسے داغ بیٹا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں فادوق حسن نے اگر تمہیں اس طیلے میں دیکھ لیا تو بھگتیوں سے اٹھوا کر گلی میں پھینکوا دیں گے، سمجھے۔ اے ہاں۔ جسے دیکھو وہی گلی کا طوق ہے۔ چلو اٹھو اب۔“ وہ حد درجہ جھنجھلا گئی تھیں انہیں دیکھ کر۔

”باجی! وہ بھرنقاہت سے بولے تھے۔“ چائے تو ملا۔“

”ارے سب کھلا پلا دیں گے تمہیں۔ مرنے لیا جاؤ گے ذرا سی دیر میں۔ اب اٹھو بھی۔ جا کر ہمارا غسل خانہ پلید کرو۔ چلو جاؤ۔“

اختر میاں، ہن کی جھاڑیوں کا رس کر لڑکھڑاتے ہوئے غسل خانے کی سمت کو بڑھ گئے۔ فردوس بیگم ہاتھ پر سو بل ڈالے کھڑی سوچی رہ گئی تھیں۔

ہاشم میاں کوچی بھر کر بیٹا لایا تھا، لیکن انہوں نے قطعاً برا نہ مانا۔ بقول راجہ عید کے ان کے دانت تک پہلے ہو گئے تھے۔ پھر بھڑکے مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

”یام۔ ذرا بند کر اپنا۔“ راجہ کھڑا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔ ”اسی نہیں چل رہا ہے کہہ ہن۔ کہاں ختم ہیں اور دانت کہاں سے۔“

”چلو۔ ہم بھوت ہی سہی، سری چڑھیں گے ناکسی کے۔“ وہ گول ملتے ہوئے ایشن اتار رہا تھا۔

”پلٹ بھی گئے ہیں کسی کو۔“ حمزہ بے سوچے سمجھے بولا۔

”یہ بھی برا نہیں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

بات سمجھ لینے والوں نے ایک جھنجھلا کر کہا۔ ”لو کیا ہے جا رہا ہے۔“

”چلو کھکو میاں۔“ ”ورنہ نے سر کو شی کی۔“ ”بسیہ لوگ نجائے کیا کیا اول فول بولیں گے۔“

”کتے رہیں۔“ ”ماہین جھلائی۔“ ”ہم کیوں جاس۔“ ہم نے تو ابھی گائے گائے ہیں۔“

”تمہارا نگا ابھی دکھا نہیں۔؟“ رانمہ نے اسے کھورا تھا۔

”ارے۔ میرے بھائی کی شادی ہے۔ کوئی مذاق ہے۔“

”یہ مذاق نہیں آئی۔ یہ۔ حقیقت ہے۔“ ”ایک بیچھے سے حمزہ نے جملہ کہا اور جلدی سے ڈیسر سارا ایشن ماہین کے چہرے پر مل دیا۔ وہ بھوت بنی بیٹھی رہ گئی۔ لڑکیاں قہقہہ لگا کر فیس پڑیں تو وہ جھٹلا کر حمزہ کو مارنے لگیں۔ پھر زور سے چیخ اٹھیں۔ اس کے ساتھ ورنہ بھی چیخ مچی۔

کسی نے ان دونوں کی چٹیا اکبیں میں باندھ دی تھیں۔ اور اب سارے کے سارے انہیں دیکھ کر فیس فیس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

پھر تو گویا ایک طوفان بدتمیزی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب ایک دوسرے پر ایشن کے گولے بنا بنا کر پھینکنے لگے تھے۔ کپڑوں، میک اپ کا شہر ہو گیا تھا۔ قہقہوں سے پورا لان گونج رہا تھا۔ بزرگ حضرات تو یہ صورتحال شروع ہوتے ہی اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اور اب کوئی کسی کا یر سان حال نہ تھا۔ لڑکوں کی تو باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو چکی

تھی۔ علی اور یونس نے کہہ دیا تھا اور اب جی بھر کر اس کا حلقہ بکاڑے تھے۔ باغیہ اور سردار نے، ا
شامیت ہائی ہوئی تھی۔ عاشر نے انہیں کے منہ پر اینٹیں ٹپکائیں۔ یہاں تھا۔ اور اب اسے دیکھ کر کس پر تھا۔
عیشہ پر اینٹیں ٹپک کر، اگر کا تو وہ جو بیچا کر کھدے کو نے تک پہنچی تھی۔ بھرا کر چلی۔ سامنے تلخ شرار
سے مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ منگ کر بولی۔
 ”بد تمیزی ہے؟ تو ماحول کا تقاضا ہے۔“ وہ منس دیا۔
 ”شٹ آفس۔“ وہ غرائی اور طیش کر دہیں سے جلی گئی۔

ٹانغہ ایک ایک بیکار ہو گیا تھا۔ بہت عرصے سے وہ اس کے گرد نہ گزرتا تھا۔ اور اس کا کام چھوٹا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے وہ اس گریز میں حاکمیت 'انفرت' محنت جسم کی پائندگی کی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ عمر اسے کچھ سمجھ سکتی تھی۔ آنا تھا۔ وہ کھڑی ہو رہے تھے۔ مگر وہ کھانا اور ٹانغہ کی طرف دیکھ کر بھی سوچ میں کہم ہو جاتی تھی۔

رات اسے بہت جی پیئند آئی تھی۔ اسی لیے صبح سویرے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ اسی لمحہ اس کی مڑکی کے پہلو پر جان کی سیڑھی کے تہاں نمودار ہونا شروع ہوئی ہوئے تھے یا ہر لائن میں چٹکی چھپ چکی تھی۔ منہ دوں گوازیں اس کے گل کو خوشی اور تشکر کے احساسات بخشے نہیں۔

روید۔ ہستہرے نکلی آئی۔ دواش روم میں جا کر اس نے دھوکا دیکر گناہ ٹپ جاتے نماز پڑھا کر خدا کے حضور حاضر ہوئی تھی۔ نماز میں اسے بہت لطف محسوس ہوا تھا۔ دل دہلا کر پیسے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد پانکھ بن گئے تھے۔

[illegible][illegible]

جائگ کرتا ہوا روضہ بکھلتے گھبراہٹا۔ جو بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے جو حرم و قوس
یکساں کرد آئندہ خالی بنا ہوا تھا۔ نرم نرمہ حویب رشتوں کی فوجی شاخوں پر اپنی کھم اور اب نیچے اترنے کے

کی کہ وہ ہے اس کی آنکھ قدرے تاحے سے کھلی تھی۔ سو باٹم کو تازہ دم ہونے کے لیے سوتا ہی آیا تھا اور اب کھڑا حیرت سے اس بے فکر دیوانی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ چراگ کی ٹنگی شیخ پریشی

۱۔ وہ گہری خیریت میں تھی۔ سیاہ گھٹیرے بالوں کی پانی اس کے شانے پر پھیل رہی تھی اور گلابی بو خوش

اول: زندگی میں یادداشتیں لکھنا۔ دوسرا: محکمہ تعلیم کے سربراہان سے رابطہ قائم کرنا اور ان سے مل کر تعلیم کے شعبہ میں کام کرنے کے لیے درخواستیں جمع کروانے کے لیے کام کرنا۔ تیسرا: تعلیم کے شعبہ میں کام کرنے کے لیے درخواستیں جمع کروانے کے لیے کام کرنا۔ چوتھا: تعلیم کے شعبہ میں کام کرنے کے لیے کام کرنا۔

[illegible][illegible]

”میرا مطلب ہے کہ تم کو اس کے بارے میں پتہ چلے۔“
وہ نے چند لمحوں کے بعد پوچھا کہ تم کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے؟
”نہ تو تم کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے نہ اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے۔“
پھر وہ نے کہیں سے کہیں رخ پھری تو اس کے سامنے ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”وہیں سے! کہہ دیتی تھی کہ تم؟“

(55)

”عباد بھائی! میں ذرا پارک تک چلی گئی تھی۔“ ربیعہ بھی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میں پریشان ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک تمہارا دروازہ بجایا پھر دوسری جانب سے دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ تم نجائے کہاں چلی گئیں۔“

ربیعہ نے اس کا چہرہ دکھا پھر مسکرا دی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی عباد بھائی! وہ ہنس دی تھی۔“ بے فکر رہی۔

عباد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑا سا باؤ ڈالا۔

”چلو ناشتہ کرلو۔ امی بہت مزے کے پرائے بنا تی ہیں۔ اور ہاں رات کو ششلا آپلی کی مندی کی تیاری بھی کرنا ہے۔ تم نے اور انیسو نے سنبھالنا ہے سب کچھ۔“

”مذہب۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

پھر اپنے کمرے میں آکر اس نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ دیکھا اور مسکرا دی۔

”مٹی میں دبائے پھر رہی تھی۔“

ربیعہ نے کانڈ پھینکا اور پھر حیرانی سے مسکرائی۔ اس پر تو پوری نظم تحریر تھی۔ ربیعہ نظم پڑھنے لگی۔

”کمال ہے۔“ پھر بولی تھی۔ ”یہ میری پہلی نظم ہے۔“

پھر دیکھا اس کے ذہن میں یہ نظم نظر آ رہی ہو گی تھانہ وہ لہجہ حیران نظروں سے گزر گیا۔

”ربیعہ! منہ بند نہ کر۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”ناشتہ کرلو۔“

وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

UrduPhoto.com

رات روشنیوں سے معمور تھی۔ عباد کے کمرے پر چھت پر تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ڈیوڑھی والوں نے چھت

کو خوبصورتی سے سجائے میں کوئی وقفہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ ہرے اور پیلے رنگ کے جھلملے دھبوں سے پورا

ماحول سج گیا تھا۔ جگہ جگہ گلاب کے پیلے اور نارنجی پھولوں کے گلدستے سجائے گئے تھے۔ اسٹیج پر گیندے کے

پھولوں کی فراوانی تھی۔ رنگین نقشبندیوں نے جا بجا مختلف رنگ کی روشنیوں کو بوم بوم بجایا ہوا تھا۔

انیسہ اور ششلا کی سیلیوں نے اسٹیج پر بیٹھ کر ہر طرف سے آوازیں نکالتی کر رہی تھیں۔ انیسہ اور

ربیعہ کھانے کے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عباد موسیقی اور تصویریں بنانے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

تب ہی ہاشم کی طرف سے مندی لے کر پوری پنشن آچکی۔ آنے والے بھی ڈھول اور دف بجا رہے تھے۔

ادھر والوں نے بھی فل دیویم میں ڈیک آئن کر دیا۔ موم بتیاں روشن ہو گئیں۔ گائیں بجا دی گئیں۔

دولہا میاں کی بہنوں اور کزنز کے چہرے موم بتیوں کی سحر انگیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ تب ہی عریشہ کی

نظرس دو آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ لیکن وہاں اجنبیت اور بے نیازی تھی۔

عریشہ کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سب کے ساتھ کھٹنے لگی۔ فراز ایک جانب کھڑا سینے پر بازو

لیپے خاموش نظروں سے ہنسی مسکراتی، کھلکھلاتی ناعہ کو دیکھ رہا تھا۔

ناعہ مندی کا تھیل اٹھائے اس کے بالکل قریب سے گزری تھی۔ گزرتے گزرتے اس نے نظرس اٹھائیں

اور اس کے لب جیسے مسکراتا بھول گئے۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

نیلے نے نل والیوم میں ایراد کا ۲۳ سال تیری گل کرنی "دکھایا تھا۔ تقریب کا رنگ یکلفت ہی بدل گیا۔
انہی باب سے آئے ہوئے لڑکوں نے ٹولی بنا کر گانے پر رقص شروع کر دیا تھا۔ عبادؔ فرزا اور عباد کے دیگر
بھی ماحول کا اثر قبول کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سارے لڑکے مل کر خوب خوب ہنگامہ کرنے

"اگرے بھی۔ پہلے رسمیں تو کر لیتے۔" شفیقہ حیات نے پاٹ دار آواز میں کہنے کی کوشش بھی کی لیکن اتنے
نیلے نے ان کی ایک نہ سنی۔

"اباں بھی آلیاں بجا بجا کر اپنی طرف کی پانی کو پوری دوا دے رہی تھیں۔ ربیعہ شوق اور دل چسپی کے عالم
میں یہ سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کب اپنی زندگی میں اس طرح کا بے فکر اور خوش باش ماحول دیکھا
پوری طرح سے تقریب کو انجوائے کر رہی تھی۔

"ربیعہ ربیعہ۔" کوئی اسے پکار رہا تھا۔
یہ چونکی۔ اس نے اچھڑاؤ ظہر دیکھا۔ دور کھڑی اہلیقہ بن جانے کب سے اسے پکار رہی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر
کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ربیعہ جلدی پکڑے کھڑی ہوئی اور شور مہا کرتے لڑکوں سے بچ بچا کر نکلنے لگی تب ہی بے خوشی میں دھمال ڈالتا
اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ یہ ٹھنک کر کی رافع بھی تھی۔ آگے میں لپٹا آ کر شرمندہ ہوا۔
"اگھاں بھائی! کھانا کھا کر سو رہے۔"
مستی گھر آ جا رہے تھے تیرے سو رہے۔"

ایک پر ایراد چمک رہا تھا۔ ربیعہ اس نکر اور خاصی ندوس ہو گئی تھی۔ وہ نظریں جھپک کر دکھائی چہرہ موڑے جلدی
آگے بڑھ گئی۔ رافع اپنی بیعت کو کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ "تجے" شور مچاتے لڑکوں کی ٹولی کے بیچ وہ ایک نک
وج میں گم کھڑا تھا۔ اسے کسی کا دکھانا تو بہ جلدی میں سے اونٹن ہاتھ اٹھا کر پھر شروع ہو گیا لیکن اب کی بار
اس میں وہ پہلی ہی سرستی نہ تھی۔



یہ اہلیقہ کے ساتھ ٹپکی منہل رہ چلی آئی جہاں سکون اور خاموشی تھی۔
نیلے کسی کام سے نیچے آئی تو دیکھا عباد بھائی کا موبائل بج رہا ہے۔ "اہلیقہ اسے بتانے لگی۔ "میں نے کال
کی تو دوسری جانب کوئی عبد الباری صاحب تھے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔"

اوپر "ربیعہ کالہ غیر معمولی انداز میں دھر کا۔" پھر پھر۔ "اس نے بے تالی سے پوچھا۔
بھوس نے انہیں تقریب کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگے۔ بعد میں بات کر لیں گے اب اگر تم کو تو میں اسی نمبر
پر ادیتی ہوں یا پھر یہ تقریب ختم ہو لے تو بات کر لیں۔ کیا خیال ہے؟"

اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ربیعہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ موقع اس امر کے لیے مناسب نہ
تھی شہلا کی رسمیں ہونا باقی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بول۔ ”میں بعد میں بات کر لوں گی۔“
 اہلقلہ مطمئن ہو کر پلٹ گئی۔ ربیعہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہر چند کہ اس کا دل ترانہ کی خیورت معلوم کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔
 لڑکوں کا جوش کچھ سرد ہوا تو اہلقلہ اور ربیعہ شہلا کو تمام کرا سنچ پر لے آئیں۔ شہلا کے چہرے پر پہلے اچھل کا سایہ تھا اس لیے اس کے تاثرات سب ہی سے پوشیدہ تھے۔ سب ہی کی پر شوق نظریں اس کے سراپے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایقان سے صبر کرنا دشوار تھا۔ جلد از جلد اپنی عزیزا جان سبیلی کے تاثرات معلوم کرنے کی خواہش مند تھی۔

رسمیں شروع کی گئیں۔ شفیقہ حیات فردوس بیگم اور عنذرا بیگم سب سے پہلے اسٹیج پر پہنچیں۔ انہوں نے اسے ایٹن، مندی، تیل سب ہی کچھ لگایا۔ شہلا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بڑے سے دبے میں چھپے اس کے وجود میں ارتعاش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک انجانا سا شور بیا کر رہی تھی۔ اسے نجانے کیوں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ بے شمار نظریں اور دودی کیمروں کے لینس اس پر مرکوز تھے۔ وہ ماتھے پر آیا پیسٹ تک پونچھنے سے قاصر تھی سب ہی اس کے قریب ایک شوخ اور مانوس آواز چھپاتی تھی۔

”ہمیں تو دیدار سے محروم نہ کرو شہلا۔“
 یہ ایقان بھی جو شوخی پر کچھ بول رہی تھی پھر وہ اس کے گھونٹ میں سے جھانک رہی تھی۔ شہلا کے لبوں پر دم ہی مسکن آؤٹ گئی۔

”ہوں۔“ پھر مطمئن ہو کر بولی۔ ”اب کم از کم دو لہا میاں کے سوالوں کے جواب تو دے پاؤ گی۔“
 شہلا کے کانوں میں ایک مرتبہ پھر سانس سانس کی ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یہ حوالہ۔ جیسی لگ رہا تھا نجانے کیوں۔

UrduPhoto.com



ہاشم چائے کی طلب کر کے کمرے سے نکلا تھا۔ شادی کے کاموں کی غرض سے رخصتی جانے والی جزوقتی ملازمہ کچن میں موجود تھی۔ اس کا ہاتھ اس سے چائے بنوانے کا تھا۔ وہ بیڑیوں پر آکر ٹھک گیا۔ بیزار ہزار سی عریضہ بیڑیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ سادہ سے پیرول میں بیوس تھی اور اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ حالانکہ وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ اس کی مندی لے کر شہلا کے گھر گئی تھی۔

عریضہ نے بھی ہاشم کو دیکھ لیا، وہ چوری ہو گئی۔
 ”عریضہ! ہاشم نے تشویش سے پکارا۔

”جی ہاں بھائی!“
 ”تم واپس آ گئیں؟“

”جی۔“ وہ نظریں جھکا کر بس اتنا ہی کہہ پائی۔
 ”کیوں خیورت؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میری۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سر میں۔۔۔ درد تھا۔“ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ ہاشم چند لمحوں اس کا چہرہ دیکھا رہا۔
 ”اسی ہی آ گئیں؟“ اتنی رات میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”چھا خیر۔“ ابھی گئی ہو تو زرا چائے بنوا دو، میں بھی سرور

محسوس کر رہا تھا۔
 "کی۔" وہ چلی۔
 "سنو" ہاشم کو بے اعتنا خیال آیا۔ "کسی کو بتا کر آئی ہو؟"
 عرش چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر اسے سہلی سے بول۔
 "زمین ہی نہیں رہا تھا!"
 "اوہ جگہ!" وہ قدرے براہم ہوا۔
 پھر جب سے وہ بالکل نکالے ہوئے بیڑھ میں چڑھنے لگا۔



سب لوگ کھانا کھا رہے تھے جب تھوڑے ہاشم کی بھل رہی تھی۔
 "عرش؟" وہ بولا۔ "وہ آپ کے پاس ہے؟" اگلے ہی لمحوں میں اسے یہ کہہ کر رہی نہیں گئی۔ نہیں۔ اسے
 بنگالے میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ اچھا میں اسی سے کہہ دیتا ہوں۔"
 وہ بالکل جیب میں رکھ کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا تو جبکہ قریب کچھ لوگ اس سے براہ راست
 سکتی دیر سے اس کی ستاشی نظروں سے دوڑ رہی تھیں اور وہ ان کی کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔
 یہ معطل کرنے سے اسے قاصر تھا۔ ان دنوں میں ایک عجیب سا لہجہ محسوس کرنے لگا تھا۔



"اور کچھ لمحوں کی آپ؟" کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔
 "نعمہ چنگ کر مڑی اور ڈر گئی۔ فرازا اس کے عین عقب سے
 اور قدرے خرم سے کہا۔
 "کی۔" نہیں، عرش۔ وہ ہنسنے لگی۔ ہوسٹ کیس اس کے ملنے میں جیسے انکس کیا تھا۔
 فرازا نے ہاتھ میں تھی ہوئی تھیں۔ اس کے لیے، نعمت نے ہاتھ میں پوٹ جہاں کرکھوٹ بھرا دھتاسی تاؤ کے
 اسے دیکھ کر بار بار کھانا کھانے سے چند گھنٹہ جلدی جلدی بھرے اور کھانا کھانے سے لوٹانی چاہی تب اس کے چہرے
 دھیمی دھیمی سکان نری کی صورت ابھری۔

برما کے پاس مڑی اس نے ہاتھ کی
 کرنا تھا مڑت بھی دل چاہی کی
 وہ دم سولی میں بولنا۔ نعمت کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے مڑ کر سروس کے پاس جا کھنٹی
 ہوئی۔ فرازا اس کی گوری گولن میں دھکی چھین کر دیکھ کر کیا تھا۔



رہنے کے ذمے انہی نے شلا کو کھانا کھلانے کی ذیونگی لگا دی تھی۔ وہ لپٹ میں جا رہی اور ہوسٹ کا پیسہ رکھا
 اب جیسے کی خاطر میں نظروں سے ڈار رہی تھی۔
 "میکسکو زنی۔" کسی نے کھانکھارے توئے کرنا۔
 رہنے چونکہ انکی۔ راتیں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سگرا رہا تھا۔ وہ نہ دوسری بھر ہوئی پر مری کی سی لگا۔

آج جیسے گئی۔

"کی۔ آپ نے مجھے کچھ کہا؟"
 "نہیں، میں نے ہی کہا ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔
 "کی۔ کی۔" وہ بھرا ہوا مسکرایا۔
 "ہاں، اس قدر کم احسان نہ تھی لیکن اس اجنبی کی مصو غرائی نظروں میں شوق اور جستجو کی حیران کن کیفیت تھی۔"
 "رہیدہ بول کھلائی جاتی تھی۔"

"نعمہ جان سکتا ہوں آپ کے متعلق؟" وہ جیسے کسی کشمکش کا شکار تھا۔
 "کی۔ کیا؟" وہ بڑبڑاتا ہوئی۔ "کیا جانتا ہے؟" وہ بولے۔
 "میں نہیں لگتا ہے جیسے آپ کو نہیں دیکھا ہے؟"
 "اس لیے کہ آپ نے نہ دیکھا ہے۔"

آج جیسے گئی۔

"نعمہ پارک میں کھانا کھا رہی تھی کہ اسے اس کے ساتھ سے مسکرایا۔
 "اس نے جیسے رہیدہ کی بات پر اس سے مسکرایا۔ "میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔"
 "نعمہ، بھول آپ کے اس سے کچھ بات نہ کیا ہے؟" وہ بولے۔
 "نعمہ کو کچھ یاد تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو پہچانی تھی۔
 "وہ بڑبڑاتا تھا۔ رہیدہ کی آنکھوں پر بھی چاکلوں کی ٹپکس آ رہی۔"

UrduPhoto.com

نعمہ کی بات پر رہیدہ نے اسے دیکھا۔



رات کے دو بجے تھے جب کہ عرش کا دواخانہ بجایا۔ عرش جاگ رہی تھی اور نامعلوم لذت کا شکار نہ
 "نعمہ کو سوسے مل چکی تھی۔
 "وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اسے چوکا ہوا تھا۔ وہ اندھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور زور دوا کھول دیا۔ ہاں
 "نعمہ کو کچھ یاد تھا۔ اسے کڑے تیروں سے گھور رہی تھیں۔ عرش کی نظریں جھک گئیں۔
 "نعمہ اس وقت۔"
 "نعمہ کی تیشیاں بے لگام گھونڈوں کی طرح ڈھیر ڈھیر گئیں لیکن انہی کی تیشیاں پوٹنی ہوئی دوا دیتی جاتی ہیں جی۔" وہ ہنسنے
 لگی۔

عرش ایک طرف میں ہو گئی لیکن انہوں نے کمرے میں قدم نہ دھرا۔
 "اسی سے اجازت لیے بغیر بھی قریب پھر دوڑا کھلی دوا ڈالی جی انہیں۔ اچھا تاثر ہوا کہ سارے سے ہمایا کے
 "نعمہ۔" وہ بولے۔
 "نعمہ میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔"
 "نعمہ تو تمہاری کچھلنے کی مار سے خراب ہے۔ یہاں اچھا تاثر لگ رہا ہے بیٹی ہو۔ نہ مرق ہو نہ ہمیں جینے دیتی

غریبہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز چٹاکی نظریں اٹھائی تھیں۔
 "گھر میں اتنے مہمان نئے لوگوں سے، واسطے بھائی کی خوشی کا موقع۔ ہمیں کسی شے کا لحاظ نہیں۔ تمہارا ماتم ہے کہ پورا ہو کر نہیں رہتا۔ ہماری عزتوں کا بھی پاس نہیں تمہیں۔"
 "میں نے آخر کیا کیا ہے امی!" وہ دمِ ہم لہجے میں شکایتا بھولی۔ "آخر کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟
 آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔" وہ خود بے اختیار سسکا اٹھی۔
 "تم اسے حال پر توجہ کرو بیٹی، تو کسی دوسرے کو یہ تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔"
 ان کے دل کو بھی اس کی بے بسی دیکھ کر کچھ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے لہجہ کچھ نرم کر لیا۔
 "بھائی کی شادی کا موقع ہے اپنے آپ کو کچھ عقل کی بات سمجھاؤ۔ ہماری باتیں تو تمہاری سمجھ میں آتی نہیں ہیں اب کسی کو تم سے شکایت نہ ہو۔"
 اسے تنبیہ کرتی ہوئی وہ مزگنی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے فاروق حسن دلفنا "راہداری میں ہو گئے۔ فردوس بیگم اپنی دھن میں نکل چکی تھیں۔
 غریبہ دروازے سے سر نکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔



رات کے چار بجے کا مکمل تھا۔ گھر کے تمام افراد تقریب کے اختتام پر تھک کر چور ہو چکے تھے۔ رات دنوں ہاتھوں کا تھکنا سر کے نیچے جمائے سیدھا لینا چمت کو گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ آج کل ان کے سر پر کنگھی نہ تھی۔ آج کل ان کے سر پر کنگھی نہ تھی۔ آج کل ان کے سر پر کنگھی نہ تھی۔
 اور شرم سے جھک جاتی تھیں۔ وہاں ایک بڑا مکان چھپنے والی کھڑکیوں سے لگا ہوا تھا۔
 پیشانی کی محراب پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسے ہاشم کی یاد آتی۔ بے سوچے سمجھے اس نے موبائل اٹھایا اور فون پرش کر کے لگا۔ چند لمحوں بعد ہاشم کی فینڈ میں ڈھل "آواز ابھری۔
 "اے ابو! تیرے سونے کا وقت نہیں ہوا؟"
 "یار ہاشم! یہ عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے مجھے۔"
 "ہائیں؟ تمہارے منہ سے کچھ دیکھنے دے۔ ہائیں! اے ابو کی دم۔ یہ اس وقت تجھے کون سی الجھن ستانے لگی؟"
 "نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "جی جانتا ہے کچھ کہوں۔ کچھ کچھ اعتراف کروں۔"
 "میں یاد رہی نہیں ہوں میرے بھائی!۔" وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "اور دیکھ مجھے سونے دے کل مجھے جاگنا ہے۔ پلیز۔ کوئی الٹا سیدھا اعتراف کر کے کہیں تو میری خیندی عتاب کر دے۔"
 "ابھی سے بے متوتی کیا یہ عالم!" وہ چیخ کر بولا۔ "ابھی تو رات پڑی ہے درمیان میں۔"
 "ہائیں!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "رات تو گزرنے والی ہے۔ ہاں پورا دن ضرور پڑا ہے۔ ایک عالم انتظار کا باتی ہے۔"
 رات کے لہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اسے ہنسی آئی۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر ہاشم نے پھر ایک سرد آہ بھری۔ رات نے ہنسنے ہنسنے موبائل آف کر دیا۔

اس نے کھڑکی کا رومہ سرکا کر مچھ میں اتاری شام کو دیکھا پھر بجائے کیوں وہ فخرزدہ ہو گئی۔ ایک عجیب اشتہار اب تھا جو اپنا آئینہ بچوں کے گرد لٹکا کر باہی چلا جا رہا تھا۔ ایک بے گلی تھی جو کسی طور کم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ ایک بے چینی جو ہر جہتی بلی بلی جا رہی تھی۔ اس وقت انھیں سے دروازہ کھول کر اندر بھاگنا وہ شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔

”عیا! ششلا! سچلی سے مڑی۔“

انھیں یاد ہو گئی۔

پار سے باہر جانے کے لیے فون آیا ہے۔ تب کو ٹھیک جانچ کر دیکھ رہی تھی۔ سائے چار بج رہے ہیں۔“

ششلا نے جہاں ہی نظروں سے گزری کی سمت دیکھا۔

”آپ کو چاہئے پانڈو؟“ انھیں بھی بے چین اور اداس سی نظر آ رہی تھی۔

ششلا نے ان بات میں سر ہلا یا توں جانے کے لیے مڑی۔

”مستوب! آف!“ ششلا متعجب ہو کر مڑی۔

انھیں یاد ہو گئی۔

”عجب کہیں ہے؟“ اسے میرے پاس بھیجنا۔ ”اس کی تو ان میں اسروں کی کئی مثال تھیں۔ انھی کے لیے انھیں“

مڑ کر دیکھنے کا حوصلہ نہ کیا۔ جب چاہ چاہ کر کے میں داخل ہوا تھا۔ دھڑکا کے قریب چلا گیا۔

چند لمحوں بعد مسکرا ہوا ہر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دھڑکا کے قریب چلا گیا۔

”ماما! آپ نہ دیکھیں۔“ وہ جملہ کھل نہ کر پائی۔

اس کی توجہ بڑے بڑے عوی دور سے لائی جانب مبذول کر رہی تھی۔

”ماما! وہ بھتیخا انما میں بہنوں کی طرف بڑھا۔“ ”آپ نے نہیں دیکھی؟“

ششلا نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ ”میرا اس کی جانب مڑا۔“

”ماما! کچھ آپ نہیں دیکھیں؟“ ششلا بڑبڑا کر کہتی تھی۔

”اور کچھ؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف مبذول کیا اور اس کی غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بھی ایک

تک بات دیکھ رہا تھا پھر اس نے اسے نیچے نیچے اٹھائیں اس سے اس کا چہرہ تھام لیا۔

”ماما! آپ کو سن رہی ہیں؟“ ششلا نے جواب نہ دیا۔

ششلا کو بچوں کی طرح ہوا جیسے عمر سے دور عمارت کی گواہی دے رہی تھی۔ اس نے ایک ایک سے خود سے بڑھا

لیا اور چھوٹ پڑ کر رو دی۔ ”میرے سوال سے اسے سر کا ایک کانٹا مارا احساس سے دوچار کیا تھا وہ حواس بھار

رہی تھی۔

اس وقت انھیں جانے کے لیے اٹھانے کے لیے میں داخل ہوئی۔ میرے اس کے جیسے تھی۔ وہ دونوں کچھ وقت اس

کے ہر اکڑا کرانے کی غرض سے اس کے ساتھ چلنے پھرنے کے ارادے سے نکلی تھیں۔ ششلا کو بچوں کی طرح دیکھ کر

انھیں نے اس کے لیے بڑے بڑے رکھ دی اور تیزی سے ششلا اور عمر کے قریب آئی۔ اور پھر ششلا کے آنسوؤں میں

اس کے بھی آنسو بھی شامل ہو گئے۔ میرے لیے یہ وقت تیز ہو گیا تھا۔ یہاں پر اس کی سسک تھی۔

پھر وہ میری طرف سے سب کی سب دھواں دھواں رہی تھی۔ ایک ایک کر کے دروازے پر منہ نہ دیکھ کر خود

”نہیں! گورہ! کیا تو نہیں جانتی؟“ انھیں یاد ہو گیا۔ وہ ششلا کی بار سے چپ کر جانے لگیں۔

”نہیں! ششلا! یہ آپ کے آنسوؤں پر چھوڑ دیں۔ زندگی کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہہ۔ بھول جاؤ ان آنسوؤں کو۔“

ششلا آنسوؤں پر چھوٹنے لگی۔

”فرزاد تمہارے بچنے اور زنجیر باندھ جائے۔“

انھیں بھی یاد کر چھوٹنے سے ایک ششلا کا عوی دور اور زنجیر باندھ کر کے بڑے رکھنے لگی۔ میرے ہم عمر

سے عمر کو خود لپٹا لیا اور نہ لپٹی۔

”مہیا! آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔“ میں سمجھیں عمر کے لیے میں آپ کی جگہ لے رہی ہوں۔ میں

اسے تب سے زیادہ جاننے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ میں محل میں کوئی کمر نہ چھوڑوں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ

تھی۔ ”میرے پاس سے اس لیے کہ کو ششلا کی بھی

ششلا اور میرے بچنے کا ارادہ نہیں کر سکتی۔

”شکر یہ رہتا ہے۔“ انھیں یاد تھا کہ کچھ مدت قبل ہی ہے۔

”مہیا! میری جانب سے آپ کو کچھ بھی تھا؟“ انھیں یاد تھا کہ کچھ مدت قبل ہی ہے۔

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

ششلا بچے ہونے لگی تھی۔ منہ نہ دیکھ کر اس کے ساتھ اس کا کانا دیا۔ وہ چلی گئی۔

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

”میرے لیے کوئی خدمت ہو۔“ ششلا نے جواب دیا۔ ”شکایتیں کیا ہے؟ تمہاری۔“

ہاشم اب خود سے مطمئن ہو چلا تھا۔ ہذا سرسری سا آئینہ دیکھنے لگا۔

”دورہ اعتراف؟ جو وقت تجہ نازل ہوا۔ وہ کیا تھا؟“

”اعتراف؟“ رافع یوں بنا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”کون سا اعتراف؟“ ہاشم نے پھر ایک دھمو کا اسے رسید کیا۔ رافع کراہ اٹھا۔

”اے کچھ نہیں یاد ایسے ہی تجھے چھیڑ رہا تھا وقت تجہ۔ توجہ سمجھ بیٹھا۔“

”دورہ جو میرے منہ سے کچھ نکل جاتا انسا سیدھا۔ پھر؟ قبولیت کا وقت تھا۔“

”قبولیت کا؟“ رافع سوچنے لگا۔ ”قبولیت کا وقت تھا؟“

اسی لمحے کمرے میں حمزہ نے جھانکا اور اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

”حضرات۔ وقت سرا بندی ہوا چاہتا ہے۔ ابو جی دونوں ہاتھوں میں سرا تھاے دولہا کے مختصر ہیں۔ تشریف لے آئے۔“

”س۔ سرا۔؟“ ہاشم کو جھکا سا لگا۔ ”یعنی کے سرا؟ میں سرا باندھوں تو میں پر؟“

رافع اور حمزہ ہنسنے لگے۔

”وہ بھی نوٹوں کا۔ ہزار ہزار کے نوٹ ہیں آپ کے سرے میں۔“ حمزہ پھر پھلکا۔

”نوٹوں کا سرا۔؟“ ہاشم کو پھر کرٹ لگا۔ ”و خدا کے لیے بھائیو۔ مجھ پر ترس بکھاؤ۔ میں سترہویں صدی کا بکری نما دولہا نہیں ہوں۔ اندھوں کی طرح کہاں ٹانگ ٹوئیاں ماروں گا؟“

کمرے میں رافع اور حمزہ کے قہقہے گونجنے تو علی اور رافع بھی جلے آئے۔

”توبے فکر کر۔“ علی نے کہا۔ ”تو میرے پاس تو نوٹوں کا سرا ہے۔“

”خیر تک؟“ ہاشم نے ابدوخ حاکم ”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے۔ جب تک تو اپنے سارے آپ جلنے کے قابل نہیں ہوتا تب تک میرا سرا نہیں لگتا۔“

”میں ہرگز سرا نہیں لگتا۔“ وہ جھجکا۔ ”اور وہ بھی نوٹوں کا سرا۔“

”سوچ لے۔ تاپا ابو کو غصہ آ گیا۔ چوتوں کا سرا باندھ کر لے جائیں گے۔ رافع نے دھمکایا۔

”اچھا۔“ وہ سہم گیا۔ ”پھر نوٹوں کا بانی کسی سے ڈاؤن ہے۔ کل نئے نوٹ ہوں گے اس میں لگس بھگ؟ ہنی مولن کا بندوبست ہو جائے تو میں یہ قربانی بھی دے سکتا ہوں۔“

”صدقے جاواں۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”بھائی جان۔ محتاط سبب سے ہزار کا تو اس میں صرف ایک نوٹ ہے۔ باقی سبب پانچ کے نوٹ ہیں۔“

”پانچ کے نوٹ؟“ وہ چیخا۔ ”وہ تو کب کے متروک ہو چکے ہیں۔“

”تب ہی تو ابو جی نے نوٹوں کا سرا بنوایا ہے۔ صرف بنوائی کے میسے دیے ہیں انہوں نے۔“

”یا خدا۔“ ہاشم کو چکر آ گیا۔ اسی لمحے ہانپتی ہانپتی فردوس نیگم نمودار ہوئیں۔

”ارے بیٹا۔ سب کے سب ہی دولہا بن رہے ہو کیا؟“ وہ حقیقی سے بولیں۔ ”نیچے ہال میں ایک لڑکا نہیں جو ہمارے کچھ کام آئے۔ اور ہاشم بیٹے! تیار ہو تو چلے آؤ۔ برات لے جانے میں اب کون سی کسر ہے؟“

”امی جی۔ میں سرا نہیں باندھوں گا۔“

”سرا۔؟“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”کون سا سرا۔؟ تمہارے ابا میاں نے تو صرف پھولوں کے ہار منگوائے

جس پر ہم کے لیے
ہاشم نے سے مٹھیاں بچھ کر مزہ کی تلاش میں اور حرام و حلال کا جان نہ کر کے سر سے سینگ کی مانند
غائب تھا۔



اس نے اقلیدہ کا لاشٹ پر تل غراں سوٹ پہنا تھا۔ لباس اس پر اس طرح سے سجا تھا جیسے اسی کے لیے بنا ہو۔
ڈرائنگ روم کے ٹیلی فون کے کمرے پر آکر کھڑا ہو گیا۔
اس کے لانے سیاہیل کر کے بچے تکھا اپنی چھب دکھلا رہے تھے گوری رومخت ذرا سے ایک آپ سے وک
اضی بھی سیاہ آنکھوں کو لانے نمایاں کر دیا تھا۔ سینٹ کا بڑا سا ہم رنگ لاپٹہ اوڑھے وہ کوئی مثل شاہ زادی
لگ رہی تھی۔
"بیوی فلا!" بے ساندھی اقلیدہ کے لبوں سے نکلا۔ "ریجہ۔ ریجہ۔ یہ تمہی ہو نا۔" راجہ شرابی تھی۔
"میں ایک کی ہے۔" اقلیدہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

ریجہ اس کی بھینے لگی۔
"بیوی لری کی۔ گردن بھی مٹالی ہے اور کانوں میں بھی کچھ نہیں۔"
"اسی ہے جس اس کے لیے یہ لائی ہوں۔" منہ پر دیکھ کر وہ دونوں ہنسیں۔ وہ ہاتھوں میں چو لری باکس
تھامے کھڑی تھیں۔
"ریجہ تمہیں پہن لو۔ یہ میرا ہے سوچوں کا میٹ ہے۔ تمہارے اس لباس کے ساتھ بہت اچھا لگے گا۔"
"تو نفی نہیں۔" وہ چٹکی بٹائی۔
"اور اب بھینے ایسی لگا کر۔ میری بیٹیوں جیسی ہو کر۔" منہ پر دیکھ کر وہ دونوں ہنسیں۔ وہ ہاتھوں میں چو لری باکس
تھامے کھڑی تھیں۔
"میں بھی ٹھانٹ تیار ہو جائی۔ اہل بیٹیاں مجھے بھی ڈانٹ کر لگیں۔"
"جس ایسی نہیں۔ میں یوں تیار ہو گئی۔" اس نے چٹکی بٹائی۔
ریجہ ذہ خاشاک کھڑی رہ گئی تھی۔ چو لری کی خوشبو اس کے ارد گرد پھیلی تھی۔ اس کا درد پھول بدن کرکھانے
لگا تھا۔



ناشر اندر داخل ہوتے ہی لنگھ کر رک گیا تھا۔ سفید موٹیوں کے کاسہ والے فیوڈی لباس میں ہلوس اینڈین کی
آج چھب سی خرابی تھی ناشر کو ڈرنک ٹیکل کے آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ اینڈین نے ایک بے
یادزی سے نظریں اس پر ڈالنا اور پھر اپنی لب ایک درست کرنے میں مگن ہو گئی تھی۔ کھلے ہوئے پردوں میں اس کی
پشت پر کھڑے ہوئے تھے اور اس کا بے پروا تھاق رپ کلبیں کر رہے تھے آٹان تھا۔
ناشر نے اس کے قریب آکر اسے کرتے تمام ایسا اور اپنا چہرہ اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ اینڈین کو بڑا مائی
"ناشر! ناشر! دروازہ کھلا ہے۔ کیا کر رہے ہو۔"
"اسی کچھ نہیں جس کے لیے دروازہ کھلا جائے۔ یونہی قریب سے دیکھ رہا ہوں جیس۔"
آئینے میں اس سے لگا ہوا عکس دیکھتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

"لوں ہوں۔" ناشر نے کہا۔ "تو ناشر کی۔" ناشر اندر سے دھک تو اچھا ہے۔ یہ میرا کھک ہے۔ ابھی میرے ایک
"ناشر! میرے بھائی! نہ آجائیں گے۔ سمجھو۔"
"لوں۔" ناشر اندر قریب رکے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "یہ اٹھ کھک ہے بھائی! بندوں کا ذرا باؤ تو۔ ہم نے
ہی کو اتال نہ ڈھالیا تو کھانا۔"

ایک نے بڑے ڈانے اندر چھا کر اسے دیکھا اور غوط سے ناک سکڑی۔
"اڑی پر آجائیں! ہم کو تو دل بھی کچھ نہ کھائے۔ یارو ہے۔"
"اور ہم اگر خند پر آجائیں تو پھر ہی مغل میں بھی منہ چوم لیں گے۔ جیس بھی یاد رہے۔"
"لوں۔" ناشر اندر چھٹی لب ایک میز پر رکھ کر اسے مصنوعی حیرت سے دیکھنے لگی۔ "لو چوں کی ماں کا نہ
ہے شہزادہ آگے آپ کو؟"
"لوں ہوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔

"میرا لبی میں نہیں رہا ہوا؟" ناشر نے غلینہ بن سے نفی میں سر ہلایا۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔

"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔



"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔
"لوں۔" ناشر کو تو کسم کی چار چوٹی کی۔
"ایک دن سے بڑے بڑے بڑے بڑے سے اسے لا تین مڑیں لگا میں۔" چارو میں سے۔ نیچے تیار
ہوئے۔ ناشر۔

گئیں۔ فردوس بیگم نے عریشہ کا بازو پکڑ کر اسے شہلا کے قریب بٹھار دیا اور اس کا دوشہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ سب دم بخود تھے۔

قاضی صاحب نے شہلا سے ایجاب و قبول کروایا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے کانغذات پر دستخط کر دیے۔ مبارک سلامت ہوئی۔ پھر وہ عریشہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

”عریشہ بی بی! آپ کو بھوس پچاس ہزار روپے سکھ رائج الوقت میاں بانیخ حسن ولد سلجوق حسن کے نکاح میں آنا منظور ہے؟“

عریشہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ ایتقان اور وردہ نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شہلا متعجب بھی۔

قاضی صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ تب اس نے کاش دار نگاہیں اٹھا کر بے خونی سے عباد کے پہلو میں کھڑے فراز کو دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے، سینے پر بازو لپیٹے بے نیازی سے گھڑا تھا اور اپنے جوتوں کی شیش پر غور کر رہا تھا۔ عریشہ کے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔

”بیٹی! جواب دو۔“ قاضی صاحب نرمی سے بولے۔

”ہاں! ہر چہ۔“ منظور بے منتظر ہوئے۔

سب چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئے تھے۔ قاضی صاحب قدرے بوکھلائے، حتیٰ کہ بے نیازی سے کھڑا فراز بھی بے طرح چونکا۔

”ادھر دستخط کرو بیٹی!“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے دھیے پر غور کرتے ہوئے کانغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر اسے روک لیا۔

”اس سے باہر نکل دینی۔ وہاں موجود افراد ایک دوسرے کے چہرے پر اس کے دھیے کی وجہ خون چڑھے ہوئے تھے۔ فردوس بیگم بھی چپکے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

عاشق نے بے وجہ کھٹکھٹا کر گٹھا صاف کیا اور گواہ کے طور پر دستخط کرنے لگا۔

عریشہ کے اصرار پر حمزہ اسے گھر چھوڑ آیا تھا۔ تھوڑی بہت بد مزگی جو چند افراد نے محسوس کی تھی وہ کچھ ہی دیر میں ماحول کی ست رنگی اور تازگی میں کھو گئی تھی۔ سب ہی نے ہاشم میاں کی بے پناہ خوشی اور مسرت کو محسوس کیا تھا اور نئے جوڑے کے لیے دعائیں کی تھیں۔

وقت رخصت شہلا کی مستحاشی نظروں کا عندیہ پا کر انہیں چپکے سے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”عمر کو فراز کے ساتھ مصروف کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں اسے صحیح ضرور لے کر آؤں گی۔“

اس کی سرگوشی شہلا نے اور شہلا کے عین عقب میں موجود ہاشم نے بھی سنی تھی۔ انیقا کی بات پر شہلا بے اختیار ہی رو پڑی تھی۔ پھر منہ پر بیگم، عباد اور بھیر بھیر سے گلے لگ کر کہہ سکتی ہی رہی۔

ہاشم نے قدرے پیچھے ہو کر برابر کھڑے رافع کے کان میں کچھ کہا۔ رافع خاموشی سے مڑ گیا تھا۔ پھر جی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر شہلا زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔



کر مثل کا گلدان زور سے ڈر رنگ نیل کے آئینے سے نکرایا۔ گلدان وہ میز اور پھر فرش پر گر اور چکنا چور ہوا۔ آئینہ چھ کر کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پھر شیشے کا انخاستاج کل دیوار پر لگا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ چینی کی گزیا، پلاسٹر آف پیس کا مجسمہ اور ایسے ہی کئی شوپس کمرے میں باہر سے اُدھر با کمرے اور انجام کو پہنچتے گئے۔ اس کے بعد بستر کے نیچے بیڈ شیٹ، میک اپ کا سامان، مٹی ڈیز، کتا بیس غرض کہ کچھ بھی اس کے جنون اور وحشت سے محفوظ نہ رہ پایا۔ ایک کے بعد ایک وہ ہر چیز کو توڑتی اور بھینتی چلی گئی۔ ایک عالم جنون تھا جو اس پر طاری تھا۔ اس کی روح کسی نادریدہ قوت سے مصروف جنگ تھی۔ وہاں تو شاید کہیں تھا ہی نہیں، صرف اور صرف وحشت کا راج تھا۔

پھر اس نے چیخ چیخ کر رونا چاہا مگر اس کی آواز گلے سے نکل نہ پائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے دیکھنا چاہا مگر اسے کچھ بھائی نہ دیا۔ تم دو غیبی کی بے پناہ شدت نے شاید اسے اندھا بھی کر دیا تھا۔ اس نے خود کو آواز دینا چاہا لیکن اسے اپنی ہی ریکارڈ کا جواب نہ مل سکا۔ وہ شاید خود سے بھی پتھر مٹی تھی! وہ دنیا میں بالکل اکیلی۔ اندھی، بہری اور گونگی ہو گئی تھی۔ اس سوچ نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ پٹنی پٹنی آنکھوں سے گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو پکارنے لگی، غبار بھیننے لگی، وحشت شانت ہونے لگی، جنوں رخصت ہونے لگا۔

عرشہ تھک کر گری گئی، ہاتھ بھرے گئے تھے۔ اسی لمحے شہنائیوں کی آوازوں سے گھر کے در و دیوار گونج اٹھے۔ بارات ولسن کو لے کر آچکی تھی۔

شہلا کو باہر لے کر آئے۔

دن بھر رافع، ناز، منو، علی اور خود اشم میاں بھی کمرے میں موجود رہے تھے اور اب وہ لوگ بلان کی محنت کو سناسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پینڈ کے بچوں بچ گلاب کی سرخ، نرم پتیوں سے بڑا پہلا بل بنایا گیا تھا۔ جبکہ بیڈ کے چاروں جانب گلابی اور نارنجی پتوں کی لڑیاں تھیں۔ کمرے میں جا ہی گلاب دھڑکتے ہوئے تھے جن کی مہک سے ماحول میں حسن، منجبت اور انتظار کی سب سے بڑی نمایاں نمایاں تھیں۔

ایقان اور مایین سحر انگیز ماحول کو زیادہ دیر نہ بنائیں۔ وہ شہلا کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئیں۔ یوں بھی لڑکے لڑکیوں نے چمت برت چکے، کاروگر اسے بنایا ہوا تھا اور ان کا خوب خوب ہلا گلا کرنے کا پروگرام تھا۔ شہلا ایک نامعلوم سی کیفیت کا شکار تھی، بھاری بھاری سے پونے اٹھا کر اُدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سب ہی کچھ محبت کی طرح خوب صورت تھا۔

تب ہی دروازہ مٹھنے کی آواز پر وہ چوکی تھی۔
 ”مما“ چپکٹی ہوئی آواز سن کر شہلا کا اپنا دل بھی جیسے چکا تھا۔
 سامنے عمر کھڑا تھا۔ شہلا کی آنکھوں میں بے ساختہ چمک نمودار ہوئی تھی۔
 ”عمہ“ آستنائی حیرت اور مسرت سے اس نے کہا تھا۔
 وہ دوڑ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔
 ”واؤ ممما! سب کچھ زبردست ہے۔ اب ہم یہاں سو یا کریں گے؟“

ارے نک نیکل کے آئینے کے سامنے وہ قدرے گم صم سی بیٹھی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی اس نے نیسے چونک کر خود میں واپس آئی۔ لیوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے فریش فریش سالہا سم ہاتھ گاؤں میں باہر نکلا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے بالوں میں چلاتے ہوئے وہ اس کے عقب میں آگھڑا

”لا بھی خاموشی سے برش کرنے لگی تھی۔ ہاشم نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو بغور دیکھا۔ لائٹ ریٹ کے لباس میں وہ بے حد سادگی کے عالم میں بھی بجلیاں گرا رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی بدلی نے اس کے پیش سر آپے کو مزید جان بیت بخش دی تھی۔

کانوں میں ہیرے کے تھے تو نرے دیکر رہے تھے۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر شملہ نے خاموش نظریں اٹھا کر اس کی چٹکتی آنکھوں میں دیکھا پھر پلکیں گرا لیں۔

”کیا بات ہے شملہ۔“ ہاشم قدرے عجیب کر بولا تھا۔ ”مگر بڑے اس بروے کو درمیان سے ہٹا کیوں نہیں تیں تم؟ کھل کر مسکراؤ۔ کھل کر کہہ دو۔ کھل کر اپنی لگو۔ یہ کیا کہ بے قراری کی یہ چادر تم ساتھ ساتھ لیے چلی آئیں۔“

وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے آیا تھا۔ شملہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ ہاشم بھی بے ساختہ ہی سیدھا ہوا تھا۔

”دوست“ شملہ نے کہا۔

”اچھا!“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”دوست اپنی ہے؟“

ابھی شملہ کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر بج بج دنگ ہوئی۔

”رنگ!“ ہاشم دھیرے دھیرے ہنس دیا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی بے خود ہو گیا تھا شاید۔“

ہاشم دروازے کی جانب بڑھا تو شملہ نے خود کو کیوز کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتے تھے۔

دروازہ کھلنے پر باہر کھڑے کئی افراد تھے، مسکراتے اندر آئے تھے۔ ان کی رہنمائی میں انھیں ”رہیدہ“ عمر عباد کے

نانا نانا، وردہ ٹھانیہ اور سدرہ بھی تھیں۔ لمحہ بھر بعد ہی سب ہی چمک رہے تھے ہنس رہے تھے۔ شملہ عمر کو یوں

ساتھ لگائے بیٹھی تھی جیسے برسوں بعد ملی ہو۔

فردوس بیگم نے کمرے میں جھانکا۔ ان کی سب سے پہلی نگاہ شملہ اور عمر پر ہی پڑی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان

کے چہرے پر نہایت بد مزگی کے تاثرات ابھرے۔ شملہ بھی اتفاقاً ”ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ قدرے

خفیف سی ہوئی۔

”ای می۔ آئیے۔“ ہاشم نے اپنے ہاتھوں کی گھڑی پر۔ ”ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب بڑھا۔

”ہم باہر ہی بھٹکے مل دھرنے کی جگہ نہیں اندر۔“ وہ بے زار سے لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”اے ماہین۔

یہاں بیٹھی ہنس مذاق کر رہی ہو! باہر ناشر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دلہن کی ہنسی جو سامان لائی ہیں وہ بھی ویسا ہی پڑا

ہے۔ چلو ذرا ناشتہ لکھاؤ۔“

ان کے بیزار لہجے اور کرخت آواز نے لمحہ بھر کے لیے کل دنگزار ہوئی محفل کو سرا سیمہ سا کر دیا تھا۔ سب ہی

خاموش ہو کر رہ گئے۔ ماہین نکل سی ہو کر انھی دو وردہ اور ثانیہ بھی جلدی سے اس کا ہاتھ بٹانے کے خیال سے کھڑی

ہو گئیں۔

”آویا۔ ذرا رافع کی خبر لیں۔“ ہاشم نے عباد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بغیر ہر محفل کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔“

عباد فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ناعمد اور سدرہ بھی ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کمرے میں اب صرف شہلا، انہیدہ اور ربیعہ ہی رہ گئی تھیں۔

”یہ کیا رائے ہے دولہا بھائی کے بارے میں؟“ انہیدہ نے مسکراتی نظروں سے شہلا کو دیکھا۔ وہ رسانیت سے مسکرا دی تھی۔

”رائے اگر اچھی نہ ہوتی تو ہابی کیوں بھرتی میں۔ ظاہر ہے رائے تو شروع سے ہی اچھی ہے۔“ وہ عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”اور ان کی رائے آپ کے بارے میں؟“ اب ربیعہ کی باری تھی۔ ”میں نے کیا بتایا آپ کو؟“

”کیا جانتا چاہتی ہو تم دونوں؟“ شہلا نے دونوں کے کان پکڑ لیے۔ ”اب کیا میں لفظ بہ لفظ ان کی باتیں دہراؤں؟“

دونوں ہنسے لگیں۔ عمر حرج لگتا ہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”مما۔ اب آپ کی مثال رہیں گی؟“ بالآخر اس نے جلد ہی وہ سوال پوچھ لیا جو وہ جملے بکب سے لبوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

”نہیں۔“ رافع نے بار بھری سرزنش کی۔ ”میں نے آپ کو کہا تھا؟ آپ بھول گئے؟“

”نہیں تو۔“ شہلا نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ آپ بھول گئے۔“

اس کی صورت دیکھ کر ربیعہ اور انہیدہ کو ہنسی آئی، جبکہ شہلا سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اسی وقت دروازہ کمرے میں آئی تھی۔

”آپ لوگ آجائیں۔“ شہلا نے لگ گیا۔ ”وہ انہیدہ اور ربیعہ سے مخاطب ہوئی، پھر اس نے شہلا پر نظر ڈالی۔

”شہلا بھائی۔ اب کا اور ہاشم بھائی کا ہشتہ میں بیس لے آئی ہوں۔“

”نہیں وردہ۔“ شہلا جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ”میں اور ہاشم اب سب کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“

وردہ مسکرا دی تھی پھر اس کی ہر اہی میں وہ تینوں کمرے سے نکلی تھیں۔

”اگنگ ٹیبل کے آس پاس مزید کچھ کرسیاں لگا کر سب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ یوں بھی خاندان کے بڑے اپنے کمروں میں ہی تھے۔“

”آپ ادھر بیٹھیں شہلا بھائی۔“ رافع جو ہاشم کے برابر والی کرسی پر بیٹھا خوش گہپوں میں مصروف تھا اسے سامنے بیٹھتے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں رافع۔ آپ بیٹھیں۔“

”پلین۔“ رافع مصر تھا۔

شہلا جھکی جھکی نظروں سے ہاشم کے برابر آئی تھی۔ رافع دسری کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے پھر چونک اٹھا تھا۔ اس کی نظر ربیعہ پر پڑی تھی۔ وہ چند لمحے بے اختیار اسے دیکھا رہ گیا۔ ”وہنا۔“ ہاشم کھنکھارے۔ رافع چونک اٹھا پھر وہ ادھر ادھر دیکھا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

”مورثہ لکھیں سے مابین بڑی؟“ ”دھنسا“ انھیں کہہ کر خیال آیا تھا۔ ”ہم تو اسے نکاح کی جبار کہہ رہا تھا ہے جس میں
 ہے کہ سلیمان نے بڑی بہن کو بیچ دیا ہے۔“
 ”وہ بے دماغ۔ دراصل وہ بھڑا ور ہے اسے سب سے“ انہیں سے بات سے سن کر اس نے آواز نہ کر رہی تھی۔
 دیکھو اور پتا چلے گی کہ اس چارہ میں کچھ تو نلے نلے غمزدگی سا بھی ہے۔“

”مبارک ہو!“ نے بولے سے دیکھ کر کمرے میں جھانکا۔ ”ہیں آجہائیں؟“
 جھانکا کی تیزی سے چلتا ہوا قلم رک گیا۔ اس نے مرکز کردار نے کسی طرف نہ دیکھتے ہوئے خوش ہلنے سے مسکرایا۔

”تو بہت مصروف ہو نہیں آ۔“ اس نے اس کے سامنے پہلے ہوئے کا ہاتھ کے زور کر دیا۔
 ”مجھ پر کیا خاص نہیں؟“ اس نے رید کر سامنے بیٹھے اداکار کا کہہ ”کوئی کام پر ہے؟“
 ”نہیں۔“ باطل نہیں۔“ تو بیٹھتے سے مسکرائے۔ ”میں تو آپ کا شکر ہے اور اگر کچھ ایسی باتیں ہوئی ہوں۔“
 ”آپ بہت میری زندگی میں بھائی نہیں فرمائی کہ کر رہے ہیں۔“

وہ یہ کہ انگلیزوں نے جھک کر بھی دُور جہاز پر اچانک منہ کی گڑبڑ سے بڑبڑا کر دیا۔
 ”اے گاؤ!“ عباد نے منہ کی گڑبڑ سے اسے دیکھتے ہوئے اور بڑبڑا کر کہا۔ ”اگر تم صرف یہ بات کرتے آئی ہو تو
 تین ماہ میں دست معقول ہوں۔“

”ہمیں۔“ وہ جلدی سے بولتا۔ ”اس کے علاوہ یہ کہ میں“

کہ تم کو بھی فضیل سچوں سے ملتی ہو۔ جس کی یہ ضرورت ہے کہ غفار میں حاصل کرنا ہوں۔ تمہارا ایسا مین ہو جائے گا۔ میں بیگیٹس وغیرہ کے بارے میں سننے پر تیار ہوں۔"

”مبارک ہو! تم کو جوہلکے ہوئے بولوں ایک بات اور۔“

”عبارتِ بختی میں اکثر لوگ مجھ سے میرے ہاتھی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بختی میں ہاتھی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند اسے دیکھنا ہے۔“

”یہ ایک بات یاد رکھو۔“ عوادین رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے بارے میں اتنا زیادہ کانفرنس

ہوئے کی ضرورت نہیں ہے جسے قہر میں ہو اپنا حال آپ ہو۔ کوئی دوسرا شخص تمہاری ذات کا حوالہ نہیں
 دے سکتا۔ "لوگوں کے لئے سانس لینے کو دیکھو پھر بولا۔

بہن! ہو جو کچھ عرصے کے لیے تمہاری جامع و ادنیٰ مجھے سونپ کر گیا ہے اور جس سے تم سے کوئی کچھ بچے تو نہیں مینا

42

43

کنا سے کہ بڑائی کے سوا دنیا میں شمار رکھنی نہیں ہے۔ یہ تصور دیکھو! دنیا کو بات سے بہت ڈھکے لے کر یاد رکھنا اور کوچ کی حالت ہوتی ہے۔ جسے خود کو جتنا بڑی دیکھیں جسے چھوٹی لگا دے۔ یہ انہی شمار سے بات سے میں تجس رہیں گے۔ لہذا ہمیں سچ سے کہہ کر خود کو دیکھ سوں سے الگ رکھنے کی کیا چاہئے کہ کو خوشی نہ نہ کہ دوسروں کی کہ دیکھنا اور خود کو دیکھ سوں سے شمار کیا ہو اور کیا چھوڑیں گے! رائے!"

وہ بڑے سحرگاہ سے اترے انکشاف میں رہا گیا۔

”اب میرے لیے اچھی سی جائے بنا کر دو۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”تم نے میرے سر میں درد لگا دیا۔“

میں نے ان کے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ ان کے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ ان کے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔

[illegible]

تھی کہ اس کی جتنے جانے کے بعد اس پر بھی کڑی دوسبب لگے جانتا چاہتی تھی۔
اس نے دل میں غلامی میں غمگین ارادہ کیا کہ کثرت کو وہ ضرور ملے گی کہ اسے عبدالباری کا نمبر اپنے
میلوں میں ملے گا۔ مگر کافور نے اسے یہ کہنے سے گریز کر دیا تھا کہ کسی انصافی بندو بیگم کو کوئی غلط خیال نہ

Urdu

دلاؤں کا ہاتھ کی صورت سر کے نیچے اور منہ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ سی ڈی وی پیسٹر پر دم مسمیوں میں نور جہاں کی مشرق تواریخ میں "ظہر کے لئے" اور "آنا" جیل رہا تھا۔ سن کے پورے ہو کر وہ منظر متحرک تھے۔

اے: جو سچ و حقیقت کو دیکھ کر ہنس کر رہے ہو، ان کو سچ و حقیقت کے سچے دوستوں میں سے سمجھو۔ جو سچ و حقیقت کو دیکھ کر ہنس کر رہے ہو، ان کو سچ و حقیقت کے سچے دوستوں میں سے سمجھو۔

ہر اس کا دل دنیا کا لکھو چمن خسرو بالا کرتا لے گا۔

[illegible]

”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ دھڑکے سے پوچھا۔ ”میرے لیے آگے آؤ اور میں تم سے کہہ سکتا ہوں۔“

وہ طعن آئے محض یہ بازور کہ اس کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

43

42

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ایقان کو پہلے پہل نیند میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کسسا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔
 عاشر کے موبائل پر مدھم مدھم سروسوں میں بیج بج رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر گہری نیند سوئے ہوئے عاشر کو دیکھا پھر
 ہاتھ بڑھا کر اسے جگانا چاہا۔ کبھی عاشر از خود جاگ گیا تھا۔ وہ پڑنا کر اٹھ بیٹھا۔ ایقان نے پھر آنکھیں موند لیں۔
 ”ہیلو۔“ عاشر کی مدھم لیکن تدرے خفا خفا سی آواز آئی تھی۔
 نجانے کیوں ایقان کی سوتی ہوئی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ عاشر مزید کچھ بات کیے بغیر اٹھا اور ڈرنک روم میں
 گھس گیا۔ وہاں سے اس کے مدھم مدھم ہونے کی آواز آرہی تھی لیکن ایقان کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔
 چند لمحوں بعد وہ بے حد تیزی سے باہر آیا تھا۔ اس کی نظریں جاگتی ہوئی ایقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ عاشر
 ٹھنک گیا۔

”کیا بات ہے عاشر! اس کا فون تھا؟“ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”کسی کا نہیں تم سو جاؤ۔“ وہ سیلینگ سوٹ کے بن کھولنے لگا۔ ”میں ذرا ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“
 ”ایئر پورٹ؟“ وہ نہایت حیران سے بولی۔ ”خیریت؟“
 ”ہاں خیریت ہے۔ ایک دوست کی فیملی بیچ رہی ہے۔ اسے گھر تک ڈراپ کرنا ہے، اسی کا فون تھا۔“
 ”تمہیں چائے بنا دوں؟“ وہ بستر پر اتر آئی۔
 ”نہیں۔“ وہ شرٹ پہنے لگا۔ ”بھلا لینڈ کر چکا ہے، دیر ہو جائے گی۔ میں چائے ایئر پورٹ پر ہی پی لوں گا۔“
 ”ہوں۔“ اس ہتھکڑی سروسوں میں کما اور اس کی غلٹ بھری حرکت دیکھنے لگی۔
 عاشر باج منٹ میں تیار ہو گیا تھا۔ اس نے کم صم سی ایقان پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے اس کا کال
 تصدیق کیا۔
 ”ڈونٹ وری، ہارٹ لک۔ میں ٹھنڈے ڈیرے ٹھنڈے سوٹوں کا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“ ایقان نے اثبات میں
 سر ہلایا۔ عاشر تیزی سے باہر نکل گیا۔



وہ برہم برہم سا کارڈ اسٹیک کر رہا تھا۔ عاشر نے شادی کی نظروں سے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا کالر کھینچا۔
 ”سسر! میں تمہاری جدائی میں بے تاب ہو کر یہاں تک چلی آئی ہوں اور تم ہو کہ ٹھیک سے بات تک
 نہیں کرو رہے ہو۔ یہی صلہ ہے میری بے تابیوں کا تمہارے پاس؟“
 عاشر نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمہاری اس حرکت سے میری انڈو اچی زندگی متاثر ہو سکتی ہے لڑا! تمہیں احساس نہیں؟“
 ”اے ڈونٹ وری۔“ وہ اطمینان سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ”میں تمہاری بیوی سے کوئی مناظرہ
 کرنے کے ارادے سے نہیں آئی، پھر بھلا تمہاری انڈو اچی زندگی کس طرح متاثر ہونے لگی؟ ہر سال لاکھوں سیاح
 تمہارے ملک میں گھومنے پھرنے کے ارادے سے آتے ہوں گے۔ ایک میں بھی ہوں۔ تم کس بات کی فکر میں پڑ
 گئے؟“

”وہ لاکھوں سیاح ہر گھنٹے بعد میرے سیل فون پر کل نہیں کرتے۔“ اس نے دانت پیسے۔ ”تم سب کچھ سمجھ کر
 بھی کچھ سمجھنا نہیں چاہ رہی۔ بات یہ ہے۔“
 نرانے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور دلکش انداز میں مسکرای۔

”تمہاری یہی سبب ضرور ہے کہ وہی ہے۔“ شہزادہ سے بولی۔ ”جہان میں تو تم کا وہی نام آکر نہیں دیتے تھے۔ میں نے اچھا کیا جو یہاں تک پہنچا۔“

وہاں سے باز رہنے لگی۔ مگر کئی روز بعد بلڈنگ کے ادویہ سے نچے اترنے کی تیاری میں تھی۔ لوگ کا ہواؤں بسوں، ٹیکسیوں میں جا رہے تھے۔ یہی ان کی منزل کی جانب دواؤں دواؤں تھے۔ احاطہ میں مگر ایک مخصوص پتہ تو کسی کی چل سکتی تھی۔ گاڑی ایک خاص اسٹیشن پر رکے احاطے میں جا کر تھی۔

پورے دربان نے اسے بیچ کر کار کا دروازہ کھولا۔

”تم جلد سے گاڑی پارک کر کے آنا ہو۔“ معاشرے اسے ایک نظروں سے کرکھا۔

وہاں سے کھڑک کر رہا کرتی تھی۔

[illegible]

میری کسی طرح ترانہ سے بات ہو سکتی ہے؟ " وہ گھبرا کر کہنے لگا۔
 "بڑی بے محال۔"
 میرا خوبہ دل ٹھیک ہے۔ " اس دواہن کے اندر سے اس کی خیریت چاٹتی رہتی ہے۔"
 "تھا۔ برو کے قوت سے میرا کام بے پناہ بھگتے گا۔" وہ آواز دھکی بولی۔
 "نعمت ہے۔ خدا حافظ۔" وہ کہلا۔
 "خدا حافظ۔" میرے منہ سے اترتا ہوا اس میں سب کچھ آف کر دیا۔ اس کے ذہن میں مجھے کئی مناظر دواہن

في

شہلاط نے اُسی لمحے کو کہیں کو یا خوشیاں نوشنی کی صورت سے اُڑی ہوئی حمیمہ اُلغہ رہی۔ ”مُحرمینہ وہ بیگم سب
 سے ہے کہ جس نے میں نے پہنچے تھے۔“
 ”سب لوگ کہتے ہیں وہاں آیا؟“ اُلغہ خوش و خروش سے پوچھ رہی تھی۔ ”جب کب کی اور اچانک ہی کئی
 مرتبہ وہی جیست تھیں، دیکھو! دیکھو! اچانک تھا۔ اسنے سارے لوگ آگئی دھیر ساری دولتیں۔ اُنکی دخل
 بدل۔ سب کچھ کھتا اپنی لڑکھانہ اُقلہ جہاں کا محل کیسا ہے؟“
 ”دور کے محل سارے“ شہلاط دھیر سے فرمادی۔
 ”کیا مطلب؟“ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

[illegible][illegible]

”میں نے فغان پر ٹکڑا کر کھاکھاک میں ایلے لے کر کہا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر اس کا کلاں چوم لیا۔ ”یہ شاید قبرستان کا بھول گیا۔“ کپڑے شہزادے نے؟“

”میں بھول گیا تھا۔“ مراد نے کپڑے ڈھکیے کہ کر میں ہر بات بھول گیا۔“

”یہ قصور ہو یا! اس نے مٹی کی چیز کھانچ لی۔“ کچھ اسی کی ہیں تمہاری مراد۔“

شہلا نے اسے غصے سے دیکھا۔ اس نے لمحہ بھر میں لوجہ اور انداز بدل لیا۔

”اپنی بس۔ اب تم یہاں تک آئی ہو۔ تو اجازت بھی دے دو۔ کیا میں عمر کو لے جاسکتا ہوں؟“
شہلا متذبذب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پائی کسی گاڑی کی روشن ہیڈ لائٹس ان تینوں پر پڑی تھیں۔ شہلا اور ابراہان بے ساختہ ہی اس جانب متوجہ ہوئے۔ لائٹس آف ہوئیں اور گاڑی میں سے ہاشم برآمد ہوا۔

شہلا کو ایک پل کے لیے اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ اس منظر میں اس کی پوزیشن کچھ انورڈ سی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔
ہاشم گاڑی بند کر کے قدم قدم چلا اس کے قریب آگھڑا ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ابراہان کو دیکھا۔ گویا اس کا تعارف چاہتا ہو۔

شہلا کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ شرمندگی کا ایک گہرا احساس اس کے پورے وجود پر غالب تھا۔ وہ سیدھی لیکن میں چلی آئی۔ فریق کھول کر پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

”کیا ہوا بیبا۔“ پیچھے سے انہی کی آواز آئی۔ ”میں ہاشم ہوں۔ کہاں رہتے ہو؟“

”ہاں۔“ اسے کوئی جواب نہ دیا تھا تو اس نے گلاس لیوں سے لگا لیا۔

”السلام علیکم۔“ ہاشم کی خوشگوار آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

انہی ریجہ اور منہزہ بیگم ہاشم سے ملنے میں مصروف ہو گئیں۔ شہلا اتنے عرصے میں خوشی کا قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

شہلا کا دل اب بھی اسی طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاشم کی آمد نے اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ شہلا نے بے اختیار ہی اس کی نظروں میں کچھ دھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے جناب ایسے ہنسنے لگے ہو؟ ہمیں لاشی نہیں کر رہیں۔“

”جی۔ نہیں۔ وہ میں۔ دراصل وہ منہزہ بیگم ہے۔ شہلا کے ذہن میں سب سے زیادہ غلط فہمی گھڑنے سے

پس دیا۔

”عمر کہاں ہے شہلا؟“ منہزہ بیگم کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔

ریجہ اور انہی جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگانے لگی تھیں۔ شہلا ایک مرتبہ پھر الجھن کا شکار ہوئی۔ کیا

کے کیا نہ کہے۔

”عمر کو اس کے والد ابراہان جیلانی لے کر گئے ہیں۔“ ہاشم نے ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سلاطین سے کھیرے کا

پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا اور عام سے انداز میں اظہارِ عداوت۔

شہلا نے قدرے متحیر ہو کر اسے دیکھا۔ ریجہ اور انہی دلعتاً اپنی اپنی جگہ تھم سی گئی تھیں۔ منہزہ بیگم بھی کچھ پریشان سی ہو کر ہاشم کو دیکھنے لگیں۔

وہ بے حد ناراض انداز میں اپنی بات کہہ کر اب پانی کا گلاس بھر رہا تھا۔

”ابراہان؟“ پھر منہزہ بیگم پوچھیں۔ ”ابراہان آیا تھا؟“

”جی ہاں وہ باہر سے ہی عمر کو لے گئے ہیں۔ چند گھنٹے بعد چھوڑ جائیں گے۔“

شمالی سرحد کا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اس کا دل بکری سی مطلقاً سا ہو گیا تھا۔ شرم از قضا سابر تھا۔
منہ و دیکھ نہ قدم آگے بڑھ آئیں بھراؤں نے اس کا چہرہ قسم کر سر ہٹا دیا اور اس کی پیشانی پر ہنسی۔
"جیسے رہو گشت نکلتے ہو۔"
اس کا سر گرا ہوا۔ اس کی نگاہیں شمال کی لگا ہوں سے عکس کی تھیں۔ شمال ان نظروں کی چمک کی تاب نہ لاتی تھی۔
اس نے ہجر سر ہٹا لیا تھا۔

بھائی، "اس نے اندر بھاٹک۔" میں آسکھوں؟" کپیر نر موصوف۔ راجن چرک افرو۔
"تاکو۔" اس کے اندر اس صدمہ جو مصیبت تھی۔

راجن چندرے دوڑا نہ بری کر دیا اور اندر سے تیز بہ نکلا تھا۔ راجن نے ایک مرتبہ پھر نظر اٹھایا۔
"میں بھاریات کر لوں گا بھائی! آپ موصوف ہیں تو۔"
راجن کو اس کے لیے کہ خبر معلوم کیا کہ اس کا والد کپیر نہ رکھ کر کے لے گیا۔
"میں آجوت۔" لکری کھمٹا ہوتے بولا۔
راجن اندر چلا گیا۔ لاکھ حیدر اور غاموش غاموش ساتھ۔ اندر غوری راجن کی کرسی کے متقبل پاسے کاؤچ پر

بیٹھ گیا۔
"مجھے آج سے ایک مہینہ بات کرنا ہے۔"

"بولو۔" راجن نے غور سے اسے دیکھا۔

"بھائی۔ میرے اور عرش کے متعلق۔" فاندان کے بول۔

"کہتے ہیں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"کیا یہ؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

"میں؟" راجن نے غور سے دیکھا۔

... کی صورت حال کی نشان دہی کر رہا۔ "دوستی سے۔"
"مگر اس رہنے کے لیے راجن میں کئی تو کھراؤں کو اس کے ساتھ جرتے کام نہیں لےنا چاہیے تھا۔
ابن ابید۔ اب کم از کم تمہاری جانب سے کوئی ایسی بات نہیں ہونا چاہیے راجن! جس سے فائدہ تو ان میں
کا کیا ہو؟" ابول بوار اور بڑے۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ابھی سے میرے لیے اپنے دل میں اتنا خیر
نہ کر کے لی تو بعد میں اس رہنے کو مجھ سے ملنا ہی نہیں ہے۔ یہ بھی مشکل ہو جائے گا اور اس کے لیے بھی۔
بہتر یہ ہے کہ صورت حال کو ابھی واضح کر لیا جائے۔ "وہ آج ہی سے کہہ رہا تھا۔
"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔
"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

"میں سمجھتا ہوں بھائی۔" ابول بوار نے کہا کہ وہ ابھی سے راجن کے لیے ایک نیکو کھا۔

تھی۔

رائف بھی مڑ کر جاگ ٹریک پر دوڑنے لگا۔ دل ٹھہر گیا تھا، قدم دوڑ رہے تھے، جب ایک جنگ سی اس کے وجود کے اندر پھا ہونے لگی۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری ہے۔ یا تری مر مر سے پیشانی سے۔“
وہ خود بخود ہی گنگنایا تھا پھر ٹھہر گیا۔

”خود خدا سے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

بارک دور دور تک خالی تھا۔ اس کی نظریں بے قرار ہو گئیں پھر اس نے سر جھٹکا۔ خود کو کو سالہا پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری ہے۔ یا تری مر مر سے پیشانی سے۔“

دل تھا کہ ٹکرا کر کیے جا رہا تھا۔ رائف یہ نظم شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نظم کی طرح جداسنے انجام سے بھی واقف تھا۔ ایک ایک وہ ٹھٹھک کر رکا۔ ریجہ اس کے سامنے سے آ رہی تھی۔ رائف کی مانند بھی پلٹ کر چل پڑی تھی۔ نتیجہ

یہ کہ ایک گولائی میں چلتے چلتے وہ پھر آئے سامنے تھے۔

فاصلہ اب اس قدر کم تھا کہ گر بننا ممکن تھا۔ رائف چہرہ پر دم سے یہی جملہ بول رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بلاشبہ جتنے مسکرایا۔

”و علیکم السلام۔“ یہ بھی جتنے ”سا“ مسکرائی تھی۔ ”آپ سے روز آتے ہیں یاں؟“

”جی ہاں، تقریباً۔“ رائف کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔

”ہلے ایک دھڑکتا ہوا کرتا تھا آپ کچھ عرصے سے۔“ وہ بولا کہ اس کا ہونگہ۔

”کے لیے مس کا۔“ وہ بولا کہ اس کا ہونگہ۔

ریجہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

”چلیں صبر کریں، خدا نے چاہا تو آپ کو کوئی اور دوست مل جائے گا۔“

رائف چلتے چلتے رک گیا۔ دیکھ کر اس کی سادہ انداز میں کسی گہنی بات نے اس کے اندر ہلچل کی دھڑکی پھر کادی۔ اس

کے رک جانے پر ریجہ نے گردن موڑ کر اس سے دیکھ کر تیار ہو کر اس کی نگاہوں میں بلا کی معصومیت تھی۔ رائف معمول کی مانند پھر چل پڑا۔

”بڑھتی ہیں آپ؟“

”نہیں نے کر بچویشن کیا ہے۔ اب سائزز کرنے کا ارادہ ہے۔“ وہ مختصراً ”ہوئی۔“

”آپ شہلا بھا بھی کی رشتہ دار ہیں؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”نہیں۔“ ریجہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ ”جی۔ رشتہ دار ہی سمجھ لیتے ہاں، وہ اس روز آپ کی ایک نظم

میرے پاس رہ گئی تھی۔ آپ کہیں تو ہیں۔ واپس کر دوں؟“

رائف مسکرایا اور ایک ٹھہری سی نظر اس پر ڈالی۔ صبح کی خوشگوار روشنی میں وہ ہار سٹھار کے پھولوں کی سی لگتی

تھی۔

”نہیں۔ واپس کرنے کے بجائے آپ رکھ لیں تو مجھے اچھا لگے گا۔“

اس کے جواب میں نبھانے کس جذبے کی حدت تھی۔ ریجہ کی پیشانی چمک اٹھی۔ اس نے رسمی سا مسکرا کر

اسے دیکھا اور گھر جانے والے رستے پر چل دی۔

آنکھوں میں گہری سوچ لے رہا تھا۔
 ”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری مرمریں پیشانی سے۔“ وہ بن نے پھر تکرار شروع کی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔ نظم نے خود کو مکمل کر دیا کر ہی رہا تھا۔



دودا اش روم سے نکل کر کچھ بھر کے لیے ٹھنک کر رہی تھی۔ ہاشم بستر پر نیم دراز بے دلی سٹی ہوئی کے چیل بدل رہا تھا۔ شہلا کو آواز دیکھ کر اس نے بی بی آف کر دیا۔ گویا وہ اسی کے انتظار میں تھا۔
 شہلا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ہاشم نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”نارغ ہیں آپ؟“

”جی ہاں“ وہ آہستہ سے بولی۔
 ”کچھ باتیں کر لی جائیں؟“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شہلا چونک اٹھی۔
 ”خود۔۔۔“

ہاشم کھٹک کر اس کے قریب ہوا اور اپنی کاپی پر قلم لگایا۔
 ”شہلا! کتنا اعتبار کرتی ہو؟“
 ”جی؟“ شہلا نے حیرت سے دیکھا۔ ”میں کچھ سمجھتی نہیں ہاشم۔“
 ”میں نے پوچھا۔ کتنا اعتبار کرتی ہو؟“ وہ نہ سمجھنے والی کوئی سی بات ہے اس میں؟
 ”آپ۔۔۔ میں نے شوہر پر۔۔۔ میں نے اپنی مرضی سے۔۔۔“
 ”تو غلط ہے۔۔۔ کس اعتبار کروں گی آپ پر؟“
 ”اسی طرح تم بھی میری بیوی ہو شہلا۔ میری عزت ہو۔ میری محبت بھی ہو۔ میں نے تمہیں بہت خواہش سے اپنایا ہے۔ میں تمہیں بھرپور اعتبار کرتا ہوں تم پر۔ اعتبار بھی، اعتماد بھی۔ تم سے دلچسپی سب سے رشتے استوار کر لیے ہیں میں نے۔“
 ”نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے سے۔“
 ”اس روز تمہیں گھرایا ہوا دیکھ کر میں نے سوچا تھا شہلا! کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟
 تمہارے انداز کہہ رہے تھے کہ تم مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئی ہو۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے حوالے سے کبھی کوئی غلط خیال میرے دماغ میں آسکتا ہے؟“
 شہلا چند لمحے خاموش رہی۔ اسے ہاشم کی نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔

”دیکھو شہلا! میں تمہارے ماضی سے بخوبی واقف ہوں۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنایا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے سب سے خراب حوالوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ تمہارے اور عمر کے ساتھ اس شخص کا نام وابستہ تھا۔ عمر کے ساتھ اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس تعلق کے حوالے سے تمہارا اس سے سامنا بھی ہو سکتا ہے بات بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ خدا خواستہ تمہارے دل میں کوئی غلط خیال ہو۔ میں مکرر بھی یہ بات نہیں سوچ سکتا۔ تم میری جانب سے اپنا دل صاف کر لو۔ اور آئندہ ایسی کسی بھی چیز کو بولڈی فیس کرو۔ تم میری بیوی ہو شہلا! میرا اعتماد ہو۔“

شہلا دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی۔
 ”زات کیسے؟“ وہ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔
 ”ہوں؟“ وہ چونکی۔ ”لیس۔ آف کورس۔“

قرآن شریف کی آیات کا احرام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں مناسبت اور تعلق کے لیے شان کی جاتی ہیں۔
اللہ کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات و روایات اسلامی طریقے کے مطابق یہ فراموشی سے محفوظ رکھیں۔

”جنگنا ہے یا سونے کے ارادے ہیں؟“ اس کے انداز میں شرارت برپا ہی تھی۔

”میں نے سوچا تھا کہ ہوں ہاشم۔ پلینہ۔ اگر آپ مائنڈ نہ کر سکتے تو“

”خود مانند“ وہ اپنا تکیہ اٹھا کر قدرے دور ہوا۔ ”یوں تو آپ جاگنا چاہتی ہیں لیکن اکیلے میں۔ چلیں
بہر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ شب بخیر۔“

وہ تکیے میں منہ چپا کر لٹ گیا۔ شہلا نے ہاتھ پر دھا کر لائٹ آف کر دی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاتھ نے درست کہا تھا۔ وہ جاگنا چاہتی تھی مگر تنہائی کے ساتھ اسے مختلف باتوں پر غور کرنا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ لمبے سبز زہرے تھے۔

ابزار کے انداز اسے بے حد خوفزدہ کر چکے تھے اس کے مقاصد اسے بے چین کر رہے تھے اس کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔

[illegible][illegible]

موبائل تن کر کے اس نے کان سے لگایا اور خاموش رہی۔

”عاشوب دُشرب تاك نومی۔ پلینز: ”لججہ التجانیہ تھا۔“

ایقان نے موبائل آف کر کے جگہ پر رکھا اور کسی چور کی طرح اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ دواش روم سے عاشر نکلتا تھا۔ دواہنی جگہ آکر لیٹا پھر اس نے پاؤں بڑھا کر ایقان کو گھیرے میں لے لیا۔

یقین کی دند 'غرضی' پلوں سے ایک موتی بکلا اور اس کے بالوں میں گم ہوا۔

۴۔ "اٹ یو؟" وہ لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

یقین کے محل میں پہلی دراڑ پڑی تھی۔ اس کا وجود جیسے تیز ہوا کی زد میں تھا۔ عاشر کا بازو اسے آگ سے بچا
محسوس ہونے لگا۔

بے حد رغبت سے سبب کا مرتہ کھاتے ہوئے وہ بہت فریض اور قدرے خوش نظر آ رہا تھا۔ ایقان نے کن اٹھیں سے اس کی جانب دیکھا۔ عاشر اس کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا، وہ مرتبے کی تیشی میں چھب ڈال کر سبب کے نکلے نکالنا اور منہ میں رکھ لیتا۔ ایقان چند لمحوں سے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس قدر بے فکر و خوش باش زندگی سے بھرپور انداز سے جیسے کوئی غم کبھی چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ اس کے ارد گرد سوالیہ نشان پھرنے لگے۔

”عاشر! ازاں یو؟“ وہ لہجہ پھر اس کی سماعتوں میں سرسرا نے لگا تھا۔

”عاشر! ڈ۔۔۔ پلینر ٹاک ٹوی۔۔۔“ وہ التجائیہ انداز اس کا دل چھیدنے لگا۔

”تزا۔۔۔ یہ لڑا کون تھی؟ کیا عاشر اسے جانتا ہے؟ کیا وہ اس سے بات کرتا ہے؟ کیا وہ اس سے ملتا ہے؟“ سوالوں کی ایک یلغار تھی جو اسے رات کے پچھلے پیر سے لے کر اب تک پریشان کر رہی تھی۔ عاشر نے مرتبے کا جار بند کرتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں پھر وہ تھک سا گیا۔

ہاتھ میں سلاکس تھا، وہ بے حد عجیب سی، نظروں سے اچھلنے والی تھی۔ وہ اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے ہاتھ میں موجود سلاکس کی بھی خبر نہ تھی۔

عاشر نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ایقان بری طرح سے چونکی پھر اس نے سلاکس واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور پٹانے رکھی ٹھنڈی ہوتی چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ گھبراہٹ سے پوچھ رہا ہے؟ اس نے ایقان کی بات سننے میں عدم توجہ محسوس کی۔

”ہول۔“ وہ پھر پوچھ رہا ہے؟

”کیا کہا؟“

عاشر نے ہاتھ پر ہاتھ اس کے گال پر زور سے چٹکی بھری، وہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔

”کیا ہے عاشر!“ خلاف توقع وہ بیزاری سے کہتے ہوئے کھڑی ہوئی پھر وہ ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

عاشر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ان پر اپنا چہرہ رکھا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ برتن سمیٹ رہی تھی لیکن اس کے پورے وجود میں ایک اضطراب سا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ ایک تناؤ تھا جو اس کے انداز سے بھی جھلکتا تھا اور جرے سے بھی۔

”ایقان! س۔“ عاشر نے اسے پکارا۔

”کہو۔“ وہ کچن کی جانب جاتے جاتے رک گئی۔

”تمہیں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

ایقان نے مڑ کر نہ جانے کیسی نگاہوں سے اسے دیکھا، وہ گڑبڑا سا گیا پھر وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ عاشر اچھے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کی پھر اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ وہ ساس مین میں پانی ڈال کر جو لمبے پر رکھ رہی تھی۔ عاشر اس کی اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ ایقان چونکی۔ اس کے ہاتھ تھمر گئے۔

”کیا بات ہے ایقان! س۔“ عاشر نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ ”بیزار ہو گئی ہو، تمہ سے واپس چلا جاؤں؟“

”پاگل ہوئے ہو۔“ وہ کھوکھلتے لہجے میں بولی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”بسیا تم سلوک کر رہی ہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”میں نے کہا کیا ہے عاشر؟“

”عدم تو جتنی کی بار بار رہی ہو اور پوچھتی ہو۔ چلو تاؤ۔“ اس نے اس کا سر اپنی جانب موڑا۔ ”کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“

اس کے دونوں ہاتھ ایقان کے کاندھوں پر تھے۔ ایقان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ عاشر کے انداز میں بناوٹ کی پیوند کاری بھی تھی۔

”یہ لڑا کون ہے؟“ اس نے پوچھنا چاہا لیکن الفاظ اس کے لبوں تک آنے سے پہلے ہی تحلیل ہو گئے۔ جانے اس سوال کا کیا جواب آتا؟ اگر وہ یقیناً نظر سچا لیتا۔ اگر ایقان کے شانوں پر دھیرے اس کے ہاتھ بے اختیار پھسل جاتے۔ اگر وہ ٹھیکے سے انداز میں ایسی وضاحتیں دینے لگتا جو ایک آن دیکھنے جھوٹ کا آئینہ معلوم ہوتی۔ پھر کیا ہوتا؟ ایقان اپنی خوش فہمیوں سے اس قدر جلد دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے پھر سے رخ موڑا اور چولہا جلانے لگی۔

”رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ طبیعت مضطرب ہو رہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلد از جلد سب کام سمیٹ کر سو جاؤں۔“

”ہاں۔“ عاشر نے چند لمحوں میں اس کی بات پر غور کیا۔ ”نیند کیوں نہیں آتی؟ کوئی پریشانی؟“

”کمال ہے عاشر۔“ وہ زبردستی مسکرا دی۔ ”جتنے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ کبیں کوئی کمی نہیں ہے۔ زندگی میں نہ تمہاری۔ محبت میں۔“ اب کی بار اس نے سوچ میں غم سے عاشر کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ تڑپے چونکا پھر مسکرایا۔

”چلو پھر ٹھیک ہے۔ تم آرام کر لو۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک لوٹوں گا۔“

”نامہ؟“ ایقان نے اسے دیکھا۔ ”کیا کام؟“

”چند ایک پرانے دوستوں سے ملوں گا۔ سوچتا ہوں واپس لوٹ کر جو کاروبار کرنا ہے، ابھی سے اس کی سمری تیار کر لوں۔ اچھا ہے، یہ معلومات جمع ہوتی رہیں گی تو کام آئیں گی۔“

”ہوں۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تازہ چائے تمہارے لیے ہی بنا رہی تھی۔ اب پی کر جاؤ۔“

”نہیں یا۔ تم پی لو۔ مجھے تو ابھی بننا ہے۔“ وہ ایک بار پھر بے فکر اور خوش باش لگنے لگا تھا۔

”چلو ہوں۔ دروازہ بند کر لو۔“ ایقان پر سوچ ڈگباں لے لی۔ کچن کے دروازے پر ہی ایستا وہ ہو گئی تھی۔ وہ آئینے میں خود کو بغور دیکھتے ہوئے سفید شرٹ کا کالر ٹھیک کر رہا تھا جب اس کے پیچھے شہلا کا عکس نمودار ہوا۔ ہاشم کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ جاگئی۔ اس نے غور سے خود کو اور اسے ایک ساتھ دیکھا اور پھر مسکرایا۔

شہلا آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

”صبح خیر بادام! وہ گفتگو کی ہے بولا۔“

”ہاشم! ایک بات کہنا تھی آپ سے۔“

”ہوں ہوں، جتنی چاہے کہیے۔ آپ کے لیے تو ہم آفس سے لیٹ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ شہلا مسکرا دی۔ ”میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ میں نے جتنی چھٹیاں لی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں۔ میں اب ہسپتال جایا کر دوں گی۔“

”ضرور چائیے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی جیسے اسے کسی بات کے کہنے سے جھک سی تھی پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”عریشہ۔ کیسی ہو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اتنے دن ہو گئے، تم تو اب ملنے آتی ہی نہیں ہو۔ خود کو قید کر لیا ہے تم نے اس کمرے میں۔ ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“

عریشہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اسی سے مسکرائی۔ ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر بالوں میں گم ہو گیا۔

”بیمار تو میں ہو گئی ہوں، ناعملہ۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔“

”ایسا کیوں کہتی ہو؟ خدا نہ کرے جو ہمیشہ کے لیے بیمار پڑو تم۔“ ناعملہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے دھچکا سا لگا۔

اس کا ہاتھ ہڈیوں سے بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں تم سے۔“ وہ ہنسی بھری نگاہوں سے بولی۔

”کون سی نئی بات ہے پوچھنے کو ناعملہ؟“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”کیا جان لو گی تم؟“

”تمہیں نافع پسند نہیں ہے؟“ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔

عریشہ نچی سے ہنس دی۔ اس کے چہرے پر ہنسی پھیل گیا تھا۔

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ ضرورے کو دفنا کر پوچھنا کہ تمہیں قبر پسند آتی یا نہیں۔ عجب لالہ حاصل سوال ہے ناعملہ!“

ناعملہ خوفناک اور وحشت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے عریشہ واقعی ایک مروے کی مانند محسوس ہوئی۔

سرد اور بے جان۔

”عریشہ!“ ایک لمحہ کے لیے عریشہ نے اس کی طرف سے ہنسی بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

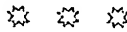
”بولو تو تمہاری ساری باتیں شکوئی ہیں۔“ عریشہ نے اس کے خیالات پر بہت اثر پڑنا ہے عریشہ نے

”مجھے اب کبھی بات سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ”اب تم جاؤ ناعملہ میرے پاس بیٹھنے

سے تمہیں ضرور فرق پڑے گا۔ کہیں تم میں سے بھی کافر کی ہونہ آنے لگے۔“

ناعملہ سن سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ عریشہ نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ ناعملہ اٹھ کر مرے مرے قدموں

سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔



”ہوں۔“

وردہ متفکر ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں وردہ آئی! وہ مر جائے گی۔ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے خود کو ایک مردہ

تصور کر لیا ہے اور اس کے اندر یہ یقین بچھتا ہوا جا رہا ہے۔“

ناعملہ اسے لفظیہ لفظ ساری کمالی سن کر بیٹھی تھی۔ دونوں ہمیں حقیقتاً ”پریشان ہو گئی تھیں۔“

”کیا کیا جائے۔“ وردہ سوچ رہی تھی۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟ فاروق ناموں نے بہت غلٹ دکھائی ہے فیصلہ

سنانے میں۔ لڑکیاں بھی جیتی جاگتی مخلوق ہیں۔ وہ بھی جذبات و احساسات رکھتی ہیں، ان کی بھی پسند ناپسند ہو سکتی

ہے۔ اگر اسے نافع پسند نہیں تھا تو بہوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تو اسے اتنا کا مسئلہ بنالیا۔ مجھے

لگتا ہے ناعملہ! عریشہ کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ وہ اتنی زیادہ حساس ہے، اس کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔“ ناعملہ

نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ وروہ نے ٹولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم عریضہ اور ثانیہ تو ایک دوسرے کی ہم رازو و مساز تھیں۔ اس نے کبھی کسی اور کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کبھی بھی نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور ہم سے ذکر کرتی۔“
 ”ہوں۔“ اس نے ر سوچ انداز میں کہا پھر تو سارا مسئلہ بس یہی ہے کہ وہ نافع کو شدت سے رو کر رہی ہے اتنی زیادہ شدت سے کہ اس کی اپنی ہستی مٹتی جا رہی ہے اور اسے یا کسی اور کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔
 ”ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں ایسا؟“ ناعمہ نے تاسف کے احساس میں گھبر کر پوچھا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔

”آپ۔۔ آپ۔۔ رافع بھائی سے بات کر سنا۔“ وروہ نے اسے بری طرح گھورا۔
 ”یا گل ہوئی ہو میں رافع سے کیوں بات کروں۔ بات کرنا ہوئی تو میں ڈائریکٹ نافع سے کروں گی۔ تمہارا دماغ بھی نجانے کہاں سے کوڑیاں لاتا ہے۔“
 وہ بڑبڑانے لگی تھی۔ ناعمہ کے لب شہادت سے مسکرانے لگی تھی۔ اس نے پیار سے بسن کی جانب دیکھا تھا۔



یہ سپیدی افق سے اُترتی ہے
 یاتری مرمریں پیشانی سے
 یہ کرن آسمان سے اُترتی ہے
 یہ تیری مسکراتی آنکھوں سے
 دل کے جذبوں نے بولنا سیکھا
 تیری نظروں کی میرانی سے

وہ سادہ صفحے پر رقم الفاظ کو تنگ رہا تھا۔ عجب آرزو میں تھیں جو شہر تمنا میں غنچا پانے لگی تھیں۔ رافع نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں سخی سخی بند کر لیں۔
 ”یار رافع!“ اس کے کانوں میں ہاسٹم کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”خدا اگرے تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“
 وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے جینی حد سے سوا ہونے لگی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پیٹ سے کاسنی نیل جھک جھک کر اندر جھانکنے لگی تھی۔ رافع کا دل چاہا وہ بھاگے۔ بھاگتا جائے۔ اتنا بھاگے کہ تھک کر چور ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے جھکے ہارے وجود میں صرف ایک دھڑکنے دل کی آواز ہو اور ہر آواز معدوم ہو جائے، ہر خیال پس پشت چلا جائے۔ ہر احساس ختم ہو جائے۔ صرف۔۔ صرف ایک احساس کے سوا، وہ ہر بات بھلا ڈالنا چاہتا تھا لیکن۔۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔

”کون ہو تم۔“ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ ”کہاں سے آئی ہو، کیوں آئی ہو؟ کیا ملا تمہیں کسی کی سکون دنیا کو بے سکون کر کے۔ کیا پایا۔۔ بولو۔ جواب دو۔“ ذہن کے افق پر ایک مرمریں وجود کی مسکراتی شبیہ نمودار ہوئی۔

”ہاں سنگھار کے پھولوں سی لڑکی، لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے گلاب جذبوں کی خوشبو تم تک پہنچے اور تم بھی میری طرح بے سکون ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا۔۔ لوٹ جاؤ۔۔ لوٹ جاؤ۔“

”میری چٹیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔“ اس نے سلاو کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بظاہر عام سے انداز میں کہا۔ ”میں بھی کل یا پرسوں سے جو ان کروں گی۔“
 کھانا کھاتے فردوس بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے ہاتھ پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ شملہ ان کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی اس نے ان شکنوں کو محسوس کر لیا۔ منہ میں نوالہ ڈالتی ماہین کے ہاتھ بھی ست ہو گئے۔
 ”اے بھی سے... ابھی سے بھابھی!“ پھر وہ بولی۔ ”ابھی تو ہم نے اپنے چاؤ بھی پورے نہیں کیے۔“
 ”اے ہاں۔ کیسے چاؤ۔“ فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی ہاٹ پائٹ میں رکھ دی۔ ”ہم نے تو پہلے دن ہی ہر چاؤ جو نچلے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ جیسے چاہو کرو۔ ہم بے چارے نہ لیٹنے میں نہ دینے میں۔“
 ”ہی!“ ماہین نے ناں کو تنبیہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

شملہ خفیف سی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سب ہی پر ڈالی۔ مردہ دلی سے ٹوٹتی ہوئی عریشہ نے تو گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ حمزہ ماں کے انداز پر بے حد شرمندہ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا تھا۔ ماہین چورنی پیٹھی رہ گئی تھی۔ ماحول میں عجیب سی ناگواری چھل گئی تھی۔
 ”ماہین!“ شملہ نے فلم بندی سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے... کیا اچی جان کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے؟“
 دیکھو ماہین! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے اس بات سے بے حد خوف و محسوس ہو رہا ہے کیونکہ...

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جھک آڑے آگئی تھی۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے پہلے تعلق کے چارے میں بات نہ کیا۔ ہر چیز کہ وہ ماہین کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا پہلا تعلق ختم ہونے کے پیچھے بھی اسی محسوس بات کا ہاتھ تھا۔
 ”آپ دل پر تھیل بٹھا کر بیٹھا ہے۔“ فردوس نے اسے انداز میں بولی۔ ”اچی کی اوقات ہے۔ زنا زرا سی بات پر موڈ خراب کر لیتی پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں پھر اصل بات تو ہاتھ بھائی کی اجازت کی ہے۔ اگر وہ راضی ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے بہترین سینیٹے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شملہ سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا میکہ اور اس کلب پر ہنگاموں کا ٹوٹ کر یا تو پھر وہ ایک بے گہری سانس بھر کر کھڑی ہو گئی۔

گاڑی گرلز کالج کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ فریحہ نے جس کا خالی ڈبہ باہر پھینکا اور بھائی کی جانب دیکھا۔ وہ ہونٹ پیچھے نبھانے کس سوچ میں گم تھا۔ سن گلاسز کے پیچھے چھپی آنکھیں اپنا بھید چھپانے میں کامیاب تھیں۔ فریحہ نے اس کے تاثرات دیکھے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ کاندھے اچکا کر کالج کا گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تب ہی گھڑی کی سونیوں نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ چند لمحوں میں برا آہنی گیٹ واہوا تھا۔ لڑکیاں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں۔ آپس میں باتیں کرتی، ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتی، خدا حافظ کہتی، بے فکر لڑکیاں ہستی کھل کھلائی گھروں کو جانے کی عجلت میں تھیں۔

”دھم!“ فراز نے فریحہ کو مخاطب کیا۔ ”وہ سامنے۔ جس کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں اور کاندھے پر بلیک بیک۔“

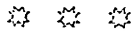
فریحہ نے جلدی جلدی گاڑی کے قریب سے گزرتی لڑکی کا مشاہدہ کیا اور مسکرائی۔
 ”گندہ! پسند تو آچھی ہے آپ کی۔“ فراز نے گہری سانس بھر کر گاڑی اشارت کر دی۔

”یاد رکھو گی نا۔“

”بالکل۔“ وہ یقین سے بولی۔

”مجھے اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ شہلا آبی کی شادی میں علم ہوا کہ اس کا نام ناعمہ ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بالکل غلطی نہیں کروں گی۔ ویسے کیوں نہ اسے گھرتک ڈراپ کر دیں؟“
 فراز نے ایک نظر بہن پر ڈالی اور زخمی سے انداز میں مسکرا دیا۔
 ”غلطی بار بار نہیں دہراتے۔“ وہ بولا تھا۔

پھر اس نے گاڑی سڑک پر ڈال دی۔ فریجہ نے نا سنجھی سے کاندھے اچکا دیے۔



”ہم اندر آسکتے ہیں؟“ شہلا نے جالی کا دروازہ کھول کر اندر جھانک کر پوچھا۔
 ”کروشیہ سے نکل بنانی رابعہ بیگم نے ذرا کی ذرا نظرس اٹھائیں اور ایک دم ترخوش ہو گئیں۔
 ”زبے نصیب۔ زبے نصیب۔“ وہ والہانہ انداز میں انھیں۔ ”یہ آج چاند کہاں سے نکل آیا۔ وہ بھی ہمارے گھر میں۔ آؤ آؤ نا۔“

شہلا مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کی ہمراہی میں انیقہ اور ربیعہ بھی تھیں۔ وہ آپس میں سلام دعا کرنے لگیں۔ ان کی آواز پر حق کر اندر سے وردہ اور ناعمہ بھی نکل آئیں۔
 ”شکر ہے۔ آپ کو ہمارا خیال تو آیا۔“ ناعمہ نے شہلا کے گلے لگ کر جھٹ شکوہ کیا۔ ”وردہ اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ انیقہ اور ربیعہ مسکرا دیں۔“

وردہ انیسویں صدی کے ایک بڑے گھرانے کی خاتون تھیں۔ شہلا نے خود باہر نکلنے کی جگہ سے جھپٹ کر دیکھا۔ وہ بھی ایک بہت ذوق و شوق سے سوار رہے گھر۔ ”شہلا نے خود بخود دیکھا کہ وہ دیوار کو دیکھیں سے دیکھا۔“

”یہ سب وردہ کا کمالی ہے۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”گھر کو سجانے بنانے کا جنون ہے۔ اسے کہنے ہی کو سز کر ڈالے ہیں اسی چکر میں۔“ بروقت کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی ہے۔“
 ”اور ناعمہ۔“ شہلا نے بھرتے بھرتے چڑھنے والی گلانی لڑکی کو شوق سے دیکھا۔ رابعہ بیگم نے آہ سے مشابہ سانس بھری تھی جو اس کے استفسار کا خوب جواب تھی۔ ناعمہ شرمندگی سے مزید سرخ ہوئی۔ انیقہ اور ربیعہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”ہاں تو چھوٹی بھی تو ہے نا۔“ شہلا بول اٹھی۔ ”چھوٹی بیٹیاں بلا ڈلی زیادہ ہوتی ہیں نا۔“
 ”کوئی نہیں ایسا۔“ انیقہ نے احتجاج کیا۔ ”میں چھوٹی ہوں لیکن امی آپ کو زیادہ چاہتی ہیں۔ مجھے تو ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ ناعمہ جھٹ سے بولی۔ ”گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ میں ہی کھاتی ہوں۔ کہاں کالاڈ کیسا لاڈ۔ سارے نمبر تو یہ وردہ آپلی لے جاتی ہیں۔“ ایک بار پھر سب اس کے احتجاج پر ہنس دیے۔

”وردہ میری سب سے پیاری اور نیک بچی ہے۔“ رابعہ بیگم کے لہجے میں سچی محبت پوری رہی تھی۔ ”میرا سب سے زیادہ خیال کرنے والی، سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ یہ ناعمہ تو ابھی بچپن سے ہی نہیں نکلی۔“
 وردہ چائے کی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ چائے کے ہمراہ پائسن اپیل کیک اور شاہی کباب بھی تھے ٹرے میں۔
 سینئر ٹیبل پر رکھ کر وہ سب کو سرو کرنے لگی۔

”مجھے تو یہ کتاب اور ایک بھی وردہ کے ہاتھوں کا کمال لگتے ہیں۔“ شملانے کہا۔

”اسی نے بنائے ہیں۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔

”وردہ! شملانے کتاب کا پس منہ میں رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”ربیعہ بھی دراصل تم ہی سے ملنے آئی ہے۔ تم ہائز کر رہی ہو نا؟“

”جی ہاں سوشیلو جی میں۔“

”ربیعہ بھی ایڈیشن لے رہی ہے۔ یہ تم سے کچھ مشورہ وغیرہ کرنا چاہتی ہے۔“

”ضرور۔“ وہ مسکرائی۔ ”میرا ہی سبجیکٹ لے لو تو ہم دونوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔ ویسے میں تمہیں سارے سبجیکٹس کے متعلق تھوڑا بہت گائیڈ کر دوں گی۔ تم اپنی مرضی سے سلیکشن کر لیتا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سر ہلایا۔

”او میرے ساتھ۔ میں تمہیں بس وغیرہ دکھاتی ہوں۔“ وردہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ربیعہ بھی اس کے ہمراہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

”بہت باری پتی ہے۔ ماشاء اللہ۔“ رابعہ بیگم اس کے جانے کے بعد بولیں۔ ”تم لوگوں کی رشتہ دار ہے؟ شادی سے پہلے اس بچی کو کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”رشتہ دار ہی مجھے۔“ شملانے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی کچھ عرصہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔“

”بھائی کی غرض سے آئی ہو گی۔“ وہ پر خیال انداز میں بولی تھیں۔

”جی! انہوں نے مختصراً کہا۔“

UrduPhoto.com

”بس تو پچھڑے ہو گیا میں سوشیلو جی ہی سلیکٹ کر لیتی ہوں۔ اچھا مضمون ہے۔“ ربیعہ کتابیں اور مضمونیں وغیرہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ وردہ خوش ہو گئی۔

”چلو پھر تو بہت اچھا ہو گا کہ ہم دونوں ساتھ ہی کالج آیا جایا کریں گے۔ نوٹس وغیرہ اپنے میں بھی سہولت رہے گی اور ویسے بھی مجھے تم اچھی بھی لگتی تھیں۔ جی چاہتا تھا تم سے دھیر ساری باتیں کرنے کو، تمہیں قریب سے دیکھنے کو۔“ وردہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ربیعہ حیران ہی رہ گئی۔

”اچھا۔ تو تم نے کبھی مخاطب بھی نہیں کیا مجھے۔“

”تمہارا رعب حسن تھا نا۔“ وردہ ہنس دی۔

ربیعہ بھی قد رے شرمندگی سے مسکرا دی۔

”مجھے اپنی تعریف بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“

”نیلجھو؟“ وردہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ارے نہیں۔“ ربیعہ ہنس پڑی۔ ”اور کوئی ارادہ بھی نہیں۔“

”وہ کیوں؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”بس۔“ ربیعہ اداس سی ہو گئی۔ ”کوئی وجہ تو نہیں پھر بھی۔“

”کبھی کوئی اچھا نہیں لگا اس لیے؟“

ربیعہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ درپچہ خیال پر دو چمکتی شناسا مہمان لگا ہیں ابھری تھیں۔ وہ مسکراتے

لب خاموش مگر ہمہ وقت کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ خاموش مہربان تبسم دل کو اچھا لگا تھا۔ نبانے کیوں اس وقت دورہ کے سوال پر ربیعہ کے ذہن میں اس نگاہ کا ہر لمحہ پھر گیا۔
دورہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ کر مسکرا دی۔



”آپ کی امی کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔“ چہرے پر کلیرنگ کریم ملتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں کہا۔
دیکھلی میگزین کی ورق گردانی کرتا ہوا ہاشم قدرے چونکا اٹھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے اور بات پر غور کیا پھر محتاط سے انداز میں بولا تھا۔

”امی کی پسند ناپسند سے اتنا فرق نہیں پڑتا شہلا! میں بار بار تمہیں کہہ چکا ہوں، تمہیں میرا اور مجھے تمہارا اعتبار ہونا چاہیے۔ جب میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں پھر تمہیں کسی اور کی اجازت درکار تو نہیں ہونا چاہیے اور امی کی پیچیدگی کسی حد تک تو سمجھتی ہی ہوگی۔ مزید وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”فرق کیوں نہیں پڑتا ہاشم!“ وہ کاشن بال سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ ”ایک گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں سے فرق تو پڑتا ہے۔ خیر میں منیجر کر لوں گی۔ آپ میرے ساتھ ہیں تو میں مطمئن ہوں۔“

”میں تو کب سے آپ کے ساتھ ہوں؟“ شرمندہ آواز سے پوچھتی آئی۔ ”آپ نے مجھ کو میکزین بند کیا۔“ آپ دھیان ہی نہیں دے رہیں۔ اب تو پاؤں ہو کر سوچتا ہوں، رافع سے کپ شپ لگا آؤں۔“

”ضرور۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں نے آپ کو کبھی روکا تو نہیں۔“
”کاش!“ لٹس نے آہ بھری۔

”آپ سچ جانتے ہیں؟“ شہلا کو حیرانی ہوئی۔
”روک لو! اچھا بھلا بھلا۔“ وہ شہلا کے ہاتھ سے ہاتھ لگا کر کہتی تھی۔

شہلا جھینپ گئی تھی۔ ہاشم مسکراتا ہوا باہر کی سمت بڑھ گیا۔



”یا حضرت۔“ رافع نے اسے مخاطب کرنا شروع کیا۔ ”یہ واقعہ آپ کی سواری یاد دہانی ہے یا پھر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”اے۔۔۔“ ہاشم نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے ایک دھپ سے نوازا۔ ”تجھ پر بھی یہ اچھا وقت آئے گا، بے فکر رہ۔“

”آہ۔۔۔“ رافع نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یا ہاشم! اچھی دعائیں دیا کریا ر! مجھے لگتا ہے تیری زبان اچھی بھلی کالی ہے۔“

ہاشم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ رافع آنکھیں موند کر دم سروں میں کچھ گھٹناتے لگا۔

”یہ جو ایک اچھی سی لڑکی ہے ربیعہ!“ ہاشم بولا۔
رافع نے اس قدر بے اختیار آنکھیں کھولیں کہ ہاشم کا دل حقیقتاً ”زور سے دھڑکا۔“

”یار رافع! سبھل کر میرے بھائی۔“ وہ حقیقتاً پریشان ہوا۔
رافع کے لبوں پر تبسمی جیسی۔ سی مسکراہٹ ور آئی تھی۔

”یو نہی۔۔۔ خوا خواہ۔۔۔ ہواؤں میں تیرا۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔
”تیر تو ہواؤں میں ہی پھوڑے جاتے ہیں دوست۔۔۔ تب ہی نشانے پر لگتے ہیں۔۔۔“ ہاشم کے لیے میں یقین

بھی تھا۔ بے شک یہی تھی۔ ”میں تیرا دوست ہوں رافعہ۔ تیرا ہمد ہم نفس۔ تو مجھ سے جموت نہیں بول سکتا۔“
 رافعہ سر جھکا کر اپنی تجلیاں سلنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ہاتھ کو دیکھا۔
 ”میں خوراس سے بھی جموت بولنے کی سعی میں مصروف ہوں دوست۔ پر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو
 بڑا ظالم دوست ہے ہاتھ۔ تو نے مجھے بہت بدعاش دی ہیں۔“
 ”اوہ۔“ ہاتھ جیسے بالکل ہی بیچہ تھا تھا۔ ”اکی۔ اکی اہم سوری رافعہ۔ کیا خبر تھی۔ اوہ۔ اکی اہم ریکی
 سوری۔“

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ ایقان نے اسکول سے آئے ہوئے مومن کو ہدایت دی تھی۔
 ”جزیرہ بھائی آ رہے ہیں۔ ہم اپنی ای کے کھر چل رہے ہیں۔“ وہ خود ایمان کو خوشبو سنا رہی تھی۔
 ”ہرے۔“ مومن نے غور کیا۔ ”ہم وہاں رہیں گے نامہ؟“
 ”ہاں۔ آج رات دیں گے۔ کل واپس آجائیں گے۔“ وہ اب ایمان کی پونیاں بٹانے لگی۔
 ”آجی جلدی۔“ اس نے منہ بسورا۔ ”مجھے عرصے کے ساتھ کھانا بہت پڑا تھا۔“
 ”بھیا! آپ کی پچھیاں تو نہیں ہیں پچھیا آئے ہوئے ہیں آپ کے۔“ وہ کھانا کھانے لگی۔
 ”پہا کتنے دن بعد واپس جائیں گے؟“ ایقان نے پچھیا کھانے دیکھا اور کمری سانس بھری۔
 ”پہا نہیں۔“ وہ قدرے خشکی سے بولی۔ ”آپ کیلئے پیچ کرؤ جلدی۔“
 وہ اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔ ایمان کو تیار کر کے اب وہ چوہاں بن رہی تھی۔ جب ڈور تیل لگی۔ باہر حسب توقع
 تیز ہی تھا۔ ایسے لالہ لالہ انداز میں ایمان کو گاندھے پر چڑھا کر وہ اندر چلا گیا۔
 ”چلیں پیچو۔“

”ہاں چلو۔ ہم لوگ تیار ہیں بالکل۔“
 ”اور پیچھا حضور۔ وہ کہاں ہیں؟“
 ”کچھ خبر نہیں ملتی ان کی۔“ وہ سٹلے بیٹھے سے انداز میں بولی۔ ”بھئی بالکل فاسخ۔ کبھی جد بعد مصروف۔ سنا ہے
 آج کل کسی برس وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔“ انہوں نے پچھتاہٹ سے باہر ہی پائے جانے
 ہیں۔
 ”ہوں۔“ اس نے سر ہایا اور فرخ پیکول کر کوئی کام کی چیز تلاش کرنے لگا۔ ”میں نے اپنی چوہوں کو پکھلا دیا
 تھا۔ ایک ناز لڑکی کے ساتھ آکس کریم پارلر پر۔ شاید برس وغیرہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔“
 ایقان جہاں بھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے بے اعتباری سے حقو کی جانب
 دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو لیکن وہ اپنی بات پوری کر کے اب سنجیدگی سے منہائی کے ذبے پر ہاتھ صاف کر رہا
 تھا۔
 ”تم نے تم نے۔“ عاشرہ دیکھا تھا۔ آکس کریم پارلر پر۔ ”وہ بے اعتباری سے بولی۔ ”کب؟ کب کی
 بات کر رہے ہو؟“
 ”اوں۔“ اس نے سوچا۔ ”شاید برسوں کی بات ہے۔ پرسوں رات کی۔ جی ہاں۔ یقیناً میں اسی دن رہبر کے
 ساتھ نکلا تھا۔“
 ”پرسوں۔“ ایقان نے کھوئے کھوئے انداز میں سوچا۔

اس روز عاشرہ رات بہت دیر سے لوٹا تھا اور ایقان کے استفسار پر اس نے ایک دوست کے ہاں دعوت کا ذکر کیا
 تھا۔
 ”دعوتیں پیچیدہ۔“ حقو نے قدرے آکٹا کر کہا۔ ”مجھے دیر ہو جائے گی۔ میری شام کی کلاسز ہیں۔“
 ”اے۔“ وہ چونکی۔ ”ہاں چلو۔“
 خود پر قابو پا کر اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ بدقت تمام اس نے بیک شانے سے لڑکایا۔ اس وقت
 اس کا پانچویں کسی کے شانے سے لگ کر آٹو ہمارے کوچہ رہا تھا۔
 ”ایک ناز لڑکی کے ساتھ۔“ آکس کریم پارلر پر۔ ”حقو کے الفاظ اس کا دل کاٹ رہے تھے۔
 ”عرا کانگ۔“ عاشرہ کے موبائل کی اسکرین اس کے ذہن پر روشن تھی۔

”اوکے۔ میں اب چلوں گا۔“ کانی کا خالی کمر سائیز ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑائے الماری کے پٹ بند
 کرتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔
 ”آج پیس رک جاؤ۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ برش سے بال بٹھارنے لگا۔
 ”کس طرح ہے؟“
 ”خوب۔“
 ”عرا! چلیں۔“ ایقان نے ایک چار ایک رتبہ سمجھا لیا۔ ”ایسے مطالبات مت کرو جو میرے لیے ناقابل قبول
 ہوں۔“

”جو مطالبات تمہارے لیے قابل قبول ہوں ان کی ایک لسٹ بنا دو۔“ وہ شرارت سے ہنس۔
 ”میں تمہیں اپنا دائرہ عمل بتا جاؤں۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولا۔
 ”اے۔“ اس نے منہ کھول کر کھانے کا کمانڈ کیا۔ ”اب کب آؤ گے؟“
 ”برسوں تمہاری فلائٹ سے پچھتیں ہی آف کرنے آؤں گا۔“ وہ چند لمحوں کے بعد
 ”حقو! آؤں۔“ وہ فون سے کلمہ کل نہیں آؤ گے۔ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
 ”عاشرہ! تم نے فون کروں گا۔“ وہ نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔
 ”عاشرہ! اس نے پیچھے سے پکارا۔
 وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”کل۔ شادی کرو گے مجھ سے؟“
 عاشرہ نے حیرانی سے دیکھنے لگا۔
 ”یہ کون سا مذاق ہے؟“
 ”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ حقیقتاً سنجیدہ تھی۔

عاشق نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا بے تاثر سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
 لڑا چند قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آگئی۔ مدھم مدھم روشنی میں وہ بلا کی سحر انگیز لگ رہی تھی۔ بے واغ،
 چمکتے چہرے پر سچی سیاہ آنکھیں صراحت سے اپنا مدعا کہہ رہی تھیں۔
 ”بولو عاشق؟“ اس نے دھیمے سے کہا ”شادی کرو گے مجھ سے؟“

پھر اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ چند لمحوں کے لیے ماحول میں بے حد گہیر خاموشی چھا گئی تھی۔
 عاشق کو اس لمحے میں بھری ہوئی جاو اد اثر رومانیت سے نکلنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ پھر اس نے آستلی سے اس کا سر
 اپنے کندھے سے ہٹایا۔

”نہیں لڑا۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ مضبوط تھا ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی ”کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا رکاوٹ ہے؟ تم مسلمانوں کو تو چار چار بیویاں رکھنے
 کی اجازت ہے؟“

عاشق کو لہجہ بھڑکے لیے جھنکا سا لگا پھر مسکرا دیا۔

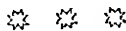
”ہاں بالکل ہے اجازت لیکن یہ آپشن ہے مجھ پر بھی نہیں۔“
 ”کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے اس آپشن سے؟“ وہ ضدی بننے سے بولی۔
 ”کیونکہ میں اپنی بیوی کو بہت چاہتا ہوں لڑا! میں اسے دیکھی نہیں کر سکتا۔ میرے بچے مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں
 نہیں چاہتا کہ ان کو ان کے ساتھ کوئی نا انصافی ہو۔ دو شادیاں کر کے میں انصاف کے تقاضے پورا کرے نہ کر پاؤں گا۔“

”عاشق! میں تمہیں ہر وقت پر حائل کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اس نے انتظار کی بے بسی
 تھی۔

”مردی لڑا! میری کوئی قیمت ہے ہی نہیں۔ جو چیز ناٹ فار سیل ہو اس کی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ بات میں تمہیں
 نبھانے کب سے سمجھا رہی ہوں لیکن تم سمجھتیں نہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں تمہارے حقے کا
 وقت دے چکا ہوں۔ تمہیں مجھ سے کسی درکار تھا۔ تم خود کستی تھیں۔ اب شکایت کا حق تمہارے پاس نہیں
 ہے۔“

”جھوٹے ہو، تم جھوٹے۔ تم مسلمان مرد دو غلے ہوتے ہو۔ منافی ہوتے ہو دل میں کچھ اور زبان پر کچھ
 ادا۔ تم سے اچھے تو وہ ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کم از کم ان کے تعلق میں منافقت تو نہیں ہوتی۔“
 وہ الماری کے پٹ سے ٹیک لگا کر جنونی انداز میں بول رہی تھی۔ عاشق نے بے حد سکون سے اس کی بات سنی
 تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولا ”تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ تم کسی ایسے مرد سے شادی کرو جس کا
 کوئی مذہب نہ ہو۔ مسلمان مرد سے شادی کر کے تمہیں کیا ملے گا سوائے منافقت کے۔“
 اپنی بات مکمل کر کے وہ روکا نہیں تھا۔
 ”عاشق! عاشق!۔“ وہ اس کے پیچھے لگی ”عاشق! میری بات سنو۔“
 باہر کا ریڈور سنسن پڑا تھا۔



”کیا بات ہے بچی۔ جب سے آئی ہو، یونہی کھولی کھولی خاموش خاموش سی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے

”اوقاف“ اسنے سالوں سے وہاں چلیاں میں لگی ”کیلا پن“ سپہ رہے ہو وہاں تو تمہیں کوئی شکایت نہ ہوئی۔ یا وہاں بہت قوتیں میسر ہیں؟“

عاشقو نکا۔ اس کے لیے کانٹا اور بدلاؤ بہت واضح تھا۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے گویا سنی ان کی۔

”میں ہیں گھر میں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”لے آناؤں؟“

ایقان لہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جی چاہتا تھا۔ کوئی ایسا جملہ کہ اس کے اندر کی ساری تیش اس جملے میں گھل کر اس کی سماعت میں اتر جائے۔ پھر لگے گی اسے ہر طرح کی مصلحتیں اس کی زبان کے آؤ بے آؤں۔

”مرضی ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

”کیا بات ہے ایقان۔“ وہ لہجہ کیا ”تمہیں ہوا کیا ہے؟“

”خدا ماننا؟“ وہ نون رکھ کر مڑ گئی۔

نہا۔ شملہ کی ہر لڑی میں وہ راجہ جیکم کے پورشن میں گئی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کے قدموں کو کس سمت میں بوجھنا ہے۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ رافع نے اس کا چہرہ بڑھا۔ ”میرا خیال ہے شملہ بھالی اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“

”جی ہاں۔ لیکن اس وقت میں درود کے پاس آئی تھی۔ مجھے اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ شملہ آئی تو خود ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں واپس جا کر ان سے ملوں گی۔“

”درود ہے! رافع کا چہرہ واضح طور پر بچھا تھا۔ ”وہ۔“ اچھا آئیں میں آپ کو پیچھو کے پورشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

”ریبیہ نے روش پر اس کی ہر لڑی میں قدم بوجھا ہے۔ رافع اس سے دو قدم ہٹ کر قدرے آگے چلنے لگا۔ اپنا

اس سے سامنے راستہ پورشن کا مڑ کر دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ شملہ باہر نکلے تھے۔

”راجہ اور ریبیہ رک گئے۔“ انہیں دیکھ کر جیسے ٹھنک کر اپنی جگہ پر ٹھہرا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور استعجاب کے رنگ تھے۔

ریبیہ شملہ کو دیکھ کر تیز قدموں سے اس تک پہنچی۔

”اسلام! علیکم۔“ اس نے بے حد مرحوشی سے اس کے دونوں کو سلام کیا۔

”علیکم السلام۔“ شملہ نے محبت سے اسے سنا کر کہا۔ ”تم مجھ سے ملنے آئی ہو ریبیہ۔ اندر چلیں؟“

”نہیں۔ میں نہیں آئی تھی۔“ ریبیہ نے شرارت سے اس کی دیکھ کر کہ مجھے علم تھا کہ آپ کو ابھی ہم لوگوں سے ملنے آئے ہیں۔ میں درود کے پاس آئی تھی۔ لیکن خریدنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھی۔“

”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ شملہ نے نگاہیں لباس میں پھوس ریبیہ کو غور سے دیکھا۔ ”بہت پیاری لگ رہی ہو ریبیہ۔“

”جی۔“ وہ جینیب کی گئی۔

”یہ رنگ بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر۔“

”اچھا۔“ وہ جینیب کی گئی۔

”بائیں دونوں کو جو ٹنگٹنگا کر کیے ملے رافع کی سمت کھٹک لیا۔

”ابے شاعر۔“ اس نے مختصر تو جی کی ”تو تو بڑھتا جا رہا ہے۔“ یوں سرعام بانگ بول۔

”ہائے۔“ شملہ نے جواب دیا۔ ”میں اسے پیچھو کے پورشن تک پہنچانے جا رہا ہوں۔“

”ہائے۔“ اس نے دوبارہ ”تمہیں کی خبیلی دیکھیے کہے کہاں پہنچانے جا رہا ہے۔“ رافع نے زیر لب اسے برا بھلا کہا۔

”تو میرے کون رافع۔“ وہ تڑپ کر ہوا ”ابو جی خوب چیخ رہی ہے۔ اگر میں تعصب کی عینک اتاروں تو میری اور شملہ کی جوڑی کو بھی مات دے دی تو نہ۔“ رافع نے گہری سانس بھری تھی۔

”بائیں بائیں۔“

”ابے۔“ اس نے ”معاذی اللہ! انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے۔“ ہم چلتے ہیں۔“ تم تھوڑی دیر اور اس کے ساتھ چلو۔“

پھر اس نے پیادے کر شملہ کو کھانہ شملہ اس کی نگاہوں کا اشارہ پا کر ریہہ سے اجازت چاہ کر آگے بڑھ گئی۔

”جلدی آنا۔“ اس نے ریہہ کو نالید کی گئی۔

”میں آئی۔“ تو میرے کھٹے میں آئی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”ایقان! ریبیہ نے کمرے میں جھانکا ”بڑی ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔“ اس نے جرتل پر سے سر اٹھا کر چہرے پر اظہار کیا ”میں نے کئی ضروری کام ہے؟ میں ذرا یہ دیکھ کر انا بڑا ہی تھک۔“

”مجھے درود سے کچھ کام ہے۔“ بس کے مطلق بات کرنا چاہ رہی تھی ”ایقان! مجھے لہ بھر کے لیے سوچا۔“

”ہاں تجلی جاؤ۔ اب تو تمہارا انا بڑا ہے گا۔“

”نہیں اس کی؟“ وہ تذبذب ہوئی۔

”یاد رکھو۔ اب یہ گزیرنے کے فاصلے پر تو گھر بھی بھر بھی تم کو پہنچتی ہوں۔“ وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔

”نہیں نہیں۔ ایقان! تم اپنی اسٹری کوس۔ میں چل جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طرف سر ہٹا دیا۔

ریبیہ نے اسے کتابیں چھوڑ کر دیکھ کر جلدی سے کہا۔

”شیوور؟“ اس نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئی۔

دوبے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو رنگ دیا تھا۔ اس سنہری سنہری شام میں اپنی صحن میں آگے بڑھتا ہوا رافع کھٹک کھٹک لڑکی کے بچوے گیت کے دو سری جانب کھڑی ریہہ بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہری گئی۔

”آپ؟“ وہ مسکرایا ہوا۔

ریہہ بھی ماتت سے مسکرائی ”کیوں۔ میں یہاں نہیں آ سکتی؟“

”نہے نصیب۔“ وہ قدرے خیر ہوا۔ ”ہزار مرتبہ آئے۔“

”آپ دروازہ کھولیں۔ تب نا۔“ وہ اس پر زنی۔ رافع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھی ہنس دیا۔ پھر اس نے کندھی کھول کر گریٹ دیا۔

”تشریف لائیے۔“ ابو ارموسٹ ویکم۔

ریہہ قدرے جینیب سی گئی۔ اندر آ کر اس نے لہ بھر کے لیے اپنے سامنے پھیلے پنگے کے طول و عرض کو دیکھا

رافع نے جزر ہو کر اپنی نگاہ پھیری تھی۔

”ہائے رنجہ تم! درد اسے دیکھ کر کل ہی اٹھی! ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔۔۔ پوچھو تو ناعمہ سے۔“

”بالکل سچ! ناعمہ بھی مسکرائی ”درد آئی آپ کا ہی ذکر کر رہی تھیں۔“

”اؤ اندر چل کر بیٹھیں۔۔۔ ناعمہ! تم ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ درد اس کا ہاتھ تمام کر اندر کی جانب چل رہی تھی۔

”بیچہ ان لوگوں کی محبت اور خلوص سے حقیقتاً متاثر ہوئی تھی۔ خصوصاً ”درد اسے بہت اچھی لگی تھی۔“ ”حیات والا“ کے بننے اور فساد سے وہ اب تک متعارف ہوئی تھی ان میں سے دو افراد اسے خصوصیت سے اٹھنے لگے تھے ان دونوں سے ایک درد تھی۔

ناعمہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں گہری سیلیوں کی طرح کھینچی بات پر ہنس رہی تھیں۔

”نعمت! اچھی لگتی ہیں آپ بیٹے ہوئے۔“ اس نے نرے ان کے ہاتھ رکھی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

”زیادہ سے زیادہ ہٹا کر رہیں۔“

”بیچہ دفععتاً ”بیٹہ ہی ہو گئی تھی۔“

”ایسی بیٹی تو بھی بھاری آئی ہے۔“ نجامے کی اسوج کردہ بولی تھی پھر قدرے چونک کر ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

”اور تم لوگ تو یوں ہی ہمیشہ مذاق کرتی رہتی ہو گی۔ ہنسوں کی تو پٹیل میں خوب ہنسی ہے۔“

ناعمہ نے درد کو دیکھ کر منہ بنایا۔ درد مسکرا دی تھی۔

”ہن کے ساتھ اور ہمیشہ مذاق؟“ ”بولی۔“ ”میں تو ہمیشہ محبت پر نکتہ اعتراض اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔“

”ہن کو درد زیادہ ہیں۔۔۔ ہاں راکھ آئی سے میری خوب ہنسی ہے۔“

”ہنسوں کی اصل قدر شادی کے بعد ہی آتی ہے۔“ ”درد نے اسے چڑھایا۔“ ”کیوں بیچہ؟“

”بالکل ٹھیک۔“ ”مسکرائی۔“ ”درد کی شادی کے بعد تمام اسے بھی یوں یاد کر گئی۔“

”جی رہتے ہیں۔“ ”اس نے کپ رنجہ کو تھمایا۔“ ”یہ کون سا راکھ آئی کی طرح کہیں درد جا رہی ہیں جو میں انہیں یاد کروں گی۔“ ”ناجمہ کی کریمیں وہیں کی۔۔۔ دن رات نصیحتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“ ”بیچہ نے دل چسپی سے درد کی شریکیں مسکراہٹ اور ناعمہ کے ہمنامے ہوئے انداز کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ سلجوق ماموں کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے معنیہ ہیں۔“

”بیچہ کو نجامے کیوں لمحہ بھر کے لیے چکر سا آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر وحند لا گیا۔ ہاتھ کانپا۔

چائے سار میں چمک گئی۔ لمحہ بھر کی بات تھی پھر منظر صاف ہو گیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور دھیرے سے مسکرائی۔

””چھما۔“ ”بولی۔“ ”درد نے توتھایا ہی نہیں کہ یہ ایک بیچڑ ہے۔“

”یہ ایسی ہی ہیں۔۔۔ کتنی سی۔“ ”ناعمہ مزے سے بولی۔“

”خیرم کر کچھ۔“ ”درد نے اسے جھڑکایا۔ اس نے قطعاً ”مراد نہ کی۔“

”چندر سال قبل بزرگوں کی باہمی رضامندی اور رافع بھائی کی پسند سے یہ رشتہ طے پایا ہے۔“ ”ناعمہ مسلسل بول رہی تھی۔“

”بیچہ کو یوں محسوس ہو گا کیسا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھینکے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالی نرے میں رکھ دی۔“

”کیا نہیں پسندو مند۔“ ”درد جھٹ بولی تھی۔“ ”ناعمہ! کچھ زیادہ ہی بول رہی ہو۔“

”بھئی میں تو جی ہی بول رہی ہوں۔“ ”کیا غلط ہے کہ رافع بھائی نے عمریشہ کے بجائے آپ سے منسوب ہونا پسند کیا تھا؟ ان کے سامنے دونوں آہستہ آہستہ۔“

”انہوں نے شخص ترجیح دی تھی کہ ان کے مطابق عمریشہ ان سے کافی چھوٹی ہے۔ باقی یہ کہ اس رشتے کے طے پانے میں کچھ کچھ کی نا انصافی کی نہیں تھی۔“

”اللہ۔۔۔ تو آپ ان کے حق میں سفارشات کیوں دے رہی ہیں۔“ ”ناعمہ شرارت سے آنکھیں منٹا کر بولی۔ ”پسندیدگی اگر ہو بھی تو میں اور بیچہ ہرگز متفق نہیں ہوں گے۔ کیوں بیچہ؟“

”بیچہ شخص مسکرا کر رہی تھی۔ ”وہ شخص کے اقدار پر چٹکی دو لگائیں اپنی جگہ ہنوز موجود تھیں اور ان میں موجود وہ جذبہ وہ کمال وہ حیاتی وہ اخلاص؟“

”جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

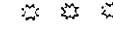
””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

””جھوٹ کماں تھا، جسکے جھکا؟ بیچہ کچھ نہ پائی۔“

””کس سوچ میں تھو کس؟“ ”ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اچھایا تو جلدی سے مسکرائی۔“

یقین اور بے یقینی کے اس بل پر سنبھل کر اس کی سوچ اب یقین کے سرے پر آکر ٹھہری تھی۔ وہ جیسے سارے قصے سے آگاہ ہو گئی تھی۔ شک اور بے یقینی اپنا کام کھار کھیل ہو چکے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کن موڑ پر تھی۔



بچوں کو اسکول کے لیے بھیج کر ایتھان اندر آئی تو بیڈروم کے دروازے پر اگر ٹھہری۔ وہ نماذ جو کر آئینہ کے سامنے موجود تھا۔ بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بے حد فریض و مؤذ میں وہ کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔
 ”ایسا چائے و جلدی ہے۔“ کہنے میں ایتھان کا عکس دیکھ کر وہ بولا اور بالوں میں برش بھیرنے لگا۔
 ایتھان خاموشی سے بیٹھی تھی۔ لیکن میں اگر چائے بنائے ہوئے وہ خود میں چولے سے زیادہ پیش اور کھولے ہوئے پانی سے زیادہ کھولا و محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ عاشر کے وجود میں بھی بھڑک اڑے۔
 بے حد مصروف سے انداز میں وہ ٹیبل پر اخبار بچھا کر سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ ایتھان نے چائے کے کپڑے ہاتھ سے دھو کر رکھا اور کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی تھی۔ کرسی چھوٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔
 چائے پیتے پیتے عاشر نے لگا ہاتھ کر اسے دیکھا اور بے حد چونکا۔
 ”ایتھان! کیا ہوا تمہیں؟“

وہ جواب دینے بنا اسے دیکھتی رہی۔
 ”طبعیت خراب ہے؟ اتنی سرخ آنکھیں جیسے روٹی رہی ہو رات بھر۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ چومنا چاہا۔ ایتھان نے اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ برے لیا۔
 ”؟؟“ اس نے بے یقینی سے دیکھا۔
 ایتھان نے عین اس کی نظروں کے سامنے مٹی کی کھلی تھوڑی سی گھاس کے ہاتھ پر وہی آشوروں کا تھا۔
 ”کیا ہے؟“ عاشر نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”میں تو میں جانا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ آشوروں نے اور بتاؤ کہ یہ محبت کی نشانی کس کی ہے کس کے لیے ہے اور کیوں ہے؟“

عاشر تھکا سا ہو گیا۔ اس نے دیر سے سے ٹھٹھا اٹھایا اور اگلے ہی پل پہنچ گیا۔ اس میں سے لڑا کے مخصوص پریم کی نہایت تیز خوشبو آ رہی تھی۔
 ایتھان ایک جھپکے بغیر اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ عاشر نے ٹٹو کی تہہ کھلی پر تیز لڑائی و محرومی کی خوشبو کے یوں سے گہری سانس پر بند ہو گئی تھی۔

”یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے ایتھان سے پوچھا۔
 ”غیر ضروری سوال ہے۔ ان ضروری سوالوں کا جواب دو عاشر! جو میں تم سے پوچھتے ہیں؟“ عاشر نے جڑ بڑھ کر اسے دیکھا تھا۔
 ”میں کہہ سکتا ہوں ایتھان! اگر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ یہ لڑا کی حرکت ہے۔ اسی نے جان بوجھ کر میری جیب میں رکھا ہو گا۔“
 ایتھان کا نفس تیز ہو گیا۔ اسے ایک نمک دیکھ رہی تھی۔
 ”جانتے ہو عاشر! مرنے کے زب تن کے لباس میں اگر کوئی لڑکی کچھ رکھنا چاہے تو اسے اس مرنے کے کتنا قریب ہونا پڑتا ہے؟“

عاشر لہجہ بھر کے لیے دم بخور ہوا اور پھر وہ کچھ بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔
 ”دیکھو ایتھان! بات دو میں ہے جو کہ سمجھ رہی ہو۔ دراصل میں تمہیں بتانا چاہ رہا تھا۔“
 ”کہوں یہ کیا؟“ وہ جیسے اس کی بات نہ ہی سمجھ رہی تھی۔

”لڑا! امیری دوست۔ وہاں جاپان میں وہ میرے ساتھ۔“
 ”جاپان؟“ بے یقینی سے اس کی آنکھیں کھیل کھیل گئیں۔ ”وہ جاپان سے تمہارے ساتھ آئی ہے۔“
 ”نہیں۔“ وہ جڑ بڑھ کر بولا۔ ”وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ وہ بعد میں۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی آئی ہے۔“
 ”خیر تمہارے لیے ان رپورٹس کتنے تھے؟“

ایتھان کو گردش و گشتوں میں رونما ہونے والے واقعات یاد آنے لگے۔
 ”اوس! اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دوست کی فیملی آئی ہے۔ اور اس دن کے بعد سے تم پورا پورا دل دینا چاہو۔“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“
 ”خیر۔ اور اب؟“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“
 ”اوس! اور اب؟“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹھٹھا لیا۔
 ”ایتھان! کیا ہے؟“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“
 ”اوس! اور اب؟“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“
 ”اوس! اور اب؟“ ایتھان نے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نہ کچھ سمجھتی ہوگی۔“

وہ روتے ہوئے اٹھی اور بھاگے ہوئے بیڈروم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ عاشر پشیمانی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا تھا۔



وہ روتے ہوئے اٹھی اور بھاگے ہوئے بیڈروم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ عاشر پشیمانی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا تھا۔

کیا وہ سراب تھا کیا وہ کسی رنگ دار میں تھی کیا وہ قریب نظر تھا کیا وہ کوئی تمنا تھی؟
 ”رہے بھانگے۔“ بھانگے بھانگے اس کی ٹانگوں میں وہ روئے لگا لیکن پانی اتنا ہی دور۔
 ”رہے۔“ ایک ٹھنڈی، ٹھنڈی آواز کہیں سے ابھری تھی۔ ”رہے۔“ آواز کہیں سے ابھری تھی۔ ”رہے۔“ آواز کہیں سے ابھری تھی۔

”کس کی آواز ہے یہ؟“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ شناسا، مہربان آواز۔

”رہیمہ ریجیڈ آؤ۔ میں یہاں ہوں رہیمہ تمہارے سامنے۔“

رہیمہ نے انکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ دفعتاً چاند کو بادلوں نے انی اداوت میں لے لیا۔ کچھ لمے قبل جنگ کا ماحول اپنا گنگا اندھیرے میں بدل گیا اور پھر رہیمہ نے بارش برستی محسوس کی۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ آواز اسے مسلسل بیکار رہی۔ ریجیڈ کا ذہن اس کی بیچون کو گرفت میں لانے سے قاصر تھا لیکن شنائیں مسلسل محسوس ہو رہی تھیں۔

”کون ہو تم؟ کون ہو تم؟ کہاں ہو تم؟“ وہاں گلوں کی طرح آؤں کے بڑھ رہی تھیں۔

ایک ایک اسے غور کر گئی۔ بڑے زور کی غور کر۔ اور اس سے پتہ چل گیا کہ وہ گرتی گرتی آئی تھی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس بھر رہی تھی۔ اس کے خائسوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ برابر میں لیٹی ہوئی انیقا لٹھ کر بیٹھ گئی۔

”رہیمہ؟“ وہ انھیں کراس کے قریب چلی آئی۔ ”کہا ہوا ہے؟“

رہیمہ بھی لٹھ کر بیٹھی۔ ”پانی؟“ وہ مشکل بولی تھی۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“

”پانی لائی ہوں۔ تم شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔“ انیقا نے اس کا ہاتھ ہتھکڑ سے تھام کر فرنگی کی جانب بڑھ گئی۔

اپنی سانسوں سے ابھی ریجیڈ اب خود سے ابھڑ رہی تھی۔ کیوں بھی کسی نہ ایسے خواب؟ کسی کی دعوت بہیم اسے ملانی تھی؟ اسے کہاں جاتا تھا؟ اس کے لاشعور میں کیا ہو رہا تھا؟

انیقا اسے پانی پلا کر پھر سے لیٹ کر سوچنے لگی۔ لیکن اب پچھلی کی باری طرح نہ سو سکی۔ اب وہ سوچیدگی سے ان خوابوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ مسلسل اتفاقی نہیں تھا۔ کوئی باطنی اس کا منتظر تھا۔ لیکن کون؟

وہ تیزی سے ریٹک تھماتے ہوئے اپنے پورشن کی جانب جا رہا تھا جب اس نے لان کے پینٹل حصے میں پھست کو جاتی ہوئی بیڑیوں پر کسی کو بیٹھے دیکھا۔

ناخن ٹھکڑا۔ دوسرے واضح نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس اداوت اسے ابھی اسے ابھی اس طرح بتاتی ہیں کون بیٹھ سکتا ہے۔ ایک کڑواہٹ اس کی حلق میں اتر گئی تھی۔ جھک کر اس نے پہلے کی طرح ریٹک تھماتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن بجائے کیا بات ہوئی۔ وہ آگے بڑھ نہ سکا۔

اس نے پھر اسی جانب دیکھا۔ چند لمحوں سے سوچا پھر اس کے قدم بے اختیار اسی بیڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وہ عریض ہی تھی۔ کاسی رنگ کے کپڑے، شکرانہ آلود لباس میں بلبوس۔ ہاتھوں پر تھوڑی ٹکائے ہوئے جس و حرکت میں تھی۔ ناخن اس کے قریب جا رہا۔ عریضہ سے مراٹھا یا دونوں کی نگاہیں گرا گئیں پھر اس نے کسی تاثر کے بغیر واپس سر جھکا لیا۔ ناخن نہ دیکھا ان نگاہوں کی وہ پچھلی خفاہٹ اور نفرت اب معدوم تھی۔ اب وہاں نیچے ہوئے چراغوں کی ہی کیفیت تھی۔ نہ کوئی تاثر نہ سوچ نہ خیال۔

اس نے گہری سانس بھری پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ عریضہ کے وجود میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

”عریضہ؟“ اس نے نرم لہجے میں پکارا۔

”کو؟“ بے تاثر جواب آیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”سب کچھ ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک انتظار باقی ہے۔“

”کیا انتظار؟“ وہ ابھرا۔

اس بات کا کوئی جواب نہ آیا تھا۔ ناخن کچھ دیر خاموش رہ کر لفظوں کو تریب دینے لگا۔

”دیکھو عریضہ؟“ پھر وہ بولا۔ ”کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ نکالا جاسکے۔ میں جانتا ہوں۔ جب سے ہماری جنگی ہوئی ہے تو ہمیشہ طور پر ڈسٹر ب ہو گئی ہو اور جب سے نکلج ہوا ہے تب سے تو۔ تم جیسے پائل بھیج رہی ہو۔ دیکھو۔ میں ایک کھلے ذہن کا انسان ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر انسان کو اپنی ذاتی رائے پسند یا پسند کے مطابق فیصلے کرنے کا کلی اختیار ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے معاملے میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسی بات نے تمہیں برت کیا ہے غالباً۔ شاید میں تمہارے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو تم نے اپنے جیون سماجی کے بارے میں اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ عریضہ لولی بیٹھی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کسی اور سے کہہ رہا ہو اور عریضہ نا

”عریضہ؟“ اگر ایسا ہی ہے تو اس سے اس کی نسبت کی وجہ یہی ہے تو یقیناً ہائوس کسی جرم کی ذمہ داری کما سکتے

نہیں وہاں کہ تم ہی نہ ہو۔ لیکن میں اس بات پر مت ہمت ہے کہ میں ایسے جبری فیصلوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہوں۔ قانونی و شرعی امور میری ذمہ داری ہیں۔ لیکن اگر میں اس رشتے کو ختم کرنے سے شہادت انکاری ہے تو میں اتنا خوف رکھتا ہوں کہ میں ہاؤس پر ہتھ پڑنے کے بجائے کڑواؤ کروں۔ لیکن۔ لیکن پلینڈ ایک مرتبہ اپنے منہ سے کہہ دو کہ تم آزادی چاہتے ہو۔ یہ ہندو صحن تمہارے لیے تکلیف دے گا۔ تم ایک مرتبہ کہہ دو۔ پھر وہی ہو گا جو تم چاہو گے۔ ایک جتنے چاہے گا انسان کو اس کی تکلیف دہ صورت میں رکھنا۔ اگر تم میری ہدایت کی حد سے باہر ہے۔“

”میرا نام کیا ہے؟“ وہ پوچھا۔

”ہو عریضہ؟“ انھوں نے پوچھا۔ جواب وہی بات کہ۔

”مجھے کسی ہندو یا آزادی سے اب فرق نہیں۔ وہ ناخن ہے۔“ بالآخر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوئی تھی۔

”میں اب بیٹھی ہوں۔ تم نے ہم شاید ایک ہی بات کہی۔ آخری ذمہ۔ پس اس کا انتظار ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ اگر تم اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہو۔ کوئی قدم اٹھانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔ جہاں تک میرا

سوال ہے۔ میں بھٹکتی سے دست بردار ہو چکی ہوں۔“

وہ دیر کے دیر سے پلٹے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ ناخن جیڑائی سے بیٹھا اس کے لفظوں پر غور کرتا رہا۔



شہلا تھکی باری باہنسل سے لولی تو شہید یا اس لگ رہی تھی۔ پانی پینے کی غرض سے وہ کچن میں داخل ہوئی تو جلی پینے تو وہاں سے فروں پیلے اس کی جانب دیکھا تھا۔ شہلا ٹھنڈک سی گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مسکراتر شہید لہجے میں سلام کیا۔

”اولم السلام۔“ انہوں نے جواب دے کے ساتھ سر کو بھی جھکا دیا تھا۔

”آپ سے کیا گروا ہے؟“ اس نے ان کے کچے کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ستارے انداز میں پوچھا۔

”دو سے ہیں اپنی جان کو۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہو۔ ”موزوں بھی بڑیوں کو تھس رہے ہیں۔ سوچا تھا۔ ہو

گھر میں آئے گی تو جان کو کچھ نیسب ہو گا۔ ہم بھی تجو ڈا آرام کر لیں گے۔ لیکن ہم سے بد قسمیوں کی قسمت

میں آرام ہو بتا۔ صبح باہری شام باہری۔ یہی کرتے، ہم چار دن بیمار ہوں گے اور خیر سے اپنی آرام گاہ کو پہنچیں گے۔ ہو کو دوسرے مریض بنانے سے فرصت نہیں۔“

شلا حدود درجہ چل ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چیخ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”اگلی ایک دو سو سو۔“ میں کل سے ضرور کھانا پکا کر ڈیوٹی پر جاؤں گی۔ آخر اتنا یہ بھی میری ڈیوٹی ہے۔ آپ آرام کر سہیں کھانا پکاتی ہوں۔“

فردوس نیکنے ہاتھ میں پکڑا پچھوے دینے میں تامل نہ کیا تھا۔

”اگلی دس گے گوشت میں۔ دال بھی رکھتی ہے دوسرے چیلے پر۔ میں سوچ ہی رہی تھی۔“

”میں۔ میں کچھ لیتی ہوں۔“ آپ جاملے پائیز۔“ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

”اے ہاں۔“ ہم بھی انسان ہیں۔ کماں تک چپ رہتے۔“ وہ زیر لب برزواتے ہوئے باہر نکلی تھیں۔

شلا نے تجانے کب کار کا سانس خارج کیا۔ اس نے پیرے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر کے گوشت چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

”دینے چاہیے کہوں رافعہ جوڑی خوب چن رہی ہے۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا شرارتی اچھو کہنا۔ اس نے سختی سے آنکھیں پھینکیں۔

”آنکھیں بند کر دے کانی کیڑوں میں ملبوس وہ بار سنگار کے پھولوں کی لڑکی پر نہ اتنی پر مسکرانے لگی تھی۔ رافعہ نے گھر کا جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

”خدا کرے رافعہ! تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“ وہ بڑھاپے میں کھٹکتا ہوا تھا۔

”مستاناں تیرے۔“ وہ بڑھاپے میں۔“ اور کوئی دعا نہیں دے سکتا تھا۔

”میں نے تجھے دعا نہیں دی دعا ہی ہے۔“ ہاشم کی بیٹی اس کے کانوں میں گونجی۔ رافعہ نے گہری سانس بھری۔

”ٹھیک ہی کہتے تھے تمہارا ہاشم مریاں! بد دعا دی تھی تمہارے لیے۔“ مطلقاً میری پر سکون، مطمئن زندگی میں اضطراب کی لہرں تمہاری اس بد دعا سے ہی اٹھی ہیں۔ ہم نے تمہارے لیے دعا کی ہے اور دیکھو تم مطمئن اور شاداب بیٹھے ہو۔“ بولو حق دوستی کس نے ادا کیا؟“

وہ اٹھ کر کھڑے لگا۔ وہ دنوں ہاتھ پتہ پر پابند تھے وہ رات کی ٹھنڈی ہوا میں کھلی چست پر کھلتا رہا۔

رات بھیلی ہے تیرے سر میں آج کل کی طرح چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح تجانے کہاں کس نے نور جمال کی آواز میں جو بصورت غزل لگائی ہوئی تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرے ہونے وسیلے لیکن اپنی آنکھ میں دھندلے ہوئے کھلے بول اس کی ساعوتوں سے آکر آئے۔

”رافعہ کانی یکدم آو اس ہو گیا۔“ اے طرح کے بد دعا اس۔ ایک عجیب تڑپ تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے دیکھنے کی تڑپ۔ اسے پانے کی تڑپ۔

پھر اسے کچھ چرے یاد آئے۔ اپنی ماں کا ٹکافتہ، مسکراتا چہرہ۔ اپنے باپ کا بار بار مگر پر شفقت چہرہ۔ اپنی بیوی۔ چچی کا آواز۔ مگر پر تیز لیکن چہرہ۔

وہ اتنے چہروں سے محبت نہیں بول سکتا تھا۔ وہ صرف خود سے جھوٹ بول سکتا تھا اور اب تک بول رہا تھا لیکن شاید اب اس میں بھی ناگام ہو چلا تھا۔

”رافعہ!“ اسے اپنے باپ کے الفاظ اب تک یاد تھے۔ ”تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ میری امیدوں“ آرزوؤں کا مرکز۔ تجانے کیوں ہر آپ کو اپنے بیٹے کے سر سر سنا سنا کی اپنی شدید تمنا ہوئی ہے۔ خیر۔ تمنا پوری ہونے میں تو ابھی وقت ہے لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں بیٹا کہ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے کی متنبہ علی ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت، ایک دوسرے کا مان ہیں اور ہم بزرگوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طاقت میں اضافہ کریں گے، کی نہیں۔ بیٹا! تم جوان ہو یتیم نہیں تمہارے فیصلے کرنے کا اختیار ہونا چاہیے لیکن اگر تم یہ اختیار اپنے والدین کو سونپ دو تو ہم مرستے دم تک تمہاری فرماں برداری پر مشغور رہیں گے۔“

”اب جیسا کہیں بابا!“ اس نے سعادت مندی سے کہا تھا۔

”جہاں صاحب کا عذر یہ عیش کے لیے ہے اور راجہ کا روہ کے لیے۔ اب تم تہاؤ تمہاری پسند کیا ہے؟“

”میرے پسند کیا ہے۔“ میں ہے بابا! میں نے کہا تھا۔ آپ کو اختیار ہے۔“

”تم نے کس کو پسند کیا ہے؟“

”عرشہ تو۔“ وہ بھجکا۔ اور کانی کی کم عمری اور قدرے نا سنجیدہ۔

”کہوں! اور رو رہے؟“

”رو رہے۔“ میں نہیں بابا! میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ جو آپ بہتر سمجھیں۔“

”کہوں! تمہارے بیٹا اب تمہاؤ کے ساتھ رہاؤ۔“ اس کے سونامی کا کام ہے۔

اور وہ مطمئن سا چلا آتا تھا۔ مگر رے ہوئے سالوں میں اسے کبھی یہ بات یاد نہ آئی تھیں لیکن اب اکثر یاد آتی۔

”جیسا کہیں بابا!“ اس نے سعادت مندی سے کہا تھا۔

”جہاں صاحب کا عذر یہ عیش کے لیے ہے اور راجہ کا روہ کے لیے۔ اب تم تہاؤ تمہاری پسند کیا ہے؟“

”میرے پسند کیا ہے۔“ میں ہے بابا! میں نے کہا تھا۔ آپ کو اختیار ہے۔“

”تم نے کس کو پسند کیا ہے؟“

”عرشہ تو۔“ وہ بھجکا۔ اور کانی کی کم عمری اور قدرے نا سنجیدہ۔

دیوار کے ساتھ گئے ہوئے چھوٹے گول میں بائی والے بونے ورد ٹھنکی تھی۔

”تھوکی میری میں ایک بے پروا و بھورت۔“ بھونے ٹھنکی! ڈورن کی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔

”اسلام علیکم۔“ وہ ٹھنکی سے مسکرائی۔

”ورد! اے بڑھاپے! اس سے ہاتھ لیا۔“

”ورد آئی! یہ ناعمہ کا چہرہ رہی تھیں۔“ تھوڑا بولا۔ ”میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔“

”اب! ناعمہ کی فرزند ہیں؟“ ورد نے دیکھی ہے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ بولے سے تھی۔ ”میں نے انہیں کالج میں دیکھا ہے۔ ویسے میرا نام فرید ہے۔ آپ کی تعریف؟“

”میں ورد ہوں۔ ناعمہ کی بڑی بہن۔“

”اب! ناعمہ گھر پر ہیں؟“

اسی لمحے کرے سے گولی کا تیز سروں میں گنگناہی بے فکر ناعمہ باہر نکلی تھی۔

گافی کہتا تھا سناجے مگر

منورامین کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سمجھتی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل میں موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوشنودہ ہو جاتی ہے۔ ربیعہ کا شمار کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منظرہ بیگم کریمہ کو اپنی بیٹی ہلاتی ہیں۔ ہاشم بود شملہ کی شادی کی تقریب میں ہی نایع اور عرشہ کا نکاح پر دعوا دیا جاتا ہے، جس پر عرشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابرار خیالی کا فون شملہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ شملہ شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شملہ کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔ فراز خود حقیقت ناعہ کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عرشہ کے لیے فراز کی تدبیریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز یہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعہ باتیں کرتی تھی۔ رابع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا عظم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا عاشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شملہ اب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلاسارے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شملہ ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ ووردہ کے مشورے سے ایم ایس شو سیالوٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاشر لڑا سے ملنے ہوئے آتا ہے تو لڑا اسے پر پوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً "صدے" لگ رہ جاتی ہے۔ ربیعہ ووردہ سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے یہ چل ہے کہ فون پر اپنی رابعہ سے ہو چکی ہے۔ لڑا سے صدے سے دو چار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رابعہ بھی اسے جلد بندی میں لایا گیا ہے۔ ووردہ کے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۵

چیسویں قسط

فریحہ نے بے حد اشتیاق سے بھولے چہرے والی ناعہ کو دیکھا تھا۔ ووردہ جو فریحہ کو بغور دیکھ رہی تھی، ان نگاہوں کی معنویت پر قدرے چونک سی گئی تھی۔ ناعہ بھی ایک اجنبی مگر خوبصورت اور خوش لباس لڑکی کو گھر میں دیکھ کر ہنسی۔

”ناعہ! آئیے فریحہ ہیں۔ تم سے ملنے آئی ہیں۔“ ووردہ نے نرم لہجے میں کہا۔

ناعہ نے ایک مرتبہ پھر گڑبگڑا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ”مجھ سے ملنے؟“ وہ حیرانی سے ناک چڑھا کر بولی۔

فریحہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ ووردہ قدرے بھنائی تھی۔

”اے فریحہ!“ وہ خود ہی بولی تھی۔ ”اندرا چل کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

فریحہ نے ہنوز مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ووردہ آگے بڑھی تو فریحہ بھی اس کی ہمراہی میں قدم بڑھانے لگی۔ ناعہ پہلے تو ہونٹوں کی مانند کھڑی رہ گئی پھر کچھ خیال آنے پر وہ بھی تیزی سے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھی تھی۔

”کیا میں آئی؟“ ووردہ نے شائستہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”کوئلہ ڈرنک یا پھر چائے؟“

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجئے

قرآن مجید کی ہر آیت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی روایتی احادیث میں آیت اور حدیث کے لئے شان کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ بالذات ان صحاح و بیانات میں جو آیت اور احادیث اسلامیہ خریفہ کے مطابق ہیں۔ جو خود بخود سے بخود بخود ہیں۔

ربیعہ نے فرخ چند کر کے لمحہ بھر کے لیے غور سے سنا پھر دو کوڑی ایک طرف ڈال کر تیزی سے اندر کی جانب بھاگی تھی۔ کر کے کا منظر اس کے ہاتھ پاؤں ہٹلا دینے کے لیے کافی تھا۔ منینہ بیگم بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کے پیٹ کے پچھلے حصے پر تھیں۔ وہ تھے اور وہ پری طرح سے گراہ رہی تھیں۔ ربیعہ دوڑتی ہوئی ان تک پہنچی۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔
”دوسرے درجہ سے“ وہ دوڑے کو تھیں۔

شدت ضبط سے ان کا چہرہ لپٹا ہوا تھا۔ انہیں گھر کے حلقوں میں اتاری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
”آئی۔ آئی۔“ ان کے من میں گونج رہا تھا۔ ”ربیعہ کے ہاتھ پیر پھیل چکے تھے اور عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

”میری بچی! میری بچی!“ منینہ بیگم نے بے بسی کی تھیں۔ ”میری بچی کو بلا دو۔“

”ربیعہ کی عقل کو اٹھانے کے لیے“ وہ دوڑے کو تھیں۔
”آئی۔ آئی۔“ ان کے من میں گونج رہا تھا۔ ”ربیعہ کے ہاتھ پیر پھیل چکے تھے اور عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

شہلا باپیل جانے کے لیے تیار کیے تھے اس مراحل میں تھی جب اس کے موبائل کی صیج بجی۔ غلبت میں کلاں پر نازک سی سلور ریشم واپس آجائے ہوئے وہ بیڈ کی سائیل پھیل تک آئی۔
اسکریں پر روشن کیم کے کھڑکس کے لیوں پر لگی سی مسکراہٹ آئی۔

”شہلا! آئی۔ آئی۔“ اس نے دوسری جانب سے منینہ بیگم کی آواز کی توقع تھی۔
”شہلا! آئی۔ آئی۔“ اس نے دوسری جانب سے منینہ بیگم کی آواز کی توقع تھی۔

ربیعہ کا نازاڑی نہیں الفاظ بھی اسے تھے کہ شہلا کا وجود کانپ کر رہا۔
”کیا کیا ہوا؟“ وہ بولا۔

”مجھے نہیں پتا۔ بس آپ جلدی آئیں۔“ وہ دوڑے کو تھیں۔
شہلا ایٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لمحہ بھر میں وہ مرکزی گیٹ پر تھی۔ سامنے ہی رافع اپنی بانگ اشارت کر رہا تھا۔ شہلا تیزی سے لگی۔

”رفاع! رافع! یہ کونسا شخصہ ای کے گھر لے چلا۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“
”کیا ہوا بھائی؟“ وہ بھی گھبرا گیا۔ ”کیا کیا ہوا؟“

”جائیں۔ بس تم جلدی چلو۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہوئے ہوئی۔
رافع نے بانگ دوڑا دی تھی۔

اس کے حال پر چھوڑ کر نکلے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ایقان نے دو دو کر رہا حال کر لیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی شرابیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔ اسے تو بس انتہائی علم ہو گیا تھا کہ غاشری زندگی میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اور یہ خیال سہلانہ برہنہ تھا۔ جتنا سوچ رہی تھی۔

موسم کو نوڈلر کا پلہ دے کر وہ فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر پھر کمرے میں چلی آئی۔ گھونٹ گھونٹ کر ٹھنڈا پانی اپنے اندر ڈالتے ہوئے اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ عاشر کو معاف کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ عاشر نے اس کے اعتماد کو بے حد ٹھیس پہنچائی تھی۔ اور بات صرف اعتماد کی کب تھی؟ یہاں تو عجب تھی جسے راکو پر بھی ہوئی تھی جس کے پیچھے وہ آکھیں مگر اسے اتنے سالوں سے چلتی چلی جا رہی تھی۔

ایقان کی نگاہوں میں گزشتہ زندگی کے سارے مناظر ایک ریل کی مانند چل رہے تھے۔ وہ کالج کا خوبصورت زمانہ، شہلا اور اس کی بے مثال دوستی کے دن۔ پھر شہلا کو ابراہار اور اسے عاشر مل گیا تھا۔ دونوں کی زندگیوں کے قریب ایک ساتھ ہی زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا تھا۔

ایقان اس حساب سے خوش قسمت نکلی تھی کہ اس کی محبت کو کسی بھی رکاوت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ عاشر کا رشتہ آنے پر جب گھر والوں کو اس کی عاشر کے ساتھ انوالو میں کھانا بھانا اور بھانسیوں کی پیشانیوں پر بل ضرور پڑے تھے لیکن کسی نے بھی ان دونوں کے باہر آجائے کی کوشش نہ کی تھی۔ سوائے فردوس بیگم کے جو اس کی شادی کا آخر میاں سے کرنے کی خواہش مند تھیں لیکن ان کے والدین نے ایقان کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے عاشر کا رشتہ قبول کر لیا تھا۔

عاشر ایک خیر، موصوفہ طبقے سے تعلق رکھتے والے تھے۔ ان کے خاندان میں جیسے والدین، رعایا تھے۔ ایقان کی صورت بہت سے خوبصورت خاویوں کی تعبیر مل سکتی تھی۔ لیکن اس کے خواہوں کا ایک بڑا حصہ حصول آسائش سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے آگے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ تھی۔ ایقان کے بہت روکنے پر بھی وہ خود کو آگے جانے سے نہ روک سکا۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں ہی وہ بچہ پیدا کیا۔ اگر کچھ بٹانا سے تو جلد ہی کے سمندر کی یاد کرنا پڑے گا۔ سو وہ کوشش میں تھیں۔ موصوفہ راکو ایک دن اسے سالوں کی عیال کی نوید سن کر جان چلا گیا۔

ایقان محبت کے پانی کی پھل تھی۔ اس کی زندگی میں سب کچھ محبت سے ہی عبارت تھا۔ لیکن محبت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر نہایت متقاہ صورت میں آنا اور خود پسندی کا جذبہ بھی اسی شدت سے موجود تھا۔

وقت محب اور محبوب دونوں بٹانا چاہتی تھی۔ وہ محبت میں پوجا کی قائل نہ تھی۔ کچھ وہ کچھ لو کا اصول اس کے اندر پورے توازن کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اتنے سالوں بعد ایک بچہ تو توازن اس طرح بگڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو پھینکی کی صورت تلاش سے یا ہر ذرا ہوا محسوس کر دیتی تھی۔ ایک تہی جو عضو عضو کو کرب میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے عاشر کو اتنا چاہا تھا کہ اس کی بے وفائی کا خیال اس کی رگ جال کو خنجر کی مانند کاٹ رہا تھا اور جتنا تڑپ رہی تھی کچھ گزرنے کا خیال انتہائی ہی ہوا جا رہا تھا۔

ایقان کو دوسرے گروہ سے ملا دھانے کے لیے فرج سے ہزراں ٹکڑی رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔

چند منٹوں میں وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ منیڑہ بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔
 نے انہیں سلام کیا۔ وہ پچھلے پچھلے ہو رہی تھی۔

شہلا نے اپنا فرسٹ ایڈ باکس منگوا لیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے انہیں فوری طور پر اپنا
 کرنے والی بین فکریٹ دی پھر سڈ پر کچھ لکھنے لگی۔

”رافع۔ پلیز انکجشن لاؤ۔ اگر امی کو آرام نہ آیا تو میں انہیں انکجشن بھی دے دیتی ہوں۔“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن آئی کو ہوا کیا ہے؟“

”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ شاید اینڈ کر

ہو۔ لیکن اینڈ کس لگتا نہیں ہے۔“

وہ منیڑہ بیگم کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ رافع فوری طور پر نسخہ لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”انفیکشن؟“ شہلا نے سوالیہ نظروں سے رابعہ کو دیکھا۔ ”کوئی نہیں اب تک۔“

”نہیں۔“ رابعہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اب آتی ہی ہوگی۔ عمر کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

عمر کے ذکر پر شہلا کے چہرے کے تناؤ میں قدرے کمی آئی تھی۔ وہ پھر منیڑہ بیگم کو دیکھنے لگی جو اب آہستہ

آہستہ کراہ رہی تھیں۔ ان کے درو میں کافی کی دوا بیچ ہوئی تھی۔ شہلا کافی متشکر انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”شہلا آئی۔“ آئی کو پہلے کسی آئینہ اور داٹھا ہے؟“ رابعہ ان کا ہاتھ دبا کر بوجھنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ کچھ پوچھنے لگی۔ ”بہسی کبھار ہلکے پھلکے سے درد کی شکایت کرتی تھیں۔ ہاتھ کی دوائیاں بھی

اکثر استعمال کرتی ہیں لیکن آتشا شدید درد۔ کبھی نہیں ہوا۔“

”آئی کا مکمل چیک آپ کروانا چاہیے نا؟“

”ہاں رابعہ۔“ شہلا نے کہا۔ ”اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ بھی پرکھ دیا۔“

رافع ہونے سے درد آواز بجا کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں شارٹنگ جو اس نے سائڈ بیگ میں رکھ دیا۔

”بہت شکر رافع۔“ شہلا نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ”میں نہیں پیسے دینا بھی بھولی تھی۔“

”بھلا بھی۔“ وہ سائی ہوا۔ ”کیسی غیروں جیسی باتیں کرتی ہیں۔ آئی میرے لیے بھی مال جیسی ہیں۔ اب ان کی

طبیعت کیسی ہے؟“

”آرام آگیا ہے۔ لیکن کل میں ان کا مکمل چیک آپ کرواؤں گی۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میں اب چلوں بھابھی؟“

”چائے پیتے جاؤ۔“ شہلا نے رابعہ کو دیکھا۔

وہ جلدی سے گھڑی ہوئی تھی۔ رافع نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”نہیں رابعہ۔ ایلیمنٹس میں چلوں گا۔ آپ ٹکلف میں نہ پڑیں۔“

”ٹکلف کیسا ہے چائے بننے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے؟“

رافع نے لمحہ بھر کے لیے نگاہ اٹھائی پھر بے بسی سے اوڑھ اوڑھ دیکھا۔

”بیٹہ جائیں نا پلیز۔ میں صرف پانچ منٹ میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ وہ شگفتگی سے مسکرائی۔ رافع کسی معمول

کی مانند کرسی پر بیٹھ گیا۔



”امی۔ امی جی۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو۔“ ”انقرہ‘ منیڑہ بیگم کی گود میں منہ چھپائے منمنارہی تھی۔ انہوں نے

مسکراتے ہوئے اس کے بالوں پر بارے ہاتھ پھیلا۔

”کچھ نہیں۔ تم لوگ تو کئی پریشان ہو رہی ہو۔ رسول میں نے بواکل انداز کھالیا تھا اور تم جانتی ہو؟“ انداز میں موافق نہیں آتا۔ رسول سے ہی ہلکا سا درد تھا۔ کل وہی درد بڑھ گیا۔ بد بھی ہو گئی تھی اور کچھ بھی نہیں۔
”لاڈلہ ڈاکڑ کی موجودگی میں آپ کی اپنی رائے کا وزن کچھ بھی نہیں ہے امی جان! ششلا معنوی عقل سے بولی۔“ یہ معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں، ہم خود تحقیق کریں گے مرض کی۔ آپ کل میرے ساتھ ہسپتال چل کر رہی ہیں۔“

”امی! جی ڈاکٹر ہو تو مدد دیں۔“ وہ ہنس دیتی۔ ”مرض خود بتا رہا ہے اپنے مرض کے بارے میں اور تمہیں کچھ بتا رہی نہیں چل رہی۔ ششلا پر بارود دار ہے تشخیص کا ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر اور حکیم نبض پکارتے ہی مرض پکڑ لیا کرتے تھے۔“

ششلا اور انقضا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے لگتیں۔

”یہ تو آج ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ انقضا نے تائید کی تھی۔ ”جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی بڑھتی جا رہی ہے انسانوں کی اپنی قابلیت سختی جا رہی ہے۔ آج کا ڈاکٹر جب تک دس سیسٹنٹ نہ کرے گا، کچھ تجویز نہیں کرتا۔“
”ہاں تو اپنے پاس ہی رکھو اپنی ڈاکٹری کو۔“ ان ٹیکنیٹان سے یہ پتہ چلا رہا تھا کہ بولے بولی تھیں۔ ”میں اپنا نسخہ خود تجویز کر چکی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

”اسکند میں انداز نہیں کھاؤ گی۔“

ششلا اور انقضا نے برا سامنا بنایا تھا جبکہ راجہ کی ہنسی لگی تھی۔

ورد کا بیڑا جو ش سے انداز میں مال کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ راجہ بیگم نے گردش کیے کی تیل ہاتے ہاتے اس پر ایک ٹکاؤ لایا اور پھر مسکرائیں۔

”امی! آپ کا کیا خیال ہے؟“ ورد نے دم حمس آواز میں پوچھا۔

”کس بارے میں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”فوب! اسی لڑکی فریح کے متعلق۔“ اس نے اوپر اُدھر دیکھ کر ناعملہ کے موبو فون پر ہنسنے لگی۔

”ہو! وہ لڑکی تو کبھی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”امی! یہی۔ اس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی بہت اونچے اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ہے یا؟“

راجہ بیگم نے گردش اور دھماکا ایک طرف رکھ دیا اور قدرے شہید کی ہوئیں۔

”لیکن ورد! اپنی ناعملہ تو بہت بوگنی کی ہے ابھی۔“ مجھے تو رورہ کر کی خیال آ رہا ہے کہ مجھے ناعملہ کا رشتہ خاندان میں ہی کرنا چاہیے۔ اپنے بچہ اپنے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن اپنے خاندان میں اب بے کون؟“ وہ قدرے تجزیہ کرتی گئی۔ ”اور جسے نافع اور عرش کا نکاح ہوا ہے“

”نہیں! میں خاندان میں رشتہ ہونے سے خوف سا رکھتا ہوں۔“ ششلا نے کہا کہ بات سے جو ان لوگوں کی خوشیوں کو کھنسا لگ گیا ہے۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں کون سی اور مالی دنیا میں رہنے لگے ہیں جو جیتھو کو قبول ہی نہیں کر پاتے۔ خیر یہ تو ایک بے معنی سی گفتگو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ لوگ ناعملہ کا رشتہ لے آتے ہیں تو کہ ایک لازمی بات ہے تو پھر ہمارا جواب کیا ہو گا؟“

راجہ بیگم کے چہرے پر تفکرات کے سائے پھیلے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ورد! اجائے کیوں مجھے بھی وہاں سے لگے ہیں۔“ راجہ نے بول تو ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا لڑکا ہے لیکن۔ لیکن تمہاری طرف سے یہ کچھ زیادہ ہی بے نیاز لگتا ہے۔“ جیسے جیسے اسے اس رشتے کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو۔

”فوب!“ ورد نے سر پیٹ لیا۔ ”امی! یہ تو سوال گندم جواب چناؤ لی مثال ہوئی۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اپنی ششلا ناعملہ کی بات کر رہی ہوں۔“ ناعملہ کا رشتہ طے ہو جانے سے زیادہ اب مجھے تمہاری فکر بھر دے گا۔“ انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”ناعملہ کا رشتہ طے ہو جانے کے بعد اگر انہوں نے فوری شادی کی فراہم کی تو میں کیا جواب دوں گی؟“

”نہیں؟“ ہم ناعملہ کی شادی کر دیں گے۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”پھر ششلا اور آپ عیش کریں گے یہاں۔ وہ معنی کرتی تھیں۔“

”ہی! ہائی! ہولی ساری چیزیں کھا جانی ہے۔ کیا ہوا ہے اس نے مجھے۔“

راجہ بیگم بولے مسکرائیں۔

”میں ان کی بات سن رہی ہوں۔“ ورد نے اصل بات یہی کہ عذر دیا تھا ابھی راجہ کی شادی کی بات نہیں کریں گی۔

”میں اور سردار کی ابھی نہیں بات نہیں چلی۔“ ششلا نے انہوں نے تمہیں تیس سال ہوئی بٹھا کر رکھنا ہے۔“

”تو آپ کو کابے کی گھر ہے؟“ ان کے لئے لاؤ سے ان کے گلے میں بائیں ڈالیں۔ ”میں خود نہیں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ساری عمر۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”مجھی بات سنو۔“

ہاشم نے اپنے سوال کے جواب میں اس کے بدلے ہوئے تاثرات کو بے حد دھیان سے دیکھا۔ اسے احرا ہوا تھا کہ شہلا کا وہاں سے جانے کا موذ میں ہے۔
 ”میں چلوں پھر؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

شہلا چونکی تھی۔ اس نے ہاشم کا سوال یاد کیا پھر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”میں بھی چل رہی ہوں آپ کیلئے ہی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟“

ہاشم ذرا سا مسکرایا ”لگ رہا تھا کہ کیلئے ہی جانا پڑے گا۔ چھٹی جس الارم بج رہی تھی۔“

”کیسے تو آپ کی چھٹی خرس کا علاج کروں۔“ صحیح صحیح کام نہیں کر رہی یہ۔“ وہ اپنا پینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے

یونہی بولی۔
 ہاشم ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھنے اور مسکرائے پر مجبور ہو گیا۔ شہلا کے انداز میں جیون ساتھی والا رنگ ابھرنے لگے تھے اس کی روزاؤں والی اجنبیت میں کئی آتی جا رہی تھی۔

”چھائی ہی نہ! میں اب چلتی ہوں۔ کل آپ سے ملنے آؤں گی۔“ وہ انام پر ہنس رہی تھی کہ ایک جگہ میں اس کی اور ریمہ کو بھی یاد پائی کہ رانی ہے۔

”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“ وہ بھی مسکرائی۔ ”ریمہ تو میرے منہ بھٹ کا صاحب رکھتی ہے۔ وقت پر کھا

وقت پر دو لائی۔ بیٹیوں سے بڑھ کر کوئی بے میرے لیے۔“

اندرا داغ ہوئی ریمہ نے ان کے چلنے سے اس کی طرح ہلکی ہلکی ہو کر مسکرائے لگی جیسے ہر ریاضت کا حائل

پالیا ہو۔ شہلا نے بھی اس کا پتہ بہت محنت سے دیکھا تھا۔

ریمہ کی ہم راہی میں اندر آ کر بھاگ کر شہلا لے لیں گیا تھا۔

”لانا۔“ اب جا رہی ہیں پھر۔

”نعم۔“ ریمہ نے اسے پکارا۔

”نہیں۔“ وہ ضد کی بین سے بولا۔

”میں آج ماما کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بہت دنوں سے ماما کے ساتھ نہیں

سویا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔“

”جھوٹ۔“ ریمہ نے اسے ایک ہیبت لگائی۔ ”روزانہ میں تم کو کھانی ملتی ہوں اور تم کھانی ختم ہونے سے

پہلے ہی سو جاتے ہو؟“

”تو میں کیا کروں۔ آپ کی کھانی اتنی لمبی ہوتی ہے۔ اور رنگ ہونے لگتی ہے تو میں سو جاتا ہوں۔“

”ریمہ! اس کے کپڑے اور یونیفارم وغیرہ رکھ دو۔“ شہلا نے محبت سے اس کا سر ہلایا۔ ”میں اسے اپنے

ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔“

”ہرے۔“ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

مال بیٹہ کی خوشی دیکھ کر پھر کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

آپ کے سارے دو سرے نہیں ملتا
 لفظ کے بیچ د ختم کھنگالے ہیں
 ”پیار“ بھی ہے ”ریا“ نہیں ملتا
 اپنی مسکرائیوں میں خدا صوفیائے نہیں اب ملتا
 بت کدوں میں

”رائف“ ”خدا“ ”لا“ کے پچھلے بڑے لان میں منسل رہا تھا۔ دماغ پر بجائے کیوں ایک پڑا ہوا مجھوس ہوتا

جائے۔ وہ اس پوجہ کو خود پر سے اتار کر پینک دینا چاہتا تھا لیکن کسی طور کا سیانی نہ ہوتی تھی۔ ایسے عالم میں لفظ سے

خط بڑ گیا۔ خیال سے خیال بڑ گیا اور غزل ہوئی گی۔

وہ گھاس پھوس سے بھرے ہوئے حوض کی منڈر پر بیٹھ گیا۔ وہ مسکرت نہیں پتا تھا لیکن بجائے کیوں اسے

پتہ نہ تھا کہ کچھ کچھ کی طلب ہونے لگی تھی۔ ذہن میں بھرا ہوا دھواں کسی ہمارے نکلنے کا جی چاہے لگا تھا۔

نجانے وہ آسمانی رنگ آٹا کیوں پہنتی ہے؟ شاید اسے علم ہے کہ آسمانی رنگ اس کی صحیح رنگت بہت چٹا ہے۔

اس رنگ میں اس کی سیاہ آنکھوں کی ایک اور سیاہی مزید بڑھ جاتی ہے۔ شکر کی بیوں کی سکان اور جھلی معلوم ہوئی

ہے۔ شاید!

لیکن نہیں۔ وہ تو خود اسے اتنی بے نیاز مجھوس ہو چکی ہے، ہنسی ہائی دینا ہے۔ اس کا دھیان تو بجائے کہاں رہتا

ہے۔ بادلوں پر۔ چاند کی چاندنی پر۔ ان ہی دنیا میں۔ کیوں کی عمری میں۔ شاید وہ خود بھی دیر سے آئی ہے۔ وہ

پتہ نہیں لگتی۔

”کسی نے اس کے کانٹے پر ہاتھ رکھا تھا۔“ رائف اپنی ہی پڑا پھر اس نے ہاشم کے مخصوص ”Gucci“ کی

خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈر پر بیٹھ گیا تھا۔

”تو بے طے ہے کہ تو اس سے محبت کر کے لگا دیتے۔ میرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“

رائف خاموشی سے مینا رہا۔ ہاشم کے اس تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔

”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رائف نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی چکا گئی ہے تو اب تو تجھے سونا

چاہیے۔“

ہاشم اس کی بات پر دھیرے سے فس پڑا۔

”کیوں؟ شاید محبت کا اختتام ہے۔“ جیسے لامانی جملے پر تیرا قیاس ہے کیا؟“

”نہیں۔“ رائف بھی مسکرایا۔ ”میرے کئے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں

جدائی رت جگے دیتی ہے تو تمہیں کی قیمت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے آؤ جیسے لگتے

ہیں۔“

ہاشم زور سے ہنسا پھر فقط خاموش ہو گیا۔

”یار رائف! تو کچھ دیر بعد بولا۔“ یہ دن اسے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن

وہ محبت کی قیمت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے ہندے کو؟“

رائف چونک سا گیا۔ ہاشم کے لہجے میں کچھ تھا۔

”تو اکثر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے مختار سا ہو کر پوچھا۔

اس کے گھر کا پتہ نہیں ملتا
 ہم کو اک رہنما نہیں ملتا
 ایک عالم کو چھان بیٹھے ہم

”اوتھیں یا سنا شکایت تو جب بھی ہوئی، مجھے اپنے آپ سے ہوگی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔
 ”خدا نہ کرے۔“ رافع بددلیا۔
 ”چھا، غزل سنا۔“ ہاشم قدرے بے فکری سے پھیل کر بیٹھا۔
 ”کون سی غزل؟“

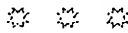
”جو ابھی وارد ہوئی ہے۔ ایسی رات اور ایسی شمالی۔ شاعر غزل نہ کہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“
 رافع دھیرے سے ہنس پڑا۔ ہاشم یا رغار تھا۔ اس سے کچھ بھی چھپانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اسے غزل
 سنانے لگا۔ ہاشم بخور سن رہا تھا۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔“ پوری غزل سن کر وہ بولا ”خواہش کی رنگین تلی۔ تصور کی سین نگار
 سے نکل کر اب حقیقتوں کی دنیا کی جانب نحو سفر ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”تیری غزل کا وہ ماورائی، تصوراتی رنگ غائب ہو رہا ہے۔ جس میں صرف محبوب کو سوچنے سے ہی خوشی بلکہ
 روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ تیری سوچ میں اب لا حاصل کی تلخی اتر رہی ہے۔“ رافع خاموش سا ہو گیا۔ شاعر
 ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا۔
 ”یار شاعر! خوش رہنا چاہتا ہے تو۔ اسی تصوراتی دنیا میں لوٹ جاسے۔ محبوب کو سوچ اور بس سوچ۔
 جہاں اسے اپنے کی خوشامی۔ وہیں سے سوچ کا رنگ زار شروع ہو جائے گا اور ترنما شاعر کی صورت دوسرا اور
 دور ہوتی چلی جائے گی۔“

UrduPhoto.com

”ہاشم! وہ دھیرے سے بولا۔
 ”ہوں؟“
 ”تیرے ہنس سگریٹ ہے؟“
 ”رکھتا تو ہوں۔“ اس نے جیب پر ہاتھ مارا پھر ٹول کر ایک سگریٹ برآمد کی۔
 رافع نے اس سے سگریٹ لے کر سلگائی اور بہت سا دھواں چھوڑا۔
 ”بس اب تو جا۔“ پھر وہ بولا۔
 ”اچھا۔“ ہاشم حیران ہوا پھر گری سا اس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں۔“
 پھر رافع پر ایک ترحم بھری نظر ڈال کر وہ دھیرے دھیرے قدم بدھاتا چل پڑا تھا۔



شہلا کا ڈیوٹی نام شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہ تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے اس نے ایک نظر لاؤنج کی دیوار پر
 نظر آتے والے کلاک پر ڈالی۔ محض آدھا گھنٹہ ہی رہ گیا تھا۔ اس نے پریشانی سے ماتھے پر آتے بال بازو سے ہٹائے۔
 فردوس بیگم کچن کی ہر ذمہ داری اس کے سپرد کر کے خود ہر فرض سے سبک دوش ہو چکی تھیں۔ عریضہ کا گھر میں
 ہونا نہ ہونا بالکل برابر تھا بلکہ شہلا کو اس کی صورت بھی ہفتہ میں دو تین بار بمشکل نظر آتی تھی۔ ایسے میں شہلا کو
 اپنی ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھنے میں کافی دقت پیش آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے، مجھے کچن کے لیے ایک عدد ملازمہ رکھ ہی لیتا چاہیے۔“ اس نے پاش پاش میں روٹی رکھتے
 ہوئے سوچا۔ ”میں ہاشم سے کہتی ہوں، وہ اس سلسلے میں اپنی امی کو خود ہی قائل کر لیں تو میسر ہو گا۔“
 روٹیاں پک چکی تھیں۔ شہلا نے سنک میں ہاتھ دھوئے ہوئے اپنے آج کے ڈریس کے متعلق لمحہ بھر کے

لے سوچا پھر مطمئن ہو کر کہہ لایا۔

کیا بات تھی جتنکے ہوئے وہ جیسے ہی مڑی اس کی چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ کہن کے دروازے پر ایک بڑے ذیل ڈول سانوا آوری کھڑا تھا۔ اس کی سرخ نظریں شملہ کو اپنے وجود کے آریار گردن محسوس ہوئیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔

”اب کے ہاں بھول کر اسلام کرنے کا درواج نہیں ہے کیا؟“ وہ پولا۔

تب شملہ کے حواس دھیرے دھیرے ابھیں لوٹے۔ اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔

”اویسہ“ اس کے لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”اسلام! وہ علیکے کک۔ کیسے ہیں آپ؟“

”وہ ٹیکم السلام“ وہ مسکرائے۔ ”موتہ تھے ہی ہیں شملہ! بیگم! جیسا آپ کی دوست چھوڑ گئیں ہیں۔“

”وہ گاؤں۔“ شملہ نے دل میں سوچا۔ ”یہ اختریاں اب تک۔“

”اب کو خدا کی مبارکباد۔“

”شکر ہے۔“ وہ جھٹکا بولی تھی۔

اختریاں کہن کے دروازے پر جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلنے کے راستے پر کھڑے تھے۔ شملہ کو کوفت لگتی تھی۔

”اگر آپ کو کوفت ہے تو بتائیے۔“ اختریاں نے جیسے اس کی کوفت اور بیزار محسوس کر لی تھی۔ وہ کہن کے دروازے پر سے ہٹ کر نکلے ہوئے۔

”جی۔ جی ضرور۔“ شملہ نے اپنی کوفت کو جی لا کر کہن دیوانے کی کوشش کی۔

اختریاں باہر نکلتے تھے۔ شملہ نے جلدی جلدی سامنے پہن چوڑے پر در احاطہ تب ہی اس کے انڈوں میں ہلکا

دلی آواز آئی تھی۔

”اے بھئی۔ تم بھر تین برس۔ ہمارا سکون سلامت نہ رہتا۔“ یہ جتنا جتنا ادا دھارے خدوں

تیکم کے اور کسی کا ہو سکتا تھا۔

”بائی۔ کوئی سلام دعا کا موقع بھی دے دیا کرو۔“ اختریاں نے تھکے۔ ”میں دیکھتی ہی تم تو یوں کونے دی ہو جیسے ہم تمہارا بچہ نہ بھاگے ہوں۔“

”ہماری عزت کا ہمارا وقار کو کوئی کا کر جاتے ہو تم بھیا۔ اور بھلا کیا کرے اور؟“ دلی نے گھر میں سے۔ کیا

سوچے گی کہ تمہارا بے ”شر فنان“ علیہ دیکھ کر۔“

”ہا۔۔۔“ وہ بھئی تھکے۔ ”جھکا۔ تو یہ کمر تنائی تمہیں۔ کوئی بات نہیں باقی۔ زمانہ بے اختیار چل رہا ہے۔“

سرخ لہو تو اب شاید ہماری ہی گردنوں میں دوڑ رہا ہے جو ہم ”پہلوں“ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ ویسے ”دلی“ دلی کی بات بھی خوب کی تھی۔ ہم کیا لے جاتے نہیں۔ ہا۔۔۔“

”رُبے میں چائے اور بکٹ لے کر آئی شملہ کے ذہن کو جیسے کزن کا قہقہہ لہو بھر کے لیے خشکی۔ اس نے اپنا

چہرہ سوچا۔ وہ ناہمو محسوس کیا پھر گرم گرم لبوں اس کے پورے جسم میں گردش کرنے لگا۔ اس نے رُبے اختریاں کے سامنے تقریباً غصے سے بولی تھی۔

”فروں نے تیکم کے حیرانی اور قدرے خشکی سے اسے دیکھا جسے اس بدتمیزی کا مطلب جاننا چاہتی ہوں۔ شملہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کو کھولتے تھے پھر لہو بھر سوجا۔ اس کے بعد وہ لب کاٹنے ہوئے مڑ گئی۔ تھکے تھے ذہن اور بڑھریہ اعصاب کے ساتھ وہ بیٹھیاں چڑھتی اپنے کمرے تک چلی آئی تھی۔ اسے آنا دم ہو کر اپنی بیوی پر پہنچا تھا۔ سوچوں میں اچھ کر خود کو تھکانے سے کچھ حاصل ہی نہ تھا۔“



پہلوں کو اپنی دینی ریبیہ کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ لکڑی کے بھیلے سفید چائیک کے دوسری جانب ورہ کھڑی تھی۔ ریبیہ نے چائیک کیاری میں ڈال دیا اور تیز قدر میں سے پتلے ہوئے چائیک تک آئی۔

”اسلام! علیک۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”وہ شکر آتے ہوئے اس کا استقبال کرنے لگی۔“

”وہ علیک السلام۔“ ورہ اندر چلی آئی۔ ”کیسی ہو ریبیہ۔“

”وہ بالکل ٹھیک۔“ آواز دہرائی تھی۔ ”وہ اندر بیٹھے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ ختم کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ انقذہ اپنے کمرے میں اسٹڈی میں مصروف تھی جبکہ منیزہ بیگم صبر کی نماز سے فارغ ہو کر چائے کی برقی تھیں۔ ورہ کی آمد پر دو دو بچوں ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھیں۔

”اے تے سالوں میں تم کیسی مجھ سے ملنے نہ آئیں اور ریبیہ سے دوستی ہوئی تو اس سے ملنے آئی ہو۔“ انقذہ نے

ایک دھڑکنے والے انداز میں شکایت کی تھی۔

”وہ تو تم ٹھیک کر رہی ہو۔“ ورہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی باقی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ریبیہ۔ جی تو مجھ سے ملنے آتی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کیسی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی لیا۔“ انقذہ نے ہنس دی۔ ”یہ سب ہی نفسیہ ہے۔“

”یہ ریبیہ نے ہی لایا۔“ منیزہ نے تیکم کے ہاتھ سے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا اپنی ہے سب ہی

گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“

ریبیہ نے چائیک کی برقی لے کر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔

”وہ بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔“ ورہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی باقی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ریبیہ۔ جی تو مجھ سے ملنے آتی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کیسی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی لیا۔“ انقذہ نے ہنس دی۔ ”یہ سب ہی نفسیہ ہے۔“

”یہ ریبیہ نے ہی لایا۔“ منیزہ نے تیکم کے ہاتھ سے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا اپنی ہے سب ہی

گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“

ریبیہ نے چائیک کی برقی لے کر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔

”وہ بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔“ ورہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی باقی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ریبیہ۔ جی تو مجھ سے ملنے آتی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کیسی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی لیا۔“ انقذہ نے ہنس دی۔ ”یہ سب ہی نفسیہ ہے۔“

”یہ ریبیہ نے ہی لایا۔“ منیزہ نے تیکم کے ہاتھ سے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا اپنی ہے سب ہی

گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“

ریبیہ نے چائیک کی برقی لے کر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔

”وہ بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔“ ورہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی باقی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ریبیہ۔ جی تو مجھ سے ملنے آتی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کیسی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”آئی! عباد بھائی کے ایک دوست ہیں فرازا احمد ہیں نا؟“

”ہاں ہاں! فرازا تو ہمارے گھر کے ایک فری مینڈ ہے۔ ہمارے لیے تو وہ عباد جیسا ہی ہے۔“

”چاہے“ وردہ خوش ہو گئی۔ ”میں دراصل یہی جانتا چلا رہی تھی ان کا فیملی بیک گراؤنڈ، خاندان کے،“

”غیر سب کے ہیں؟“

”سب ہی بہت اچھے ہیں۔ دو بیٹیں اور دو بی بیات ہیں۔ سب ماشاء اللہ سلیحے ہوئے، پڑھے لکھے افراد ہیں۔“

”وردہ کے چہرے پر چمک اُٹی تھی مسنیزہ بیگم کے الفاظ اور انداز بہت حوصلہ افزا تھے۔“

”پہلے یہ تو تانکے بات کیا ہے؟“ انقید نے اسے گھورا۔

”بات یہ ہے کہ فرازا، بہن فریڈہ ہمارے گھر آئی تھیں ان کی باتوں سے اندازہ ہو کر وہ لوگ ناعملہ میں انٹر“

”پڑی گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ انقید بھی خوش ہوئی۔ ”ان دونوں کی جڑی تو خوب ہے۔“

”فرزا بھائی تو مجھے رستم نظر آئے، اسیل، سمجھتی ہوں ان سے۔“

”اسے نہیں انقید پالینے۔“ وردہ دلچسپی سے انداز میں بولی۔ ”میری تو ان لوگوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ“

”محض میرا اندازہ ہے ابھی تم ان سے کچھ مت کہنا، ورنہ ہمارے محض کیا خیال کریں گے۔“

”تم نے گھر پر وردہ بیٹی۔“ مسنیزہ بیگم نے اسے تسلی دے کر کہا۔ ”ہمارے گھر سے ایسا کوئی ذکر نہیں ہو گا اور ہمار“

”تک ان لوگوں کا تعلق ہے، وہ بہت اچھی فیملی ہے۔ ہر لحاظ سے اچھی۔ اگر رشتہ آئے تو قبول کرنے میں تامل“

”کرتا۔“

”بہت شکریہ آئی!“ وردہ مسنیزہ سے بولی۔ ”میرا بیٹا تو کتنا اچھا ہے۔“

”یہ ناعملہ، تمہارا بوجہ کب سے ہو گئی؟“ انقید حیرت سے پوچھا۔

”وردہ نے اس کی بات پر غور کیا پھر خود بھی اس کی باتوں میں شریک ہو گئی۔ چائے لے کر اندر داخل ہوتی رہی۔“

”نئے وہیمان سے اسے دکھاتا تھا، مٹی مٹی آنکھوں والی تصویر، نکت کی حامل وردہ واقعی پرکشش تھی اور ہنسی اس“

”کے چہرے پر لگتی تاڑے آئی تھی۔ رہیہ نے دل سے اس کے پیچھے مسکراتے رہنے کی دعا کی۔ بچائے کیوں یہ“

”لو کہ اسے بہت اپنی اپنی ہی لگتی تھی۔“

”کوہر سے پانی لے کر وہ جیسے ہی چلی، لمحہ بھر کے لیے ٹھیک کر رک گئی تھی۔ سن گاہیں نیلے وہ مقابل تھا۔ ایقان“

”ان نگاہوں میں دیکھنا چاہتی تھی سو پانی لے کر سائز سے نکلے گی۔ عاشر نے اس کا رستہ روک۔“

”یہ کون سا اصل کھیل رہی ہو تم میرے ساتھ ایقان!“ نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی پتا چلتا تھا۔“

”کھیل؟ کھیل کا مطلب جانتے ہو تم عاشر صاحب؟ میں ایک کمزور عورت بھلا کون سا کھیل کھیل سکتی ہوں؟“

”کھیل تو تمہارے جیسے عرو کیلئے ہیں۔ ہم عورتوں سے۔“

”یہ کیا گفتاری ہے!“ وہ جھنجھکیا۔ ”میرے واپس جانے میں محض تین دن رہ گئے ہیں۔ محض تین دن۔ اور“

”تمہیں تم اپنی ہر ذمہ داری، ہر تعلق کو پس پشت ڈال کر گھر واپس کیے جانے کی باتیں مصروف ہو۔“

”ذمہ داری۔“ نفق۔ ”ایقان سے بھرا ہوا گلاس سبک میں دے مارا۔“ میں یاد رکھوں اپنی ذمہ داریوں کو۔“

”تم تعلق بناؤں گے اور تم!“ اس نے انقید سے عاشر کی جانب اشارہ کیا۔ ”تم آزاد ہو چکی ہو کروال ڈال پھرے“

”یہ کیا ہے؟“

”تم نے آپ سے پوچھا اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس“

”سوال کا جواب تمہیں اللہ سے سوا کیا نہیں دے سکتا۔“

”دیکھ اس کے قہر سے کڑ کر رہا ہے۔“ عاشر نے اس کا بازو اس سختی سے پکڑا کہ اس کی انگلیاں ایقان“

”کے بازو میں کبھی نہ گئیں۔“

”اسے چھپتے ہوئے وہ کمرے میں لایا اور بستر پر دے مارا۔ ایقان کے لبوں سے جھٹکی جھٹکی سی چیخیں برآمد ہوئی“

”تھیں۔“

”تم مجھے میرے لہجہ پر رہے کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ کیا کر لیتیں تم اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو؟ کیا کر سکتی“

”تھیں؟ تم اس میں اس کی رازوں اور حسن کا پورا نہ بن جاتا اور اس دنیا کی میں کم تو بیٹھ کے لیے جھوڑتا؟ بولو۔“

”جواب دو؟“ جواب نہ دے سکتی تھیں۔ ”میرا اور کیا کرنا چاہتا ہے؟“

”ایقان بستر پر گر کر اسے خلی نظر میں سے دیکھ رہی تھی۔“

”ایقان بیگم آگم نہ جانے کون سی فیملی تھیں زندہ ہو۔ آجکے سکول کر دیکھو کہ اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔“

”کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر اگر خراب ہونا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں بیوی تو ایک بہت کمزوری“

”شے ہے۔“

”ایقان کی آنکھوں میں کچھ آسو آگئے تھے۔ ایک تک اسے دیکھے جاری تھی۔“

”میں نے اس کا کچھ نہیں کیا۔“ عاشر نے اس کی طرح مہم کرنے کی ضرورت پیش آئے سمجھیں تم!“

”وہ خراب ہونے کے بعد شفا کے بعد ان کی زندگی بگڑا رہی تھی۔“

”مردوں کی زندگیوں میں ایسے چھوٹے موٹے واقعات آتے رہتے ہیں۔ ہوا کے جھوٹے کی مانند عورتیں آتی“

”ہیں اور جلی جاتی ہیں۔ اور ہوا کے جھوٹوں کے پیچھے کوئی نہیں بھاگتا۔“ عاشر نے اس کی کوشش کر۔“

”ایقان نے اپنے چہرے پر بے یار و بالا کچھ کرکھڑی ہو گئی۔ پھر وہ قدم قدم پاتی اس کے سامنے جا کھڑی“

”ہوئی۔“

”ہوا کے جھوٹے کی مانند اگر کوئی میری زندگی میں بھی آجائے مسٹر عاشر اب بھی تمہارے خیالات یہی رہیں“

”تھے۔“ عاشر نے اس کی باتوں سے دلچسپی نہ لے کر اسے جواب دیا۔ ”وہ غریبا تھا۔“ تم نے صرف میری محبت دیکھی ہے۔ اسی پر قناعت کرو۔ اس“

”سے آگے جانے کی کوشش کی تو تھوڑے ہی دن میں کل ہو۔“

”وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ بچائے کیا بات تھی چہرے پر اشتیاق کیوں کے باندھو اسے روانہ نہ کیا تھا۔ کھلی“

”آنکھوں سے دھوا کو کھینچتے ہوئے وہ بچہ سے کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔“



مندی مندی آنکھوں سے شملہ نے ٹائم دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ وہ اندر کر بیٹھ گئی۔ آج اس کا آف

ڈس تھا۔ اس نے وہ پیر بہت مزے سے سونے میں بتادی تھی۔

اس نے اپنے برابر خالی جگہ پر نگاہ کی۔ عمر کو اس نے اپنے ساتھ ہی سلا یا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا بجائے کہ وقت وہ اسے سو ناچھو ذکر کرے سے نکل گیا تھا۔

شمال نے اپنے بال سینے اور اٹھ کر لاشیں آن کیں۔ پھر وہ دواش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر پٹکون اعصاب کے ساتھ چائے کی طلب لیے وہ کمرے سے نکلی تھی کہ میز پر بیٹھ کر پڑھ کر رہی تھی۔

”یہ جھوکر تو جان کو آگیا ہے۔ ابشتا شیطاں اُتارتا شریر۔“ فردوس بیگم کا بارہ نہایت ہائی ہو رہا تھا۔

شمال کی نظر باہم کے گلے پر پڑی تو اونہا ہوا کر ٹوٹ گیا تھا اور عمر اس کے قریب کھڑا نہ ہو سکا تھا۔

”مجھے کیا پتہ۔ آپ لوگوں نے رستے میں گلے رکھے ہوئے ہیں۔“ وہ اپنے انداز میں بولا۔ ”یہ کوئی جگہ تو نہیں۔“

پوچھ کر اس نے انہیں باہر بھیجے۔ ”آپ لوگوں کا لان کتنا بڑا ہے۔“ اسے لگام نہیں کا۔ ”انہوں نے اس کی کمر ایک سو پچاس سو روپے کی

شمال کے دل کو تجلے کیا ہوا تھا، وہ بھر میں بیٹھ گیا۔ ”آپ نے اس کے عمر کو کتنے سو روپے لپٹا لیا۔“

”آپ نے اس کے عمر کو کتنے سو روپے لپٹا لیا۔“ اس نے اس کی طرح ٹرٹ نہ کریں بچوں سے غلطی

ہو جاتی ہیں۔“ اس کا بھڑکنا بڑھتا ہوا تھا۔

”بی بی! ہمارے گھر میں بچوں کو لوگ کا تیر نہیں جانتے۔“ سمجھیں تم۔ ”انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ ”اتنا ہی لاؤ

کا لٹو ہے تو بے تانی اماں کے کمرے۔ ہم نے تو پہلے دن اپنی صاف کمرہ دیا تھا کہ ہم بوتلے جارہے ہیں۔ پھر ہمارا

اپنا خون ہی ہو گا۔ پھر بھی ہر روز کمرے میں مونک لگاتے۔ ”وہ اس کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ ”وہ اس کے کمرے میں بیٹھ گیا۔

”میری عرش کتنے شوق سے لاتی تھی۔“ سب سنا سنا کر کھڑے ہوئے۔ ”وہ بڑا ہی تھی۔“ شمال انکھوں میں آنسو

بھرے لب کاٹ رہی تھی۔ ”عمر نے سنا تھا کہ اس کا چودہ تھا۔“

”وہ آئی ایم سوری ماما انہوں نے میری وجہ سے آپ کو ڈانٹا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے بے حد ضبط سے خود پر قابو رکھا تھا۔“

”چلو بیٹا! ہم ہاتھ دے کر چلتے ہیں۔“ اس نے بے حد ضبط سے خود پر قابو رکھا تھا۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے سنا لیا۔ ”میں واپس نہیں آؤں گا ماما۔“ اس نے اپنے کان پر ہنسنے نہیں ہے۔ آپ واپس

آئیں گی؟“

شمال کاٹ کاٹ کر میز چوٹی کی جانب بڑھ گئی تھی۔

”نہیں یہ کیا کہہ رہی ہو ایقان تم۔“ غمزدار بیگم خوف سے چلی بڑی تھیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی بیگم۔“ اس کے بچے کی استقامت سے انہیں مزید خوف محسوس ہوا۔ ”اور

آپ جانتی ہیں میں کس قدر خدشہ کی ہوں۔“

”لیکن ایقان۔۔۔ اماں۔۔۔ تمہارے بھائی۔“ وہ ہچکا کر رہ گئیں۔ ”تم نے اماں سے ذکر تک نہیں کیا اور اب

مجھے بتا رہی ہو۔“

ایقان نے ہنسی سانس بھری، وہ اپنا ضروری سامان اور بچے لے کر وہ پیر میں ہی ”حیات دلا“ چلی آئی تھی۔ سارا

دن عجیب بے کلی میں گزرا تھا۔ دل کو کچھ نہ لگے ہوئے تھے۔ اماں کے سوجانے کے بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

غور کیا کہ اس نے سب احوال کہہ ڈالا تھا۔

”اماں کو میں بتا دوں گی۔ بھائی کو آپ بتا دیں۔ دنیا کو خود ہی بتا چل جائے گا۔“

”ایقان۔۔۔“ وہ روئے کے قریب ہو گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کرو رہی ہو۔ ارے کچھ سوچ سمجھ کر بولو۔“

”موتا طے ہے بھائی بیگم! کہ میں پلیٹ کراس شخص کیاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی ”آپ جانتی ہیں ماما

موجودہ میں ”حیات دلا“ کے حصے اپنی زندگی میں ہی کر ڈالے تھے۔ وہ بڑے حصے دونوں بھائیوں کے لیے اور وہ

چھوٹے حصے ہم دونوں کے۔ ہے نا۔ میرے حصے کا پورشن اب تک ویران اور خالی پڑا ہے۔ میں وہیں رہوں

گی۔“

”ہمیں تمہارے رہنے کی نہیں۔ تمہارے آباد رہنے کی فکر ہے۔ ایقان۔۔۔“ انہوں نے آنسو پونچھے۔

”نہیں بھئی تمہاری اور سردہ کی طرح ہو۔ میں بھی نہیں چاہوں گی کہ تمہارا ہنسا ہنسا گھر پر باد ہو۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تو آپ کے کیا خیال ہیں۔“

منور میں کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراء اس کی ایک باتیں سن کر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین کو بیچ پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ غور فرود ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عہد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منورہ بیگم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بناتی ہیں۔ منورہ، شملہ کی شہین کی تقریب میں نائغ اور عریض کا کاج پر سوا دیا جاتا ہے جس پر عریضہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابراہیم جیلانی کا فون شملہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ شملہ شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابراہم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شملہ کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتبار کرتا ہے۔ فراز جو در حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے، فراز ہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ فراز کی آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز ہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ رافع کو ربیعہ میں اپنے آپ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا علم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا عاشر کو پاکستان پیچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پر اسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شملہ سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سر درویدہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلاسا دے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شملہ، ربیعہ کے ساتھ منورہ اور ابجد بیگم کے گھر آتی ہیں۔ ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ درود کے مشورے سے ایم ایسے سوشالوٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاشر لڑا سے ملنے ہو کر ہتھکڑی تو لڑا سے پر پوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر نوکھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً "صدے" سے لگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ درود سے ملنے کے بعد اس کے گھر آتی ہے۔ منورہ کی شادی رافع سے ہو چکی ہے۔ منورہ اسے صدے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا لیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ درود کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۶

حکیم سوری قیصر

بیل ایک تو اتر سے بھی تھی۔ عذرا بیگم افواہ و خیزاں فون تک پہنچی تھیں۔

"ہیلو" انہوں نے بھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

عاشر ہند کھوں کے لیے خاموش رہا تھا پھر ان کے دوبارہ "ہیلو" کہنے سے قبل ہی وہ آسکی سے بولا۔

"السلام علیکم بھابی جان۔ عاشر بات کر رہا ہوں۔"

اب چند لمحے خاموش رہنے کی باری عذرا بیگم کی تھی۔ پھر وہ بھی مزید ہم آواز میں بولیں۔

"ہاں عاشر میاں! کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں بھابی جان۔ یہ ایقان کہاں ہے؟" اس کی زبان اگلنے لگی تھی۔ عجب شرمندگی کا احساس دامن کیے ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی دل کی تھوں سے غصہ بھی اٹھ رہا تھا۔

"ایقان" عذرا بیگم بھی جیسے اس کے جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔ "ایقان تو شاید سو رہی ہے۔"

عاشر نے گہری سانس بھری۔ اسے نجانے کیوں ایک وہم سا تھا جیسے وہ اسے وہاں نہیں ملے گی جیسے وہ کہیں اور

◀ قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے ▶

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی مملوآت میں انسانے اور بخل کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق سے خوشی سے محفوظ رکھیں۔

یہ بات نہیں بھولوں گی۔

عاشقِ کامی چار بیویوں کا راز کرنا پراسر بیوڑے۔

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”عاشق صاحب! وہ طنز نہ کرنا کیونکہ مجھے آپ کی طرح نہ کسی کے حسن کا نشہ چڑھا ہے نہ ہی غم غلط کرنے کے لیے میں نے شراب کا سارا لیا ہے مجھے میں نے جو کچھ کہا وہ باقی ہوش و حواس کہا ہے۔ آپ کو نہ اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت ہے نہ مجھ میں یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں ملتی۔ تمہاری ضرورت ہے کہ اب میرے دینا کا مشکل ترین کام ہے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”عاشق صاحب! وہ طنز نہ کرنا کیونکہ مجھے آپ کی طرح نہ کسی کے حسن کا نشہ چڑھا ہے نہ ہی غم غلط کرنے کے لیے میں نے شراب کا سارا لیا ہے مجھے میں نے جو کچھ کہا وہ باقی ہوش و حواس کہا ہے۔ آپ کو نہ اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت ہے نہ مجھ میں یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں ملتی۔ تمہاری ضرورت ہے کہ اب میرے دینا کا مشکل ترین کام ہے۔“

”مروم! وہ بلہا گیا۔“ اور اس کی طرح صبح آؤں گا کہ تمہارے گھر والوں سے۔ کیا سمجھا ہوا ہے تمہارے میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں۔ قانونی پوری ہو میری کوئی معشوقہ نہیں ہو جو یہ دھمکیاں دے رہی ہو۔ خناس چڑھ گیا ہے تمہیں۔“

بڑھاتے ہوئے اس نے ریسپور بلیو کے دے مارا تھا۔ ایقان چند لمحوں کے لیے سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلر رہی تھی۔ اس کی طرح تھوڑے تھوڑے روپ کے متعلق اس نے کی بار بار سنا اور پڑھا تھا۔ وہ کبھی یاد نہیں کرتی تھی۔

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

جلی ہوگی۔ اب اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو جانے پر وہ قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

”تمہیں بھائی جان۔ وہ سو نہیں رہی جاگ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کپ پلیر میری اس سے بات کروا دیتا۔“

”عاشق! وہ بلہا گیا۔“ اور اس کی طرح صبح آؤں گا کہ تمہارے گھر والوں سے۔ کیا سمجھا ہوا ہے تمہارے میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں۔ قانونی پوری ہو میری کوئی معشوقہ نہیں ہو جو یہ دھمکیاں دے رہی ہو۔ خناس چڑھ گیا ہے تمہیں۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

”ایقان! یہ بات تم کوئی سولہ سو سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کالو۔ یہ کیا اول قول کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ میں آنا بتا ہوں اور تم ہمیں کہہ لینا تاکہ تمہارا یہ باطل بن اترے۔“

ایقان نے رخ پھیر کر اسے ذہن ایک نظریہ کیا۔

”نہیں!“ وہ بے حد غصہ انداز میں بولی۔

کمرے میں موجود نفوس میں سے زیادہ تر نے بے اختیار مہر سانس بھری تھی۔ عاشر نے ایقان کی بے پناہ ضدی طبیعت کے مقابلے میں اس سب کی بے بسی محسوس کی۔

”آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ چلائی اٹھا اور اگر کچھ کیا ہے تو ٹھیک سے دنیا میں نہ شام مر رہی ہو کبھی نہ کبھی رستے سے ہٹ چکا ہے۔ پھر دیر کے لیے ہٹ چکا ہے جس میں اس کا مطلب ہے تو نہیں ہے کہ ان کی بیویاں اس سرگشتی پر راضی ہیں۔ اس طرح تو اس طرح تو کتنے کھڑے کھڑے جاسیں برباد ہو جائیں۔ آپ آپ سب لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اس سے کہیں یہ سامان اور بیچنے کے اور میرے ساتھ چلے۔ میں اسے لینے آیا ہوں ایک طرح سے معذرت خواہی ہوں اور یہ ہے کہ اور اگر مر رہی ہے آپ لوگ بھی اپنی خاموشی سے اسے شہر دے رہے ہیں۔“

اس کے لفظ لفظ سے بے بسی اور بڑا واقعہ جھٹک رہا تھا۔ ایقان کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے سر سے اس سے مل کر اس کے غریب ہونے اور بھلائیوں پر رنج کر دیا تھا کہ انی سال وہ اس کے ساتھ چلائے گا تو انی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ کہ اگر کسی نے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تو وہ کوئی انسانی قوت نہیں رکھتا ہے۔ کبھی گریز نہیں کرے گی۔ وہ مال اور بھائیوں کی لادنی تھی۔ سب سے پہلی اور بیشہ سے اپنی بھائیوں کی تھی۔ اس وقت بھی اس کی دھمکی نے جیسے سب کے لیے سخت ہونے لگی تھی ان کا گھر اٹھنا غلطی فزوری کی اہمیت کو پہچاننے اور ان پر زور دینے والوں میں سے تھا۔ فاروق حسن اور سلوٹو حسن کو ایقان کی ناراضگی کی وجہ جان کر حقیقتاً ”وچکا گناہ“ انہیں غاشر سے اس بے راہ روی کی امید نہ تھی۔ بدل میں وہ ایقان کو رستہ چار رہے تھے۔

فاروق حسن نے کھینچا کر گناہ صاف کیا پھر دوڑنے لگا اور دوڑتے لگا کر دوڑنے لگا۔ ”وچکا گناہ“ انہیں غاشر سے اس بے راہ روی کی امید نہ تھی۔ بدل میں وہ ایقان کو رستہ چار رہے تھے۔

”کیوں عاشر میاں! آپ کہتے ہیں کہ آپ کہاں لگا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ معذرت خواہ ہیں۔ حالانکہ اب تک جو کچھ آپ نے کہا اس ساری گفتگو میں ایسا نہیں ہے جو آپ کو معذرت خواہ ثابت کرنا ہو۔ آپ دنیا کے سارے مردوں کے ایک ہی حریف میں ڈھونڈ لیں پھر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا ایسا میاں!“ وہ بھی دُور سے نرم پڑا۔ ”میں تو بار بار یہی عرض کیا ہوں کہ ٹھیک ہے مجھے سے غلطی ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس زرا سی بات کے پیچھے اپنا گھر خراب کیا جائے۔ میں اسے چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کو چاہتا ہوں۔ پھر یہ مجھے کس بات کی مراد چاہا رہی ہے؟“

فاروق حسن نے اس کی بات مکمل ہونے پر سوالیہ نظروں سے ایقان کی جانب دیکھا تھا وہ اب ہونٹ چباتے ہوئے جیسے خود کو بہت کچھ کہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

”بھولواؤ ایقان! فاروق حسن بولے۔“

”بھائی میاں!“ وہ سیکھنے لگے میں بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اگر معذرت خواہ ہیں بھی تو مجھے ان کی معذرت پر بری برائی نہیں۔ میں نہیں ہے چور اگر چوری کرتے ہوئے پڑا جائے اور اسی وقت معافی مانگ لے تو کوئی ہے جو یہ نہیں کرے گا کہ آنکھ پر چور مزد چوری کا ارتکاب نہیں کرے گا؟ اس نے تو پکڑے چلے پر ایک دہری کارروائی کے طور پر ہی معذرت کی ہے؟ اسی حال ان کا بھی ہے۔ چکر لٹا رہا ہے۔ کب سے چل رہا ہے اور بات کہاں جا چکی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف اتنا ظلم ہے کہ میں نے ان کے رویے میں

کھپاؤ اور فریق محسوس کیا لیکن یہ مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ میں نے بھی بار بار اسے وقت کی کمی کا رونا رویا یہ ہمارا کچھ نہ کچھ کر کے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں نے ایک واضح ثبوت ملنے پر انہیں یہ باور کرایا کہ میں بہت کچھ سمجھ چکی ہوں تب انہوں نے اعتراف کر جم اس انداز میں کیا جیسے سرے سے بلا امارتے ہیں۔ میرے نزدیک جو بات زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے محض وقتی کھیل جسے بہت سے لوگ کھیلنے میں انہوں نے بھی کھیل لیا تو کیا برائی؟ معذرت اس کو کہتے ہیں؟ شرمندگی اس کا نام ہے؟ کیا گارنٹی ہے اس بات کی کہ کل کو یہ کھیل دوبارہ شروع نہ ہو گا؟ وہ حسین بلا وہاں جاپان میں ان کی روز روز جدائی برداشت نہ کر پائی۔ ان کے پیچھے دو مہینے تک پہنچ گئی۔ یہ اسے اسے لیے لیے پھرتے رہے۔ اس کے ساتھ وہ بولوں میں عیاں شیاں کرتے رہے جیسے جھوٹ بولنے کے آنکھ شروع کرنے والے برنس کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں یا شاید یہی تھا ان کا ”آنکھ“ ہونے والا ”برنس“ وہاں جاپان میں انہیں کس کا ڈور ہو گا؟ وہ حسین ہوئی۔ اور یہ ہوں گے میں جاپان میں کچھ بچے اپنی بولی ”اپنی جان جلائی ہوں“ مکمل کھل کر رہا جاؤں یہ ہر سال بعد شریف لاس اور اپنا ”ہنسنا کھڑ“ دیکھ کر کھینچتی خوشی اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ بس! ان کی معذرت خواہی کے پیچھے یہی خواہش کار فرما ہے۔“

ایقان کے لفظوں میں ساری گونج رہی تھی۔ کمرے میں کافی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر عاشر نے مہر سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں جانتے ہوئے بھی اپنی کھول کر تمہیں دکھا نہیں سکتا۔ تم میری کسی بھی بات پر متوجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن چاہو تو بتاؤ کہ تم اس مشکل کا کیا حل نکالتی ہو؟ اب جو ہوا ”موہو کلین“ آنکھ کیا کیا جاتا ہے؟ اس وقت اپنی بولی میں ”وچکا گناہ“ انہیں غاشر سے اس بے راہ روی کی امید نہ تھی۔ بدل میں وہ ایقان کو رستہ چار رہے تھے۔

”اس غلطی میں تم رہنا۔ میں بھی تمہیں غلطیوں میں ڈھونڈ لیں پھر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں غلطی میں مت رہنا۔ میں بھی تمہیں غلطیوں میں ڈھونڈ لیں پھر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں اپنے بچوں سے کتنا زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ ایک برو کن فیملی کا حصہ بن جائے۔ لیکن میں اپنے بچوں کا پابانہ خرچ نہیں دے دوں گی۔ قانونی طور پر تم سے وابستہ ضرور رہوں گی لیکن۔ لیکن عملی طور پر تمہارا گھر سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔“

وہ جھجک مٹی تھی۔ بھائیوں کی موجودگی نے اسے بہت کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم نے حد تک عاشر شریفی پر وہ ایسا تھا۔

”ایقان!“ وہ دُور سے بے بسی سے بولا۔ ”کہا، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”دوسرے یہ کہ میں اب تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی میں یہاں رہوں گی۔“ حیات ولا“ میں نے اپنے پورٹن میں۔ لیکن اسے بچوں کا پابانہ خرچ نہیں دے دوں گی۔ قانونی طور پر تم سے وابستہ ضرور رہوں گی لیکن۔ لیکن عملی طور پر تمہارا گھر سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔“

”میں۔ لیکن تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنا کیوں چاہتی ہو؟ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تمہیں وہاں رہنے میں کیا راحت ہے؟“ وہ بالآخر خضیہ کھوئے ہوئے اس کے مقابل اٹھڑا ہوا۔

ایقان چند لمحوں کے اس کی آنکھوں میں جھماکی رہی۔ اس کی نظروں کی بے بسی، جھنجھاک اور کچھ نہ کہنا سننے والی کیفیت سے وہ عجب سرت سے ہلکا رہی۔

سے رقبہ پر پڑی ہوئی، انکیسی یا ایک قدرے بڑے گیسٹ روم کی مانند تھا۔

”تو تم نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟“ اس کی نگاہ ہر جانب سے ہو کر سامنے بیٹھی ہوئی ایقان کے چہرے پر آئی۔

”تمہارے خیال میں یہ ایک غلط فیصلہ ہے؟“ ایقان نے جواب دینے کے بجائے انہی سے سوال کیا۔

”جانتا نہیں ایقان۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”ہر مسئلہ ایک دائرے کی مانند ہوتا ہے۔ دائرے کے

اندروں موجود شخص کو وہ اور طرح سے دکھائی دیتا ہے اور دائرے سے باہر موجود شخص کو اور طرح سے۔ اور دائرے

کے باہر جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ دائرے کے اندر موجود شخص کی کیفیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پاتے۔“

”پھر کبھی۔۔۔“ ایقان نے اصرار کیا۔ اپنا اپنا نقطہ نظر تو ہوتا ہے نا۔ تم کیا کہتی ہو؟“

”ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس انا کو سمجھ سکتی ہوں ایقان! جس نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا لیکن

ایقان ایک دن اپنی اسی انا کا گلا عورت اپنے ہاتھ سے گھونٹتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔“

”تم مجھے بھی اچھی طرح سے جانتی ہو شہلا!“ ایقان ضدی بن سے بولی۔

”ہاں!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تمہیں بھی جانتی ہوں۔ اسی لیے کچھ بھی کہنے سے گریز کر رہی تھی۔

تمہاری انا کی سطح عام انسان کی سطح سے بلند ہے میں سمجھتی ہوں۔“

”شہلا، شہلا تم جانتی ہو گواہ ہو تم۔ میں نے اپنے ساروں ایسے کتابے تلاش چاہا ہے۔ ہر لمحہ ہر لمحہ اس کا خیال

دل و دماغ میں اس طرح چبوسا رہا کہ اور کچھ سوچنے یا غور کرنے کی میں مجھے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس کی

جدائی میں اس کی قربت اور اس کی قربت میں اس کی جدائی کے بارے میں سوچتی رہی اور اس نے اس نے

میری محبت، میرے اعتبار و اعتماد کی وجہاں اس قدر آسانی سے بکھیر دیں؟ وہ عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن وہ

ایقان تو نہیں تھی۔ وہ اس کی محبت تو نہیں تھی۔ کہے اس کا دل ہانا کہ وہ اس کے قریب جائے گی کہ اس کے ضمیر

نے گوارا کیا کہ وہ اس کے گھر سے دھانسی کے جوہر کو کھینچ لے گی۔“

”ہو سکتا ہے ایقان یہ تمہاری غلط فہمی ہو۔“ شہلا نے ضرور سے سچے میں کہا تھا۔ ”اس عورت نے عاشق بھائی

کو مجبور کر دیا تھا۔“

”سگن پوائنٹ پر ایقان نے طنز سے اس کی بات کاٹی۔ ”دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بات پر قائل نہیں کر سکتی

کہ کسی عورت نے کسی مرد کو مجبور کر دیا۔ یہ صرف اور صرف مرد کے اندر چھپا بیٹھا ہے جو مخالف کو راضی رضا

دیکھ کر کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔“ اس نے اپنے منہ سے دے دے والی بات کہی۔ ”یہ بات روشنی کی مانند عیاں ہے مجھ پر اور

اور میں اب اس کے قریب نہیں جا سکتی۔ مجھے ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے اپنے جذبوں کے خون کی بو آئے گی۔ مجھے

مجھے اس کی سانسوں سے کسی دوسری عورت کے وجود کا۔“

وہ بات مکمل نہ کر پائی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رو دی۔ شہلا متاسف نظروں سے اس کی جانب

دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ایقان کو اپنے شانے سے لگایا۔

”مت رو ایقان۔۔۔ مضبوط فیصلے کرنے والوں کو پہلے اپنے آنسوؤں جیسی کمزور شے کو مات دینی پڑتی ہے۔ اگر تم

واقعی یہی سمجھتی ہو کہ تمہارا فیصلہ درست ہے اور اصل ہے تو پھر اپنے آنسوؤں کو یہ یاد کرو الودود نہ یہ ہمیشہ تمہارا

اور تمہارے فیصلے کا منہ چراتے رہیں گے۔ تمہیں جتنا ہے وہیں گے کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا۔“

”کبھی نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

”اور ایقان! پوشش کرنا تمہارے معصوم بچوں کے ذہنوں میں قبل از وقت وہ سوال نہ اٹھیں جو انہیں بھی

پریشان کر دیں اور تمہیں بھی۔ انہیں یہ احساس مت دلا نا کہ ان کے باپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی پاداش

میں انہیں یہ ہجرت کرنی پڑی ہے۔ میں میں معصوم سوالوں کے درد سے آشنا ہوں اسی لیے تمہیں یہ مشورہ دے

رہی ہوں۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ ایتھان نے سر جھکا لیا۔

”میں اب چلوں۔“ شلا گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اسپتال سے سیدھی تمہارے پاس ہی چلی آئی تھی۔

”سب ہی تمہارے مسئلے سے متاثر ہوئے ہیں ہمیں نا“

”تلا ہر ہے۔“ وہ افسردگی سے سرکائی۔ ”میرے اپنے ہیں۔ میرے دکھ ہر لانا“ دیکھی ہوں گے۔ ہر کوئی تسلی اور دلاسا دینے آیا ہے۔ سب کچھ کیا تھا تو تم جانتی ہو مجھ سے کچھ زیادہ ہی افسوس ہے۔

”ہوں۔“ شلا ہلکا سا مسکرائی۔

ایتھان نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتی رہی۔

”شلا۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔“ وہ چونکی۔ ”ضرور۔“

”وہ نہیں ہاں تم سے میرا مطلب ہے ڈو لوہو؟“ اس نے پھیلکے ہوئے پوچھا۔ پھر کے لیے حیران ہوئی جیسے اے ایتھان کی جانب سے اس سوال کی امید نہ تھی۔ پھر وہ کل کر مسکرائی تھی۔

”ہی اڈریس کی اڈریس۔ وہ شگفتگی سے بولی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ ایتھان نے قدرے سختی سے آئے دیکھا۔

”تمہارے سوال کا جواب کیا ہے اڈریس فرینڈ؟ یہ تجھ پر خود بھی نہیں جانتی۔“ اس نے ایتھان کا سر ہلایا۔

”جس لمحے مل گیا۔ اس دن تمہیں بھی ضرور ملے گی۔“ اس نے کہا۔

ایتھان اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

چھوٹے سے پارک کی پختہ روش پر وہ دونوں ٹھٹھکے جا رہے تھے۔ راستے میں بڑے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو جوئے کی ٹوک سے اڑاتے ہوئے بے فکر سی چھٹی کھاتے ہوئے منظر کا دل دودھ بے حد فریش تھا۔

ناٹھ بے بات پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اسے اس بے فکر اور فریش منظر کا پس منظر بھی معلوم تھا۔ کل ہی اس کی منگنی اس کی پسند سے اس کی پیچھے راوے ہوئی تھی۔ ناٹھ نے کئی اہم فیصلوں میں شرکت کی تھی اور وہ جانتا تھا کہ منظر صرف خوش نہیں بلکہ بے حد خوش ہے۔

منظر سے اس کی دلچسپی زیادہ رہی تھی۔ ابھی چند ماہ قبل ہی دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور پھر کئی دنوں کے بعد وہ

میں ایک سو برس سے کئی قریب ہو گئے تھے۔

کئی روٹوں کی گانے کی دھن پر پہنچ جاتے ہوئے وہ بیچ پر جا بیٹھا تھا۔ ناٹھ بھی خاموشی سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ منظر نے یکفخت پہنچ جانا سو فٹ کر کے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ آج گھر والے کی ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“ ناٹھ لڑکھڑکھ کر لے کر بڑا لڑا گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”دکھو؟“

”کیا ہے یاد۔“ وہ جھلا گیا۔ ”تم سے کس نے کہا کہ میں تمہاری دعوت کر رہا ہوں۔ میرے گھر پر کیا پکا ہے

اس سے تمہیں کیا مطلب؟“

”مجھے اس سے مطلب نہیں۔ میں تو محض تمہاری سنجیدگی، خاموشی اور افسردگی کے جملہ اسباب جاننے کی

کو شش کر رہا ہوں۔“

”تمہیں کس فرشتے نے خبر کی کہ میں افسردہ ہوں؟“ وہ مزید جھلایا۔

”سنجیدہ اور خاموش تو ضرور ہو۔ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے نا؟“ وہ مسکرایا۔

ناٹھ خاموش ہو گیا۔ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کی تردید چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ منظر کی شگفتگی اور خوشی سے اس کے اندر عجب ملال سے اتر آئے تھے۔ وہ بہت سے سوالوں کے درمیان گھبر گیا تھا اور یہی اس کی خاموشی کا سبب بھی تھا۔

”میں سوچ رہا تھا۔“ اس نے یونہی گھبراہٹ مٹانی چاہی۔ ”کہ تم آج بہت خوش نظر آتے ہو۔“

”ہاں تو میں ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”وہ مجھ کی طرف سے ہے یا کچھ اور بھی؟“ وہ روکے بن سے بولا۔

”یہ تو مجھ کی طرف سے ہے۔“ منظر نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”یہ وہ تمہارے نزدیک محض ہے؟ میری منگنی ہوئی ہے یا زہری پسند ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے بے دلی سے ہٹا کر بھرا۔

”خوش نہیں ہو رہا؟“ منظر نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں نے تو تمہیں اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔“

”اب کیا تمہارا مطلب ہے؟“ انسان ہو یا جانور جیسے اور یہ رشتہ تو ہوا ہی اٹو کھا ہے۔ دنیا کے ہر رشتے

”پتا نہیں۔“ ناٹھ نے اٹو اٹو میں لڑکھڑکھاتا تھا۔ ”میں نے کبھی اس طرح کی محبت کو محسوس نہیں کیا۔“

”کیوں؟“ گھر سے ہو گیا؟“

ناٹھ نے دھنگی سے اسے دیکھا تو وہ دھنگائی سے ہنس پڑا۔

”مکمل آدمی ہو یا محبت کی لطافت اور پختہ سے انکاری ہو۔ خیر شاید ابھی ہم اتنے کلوز نہیں ہوئے کہ تم

اسے اندر کی باتیں آشکار کرنے کے لیے مجھ پر آمنا انتخاب کرو لیکن اتنا ضرور ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے ضرور کوئی غبار کوئی محسوس زندگی۔“

”جس سے تمہیں پتہ چلے گا۔“ ناٹھ نے بے حد خاموش بیٹھے ہوئے ناٹھ کے کاندر سے پھٹی ہوئی۔

ناٹھ نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔



باتوں میں کتابیں تھامے وہ بے حد مصروف سے انداز میں باہر نکلا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے سے آئی ہوئی

دور پر پڑی۔ ورنہ بھی رات کو جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ پھر وہ رات کے سامنے آ کر۔

”آپ کی بخیر رہی جا رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”آج تمہیں جمع کروانا ہے۔ تم؟“

”میں آج نہیں جاؤں گی۔“ وہ دھڑکتے ہوئے انداز میں بولی۔ ”ایتھان خالہ کی وجہ سے کچھ بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ آپ میرے ایک ہی کام پر تیار ہیں گے؟“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”ہاں ضرور ہوں۔“

”وہ رعبہ میرا انتظار کر رہی ہوگی، ہم دونوں ساتھ ہی نکلتے ہیں نا۔۔۔“

وہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”آپ کو دیر ہو رہی ہو تو کوئی بات نہیں۔ میں خوب چلی جاتی ہوں اسے بتانے۔“

”ارے نہیں۔“ رافع مسکرایا۔ ”میں تمہارا پیسہ دے دیتا ہوں ڈونٹ وری۔“

”مستحقک پورے“ وہ ممنونیت سے مسکراتے ہوئے کرپٹ گئی۔

رافع مرکزی گیٹ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سیاہ سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے وہ نجانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ کیسے رستے تھے یہ، جولا کھ گریز کرنے پر بھی ایک ہی سمت کو جانا لگتے تھے۔ کتنے دن لگتے تھے دل کو سمجھانے میں اور پل بھر میں وقت پھر اسے اس کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لفظ سے لفظ جڑنے لگتے تھے۔ تخیل کا سیل رواں بہا کر کہاں سے کہاں لے جایا کرتا تھا اور اس کی سوچ ایک کمزور تنکے کی مانند بھٹکتی پھرتی تھی۔

نیکدم رافع ٹھنک کر رک گیا۔ سفید بنگلے کی دیواروں پر چڑھی ہری بیلوں نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ وہ آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔

لکڑی کے چھوٹے پھاٹک کے قریب ریجیہ کھڑی تھی۔ لیکن کھرے پکڑوں پر بڑا سا سفید دھبہ اور سفید اسکارف لیے وہ موسم بہار ہونی لگتا لگ رہی تھی۔

تھی۔ نبجانے وہ اس قدر انہماک سے کیا سوچ رہی تھی۔

”آب!“ اس کے لب تحریر پا کے یوں رہے تھے جیسے رافع کا سامنے ہوگا۔ اس کے لیے بے حد باعث حیرت تھا۔

راجہ کو بچانے کیوں خوش فہمی سی ہوئی۔ شاید وہ اسی کو سوچ رہی تھی تب ہی اسے سامنے ایک کونکوں خیران سی ہو گئی۔

”وہ سلام علیکم۔“ وہ دیر سے مسکرایا۔

”وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ“ ”ربیعہ بھی اپنی کیفیات پر قابو پا کر غلبہ نگیں سے مسکرا دی۔“

رافع کو یوں لگا تھا جیسے وہ صبح مزید خوب صورت ، مزید چمکیلی ہو گئی تھی۔

’یونیورسٹی جانے کی تیاری میں ہیں؟‘ اس نے ملکے کھلکے انداز میں پوچھا۔

”ستاری تو کب کی ہو چکی، میں ورہہ کا انتظار کر رہی ہوں وہ اب تک نہیں آئی۔ پوائنٹ نکل جائے گا۔“

”دورہ کا اسی سبب ہے آپ کے لیے وہ آج یونیورسٹی نہیں جائے گی۔“

”اوہ۔“ ربیعہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔ ”لیکن کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا شاید ناسازی طبع اس کی وجہ ہو۔“

”اچھا! رعبہ مایوس سی ہوئی۔“ پھر میں بھی نہ جاؤں۔“ اس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

”مشورہ مانگ رہی ہیں؟“ رابع شوخی سے مسکرایا۔

ربیعہ چونکی بھروسہ سے ہنس۔

”نہیں۔۔۔ بلند آواز میں سوچ رہی ہوں۔“

”دیے میں یونیورسٹی ہی جارہا ہوں۔ مجھے ٹیفس کے سلسلے میں تھوڑا کام ہے۔“

رہیہ اس کا مطلب سمجھ کر چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر وہ گڑھی کا پچانگ کھول کر باہر نکل آئی۔

”جب ایڈیشن ملے لے لیا ہے تو کبھی کبھار اکیلے کلاس اینڈ کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیے۔“ وہ بولی۔

”گھڑ۔“ راضع نے سر ہلایا۔

”اور انہی کے۔“ اتم نہیں جانتی یہ۔ شخص مسلسل عمر کی بریں واشک میں لگا ہوا ہے۔ بچائے لکھا کر کے رہے گا یہ۔
 روئے حد ریشان ہو چکی تھی۔

”وہاں آیا آپیلے بھی آپ نے بتایا تھا“ وہ خوش ہوا۔ ”پھر تو میرا گھر ہے نہ پایا؟“

”ہاں میری جان! میں نے کہا نا یہی تمہارا گھر ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے لگا۔

”لیکن پایا! یہاں تو صرف آپ رہتے ہیں اکیلے۔ میں تو نانو کے ساتھ سوتا ہوں یا پھر ربیعہ خالہ کے ساتھ۔ میں یہاں کیسے سوؤں گا؟“

ابرار نے اس کی جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔

”میرے ساتھ سوتا۔۔۔“

”ہاں پایا!۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔ ”لیکن مجھے کہانی سننے بغیر نیند نہیں آتی نا۔“

”میں تمہیں دھیر ساری اسٹوری بکس دلوں گا۔۔۔ روز پڑھا کرنا۔“

”ایسا کیوں نہ کریں پایا!۔“ نانو ربیعہ خالہ اور خالہ جانی کو بھی یہاں لے آئیں۔ ”اسے نئی ترکیب سوچنی تھی۔“

”کتنا مزہ آئے گا سب لوگ مل کر رہیں گے۔“

”مما کا نام نہیں لیا تم نے۔۔۔؟“ ابرار نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہاری ممما کو یہاں لے آئیں تو کیسا رہے؟“

عمر ایک دم خاموش ہوا تھا۔ وہ روٹ پیس کانٹے سے توڑنے لگا۔ ابرار نے اس کے انداز کو بطور خاص دیکھا۔

”بولو عمر۔۔۔؟“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”پایا!۔“ مجھے تھوڑے سے چاول دیں نا۔۔۔“

ابرار نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور اپنا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر وہ چاول کھاتے عمر کو غور سے دیکھنے لگا۔

”عمر!“

”جی پایا!“

”آپ اپنے پایا کی بات کو انور کر رہے ہو جانو؟“

”نہیں پایا یہ بات نہیں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”پھر کیا بات ہے؟ مجھے سچ بتاؤ۔۔۔“

”وہ۔۔۔ ممما کہتی ہیں اپنے پایا مجھے میری باتیں بالکل درست کرنا۔ اگر پایا کوئی بات کہیں بھی تو تو تم خاموش رہنا۔“

”ہوں!“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اصل میں جانو بات یہ ہے کہ آپ کی ممما ہم سے ناراض ہیں اسی لیے۔“

”انہوں نے ہاشم انکل سے شادی کر لی؟“ وہ بے ساختہ ہی بولا تھا۔ ابرار اس کا چہرہ دیکھ کر زہ گیا۔

”لیکن پایا!۔“ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہاشم انکل کی دلہن بن کر ان کے گھر چلی گئی ہیں۔ اگر آپ نے

انہیں یہاں لانا تھا تو آپ ان سے شادی کرتے۔ اب وہ یہاں نہیں آسکتیں۔“

ابرار گم صم صم ہوا تو اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”اور آپ بھی ان کی باتیں نہ کریں پایا! ممما ناراض ہوتی ہیں۔“ اس نے بے حد مدبرانہ انداز میں گویا اسے

سمجھایا تھا۔

ابرار دھیرے سے مسکرایا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”ڈنٹ وری عمر! تم دیکھنا ایک دن ہم تمہاری ممما کو منالیں گے۔“

”زیلی؟“ اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ ”مما ممما مان جائیں گی پایا؟“

”جی ممالی جان ایسے کچھ چاہیے آپ کو؟“ وہ کھینچی کوئی کوزی اسے ڈھانچتے ہوئے بولی۔

”اے ہو کچھ نہیں چاہیے سے تیرا یہ لوگ کیلے بھی آئے ہیں کیا؟“

”سب تو نہیں البتہ فریئر ایک مرتبہ آئی تھی۔“ ثانیہ ایلیر یہ برتن زرائی میں لگا دو۔ ”ورد نے ان کی بات؟“

جواب دیتے ہوئے ثانیہ کوہدایت بھی دی۔

”دیکھتے آئے ہیں یا باقاعدہ رشتہ بنی ڈال رہے ہیں۔“

”مجھے خبر نہیں ممالی جان،“ وہ مسکرائی۔ ”میں تو تب سے کہن میں ہوں۔ اندر کیا بات جیت چل رہی ہے مجھے خبر نہیں۔ لیکن آپ تو اندر سے ہی آ رہی ہیں نا؟“

”اے نہیں تو کچھ کچھ نہیں کیا ان کے انداز تو ایسے ہیں جیسے مقلی ہوئے بھی مدت گزر گئی ہو۔ اب تم لوگ کچھ چھاؤ تو ہمیں کیا خبر؟“

وردہ تجھرو گئی۔ وہ اپنی بات کہہ کر پھر پلٹ کر ڈور انکد دوم کی سمت چل پڑی تھیں۔

”دیکھا تم نے۔“ ”وردہ“ ثانیہ کی جانب مڑی۔

”برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے کباب پلیٹ میں رکھتی رہی۔ ”تم اپنا کام کرو۔“ ”وردہ ہماری سانس بھر کر ڈالی کا جائزہ لیتے لگی تھی۔

اس چھوٹے سے گھر کے لیے وہ ایک بے حد خوشی کا دن تھا۔ ان کی پچھلی سے وقت رخصت اپنے نفیس سے

پرس سے ایک ٹمبلین ڈیا نکالی تھی اور رابہ بیگم کی جانب سے ان کا جازت طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اور رابہ بیگم

سوائے مسکرائے کچھ نہ کہہ پالی تھیں۔

تب انہوں نے ڈائمنڈ رنگ ناعہ کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈال کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

”یہ صرف شکر ہے۔“ ”وہ بولی تھیں۔“ ”ماں باقاعدہ رسم بھانجنا چاہتے ہیں۔“ ”اگر وہ تو ہوتی تو ہوتی۔“

”اور رسم کیسے ہوتی ہے؟“ ”فردوس بیگم نے ناگوار سے منہ پھریا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ وہ بھانجنا اور بھانجوں کے درمیان

تھا۔ صد شکر کہ ان کی بزرگداشت صرف ان کے بھانجوں کی کھڑی ثانیہ ہی بن سکتی تھی۔

ان کے جانے کے بعد سب ہی خوشی اور بیگم اور ناعہ کو مبارکباد دینے لگے تھے۔ رابہ بیگم کا پیکٹا چرو

ان کی کچی خوشی کا مظہر تھا۔ ناعہ، ہونٹوں سے مٹھل سب کے چہرے پر کھ رہی تھی۔ خود پر سے گزرنے والی افاد

نے جیسے اس کے حواس مفلوج کیے ہوئے تھے۔

”رائہ کو فون کر کے بلاؤ ورنہ۔“ ”رابہ بیگم کو بڑی بیٹی کی یاد ستائی۔“ ”اس غریب کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“

”اے میں بھی چلوں!“ ”فردوس بیگم اٹھی تھیں۔“ ”ماہین کو اطلاع کروں جیسے ہمیں کبلا بچوں کا بچہ پیدا ہوئے۔“

اسے بھی بتاؤں ہاں!“

کئی افراد انہیں جاؤ کیہ کر مسکرائے تھے۔



ماہین دوڑی دوڑی چلی آئی تھی اور اب بے حد دلچسپی اور اشتہاک سے ماہی گفتگو سن رہی تھی۔

”یہ بڑی کتابیاں اور دونوں میں ڈرامہ اور موجود گیوں جیسے کہیں کے ریش زادے ہوں۔ اے ماہین! یہ دو

ناعہ تو بڑی ہوشیار نکلی۔ تجاہلے کہاں سے اس نے ایسا ریش زادہ کو کیا۔ ہمیں نہ آئیں ایسی ہوشیاریاں اور

بیٹیاں! ہم سے زیادہ بھولی۔“

”کچھ پتا نہیں چلا آپ کو یہ رشتہ کیا کیوں کر؟ انہوں نے ناعہ کو کہیں دیکھ کر پسند کیا یا لڑکے اور لڑکی کی باہمی

پسند ہے؟“

”اے ہمیں کوئی کچھ بتائے تو ہمیں پتا بھی چلے۔“ ”وہ دواوی سے بولیں۔“ ”کن سوئیاں لینی تو ہمیں آج تک نہ

آئیں۔“

”ہاں موجود افراد کی باتوں سے انداز نہ ہوا آپ کو؟“ ”ماہین قدرے خفگی سے بولی۔“ ”ایک تو آپ کی سمجھ بھی

ایسی ہی ہے نا۔“

”اب تمہیں بتایا ہے تمہارے کہ نا جارا کیا ہے۔“ ”وہ سرگوشی میں گویا ہوئیں۔“ ”اے ہم نے کبھی جلد بازی

سے ہی کام لیا۔“

”کس معاملے میں؟“ ”اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا تھا۔

”جی عرشہ کے معاملے میں اور کس معاملے میں۔“ ”انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

فریئر نے ماہی کو بول کر نکالنے عرشہ کے اچھے اپنا نام سن کر سرت پرے تھے۔

وہ دوکاب تک ناگوار سے آپ لوگوں کے اس غیر متصفانہ فیصلے پر۔ نہ لڑکی کی رضامندی ڈھنگ سے لی نہ

کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت دی۔ اب وہ کچھ عجیبے نتائج میں رکھا ہی کیا ہے؟ کہاں ہماری بہن برتن مانگنے کی اور

وہاں نہ کبھی ناعہ، راج کر کے۔“ ”ماہین نے بھی پیچھو لے پھوڑے تھے۔

”جس ماہین نے۔“ ”غلطی ہی ہو گئی۔“ ”انہوں نے کئی افسوس لے۔

عرشہ فریئر کے اس ہی کھڑی تجاہلے کیا ہوئے لگی تھی۔

”گھر کیسا ہے لوگا؟“ ”ماہین پھر اپنے غفیفی انداز میں بولی۔

”نفس امارا جان۔“ ”اکیسے ہاتھ تو ہو۔“

”جیسے پھر دیکھنا۔“ ”کیا ان کی ہیں؟“ ”ماہین کو ابھی پتا نہ آیا۔

”فرانز نام ہے لڑکے کا۔“ تصویر وردہ نے مجھے دکھائی تھی اس کی۔ اے! ماشاء اللہ ایسا خوبہ جوان کہ نظر پھر کر نہ

دیکھ لوں۔“

”جھما۔“ ”واقعہ؟“ ”ماہین کو سرت ہوئی۔

”گھر والے ایسے عمدہ لوگ اور ہمیں ایک سے بڑھ کر ایک۔۔۔ بڑی شادی شدہ ہے۔“ ”یہ اور چھوٹی والی دیر کھ کی

ابھی کہیں بات نہیں ہوئی۔“

”معرورین نے دیکھ کر ہنسنا لیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ ان سب ناموں سے وہ

بجلی واقف تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے ماہین! یہ ناعہ کا ہی کام ہے۔ اسی نے کہیں سے لڑکا پیچھے لگایا ہے۔ کسی گھٹی نکلی ہے یہ اور

صورت دیکھو تو فرشتوں کی سی۔“

”کیا خبری!۔“ ”ماہین بے دلی سے بولی۔ ”بغیر جانے ہو مجھے کسی کی پر الزام دھرتا ناعہ اور وردہ ایسی لوکیان

نہیں ہیں۔“

عرشہ کے کی حالت میں اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔

باقی اڑت دیکھیں

انہوں میں کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھبر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراز اس کی ایک نہیں سمجھتی۔ جس پر ربیعہ کو
 ڈانٹا جاتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔
 ربیعہ کا گھر کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔

خود شملہ کی شہرانی کی تقریب میں ہی نافع اور عریض کا نکاح پر عروا کیا جاتا ہے۔ جس پر عریض سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

ایک اور رات ابرار جیلانی کا فون شملہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ شملہ شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس
 رات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شملہ کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

انہوں نے حقیقت ناعمد کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریض کے لیے
 شملہ پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فرازی کی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمد باتیں کرتی تھی۔

ان کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا علم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پر اسرار رویے پر مشکوک

ہوتا ہے۔

شملہ کے سامنے چمپسی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فریوس بیگم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے

دوب کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شملہ ربیعہ کے ہاتھ زرا بوجہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے
 ربیعہ، ورہ کے مشورے سے ایم ایف کو شہر لاؤجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

عاشر تراز سے ملنے ہوٹل آتا ہے تو تراز اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر تراز کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم تراز کا رومال ایقان
 کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان

بے حد غصہ سے لگ جاتا ہے۔
 ربیعہ، ورہ سے ملنے اس کی طرف رافع لے جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے درمیان رافی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے صدمے

کا باعث بنی ہے۔ دو بچری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ ورہ کے لیے اسے دل میں
 جذبات محسوس نہیں کرتا۔

انہی دائری میں دیکھ کر اس نے نمبر لایا تھا پھر دوسری جانب ہوتی ہوئی بیل کی آواز سننے لگی تھی۔ جلد ہی فون
 اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔“ حسن اتفاق سے وہ ورہ ہی تھی۔

”ہیلو ورہ۔۔۔ ربیعہ بول رہی ہوں۔“

”ورہ؟“ ورہ کی آواز میں خوشی در آئی۔ ”کیسی ہو ربیعہ۔۔۔ سچ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ کل یونیورسٹی نہیں آئیں۔“ ربیعہ نے پوچھا۔

”میری طبیعت؟“ ورہ قدرے گڑبڑاسی گئی تھی۔ ”اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں تھیک ہوں ربیعہ! بس یونہی کچھ موڈ
 آ رہا تھا اور پھر شام کو اچانک ہی وہ لوگ چلے آئے۔“

”وہ لوگ۔۔۔؟“ ربیعہ کچھ نہ سمجھی۔

”ہاں! وہ۔ فراز کے گھر والے۔ میں نے تم لوگوں سے ذکر کیا تھا نا پہلے بھی۔ بس وہ اچانک ہی آگئے تھے کسی پروگرام کے۔ اور افزا تقریب میں ہی ناعمہ کو آگے بھی بھیجنا تھے۔ خصوصیت ایسی ہو گئی تھی کہ میں تمہیں فون بھی نہ کر پائی۔“

”اے۔۔۔“ رعبہ خوش ہو گئی۔ ”مجھ تو مبارک ہو بہت بہت۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔ ناعمہ کو میری طرف سے بہت مبارک باد سننا۔ فراز بھائی تو اتنے اچھے ہیں کہ کسی شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ناعمہ واقعی خوش قسمت ہے۔“ ورنہ دیکھتے تو ہمیں دی۔

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ دیکھ تمہارا بادیہ خود کیل نہیں آجاتا جس؟ تم سے ملنے کو بہت مل چاہ رہا ہے۔“

”دیکھ! منگنی کی مصافحہ کھانے میں بھی خود چل کر آؤں؟“ رعبہ مسکرائی۔
 ”مصافحہ میں بھی کھلائیں گے اور گھر بھی دیئے آئیں گے۔ تم بے فکر ہو۔“ ورنہ بھی مصافحہ کی بات نہ ہو۔
 ”جیسا میں کو خوش کرتی ہوں۔ اسی سے پوچھ لوں۔“ رعبہ بول۔
 ”وگے میں منتظر ہوں۔“

رعبہ نے رعبہ پر روکھا یا پھر چند لمحوں کے لیے سوچ میں رہی۔ ”حیاتِ دلا“ کی سہاگت جاتے ہوئے رستے میں جو بانوس سی خوشبو اپنی جانب بلانے لگتی تھی وہ خوشبو ایک طلسم کی مانند تھی اور رعبہ سب کچھ جانتے جوتے ہوئے بھی اس طلسم کا شکار ہونا نہ چاہتی تھی۔ ورنہ کی قسمت میں بے حد خلوص تھا۔ ورنہ خود مست معصوم اور پر خلوص لڑکی تھی۔ رعبہ گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چلی دی۔ اس نے ”حیاتِ دلا“ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

”رعبہ آ رہی ہے۔“ ورنہ نے ناعمہ کو مطلع کیا۔ ”وہ تمہیں بہت مبارک باد دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں آکر مبارک باد دے۔“

ناعمہ نے سہی سے ہنسنے کا بیان کیا اور ایک بروی سی ہنسی لہرائی۔ ”ابھی سو کر اٹھی تھی۔“
 ”آپ ان کے لیے چائے تو ضرور تیار کریں۔“ ایک کپ چائے بھی دے دیتے تھے۔
 ورنہ نے کپ چائے بے حد خشکی سے اسیے دیا۔
 ”تھوڑی سی شرم کسی سے اوجھار لی لو ناعمہ! ایسے ٹھیک ہی فکر مند ہو رہی ہیں تمہاری طرف سے۔“

بے وجہ انہیں طفیل تسلیاں دیتی رہتی ہوں۔ وہ گھنٹے سے بستر میں تھکی ہوئی ہو اور بجائے اس کے کہ رعبہ کے آنے پر تمہیں چائے وغیرہ سو کرو۔ ”الٹا فریضہ پروگرام شروع کروا۔“ کیا ہے گا تمہارا اب تو عقل کرو۔ سرسرا ل والی ہو گئی ہو۔“

”اے! آپ! یہ کیسے۔“ وہ ہنسنے کا انداز اختیار کر لیں۔ ”آپ تو ای کی زبان استعمال نہ کریں۔ سچی میں تو پہلے ہی بے حد کوشت کا شکار ہوں۔ کیا مصیبت سیر رہ گئی ہے بیٹھے تھکا۔“

”ناعمہ! عقل کرو! الٹی سیدھی باتیں وقت مند سے نہیں نکالا کرتے۔ خدا نے تمہیں اتنی بڑی نعمت عطا کر دی ہے۔ لڑکیاں تو ایسے رشتوں کے لیے وقف رکھا کرتی ہیں۔“ ورنہ تنبیہ کی سے بولی۔
 ناعمہ زور سے ہنس دی۔ ورنہ نے پھر اسے گھورنا تھا۔ لیکن وہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر جتنی رہی۔

”میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟“ وہ چڑھ گئی۔

”اور کیا۔۔۔ لطیفہ ہی ہو گیا ہے تو۔۔۔ سنی دنیا جہاں کے ہندو نصائح سننے کا لڑکوں کو اس قدر شوق ہوتا ہے کہ وہ لطیفہ کہنے لگتی ہیں۔ جتنی جتنی باتیں سنی دنیا میں آئی ہیں، انہیں سنی سن کر مرے والی ہو گئی ہوں۔ اچھے اچھے دس پندرہ اقوال ای کی جانب سے عطا ہوتے ہیں۔ سوتے چھ سات آپ بھی ساتھ لگا رہی ہیں۔ ابھی تو ذرا رات بھر لپٹی کو آنے دوس سب سے زیادہ خطروں کو سمجھتے ہیں۔ ان سے ہے۔ وہ تو مجھے حالتِ نیند میں بھی نہ جھٹکے گی۔ جگا کر کہیں گے۔ ناعمہ! تمہارا منہ کھلا ہوا ہے۔ اسے بند کر کے سونے کی عادت ڈالو۔“ سرسرا ل والے کیا کہیں گے۔ اس نے سوتا بھی نہیں سکھایا۔ ”آئی! یہ سرسرا ل والے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں؟“

ورنہ نے خود بہت مضطرب کر دیا لیکن سرسرا ل اس کے کہوں پہ لگی نہ تھی۔
 ”بے وقوف۔“ وہ اتنی ہی کہہ گئی۔
 ”اے! یہ سنو! اب ان دونوں کو ہی کر کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جانب دنگا تھا۔“

”اے۔۔۔“ ناعمہ کے کہوں کے لیے اختیار نکلا۔ ”عزیز! تمہیں۔“ وہ خوش ہو کر بستر سے نکل کر اس کی جانب بڑھی۔
 ”کہ تو نا خدا خدا کر کے تو آخر تمہیں ہماری یاد آگئی۔“

اس کے قریب پہنچ کر ناعمہ قدرے ٹھنک سی گئی۔ ”عزیز! یہ حد ہے۔ تاثر سے انداز میں کھڑی تھی۔ ناعمہ دیکھتا ہے کہ ہر خوش اور اذیتناہ انداز نے بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ اس کی آنکھوں میں سرور میں واضح شگفتہ نظر آتا تھا۔ ناعمہ نے قدرے پیچھے ہٹ گئی۔

”اے! عزم! یہ! ورنہ نے بھی خوش مزاجی سے اسے مخاطب کیا۔ ”اندر آکر بیٹھو نا! وہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے کیا؟“
 عزم نے ناعمہ سے نظریں ہٹا کر ورنہ کی جانب دنگا پھر ایک ایک قدم بڑھا کر اندر چلی آئی اور بستر کے کوٹے پر بے حد تکلف سے کتب گئی۔ ناعمہ بھی اس کے قریب آگئی۔

”تم دونوں باتیں کرو۔ میں بیٹھے تنگ جائے بنا لاؤں۔“ ورنہ اچھٹے ہوئے بولی۔ ”ہم نے بھی شام کی چائے اب تک نہیں پئی ہے۔“

”تمہاری باتیں سن کر میں نے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر دوبارہ ناعمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی نظریں بے حد جھپکی ہوئی تھیں جس نے ناعمہ کو تجا نے کیوں خوف زدہ کر دیا۔
 ”گلابات سے عزم سے۔“ دھالا خربولہ تھی۔ ”تمہیں اچھے عجیب سے انداز سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“
 ”ناعمہ! تمہاری مصیبت ہو گئی ہے۔“ ورنہ سرسرا ل ہوئی آواز میں بولی۔

”بالفہم! تم نے ٹھیک سنایا۔“ ناعمہ نے سر ہلایا۔
 ”خوش نظر آ رہی ہو۔“ اس کے لیے جس زہر سکاھا۔ ”کہاں کھلی ہے قسمت؟“
 ناعمہ کا منہ حیرت سے کھلا۔ اسے لگا ہی وہ عزم سے نہیں سمجھتی تھی۔ وہ بچپن سے جانتی تھی۔

”ایک بات تمہادوں تمہیں۔“ اس سے پیشتر کہ ناعمہ کو بول پائی وہ پچاس لیچے میں گویا بولی۔ ”دوسروں کے غم کو دالے دالے دالے بھی خوش نہیں رہا ہے۔ تو یہ طور پر انہیں خوشیاں راس اچھی جائیں تو یہ ایک یکن کی ناگوار میں لے دو وقت ہے۔“

”عریشہ“ ناعمہ کے لب کا پنے۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کس کے حصے پر ڈاکہ ڈالا ہے میں نے۔ کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟“
 اس نے قبل کہ عریشہ کچھ بولتی، رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔
 ”ماشاء اللہ۔۔۔ بھی آج تو ہماری عریشہ بیٹی آئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“ عریشہ باطل خواستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ جیسے زرب لب بولی۔
 ”وعلیکم السلام۔“ جیتی رہو۔ کیسی ہو بیٹی؟“ رابعہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنوز سرواندازیں بولی۔
 ”ناعمہ کی منگنی کے بارے میں پتا چلا تمہیں؟“ رابعہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔
 عریشہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
 ”مجھے تو چل گیا ہے۔۔۔ ناعمہ کو بھی چل جائے گا۔ چلتی ہوں۔“
 وہ مڑ کر اچانک ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رابعہ بیگم نے اسے اور ہجرت سے ناعمہ کی سمت دیکھا۔ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”کیا مطلب اس بات کا؟“ وہ بڑبڑائیں۔

”پتا نہیں آئی جی۔۔۔“ ناعمہ منمنائی۔

اسی لمحے دروازہ چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”ہاں بیٹی۔۔۔ عریشہ کہاں گئی؟“ رابعہ بیگم نے اسے اشارہ کر دیا۔
 ناعمہ کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔

Urdu Novels



وہ دوسرے کھانے کی تیاری کر کے کچن سے نکلی تھی۔ سامنے بیٹھی منیہ بیگم کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھک سی گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
 ”امی جی۔۔۔“ ربیعہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”کیا بات ہے۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ جب سے ان کی طبیعت ایک مرتبہ بگڑی تھی تب سے نجانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا سا لگتا تھا۔ وہ اب انہیں کچھ بھی نہ کرنے دیتی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہو تا تو وہ اگلے دن کے کھانے کی زیادہ تیاری رات میں ہی کر لیا کرتی اور اگر آف ہو تا تو نہ صرف ناشتہ بلکہ دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہی بناتی تھی۔
 منیہ بیگم اپنی سوچ سے نکل کر اب محبت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔

”ہاں ربیعہ۔۔۔“ پھر وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری جیسی خدمت گزار بیٹی جس ماں کو مل جائے۔۔۔ اسے کچھ ہو سکا ہے بھلا؟“ ربیعہ کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی ان سے لپٹ گئی۔

”امی جی۔۔۔ آپ کی بیٹیاں واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔ اتنی اچھی اتنی پیاری، شفیق ماں قسمت والوں کو ملتی ہے۔“
 ”تم بھی میری بیٹی ہو ربیعہ! یقین جانو۔ مجھے شہلا، انہیکا اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے

”آپ سے بات ہو رہی ہے جناب!“ ”شرارت بولا۔ ”موسو تو خود بخود ہی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ مابدولت کا سوال مثال کی ہیں۔“

”نہیں! آپ کی بات نہیں ہے۔ آپ کا دل چاہ رہا ہے تو ضرور چلتے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آئی تھی۔ ”آپ کو کیا بات آپ تک شخص ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“ اس نے قدرے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔ ”مختصر۔ پھر کچھ ڈیڑھا گروہ کہاں چلیں؟“

”چاہتا ہوں۔“ ”وہ فوراً بولی تھی۔“

”وہی بات سن۔“ اس نے فوراً اتفاق کیا۔ ”چلو پھر گھر پہنچو، تو فوراً رست کر کے فریض ہو کر نکلیں گے۔“

”موسو کو بھی لے لیں گے۔“ اس نے اسے بتا دی تھی۔

”باشم کی جانب سے پھر کچھ کاوقف ہو۔“

”اگر۔“ ”چند لمحوں بعد بولا تھا۔“

”خدا حافظ۔“ ”خدا حافظ۔“ ”خدا حافظ۔“

”پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔“ ”باشم کی جانب سے وہ پھر کچھ کاوقف اسے ڈسٹر کر گیا تھا۔“ ”نجانے اسے عمر کو کبھی

سمجھنے لے جانے کی بات کرنا چاہیے۔“ ”پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔“

”گھر تک پہنچنے پہنچنے کے بعد کچھ سوچنے لے جانے کا بار کبھی نہیں کر چکی تھی۔“ ”نجانے کیوں اس نے محسوس کیا

تھا کہ اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

دیکھ سکتی تھی۔“ ”اگر اس کا دل چاہتا تو وہ اپنی اہلیت صرف شہر کی ہر ایسی کاخ و شاہی محل میں منہ بٹھا اور شہر کے شاہی محل کی کھڑکی سے

محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”رہیدہ کا دل مزید پھلکا۔ اس کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر چپ چاپ منیوہ بیگم کے آگلیں میں گم ہو گئے۔

اس نے ان کے کانڈھے سے سر نہ اٹھایا۔

”رہیدہ!“ ”انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔“

”جی ہاں۔“ ”وہ چند لمحوں بعد بولی۔“

”دیکھو! تم نے پوچھا نہیں۔“ ”کیون اب پوچھنے کو دل کرنا ہے۔“ ”پچھ اپنے بارے میں تھاؤ! اپنے پس منظر

کے متعلق! اپنے گھر والوں کے متعلق۔“

”رہیدہ نے ان کے کانڈھے سے سر اٹھایا پھر نظریں نیچی کیے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔“ ”اس کا دل چاہا وہ انہیں

شرع سے آخر تک سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دے۔“ ”یوں بھی اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات تھی جسے نہیں سنو

کسی سے چھپانا چاہتی۔“

”کیون پھر اسے عباد کا خیال آیا۔“ ”اس کے سب کچھ کہہ دینے سے عباد کدم اسے گھر والوں کی نظروں میں نہ آتا۔“

”جائے اور پھر جن حالات کے تحت جس طرح وہ عباد کے ساتھ آئی تھی، شاید اس کے گھر والوں کے لیے وہ بھی قابل

قبول نہ ہو۔“

”منیوہ بیگم اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہوئے۔“ ”مستراؤں پر انہوں نے رہیدہ کے ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں لیے۔“

”عباد کہہ رہا تھا۔“ ”اس کے کسی دوست کی بہن ہو اور وہ کسی کے سلسلے میں باہر گیا ہو ہے۔“

”جی۔“ ”وہ بھی وہی نظروں سے غفلت اٹھائی کہ نہ۔“

”تمہارے ماں باپ۔“

”رہیدہ نے نظر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔“ ”ان کی آنکھوں میں اعتبار اور محبت تھی۔“

”وہ حیات نہیں ہیں۔“ ”وہ دھڑکتے ہوئے ہیں۔“

”ماں کے متعلق اب ایسے مت کہنا۔“ ”وہ شفقت سے مستراؤں میں ہنس رہی تھیں۔“

”جی۔“ ”رہیدہ ایک بار پھر بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی۔“

”وہ ڈوبتی آف کر کے اینٹیل سے نکل ہی رہی تھی۔“ ”جب باشم کی کال آئی۔“ ”شہلانے موبائل اسکرین پر چمکاتے نام

کو قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔“ ”ان وقت میں تو وہ اچھا بھلا بڑی ہو تھا۔“

”میلے۔“ ”اس نے موبائل اٹھ لیا۔“

”عزیز من۔“ ”کہاں ہیں آپ؟“ ”وہ کالی خوشگوار موڈ میں لگتا تھا۔“

”میں بس گھر کے لیے ہی نکل رہی تھی۔“ ”آپ کہاں ہیں؟“

”میں بھی گھر جا رہی ہوں۔“ ”سوچا تمہارا شیفول پنا گلوں۔“ ”ذکر کے متعلق کیا خیال ہے؟“ ”آج کیس باہر چلے

ہیں۔“

”شہلا کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔“ ”اس کے لب مسکرا دیے تھے۔“

”خیریت۔“ ”ہمت موڈ میں تھیں۔“

”بھائی بیگم نے سنہ“ وہ بولا۔ ”اور زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے محض یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے پچاس ہزار کاڈرافٹ بھیج دیا تھا اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیتا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو گا!“

ایقان چند لمحے خاموش کھڑی ہوئی کاتھری پھر اس نے ریسیور سائیڈ میں پٹا تھا۔

”مومن۔! یہاں آؤ۔“ وہ چلائی۔

مومن دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”جی ماما؟“

”فون پر بات کرو۔“ وہ وہاں سے جانے لگی۔

مومن نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تھا پھر اگلے ہی لمحے اس نے بے ساختہ مسرت اور اشتیاق سے گھنگو کا آغاز کیا تھا۔

”بھائی! السلام علیکم میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

ایقان کمرے میں چلی آئی۔ ایمان بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ضبط محال تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے کتنی قطرے نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہوئے۔ کس سنگ دلی سے اور بے مری سے اس نے بات کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہی لہجہ پھول برساتا تھا۔ مومن بات ختم کر کے کمرے میں آیا تو وہ اچھا خاصا رو چکی تھی۔ پوٹے متورم ہو چکے تھے، وہ اسے دیکھ کر جلدی جلدی چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”ماما! اب ایمان کا پتہ رہے تھے وہ بھی ہم لوگوں کو مس کر رہے ہیں۔“

”جھا!“ وہ گڑبڑاتی ہوئی بولی۔

”اور ماما! اب ہمارے لیے بار سن بھی بیج رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے شاپنگ کی ہے!“

”اچھا بیٹا! ٹھیک ہے۔“ اس کا دل پھر بھرتے لگا تھا۔

”ماما! آپ ہمارے نہیں کر تیں؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ایقان گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔



شہلا چہرے پر کلنزنگ ملک لگا کر اب نشو سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز پر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ یقیناً ”ہاشم ہی تھا۔ شہلا آئینے کے سامنے سے ہٹ کر دروازے تک چلی آئی۔

لاک کھولنے تک اس کے ذہن میں یہ خیال رائج تھا کہ باہر یقیناً ”ہاشم ہی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔ باہر فاروق حسن ہوں گے اس کے تو وہم و گمان میں نہ تھا۔

شہلا بیٹے! آپ کا فون ہے۔“ وہ باہر سے پوئے۔ ”کارڈ دروازے ایکسٹیشن سے بات کر لیں۔“

”جی۔ جی انگل۔!“ وہ ہکا کر رہی رہ گئی تھی۔

پنک نیٹ کی ٹائی میں ہنا شمال کے ان کے سامنے آجائے پر وہ حد درجہ خفت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سخت سست سنائیں۔ دروازے پر کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خوشحال یا گاؤں وغیرہ لینا چاہیے تھا۔

خود سے لڑتی جھگڑتی، برا بھلا سمجھتی نہ فون تک چلی آئی تھی۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا تھا کہ اس وقت بھلا کس فون ہو سکتا تھا۔

”ہیلو“ اس نے ریسپو راتھا یا۔

”ہیلو“ دوسری جانب ابرار تھا۔

شملہ کے اوپر جیسے براڑوٹا، ابرار کا فون اور وہ بھی گھر کے نمبر! فون فاروق حسن نے ریسپو کیا تھا یہ سوچ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

”تم تم تم نے یہاں... اس کے حلق سے آواز نکلتا مشکل ہو گئی۔
”کیا کروں؟“ وہ بعد مطمن تھا۔ ”موبائل پر نمبر کیہ کر تم فون ریسپو نہیں کرتیں۔ بجوزا“ مجھے اس نمبر فون کرنا پڑا۔“

”میں نہیں ریسپو کروں گی تم اس نمبر کال کرو۔“ اس نے یہ تمنا شاہد کر دی تھی کہ کہہ کر ریسپو راتھا تھا۔
”کچھ دیر دیکھ کر دیکھ لو، اس نے دل کی دھڑکن سن کر ہی پھر تیز تر قدموں سے چلتی اپنے بکھرے کپڑے پہنی تھی۔

”بس تو رخ اس کا موبائل پر چڑھا تھا۔ شملہ نے عجیب کر موبائل اٹھا یا تھا۔
”کیا بات ہے ابرار! کیوں میرا تمنا بنا رہے ہو؟“ اس کے لیے جسے جہاز کی در آئی تھی۔

”تم میرے جذبات سے کھیل رہی ہو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ وہ بخشنا انداز میں بولا۔
”کتنے دن سے میں تمہارا سیل فون نمبر ڈرائی کر رہا ہوں لیکن تم ہر مرتبہ مجھے مایوس کرتی ہو“ آخر بات کر لینے میں تمہارا کیا جانا ہے؟“

”ہمارے دو رشتہ دار اب ایسا کیا ہے جس پر بات کی جاسکے؟“
”ہمارے عمر سے ہمارے درمیان!“ شملہ ایک سخت خاموش ہو کر رہی۔

”شملہ! میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں۔“ قائل طور پر۔
”شملہ! کوئی دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن نہ ہو جائے گی۔“

”نہیں۔۔۔“ اس نے سنا تھا اس کے بولوں سے نکلتا تھا، ”تمہیں ابرار پر کیا دلچسپی ہے؟“
”تو پھر تم ایک رات بیٹھ کیوں نہیں کر لیتیں؟ کیا رکھا ہے اس شخص میں؟“ اس نے گھر کو شملہ!

”میں نے تمہارے لیے کیا کچھ کر رکھا ہوا ہے اور اور کچھ میرے دل میں ہے وہ تو میں تمہیں دکھا بھی نہیں سکتا۔
”یقین کرو شملہ! تمہاں کو نہ ہوگی۔“

شملہ کا اپنی بے بسی پر رونے لگا۔
”دیکھو شملہ! اوصاف بات یہ ہے کہ میرے مہر کی جذبات ختم ہو چکی ہے۔“ وہ مزید بولا ”میں اپنے بیٹے سے اب کسی طرز علیحدہ نہیں رہوں گا۔ وہ بھی خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ اس کے پاس ماں رہی نہ باپ۔

جب تک تم اس گھر میں نہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں مجھتا ہوں اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے جبکہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا بہتر سمجھتی ہو؟“

”میں؟“ وہ غائب جاتی سے بولی۔
”ہاں تم۔۔۔ فیصلی کی تمام دیریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ یونہی ایک مختلف خانوں میں بیٹھی ہوئی زندگی جیتی رہو یا پھر میرا آجائو! یہاں زندگی مکمل ہے۔ گھر مکمل ہے۔ ہر چیز تمہاری ہے مکمل تصرف کے ساتھ!“

شملہ آکر کمرے میں سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا، تم نے کس وقت چلا آیا تھا۔

لیاس تبدیل کر کے دوڑ رنگ دروم سے باہر اترتا تھا۔ شاید جس وقت وہ فون سننے کو مرنے سے باہر بھی تھی تب ہی ہاشم کی اوائی ہوئی تھی۔ موبائل فون سے لگاتار غائب جاتی سے ہاشم کو کتنے گلی تھی۔

”اور سنو شملہ! ایک بات یاد رکھنا جتنے عرصے تم وہاں ہو اس درمیان تمہیں کسی طور بھی پر یگنٹ نہیں ہونا۔ یہ وہ چیز ہے جو تمہیں ایک ناقابل تصور مشکل میں مبتلا کر دے گی۔ تم کسی کنارت سے نہ لگ سکو گی۔ اسی مجبور میں پیشہ کے لیے پھنس جاؤ گی۔ سمجھ رہی ہو؟“

شملہ کے منہ سے ایک لفظ نکلتا محال تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہاشم کو کچھ جاری تھی جو کبھی کبھار اس پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔

”جی! لاٹکان اس بات کا خیال رکھنا ہی بہتر ہے!“
شملہ نے موبائل آف کر کے جان ہاتھوں سے ایک طرف ڈال دیا۔

”یہ کیسی گفتگو تھی؟“ ہاشم نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ”نہ ہوں نہ ہاں! تمہیں لمبی بھری غریب سنا بات تھی۔“

”جی۔۔۔ شملہ! اگلے ہی دیکھا“ اس کا کہا؟“
ہاشم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا پھر غیبتی میں سر ہلایا۔

”کچھ نہیں!“ وہ بولا تھا۔

”تم اس دن آئیں نہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔“ وہ نے شکوہ کیا تھا۔ ریشہ نے لان کی روش پر چلنے سے تھک کر اس کی جانب دیکھا۔

”وہاں دو روز سے وہاں دو عذرت خواب نہ انداز میں رہی تھی۔“ مجھے تو تم سے عذرت کا بھی خیال نہ رہا اس لان چند ایک کام لیے نکل آئے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی نہ آسکی۔

”خبر چاہئے۔۔۔ میں اب تم سے عذرت کی منتی پیش ہوں یونہی ایک ذکر کر رہی تھی۔“
”دونوں پھر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ کلاس آگے کے بعد وہ چل قدمی کر رہی تھیں۔ اچھی مجلس شروع

ہوئے میں تقریباً“ آج کل کے بانی تھا۔ وہ کب شپ کی غرض سے باہر چلی آئی تھیں۔
”تم نے سروزی کے فون نکال کر لیے ہیں؟“ وہ نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے سوچا کہ اس کی ضرورت ہے۔ میں آج اپنا کارڈ بھی لانا بھول گئی ہوں۔“ ریشہ نے بے چارگی سے کہا ”فون اس دور سے بڑے ہیں۔“

”سروزی! اساتذہ محسن کے معاملے میں اچھے سے سیکھت آؤی ہیں۔“ وہ نے اسے دھکیلا۔ ”ذرا خیال رکھنا۔“

”ہوں۔“ ریشہ نے غائب جاتی سے سر ہلایا۔
اس کی نگاہ دور سے غائب سے ان کی جانب آتے ہوئے راضی پڑی تھی سلاٹ گرین شرٹ اور بلیک پینٹ۔

بہار اس کا سر بالائی جانب نظر تھا۔ سن گھر مڑ گئے کمینوں تک آتھیں فولڈ کیے دو بے حد پیڑم گم رکھا تھا۔
”نہیں! تمہاں کہیں اور دو کھینے گئی تھی۔“

”اگر سے۔۔۔“ وہ کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔ ”یہ تو رافع ہیں!“
”اسلام و علیہ۔۔۔“ وہ ان تک آ پہنچا۔

”وعلیکم السلام“ وہ دونوں بھی بولی تھیں۔
 ربیعہ نے محسوس کیا اور وہ کے گلاں پر ہلکی سی سرخی اٹھی اور لب مسکرانے لگے تھے۔ ربیعہ بھی شائستہ سے مسکرائی۔

”کلاس تک ہو رہی ہے؟“ رافع نے انہیں چھیڑا تھا۔
 ”جی نہیں۔ ہم بہت ریموٹر اور پکٹوکل اسٹوڈنٹس ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی ”آپ اپنی سناپے کلاسز ختم ہو جانے کے بعد بھی یہاں نظر آ رہے ہیں۔“
 ”مجھے ذرا لاپرواہی میں کام تھا۔“ وہ ہنس دیا۔ ”اور یوں بھی یہاں سے جس کا رشتہ ایک بار بڑ جائے وہ اتنی آسانی سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔“
 ”لاپرواہی؟“ ربیعہ کو چانک سی خیال آیا تھا ”دیکھ نکلاؤ اس اگر زحمت نہ ہو تو۔“ آپ کے ہاتھ خالص تعلقات بنے ہوئے ہیں!“

”ہائی ہیلو۔“ اس نے ذرا سا سر خم کیا۔
 ربیعہ نے یکے سے نوٹ تک نکال کر اسے کتابوں کے نام لکھ دیے۔ رافع نے ایک نگاہ ان ناموں پر ڈالی۔
 ”اوکے ربیعہ! میں دیکھ نکلاؤں گا مجھے ذرا دیر ہو جائے گی میں شام کو دیکھ آپ کے کمرے جاؤں گا۔“
 ”بہت بہانہ ہوئی آپ کی۔“ ربیعہ خوش ہوئی۔
 ”اب بلیئر تکلف سے گریز کریں!“ وہ ہنسا ”میں اب چلتا ہوں مجھے چند ایک ضروری کام ہیں۔“ اس کے خدا حافظ!“

وہ ایک سمت کمرے اپنے منہ دو سمتوں کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے وردہ کی جانب نگاہ کی اور پھر جوت پہنی۔ وردہ کے رخساروں پر آجائے والی وہ چمک غائب ہو گئی اور دونوں پر لڑکتے ہوئے جھلکوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے ہر عکس وہ خالی خالی نظروں سے دو سری جانب دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کو سب کچھ سمجھنے میں لمحہ بھر لگا۔ رافع اس مختصر عرصے میں محض ربیعہ سے جو کلام رہا تھا وردہ سے مخاطب ہونے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ دو سری جانب ربیعہ بھی اس کی اندرونی کیفیت سمجھنے پر جڑی ہی کے لگی تھی۔ شاید ان دونوں نے وردہ کو نظر انداز کیا تھا۔ ربیعہ نے اپنے اندر شرمندگی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ لیکن اس کے پاس ایسا کچھ نہ تھا جس کے لیے وردہ سے معذرت کی کر سکتی۔

”چلیں!“ وردہ نے اسے سوچنا دیکھ کر خودی کما تھا ”سرنی کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔“
 ”ہوں؟“ ربیعہ چونکی ”پاں چلو۔“
 جی ہاں جی میں شرمندہ ہوئی وہ اس کے ساتھ چل دی تھی۔

”آئیے!“ ناعمہ نے کمرے میں بھاگنا کہا ”چائے پیئیں گی؟“
 ٹوس بنائی ہوئی وردہ چمک اٹھی۔
 ”ہاں ضرور۔ میں تو خود ابھی چائے بنانے کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔“ وہ مصروف سے انداز میں گویا

بولی۔
 ”یکوڑے بنالوں ساتھ میں؟ پورے کی چٹنی کے ساتھ؟“
 ”وردہ نے اب کی بار خاصی حیرت سے اس کی جانب نگاہ کی۔“

﴿قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے﴾

قرآن مجید کی ہندسہ آیات اور امارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی شہادت میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔
 ان کا احترام آپ ہر فرض ہے۔ لہذا جن بات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے منظر رکھیں۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات؟“ نیکی اور پوچھ پوچھ؟“

ناعمہ کچھ عجیب کر مسکرائی اور عتاب ہوئی۔ وردہ چہن واقتول میں دیکھ کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر مسخ خیر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاید اس کی اور رابعہ بیگم کی نصیحتیں اثر کر رہی تھیں۔ سر جھٹک کر اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہوئی۔ پھر یکدم ایک لمبائی میں خاص بھر کر کچھ سوچنے لگی۔

”مجھے بتائیے کیا بات تھی؟“ اس کی کتابوں میں دل نہ لگ رہا تھا۔ بجائے کیا احساس تھا جو مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔
 وہ کس سوچ سے بچھا چھڑانا چاہتی تھی؟ اسے خود بھی نہیں آ رہا تھا! ناعمہ جلد ہی اٹھی تھی۔ اس نے رُے میں قریب سے برتن سپٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ میں گرما گرم پکوڑے، چینی کی پیالی میں خوش رنگ چٹنی اور ساتھ میں دم کی ہوئی چائے۔

وردہ نے بے حد حیران سے ہر چیز ملاحظہ کی۔
 ”یہ کیا آتی جلدی؟“ اس نے کھڑی ہو کر ڈالی۔ ”آپ کھٹے کھٹے بھی کم عرصے میں تم نے یہ سب کچھ کر لیا؟“
 ”کیا کیا تھا؟“ اس نے حد امتیاز سے کھینچ کر ڈال کر اس سے بچاؤ منٹ میں پکوڑے بن جاتے ہیں۔ یہ اگر کوئی نہیں چینی (چائے) کی کڑواہٹ سے ہاں لگتا ہے میں کچھ دیر کیے اس میں میرا کمال کیا ہے؟“
 ”نعمہ! وردہ نے لڑکتے ہوئے اس کی طرف دیکھی۔ ”اوپر سے کچھ مری بن سکھو! آپ نے مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی ہے شاید۔“ ویسے پیاری بہانہ یہی دیکھ کر جیسے نیکی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کرنے کی سکت میں رکھیں۔ خیال رکھنا!“

”میں تو بس اتنا ہی کر سکتی ہوں۔“ وردہ گرما گرم پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔ ”اور اس سے پہلے کہ پریٹ میں ایسی ہی صاف کر جاؤں گا کچھ خود وصولی کریں!“
 ”اے کوئی ملا لوانا۔“ وردہ نے اسے کھورا۔

”بجائے ایسی کھانا ایسی ہی طرف کی ہوئی ہیں۔“ وردہ نے ان کی امان آج کل ایتان خالہ کے مسئلے پر روزانہ پُر زور گفتگو کرتی ہیں۔

”ہاں!“ وردہ کے چہرے پر ملال ابھرا ”یقیناً خالہ!“
 ”آئی!“ ناعمہ نے دے دے کے پلو سے ہاتھ صاف کیے ”ایک بات کہنی تھی آپ سے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں؟“

”ہائیں۔“ وردہ کو حیرت ہوئی ”تمہارے منہ بیٹ ہیں سے مجھے یہ امید تو نہیں ہے کہ کوئی بات کہنے میں تم کو تنگ کر دوں اور وہ بھی مجھ سے؟ مجھ سے تمہارا کیا بار ہے؟“ ناعمہ کے چہرے پر کش مکش کے رنگ ابھرے تھے۔ ”تو اب! آفریقہ کا فون آیا تھا کچھ دن پہلے۔“ وہ چاہتی تھی کہ میں فون پر بات کر لوں۔ میں نے اسے پہلے تو منع کر دیا لیکن اس کے اصرار پر میں نے کہا کہ میں آپ سے پوچھ کر تاؤں گی۔“
 وردہ کے ہاتھ میں پکوڑا تھا جسے وہ منہ میں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ ناعمہ کو دیکھنے لگی۔ جو جھکی جھکی نظروں سے بات کر

ری تھی۔

”چچا تھیں آئی۔ اچھے کیا اس سے بات کر لینی چاہیے یا پچھڑی سے بھی پوچھ لوں؟“
 ”ناعمہ! وہ بولے سے مسکرائی۔ ”مجھے امید تو نہیں تھی کہ میری بدھوشی میں اس اتنی عقل بھی ہو سکتی ہے!“

”اب تو یہ مجھے اندازہ لٹیٹ کرتی ہیں!“ اس نے شکیانہ نظروں سے بہن کی جانب دیکھا ”اب میں جانتی بھی کہ عقل نہیں ہوں۔“

”جانتی بھی؟“ ورنہ کو ہنسی آئی ”جنگ کام نہ فہم۔ بس تھوڑی سی کم عقل ہو اور مجھے لگتا ہے کہ یہ خالی بھی دور ہوئی جارہی ہے۔ چرخ جہاں تک فراز سے بات کر لیتے کی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک حد اور تیز کے اندر کر بات کر لیتے ہیں کوئی مزاج نہیں ہے۔ میں اسی سے بھی دس کس کر لوں گی۔ مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو گا۔ رافع کے حوالے سے انہوں نے بھی مجھ پر کوئی معمولی سی پابندی بھی نہیں لگائی۔ اسی لیے مجھے بھی اس پر غصہ کے خاص ہونے کا اتنا احساس بھی نہیں ہوا اور پھر ان کی عقلی اچھی جلی ماڈرن ہے۔ جب تک ہم نے ان سے رشتہ جوڑا ہے تو پھر ہمیں ان باتوں کو بھی ذہن نظر کرنا ہو گا۔ اب اگر فریج کا فون آئے تو ہم بے شک فراز سے بات کر لیں گے۔ لیکن اخلاقی تقاضوں کو ذہن نظر رکھتے ہوئے۔ یہی رہی ہو تا یہی بات کہیں؟“

”جی آئی۔“ ناعمہ کی آنکھیں بے ستور ہو چکی ہوتی تھیں۔ ”وہ سے یہ ٹاپک ڈسکس کر رہے ہوئے جو جینین محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا عمل اس کے چہرے پر واضح تھا۔

”چلو اب تم مجھے جانے کا پتہ دو اور اپنے یہ ریڈیو سیز پکڑو گے۔“ لے کر بھاگ رہا تھا۔ ”مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔“

وہ اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ ناعمہ اس کے لیے جا رہی تھی۔ ناعمہ کے جانے کے بعد ورنہ ایک مزید پھر سچوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ فراز اس سے کہتے کے حوالے سے ناعمہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کہیں کسی گوشے میں اس احساس کو خود بخود ہی کی ناکام سنی کی۔ پھر ایک سال بھر کر جانے کا پتہ لیں سے لگایا تھا!

رات کا شاید آخری پیر تھا۔ سو نے کی کوشش میں ہر طرح سے ناکام ہو کر شملانے بے بسی سے ایک برتہ بچھو۔
 گھڑی کی جانب دیکھا تھا۔
 ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شملانے بے قرار ہو کر روٹ بدلی۔

”میں عمر کو اپنی کسبندی میں لینا چاہتا ہوں قانونی طور پر۔“ اس کے کانوں میں ابرار کے الفاظ گونجنے۔
 یہ جینین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ سترے اتر کر بے قرار کی سے کمرے میں ٹھننے لگی۔

”جب تک تم اس گھر میں نہیں مت تک بات دو سہری بھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز انہیں ہے۔ جب کہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی بھی نہیں ہے!“ شملانے نے بیسی سے لب کاٹے۔
 ابرار کی بات کی صورت بھی غلط نہ تھی۔ عمر چاہے اس باب کے ہوتے ہوئے بھی اپنی نانی کے گھر رہا تھا۔ وہاں سے بھی دور ہو گیا تھا اور اب بھی۔ ایسی صورت میں اگر واقعی ابرار قانون کے ذریعے اسے حاصل کرنا چاہتا تو اسے پہلی کوشش میں ہی کامیابی مل جاتی۔ یہی بھی شملانہ بخوبی جانتی تھی کہ قانونی طور پر عزم ابرار کا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کاغذ آگ آئے ہوں۔ عمر سے جدا ہونے کا تصور جان لیوا تھا۔ عمر تو اس کے سینے میں لپ کی جگہ دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اپنے نظروں سے دور کرنے کے بارے میں سوچ سکتی بھی بھلا؟

”میں نے غلطی کی ہے۔“ وہ زور پر بڑبڑائی ”شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی بہت سی غلطی کی ہے۔ وہ اگر عمر کو لے گیا تو کیا رہے گا میرے پاس؟“ یہ درست تھا کہ وہ شادی کر کے ہاشم کے ساتھ جاتی تھی مگر اسے اطمینان تھا کہ اس کا عزیز زان جان بیٹا چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ خود روزانہ ہی چلا آتا تھا۔ فریج کے مناسیب روئے اور غصہ کی بو کی رو کی بغیر۔ پھر شروع سے ہی وہ بہتر و بہتر کے بے حد قریب رہا تھا۔ ماں سے زیادہ وہ نانی کے قلب کی عادت تھی۔ ابرار کے ساتھ جا کر وہ مینٹلی طور پر کس قدر ڈسٹرب ہو سکتا تھا؟ شملانہ کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی شخصیت و خصوصیت میں رٹ کر رہ جاتی۔

”میں نے اپنی تمام ذہنی قوتیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔“ اسے پھر ابرار کی بات یاد آئی ”نہی تو ایک مختلف خاتون میں ہی ہوئی زندگی تھی۔ راجہ پھر یہاں آجائے۔ جہاں زندگی مکمل ہے۔ گھر مکمل ہے۔ ہر چیز تمہاری ہے۔ مکمل تصرف کے ساتھ!“

شملانے لب بٹھینچے تھے۔ ایک تکلیف کا احساس اس نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ وہ اس شخص کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جب اس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کا انتخاب کیا تھا تب یہ مکمل زندگی مکمل گھر اور مکمل تصرف کہاں تھا؟ تب کیوں اس نے اسے ایک ایسے گھر میں لے جا چھوڑا تھا جہاں کچھ بھی اس کا نہ تھا۔
 ”کہہ دو جہاں ابرار کی عمر بڑھ کر ایک عورت کے ساتھ رہنے سے متاثر ہوئی۔“

وہ حرکت کرنا نہیں لگا۔ اس نے سوچا کہ اس کے سوال کے جواب سے کیا ملے گا؟ لیکن اسے ایسا کرنا نہ بہت دیتا تھا۔ ان کو بات سے وہ کوئی بھی مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ شملانہ ہی دل میں شرمندہ ہو جاتی اگر اس کے الفاظ کوئی اور سنی اختیار کر لیتے۔ لیکن اب بھی کوئی راست بھانپ کر دیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف اندھرائی اندھ نظر آ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس سے وہ کمر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ آنکھوں کو تھیلیوں سے پوچھتے ہوئے وہ بہت تک پہنچ گئی تھی۔

اپنی جگہ پر لیٹے ہوئے اسے اپنا کانک سی، خوش کاما لیا ہاشم کھلی آنکھوں سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ شملانے براعتاری میں ایک برتہ بچھو اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہی تھیں۔ ہاشم نے ہاتھ دھوا کر اس کے رخسار کو چھو اور اپنی ”شملانہ! وہ گھبرا کر آواز میں بولا۔

”جی۔“ وہ اپنی جگہ چوری بہن کی تھی۔
 ”رات کے اس پس پس یوں اکیلے میں اس طرح جوسے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“
 ہاشم کے لیے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے شملانے کے اعصاب کو پتھر کی طرح منجمد کر دیا تھا۔

باقی (ستارہ سچے سے سچے)

ماشرکی اجانگ باکستان آمد ہونے کا نڈان کہ سرور کر دیتی ہے۔ تاہم ایقان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔
منورا کی سخت باتیں سن کر ریمہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر لیتی ہے لیکن فرزند اس کی ایک نہیں مٹتی۔ جس پر ریمہ کو
تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ریمہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ریمہ کا جناح گھر میں خستہ قدم کیا جاتا ہے۔ منہ، پیچ، ریمہ کو اپنی بیٹی بنالیتی ہیں۔
ہاشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی ناخ اور عریشہ کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی دو تیس رات ایبراہیم جانی کا خون شہلا کو برائیاں کر دیتا ہے۔ شہلا شادی سے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس
کی ملاقات ابراہیم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم، شہلا کو اطمینان دلانے کے لئے کہہ دیتا ہے۔
فرزند جو بدعت ناعم کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فرزند
کی آمد برائیاں کا باعث بنتی ہے۔ فرزند بھی سمجھتا ہے کہ خون پراس سے ناعم بائیں کرتی تھی۔
واقعہ کو ریمہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔
فرزند، ماشرک پاکستان چھج کر خون کرتی ہے۔ ماشرانے لینے اور پورا ہوتا ہے۔ ایقان، ماشر کے پراسرار رویے پر مشکوک
ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے بھی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سر درد اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے
دلہا سارے کوٹھن کر دیتی ہے شہلا، ریمہ کے ساتھ رالو بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ریمہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ریمہ
درد کے شور سے ایم اے سوخا لوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔
ماشر، لڑا ہے ملنے ہوئی اسلئے تو لڑا ہے پر پورا کر دیتی ہے۔ ماشر، لڑائی پیش کن دکر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رد مال، ایقان کے
ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ ماشر سے محبت پوچھتی ہے۔ ماشر کو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً صدمے
سے گنک رہ جاتی ہے۔

ریمہ، درد سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا جاتا ہے کہ درد کی سنگی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خراسان سے
دو مار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے مبداء میں ہی کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ درد کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات
محسوس نہیں کرتا۔

UrduPhoto.com

ایقان، ماشر کا گھر پروردگار کے لیے بھیجے آجاتی ہے اور ماشر کی تمام تر تعلیم و باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے
تعلق اٹھ کر لیتی ہے۔ وہ ماشر کی بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد
پریشان کن ہے۔ ماشر چھاپاں جاتے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

”شہلا گھر کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بظاہر سویا ہوا محسوس ہوتا ہاشم نہ
صرف جاگ رہا ہو گا بلکہ اس کی بے چینی اور بے قراری کا عینی شاہد بھی ہو گا۔ شہلا کو یوں لگا جیسے ہاشم کی آنکھوں
میں اس کے سوال سے بڑھ کر بے اعتباری تھی۔ ہاشم نہایت آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ تنگی سے ٹیک لگا کر اس نے
دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے تھے اور اب سوالیہ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت ٹائٹ
لیپ کی مدھم دودھیا روشنی میں شہلا آن آنکھوں کو بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر اپنے گالوں پر
آئے آنسو کو ایک بار پھر صاف کرنا چاہا۔ ہاشم پورے حواسوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ تھا۔

”شہلا!“ اس نے بے حد دھیمی آواز میں پکارا۔ ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ شہلا سے کوئی جواب نہ
پڑا نہ ہی نظریں اٹھائی گئیں۔

”کیا ان آنسوؤں کی آمد میں میری کسی کوتاہی کا عمل دخل ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ اب کی بار وہ بے اختیار ہی بولی تھی۔ ”ایسا ہرگز نہ سوچیں ہاشم! آپ سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی ہے تو اس یو کی میں کچھ ڈھونڈ سکتی تھی!“
 ”وہی تو پھر رہا ہوں وہ ذرا پریشان؟“ اس نے سر ہانکے ناٹم نہیں کی جانب دیکھا۔
 ”خراشیں کون کی بات ہے جو رات کے اس پھر نہیں یوں رکھا رہی ہے۔ یہ وقت تو اللہ والوں کا ہوتا ہے پھر دل والوں کا۔“

شملہ نے بے اختیار جو تک کر اسے دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں؟“
 ہاشم کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔
 ”جیسے میں نہیں سمجھا۔ میرے سوال کا جواب ابھی تک اودھا رہا ہے۔“ شملہ نے طرح پر زور دیا۔
 ”تاہم! میں نہیں شاید عمر کو کس کر رہی تھی مجھے یو کی رونما کیا ہے وجہ ہے اختیار۔“

”عمر کو کس کر رہی تھیں؟“ اس نے جیسے خود کھائی کی۔ ”عمر کو تو ہم نے رات بھر دیکھا ہے گھر ڈرا ب کیا ہے۔ کتنی دیر تک رہے ساتھ وقت گزارا ہے اور تم عمر کو کس کر رہی تھیں؟“ اس کے لہجے میں تجاہل نے کیا تھا۔ شملہ کا پیچھا وہ سلیمان بولی بین کر کہاں سے عائد ہو جاتا۔
 ”یہ کیا ناٹم؟“ لہجہ سختی۔ ”میں سوچا چاہتی ہوں بہت دور ہو گئی ہے۔“

اس نے آنکھوں پر یوں بانڈ کر رکھا جیسے اب مزید نہ دیکھ سکے۔ لہجے کچھ پچاندہ ہوا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ خیرند کو اب بہت دور کے لیے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔
 چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کی سانسز ٹھیک کی دروازے کھلے اور کچھ دیر ہوئے کی انداز میں۔ پھر اس نے ہاشم کو اپنی ٹانگ سے اٹھ کر جگایا۔ بونے محسوس کیا۔ وہ ٹھیک کی دروازہ کھول کر آیا تھا۔
 شملہ سمجھتی تھی۔ جب کبھی اسے سگریٹ کی طلب ہوتی تھی تو وہ ٹھیک کی میں چلا جاتا تھا۔ رات کے اس پھر اسے سگریٹ کی طلب کیوں ہوتی تھی؟ شملہ کا دل معمول سے ہلکا کر دیتا تھا۔ شملہ کی حرکت سے تجاہل نے اسے اپنے طور پر کیا فائدہ کیا تھا۔ شملہ کا کیا چاہا کہ وہ جا کر اس سے صاف نہ بچھڑے بلکہ کہ وہ کامیاب رہا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھوں پر بانڈ رکھے لیٹی رہی۔ ٹھیک کی میں کھڑا ہاشم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

باہر گاڑی کا ہارن بجتی ہے تو یہ تھیل پر جوش انداز میں اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ عمر سب سے پہلے شور مچاتا ہوا باہر کی جانب دوڑ گیا۔
 ”ہاموں آگئے۔۔۔ ہاموں آگئے۔“

ربیعہ ”انیقہ! اور منیوہ! بیگم! کی لاؤں گا! دروازہ کھول کر یہ بیویوں تک آگئی تھیں۔ فزا اور عباد کو لڑی کا دروازہ کھول کر اندر آ رہے تھے۔ عمر کو کچھ کر عباد نے اپنا اپنی کس بجے رکھا اور اسے اپنے پاؤں میں سیٹ لیا۔
 ”جیسی! بھائی! بھائی! شاد اللہ! شیریں کیا ہے!“ اس نے اس کا نشانہ بچکا۔ ”اب تو ہم کر دیکھ لیں گے۔“
 ”ہر لوں گا۔“ اس نے مکالمہ لیا۔
 ”مائی ہیلو راجا نو۔“ عباد نے قہقہہ لگایا۔
 پھر عمر کو انارکھہ ان تینوں کی جانب بڑھا تھا۔
 ”السلام علیکم۔۔۔ وہ اسے لپٹ گیا۔“

”و علیکم السلام۔“ انہوں نے محبت سے اس کا ہاتھ چوما۔ ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک آگئی۔ اللہ میاں نے میری دعا میں سن لیں۔ اب نہیں جانے دوں گی۔ سن لو!“
 ”تو اس کو ہو کر آیا ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”گھر ہو جائیں آپ کی گود میں سویا کروں گا۔“ انیقہ اور ربیعہ ہنس رہیں۔
 ”اور بھئی کیا حال ہیں آپ دونوں کے۔“ وہ ان کی جانب متوجہ ہوا۔ ”پڑھائیاں کیسی جا رہی ہیں؟“ نقیصہ

وقیصہ چل رہی ہیں یا رستے کا ہی سارا ہے؟
 اس کی بات پر انیقہ نے ناک پر چھائی جبکہ ربیعہ دل کھول کر ہنسی تھی۔
 ”تو یہ ہے عباد بھائی! اتنا گرا کر کھتے ہیں آپ ہمیں۔“
 ”ساری پڑھائیاں انہوں نے جو اپنے نام کھواہی ہیں۔“ انیقہ ”فزا کے سامنے ایسے نیار کس پر چل ہو رہی تھی۔“

”خیران بھی ان کی جھنجک سے محظوظ ہوتا مسکرا رہا تھا۔ اس نے بھی بڑھ کر ان لوگوں سے سلام دعا کی پھر عباد سے مخاطب ہوا۔
 ”غلام کو اجازت ہے جناب؟“
 ”جی نہیں۔“ عباد نے اسے گھورا۔ ”بھائی! میں نے خبر کیا لی ہے اب تک ابھی تو تم جانے کے ساتھ کئی طرح کے لوازمات لاؤ گے اور ہماری تواضع کر کے باقی البتہ جانے نہیں ہماری طرف سے مفت دی جائے گی۔
 جانے کے بعد میں تمہاری کھل کر خبروں لگا۔“

”منیوہ! بیگم! دروازہ دروازہ پر حیران ہو گئی تھیں۔“ اس غریب نے اچانک کیا تصور کر ڈالا ہے جو اس کے ساتھ ہے۔ یہ خبروں پر اس کو لگے۔ ”عباد! اب اس کے بجائے پھر فزا کو گھورنے لگا تھا۔
 ”میرے میرے بھائی!“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میں مجھے غلام ساس جیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے میں خود کو مظلوم ہو محسوس کرنے لگا ہوں۔“
 ”جی! میں بہت کمزور اب اس قسم کے رشتے ہی بھائی ہیں گے۔“ عباد نے اسے مزید چڑایا۔
 ”چپ چاپ ہمارے ہی محلے میں ہمارے ہی رشتے داروں کے گھر مگنی کر کے بیٹے کیا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں۔“

”خبر کیوں نہیں۔“ منیوہ بیگم نے فوراً ہی فرازی حمایت کی۔ ”بالکل خبر تھی ہمیں۔“ مگنی کی مٹھائی بھی دونوں کے پاس تھی۔
 ”لیکن میرا اس کا رشتہ تو ذرا استغیث ہے امی جی۔“ عباد ضدی لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو بہت پہلے سے سارے محلے کی خبر ہو چکا ہے جیسی نا۔“
 ”چلیں اب جانے کبھی دس عباد بھائی!“ ربیعہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ ”دوستی میں ایسی پھولی پھولی باتوں کو مانڈ نہیں کرتے پھر بھلا دوستی کا مطلب کیا ہوا؟“
 ”دش اس!“ فزا مسکرایا۔ ”دشیک! پور بیچ!“
 ”پھولی پھولی باتیں؟“ عباد نے قہقہہ سانس بھری۔ ”اچھا۔۔۔ خیر منیوہ سسی!“

”جہاں تک چاہے کے ساتھ لوازمات کی بات ہے تو اس کا ہم لوگوں نے پورا بندوبست کیا ہوا ہے۔ لوازمات بھی تیار ہیں اور چاہے بھی۔“ انیقہ نے بات مکمل کی۔ ”اب آپ سب لوگ اندر تشریف لے چلیں تاکہ شام کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوا جائے!“ انیقہ کی بات پر مسکراتے ہوئے سب ہی کے قدم اندر کی جانب بڑھ گئے۔

وہ اپنا کہا پورا کرتے ہوئے حقیقت میں مبنیہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”بس اب ہمیں جانے دوں گی۔ یاد رکھا! بےست پڑھائیاں ہوئیں۔ اب ماں کے ساتھ رہو۔ نجات
زندگی میں اب کتنی سانسوں کی مہلت باقی ہے!“

مشکل سے کورس کے لیے ایڈمیشن لے لوں گا۔ خدا انخواستہ آپ کو کیوں کچھ ہونے لگا۔ ابھی تو ہم نے بہت خوشیاں ساتھ مل کر منگائیں۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔“ وہ کچھ مطمئن، کچھ آرزو سی ہو کر بولی تھیں۔

”سب سے پہلے انبیاء اور ریحہ کے لیے رشتے دیکھنے ہیں تاکہ ان کی پرہیزی مکمل ہوتے ہی ان کے فرض سے سبکدوش ہوا جاسکے۔“

”بے فکر ہو۔“ انہوں نے اس کا کان کھینچا۔ ”وہ کہتی ہیں کہ اب تمہارے دل کے اچھے سر لڑکی دھونڈنا ہے۔ تمہا شاء اللہ بخالی ہے بھی فارع غوثیجے ہو۔ اور عیار راج پوچھتو تو میری اپنی خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد تمہارے بہرہ رسا سچا ہو جائے۔“

”وہاؤں!؟“ وہ انھیں دیکھا۔ ”یہ آپ کس پکوان میں بیٹھ گئے؟“ اچھی تو میری ذخیرہ ساری پلا تلنگڑ ہیں جن پر مجھے عمل

[illegible]

”ہاں“ چاند پر گنبد ڈالو گے۔“ وہ ہنسا پھر تدرے سنجیدگی سے بولا ”ہاں“ اسی کی ہلکے بات چھلکے ذوق امیر حسن سے ہوئی ہے۔“

”تو میرا نام عسکر ہے۔ لیکن یہ دعائی اور تجربے میں مجھے سے کہیں آگے ہے۔ اس کا برٹش لندن میں ہے۔ اب سے دو سو سال پہلے کے ہے۔ وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ وہاں لندن میں اس کے کاروبار کی یادگار ٹریڈرز سٹریٹ سٹیبل رہے ہیں۔“

بہت بڑے پیمانے کا کام ہے جس کے لیے اسے یہاں بھی اپنا ترنزی ضرورت ہے جو جیسے بھی جائیں اور کام پائیں
یہی مددیں ہیں نے امیر حسن کے ساتھ برقی شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چند ایک روز میں ہم ہر وجہ جیکٹ
مائن کر لیں گے اس کے بعد کچھ عرصے تک دن رات کی مصروفیت ہوگی۔“

”عہدہ!“ یہ کچھ پریشان ہو گئیں۔ ”تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے یہاں کیا ہے؟“

”سب ہے فکر میں۔ ہاں لیکن ہر نماز کے بعد کامیابی کے لیے دعا کرتا نہ بھولیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے
ایک دعا اور اخی منت کی قبول کا پورا یقین ہے۔“

”رہیجی جیسی بہرہ راہ کی آج کل کے دور میں نایاب ہے۔ اگر تم راضی ہو تو کیوں نہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ رکھ لیں۔“

اس کے کانوں میں منیوہ بیگم کی آواز کی بازگشت لہرائی وہ لڑکھ بھر کے لیے بے کل ہوئی تھی۔ پھر عمار کی یاد آئے لگیں تو اس نے سکون کا سانس بھرا۔

تو جیجی تھا کہ یہ گھر اسے بھی بے حد پسند تھا۔ یہاں کے کنبوں کے لیے اس کے دل میں بے حد فطری اور بے حد جیجی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بھی بیوہ تھیں اور رہا جاتی تھیں لیکن جس حوالے سے منیوہ بیگم نے یہ بات سنا تھی کہ منیوہ بیگم نے اس کا تصور بھی محال تھا۔ عمار نے ٹھک کہا تھا۔ ”بیوہ کے لیے اب اپنے پرانے حلقے کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے عمار بھائی تھا، صرف بھائی۔ منیوہ بیگم ہاں تھیں اور ان کے اور شملہ بزرگ اسی گھر میں رہتے ہوئے ان رشتوں کے بدلے کا خیال قطعا نہ تھا۔ لیکن طمانیت کی بات یہ تھی خود عمار بھی اس کا ہم خیال تھا۔ ”بیوہ وہیں کھڑی سوچی رہی۔ پھر اسے خیال آیا۔

”کیا اس کی بے گلی بے قراری کی وجہ کھلی تھی؟“

اس سے پرے اس نے سوا بھی کچھ تھا جس نے اس کی آنکھوں سے نمونہ ڈور کیا تو انہوں نے کیا تھا وہ؟ وہ انکھیاں پٹھانے لگی۔ عجب مشکل میں دل آن تھا۔ آخر کیا تھا؟ اس میں جو اسے یوں بے چین کر رہا تھا؟ کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے متعلق سوچی تھی؟ وہ کیوں اپنے دیکھنے کی تہی رہتی تھی۔ ان مسکراتی آنکھوں کے سر کو کیا نام دیا جا سکتا تھا؟

دو بار سے لگ کر کھڑے کھڑے اس نے خود سے لائیکر اور سوالات کر ڈالے تھے جن میں سے کئی ناہمی جواب اس کی سانس نہ تھا۔

”کیا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟“ چانک سی ایک سوال اس کے اندر سے اٹھ اٹھا۔

”بیوہ اس سوال سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس جواب سے ڈر جائے کہ بے نظریں پر ادبی تھی۔

”شاید ہاں۔“ اس نے سوچنا چاہا۔

تب ہی ایک معصوم، مسکراتی صورت اسے یاد آئی۔ وہ روز کا چوتھ بھر غلط اور سچ و درود کا۔

”نہیں۔“ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ ”نہیں یا بھل نہیں۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے نہیں پتا وہ کون ہے۔“

اس نے سلائیڈنگ ڈور بند کیا اور ایک ٹھٹکے سے پردہ برابر کر دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بستر تک آئی تھی۔

ٹھٹکے کے سارے نیم دروازہ پر کمر اس نے آنکھیں موندیں۔ تب اسے احساس ہوا اس کے اندر کوئی چپکے چپکے اس پر بس رہا تھا۔ ”بیوہ نے بے بسی سے اپنا سر بیڈ کی پشت سے ٹکرایا۔

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ!“ رابعہ بیگم اسے آواز دے رہی تھیں۔ وہ پرزے استری کر رہی تھی۔ یونی اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”جی ہاں۔“ اس نے دروازے کی جگھ سے ہی پوچھا تھا۔

”تمہارا فون ہے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ ”بات کرلو۔“

”کس کا ہے؟“ وہ فون کی جانب بڑھنے لگی۔

”فریج کا۔“

ناعمہ کے قدم ایک نکتہ ہی سمت پرے پھرے پر پریشانی سی نمایاں ہوئی۔ اس نے آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

وہ جانتی تھی فون فریج کا ہی تھا لیکن فریج کے ساتھ کون موجود تھا اسے اس بات کی بھی خبر تھی۔ ہر چند کہ دور اسے اجازت دے چکی تھی بلکہ شاید اس نے اب تک رابعہ بیگم سے بھی یہ بات نہ سیکس کر لی تھی لیکن پھر بھی ایک جانب تھا جسے انہاں ناعمہ کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

”بھیلو۔“ اس نے ریسپورڈر اٹھا کر کئی الامکان آہستہ سے آواز میں کہا۔

”ہائے!“ دوسری جانب سے فریج کی شوق، شکفتی ہوئی آواز آئی، ”کیا ہو رہا ہے جناب؟“

”دیکھو مجھے نہیں۔۔۔ میں ہوں۔“

”کیا اس نے فریج سے کہا؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ ٹھٹکی سے بولی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے آپ سنا نہیں کیسی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ یہ ہم عمر نمونہ جیجی میں آپ جناب میں چلے والا۔“ وہ بے تکلف سے بولی۔ ”میری اور تمہاری تو خوب باتیں، اور کس کس میں بہت لڑائی کالیج کی ہوں۔ خیال رکھنا۔“

ناعمہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مجھے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے تھے۔ شاید فریج نے ہی مسکب لگانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ غلط سمجھ گئی تھی۔“

”فریج تو بھی نہیں ہوتی۔“ وہ اپنی جگہ میں لپٹی۔

”جی۔“

”جیسا۔“ بھائی سے خوب شکایتیں لگایا کر رہی تھی۔ ”نا؟“ ناعمہ، جینیب جی جی۔

”نہیں فریج کی بھائی کی عمارت تو میں ہے مجھے کچھ پتا تو وہ تو اپنی بھئی ایسا سمجھتی ہیں۔ انہوں نے ہی کہا ہو گا

”تم نے۔“

”تو بھی۔“ چور کی راز میں جھانک لے لے اور قہقہہ لگا۔ ”جیسا خیر ہمارا انا تم تو پورا ہوا۔ یہ بھائی مجھے خوب خوب محو رہے ہیں اور اب تو انہوں نے مجھے راز کھینچ کر شروع کر دی ہے۔ تم اب ان سے صفائی پیش کرو میں تو چاہتا ہوں۔“

ناعمہ کو اچانک ہی یہ سنا کہ اس میں خون خشک ہونے کا احساس ہوا اسے لگا اس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔

”ناعمہ، خاں مش۔“ دوسری جانب سے قدرے سنجیدہ لیکن خوب صورت مردانہ آواز ابھری تھی۔ ناعمہ خاموش رہی۔ اس نے کن آنکھوں سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ماں کی جانب دیکھا تھا جو کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ یہ نہیں وہ اس کی جانب متوجہ تھیں یا نہیں۔

”بھلو!“ دوسری جانب سے پھر کہا گیا۔

”جی۔“ وہ کسی مجرم کی طرح مری مری آواز میں بولی تھی۔

”یہ میری آواز اس کرسانہ کیوں سو گھ گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”نہیں؟ آواز بیچانی نہیں یا پھر آواز بیچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

”نہایت سنجیدہ اور قدرے سخت انداز میں کہا گیا تھا۔ ناعمہ کی کچھ نہیں سمجھ نہ آیا۔

”جیسا۔“ کوئی بات نہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیسی بات؟“ کھل کر تانا۔ آواز بیچانی ہے یا نہیں بیچانی؟“ فرزند قدرے طنز سے بولا۔

”تمہارا پس بھلا کیسے۔“ اسے پھر قریب بیٹھی ماں کا خیال آیا۔

”مہوں!“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”زیادہ لوگوں سے باتیں کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ آواز میں آئیں میں گھلنے ہو

جاتی ہیں۔ دیکھیں کہ کون تو مجھ سے بھی تمہاری آواز نہیں پہچان رہا ہے۔ تمہارے انداز پر سے بدلے ہیں۔ تم کنگٹھ کیل کر رہی ہو؟

”جی؟“ اب کی بار وہ حقیقتاً پشیمان ہوئی۔ ”میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ فرزانہ دھڑکے سے ہنسا تھا۔

”بہت خوب۔“ بانی دوسرے یہ نیا نمبر کھول لیا گیا ہے؟ وہ پچھلا نمبر اب کس کس پاس ہے؟

”پچھلا نمبر؟“ وہ گم صم صم ہوئی۔ ”آپ؟“

”ناعمہ!“ رائے دیکھ کر اچانک سی زور سے بولی تھیں۔

”جی جی جی! وہ کیلے ہی ہر اسان تھی۔ زور سے رہیں زور زور کر لیں۔“

”کیا صل رہا ہے؟ تم اسز کی کلی چھوڑ آئی ہو؟“

ناعمہ تیزی سے اندر کی سمت دوڑی تھی۔ رائے دیکھ کر بھی اس کے پیچھے آئیں۔ لیکن سے نکل کر وہ بھی اسی تھی۔ ناعمہ نے واقعی اسز کی بند کی بغیر اپنی ہی قیص پر بھجوری ہوئی تھی۔ قیص جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

ورد نے جلدی سے آگے بڑھ کر مین برڈ کیا اور اسز کی اٹھا کر جگہ پر رکھی۔ ناعمہ صدمہ سے اپنی قیص کا شہر دیکھ رہی تھی۔

”یہ لوگ اپنے حواسوں میں کبھی ہوتی ہے؟ نہ جانے دھیان کیا کیا ان کا رہتا ہے۔“

رائے دیکھ کر بڑھاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ناعمہ ان کا مطلب سمجھ کر خفت سے سر نہ ہو گئی تھی۔ ورد نے اس کی صورت دیکھی۔ اسے اسے اختیار ہی اس پر تڑپ لگ گیا۔

”چلو کوئی بات نہیں یہ کچھ تو بہت سے مار کھیں ہیں۔ تمہیں کلی ہی بی قیص کا کپڑا لا دوں گا۔“

”ہوں؟“ اس نے چونک کر مین کو دیکھا۔ ”کیا مین کوئی چیز آئی؟“

ورد نے فور سے اسے دیکھا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔ ”فریح؟“

”جی۔“ وہ سر جھٹکا کر بولی۔

ورد بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ناعمہ اسی پوزیشن میں کھڑی اپنی جلی ہوئی قیص کو گھورتی رہی۔

دل قدموں کو اور قدم اسے یہاں تک لے تو آئے تھے لیکن جل جاکر اب وہ خفت کا شکار تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے جی میں پلٹ جانے کا خیال آیا۔ تب ہی لاؤننگ کا دروازہ کھول کر عبادا ہر گیا تھا۔ کھڑکی کے چھوٹے گیٹ کے اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔

”راغ حنائی!“ عبادا نے پوچش انداز میں آواز ملائی۔ ”آپ کو کچھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”یہ تو تم سناؤ!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”مجھے ملتے ہی نہیں۔ چھٹیوں میں اگر بھی چپ چاپ سے نکل جاتے ہو۔“

”بس آپ کی شکایتیں ختم“ وہ ہنسا۔ ”اب مستقل طور پر میں ڈیرہ چالیا ہے ہم نے۔ اب خوب محفلیں جما کر ہیں اور ہم آپ کی غزلیں سنا کر سن گے۔“ راغ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آپیں نا مانند۔ اطمینان سے پیٹھ کر بات کرتے ہیں!“

راغ نے نیک نگاہ سفید رنگ مرسرے مزین دیواروں پر ڈالی تھی پھر اس نے مہری سانس بھری۔

”نہیں یار۔! بس جاؤں گا میں۔ یہ کہتا میں رہیہ۔ کو تو تھیں یہ پلیرا سے پتہ چار تھا۔“

”اچھا! عبادا نے کہا میں نے کران کے نام لکھے۔“ لاہر بری کے لائے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ رہیہ اور ورد نے فون وغیرہ نہ مانے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن چائے پی پیو تو آپ جا نہیں سکتے۔ کچھ تو ہمارے جذبہ میزبانی کا خیال کیجیے۔“

”بھیرسی۔“ وہ مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔ چائیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ ہمارا دل تو ذکر خوش ہوتے ہیں تو یونہی سی!“ عبادا اٹھ کھنسی سے بولا تھا۔

”میں پھر آؤں گا عبادا ابھی ذرا ضروری کام سے جا رہا تھا۔“

”اے رافع بھائی!“ عبادا نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”تاغ سے کہیے گا مجھ سے ملے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہاتھ ملاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اسے ایک کڑی دھڑکی کا خیال اس قدر فزٹ بخش تھا۔ رافع نے اس خیال کو کس مشکل سے اتار دی تھی۔ وہی جانتا تھا اس کا ہونا تھا سوچ آزرہ ہوئی تھی لیکن وہ جانتا تھا ہی ٹھیک تھا۔

گاڑی اسکول کے سامنے رکتے ہی وہ گیٹ کے بجھا بھاگا چلا گیا تھا۔ شملہ نے جھک کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھا۔

”اے عبادا! کچھ مہیا۔“

”اے عبادا! کچھ مہیا۔“

”کان۔“ وہ مسکرایا۔

”مہا کو کھانے کرنے لگے ہونا۔“ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”نہیں مہما۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”بس رافع میرا موڈ ہو رہا تھا کہ آپ مجھے پک کریں۔ اسی لیے آپ کو فون کیا۔“

شملہ نے ایک مسکرائی کا گھڑیل پر ڈالی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ نہیں سمجھتی تھی تو خیر میری ناہمتی کو بھی میں نہیں لگس روز روز یہ نہیں چلے گا۔ سمجھے؟“

”جی۔“ اس نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

”پھر وہ پھر گزرتے مناظر دیکھنے لگا تھا۔“

”رہائی کیسی جا رہی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”خوش نکلا!“ منتھلی میٹ میں میری رپورٹ سب سے اچھی ہے۔“

”دیر دست۔“ شملہ نے خوش ہو کر اس کے بال ملانے سے انہدہ بھی سی کار کر گئی ہوئی چاہیے۔

”جی مہما۔“ مہما! اس نے اچانک ہی پکارا۔ ”اس روڈ پر اگر ٹرن کریں تا تو آگے جا کر ایک اور روڈ ہے۔“

”واہ میرا گھر۔“

شملہ نے شجب ہو کر اس رستے کی جانب دیکھا جو شہر کے پوٹھ ایریا کی طرف جاتا تھا۔

”کس کا گھر ہے؟“

”میرا؟“ وہ مزے سے بولا۔

”تمہارا؟ وہ کیسے؟“

”میرے پیہا نے بنوایا ہے میرے لیے۔“

شہلا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”پیہا تمہیں یہاں لائے تھے؟ اس گھر میں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”جی ہاں! بہت شاندار گھر ہے۔ پیہا بولے ”یہ تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے بنوایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں

اتنے بڑے گھر میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ تو وہ بولے۔۔۔“ اچانک وہ زبان دانوں میں دبا کر خاموش ہو گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ وہ قدرے خالی الذہنی سے بولی۔ ”کیا بولے؟“

”وہ بولے۔۔۔ تمہاری ماما کو بھی اس گھر میں لے کر آئیں گے۔“

شہلا خالی خالی نظروں سے سامنے سرک کو دیکھتی رہی۔ قریب گزرتی گاڑی نے زور سے ہارن دیا تب وہ چونکی

تھی۔ اس نے عمر کی جانب دیکھا جو اب مزے سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

”ماما! کچھ دیر بعد وہ پھر بولا تھا۔

”ہوں۔۔۔ بولو۔“ وہ مدھم آواز میں بولی۔

”بچوں کا گھر کون سا ہوتا ہے؟ ان کے پیہا کا یا ان کی ماما کا یا پھر ان کی نانو کا؟“

شہلا خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ اس کے معصوم بیٹے کے لیے واقعی یہ ایک بڑا سوالیہ

نشان تھا کیونکہ پھر بچے کی طرح اس کے ماں باپ کا گھر ایک نہیں تھا۔ ان دونوں کے گھر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے۔

اس پرستم یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک تیسرے گھر میں رہتا تھا جو کہ اس کی

نانی کا تھا۔

”ہیائیں نانا! اس نے اصرار کیا۔

شہلا نے ایک گہری سانس بھر کر پلکیں جھپکیں اور نمی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”بچوں کے تو سارے ہی گھر ہوتے ہیں بیٹے! پیہا نانو سب ہی بیار کرتے ہیں بچوں سے۔۔۔“

”لیکن پیہا کہتے ہیں کہ نانو کے گھر رہنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں پیہا کا گھر ہی بچوں کا اصل گھر

ہوتا ہے۔“

شہلا کے اندر ملال اترنے لگے۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”ماما! میں اب اپنے پیہا کے ساتھ رہوں گا۔۔۔ ان کے گھر میں۔“ وہ اچانک ہی منعم انداز میں بولا۔

شہلا کی گرفت اسٹیرنگ پر کمزور پڑنے لگی۔

”کس نے کہا تم سے؟“

”پیہا نے کہا ہے۔۔۔ لیکن مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی ہے۔۔۔ میں نانو سے ملنے جاؤں گا روز لیکن رہوں گا

اپنے پیہا کے ساتھ ٹھیک ہے نانا۔“

شہلا نے مضطرب سی ہونٹ دانوں تلے ڈال لیا تھا۔

”اور اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو آپ بھی آجائیں۔۔۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا۔

”ہاں شکریہ! بہت اچھے ہیں ماما! وہ آپ کو ضرور پریشان دے دیں گے۔“

شہلا کی اب سمجھ میں آیا تھا کہ عمر آج اس سے ضد کیوں کر رہا تھا کہ وہی اسے اسکول سے واپسی پر لینے آئے۔

اس نے بے حد صراحت سے ابراہن کا پیغام اس تک پہنچا دیا تھا۔ یہ بات ابراہن کی زبان سے سن کر وہ جھلا جاتی تھی

لیکن آج عمر کے ہونے سے یہ سب کچھ سن کر اس کا ذہن جیسے دور کیس خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس نے اپنی کیفیت پر قابو نہ پایا تو وہ ضرور گاڑی کیس مار بیٹھے گی۔ سر جھٹک کر اس نے سڑک پر نگاہ نہائی اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

رات کے کھانے پر وہ بے حد خاموش خاموش رہی تھی۔ وردہ نے کئی مرتبہ اس کی کیفیت نوٹ کی لیکن وہ اس کی موجودگی میں اس نے کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا۔ ناعمدہ نے بمشکل چند لمحے لیے بچہ رو کھانا چھوڑ کر افراتفری کھڑی ہوئی تھی۔

وردہ جب ٹیبل صاف کر کے میں داخل ہوئی تو وہ چائے کا کپ لیے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ وردہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”نہیں! وہ چونک گئی۔

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ مجھے تم کچھ پریشان محسوس ہوتی ہو۔“

”نہیں! آپ! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ تو مجھے وہی ہے۔ یہی ہے جو کبھی تھی شام کو فروٹ جات کھاتی تھی۔“
 ”جیسا؟“ اس نے غور سے اسے دیکھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے فراز کا خون آنے سے تم کچھ دھڑب دھڑب ہو گئی ہو۔“
 ”فراز کا؟“ ناعمدہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”نہیں! آپ کو کیسے لگا کہ وہ خون؟“
 ”غیر۔ تمہاری طرح بدحواس نہیں میں۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

”اس کا استعمال بھی کرتا آتا ہے مجھے۔“
 ناعمدہ نے سر ہٹا لیا۔

”لیکن میں اتنی بدحواس کیوں ہوں آپ؟“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔ ”مجھے تو کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”جی نہیں۔ یہ فراز کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی ایک بات بھی میرے ذہن میں نہیں پڑی۔ عجیب اشتادوں ان باتوں میں بائیں کر رہا تھا۔ مجھے تو ایسے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ یہ آپ لوگوں کو بھی ارشاد کیاں طے کر دیا ہے۔“

وردہ اس کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی۔

”کیسی عجیب باتیں؟ کیا کہہ رہا تھا؟“
 ”مجھے سے بوجھ رہا تھا۔ کیا تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ پھر کہنے لگا تم شاید گلٹ غل کر رہی ہو۔ بھلا میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب؟“ جب میں پہلی مرتبہ اس کی آواز سنوں گی تو میری نونوں کی کیسے اور مجھے کیوں ہونے لگا نہیں ہے۔ کون سا جرم کیا ہے؟“

”نوں پر نہ سکی۔ عام زندگی میں تو تم نے اس کی آواز نہ سنی ہوگی نا؟“
 ناعمدہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا۔

”ہاں۔۔۔ بائیں بھائی کی شادی میں اس نے وہ ایک مرتبہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ لیکن تب بھی اس کا رویہ عجیب سا ہی تھا۔ اور وہاں!“

اسے یکدم ہی یاد آیا۔
 ”ایک مرتبہ وہ ہمیں شینگ شینگ میں بھی ملا تھا۔ میں سی ڈیزو کی دہری تھی اور وہاں کیا تھا؟ آپ! اب تو میں اسے کوئی بالکل ہی بھی نہیں جانتی۔ اس کا رویہ بالکل بھی نارمل نہیں تھا!“

وردہ کے چہرے پر اب اس کی پریشانی کھل کر ظاہر ہو چکی تھی۔ ناعمدہ نے اس کا چہرہ دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئی۔
 ”ہائے! آپ!۔۔۔ اب کیا ہو گا۔ آپ لوگوں نے ایک پاگل سے میری منتگنی کر دی ہے۔ میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

”جیسا؟“
 ”وردہ نے اس کی بلند دہائی پر اسے جھڑکا۔ ”ای! کوہ گزیر! فضول باتیں پتہ نہ چلیں ان کا بلڈ پریشر فوراً آہائی ہو جائے گا۔ مجھے تو تمہاری بات کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ میں بھی اس سے کی ہوں نہیں نے بھی اس سے بات چیت کی ہے۔ مجھے تو وہ ہر طرح سے ایک معقول بندہ لگے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عباد کا دوست ہے۔ آپ! ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ لوگ آج بھی بند کر کے یہ رشتہ کرنے کا مشورہ نہ دیتے۔ میں سننے والا نہیں ہوں۔“
 طبیعت سے بخوبی واقف تھیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔“

”اور میری بات پر آپ کو یقین نہیں؟“ وہ آدھری سے بولی۔
 ”نہیں۔ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وردہ نے جھجھکا جھپٹا۔

”مثلاً؟“
 ”چل جائے گا۔“ تم خود کو پریشان مت کرو۔“
 وہ اسے دیکھ کر وہاں سے اٹھ کر چلی۔

عذرا تیکم کرے میں داخل ہو میں تو شفیقہ حیات کو مری سوچ میں گم کیا۔ ان کے چہرے پر از حد رنج و غم کے آثار تھے۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔

”کیا بات ہے اماں؟“
 ”ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ انہوں نے غمخیزی کو ہجر کر کے اپنی جگہ پر کھینچ لیا۔“
 ”کہتے ہیں وہ مجھے ہیں۔“

”کیا کوئی بات ہے؟“
 ”نہیں! وہاں سے اٹھ کر چلی۔“

عذرا تیکم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں۔

”دراصل وہ ہماری نصیحتوں سے چڑنے لگی ہے۔ یا تو آپ کوئی بات چیت کر بیٹھ جاتی ہیں یا میں۔ نہ کچھ عرصے تک اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں بھی اس کے جذبات کا خیال کرنا چاہتی۔“
 ”ایسے کیا خیال خیال کریں ہم۔ اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔“ ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

”اماں! سارا قصور اسی کا تو نہیں ہے نا۔“ انہوں نے اپنی آواز میں زندگی حمایت کرنا چاہی۔
 ”میں نے چیپ نہ بولی۔“ انہوں نے ہمو کو ہو لے۔ ”جھڑکا۔“ ”ہم نے بھی اسی دنیا میں زندگی گزار رہی ہے۔ ہر طرح کے حالات سے گزارنے ہیں۔ جراثیم بھی حاصل کی ہیں اور مشاہدہ بھی۔ اسے سوچو کہ بچے چاہتے ہیں کیا کسی ٹھیکل تمام میں چاروں دوڑ دو؟ ایسے کا کچھ سی ناک زخمیں، بھلی سی چوٹ نہ برداشت کر لیں جو رور ہو گئیں غم سے۔ اسے عورتیں تو شرابی بھائی! جواری مردوں کو زندگی بھر بھس ٹھیکل کر برداشت کر لیں کہ کھرنے نوٹ نہ پڑے۔“

ہے گھر نہ ہوں۔

غذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔

”خجک کتنی ہیں آپ۔۔۔“ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔ ”ظلم، جبر، بے ایمانی، قریب عورت ہنسی غم برداشت کرتی رہے تو عورت! ان کے خلاف آواز اٹھانے فریب دینے والے ناگربیان پڑے“ اسے اپنے جذبول توہین کی سزا دینا چاہے تب سارے الزامات کا اس غریب کی طرف۔ اس نے گھر توڑا اس نے بچوں کو لے کر کیا۔ خاموشی نے زبان گائے جیسی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانے والی عورتوں کو مثال بنانا کر پیش کیا جاتا ہے۔

”میں کتنی ہوں غمراہ! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ شفیقہ حیات نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

”اس کو سمجھاؤ! اب بھی وقت ہے معافی مانگ لے اس سے۔ اپنا گھر پھر سے آباد کرے۔ اورے یہاں بیٹھ کر اچھی لگ رہی ہے بھلا؟ اپنے گھر کو ملاؤ مل کر ملتی آئی ہے، ملاؤ مل کر چلے آئے ہے کیا؟“

”آپ جانتی ہیں اماں! وہ کس قدر ضدی ہے۔۔۔“ انہوں نے دھیمے جیسے کہا۔
”اور یہ خدا انسان کو تباہ کر دیتی ہے، تم بھی جانتی ہو گی۔“
”خدا نہ کرے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”اورے بد دعا نہیں دے رہی امیں! ہاں ہوں اس کی، مگر ہاں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے جایا توں میں اس کا ساتھ دوں۔ اسے ایتھے برے کی تہیز نہ سمجھاؤں، کٹھن نہ دکھاؤں۔ میرا تو بچہ کرنا ہے، بچہ مل کر سناں اسے۔“

”جلدی نہ کریں اماں!۔۔۔“ انہوں نے ہونے سے ان کا ہاتھ دھکا دیا۔ ”ابھی رخصت ہونے والے ہیں۔“
”اورے میرے جی پر بشارت ہے اس کا خیال۔“ وہ سن گئیں۔ ”کچھ اور نہ ہو جائے غمراہ!“

”مب ٹھیک ہو جائے گا اب گلہ نہ کریں سنا شراکت میں۔۔۔“ انہوں نے سانس کو قتل ہی تھی۔
”دونوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچ میں گم ہوئی تھیں۔ تب ہی سدرہ کرے میں داخل ہوئی اس نے ایک نگاہاں اور ادراپی پر ڈالی پھر ادھر ادھر نہ دیکھا۔

”پچھو کہاں گئیں؟“
”پچھو؟“ وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔

”ہاں!۔۔۔“ ابقانا پچھو آئی تھیں نا ابھی۔۔۔ میں لیکن میں تھی۔“
”ایقان آئی تھی؟“ شفیقہ حیات حیران سی ہو گئیں پھر جیسے بہت کچھ سمجھ گئیں۔

”اس نے یقیناً ہماری گفتگو کی ہے۔“ غمراہ بیگم شکر ہو گئیں۔ ”بے چاری اسے قدموں لوٹ گئی ہے۔“
شفیقہ حیات کچھ سوچنے لگی تھیں۔

ہاشم نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کی تو دیکھا شہلا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس نے دست و پاؤں پر نگاہ ڈالی۔ اس کا ڈیڑی ناظم آف ہوئے گاڑی پر ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منیجر بیگم کی طرف چلی گئی تھی۔ اپنا بریف کیس اٹھائے وہ پچھو نے پچھو نے قدم اٹھا کر کے اندر دھکیں جسے میں داخل ہوا۔ لاؤنچ میں فاروق ہاشم نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کی تو دیکھا شہلا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس نے دست و پاؤں پر نگاہ ڈالی۔ اس کا ڈیڑی ناظم آف ہوئے گاڑی پر ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منیجر بیگم کی طرف چلی گئی تھی۔ اپنا بریف کیس اٹھائے وہ پچھو نے پچھو نے قدم اٹھا کر کے اندر دھکیں جسے میں داخل ہوا۔ لاؤنچ میں فاروق

س اور فردوس بیگم موجود تھیں۔

”اسلام کو علم۔“ وہ بریف کیس میں سر رکھ کر ہوش بیٹھ گیا۔

”وہ بیگم کس کسلام۔“ فاروق حسن نے جیسے کہ اوپر سے اسے دیکھا۔
”شہلا نہیں! اس اب تک؟“ ہالوں میں انگلیاں پکھیرتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔
”میلہ روٹے تو کریں کہ ان کا گھر ہے کون سا۔“ فردوس بیگم کو گویا اس کے سوال نے تیلی ہی دکھادی تھی۔

”کس گروہ میں۔“
ہاشم چونک اٹھا۔ اس نے باری باری ماں کا تہہ ہوا اور باپ کا ساٹھ چھو دیکھا۔

”وہی مطلب۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“
”مطلب یہ بیٹے جی۔۔۔ کہ کچھ ہمارا اور ہماری عمروں کا خیال کر۔ ہمیں ہو چاہیے سچی ہماری خدمت کے

لے۔ وقت رکھنا وقت پر دوا دے۔ یہاں تو ہوسو بیگم کو گویا اور پھر میکے سے فرصت نہیں۔ فارغ اوقات میں میرے لیے۔۔۔“
”کس میں؟“ ہاشم نے پوچھا۔
”کس میں؟“ ہاشم نے پوچھا۔

ہاشم خاموش سا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شہلا کے لیے کچھ بھی غلط سننے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوتا لیکن ماں

آخر گروہ میں تھی۔ اس کی بات درکار تھی۔ ”تھماری اہلی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو

”ہاشم بیٹے!“ فاروق حسن نے جیسے ناگوار سا ہر رکھا۔ ”تھماری اہلی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو

اب کچھ عرصہ گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

”ہاں!۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔۔۔“ ہاشم نے گھر میں سچی خوشیوں کے ہنسی ہیں۔ سب مل کر

ماشرکی اچانک پاکستان آمد تو نے غافلان کو سرد کر دیتی ہے۔ تاہم ایمان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔
منفرد ایمان کی سخت بائیں سسٹن کر ریجہ کچھ چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ریجہ کو
بالہو نا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ریجہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ریجہ کا عہد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منتر و بزم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بنالیتی ہیں۔
انتم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریشہ کا نکاح پر رخصت کیا جاتا ہے جس پر عریشہ محنت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی اولین رات ابراہیم جلالی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی سے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس
کا مذاق اڑا رہے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر بائیں سسٹن، شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرنا ہے۔
فراز جو درحقیقت ناعم کو پسند کرتا ہے، بائیں سسٹن کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فراز
کا آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعم بائیں کرتی تھی۔
نافع کو ریجہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم بائیں سسٹن کو ہو جاتا ہے۔

لڑا، ماشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے۔ ماشر اسے لینے ابراہیم روٹ جاتا ہے۔ ایمان، ماشر کے پراسرار رویے پر مشکوک
ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے بھی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بائیں سسٹن کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم بائیں اسے
دلدار سے کہہ دیتی ہے شہلا، ربیعہ کے ساتھ رابعہ کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ
درد کے شور سے ایمان سے سویشالوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔
ماشر، لڑا سے ملنے پہلے اسے توڑنا چاہتا ہے کہ فون کرتی ہے۔ ماشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا درد مالی ایمان کے
اپنے ایک باتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ ماشر لو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ ایمان حقیقتاً صدمے
سے لنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ درد سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا چکا ہے کہ دردہ کی منگنی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے صدمے سے
دھار دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا کیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ دردہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات
محسوس نہیں کرتا۔

UrduPhoto.com

ایمان، ماشر کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے میکے آ جاتی ہے اور عاشر کی تمام ترقیقن رہائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے
تعلق کر لیتی ہے۔ وہ عاشر کی بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد
جان کن ہے۔ عاشر جاپان جانتے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

۲۹ ترتیسویں قسط

قریب آکر اس شخص نے ربیعہ کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔
ربیعہ جھجک کر خود کھڑی ہونے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے لبوں سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اسے اپنے پہلو
پاؤں میں بازو میں درد کا احساس ہوا۔

”میں... میں بے حد معذرت خواہ ہوں میڈم!“ وہ شخص بے طرح شرمندہ اور ہراساں ہو رہا تھا۔
تب ہی ایک بائیک ان دونوں کے نہایت قریب آکر رکی۔ بائیک پر بیٹھا ہوا رافع نیزی سے اترا اور ان لوگوں کی
نہ بڑھا۔

”ربیعہ! ربیعہ! آریو آل رائٹ؟“ وہ ربیعہ سے پوچھنے لگا۔
”میں... میں ٹھیک ہوں۔“ ربیعہ نے رسائیت سے بولنے کی کوشش کی۔ نبھانے کیوں رافع کو دیکھ کر اس کی
گھون میں آنسو آگئے تھے۔ سڑک پر اچھا بھلا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔
رافع اب اس کا ڈرائیور کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا ہر نہ چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتا۔

”تی بڑی گاڑی ہے تو اس کو استعمال کرنے کے تقاضوں کو بھی نہ نظر رکھیں مسٹر!“ وہ نہایت شے سے اس شخص سے مخاطب ہوا۔ ”کوئی نشہ وغیرہ کر کے گھر سے نکلے تھے آپ؟“

”کیسے کہہ سکتا ہوں! میں معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں قصور وار نہیں ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔۔۔ بھلا آپ ضرور ادا کریں گے۔“ رافع طرے بولا۔ ”ان معاملات میں اکثر ہی گاڑیوں والے بے قصور ہوتے ہیں۔“

”رافع! رافع! پلینز۔“ رجبہ دردی شدت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی بے قصور ہیں۔ دراصل میں ہی بغیر دیکھے بھانے سرک کر اس کر رہی تھی۔“

”میرا خیال ہے، میں باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں ہسپتال لے کر جانا چاہیے۔“ وہ شخص رجبہ کا زور پر ناچو غور سے دیکھنے لگا۔ رافع نے اس رجبہ کا بازو لیا تھا۔

”میں نہیں۔“ رجبہ مزید زور دہری۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں میں اب گھر جاؤں گی۔“

اس نے قدم بڑھانے کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر جی اٹھی اسے احساس ہوا کہ اسے واقعی چوٹیں آئی تھیں۔

”رجبہ! رافع! رافع! پلینز۔“ رافع زور سے بولا۔ ”میرا خیال ہے، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہیں چیک آپ کروا لیا جائے۔ میں قریب ہی میرے دوست کے بھائی کا کلینک ہے۔“

”میں گھر جاؤں گی۔“ وہ اگلے انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع مزید نرم ہوا۔ ”میں شہلا بھائی کو فون کر دیتا ہوں۔“

وہ شخص عجیب کش کش کا شکار ہیں کھرا تھا۔ رافع نے اپنی بائیک سائڈ میں کھڑی کی پھر وہ رجبہ کے قریب چلا آیا۔

”اگر تمہیں سارے کی ضرورت ہے تو میں۔۔۔ وہ قدر ہے۔“

رجبہ کا چہرہ سخت سے سرخ ہو گیا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود کو قائل نہیں کیا کہ وہ رافع کا بازو تھامتی یا رافع اس کا ہاتھ چکڑا کر اسے خالی سے ہی اسے شرم سے پالی پالی کر دیتا تھا۔

”اگر آپ ہاتھ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں گا۔“ رجبہ نے عجیب سی صورت اختیار کر لی۔

”اگر آپ ہاتھ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں گا۔“ رجبہ نے عجیب سی صورت اختیار کر لی۔

بڑھ گیا۔

رجبہ کو آنا دیکھ کر منیوہ بیگم اور ابقہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ ان کی آوازوں سے پریشان ہو کر عباد بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔

”کیا ہوا ہے رجبہ!؟“ رجبہ نے ”زبان چوت تو نہیں آئی۔“

سب کے سب اس سے مختلف سوالات کرنے لگے۔ رجبہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی ابقہ نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا بازو چیک کرنے لگی۔

ایسے میں عباد کی نگاہ ایک تخت سامنے کھڑے اسے گھس رہی تھی۔

”ارے امیر حسن۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا کہ آپ کب متوجہ ہوتے ہیں!“ عباد گرم خوش انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ رجبہ نے بیگم کی جانب اشارہ کیا۔

”جی۔۔۔“ امیر حسن نے ان کے متعلق بات کی تھی۔ شاید آپ کو یاد ہو۔“

”امیر حسن!“ منیوہ بیگم بولنے لگی۔ ”ہاں! شاید یہی ہیں نا جن کے ساتھ تم اپنا برنس اشارت کرنا چاہتے ہو۔“

”جی ہاں۔“ عباد مسکرایا۔

امیر حسن نے بے حد احترام سے منیوہ بیگم کو سلام کیا۔

”جی۔۔۔“ وہ منیوہ بیگم سے بولیں۔ ”میرا تو خیال تھا کہ کوئی بڑی عمر کا شخص ہو گا۔ تم تو بالکل میرے عباد جیسے ہی ہو۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”دراصل برنس میرے پیلا اور بھائی سمجھاتے ہیں۔ میں یہاں پاکستان میں اس کی بروموشن کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میرا عباد صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہم نے سوچا کیوں نہ مل کر کام کیا جائے آج بھی میں اس سلسلے میں عباد سے ہی ملنے یہاں آیا تھا۔“

”اور ہمارے گھر کے ایک بڑے سے آپ سرک پر ہی مل لے۔“ ابقہ نے مزاحاً ”شکایتی انداز میں کہا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔

”اگر آپ کو کوئی بات ہے تو میں آپ سے گھر کا بندہ ہی دے جاؤں گا۔“ امیر حسن اب ناشائستہ سے گویا ہوا تھا۔ ”مگر اس حادثے میں میرا ہاتھ ضرور نہیں ہے کیوں کہ رجبہ۔“

Urdu photo.com

”یہ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رافع نے رجبہ کو قائل کرنے والے انداز میں دیکھ کر کہا۔ ”تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میرا خیال کہ تم گھر تک آرام سے چل پھاؤ گی۔“

”اچھا بات رجبہ۔“ رجبہ نے کچھ جی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی کا ہی سارا اسے کر بچھلے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

”اچھا! میں نے اس کے لیے لپک کر دروازہ دیا تھا۔“ رجبہ کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے رافع کو دیکھا۔

”پلینز۔ آپ بھی نہیں۔“

”میں نہیں بائیک پر آتا ہوں۔“ آپ انہیں گھر تک پہنچا دیں۔ بے حد نوازش ہوئی۔ ”وہ اپنی بائیک کی جانب

”جی ہاں۔“ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رجبہ آہستہ سے بولی تھی ”دراصل میں ایک کتے سے خوف زدہ ہو کر دوڑی تھی۔“ عباد نے جی سرک کر اس کرنے لگی۔ آپ نے تو پھر بھی حاضر رہائی سے کام لیا ورنہ شاید یہ حادثہ خراب ہو سکتا تھا۔“

”پچھانے والی ذات خدا کی۔“ وہ مسکرایا۔ ”ہم انسان تو خدا کے پتلے ہیں۔“

رجبہ نے اب کی بار پہلی مرتبہ اسے نظر بھر کر دیکھا۔ خوب صورت بھاری کواڑ رکھنے والا وہ شخص خود بھی متحرک شخصیت کا لپک تھا۔ آف راجنٹ شلوار سوٹ میں اس کا قد دو قدامت بے حد جاذب نگاہ نظر آتا تھا۔ اس کا لمبواور بات کرنے کا انداز بھی بہت خوب صورت تھا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی مملکت میں احسان کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو کچھ اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے محفوظ رکھیں۔

”ایسا! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں ہرگز ڈرانگ روم میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ بین پیٹیک کرفورڈ سے خدی بن سے بولی تھی۔

وہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔
”ناعمہ! یہ نیلا درے اس کے کچھ مختلف تقاضے ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں کہیں دنیا داری مناجاتی بھی بتا کر دیتی ہوں، لیکن مجھے یقین ہی کرنا ہے۔ اور اب انکار میرے مزاوتی ضائع مت کرو۔“

”کیا!؟“ وہ رونا بھی ہوئی، لیکن اس کی کوکس نے کہا تھا کہ ”کوہ“ اس کے انداز میں اربانے کا اشارہ تھا۔ وہ کوہ کو اس کی بات اور اس کی بے بسی پر غصی آگئی۔ وہ غصی چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ناعمہ دیکھ کر پریشان ہوئی، صورت جانے کی بھی سوچ رہی۔

پھر وہ کچھ تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔
”میں نے تو یہ سب کچھ سنا لیا، لیکن اب اس کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ بھی سنا لیا۔“ وہ رونا بھی ہوئی، لیکن اس کی کوکس نے کہا تھا کہ ”کوہ“ اس کے انداز میں اربانے کا اشارہ تھا۔ وہ کوہ کو اس کی بات اور اس کی بے بسی پر غصی آگئی۔ وہ غصی چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ناعمہ دیکھ کر پریشان ہوئی، صورت جانے کی بھی سوچ رہی۔

”وہیں ملو! اس نے ملے ملے نظروں سے اس کا سراپا دیکھا۔“ چلو، یہ چائے لے کر جاؤ اور سیلیٹے اور غیرت سے سرو کرو۔“
”یہ کام آپ کر لیں نا آئی!۔“ وہ کچھ جھرمے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھ سے تو بے اور وہ وہ کھانا سب کچھ کھا رہا تھا۔“

”زیادہ پہلے ہی اس کی ضرورت میں ہے۔“ وہ درے اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ”چلو، سنبھالو! اس نے زالی کچھ کرنا عماد کے آگے کر دی۔ مزید بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر زالی کیلئے گئے، وہ وہ بھی اس کے پیچھے تھی۔

ڈرانگ روم میں داخل ہو کر اس نے نگاہ اٹھائے بغیر ہی سلام کیا تھا۔ جواب میں فریڈ کی گرم خوش آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کون کہاں بیٹھا ہے۔ سو وہ اسی جانب بڑھ گئی۔
”ناعمہ! اس نے سب کو جانے دو۔“ زالیہ بیگم نے اسے دیکھتے سے پکارا۔
وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی، لیکن اسے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ناچا وہ زالیہ بیگم کے ساتھ بیٹھے ہوئے فراز کے قریب لے آئی۔

”میں صرف چائے لوں گا۔“ بنا دیکھے پلیز! اس نے سرونگ پلیٹ واپس زالیہ میں رکھ دی۔
”چینی؟“ ناعمہ نے دیکھتے سے پوچھا۔
”غیر چینی کی چائے دیں۔“ اس کے لیے میں کئی ہی پیش تھی۔

”بہم لوگ ڈرانگ روم میں بیٹھے ہیں ای!۔ ذرا چائے وغیرہ بھیج دیں۔“ عمار نے منہ دیکھتے ہی کہا پھر وہ امیر حسن کے کمرے ڈرانگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”ناکل ٹھیک شاگ ہو تم!“ انہی نے اس کے بازو وغیرہ اچھی طرح ہلا کر دیکھ لیے تھے ”میں بین کمرہ دیتی ہوں۔ گرم گرم دودھ سے کھا کر تھوڑی دیر آرام کرو۔ کل تک ناکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“
”میں اسے گرم دودھ میں ہلدی ملا کر دیتی ہوں۔“ منہ دیکھتے ہی بولی تھیں ”کسی اندرونی چوٹ کا خطرو نہ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہی نے سر ہلایا ”بہم دونوں اپنے اپنے کمرے میں آرام لیتے ہیں!“
”یہ سکرادی۔ منہ دیکھتے ہی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔“ انہی نے اس کے لیے کمرے کی بہت چل دی۔ اس نے کمری سانس بھر کر صوفے کی پشت سے سر کھینچا۔ اس کا ذہن رانچ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ اسے چھوڑتے ہوئے تھک تو کیا تھا۔ پھر نہ جانتے کہ اسے اندر آنے کے بجائے باہر سے ہی لوٹ گیا۔ لوٹتے سے اس کا چہرہ اس کی آنکھیں ”ریجہ“ کے لیے فکر مند تھیں۔ ”ریجہ“ کا دل فکر میں بیٹھا تھا۔ اس نے نگاہوں سے پوچھا ”پنا خیال رکھنا“ کا بیچنا اس کے پردہ ذہن سے بڑھ چکا تھا۔ وہ بہت دیر کے لیے کہیں کھوی گئی تھی۔

اس نے کال تیل کی آواز سنی ضرور تھی لیکن سنی آن بھی کر کے کچھ بھی اسے نوٹ نہ کر سکی تھی۔ شب ہی وہ ٹھنڈی سے سکرادی ہوئی چلی آئی۔ ناعمہ نے ایک موصوفی سے زالیہ کی طرف اشارہ کیا۔
”کون ہے آئی؟“
”یہ بے بیٹھی ہو چکے کچھ خبری نہ ہو۔“ اس نے اپنے گھورا ”بھئی ہوتی جا رہی ہو!“
”جی؟“ ناعمہ نے حیران نظروں سے اٹھائیں۔ ”میں کچھ بھی نہیں بات کی خبر ہوئی ہے مجھے؟“
”فریڈ نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی؟“ وہ نے سوائے کچھ کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی غور سے دیکھا۔

”فریڈ نے؟“ ناعمہ مزید حیران ہوئی۔ ”فریڈ آئی ہے کیا؟“
”جی ہاں۔“ صرف فریڈ بلکہ آپ کے وہ ”بچوں“ بھی ساتھ ہیں۔“ وہ سکرادی ”منا فٹ کپڑے تبدیل کر کے آجاؤ۔“
”میں؟ میں آجاؤں؟“ ناعمہ کی جان خشک ہونے لگی۔ ”نہیں ایسا۔! میں ہرگز ان موصوف کے سامنے نہیں آؤں گی۔“

”بہم دوس آپ جا کر نہیں۔“
”میں ڈرانگ روم میں ہی موجود ہیں اور تمہیں بلا رہی ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اور کوئی تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ حالات کو نہیں کرنا سیکھو۔ چلو! آؤ کپڑے بدل لو۔ بال ناؤ لیتے سے۔“
”میں اس جیلے میں دیکھ لیٹا۔“
”تو شوق سے کھنٹی توڑ دیں۔“ ناعمہ جل کر بولی تھی۔ ”میں تو دو دن سکون کی نیند سو رہی ہوں گی!“
”جو کومت!“ وہ ناراضی سے بولی ”شکر ہا بھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے۔“

ناعمہ نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ تب اس نے دیکھا اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے سے بھی برہہ کر پیش تھی۔
 ”ہائے! کیا ہو گیا بھائی آپ کو؟“ فریجہ شوخ انداز میں بولی تھی ”گھر میں تو آپ آدھا کپ چینی سے بھر لیتے ہیں اور یہاں چینی کی بچت کر رہے ہیں۔“
 ”کبھی کبھار کچی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

ناعمہ نے اسے واقعی بغیر پیشی کی چائے تھما دی پھر وہ رُالی فریجہ کے قریب لے آئی۔
 ”بھئی! اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ فریجہ نے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا ”میں تو دل بھر کر انصاف کر دیں گی۔
 ویسے سچ بتاؤ ان میں سے کیا کچھ تم نے بنایا ہے؟“
 ”کچھ بھی نہیں!“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی ”سب کچھ وردہ اپنی کا کمال ہے!“ وردہ اسے گھورنے لگی تھی لیکن ناعمہ چونکہ یہ بات جانتی تھی سو اس نے وردہ کی جانب دیکھنے سے گریز ہی کیا۔
 ”ویل سیڈ!“ فریجہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں ناعمہ کی نگاہ ایک مرتبہ پھر اس کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں ہنوز وہی پیش برقرار تھی۔ ناعمہ کو الجھن ہونے لگی۔

چائے کا کپ خالی کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فریجہ بھی جلدی جلدی پلیٹ صاف کرنے لگی پھر دونوں بھائی بہن کے درمیان نظروں ہی نظروں میں کسی بات کا تبادلہ ہوا تھا۔ فریجہ نشوونما سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے رابعہ بیگم کی جانب بڑھی۔

”آئی۔۔۔ ایک فرمائش کر سکتی ہوں۔“
 ”ضرور بیٹا!“ رابعہ بیگم مسکرا دیں۔ ”اس میں بھلا بوجھنے کی کیا بات ہے۔۔۔ بولو۔“
 ”مجھے امی سے آپ خاندان میں جوں کی بلمکے خوشی کے ساتھ ملنے کی بات کہانی کی گئی ہے۔ وہ لاؤ بھراؤ اور اس میں بولی۔“
 ”کیوں نہیں؟“ رابعہ بیگم مسکرائیں ”تم کہو تو کسی!“
 ”آئی۔۔۔ انہیں لوگ کچھ دیر کے لیے ناعمہ کو باہر لے جائیں؟“

اس کی بات سن کر رابعہ بیگم دفعہاً ”خاموشی ہو گئیں۔“ وردہ کا چہرہ بھی یکایک بخبیخہ ہوا تھا اور ناعمہ پر تو ویسے بجلی ہی گری تھی۔ وہ تو ہر اس بات کی کھڑی سب کے چرے دیکھنے لگی تھی۔

فرزادوں ہاتھ پیٹنے کی جیبوں میں ڈالنے والے یوں لالچاں سے کھڑا تھا جیسے اس کا اس بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو حالانکہ ناعمہ کو پورا اندازہ تھا کہ اس فرمائش میں فریجہ کی صرف زبان ہی استعمال ہوئی ہے۔ اسے یہ خیال بے طرح ستا رہا تھا کہ کہیں رابعہ بیگم اسے ان دونوں کے ساتھ جانے کے لیے نہ کہہ دیں۔ ایسی صورت میں یقیناً فریجہ درمیان سے ہی کہیں غائب ہو جاتی اور وہ اس کی پیش بھری نظروں کا سامنا کرنے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار رہی رہ جاتی! رابعہ بیگم نے ہنوز فریجہ کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔

”بولیں نا آئی!“ فریجہ اٹھلائی ”ہم آؤں کریم کھا کر لوٹ آئیں گے۔ زیادہ دیر ہرگز نہیں جائیں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔“

”دیکھو بیٹا!“ رابعہ بیگم دھیمی آوازیں بولیں ”میں جانتی ہوں کہ یہ نیاز مانہ ہے اس کے کچھ اور ہی تقاضے ہیں۔ نئے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن ہمارے خاندان اور ہمارے گھر میں اب تک ان ہی پرانی قدروں کا رواج ہے ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کے آپس میں ملنے یا ساتھ باہر آنے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تم لوگ یہاں آئے مجھے بے حد خوشی ہوئی، بلکہ میں نے خاص طور پر ناعمہ کو بھی سامنے بلوایا کیونکہ میں اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن بیٹا! جہاں تک تمہارے ساتھ باہر جانے کی بات ہے اس کی اجازت میں نہیں

دے سکتی کیونکہ ہمارے مشترک نظام میں اسے نہ صرف برا سمجھا جائے گا بلکہ میری بھی بدھت کے لیے اسے بھولوں کی نگاہ میں بے باک قرار پائے گی۔ اللہ نے مجھے جیسا نہیں دیا لیکن میرے بھائیوں کے بیٹے ان لوگوں کو بھولوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا سامنا ہو گیا تو ناعمہ، کبھی ان سے نظروں کا ربات نہ کر پائے گی۔ اس لیے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور برامت ماننا لیکن میں معذرت خواہ ہوں۔“

فریخہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ قدرے سخت کاغذ کا نظر آ رہی تھی لیکن فرزانہ چند دم آگے بڑھ گیا۔

”آئی، آپ کو معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”معذرت تو ہمیں کرنا چاہیے کہ ہم نے آپ سے ایک غلط فہمائش کی۔ آپ کا لفظ نظر چائی پر جی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ کی باتیں سن کر۔ آپ بیلے ہم لوگوں کو معاف کریں۔ آئندہ ہماری طرف سے ایسی کوئی فہمائش نہ ہوگی۔“

راجہ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فرزانہ کی پیشانی چومی۔

”ماشاء اللہ جیتے رہو بیٹا! جی کی ماں ہوں۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے دل میں خوف بھی تھا کہ مجھے دانا و سب کچھ سن کر کس رویے کا مظاہرہ کرے۔ لیکن تم نے میرا دل ہلکا کر دیا۔ اللہ میرے دل میں اور نیکی اور چائی سے نوازے۔ خوش رہو۔“

ناعمہ نے جہاں نظروں سے اسے دیکھا۔ اس لیے فرزانہ کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ راجہ بیگم کی دعاؤں پر دیکھ کر انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس لیے اس کا وہ انداز ناعمہ کے دل میں اترا جاتا گیا۔ ان نگاہوں کی وہ پیش نصاب تھی۔ ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تھی۔ ناعمہ نے اس کے چہرے پر۔ بڑھاپا زوری اور محبت تھی اور خوب صورت مسکراہٹ سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

”آپ اجازت چاہیں گے آئی؟“ وہ بولا۔

”آئیے اور بیٹو! تمہارا اپنا کمرہ یہ ہے۔ اس میں کوئی تلفظ کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اور آئیے کرم میں، بہت اچھی باتی ہوں۔“ وہ دیکھتی ہوئی ہے بولی۔ ”پہلے سے جا کر آئیں گے تو آئیے کرم میں۔“

ناعمہ نے باہر جانے کی اجازت نہیں لینا پڑے کی۔

”کیا ضرورت ہے؟“ وہ دیکھ رہی تھی۔

فریخہ اور ناعمہ، مسکرا کر اس۔ چند لمحوں پیشوا حل میں جو کچھ یاد کی تھا۔ اب کبیں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔

فریخہ اور فرزانہ ہر جانے کے لیے بڑھے تو راجہ بیگم اور دور وہ انہیں دھت کرتے تھے۔ اراوے سے باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ ناعمہ نے سکون کا سانس لیا تھا!

اس کے باہر سے ڈیوٹی انچارج کا فون آیا تھا۔ شملہ اسوے سے اٹھی تھی۔ اس نے قدرے غائب دماغی سے فون پر رسیو کیا۔

”اے ڈاکٹر شملہ! آپ کو آنا ہو گا۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”ایمر جنسی ہے اس وقت!“

”کیون سر۔! میں تو ابھی دو بجے واپس آئی ہوں۔“ اس نے پڑھائی سے کھڑکی کی سمت دیکھا جو چار بج رہی تھی۔

”آئی تو ڈاکٹر شملہ! لیکن مجبوری ہے۔ اڈاکٹر رضوانہ اور ڈاکٹر ارم دونوں کے ساتھ کچھ پر اہم ہو گئی ہے اور ہاسپتال میں چار کیس موجود ہیں جبکہ ڈیوٹی پر صرف ڈاکٹر ناصر ہی ہیں۔ آپ اس وقت ڈیوٹی دے سکیں۔ حل آپ کو رستہ دے دیں گے۔“ وہ نرمی سے بھجوا رہے تھے۔

”اوکے سر۔! وہ بولی ”میں آجاتی ہوں۔“

”تھوڑی دیر میں آنا۔“ انہوں نے ممنونیت سے کہا۔

”میں آؤں گے۔“ اس نے نرمی سے بولی۔

پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر وہ بیٹھیاں اتر رہی تھیں۔ سامنے کھڑی فردوس بیگم نے بے حد زبردستی اسے دیکھا۔

”تیرا دکھائی شرت کے ساتھ سفید شادو پہنے میں کھلی کھلی سی ہوا نہیں ذرا سا تڑبن کر سکی تھی۔ سفید پر سن دیکھو۔“ وہ لڑکھائی کے ساتھ ان کے قریب آئی۔

”آئی۔! میں ذرا ہاسپتال جا رہی ہوں۔“

”جان مریضی! کچھ جاننا۔“ وہ سخت سے بولیں۔ ”اجازت کی تو تم نے بھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔“

”اطلاعی کی تو اس کی ضرورت تھی۔ محسوس نہیں کرتے۔“

”آئی۔! ایمر جنسی ہے۔ ہاسپتال کے فون کیا تھا۔“ وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”ورنہ آپ آتی ہیں میں ابھی آٹھ بجنے کی ڈیوٹی کر کے آئی ہوں۔“

”آئیے ہم سب جاتے ہیں۔ تم کیا بھاری ہو۔“

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”آپ سے بات کرنا افضل ہے۔“ شملہ کا نڈھ جواب تھا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”جاننا۔! یہ تو تمہارا ریس آؤ ہے کھانے کے لیے کیا تھا۔“ شملہ نے خوش ہو کر فرمایا۔

”ایسی کوئی بڑی بات ہوئی نہیں جسے خاص طور پر یاد رکھا جاتا یا اس کا ذکر کیا جاتا!“ ربیعہ ہلکے ہتھکے شگفتہ سے انداز میں بولی۔

”شکر ہے خدا کا کہ کوئی بڑی بات نہ ہوئی!“ وردہ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر اس کے قریب پڑی اسٹک کو دیکھا۔
”اور یہ اسٹک کیسی؟“

”تخنے کی بڑی میں ذرا سی تکلیف ہے۔۔۔ چلتے وقت سارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بس اسی لیے۔“
”کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا ربیعہ!“ وردہ فکر مند ہی سے بولی۔ ”ایسی باتوں کو معمولی نہیں لیا کرتے۔“
”ہاں۔۔۔ انیقہ مجھے لے گئی تھی زبردستی۔۔۔ ایک سرے وغیرہ بھی کروالیا ہے، سب ٹھیک ہے!“
”کل سے یونیورسٹی بھی کھل رہی ہے، کیا ارادے ہیں؟“

”ایک دو دن تو نہیں جاسکتی!“ ربیعہ بے چارگی سے بولی ”جیسے ہی اس اسٹک سے جان چھوٹے گی۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔ لیکن پلیرز وردہ! میرے لیے نوٹس وغیرہ بنالینا۔ لیکچرز کے ورثہ میرا بہت حرج ہو گا!“

”تم بے فکر رہو ربیعہ! یہ بھی بھلا کہنے کی بات ہے۔“ وردہ نے نجات سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ربیعہ چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وردہ کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ اس کی بہترین طبیعت اور بے پایاں خلوص کا مظہر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت وہی درخشاں چمک رہی تھی جو محسوس ہوتے تھے اور لبوں کا تبسم جاوولی کیفیت رکھتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ اس قدر محبت سے؟“ وردہ نے اس کا ایک ٹک دیکھنا محسوس کر کے کہا۔
ربیعہ چونک کر اٹھی پھر وہ ایک گہری سانس بھر کر مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں!“ وہ دھیرے سے بولی ”سوچ رہی تھی بہت خوش قسمت ہو گا وہ شخص جس کے نصیب میں اللہ نے تمہاری سب کچھ لایا ہوگا!“
وردہ نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر مسکرا کر سر جھکا لیا۔ ربیعہ نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دبایا۔ اس دن وردہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں مہلکھاں آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وردہ کو وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب چلوں گی ربیعہ!“
”بہت اچھا! تمہارا آنا۔۔۔“ ربیعہ غلغلوں اور محبت سے مسکرائی۔ ”آئی رہا کرونا۔“
”چلو باریاں لگا لیتے ہیں اب کے تمہاری باری ہے!“ وردہ شوخی سے ہنسی۔
”منظور ہے۔“ ربیعہ بھی ہنس دی۔

”میں منیہ آئی سے دعا سلام کر لوں پھر چلوں گی۔“ وردہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ تب ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ منیہ بیگم کی ہمراہی میں فریش سارا فح آرہا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور مشڈ کلر جینز میں وہ بے حد خوبصورت نظر آتا تھا۔ وردہ اپنی جگہ پر کھڑی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ رافع کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔
”ارے!“ رافع اسے دیکھ کر رک گیا ”وردہ۔۔۔ تم!“

”نجانے کیوں وردہ نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر رافع کا روشن چہرہ قدرے بجھ سا گیا تھا۔
”جی۔۔۔ میں ربیعہ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔“ وہ دھیسے سے بولی ”عمانیہ سے پتہ چلا تھا کہ ربیعہ کا معمولی سا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا چل آؤں!“

اس کی نگاہ رافع کے ہاتھوں میں موجود گلدستے پر تھی۔ سفید گلاب بے حد تازہ اور بہت خوب صورت محسوس ہو رہے تھے۔ وردہ کا جی ان پر ہاتھ پھیرنے کو چاہا۔

”اے! اچھا کیا۔“ رافع قدرے غائب رہا غی سے بولا ”میں بھی میں نے بھی سوچا۔ دراصل اس دن میں بھی اوجھڑے ہی کر رہا تھا۔“

”اچھا آئی! میں اب چلوں گی!“ ورنہ نے اپنی توجہ گلدے سے ہٹا کر منہ بند دیکھ کر دیکھا۔

”تو آ رہی ہو؟“ رافع کا بھی دل کھل گیا تھا۔ ”انیقہ کو تو اپنی بھائی ہے ہی فرصت نہیں ملتی۔ گھر میں رہ کر بھی اس کا تباہی نہیں چلتا میں اور رعبہ یہ ایک دوسرے کی شمالی کے ساتھی ہیں۔“

”جی! ورنہ سکرانی۔“

نہ جانے کیوں رافع کو اس کی سکرانہ بے حد بھیجی تھی۔ وہ اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ کر تہہ پہنچا۔

”رعبہ! منہ بند دیکھ اس کے کمرے کے دروازے پر اسے پکارنے لگیں۔ یہ رافع آیا ہے تمہاری طبیعت کا پوچھنے۔“

اندھ بھیجی ہوئی رعبہ بری طرح سے چوکی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا دھڑ ٹھیک کیا۔

”اندھ آج نہیں رافع۔“ رافع کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہیں آپ! اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”شکر ہے اللہ ناکہ بالکل ٹھیک ہوں۔“

رافع نے گلدے اس کی جانب دھکیلا۔ رعبہ نے اسے اشارہ کیا۔

”اے! وہ بے ساختہ بولی۔ ”کتنے خوب صورت پھول ہیں۔ ابھی ورنہ بھی میرے لیے بہت اچھے پھول لائی تھی۔“

رافع نے اس کی نظروں کے تعاقب میں گلابی پھولوں کے پھولنے والے لکڑی کے ڈھانچے پر ہاتھ رکھا۔

ہوئے پھول ورنہ کے پھولوں کے برابر نہیں رکھ دے۔

”آپ کو چوت وغیرہ تو نہیں آتی بھی زائد۔“ رافع خود قدرے غائب رہا محسوس کر رہا تھا۔

”آئی تو تھی لیکن بچت ہو گئی۔“ رعبہ دھیسے سے ہنسی۔ ”پھولوں پر نہیں کی۔“

”نہیں۔ روز بیکار ایسے ہی کر اس کر رہی ہیں؟“

”اگر ایسا ہو تو میری کوئی بڑی سلامت نہ ہوتی۔“ رعبہ شگفتگی سے ہنسی۔ ”سب میں کرک ہوتے۔“

دراصل میں ایک سگ سے ڈر کر بھاگی تھی۔ جو شاید مجھے کانٹے کے ارادوں سے بڑی تیزی سے میری سمت آیا تھا۔ مجھے تو اب پارک کے خیال سے ہی خوف آ رہا ہے۔“

”تمنا کیوں جاتی ہیں۔“ وہ بے خیالی سے بولا۔ ”کسی کو ساتھ لے لیا کریں۔“

اس نے خجائے کس سوچ کے تحت کہا تھا کہ رعبہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہی ہو گی۔

”پنا خیال رکھا کریں۔“ وہ پھر آواز سے بولا۔

پھر لڑکاکہ وہ چونک کر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پیٹت کی جیسوں میں ڈال کر اس نے گہری سانس بھری اور پیسے جو اسوں میں آتے ہوئے خوش دلی سے سکرانیا۔

”میں اب چلوں گا۔“

”ارے۔“ رعبہ بھی چونک اٹھی۔ ”اس طرح کیسے جا سکتے ہیں آپ۔ میرا خیال ہے الی جانے بتا رہی ہیں۔“

”میرا مقصد آپ کی عیادت کا تھا سو پورا ہوا چائے پینے پھر کسی دن حاضر ہوں گا!“ وہ شرارتاً بولا۔

”پھر آئے گا براہ راست؟“ رعبہ نے کس رو میں رعبہ کہہ بیٹھی۔

رافع حیران رہا۔ رعبہ بے حد خفت زدہ ہو گئی تھی۔ جو کچھ کیوں بے اختیار اور بے سبب ہی نکل گیا تھا۔

”میں میں میں اس کا نشانہ نہ تھا جانے کیسے کہہ بیٹھی تھی اور اب جی بھر کر شرمندہ ہو رہی تھی۔“

”خدا حافظ!“ ورنہ دھیسے سے کہہ کر نکل گیا۔

”خدا حافظ!“ رعبہ کے بھی ہونٹ ہلے تھے۔

کمرے کی لائٹ آف کر کے اس نے بے حد صدمہ آواز میں ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ ریڈیو پر لیت آواز کا غزل برادر گرام چل رہا تھا۔ چہنچہ کہ یہ کام اس کی طبیعت اور مزاج سے میل نہ کھا تھا پھر بھی بجائے کیوں آج ناعمہ کا دل کو بھی رات کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے پر تیار تھا۔ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ کچلے ہوئے پلوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ

تھی۔ ناعمہ سب کچھ بھول بھال کر غزل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

آخری شعر بر ناعمہ کی آنکھوں میں نجانے کیوں آنسو بھر آئے۔ شاید یہ نور جمال کی آواز کی گہرائی کا اثر تھا یا پھر لفظوں کی سچائی کا۔ اس نے انگلی کی پورے آنسو صاف کیے۔

یہ ایک اسے کچھ یاد آنے لگا۔ کوئی بات بے چین کرنے لگی۔ اس نے سوچا، غور کیا۔ کیا بات تھی؟ اسے اس غزل سے عرش کیوں یاد آنے لگی تھی؟

تب ایک ایک کر کے بہت سی باتیں بہت سی یادیں کسی البم کی طرح اس کے ذہن میں کھلنے لگیں۔ اسے بہت سے بے درپے واقعات تفصیل سے یاد آئے۔

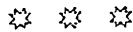
عرشہ کا اس سے یہ غزل مانگنا۔ اس کا ہر روز کھویا کھویا سا انداز۔ کبھی اداسی، کبھی بے پناہ خوشی۔ اس کا ناخن سے منگنی ہو جانے پر شدید احتجاج۔ ہر شخص ہر شے سے روٹھ جانا۔ ناعمہ کا سانس تیزی سے جلنے لگا تھا۔ اس کا ذہن آج شاید ہر راز سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن کی ایسی مثالی کارکردگی سے وہ خود ناواقف تھی!

وردہ تو اسے نہایت کم عقل اور بید شوگر دانتی سمجھتی تھی۔ یہ سب محصور اور سیدھی سادی کہا کرتی تھی۔ ثانیہ اسے کوئی عقل کی بات کہتا دیکھتی تو فرط حیرت سے دانتوں میں انگلی دبائی کرتی تھی اور آج ناعمہ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی بڑے راز سے پردہ اٹھالیا تھا۔ جیسے اس نے وہ سمجھ لیا تھا جو اب تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔

لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ سمجھ کر کس ردِ عمل کا مظاہرہ کرے؟ لیکن کیا جو کچھ اس نے سمجھا تھا وہ واقعی درست تھا؟ سچ تھا؟ یا پھر لوگوں کی اس کے بارے میں رائے بے حقائق تھی؟ جو ربط اس نے بنایا تھا۔ وہ اس کی کم عقلی کا مظہر تھا؟ اس کی انجانو جے کی حماقت کا کرشمہ؟

ناعمہ کو ابھی اس قسمی کو سمجھنا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مٹی ارادے باندھنے لگی تھی۔

Urdu



چہرے پر پانی کے چھپکے پارتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس کے لیے تو بے حد واضح تھا لیکن فریقِ ثانی کا ردِ عمل کیا ہو سکتا تھا اور کیا نہیں سہ۔ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی!

داش روم سے نکل کر وہ تولیہ سے چہرہ تھکتی ہوئی بیڈ پہ آ بیٹھی۔ ہاشم اپنی جگہ پر نیم دراز تھا۔ ایک بازو اس نے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔

شہلا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ آج ہاشم ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ اس نے شہلا کی چند باتوں کے جواب میں سنجیدگی سے چند الفاظ ہی استعمال کیے تھے اور خود سے کوئی بات اب تک نہ کی تھی۔

شہلا اور ہاشم کمرے میں ہوتے تو ہاشم کی توجہ مسلسل اس پر مرکوز رہا کرتی تھی اور مونڈے بے حد خوشگوار ہوتا تھا۔ وہ شگفتگی سے اکثر اس کی بے توجہی پر فخرے کسا کرتا تھا۔ آج معاملہ بے حد برعکس تھا۔ شہلا اس کی جانب متوجہ تھی اور وہ آنکھوں پہ بازو رکھے نجانے سو رہا تھا۔

شہلا نے ہونے سے کھنکھار کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن نتیجہ حسبِ توقع برآمد نہ ہوا۔

”ہاشم! اس نے پکارا۔
”ہوں!“ وہ اسی انداز میں لیٹے لیٹے بولا۔ بازو ہٹا کر اس نے شہلا کی جانب نہ دیکھا تھا۔ شہلا کے دل کو کچھ ہوا۔

”اوفو“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”امی پلیر ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ کہیں کیا کہہ رہی تھیں؟“

”واہ! وہ خوش ہو گئی۔“ یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!“
 ”لیکن بچی! تم باقاعدہ سے بڑی ہو۔ پہلا حق تمہارا بنتا ہے۔“ وہ لپکتے ہوئے بولی تھیں۔ ”کیا یہ بات تمہارے لیے ناگوار نہ ہوگی؟“

”آپ، آپ کیس تو میں ناعہدہ سے بات کروں۔۔۔ وہ جلدی سے بول پڑی۔“ آخر ہمیں اس کی رائے بھی معلوم کرنا چاہی۔۔۔“

”بہت سچے وارے میری بیٹی، وہ مجھ سے بولی جیسی ہے۔“ غور کر رہی تھی۔
 ”آمین!“

✱ ✱ ✱

”یوں تو“ دوسری جانب سے خوب صورت بھکاری آواز ابھری تھی ”مس ربیعہ بات کر رہی ہیں؟“
 ”جی ہاں!“ وہ قدرے الجھی۔ ”ربیعہ ہی بات کر رہی ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟“
 ”میر حسن مخاطب ہوں“ آپ کا مجرم!“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

ماہنامہ شعاع 280 دسمبر 2006

ربیعہ نے قدرے غائب نامی سے چند لمحوں کے لیے غور کیا تھا۔ فوری طور پر اسے وہ نام شمس تو محسوس ہوا۔ اس نے اپنی جیکب تکالی اور جیکب کٹ کر حرم کی جانب بڑھا دیا۔
 "میرے؟" وہ بڑبڑائی۔
 "شاید آپ بیگانی نہیں، حالانکہ میں اپنا تعارف ایک مجرم کی حیثیت سے کروا بھی چکا ہوں۔" وہ مسکرایا۔
 تب ہی اچانک اسے امیر حسن بھی یاد آیا اور اپنے نئے گھر کا در بھی۔
 "وہ؟ کیسے ہیں آپ؟" وہ تجانے کیوں شرمندہ ہی ہوئی۔
 "میں پوچھنے کے لیے تو میں نے فون کیا ہے۔" وہ ہنس دیا۔ "یہ بتائیں کہ آپ کسی ہیں؟ آپ کا پیر ٹھیک ہو گیا؟
 عبادت بارگاہ تھا کہ آپ کو چیلنے میں کچھ براہم ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سن کر بے حد پشیمان ہوا۔" مس ربیعہ۔ ایک بار پھر
 سبے حد معذرت چاہتا ہوں۔"

"اسے امیر حسن صاحب! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" ربیعہ فوراً "بولی تھی۔" میں بھی جانتی ہوں۔
 آپ بھی کسی قصور صرف اور صرف میرا تھا۔ میں ہی اندھا دھند بھاگتی ہوئی آپ کی گاڑی میں سے نکل کر آئی تھی۔
 "آپ خا خا اور الزام اپنے سر لے رہی ہیں۔" وہ ٹھنکئی سے بولا۔ "حالانکہ اصل قصور دار تو وہ پارک کا کتا
 ہے۔ کیا نام تھا آپ نے اس کا؟"
 ربیعہ کو بے ساختہ "آئی تھی۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی۔
 "میں نے کئے کا نام بھی بتایا تھا؟ شاید میرے لوہان کچھ زیادہ ہی خطا ہو گئے تھے۔" دوسری جانب امیر حسن
 بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی میں ٹھنکائی اور دستانہ پر تنقید تھی۔ ربیعہ کو احساس ہوا کہ وہ ایک متوازن اور خوبصورت
 شخصیت کا مالک ہے۔
 "لوہان تو آپ نے میرے خطا کر دیے تھے۔ عین کتا تھا۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی۔
 گواہی دینے کے لیے آپ ہوش و حواس میں تھیں۔
 ربیعہ قدرے چیخنے لگی۔
 "مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ اب جانے بھی دیں اس ذکر کو۔"
 "چلیں جانے دیتے ہیں۔" وہ فوراً "ہی بولا۔" اب اجازت دیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن حاضر ہوں گا۔ آئی
 کو میرا سلام کہیے گا۔"
 "جی ضرور۔" ربیعہ بولی۔
 "خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
 ربیعہ رستہ پر تھکے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے رستہ رو کر دکھا تھا۔

"ہاشم بھائی! میں نے آپ سے میسجوں کی فیس کے لیے کہا تھا۔"
 بریف کس بند کرنا ہوا ہاں چمک اٹھا۔ اس نے مزہ دیکھا۔ حرم شاید پوچھ رہی تھی کہ اس نے کہا تھا۔
 تھا اس کے گواہ آیا کہ اس نے دونوں پہلے ہاشم سے اپنے میسجوں کی فیس کا ذکر کیا تھا۔
 ہاشم کو قدرے شرمندگی ہوئی۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی بھائی کو اپنی کسی ضرورت کا ذکر
 دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہو۔ وہ اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنا اپنی پہلی ترجیح سمجھتا تھا لیکن کچھ کچھ دنوں سے
 وہ ہنسی طور پر مضرب ساتھ اسے بہت سی باتیں بھول جاتی تھیں۔

"تجربہ کی وجہ سے تو ہم مرکز چھوڑ کے رو سکتے ہیں با دام۔"
 شمسلا کو خوشگوار سا احساس بھی ہوا۔ کتنی ہی دن سے وہ کچھ سنجیدہ اور اداس سا تھا۔ اس نے شمسلا سے کوئی
 محبت بھری بات نہ کہی تھی بلکہ نا اہل نہ کہا تھا۔ آج اس کے لبوں سے ایسی بات سن کر اسے اچھا لگا تھا۔ ہر چند کہ
 زبان میں اس کے لطیف طعنے کا احساس بھی بھانسنے میں کچھ مشکل تھا۔
 گاڑی آگے بڑھی تو شمسلا نے کھنکھار کر چیسے کی بات کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔
 "ہاشم! میں نے آپ سے ایک درخواست کی تھی۔" وہ ذرا ہنسنے لگی۔
 ہاشم نے کچھ دیر اس کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ شمسلا نے گردن گھما کر اسے
 دیکھا۔
 "میں کچھ پوچھ رہی ہوں ہاشم!"
 ہاشم نے گہری سانس بھرے ہوئے موند کا تھا۔
 "میں کا جواب دینے کے لیے مناسب لفظوں کا چناؤ کر رہا تھا۔" وہ بولا۔

”مناسب لفظ؟“ شلا چو گئی۔ ”مناسب لفظ تو کسی معذرت یا انکار کے لیے دھونڈے جاتے ہیں۔“
 ہاشم پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولا۔
 ”تم نے جو فراخ کی سچی شہادتیں اس کے جواب میں معذرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا۔“
 ”رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے وہی شناسا آواز سنائی دی تھی۔“
 ”رابطہ قائم ہو گیا۔“ ہاشم نے کہا۔ ”وہ تم سے کبھی نہیں ملے گی۔“
 ”مناسب لفظ؟“ شلا چو گئی۔ ”مناسب لفظ تو کسی معذرت یا انکار کے لیے دھونڈے جاتے ہیں۔“
 ہاشم پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولا۔
 ”تم نے جو فراخ کی سچی شہادتیں اس کے جواب میں معذرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا۔“
 ”رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے وہی شناسا آواز سنائی دی تھی۔“
 ”رابطہ قائم ہو گیا۔“ ہاشم نے کہا۔ ”وہ تم سے کبھی نہیں ملے گی۔“

”آپ اگر معاشی مسائل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں ہاشم! تو میں نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ آپ اپنے گھروالوں کی معاشی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں نہ ہی میں نے اپنے اخراجات میں اضافے کی بات کی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک علیحدہ دکان کی بات کی تھی لیکن میرا مقصد آپ کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ خدا کا فضل و کرم ہے میرے اخراجات کے لیے میری اپنی آمدنی کافی ہے۔ میں صرف اپنے بچوں کو ان دکانوں سے خریدنا چاہتا تھا۔“
 ارنگاڑی بات کر رہی تھی۔ اس گھر میں میری سوچ جتانے سے پہلوؤں میں ستر کاٹنے میں مشغول تھیں۔
 ”شکار ہوں۔ ایک ماہاں ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی آمد پر ایک خفت سے دوچار ہوجاتا ہوں۔ آپ مجھ سے خفت کا دعوہ کرتے ہیں لیکن اتنی معمولی سی بات نہیں سمجھتا رہے ہیں۔ اگر کوئی قریب ہی کوئی گھر ہے تو وہاں شہت ہو جاتے ہیں تو اس میں کون سی برائی ہے؟“
 ”بچے کی حد تک تو بے شک ہے شلا! لیکن ایک بات سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ تم بھی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس گھر کا بار بٹاتا ہوں۔ صرف معاشی مسائل کی بات نہیں ہے اور بھی کی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو علیحدہ ہونے کی صورت میں میں اہل احسن طریقے سے سنبھال جاؤں گا۔“
 ”منہلا۔“ شلا نے چڑکاسے دیکھا۔
 ”منہلا۔“ کچھ نہیں۔ ”وہ مجھے سے بولا۔ ”تم اس وقت ایسے موڈ میں ہو جب صحیح بات بھی غلط لگتی ہے۔ اس موضوع پر پھر بھی بات کریں گے۔ تمہارا باپ بھی ایسا ہے۔“
 شلا خاموش ہو کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ ہاشم کے انکار کے انیسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم اس مطالبہ پر زیادہ اعتراض نہ کرے گا اور وہی خوشی اس کی بات ماننے سے لگاؤں گے۔ ہاشم کا فیصلہ کن انداز اسے حیران بھی کر گیا تھا اور براہِ بھی۔ ہاشم نے گاڑی باپسٹل لیا اور کٹک میں روکی تو شلا اپنا بیگ بیچنے والے ہوتے ہوئے قدرے آف موڈ میں اترنے لگی تھی۔
 ”خدا حافظ۔“ ہاشم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
 ”خدا حافظ۔“ وہ زریب بڑبڑاتی تھی۔

فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کایب رہے تھے اور دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ اپنے منگیش سے بات کرنے جا رہی تھی۔ وہ ہر حال پر بھی لکھی ہاشور ایک سوین صدی کی لکھی تھی۔ البتہ حیاتِ اور ادراغی اصول میں رہنے کی قابل ضرورت تھی۔
 ”گھر اس عجیب سی گھبراہٹ کی اصل وجہ وہ نامعلوم سا احساس اور وہ اندازہ تھا جو اس نے نبھانے کیلئے ایک پیر کے جاوٹی لٹے کے قتل کا قلم کیا تھا اور اب وہ اپنے انداز سے کی تصدیق چاہتی تھی۔ دوسری جانب تل جاری تھی۔“
 ”منہلا۔“ کچھ نہیں۔ ”وہ مجھے سے بولا۔ ”تم اس وقت ایسے موڈ میں ہو جب صحیح بات بھی غلط لگتی ہے۔ اس موضوع پر پھر بھی بات کریں گے۔ تمہارا باپ بھی ایسا ہے۔“
 شلا خاموش ہو کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ ہاشم کے انکار کے انیسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم اس مطالبہ پر زیادہ اعتراض نہ کرے گا اور وہی خوشی اس کی بات ماننے سے لگاؤں گے۔ ہاشم کا فیصلہ کن انداز اسے حیران بھی کر گیا تھا اور براہِ بھی۔ ہاشم نے گاڑی باپسٹل لیا اور کٹک میں روکی تو شلا اپنا بیگ بیچنے والے ہوتے ہوئے قدرے آف موڈ میں اترنے لگی تھی۔
 ”خدا حافظ۔“ ہاشم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
 ”خدا حافظ۔“ وہ زریب بڑبڑاتی تھی۔

”جی ہاں۔“ وہ مزید رحم ہو گئی تھی۔ ”میں نے تسلیم کیا۔ آپ جو سزا بنا چاہتے ہیں دے دیجئے۔“
 فراز چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ وہ اسے درپے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
 ”سزا چاہو۔“ گانا تو طے ہے۔ منہلا۔ ”کہہ دیجئے۔“
 ”کیا ہوگی اس بات کا فیصلہ میں اس وقت کروں گا جب تم مجھے ان مجبوروں کے متعلق بتاؤ گی جن کا تم نے ذکر کیا اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔“
 ”میں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ گھبراہٹ کی۔“
 ”تب تو سزا میں کسی نری کی گنجائش نہیں نکلتی گی۔“ وہ سبہ رحم انداز میں بولا تھا۔
 ”تاہم کو اس کے اس سخت گیر شخص سے جب خوف کا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔“

ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ نجانے کیا سوچے جا رہی تھی۔ کیا ہوا تھا؟ کیا ہو رہا تھا اور کیا ہونے جا رہا تھا؟ سب کچھ ایک باریک پروے کے پیچھے تھا، نظر ابھی رہا تھا اور نظروں سے اوجھل بھی تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ جمعہ ٹھیک اسی انداز میں حل ہوا تھا جس طرح اس نے اندازہ لگایا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ تپل ہونے لگا تو وہ بے جان سی ہو کر بستر پر گر گئی تھی۔



ٹائی کی ٹائٹ درست کرتے ہوئے اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی پھر خوش دلی سے مسکرایا۔

”اودی تم ڈیشننگ ہو راف حسن!“ اس نے زیر لب کہا اور ویرے سے ہنس دیا۔ اسے ہاشم یاد آ گیا تھا جو ہمیشہ آئینہ دیکھ کر خود کو یوں ہی مخاطب کرتا تھا۔

”بے وفادوست۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”بالکل ہی بیوی کو پیارا ہو گیا ہے، مہینوں شکل نہیں دکھاتا۔۔۔ چلو اچھا ہے، اگر بیوی کو پیارا ہو جائے تو سب بڑی مشکلوں سے یہ دن دیکھا ہے اس نے۔۔۔ اور پتہ نہیں پیارا ہوا بھی ہے یا۔۔۔ اب بھی لیکری میں کھڑے ہو کر سگریٹ پیتا ہے۔“

آئین کا بن بند کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکلا تھا۔ چائے کے کپ میں دو دھڑالتی ہوئی عذرا بیگم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں بلا شاعرانہ کلمے پر مجبور ہوئیں۔ وہ کڑی پوچھ کر کپ میں چچھ ہلانے لگا۔ عذرا بیگم بھی دوسری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

”رافع۔ ایک بات کرنا تھی تم سے۔“

”جی امی؟“ ”اس نے غلٹ میں کئی گھونٹ بھرے۔“

”ثانیہ تمہارے لیے جو لوگ بچھلے دنوں آئے تھے، انہوں نے کہا، امی! یہ اور مجھے بھی لڑکا پسند آیا ہے۔ کاروبار بھی اچھا ہے ان لوگوں کا۔ پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“

”بابا کیا کہتے ہیں؟“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔

”وہ تو راضی ہیں۔ کہتے ہیں رافع سے بھی پوچھ لو۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے کپ خالی کیا۔ ”میں دو مرتبہ ملا ہوں اس سے۔۔۔ مس اچھا لڑکا ہے۔ شریف ہے، ذہین ہے اور کیا چاہیے؟“

”لیکن ایک مسئلہ ہے بیٹے! وہ دو ماہ بعد عید کی مارچ مانگ رہے ہیں۔ اتنی جلدی بازی میں سب کچھ کیسے ہو گا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ ثانیہ کے لیے تو تقریباً سب ہی کچھ تیار ہے۔ مسئلہ کس بات کا ہے؟“ وہ ماں کے ہچکچاہٹ بھرے انداز پر حیران ہوا۔

”مسئلہ۔۔۔ مسئلہ تمہارا ہے نا۔ تمہاری نوکری جب تک کسی اچھی جگہ نہ ہو جائے۔۔۔“

”میرا۔۔۔؟“ ”میرا کیا مسئلہ ہے امی؟“ اس نے مزید حیرت سے ماں کی بات کالی۔ ”بات ثانیہ کی ہو رہی ہے مسئلہ میری نوکری کا کیسے ہو گیا؟“

”بچھنے کی کوشش کرو بیٹا! تمہارے والد کا خیال ہے کہ ثانیہ کی شادی اور تمہارا ولیمہ ساتھ کر دیں، اسی طرح سدرہ کی شادی اور نافع کا ولیمہ ساتھ ہو جائے۔ دو بیٹیاں جائیں گی تو دو ہوسوں آجائیں گی اور پھر اس طرح کچھ کفایت بھی ہو جائے گی اب تمہاری نوکری کی ہو جائے تو میں رابعہ سے بات کروں۔ وہ بھی ورہ کی وجہ سے فکر مند ہے۔ ناعملہ کی مفتی کے بعد اب وہ حق بجانب بھی ہے اور سب ہی کا خیال ہے کہ اب تمہاری اور ورہ کی شادی

بات کرتے کرتے انہوں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر یکدم حیران کی طرح رہ گئے۔
جیسے کسی نے شہزاد کو ہوا دکھادی ہو۔ وہ بالکل کم صم سا ہو گیا۔ غمزدار تیک پریشان ہو گئیں۔
”راغ!“ انہوں نے پکارا۔

”کیسے؟“ وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ ”جی ای۔ کیسے۔“
”کیا کہوں نہیں اپنی بات مکمل کر چکی۔“
”کون سی بات؟“ وہ غائب عالمی سے بولا۔

”شادی کی۔ اور کون سی۔ یہ بہتر تاثر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی الجھن ہے؟“
”جی۔ نہیں۔ نہیں ای۔ کیسے۔ کوئی الجھن نہیں ہے۔“ وہ غمزدار کہہ اٹھا۔
”تو کچھ کچھ جواب دو۔“ وہ اسے لیے لیے تیار کر کے گھر دے گا۔

”میں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی اور تم لوں ہو گئے جیسے بھوت دکھ لیا ہو۔“
جائے کو پرتے لگے۔

”ای۔ میں ایک انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔“ اس نے رست واپس پڑھ لگا دی۔ ”دعا کیجئے گا۔ اللہ کامیاب کرے۔“

”اچھا۔“ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”میرا تو رواں رواں ہی لڑکوں کے لیے دعا گورتا ہے۔“
”بہت اچھی بات ہے۔“ مٹی بیٹھ گئی ہے۔ ”اچھی لڑکھاؤ دین گے۔ دیگر مراعات عطا نہ کئے ہوئے تمل پڑا۔ غمزدار اب اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔

”پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ تم اگر خیر سے کامیاب تو ہو گئے تو میں رات کے بات کروں گی۔“
رکے۔

”ای۔“ وہ اچانک ہی پلٹا۔ ”میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ زندگی میں ابھی کرے کو بہت کچھ باقی ہے۔ شادی میرے مسائل میں اضافہ کرے گی۔ آپ چھپتے ہیں ابھی کچھ بھی نہ کہیں، صرف ثانیہ کے لیے سوچیں۔“

”ہاں۔“ غمزدار ہنسنے لگا۔ ”یہ تم کو کیا کہہ رہے ہو؟“
”ایا باتیں بھر کر رہے ہو؟“
”خدا حافظ۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”خدا حافظ۔“ وہ چپکے چپکے ہنسنے لگا۔

”سیاں! ہنگر سونا سونا۔ سیاں! ہنگر سونا۔“ چاند نیچے سولی اڑتیاں۔ سن خوشو جیسے سولی بگیا۔ سیاں! ہنگر سونا۔“

”جہن میں کھڑی اچانک لمحہ بھر کے لیے نہ ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ گانا جو کبھی جہن کی حد تک نہ تھا۔“
”جہن نے اس کا دل چر کر رکھ دیا تھا۔ وہ دہریہ کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی پھری ایک طرف پیسٹیک کر رہا تھا۔“

”میں نے اپنا نام بھیجی تھی۔ سی ڈی پلیئر کن کر کے وہ اپنے کارنامے پر بے حد خوش نظر آتی تھی۔“
”مہمہ۔ مہمہ۔ آپ کا فوریٹ سنا۔“ اس نے آیاں بجا کر اس سے بھی دعا وصول کرنا چاہی۔

ایقان نے آگے بڑھ کر لیٹر آف کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔
”تو میں مہمہ۔ یہ سناٹ اچھا نہیں لگا؟“ ایمان اس کے آنسوؤں سے خوفزدہ سی ہو گئی۔ ”میں وہ سراسر مانگ رہی ہوں۔“
”آپ نے وی کی کارڈوں کا لوہنا! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ گانے کی آواز اچھی نہیں لگ رہی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اس کی کیفیت سے پہلے ہی گھبرا گئی تھی۔ سعادت مندی سے اٹھ کر بیٹھ رہی تھی۔
ایقان وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ رات بھی کتنی ہی عجیب و غریب خوابوں سے گھبرا کر اس کی آنکھ کی مڑبڑ مڑبڑ تھی۔ اس کے بعد اسے پتہ نہ آئی۔ اب دکھتا ہوا سر اتر رہے ہوئے آنسوؤں سے سوچ رہی تھی کہ مومن کے اسکول سے آنے سے قبل کھانا کیسے بنائے؟

”یہ گانا میرے دل میں سرنگ بنا چکا ہے۔“ ایک جھنجھلائی ہوئی آواز تھی۔ ”تو خریدا جاوے اس میں جو تم نے گانا اور اس کے بول میں سرگ بنائے ہیں اور جو چیز ایک بار دل کو چھو جائے وہ ہمیشہ بول نہی ہے۔ خود کرتی ہے۔ وہ بے نیازی سے بول رہی تھی۔ ”آپ کو آخر کیا اعتراض ہے اسے سنئے میں؟“

”اچھا۔“ وہ قہر سے ہوا تھا۔ ”تو یہی ہمیشہ کہتے ہو۔“
”ایک بار؟“ وہ بدرومان کر رہی تھی۔ ”ایک مطلب ایک بار؟“

”ایک ایک بار۔“ پھر بار بار بار بار۔

ایقان کی ہنسی کی آوازیں سے گھر بھر گیا تھا۔
ایقان نے ایک کراچی کے ایک بیل بھائی تھے۔ اس نے دوسرے بارہ بھائی گھڑی کی سوئیوں کو کھینچا۔

”ماں! میں شاید اس وقت وہی ہوتی ہوں۔“ اسے خوشی سی ہوئی۔
”خفیہ حیات اس سے خفا تھیں۔ وہیں بھی کھانا ہی اس کی خیریت پوچھنے یہاں تک چلی آتی تھیں۔ ورنہ اکثر ایقان ہی ان سے مل آتی تھی۔ ایک ہی گھر میں آجائے کے باوجود ان میں بھی ایک مٹاؤ دیکھ ہی ہو گئی تھی۔

ایقان تیزی سے دروازے کی کھٹ پھٹی۔ دروازہ کھول کر دیکھ کر وہ دیر کے لیے پتھر کی سی ہو گئی۔ باہر آخرتیاں کڑھنے تھیں۔

”ماں! ماں! میں بہت پریشان ہو کر رہ گئی ہوں۔“ صبح سے دیوانوں کی مانند اور صر سے ادھر پھرتی غمزدار تیکم بمشکل دوسرے تک ہی ضبط کیانی تھیں۔ کوئی چاروں پارکا لڑخوہہ سانس کھاس ہی بیٹھ گئیں۔
”میں سوچتا تھا کہ سٹوڈنٹ سے کہوں لیکن پھر خیال آنا ہے کہ اگر وہ انہیں غصہ اٹھاتا تو کیا ہو گا۔ گھر میں کوئی بڑا فساد نہ کھڑا ہو جائے۔ میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔“

”غدا آخر کے ہوں۔ ابرا کیا ہو گیا؟“ خفیہ حیات بھی گھبرا سی گئی تھیں۔ ”دیکھو مجھے کوئی ایسی سہمی خبر نہ سنا۔“
”میرا دل تو پہلے ہی بہت کمزور ہو چکا ہے۔“ غمزدار تیک خاموش سی ہو کر سانس کا چھو بیٹھے گئیں۔ انہیں الفاظ کا چٹاوت کرتے ہوئے بھی ہمت ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”ماں! میں نے صبح رات سے شادی کی بات کی تھی۔“ ثانیہ اور رافع کی شادی چونکہ ایک ساتھ ہی کر دینے کا

ارادہ تھا کہ میں نے سوچا کہ رافع کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا جائے۔
وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ شفیقہ حیات ہراساں سی ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ عذرا بیگم کی خاموشی

انہیں شاق کر رہی۔
”اب کچھ آگے بھی کہو۔“ وہ بے مہری سے بولیں۔

”اگر آپ رافع سے رافع ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ اتنی جلدی شادی نہیں کرے گا۔“ وہ سر جھکا کر ہنسنے سے بولیں۔

”ہاں بس پھر؟“ انہیں مزید بے تابی ہوئی۔

”پھر کیا؟“ انہوں نے جیڑی سے سرائیا۔ ”میری بات تو سمجھ سے صحت پریشان کر رہی ہے۔ میں نے پانی کا گھونٹ تک نہیں پیا اور آپ کہہ رہی ہیں پھر؟“

”اے کون۔“ شفیقہ حیات کی ساری بے تابی جیسے ہوا ہو گئی۔ ”تم اس بات کو اتنا برا مسئلہ بنائے بیٹھی ہو۔ میں تو دوسرے جیسے ہے جان ہی ہو سکتی تھی کہ جسے کیا ہو گیا۔“ حد کر دی تو مٹنے۔

”خدا؟ آپ کر رہی ہیں اماں۔“ وہ براہمان لگیں۔ ”یعنی یہ پریشان کن بات نہیں ہے؟ رافع کی بی بی بار بے لطفوں میں کہہ چکی ہیں اور میں انہیں بھی کہہ کر سکتی رہتی آئی ہوں کہ چاہیے جسے ساتھ ہی رافع اور وردہ کی شادی بھی کریں گے اب میں رافع کو کیا جواب دہن گی؟ پھر یہ کہ وہ روزیہ کا بھائی ہے۔ اب رافع کے نام پر بیٹی رہے گی؟ ماشاء اللہ! ہاتھ میں اب کس سے کھر کھر ہستی کے ہو گئے۔ رافع اور وہاں تک میری عمر ہی نہیں تقریباً رافع کیوں نکھانچ رہا ہے اب نہیں کرے گا؟ جب سوچیں پھر وہ جو جانیں گی؟ پھر حقوق سے کیا کہیں؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔“ وہ بالکل مطمئن تھیں۔ ”بچے نے یقیناً کچھ سوچا ہو گا اسے مستقبل کے بارے میں۔ بھلا تو اسے تمہارے ہاتھ پر کچھ نہیں ہے۔“ شفیقہ حیات نے رافع کو دیکھا اور ایک سال کی عمر پر ہنسنا لگا۔ ”ماتک رہا ہے تو اس میں زور دہی کا کیا کام ہے؟ اور رافع کو تو رافع کی بی بی کا بیٹا ہے۔“ وہ بولیں۔

عذرا بیگم مزید پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ جاتی تھیں کہ رافع شفیقہ حیات کا سب سے ڈالا ہوا بچہ تھا۔ اس کی برائیاں بھی انہیں خوبیاں نظر آتی تھیں لیکن اس موقع پر رافع کی خاموشی نے انہیں مناسب لگا تھا۔

”اگر اب آپ کو پھر وہی رافع سے بات کیوں نہیں کر سکتی؟“ آخر شادی کر لینے سے اس کے مستقبل کو کون سے خطرات لاحق ہو جائیں گے؟ ہماری اپنی ہی بے دردی اس کھر کھر میں آگئے تھے۔ یہ کہہ کر اب آگے بڑھا۔

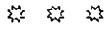
”جی ہاں! پھر وردہ سے شادی سے کچھ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں؟“

شفیقہ حیات کو ہسوکا اصل پریشانی اب سمجھ میں آئی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔

”میرا خیال ہے رافع اتنا کم عقل نہیں ہے ماشاء اللہ۔ بس سمجھو والد! بچہ ہے۔ اسے علم ہے کہ یہ دو لگہروں کا ملاپ ہے۔ اس رشتے سے کی رشتوں کی محبت اور عزت کا قلم ہے۔ وہ بھی کوئی انا کام نہیں کرے گا۔ تم اگر فکر مند ہو تو میں رافع سے کھل کر بات کر لیتی ہوں۔“

”جی ہاں! کیا چاہا رہی؟“ بولیں۔ اسے سمجھا میں اور اس سے کہیں چپ چاپ شادی کر لے۔ ہمارے بھی کچھ ارادے ہیں۔“

وہ سانس کیسا بے قدرے ہلکی ہلکی ہو کر اٹھی تھیں۔



بودوں کو پانی دیتی رابعہ بیگم ہنسنے لگی تھیں۔

”تمہارا پس بھی آگے آگے۔“

ست روئی سے چلتی ہوئی وردہ یوں رکی تھی جیسے کسی خیال سے چوکی ہو۔

”جی سنی امی۔“

”میں نے کہا۔ واپس بھی آگئی ہو۔ خیر تو ہے، غامیہ ملی نہیں؟“

”غامیہ؟“ ہاں۔ وہ بے پتہ نہیں۔ شاید وہ نہاری بھی۔ اس کے واش رو م سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں پھر واپس آگئی۔

وہ غامیہ کے پاس سے اپنا کڑھائیوں کا کیٹا لنگ لے کر تھی۔ وہ پھر والے قدموں لوٹ آئی تھی۔

”سجھا۔“ رافع بیگم مطمئن ہوئیں۔ ”اور اب کیا کر رہی ہیں؟ کہہ رہی ہیں کچھ؟“

”نہیں۔“ وہ بولیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسنے لگیں۔ ”میں اندر نہیں گئی۔ غامیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

UrduPh

”ہاں۔ شاید لیکن اتنا زیادہ نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔“ انہوں نے اس کا دھواں دھواں ہوا چہرہ دیکھا۔
 ”کوئی مدد نہیں دوں آپ کو؟“ رجبہ کو اچانک خیال آیا۔ ”اس دن شملہ آپ نے جو ٹیلیٹ دی تھی آپ کہہ دے میرے پاس۔“
 ”ٹیلیٹ سے نہیں اس انتخاب سے آرام آیا تھا لیکن تم ابھی ٹیلیٹ ہی دے دو۔ میں کھا لیتی ہوں۔ شاید اس سے آرام آجائے۔“
 ان کا چہرہ مزید پتلا پڑا تھا۔ رجبہ ڈر سی گئی۔
 ”یہی۔ میں شملہ آپ کی کو فون کر رہی ہوں وہ ابھی گھر ہی ہوں گی۔“
 ”نہیں رجبہ۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”اس کی ساس کا یہاں روز روز آتا ہے۔ میں کرتی ہوں۔“
 ”میرا اس کر دے گی۔ آئے گی۔ خواہ مخواہ کوئی ناچا لے۔ ہو۔“
 ”نہیں۔“
 ”فیصلہ آئی ہی ہوگی۔“ انہوں نے خود کو تارل ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ ”تم تب تک وہ گولی دے دو۔“
 ”بھگے۔“
 ”دھمک ہے۔“ رجبہ ناچار وہاں سے اٹھ کر لڑائی نہیں آئی تھی۔
 ”میں نہیں۔“ اس نے گولی لا کر اس نے اس کیس نکالی پھر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں انہیں قدرے آرام آیا تھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
 ”نہیں۔“ انہوں نے گولی لا کر اس نے اس کیس نکالی پھر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں انہیں قدرے آرام آیا تھا۔

”جاؤ بیٹا! ماماں ہیں آپ کے۔“ اقبال قدرے طنز سے بولی۔ ”ماماں سے ملو۔“
 اختر مایاں کھسپانے ہو کر عجیب سے انداز میں کھی کھی گئے۔ ایمان اب تنک ان کے قریب نہ تھی۔
 ”بھیا! کھی بیگم کو سلام کہیے گا۔“ اقبال نے انہیں دھرتیا پر لے کر کہا۔
 ”چھا۔“ انہوں نے تلخ داری سے سر ہلایا۔ ”ابھی جا میں گئے تو حضور کہہ دیں گے اور کوئی کام ہو تو ہم مل دو۔“
 ”آپ کے لئے تو اتنا کام ہی کافی ہے اختر مایاں! کھی اگر آپ سہولت سے کر سکتی ہیں تو۔“ وہ تلخ کر بولی تھی۔
 ”آپ نے ہی کسی قابل سمجھا ہوا ایمان بیگم تو ہم تو دنیا فتح کر لیتے۔ یہ سبے کار ہے۔“
 ”آپ کی مراد ہے۔“

”آپ اب جا میں اختر مایاں! اقبال کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ ”مجھے ابھی بہت سے کام نمائے ہیں۔ میں آپ کی ان عجیب و غریب باتوں کو قابل جواب نہیں سمجھتی۔“
 ”چھ۔“ ہم جا میں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے سیاسی نظروں سے دیکھا۔ اقبال کو لکھ بھر کے لیے بے حد خوف سا محسوس ہوا۔ اختر مایاں کا بیل ڈول کسی بھی نازک اندام عورت کو خوف میں مبتلا کر سکتا تھا۔
 ”رائف۔“ وہ ایک دہری بولی تھی۔ ”رائف آنے والا ہے۔“
 ”چھ۔“ وہ قدرے ناپوری سے بولے۔ ”پتہ نہیں ہم کتنے بڑے کیوں ہیں۔“ کسی کو ہماری کیس بھی موبو کی اجھی نہیں لگتی۔ آپ فصد نہ کریں ایمان بیگم! ہم تو یہ آپ کو ایک نظر دیکھنے چلے آئے تھے۔ اب ہم چلے ہیں۔“

”نہیں۔“ ضرور۔“ اس کی جان میں جان آئی۔
 ”آپ کی جانب بڑھے۔“ ایمان دروازہ پر نہ گئے تھے خیال سے ان کے پیچھے ہی چلے گیا۔ ایک روکر کر لے تھے۔ اقبال کے لبوں سے جھجکتے لکھتے رہے تھی۔
 ”آپ کی جانب بڑھے۔“ ایمان دروازہ پر نہ گئے تھے خیال سے ان کے پیچھے ہی چلے گیا۔ ایک روکر کر لے تھے۔ اقبال کے لبوں سے جھجکتے لکھتے رہے تھی۔
 ”نہیں۔“ وہ بھینکا گئی۔
 ”نہیں۔“ آپ کو کہنے۔
 ”خدا حافظ۔“ بھیا کھی کو سلام کہیے گا۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔
 ”چھ۔“ خدا حافظ۔“ وہ مایوس سے ہو کر باہر نکلے تھے۔

”یہ آپ کے لیے چائے بنا دوں۔“ رجبہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔
 ”نہیں۔“ وہ کسی نیل پر کھٹی مسینہ بیگم کے چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ رجبہ تیزی سے ان کے قریب پہنچی۔
 ”یہی۔“ اس نے کہا۔ ”کیا ہوا ہے؟“
 ”نہیں۔“ رجبہ سے پیٹ میں ایک گولہ سا پھرنا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے تکلیف سے نہ حال ہوتے ہوئے کہا۔
 ”بھوئی درد اٹھا ہے۔“ آپ کو۔“ رجبہ نے ان کے ہرف ہوتے ہوئے ہاتھ تھامے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ ہے

اپنے خوبصورت و مقبول ناول

300 * لاماشیل * عید واحد 180

300 * شہر دل کے دروازے * شادی پر 250

جادوں ناول ایک ساتھ منسجگاتے پر ناک خدج فوری

خوبصورت پروردق، خوبصورت چھاتی، مضبوط جلد، آفٹ پیپر

شائع ہو گئے ہیں

آج ہی فوری بکسٹال سے حاصل فرمائیں

37 راور بازار، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون 2216361

”ہست اچھی بیٹی ہو تم۔ خدا کا احسان ہے مجھ پر جو اس نے تمہیں یہاں نہر کے پاس بھیج دیا۔“
 ”میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں۔ کتنی اسی نے مجھے ماں بھائی نہیں۔ سب ہی کچھ دے دیا ہے۔“

منیزہ بیگم کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔
 ”تم سارا بھائی۔۔۔ کبھی تمہیں فون بھی نہیں کیا اس نے۔ کون سے ملک گیا ہے وہ؟“
 انہوں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔ یہ رعب کو تھوڑی دیر کے لیے کچھ بھیج نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔
 ”نہیں۔ ائی۔ جی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھیجے تب ہی فون کی بکلی بجنے لگی۔ منیزہ بیگم چونک اٹھیں۔
 ”دیکھو تو کس کا فون ہے۔ اور سنو۔ عمار یا فقیہ کا ہو تو میرے دروے کے متعلق کچھ مت کہنا۔ وہ اپنے کام پر دم چھو کر چلے آئیں گے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“
 ”جی اچھا۔“ رعبہ چار اشیائیں میں سرہلاتے ہوئے کمرے سے نکلی تھیں۔
 ”ہیلو۔۔۔ اس نے فون اٹھایا۔“

”ہیلو۔۔۔“ دوسری جانب پروردہ تھیں۔ ”رعبہ! کسی ہو تم؟“
 ”اے پروردہ تم۔۔۔ وہ خوش ہوئی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔۔۔ کچھ بگڑ چکی نہیں لگتا تمہارے۔“
 ”میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تمہاری باری ہے۔“ وہ بولی۔
 ”پہلے چادیں ضرور آؤں گی۔“ وہ خوش ہونے لگی۔ ”بولی ہوئی ہوئی بھی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“
 ”رعبہ! تمہارے اس دن یونہی کسی میں راز ہے۔ کس کا کیا تھا؟“
 ”ہاں! راز دے گئے تھے مجھے میرے پاس ہی ہیں۔“
 ”چھپ چھپاؤں۔۔۔ وہ بے فون نہیں بن رہی ہیں۔ تم مجھے۔۔۔“

”ہوں۔“ پروردہ جیسے چونکی تھیں۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ میں پچھلے مری کسی ایڈوکر والوں کی۔ اچھا خدا احافظ۔“
 اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا تھا۔ رعبہ کو بے حد حیران ہوئی۔ ”اس نے رعبہ پر کو حیرانی سے دیکھا اور کیریل پر کھڑا دیا۔“
 ”جیسے کچھ بڑھایا ہو اور گاؤں میں۔ وہی یاد آ گیا ہو گا۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

ہوا میں خنکی برہہ گئی تھی۔ گیلری میں کڑی شلا کو سرور سی محسوس ہوئی لیکن وہ پھر بھی کڑی رہی۔ باریک پنک باغ کھنکی کا بڑھتا ہوا احساس دبانے میں ناکام ہو رہی تھی لیکن شلا کو دیاں کھڑے ہو کر بے حد سکون محسوس ہوا تھا۔

رات کے دوسرے پہر کی گرمی خاموشی، ٹھنڈی ہوا اور ہر طرف بچھلا ہوا اندھیرا تاروں سے اپنے مساکل ڈسکس کر رہا ہے۔ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ صبح سے جلدی اب سہیل پوچھنا پھر بھی وہ سونا نہ چاہتی تھی۔
 اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلنے کی تھوڑی سی آواز ہوئی اور باہر سے نہاں ہر جانا۔
 ”شلا۔۔۔ اسے شلا کا ہولہ دکھائی دے رہا تھا۔
 ”جی۔۔۔ اس نے چند لمحوں بعد مڑے بغیر کہا۔
 ”تم یہاں آگئی کیا کر رہی ہو۔؟“ وہ بھی باہر ہی چلا آیا۔ ”اے رات گئے!“

”ہاں۔۔۔ جی۔۔۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ”غیر نہیں آ رہی تھی تو میں۔۔۔ کچھ دیر کے لیے یہاں آئی۔“ آواز ہوا۔ اچھی لگ رہی ہے۔

ہاتھ اس کے قریب آ کر کڑا ہو گیا تھا۔ شلا کے مخصوص ہڈیوں کی مدد سے اس نے سانس کھینچ کر اپنے اندر راز ہی پھر اس نے آگے سے اسے خود سے قریب کیا تھا۔
 ”غیر نہیں آئی تو کسی کے ساتھ مل کر بھی جاگ سکتے ہیں۔ تم جیٹہ اکیلے ہی جا گئے برا امراد کرتی ہو۔“
 اس کی آواز میں محبت نرمی اور بار بار بھلا دیا تھا۔ شلا کے لیے یہ جہد مانوس انداز تھا۔ اس نے ہاتھ کو ہینڈ نکالی نرمی اور محبت سے بھرا ہوا پایا تھا۔
 لیکن تھانے کیوں اس وقت دل تھانے مانگ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ کا ہاتھ بٹایا۔
 ”ہاتھ۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ دیر تمہارا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے امید ہے۔“ آپ سناؤ میں کریں گے۔
 ”ہاتھ۔۔۔ کچھ دیر خاموش رہا۔
 ”اگر۔۔۔“ پھر وہ بولا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔ شلا کا دل عجب خوات میں مبتلا ہوا۔ شاید اس نے ہاتھ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ وہیں کڑی چند لمحے پھر کھڑی حالت حال پر غور کرتی رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے واقعی ہاتھ کے زہم جہدوں کے ساتھ اچھا ہر بات نہیں کیا تھا۔ گنگے کا احساس بڑھا تو وہ مڑ کر اندر چلی آئی۔
 کایا کی۔۔۔ وہ کڑی تھی۔ ہاتھ بیڑ کی اس سناؤ بڑھایا ہوا تھا۔ جہاں شلا سونے لگی تھی۔ اس نے سناؤ نہیں کی۔
 راز کھینک نہ لے سکی۔
 شلا کو اندر آ کر ہاتھ کے کمرے میں راز بند کر دی۔ شلا۔۔۔ اس کی سے قریب جا بیٹھی۔
 ”ہاتھ۔۔۔ وہ سناؤ کی سے بولی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
 سناؤ کی۔۔۔ وہ دھیر دھیر تھی میں ہاتھ کی بے راز شفاف نگاہوں میں ابھی سی نمی تھی۔ شلا کا دل مزید دکھ گیا۔
 اس نے ہاتھ کے کانوں سے ہر کھڑا۔
 ”ہاتھ۔۔۔ آئی ایم ویری سوری۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں۔۔۔ میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔ لیکن ہر مرتبہ۔
 زیادتی کر جاتی ہوں۔“

ہاتھ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
 ”شلا۔۔۔ وہ عجیب انداز میں بولا تھا۔
 ”جی۔۔۔“
 ”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنی نہ مٹی کھول کر اس کے سامنے پھیلائی۔ شلا کا دل لمحہ بھر کے لیے دھڑکنے لگا۔
 ”یہ۔۔۔ تو کیا ہے؟“
 شلا خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ مائع حمل گولیاں وہ اپنی راز میں ہی رکھتی تھی۔

باتی اپنے ہاتھ سے کیل

اس کی جھکی ہوئی نظریں پھر اٹھ نہ پائی تھیں پھر بھی اس نے ہاشم کی نگاہوں سے برستی شکایت اور بے اعتباری کو محسوس کر لیا تھا۔

”شہلا! یہاں کی دیر خاموشی رو کر وہ بالآخر بولا۔ ”تم بے اثر ہو گئی۔“
شہلا نے ہنسی کے نظریں اٹھائیں۔ ہاشم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔
”فکرت کرو شہلا!“ وہ ایک بار پھر بولا۔ ”آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”ہاشم! نہ جانے کیوں اس کا دل جیسے رکا تھا۔
ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے رونے میں اس میں ایک اضطراب کی کیفیت چھپاں تھی۔
”ہاشم! شہلا نے اب تب ہو کر اسے یاد کیا۔

وہ کھٹکے کھٹکے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔
”ہاشم! میری بات سنیں۔ فارغاؤ بسک۔“ شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
ہاشم کا نہیں تھا وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ شہلا اضطراب سے بھرپور دروازے تک گئی پھر واپس

نہیں گئی۔ ہاشم اس وقت غم دھنے کی جس کیفیت میں تھا اسے نہ سمجھتا تھا نہ ہی اس وقت اس کی بات نہ دھنک سے سن سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے جا کر اسے گراوا دیتی کہ بے بس ہو کر بیڑہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اپنا چکر بامبو اسراس سے ڈھکیں گولیاں سے تھا۔ اس کا ہاتھ پر تیز زخمی ہوا۔

دوبارہ اس کے لیے وہ خود کو بے آسرا کھٹکے کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک انتظار کرتے ہی بے چینی کے لیے اس کا اضطراب کا مقابلہ کرنے کے بعد اس نے خود کو ٹوٹا ہوا کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں کھول کر کمرے کی کھڑکی پر

نکلا۔ وہ گولیاں پائی۔ کے ساتھ نکل کر اس کے دروازے پر کھڑا ہوا۔ اس نے کہا تھا تھا۔
کارٹ پر گری اس کی پیشی پر پڑی جو ہاشم بال بال پیچیدگی سے کھینچ رہا تھا۔
”فکرت کرو شہلا! آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اس کے الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ شہلا نے جھجک کر پیشی اٹھائی۔ کچھ دیر اسے دیکھ رہی، پھر اس نے وہ پیشی ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

وائٹ ٹریک سوٹ میں بیٹھ، تنہا اپنا چہرہ دے دے گھبراہٹ میں داخل ہوا تھا۔ اس سے گزرتے ہوئے وہ دیکھ کر کہہ دیا۔
تھما کر اور پھر اس کے لائے کا گتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔
نوا جو گریس وقت وہاں روم سے برآمد ہوا، بیڑہ بے نیازی سے پیشی ہوئی فریجہ کو دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ کا اور پھر جس۔“ اس نے سانس پھیل کر کی جانب اشارہ کیا۔
”بڑی تکلیف کی آپ نے۔“ اس نے شراراً اس کے کانوں پر تیلیہ ڈال دیا۔
”چھوٹی مٹی کی تکلیف تو آپ نے میں ہیں نا۔“ اس نے بھائی کو گھورتے ہوئے اٹھ کر تیلیہ جگہ پر ڈالا۔

”دیش فرائنٹ۔“ وہ پیشہ کر مڑے سے جس پینے لگا۔ ”آپ کو کام بڑا ہی کرنا چاہیے۔“
”جیسا کہ تو یہ فرماتے ہیں کہ ایک بے حد بڑا اور اہم کام کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟ اسی چاہتی ہیں“
جلد از جلد آپ کے فریضے سے سبکدوش ہوں گا۔“

اس نے بات ادھوری پھوڑی اور مسکرائی۔

”آپ۔“ کمری سوچ میں ڈوبا ہوا فراز چوٹکا۔ ”ناکہ کیا؟“

”ناکہ میری باری آئے۔“ اس نے پیشی دکھائی۔

”شرم کرو لڑکی!“ فراز نے مسکراہٹ روک کر اسے گھورا۔ ”بڑے بھائی کے سامنے ایسی باتیں۔ اور پھر مسکرا بھی رہی ہو؟“

”جیسے بڑے بھائی جب فٹیں کر کے پسند کی لڑکی دکھائے اس سے زیادہ فٹیں ساتھیں کر کے منگلی کر چائے۔
میں نے کون دن پر بلوانے کے لیے اس کمرے اور سوپ کی پیش کش کرے تب کچھ نہیں اور میں نے صرف امی کا پیغام صراحت سے پچھلایا تو بے شرمی کا ٹیبل فائٹ کر دیا تو بے پروائی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

”ویسے اصل بات آپ گول کر گئے۔ کہہ سکتے ہیں کہ شادی کے لیے کون سا مینڈ اور تارن خرچ کرنا ہے؟“
اس نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے بھائی کا چہرہ گور سے دیکھا۔
”ہاں؟“ وہ پھر چوٹکا۔ ”تم۔“ شخصی فائنٹ زیادہ فکرت کر۔ اس موضوع پر میں امی سے خود بات کر لوں

”کیا بات کریں گے؟“ وہ پھر پوچھا۔ ”اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہیں؟“
”اب تم جاؤ۔“ وہ ریموٹ سے ٹی وی پر کان کرتے ہوئے بولا۔
”سوچ لیں۔ اب میں فون پر ناغہ کر نہیں پاؤں۔“ وہ بے کھڑکی ہوئی۔

”فونٹ در۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ مطمئن تھا۔
”ہاشم! آپ کو ہوا کیا؟“
”ہاشم! اور مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے اور شادی کی بھی۔“ ناؤ۔ جلیس۔ لیوی الون۔“ اس کے پر سکون

”جیسا پھر ایسی بات کریں۔ میں جلی۔“
”جینکس۔“ وہ بڑبڑایا۔

چہرہ فونٹاتھوں کے پیالے میں کھینچ کر کمری سوچ میں گم پیشی تھی۔ ورنہ کمرے میں داخل ہوئی پھر چند لمحوں کے لیے کمرے کی کھڑکی پر

”آپ کو کچھ نہیں ہوئی ناغہ۔ بہت معصوم اور سادہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا اور مسکرائی اور کھنکھاری۔ تب وہ پوچھی۔

”اے آپ! بدل گئے آپ کے کپڑے؟“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔
”صرف میرے نہیں۔ آپ جناب کے کپڑے بھی وصل گئے ہیں۔“ ورنہ نے طنزاً کہا۔
”جب آپ کی شادی ہو جائے گی تب تو مجھے بھی دھونا پڑے گا کپڑے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیسے آپ سے پہلے راتہ آئی کی ڈیوٹی تھی۔“
”بالہ۔“ ورنہ نے فراغت سے ہنستے ہوئے پنڈلوں اٹھایا اور ہاتھوں پر تلنے لگی۔ ”ویسے محترم۔ ناغہ علی

خانہ۔ آپ کو نوید ہو کہ مجھے سے پہلے امی آپ کو سسرال پہنچنے کی فکر میں ہیں۔ سنا ہے پچھلے دنوں آپ کی ساس صاحبہ کا فون آیا تھا تو اس سلسلے میں امی کا عندیہ لینا چاہا رہی تھیں۔“

”ٹھیک ہے خالہ جانی۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔

”او اس ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”ممایاد آرہی ہیں؟“ ربیعہ نے آہستگی سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں یکایک ہی آنسو ابھرے، وہ انہیں پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ربیعہ کو اس چھوٹے سے معصوم بچے پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اسے سینے سے لگالیا۔

”عمرینہ“

”خالہ جانی! مجھے ممایاد نہیں آرہی۔“ وہ اس سے علیحدہ ہوا۔ ”میں اب ماما کو بالکل یاد نہیں کرتا۔ ماما مجھے چھوڑ کر ہاشم انگل کے گھر چلی گئیں۔ اب وہ مجھ سے روز ملتے بھی نہیں آئیں۔ حالانکہ انہوں نے مجھ سے پراسر کیا تھا۔“ ربیعہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”میں تو اب صرف پیہا کو یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا، وہ مجھے لینے آئیں گے۔ ابھی تو وہ اپنے ضروری کاموں سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”آپ کو ہم لوگ اچھے نہیں لگتے مگر؟“ آپ کی نانو کاٹھنہ خالہ عباد ماموں۔ ہم سب کتنا چاہتے ہیں آپ کو۔“

وہ اس کے بالوں کو سلاتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ ”میں بھی آپ سب سے بہت پیار کرتا ہوں اور۔۔۔ اور ماما بھی۔“

اس کی نانو ایک بار پھر اچھی تھیں۔

”پچھلے آپ ہم سب کو چھوڑ کر جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟“

”اس لیے خالہ جانی! کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ یہ گھر نانو کا ہے۔ میرا گھر وہ ہے جو میرے پیہا کا ہے۔“

ربیعہ نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”انتی سی عمر میں انتی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے بڑے ہو کر تم ضرور سائنس دان بنو گے یا کوئی بڑے فلسفی۔“ وہ لہجہ بڈل کر بات بھی بدلنے لگی۔

عمر پر اس کی بات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا، وہ پھر سے کچھ سوچنے لگا۔

”اچھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ سامنے پارک میں چلتے ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے نہیں گئی اور میرا خیال ہے کہ ابھی گھر میں بور ہو رہے ہو؟“ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں، میں تو بور نہیں ہو رہا۔ ویسے اگر آپ کو اسی کتے سے ڈر لگ رہا ہے تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“

ربیعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا تھا۔ کتا تو گویا باہر اسی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

”ہاں جی عمر۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے واقعی اکیلے جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تم پلیز میرے ساتھ چلو نا۔“

”چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اپنا بیٹن لے آؤں۔ وہاں میرے دوست کرکٹ کھیل رہے ہوں گے۔ میز پر ہی تھوڑا سا کھیل لوں گا۔“

”تھوڑا سا کیوں اتنا سارا کھینا۔“ ربیعہ نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلائے تھے۔



پارک میں واقعی عمر کے کئی ہم عمر بچے کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے انداز ہی بدل گئے۔ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی ساری خوشی اپنے چہرے اور مسکراہٹ سے چھلکا کر ان کی طرف لپک گیا تھا۔ ربیعہ مسکراتے ہوئے ایک بچہ پر جا بیٹھی۔

”بھولے“ وہ ستارہ انداز میں کہا گیا تھا۔ ربیعہ بے طرح چوکی۔

”اے آپ۔“ رافع کو دیکھ کر اس کے اندر کون سا جذبہ ابھرا تھا؟ وہ سمجھ نہ پائی یا شاید اس نے جان بوجھ کر اس جذبے سے نظر سچائی نہیں۔

”کئی دن کے بعد دیکھا۔“ اک شخص۔ ”وہ منہ ہی منہ میں نگلتا۔“

ربیعہ سمجھ کر بھی ہانسی سے مسکرائی۔ رافع کے وہ سری طرف بیٹھ گیا۔

”آپ تو بہت ذرا بڑوک نکلیں ربیعہ۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”اتنا ہی ترک کر دیا اس جاذبہ کے بعد۔“

”جی۔“ اس نے سر ہتھکایا۔ ”سمجھ دار لوگ حادثات سے بچ کر ملتے ہیں۔“

رافع چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے جسے ذرا متنی بات بھلا کر اصل معنی پر غور کیا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے ربیعہ؟“ چہرہ بولا۔ ”جو لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے جان بوجھ کر غلطی نہ کی جائے تو عقل مند ہی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بے سوچے سمجھے دل غلطی کی چیز ہے۔“

”جی؟“ اس نے حیران ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

”آپ۔“ دل کی غلطیوں پر نہیں رہتی ہیں ربیعہ؟“ رافع اسے اتنی گہری اور بھرپور نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ربیعہ چند لمحوں کے لیے حیران ہو کر رہ گیا۔ اس کی پلکیں سے اٹھنے والی اس کے رخساروں پر آگہی نہیں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ رافع اس چہرے کی دلکش سی گہرائی کے حیران کر فار ایک تک اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا۔“ کیا جواب دوں؟“ وہ خود اپنی آواز جانی محسوس ہوئی تھی۔

”ایک غلطی کی ہے۔“ رافع نے جانتا جانتا بول کر واجب العزیر ہوں یا بے اختیار قراردادے کو خلاف کر دیا جاؤں گا۔

”کہیں۔“ جو بھی آپ کہنا چاہیں۔“

ربیعہ دھڑکتے ہوئے غور کر رہی تھی۔

”بڑا یا سزا کا اختیار مجھے نہیں ہے رافع۔ غور کیجئے، جرم اگر ثابت ہو جائے تو کس کے گناہ گار ٹھہریں گے؟“

”آپ۔“ چہرہ گہرے آئینے میں بولی۔

رافع بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔

”دل۔“ اپنی پسند کا لٹرا چاہے تو؟“ یہ دھڑکے آواز دے کر بولا۔

”کہنے اور مصنفہ کی پسند کے تابع تو نہیں ہوتے نا۔“ وہ مسکرائی۔

رافع کو اس کی مسکراہٹ دیکھ کر سورج کی آخری کرن کی مانند لگی تھی۔

عمر نے رافع کو دہان بیٹھ دیکھ لیا تھا۔ وہ بیٹھ گھٹا ناؤ ڈالنا چلا آیا۔

”اتنا۔“ رافع انکل۔ السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔“ بیٹھے۔ ”رافع نے اسے چوما۔“

”اب آپ خالہ جانی سے شادی مت کر لیجئے گا۔“ اس نے منہ بنایا۔

ربیعہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی تھی جبکہ رافع بے حد حیران۔

”کیا۔“ کیا مطلب؟“ وہ اسی حیرانی سے بولا۔

”مطلب یہ کہ جب بھی میں اور میلا کر میں آتے تھے، ہمیں یہاں ہاشم انکل مل جاتے تھے پھر انہوں نے ماما سے شادی کر لی۔ اب خالہ جانی اتنی ہیں تو آپ ملتے ہیں؟“ ایسا نہ ہو کہ آپ بھی خالہ جانی سے شادی کر کے انہیں اپنے گھر لے جائیں۔

”عصہ۔“ ربیعہ ہر اک کڑی ہو گئی۔ ”تم بہت عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔ چلو گھر۔“

”نہیں۔“ ہماری قسمت۔“ رافع کی نگاہاٹھ ہر چند کہ بہت دھم تھی پھر بھی ربیعہ نے اسے بخوبی سنا تھا۔

اس نے جلدی سے اسے اپنے گھر لے کر دیا۔

”بیٹھے۔“ اب جو میرے ساتھ۔“ رافع نے عمر کو پار۔ ”اپنی ماما سے مل لو۔“

عمر کی ہاتھوں میں چمک اے اتنی تھی جیسے اندر سے جس جگہ پر چمک لخت نہ مر جھاسا گیا تھا۔

”میں انکل۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تو کل کے ٹیبلٹ کی پیاری بھی کہی ہے کہ آپ۔“

”اور کیا؟“

”اور ماما کی ساس بھینس نہیں ہیں۔“ اس نے نیازی سے کہہ کر ربیعہ کی انگلی تمام لی تھی۔ ربیعہ جزیر ہوئی۔

”رافع نے اسے نہیں برا تھا۔“

وہ آئینے کے سامنے کھڑا ناکی کی بات باندھ رہا تھا۔ شلالا اس کے پیچھے اکٹھی ہوئی ہاشم نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”ہاشم! میں۔“ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ۔“ شلالا کی زبان اٹکنے لگی۔

ہاشم کی نظر نے ایک ساعت کو اپنے گھر پر پڑا۔ وہ ہیرا شلالا کی باتوں میں پھنس رہی تھی۔

”ہاشم! جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ ہاشم غلط ہے۔ میں۔ میں۔ چاہتی ہوں کہ آپ میری بات سن لیں۔“

”شلالا! تم نے مجھے غلط فہمی میں ڈال دیا۔“ شلالا نے انکھوں میں آنسو بھریے۔

”دراصل ہاشم! میں صرف عمر کے لیے نگرانہ تھی۔ میں ایسا نہیں چاہتی ہاشم! کہ میں دوبارہ ماں نہ بنوں۔“

”میں ایسا نہیں چاہتی۔“

ہاشم آئینے کے سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے رکھے برقع کیس کو کھول کر وہ اپنی ناکل اور ضروری کاغذات اس میں رکھنے لگا۔ شلالا اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ہاشم! میں عمر کی شہیتہ کا نہیں چاہتی تھی اور بس۔ میں۔ میں سوچتی تھی کہ ایک بار عمر کو ایک گھر۔ ایک جائز مقام مل جائے تب۔ تب میں دوبارہ ماں بنوں۔ بصورت دیگر وہ بہت کا پیلنگڈ ہو جاتا۔ آپ۔ آپ سمجھ رہے ہیں یا میری بات۔“

”شلالا!۔“ وہ برقع کیس بند کرتے ہوئے بے حد غم لہجے میں بولا۔ ”میں نے آپ سے کسی بات کی وضاحت نہیں کی تھی۔ آپ کیوں خود کو بھان کر رہی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں ہاشم! آپ کے دل میں بدگمانی ہے۔“ وہ روبانسی سی ہوئی۔
 ”کنناہ دل میں ہو تو گناہ نہیں ہوتا۔“ وہ ہانٹھ کھڑا ہوا۔ ”عمل میں در آئے تب اس پر بات ہو سکتی ہے۔“
 اس نے یا ہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ شہلا اس کے پیچھے لپکی۔
 ”میں نے جو کچھ آپ سے کہا، آپ کو اس پر یقین نہیں ہے ہاشم؟“
 ہاشم ہنسر رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا اور دھیس سے مسکرایا۔

”یقین تو آپ نے میرا نہیں کیا شہلا! دکھ تو صرف اس بات کا ہے۔ اپنی دوسرے طے شدہ بات پر مزید کیا باز
 کی جائے؟ میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔“
 وہ باہر نکل گیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ ہاشم کا انداز مخاطب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ ”آپ۔۔۔“
 ”تم۔۔۔“ تنک کا فاصلہ اس نے خوش رنگ تمناؤں کے سہارے طے کیا تھا اور اب وہ واپس پلٹ رہا تھا۔
 ”میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔“
 شہلا کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ ہاشم اس سے بدگمان ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا نہ تھا لیکن اب
 ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ واقعی ایک طے شدہ بات تھی۔

”مماس۔۔۔“ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ”میں آسکتا ہوں۔“

رہبانہ بیٹھ گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں پر رکھا ہوا بانڈ بٹایا۔

”ہاں۔۔۔“ آؤ فراز۔ اندر آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی اس لیے نیند بھی نہیں آئی۔“ فراز نے تلے قدر
 اٹھاتا اندر آیا۔ ان کے قدم پر بٹھکانے والے فرش پر اس نے ناعصہ کی ماں سے
 شادی کی بات کی تھی کہ آیا وہ درود سے پکے ناعصہ کی رخصتی کر دیں گی یا پھر نہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے خوش
 ہے کہ وہ ایک لمحہ سمجھ دار خاتون ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ناعصہ کا ہاتھ ہمیں دے دیں گی۔ سب بھی ہم چاہیں
 تم سن رہے ہو نا؟
 فراز جو کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا ایک سخت چونکا۔

”جی۔۔۔ سن رہا ہوں۔“

”دراصل بیٹا! میری طبیعت تمہارے سامنے ہے۔ کبھی دن کی طرح بالکل تازہ اور روشن ہوتی ہے تو کبھی رات
 رات سی تاریک۔ مجھے خود اپنا اعتبار نہیں۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھ لوں۔ کیا باز
 ہے فراز! تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ میں اتنی اہم بات کر رہی ہوں اور تم وہ بیان ہی نہیں دے رہے ہو۔“
 ”نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب سن رہا ہوں لیکن بات یہ ہے امی کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا
 ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ یہ مت کہنا کہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کہو۔“ وہ سائیڈ میز
 سے اپنا چشمہ اٹھا کر نرم کپڑے سے صاف کرنے لگیں۔

فراز نے ایک نظر اپنی بہت عجیب محبت کرنے والی لیکن قدرے سخت گیر ماں کو دیکھا۔ اپنی اولاد میں سب
 زیادہ وہ اسے چاہتی تھیں لیکن ان سے بات کرتے ہوئے ایک حد فاضل قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ البتہ
 فرحیہ سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے اس چیز سے مستثنیٰ تھی۔ وہ ان کی لاڈلی تھی اور ان سے ہر بات شیر کر
 کرتی تھی۔

”ای۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا۔ میری منگنی آپ رخسانہ آئی کی بیٹی فرحین سے کرنا چاہتی تھیں؟“
 ”اب اس بات کا یہاں کیا ذکر؟“ انہوں نے اسے گھورا۔
 ”فراز قدرے بڑل ہوا۔

”دوسرا اصل۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ کی خواہش پوری کروں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ تیراں ہو گئی۔ ”میں کچھ سمجھتی نہیں؟ کھل کر کہو؟“
 ”ہی! میں ناعمہ سے شادی نہیں کروں گا۔“ بلاخرہ وہ مضبوط لہجے سے بولا۔

رخسانہ بیگم چند لمحوں کے لیے کھٹکے میں رہ گئی تھی۔
 ”فراز! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ ان کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی تھی۔
 ”میں ٹھیک کر رہا ہوں۔ آپ میری شادی جلد کرنا چاہتی ہیں مگر میں لیکن ناعمہ سے نہیں فرحین سے۔“
 ”رخسانہ بیگم چند لمحے اسے غور سے دیکھتی رہیں پھر ان کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر ایک زوردار چوم لیا۔
 ”میرا بڑا پوری زندگی میں انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کسی اولاد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ فراز! یہ کتنا شکر دہریا۔“
 ”ہی! اسے یقین نہ آیا۔

”تم مجھے کسی کی غریب سبکی عزت کو مذاق سمجھتے ہو۔ چاروں کا کھیل کھیلے تمہارے لیے؟ کسی کے گھر کی خوشیاں
 تم ہی بدل گئی کے لیے؟“ اس سوال کو دیکھ کر فراز نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نہیں شوق کروں۔“
 ”فرحین شوق مہماں! وہ اچھے کڑا ہوا۔“ لیکن اسے امر فرمایا۔ ”میں ناعمہ سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ لڑکی اس
 قابل نہیں ہے جو الزام آپ سے مجھ پر لگایا ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں اس لڑکی پر عائد کر رہا ہوں۔ کسی کی خوشیاں
 اس کے لیے محض چاروں کا کھیل اور دل کی جیتی ہیں۔“
 ”میں یہ مٹائی تو دونوں کا کہ اسے کھیل اور دل کی کا بجائے مطلب ہے۔“ فرحین نے اسے دیکھا۔
 ”میرا بڑا پوری زندگی میں انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کسی اولاد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ فراز! یہ کتنا شکر دہریا۔“
 ”ہی! اسے یقین نہ آیا۔

”سنو فراز! وہ بولیں۔“ اس سارے معاملے کے پیچھے کیا کائنات پوشیدہ ہے؟ میں نہیں جانتی مجھے جانے میں
 دلچسپی بھی نہیں ہے۔ تمہارا ناعمہ سے کس طرح تعارف ہوا؟ بات اٹھا کر تک پہنچی مجھے علم نہیں ہے لیکن اب
 میں یہ جانتی ہوں کہ یہ معاملہ دو افراد کا نہیں دو خاندانوں کا ہے۔ افسوس کہ تم نے ایک کمرہ محل کے لیے اپنے
 خاندان کی عزت داؤ پر لگانا چاہی لیکن بیٹا تمہاری ماں ابھی مری نہیں زندہ ہے۔ میں نہیں اس کا کوئی قدم نہیں
 اٹھانے والی۔ کیسے مجھ لیا تم نے کہ جس طرح تمہاری خدمت کے آگے مجبور ہو کر ہم منگنی کر لیں گے؟ اسی ضد
 کے آگے کھٹکتے ہوئے اسے تو فرحین دس گے ہمیں دو لڑکی جیسی بھی ہے اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا
 اس کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے وہ تمہاری ہونے والی ہو۔ سمجھتے تہ۔“

”آپ جذباتی ہو رہی ہیں مہماں! وہ فرمایا۔
 ”جذبات کا دھارا! سچ سمجھ میں رہتا ہو تو جذباتی ہونے میں حرج نہیں۔“
 ”آپ۔۔۔ آپ سو پارہا نکھو نا چاہتی ہیں۔“ وہ چراغ بولنے لگا۔
 ”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی۔ ناعمہ ہر صورت تمہاری دلہن بن کر اس گھر میں آئے گی۔ اس گھر سے لو
 تمہاری طرح عمدہ لکھن اور دے زبان نہیں ہیں۔ سمجھتے تہ۔ منگنی زبان ہے عمدہ۔“
 فراز بیٹھتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”ایقان! امیری بیٹی ایک دل خود کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تجھے اپنے بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔“ حقیقہ حیات
 نے اسی اور کاجات سے بولیں۔

ایقان کی آنکھیں شدت غصیل سے سرخ ہونے لگیں۔ اس نے بھلا لب داخوں تلے دیا۔
 ”دیکھو! ترس کھاؤں اپنے بچوں پر؟ خدا خواستہ سرک پر تو مجھے ہونے پڑے! اپنی ماں کے گھر میں ہیں۔ یہ حصہ
 ایماں نے میرے نام لیا تھا۔“
 ”اسی باؤلی عورت! کم عقل! بچوں کو باپ کا سامنے چاہیے۔ اسلام اور قانون اسی لیے متا کو فراموش کر کے پھر
 باپ کے حوالے کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ کل کو اگر اس کے داغ میں کوئی نور آجائے
 خدا خواستہ! اپنے بچے پیچھن لے دے۔“ کیا کرے گی؟ اپنے ابا ماں کا حصہ لے کر بیٹھی رہ جانا۔ بھلا یہ دو کمروں
 کی چھت بھی مانتا غور کرنے کے لائق ہے۔

”ایقان! وہ جھلک سی پڑی۔“ کیا کہہ رہی ہیں آپ! میں بھلا کیا غور کروں گی جس عورت کا شوہر اس کا ماں
 اٹھا کر اصرار ہے؟ یہ تو ایک راد چلی رو سوچنے کے ہیں آپ اگر مجھ سے یہ چاہتی ہیں کہ میں اس کے پیر پڑوں
 اسے ماماؤں بلاؤں اور ایک باؤلی پر شری سے اس کے ساتھ چل دوں تو یہ ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اتنی
 عزت نفس میرے اندر ہے ابھی۔“

حقیقہ حیات نے آسف سے اسے دیکھا۔
 ”جھولی کا کو عزت نفس کا نام مت دیا۔ ایقان! یہ شیطان کا برکاد ہے جس میں اگر اپنا گھر اپنے ہاتھوں پر باد
 کرنے پر تلی ہوئی ہو تو ہمارے غلط انسانوں سے جھولی ہے نا۔ اس نے بھی مانا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی۔
 ”میں نے غلطی نہیں کی۔“
 ”مجھے اچھا لگا۔“ ایقان نے اسے دیکھا۔ ”اس کی خامیاں بھی آپ کو دیدہ زیب محسوس ہوتی
 ہیں۔ خوبیاں نظر آتی ہیں۔“
 ”ارے بی۔“ مجھ کو صرف تیرا نظر آتا ہے۔“ آبدیدہ ہو گئیں۔ ”اس سے میرا کیا رشتہ کیا نا تا سارے
 رشتہ تیرے حوالے سے ہیں۔ میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں۔“

”مجھے چاہتی ہیں ماں تو خدا کا راز! مجھے بخور نہ کریں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چروچھپا کر سرک پڑی۔ ”میں
 پاگل ہو جاؤں گی مجھے میرے جان چرچو ڈوڑیں۔“
 ”حقیقہ حیات نے اسے دیکھا۔“ اسے دیکھتی رہیں۔
 ”تیرا کم عمری جان لے لے گا ایقان! وہ دانتے ہوئے بولیں۔ ”نہیک ہے بی! ماں میرا تلے گی تو تجھے علم ہو گا کہ
 ماں جاپوں کی محبت اور مروت کتنے دل کی۔“
 ”ایقان کے رونے میں شدت آگئی۔
 ”میں کب کسی سے بدگمانی ہوئی ماں!“

”ہاں تو اس بچے کے دل میں کیسی ہے اس لیے جس دن اس نے ہاتھ کھینچ لیا اس دن ہاتھ بھی پھیلانا پڑ جائے
 گا۔ اتنی سی باتیں نہیں سمجھتی؟ ارے جس کی کمائی کھار ہی ہے اس کی چار خطاؤں سے نظر گرا لے تو کون سی
 قیامت آجائے گی؟“

”اسے بچوں کی گفتار اس کی ذمہ داری ہے۔“ وہ رونا بھول کر زور سے بولی۔ ”کوئی احسان نہیں کر رہا ہے مجھ
 پر۔ پھر مجھے اپنے بچوں کے لیے نہیں بھی بیچے گا تو ہم بھوکوں نہیں مرے گے۔ پڑھی لکھی ہوں تو کوری
 کر کے پانا اور اپنے بچوں کا یہ سہا لگتی ہوں۔“

”وہی مرغی ایک ٹانگ۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”اس وقت سے ڈر جب وقت سمجھانے پر اتر آئے۔ ابھی تو ماں بد نصیب ہی سمجھا رہی ہے۔“

”چھوڑیں آپ۔ میرے حال پر چھوڑیں مجھے۔“ اس نے گالوں پر اتری نمی صاف کی۔
 ”یہ بتائیں چائے بناؤں آپ کے لیے۔ کتنے دن کے بعد آپ کو میرا خیال آیا ہے۔ آپ تو مجھے ماں کم اور ساس زیادہ لگتی ہیں۔“

”میں نہیں جیتی چائے۔“ انہوں نے خفگی سے سر جھٹکا۔ ”ماں کی منتار تو شک مت کر شوہر پر تو جو کیا سوکیا۔“
 ایقان نیم دلی سے مسکرائی۔ اسی لمحے فون کی بیل بجی۔ ایقان کا دل دھڑکا۔ یہ وقت تو عاشر کے فون کا تھا۔ مومن کے اسکول سے آ جانے کے بعد وہ بھی کبھار فون پر اس سے اور ایمان سے بات کرتا تھا۔ مومن نماز با تھا ورنہ بیل سن کر دوڑا بھاگتا چلا آتا تھا۔ ایقان شخص سی بیٹھی رہی۔

”فون کیوں نہیں اٹھاتیں؟“ حقیقہ حیات نے ناگوار ی سے پوچھا۔
 ایقان نے سانس بھری۔ بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا۔
 ”ہیلو۔“ اس نے اپنے دل کی دھڑکن اپنی سانسوں میں محسوس کی۔
 ”ہیلو۔“ دوسری جانب عاشر ہی تھا ”عاشر بات کر رہا ہوں۔“

”ہوں۔ مومن نماز رہا ہے۔“ وہ حقیقہ حیات پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی کہ فون کس کا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”مجھے سسے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ایقان کی پتیلیاں جھلنے لگیں۔ دل کی حالت اسے بتا رہی تھی کہ اس شخص سے کیسے کیسے باتے تھے اس کی پکلیں نم ہو چکیں۔
 ”کچھ دیر بعد کر لیتا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

نجانے کیا بات تھی حقیقہ حیات کے سامنے بات نہ کرنا ہی بہتر تھا۔
 ”ہوں، ٹھیک ہے۔“ وہ جیسے سمجھ گیا۔
 لائن ڈس کنکٹ ہوئی تو ایقان نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔ وہ مڑ کر واپس آئی تو اسے احساس ہوا کہ حقیقہ حیات پوری طرح جو کئی سمجھیں۔

”کس کا فون تھا؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”مومن کے دوست کا۔“ وہ بستر کی چادر ٹھک کرتے ہوئے اپنے تاثرات چھپانے لگی۔
 ”اچھا۔“ وہ مایوس ہو کر کچھ سوچ میں ڈوب گئیں۔ ”عاشر میاں! کبھی فون تو کرتے ہوں گے؟“
 ”جی؟“ ایقان چونکی۔ ”ہاں کرتے ہیں، کبھی کبھار۔“

”اچھا۔“ انہیں جیسے خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ ”کیا کہتے ہیں؟“
 ”کیا بتا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”مومن اور ایمان سے ہی بات ہوتی ہے۔“
 ”کبھی تم سے بات نہیں کی؟“
 ”نہیں۔“ وہ بے رخی سے بولی۔
 حقیقہ حیات مایوس ہوئی تھیں۔



منیزہ بیگم کو دوائی دے کر وہ کمرے سے نکلی تھی تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا اور چند لمحوں بعد ہی ڈور بیل

”تمہیں دیکھنا ہی بڑی خوشی ہے بچے! ماں باپ کی نظر تو اپنے بچوں کو صرف دیکھنے سے ہی راضی رہتی ہے۔ کو“ کیا بات ہے؟“

”راغب نے ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لئے۔
”دادی جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ خوشی کی خبر یہ ہے کہ میری نوکری پکی ہو گئی۔ اپائنٹ منٹ لٹرلے آیا ہوں۔“

”اے والدہ مبارک ہو بہت بہت۔“ ان کی سازی خوشی ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔
”تمہارے باب کا بھی بوجھ ہلکا ہوا۔ بڑے بیٹے کے روزگار سے لگنے کی تو خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیگ پکواؤں گی۔ کیسی نوکری ہے؟“
”نوکری بہت اچھی ہے اماں۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس سہینی میں پہلے بھی ایک مرتبہ ٹرائی کر چکا ہوں تب کا میاں نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“
”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک اوا سے جھلک رہی ہے۔“ وہ ہنس۔ ”ماں کو بتایا؟“
”امی شاید پیچھو کی طرف لگی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔
”راغبہ کی طرف؟“

”جی۔ شاید۔“ اسے جیسے دادی کی گود میں نیند آنے لگی تھی۔
”چھارہ رافع باپت سنو۔ یہ تمہارا ورہ سے شادی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟“ بھاری ماں کچھ فکر مند ہو رہی تھی۔

انہوں نے بنا کسی پیش لفظ کے اچانک ہی اصل بات کا امتحان کیا تھا۔ رافع اس اچانک حملے پر چونک اٹھا۔
”آپ کیسے کھول کر کہہ رہی ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماض ہو کر پوچھنے لگا۔
”امی! انکے دہندہ کیوں ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماض ہو کر پوچھنے لگا۔
”اے بیٹے! سچے ماؤں کے دل تو یوں بھی بہت وہمی ہو جایا کرتے ہیں۔ خصوصاً بیٹوں کے معاملے میں۔ ذرا ذرا سی باتوں سے اندازہ لگایا کرتی ہیں۔ تم سے اس کی کیا بات ہوئی۔ یہ تو میں جانتی نہیں۔ تاہم وہ فکر مند ضرور ہے۔ شاید تم نے ایسا کچھ کہا جو“
وہ بات مکمل کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رافع نے اپنے تاثرات چھپانا دشوار ہونے لگا۔

”نہو لو بیٹے! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو مجھ سے کہو اپنی پریشانی؟“
”نہیں دادی!“ وہ مدھم سا گویا ہوا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی کرنے کو بہت کچھ ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، جلدی کس بات کی ہے؟“
”بڑے لڑکے ہو۔ جب باب بنو گے تو یاد کرنا ان دونوں کو۔ ماں باپ کو کیسی آرزو ہوتی ہے ان لمحوں کو دیکھنے کی۔ بہر حال تمہاری بات رکھ کر تم کو کچھ مہلت دے دیں گے ہم لیکن ہمیں اتنا اطمینان تو دلا دو تاکہ ورہ سے شادی کرنے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

راغب نے ایک گہری سانس بھری۔ ایک نظر بوڑھی دادی کی جانب دیکھا پھر لب چباتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا۔
”اگر میں آپ سے کہوں دادی! پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

”نہ جانے کیوں میرا دل اور دماغ کسی بھی بات پر متفق نہیں ہو رہے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس وقت زندگی سے کیا چاہ رہا ہوں اور زندگی مجھ سے کیا چاہ رہی ہے؟ شاید یہ دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں اور میں اس چیز سے ذہنرب بھی ہوں اور خوف زدہ بھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں میں کسی سے بھی انصاف کر سکوں گا۔ اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فی الوقت میں شادی جیسی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا۔“

اس نے سر اٹھا کر خفیہ حیات کی جانب دیکھا جو نظروں میں بے تحاشا تشویش اور الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی وہندی بخور وحی آنکھوں میں بہت گہرائی تھی۔ رافع زیادہ دیر ان سے نگاہیں نہ ملا سکا۔

”رافع!“ انہوں نے کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ”میرے بچے تو نے اس وقت میرے دل کا سب چین سارا قرار مجھ سے چھین لیا ہے۔ دیکھ بیٹا! دادی کو کچھ بتادے کیا تجھے کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے؟“

رافع خاموش بیٹھا رہا۔ چین اور قرار کی بات کر کے جب وہ یہ بات پوچھ رہی تھیں تو وہ کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔

”رافع!“ ان کی آواز بھیک گئی۔ ”میری بیٹی رابعہ بہت ظرف والی بڑے مہروانی بچی ہے، زندگی کی کھٹھنایوں کا اس نے بہت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ خدا نے اسے تین بیٹیوں سے نوازا اس نے بہت خوش دل کر کے اپنی پھول سی بچیوں کی پرورش کی۔ اب وہ زندگی کی نعمت سے محروم رہی لیکن کبھی کوئی حسرت کوئی شکوہ اس کے لبوں پر نہ آیا۔ شوہر کی بچہ بوڑھا تھا اس سے چھوٹی۔ ہا۔۔۔ آہ! اس خدا کی بھڑکی نے بہت جلد خود پر اور حالات پر قابو ہانے کی اپنی پھل گئی کی۔ ایتقان پر تو اس کے حوصلے اور مہر کا سایہ تک نہیں پرانا تھا۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تیرا بیٹا اتنا اچھا ہے تو تم جو بچہ بچوں ہو۔ ذہن کے بجائے زیادہ تر دل سے سوچتے ہو گے۔ یہی تمہاری عمر کا تقاضا ہے۔ لیکن میرے بچے۔ جو بھی فیصلہ کرو، اپنی مہروانی پھل گئی کے مہر اور حوصلے کو مت آزمانا اور پھر وردہ بہت پیاری بچی ہے۔ بات تم لڑکیوں سے ہی ہوتی ہے۔ اس میں کبھی وہی ظفر نہ آتا ہے۔ میرے لیے اس عورت میں یہ دو خوبیاں جرم ہو رہی ہیں۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی بات نہ سنی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی“ رافع چونکا پھر اس نے ایک گہری سانس بھری۔ ”سن رہا ہوں دادی! سب سن رہا ہوں سب سمجھ رہی ہیں یہ ہوں۔ آپ کی بات سمجھتی ہیں؟ ان میں سے کوئی بات ایسی بھی ہے جو میرے علم میں نہ ہو؟“

”ب۔۔۔ فکر کر رہے۔“ میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے کسی کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس مجھے وقت درکار ہے دادی! زندگی اور زندگی کے مطالبات کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے۔ خود کو سمجھانے کے لیے وقت چاہیے۔“

”رافع!“ خفیہ حیات نے اچانک ہی سر کوئی کی۔ ”وہ کون ہے؟“

”کون؟“ وہ حیران ہوا۔

”وہی لڑکی جسے تو شاید چاہنے لگا ہے۔“

”اوہ!“ وہ ایک لحظ ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بہت۔۔۔ خوبصورت ہے کیا؟“

”کم آن دادی جان۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔ پھر اس نے جھک کر ان کا سر جو م لیا۔ ”کہہ رہا ہوں نا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بدگمانیوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔“

”بیٹا! اپنی وردہ بھی بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم نے تو کبھی اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ کب سے تمہاری سنگت ہے وہ۔ لڑکیوں کو اے رشتوں والوں سے بہت توقعات وابستہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بہت نازک جذبے ہوتے ہیں ان کے۔ ان باتوں کا کبھی خیال نہیں کیا تم نے۔“

”یا اللہ۔۔۔“ رافع بے حد گھبرا گیا۔ ”میں چلوں دادی۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

ٹھکانا... چائے پو... فریش ہوں۔ لیکن میری باتوں کو ذہن میں دہرا ضرور لینا۔"
مختہ رائدہ خیال محسوس کرتا ہوا وہاں سے نکلا۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

جاتی ہیں بھابھی جان! امی کے مشورے سے زیادہ میں آپ کے مشورے کو صائب جانتی ہوں۔ آپ لیبرے نزدیک سست امیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے فراز کی امی کا فون آتے ہی میں نے آپ کو کھلا بھیجا۔
یہ کیا رائے ہے آپ کی؟

نہج نے ایک نظر قدرے خاموش اور سنجیدہ نظر آتی عذرا بیگم کو دیکھا۔

دور آپ کا خند بھانج کا کم اور بہنوں والا معاملہ زیادہ ہے۔ اس لیے اپنی رائے دینے میں کوئی تردد نہ کریں جیسی بھی آپ کی آسانی ہو ہم ویسا ہی کر لیں گے۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ ثانیہ اور رافع کے تفرار ہو جائیں میں دردہ اور تاجہ کے فرض سے سبکدوش ہوں۔ کسی آسانی ہو جائے گی ہماری۔
میں عذرا بیگم کے لیے چائے بناتی ہوئی دردہ کے ہاتھ سٹ ہو گئے تھے۔ وہ بے دلی سے چائے کی پیالیاں

نے لگ گئیں۔
تم بالکل درست ہو رہا ہے۔ تم ہادی بابہ ہو سکتے ہو۔ میں کوئی شک شبہ نہیں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ
جیسے سے برا ہے اور دردہ تاجہ سے بڑی ہے۔ پہلا حق بھی ان دونوں کا ہی بننا ہے۔ لیکن۔۔۔ وہ قدرے

نہج نے کیا بھابھی جان؟ آپ کھل کر کیسے اگر کوئی پریشانی ہے تو ہم مل کر اس کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔
یہ ہے کہ رافع۔ رافع ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ نظر میں جھکا کر آسکتی سے ہوں بولی تھیں جیسے
! اقرار کر رہی ہو؟ رافع ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ نظر میں جھکا کر آسکتی سے ہوں بولی تھیں جیسے
رابعہ بیگم دھک سے رہائش۔۔۔ لیکن۔۔۔ اسے یا انتراض ہے بھابھی جان؟ ان کے لچر ہم وگمان
تہ کہ اس چچا ملے میں رافع کی جانب سے بھی کوئی گریز ہو سکتا ہے۔

نہج نے رابعہ بیگم کو اس بات کو۔ دراصل وہ اپنے گہرے اپنے مستقبل کے چھانٹنے سے کہتا ہے یہ
جاتی ہو آج کل کے لڑکے ایک جست میں ہی آسان چھو لینا چاہتے ہیں۔
یہ شادی، پاؤں کی زنجیر سمجھتا ہے؟ دردہ تو خود دردہ ہی مگر دوشن، نیالے لڑکی ہے۔ وہ تو اناس کی مدد کرے
یہ بات ہے۔

یہ بابر چہ رافع سے بات کروں گی۔ تم خاطر جمع رکھو۔ عذرا بیگم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے

نہج نے چائے لے کر اٹھی تو، دونوں ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ دردہ نے بسکٹ ان کے سامنے کیے تو
نہج نے ایک بسکٹ اٹھالیا۔ پھر کوئی خیال آنے پر انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

نہج نے رابعہ بیگم سے کہا کہ کب سے یا کر رہی ہے تمہیں۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک
بھی ممانہ ہے۔ پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں۔ جی۔۔۔

نہج نے رابعہ بیگم سے کہا کہ کب سے یا کر رہی ہے تمہیں۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک
بھی ممانہ ہے۔ پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں۔ جی۔۔۔

نہج نے رابعہ بیگم سے کہا کہ کب سے یا کر رہی ہے تمہیں۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک
بھی ممانہ ہے۔ پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں۔ جی۔۔۔

نہج نے رابعہ بیگم سے کہا کہ کب سے یا کر رہی ہے تمہیں۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک
بھی ممانہ ہے۔ پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں۔ جی۔۔۔

اور اگر مسلمان ماس تاراج بھی کر گیا پھر؟ سو سے اس کی بھڑکی ہوئی اور اس کا انداز شراوت سے بڑھ گیا۔
 زور سے جھپٹنے کی گئی۔ راہِ نیکم اور غمراہ نیکم میں دی گئیں۔

مذہب جیسے غمزدی سے متسلل رہی تھی۔ کل سے یہ اس نے چینی اور بے کلی کا تکار تھی۔ ماشر کے فون نے سے بہت فیس کر دیا تھا شفیق حیات کی موبائی کے باعث وہ اس سے بات نہ کر پائی تھی۔ اس نے دوبار فون کیا کہ غمزدی اسکے اس کی بہت رفاقت کرنے لگی تھی۔ لیکن اس نے فون کا کاروبار نکل دیا تھا اور اب سے اب تک سودہ ایک ماشر کا فون لینے کی گیسٹ سے شکار تھی۔ ماشر نے اسے کیوں فون کیا تھا۔ وہ آخر کار کسی ضروری بات کا چاہتا تھا۔

شاہی حسا زندگی کے انتخاب میں دوڑتے دوڑتے جھک گیا تھا۔ شاید جھکا جاتا تھا۔ اس بار کا اقرار کرنا چاہتا تھا۔ اب راجن اس کی بار کا ترانہ سننے کی بجائے خود سن سے سنتی تھی۔ اس نے ہلکا ہلکا کیسے جانب دیکھا تھا۔ سمن کے اسکول سے آئے بکریوت ہو گیا تھا۔ سمن کی بدولت تھا۔ سمن کا چرخہ بھونک رہا تھا۔ ایتن نے سمن کی طرف سے عکس کی تیز ہوئی محسوس کی اور تپ سی نکل ہوئی تھی۔ وہ ابجلی کی پڑی پھر تیری سے تپتی تھی۔ وہ فون تکتی تھی۔

نیلے! "اس دھاس میں شرم معلوم ہو رہا تھا۔"

نیلے! ماحشر بات کر رہا ہوں۔ اس کے اندام میں بے حد سنجیدگی تھی۔

"بابو! یہ کیا بات ہے؟" یقیناً اس نے سنیے میں زمانے پھر کی بے رخی سمجھ کر کہا۔ اس کی بارگاہ کے اعتراف کے

موجودہ جو کہ بہت سے نیاز اور بے پرواہیات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے انہی رانا ناچاں میں بھی کچھ کچھ کھڑکی کی صورت

میں کچھ کچھ غلام اور طالب نہیں ہوتی جتنا کہ اس کا تعلق وہاں سے تھا۔ اس کی ساری زندگی وہاں سے تھی اور اس کی ہر

جس شخص سے آپ نہیں۔ مستقبل اور خبر شیوں کے لیے کبھی کبھی کارآمد ہو سکتی ہے۔ جتنا چاہتا ہے۔"

"نیلے! آپ ایک بے حد شہزادی بات کرنا چاہتا ہو گا۔" وہ قدرت رکھتا تھا۔

"نیلے! میں بروی ہوں۔"

"یقین سے کیا۔" یقین سانس روک دیم بخونے لگی۔
 "یقین میں سے شادی کر رہا ہے۔" "ہاں، خیر کئے گا۔"
 "یا؟" اس سے سخت مشابہت توڑا لگی تھی۔
 ایک لمبے لمبے کی کھچوں۔ سامنے اندھا سا چٹا اسی اس نے فوری طور پر دلوں کا سہارا لیا ہوتا۔
 شاید وہ جی جاتی۔ وہ جیاب خاموشی تھی۔ شاید وہ اس کے جوابی رد عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ بھی جھٹکا
 سا تھا۔ یقیناً وہ نہ جھٹکا کر رہی تھی۔

”یہاں، ۱۹۴۱ء“ چوڑا چھوڑا ”اس“ نے میں طنز کیا۔
 ”چتر گون“ میں ہمارے خداداد رستے جہن تھے ایک ”منطقی“ نتیجہ ہے سو، کو شہاب اش و اقبال کی نگاہ۔“
 ایسا نہ۔ سب سات نکالوں سے دو بار کو محو رہی تھیں۔
 ”زندگی کی رشار“ اور ”انوں میں“ کی جیل میں تھے۔۔۔ میں ”ہماری“ بہت دسات سلام کرتا ہوں، تاہم میرے
 لیے سب چیز بہت مشکل تھیں۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک سال بھی کی ایک سال کی ضرورت تھی۔ اسی لیے

۲۰۰۷ م. ۲۶۶ (۲۰۰۷ م. ۲۶۶)

میں نے کہا کہ اب تم اس پر عمل دو تمہاری بات سنا کر میں نے ہنسنا شروع کیا۔

نہایت ہی عاشرانہ مجھے نفرت ہے تم سے۔ تمہارے ساتھ مجھے ہر شے سے۔ میں تیار سا ہوں تا
 جتنے کھانا میں چاہتی
 مجھے ملائی جانتے۔ ابھی اسی وقت
 یہودیوں کے لئے اپنے گھروں کی مانند بیچ رہی تھی۔ عاشرانہ کی دیر خاموش رہا۔ اس کے چہرہ میں غم تھا۔

”ہماری حالت، حیاتیات اور جلد بازی ہی تھیں اس موڑ پر لاکھ، لاکھ سے اتنے، لیکن ہر حال میں اتنے اہل فکرمقتل نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر ہی اپنے کرتا ہوں۔“ عیسٰی طلاق دینے میں بیٹھے عار میں۔ ”آمر میں اتنا کہہ کر اگلے ہی لمحے ہی کڑی آواز مت کر رہا ہے۔“ اچھی طرح سوچ بیٹھے۔ ”اچھے بچے تو اس طرح سوچتے ہیں۔“ وہ نہ ہلکا نہ سوجھ بوجھ سے بولے۔ ”بچے بھی نہیں، بھٹے طلاق ایسی ہی دلت سے جبراً۔“

فرشتے سے دو دیوایا ہو رہی تھی۔ ان کا ہاتھ نہیں پھل رہا تھا کہ رسیو میں ہاتھ ڈال کر دس یا ستر بان پکڑ لے۔ اسے دو بانہ اور مارا۔ اس کا چہرہ لوہا نہان ہو گیا۔

”سوچ لو! اچھا! اچھی طرح سوچ لو۔ میں چند ہی بجے فون کروں گا۔“ دوسری جانب اس نے لائن دس بج کر گزری تھی۔

[illegible]

دہاکن کے تمام تہسپوں، ہولی تہسپوں اس کے ایک جانب منبوزہ یکم بھی تھیں اور دوسری طرف اینفدہ تھیں۔ قدروے کے قریب عبادہ عظیم ہوا تھا۔ رہے۔ ایک ایسی تہسپ میں عمر کا سامان رکھو رہی تھی۔ وہاں سب کی حالت سے دیکھنا ڈاڈا کا بال کا قریب کرنا پھرنا تھا اس کے آج خاص طور پر یہاں اس میں تھا اور اپنی حرکات کی مانند سے بہت پرشوش اور خوش نظر آ رہا تھا۔ شملکا کی خاموشی ظہور سے بار بار اس کی طواف کرتی تھیں بیڑا اس کے اندر سے ایک تہسپ نکلتی تھی۔

”تم اب سے سٹو کے ریکی کرو؟“ زبیر نے قدرے آدھ روی سے پوچھا۔ ”ایا انیس مین چیمو نہا۔“
 ”سباں آیا کرو گے تھکلا کر تان سے۔“
 ”تھک ج۔“ اس نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ ”وئے بجے ایانے پراس کیا ہے کہ دو نیمے بست سے نواز
 میں گئے کھلی سارے انڈوں نے لے کر بھیج رکھے ہیں۔“

”آپ کو بتا ہے جہاں میرا روم سیٹ کروایا ہے۔ اسٹاٹ اپمیا کرتا اچھا۔ بیبا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے“

کاسب سے خواہش کرتا: میرے لیے سیٹ گروایا ہے۔ مہا آپ کبھی آئیں گی، مجھ سے ملنے؟ میں آپ کو اپنی چیزیں دکھاؤں گا۔ پلینز مہا۔ آپ آئیں گی؟“ شملہ کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر اس کے بالوں میں گم ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر شملہ کا چہرہ دیکھا۔

”مہا پلینز۔ آپ روز میں ست۔ میں کبھی فیل کرنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ میری وجہ سے رورہی ہیں۔ دیکھیں نا۔ آپ کبھی تو باشم انکل کے ساتھ گئی تھیں۔ میں تو نہیں رویا۔ آپ سے پراس جو کیا تھا میں۔ اب میں جابا ہوں تو آپ کیوں رورہی ہیں۔“

”مہا نے اپنے ہاتھ سے شملہ کا چہرہ صاف کیا۔ شملہ سک پڑی۔ اس نے عمر کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ منیوڈ یہ سب دل سادینے والے انداز میں اس کے شانے پر بازو پھیلا دیا تھا۔

بچے کو خوش خوشی سے شملہ کی غیر کے نہیں اپنے باپ کے ساتھ جابا ہے۔ دل مضبوط رکھو مینا پھر اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں محسوس نہیں ہونے دے گا کہ عمر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ روز عمر کو بھیجے گا۔ ہم روز اس سے ملیں گے۔ اسے پیار کریں۔ اگر دماغ سے سوچو تو یہی ٹھیک ہے۔ عمر کو باپ کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ تاہم کی ضرورت ہے۔“

”نہیں سوچ سکتی دماغ سے۔“ اس کے ہوں نے سرگوشی کی۔ ”نہیں سوچ سکتی۔ محبت کے پاس صرف دل ہوتا ہے ائی۔ دماغ تو اسے ملا ہی نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا لپچھا ہے۔“ مہا برا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں عمر کے بغیر نہیں جی سکتی۔“

”مہا۔“ اس نے ہلکے انداز سے رو بولنا ہو گیا۔ ”آپ ایسے بی بیونہ کریں پلینز۔ ورنہ میں بھی روؤں گا۔ مجھے آپ کے آنسوؤں سے رونا رہا ہے۔ مہا۔ آئی لو۔“

اس نے شملہ کو پیار کیا۔ شملہ نے اسے دو ہاتھوں سے لپٹ لیا تھا۔ عجب منظر تھا۔ سب ہی کی پلکیں نم تھیں اور دل آزدہ تھے۔

”ہر بار ہی مجھ پر ہوا۔ سب۔“ چوٹ کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ عبادت تھکے تھکے قدموں سے باہر کی جانب بڑھ کر چھوڑ دیا۔ اندر آیا تھا۔

”امی۔“ وہ منیوڈ سے مخاطب ہوا۔ ”ابرا صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ چائے وغیرہ بھیج دیں۔“

”یہ جلدی میں ہیں۔ فوراً بھیجا جا رہے ہیں۔ بہر حال میں انہیں چائے کے لیے لے آؤں گے۔“ آپ بھی مل لیں اوس۔ اوس۔ عمر کو بھی مل لیں۔“

”مہر کو چند محسوس نہ شروالی خوشی شملہ کے آنسوؤں کے کھول چکی تھی۔ وہ خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔ شملہ نے اس کی صحت دیکھی۔“

”عمر۔“ وہ لاشی میں بولی۔ ”تمہارے پیارے آگئے ہیں۔“

”مہا۔“ وہ رو بولنا سا ہوا۔ ”آپ بھی چلیں تا میرے ساتھ۔ پیار کہہ رہے تھے اگر آپ جاہیں تو۔“

”نہ۔“ انہی جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”ڈونٹ ٹانک سینس۔ مہا کو تنگ نہ کرو جانو۔ وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔ چلا ہم تمہارے پیار سے ملے ہیں۔ کم آن۔“ شملہ نے لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ انہی قہر نری سے اسے چھڑانے کی کوشش کی۔

”انہی قہر میں سر جاہیں لی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”آئی۔ پلینز۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”مجھنے کی کوشش کریں۔“

”انہی قہر میں سر جاہیں لی۔“ وہ پھر سسکی۔ ”اس سے جا کر کو، مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔“ پلینز۔

بنا کا دین نہیں ہے خلاؤں میں ٹھیک رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے نگاہ سزاوارتہ پیش کر دی۔
خود کھینچ لگا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے، کسی گہری سوچ میں نہ کرتے منظر دیکھ رہا تھا۔
"میں اب اس کے بارے میں انکلیاں پھیر کر انہیں بکھرا رہا۔"

نیا کی جان۔ مسکراتے نہیں کیا بات ہے؟
"میں مسکرائی ہوں۔ میں مت اداس ہوں۔ مجھے ماما کے آنسو یاد آ رہے ہیں۔"
"نہیں یہ بات ہے۔" وہ بھی قدرے سنجیدہ ہوا۔ "ڈوڈو وی ہائی سن! افرات فرات کو۔ تمہارے ہاتھ اتنے ظالم ہیں کہ ایک بیٹے کو اس کی ماں سے جدا کر دیں۔"

"دیکھیں ماما اتنا رو کیوں رہی تھیں۔" وہ اداسی سے پوچھنے لگا۔ "نہیں میرا آپ کے ساتھ آتا پسند کیوں نہیں کیا۔" حلالہ کو وہ بھی تجھے بھڑکھا شرم انگل کے ساتھ چلی گئی تھیں۔
"میرا بے گہری ہوا نہیں تھی۔"
"اس بیٹا تمہاری ماما کی بہت بات مجبور ہو کر مٹی تھیں ان کے ساتھ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"
"کچھ۔ خوشیاں مت جلد ماما کے گھر کو واپس لوٹنا ہوں گی۔"
"کچھ یہاں۔" وہ ابجھا۔ "ایک بے اطمینان ذوقیہ ہے جسے اس نے بڑے گھر میں اکیلا کیے رہوں گا؟"

"کیسے کیوں رہو گے یہاں تو ہیں تمہارے ساتھ۔"
"جس بے گہری نہیں ہوں گے کچھ بچہ؟"
"بچہ؟" دودھ سے مسکرایا۔ "ماما تو ہیں گی نا۔"
"نہیں۔" وہ بڑے گھر میں آکر رہے گا۔

"میرا خیال ہے یہ اہل جان کہ میں سیدھے سیدھا چلا جاؤں ان کے ابا جان کے سر و گردن اب اپنے سپوت سے
اپنے کے سر مال والے آئینے ہاتھ سے لے کر آؤں گا۔ میں اب بھی کس کس کو دیکھوں۔ کس کس سے بچوں؟
اگر وہ چھٹی ہیں۔ میں کس سے بچوں؟ وہاں رہا کروں گا۔ ماما کی ماس مسلسل فون کر رہی ہے۔ رہا رہو مجھ
عزرا دیکھ تھکت چھٹا ہوا ہوں۔" اسی ابھی خفیہ حیات نے انہیں رافع سے ہونے والی گفتگو کے متعلق

"نفس نہ کرو ہو! جوان بیٹوں کے معاملات ایسے ہی بہ حسن و خوبی بنائے ہوتے ہیں۔ انتہے پر خشک ادا بے بغیر
اور بھرے جا رہا کیا کہ رہا ہے۔ کیوں غصہ کر رہی ہو۔" اسی نے سنی، "اگلے سال سنی۔ میں خود رہا رہے بات
لے ماما کو رخصت کرے۔ وہ یہاں کا معاملہ ہے اسے نہ منائے، تم تو سب اس کے اپنے ہیں۔ گئے کی تو صرف
"اسکان انا۔" سلو تو چاہتے ہیں کہ ایک بیٹی جائے تو ایک ہو آجائے ان کی خواہش ہے یہ اور صحیح کہتے ہیں
خراچا کس کی کم ہو گا اور پھر مائیت ہے اور اگر سنبھلا ہو ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت پریشان ہو جاؤں گی۔
کی ضرورت تھی بھی ہے ناں کام، سخت آف ہو رہا تھا۔ رافع کی گفتگو کے متعلق جان کر۔

بہت سیدھے۔ سیدھے۔ سنی و شش روزہ فاسٹ کنفرم ہو تو مجھے اطلاع کرنا اور بیجا جان سے یہ اب؟
"میں ہیں۔ اگر؟"
"اچھا۔" اس نے نرمی ماس بھری۔ "چلو یہ راسدہ! بچے نا۔ اوکے شریار پھر بات کریں۔"
"میں نے فون نہ کیا۔ پھر نہ سہجے۔ بہت چائے کا پ اٹھا۔"

ڈوڈو دم میں گہری غماز، وہی چھانی، وہی قہقہہ ایسا گہرا تھا جیسے دباؤ پر کوئی بھی نہیں ہے۔ حلالہ کو اس
دست نی فرما دیا۔ منور ہوئے۔
"رہا تو ہو رہی ہے لیکن وہ لے کر رہا ہے۔ کیا بات ہے؟" حلالہ نے پوچھا۔
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"یہ۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"

"اس پر سنی ہیں وہ نہیں کم کی شام کھلی ہو۔" حلالہ نے پوچھا۔
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"

میں نے فون نہ کیا۔ پھر نہ سہجے۔ بہت چائے کا پ اٹھا۔
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"
"نہیں۔" لیا تھا۔ "میری کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔"

"شکلا! تم سب کچھ ہو اس کے لیے ایڈوکیٹوری ڈیل۔ میں کیا چاہتا ہوں۔" وہ الفاظ وہ مسکراہٹ وہ طلسم
کرد۔

”ایسا ہی ہے تو عرشہ کو لے آؤ۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔
 ”ہائیں۔“ غذرا بیگم حیران گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہوا ہے کہ برا بیٹا کیمرے بنانا چاہتا ہے اور چھوٹا بچہ ابھی نوکری پر بھی نہیں لگا اس کی شادی کر دوں؟ پھر رابعہ کیا سوچیں گی؟“
 ”تمہیں رابعہ کی فکر کیوں ہے، سو؟ رابعہ میری بیٹی ہے، میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ کچھ نہیں سوچے گی۔ دراصل یہ مشورہ میں نے اس لیے دیا ہے کہ فردوس بیگم عرشہ کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کچھ بیمار ہوتی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا علاج جلد از جلد شادی ہے۔ نافع نوکری پر نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم خدا نخواستہ بھوکوں نہیں مرے۔“

”عرشہ؟“ غذرا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔
 ”بہتہ نہیں۔“ پھر وہ دنا سے بولیں۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ جب صحیح ہے نہیں تو کیا خاک لگے گا اور آپ اماں؟ آپ رافع کی بے جا حمایت کر رہی ہیں۔ میں جلدیوں سے کہوں گی کہ وہ خود رافع سے بات کریں۔ بعض معاملات گھر کے آدمیوں کے بس میں ہی ہوتے ہیں۔ وہی نمٹا لیں۔“
 ”تم بے فکر رہو، بس اب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری مانو تو نافع سے بات کرو۔ فردوس نے کھلوایا نہ، ہوتا تو میں زبان نہ کھولتی۔ ایسا کرنے میں حرج کیا رہتا ہے؟ بلاشبہ اہل عرشہ کی سہیلیاں ہیں بچپن سے اچھا ہے تینوں ساتھ رہنے کی رخصت ہوں خیر ہے۔“
 ”اور بے چاری فردوس؟“ وہ شکایت سے بولیں۔
 ”اللہ مانتا ہے۔ اگلے برس سی۔“
 ”تپ اماں بالکل نہیں سمجھ رہیں۔ بالکل رافع کی طرح۔“ غذرا بیگم ان سے بالکل مایوس ہو گئیں۔

UrduPhoto.com

وہ سخت غصے کی کیفیت کا شکار تھا۔ کسی بھڑے ہوئے سیر کی مانند کمرے میں ٹپ رہا تھا۔ فریجہ کمرے میں داخل ہوئی وہ اس کے اندر اذیت کر کر دے سہم سی گئی۔

”کیا بات ہے؟“ ماما نے توری ڈال کر اس نے بے درخی سے پوچھا۔
 ”فران بھائی۔ مجھ سے کیوں ابھی طرح بات کر رہے ہیں۔“ ڈور وہاں ہی ہو کر رہی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“
 ”تم خرابی۔ سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔ وہ ہمارا بیٹا ہے، جس سے فریجہ۔“ وہ بس کا چہرہ دیکھ کر قدرے نرم پڑا۔
 ”امی آن تک ہماری ہر بات کو سمجھتی آتی ہیں۔ ہماری بات مانتی آتی ہیں پھر زندگی کے اتنے اہم فیصلے کے متعلق ان کا رویہ اس طرح کا کیوں ہے؟“

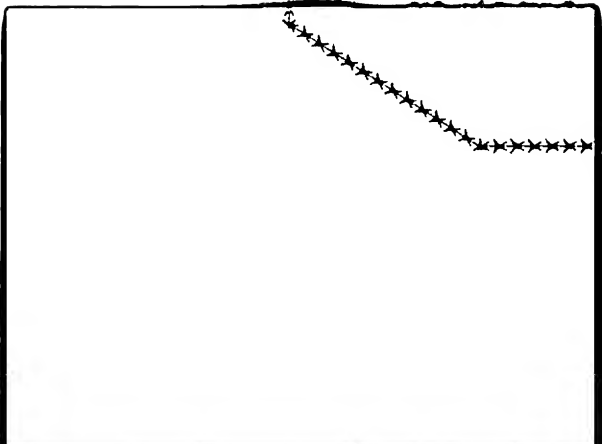
”تپ بے شک خفا ہوں بھائی جان، لیکن برحق اور جائز بات یہی ہے کہ اس معاملے میں سراسر قصور آپ کا ہے جو پتہ نہ پکڑ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ آپ خود ہی سوچیں کہاں کا انصاف ہے یہ؟“
 ”فریجہ۔ فریجہ۔“ ہم نہیں جانتیں۔“ وہ اس کے دونوں بازو تھام کر بولا۔ ”وہ لڑکی فراڈ ہے، چیتو ہے۔ یہ سب ہے۔ میں اس کا مقصد، ماما، سمجھ لا بھلا چہرہ دیکھ کر اس کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ فرسٹ ٹائم میں نے ہی اپنی کیا۔ تھا اسے لیکن اس نے میری پذیرائی کی۔ میری محبت کو خوش آمدید کہا۔ وہ کتنوں مجھ سے لون پر باتیں کرتی تھی۔ بار بار میری محبت کا اظہار کیا اس نے اور۔ اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے شادی کا ہش بندہ ہوں تو۔ وہ یہ نفرت پیچھے مٹ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا پیچھے ڈری۔ میرے فون ریسو کرنا، چھوڑ دیا۔ پھر اپنا۔ ہی تبدیل کیا۔ میں۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ دیوانہ، لیا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر میں وہ نمبر

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے
اپنے دل سے کہا کہ میں نے

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے
اپنے دل سے کہا کہ میں نے

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے

Urdu Photo



میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے
اپنے دل سے کہا کہ میں نے

"وہ رہتے باہر تھے۔" وہ سنا۔
 "ہاں، ہمیشہ اسی کی۔"
 "اب ہاشم کا تعلق ہندی ہے۔ وہ پورے ہندوؤں سے ہیں۔"
 "ہندوؤں کو یہ فرقہ وارانہ ہے۔ یہ بتا۔ میں سب کچھ کام ہے۔"
 "میں جانتی ہوں۔"
 "اور وہ اس کا کیا ہے؟"

"یہ ہے۔ اب میں یہ کہہ دوں۔ یہ سب سے پہلے ہے۔"
 "نہیں۔ اے رابع، تو سن۔ اب میں کہنے کی ہیں تو تم دونوں میں سے کسی سے کہو؟"
 "اب ہاشم ہرگز نہیں جانتا۔ شہرت سے ہوا تھا۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ کر ڈھکڑو ہوا تھا۔"
 "نیل میری طرف کیسب تک ڈھکڑاؤ لے دیں پھر کہنا۔"
 "تکسار کی طرف جاؤ۔ وہ سب ہیں۔ اے رابع۔"
 "دوسرے ہاشم توں تک۔"

دونوں نے پھر تیسرے رابع سے سراخہ کر دی تھی۔ کہ جتنے کے اور ان پر منڈلاتے "خوش نما پرندے" ان کی
 "انہیں دل، مصلیٰ، عامہ، ملی، تھی۔"

"ہاشم یہ ایک مشورہ دیتا تھا۔ وہ اس لیے کہہ دی ہے۔ تجھے۔"
 "اب۔" اس نے سر ہلایا۔ "خود کو مشورہ، لیکن اسے معاملات میں مشورے صرف لئے جاتے ہیں۔ دل
 میں اپنی کرد آتا ہے۔"
 "اب نے چونک کر اسے دیکھا۔"
 "خیر، تجھے۔"

"ظاہر اس سچے سے خیر، خیر، راہیں لیکن رابع یا وہاں ہل سکتے ہیں۔ کہ بخت کو نکال کر باہر
 "نہیں۔"

"یہ کیا اشارہ ہے؟" ان نے اب پوچھا۔
 "نہیں۔" وہ "تو یہ ہے۔" وہ "نہیں ایک خیال تھا۔ پیش کر دیا۔"
 "ہاشم۔" رابع نے دہرایا۔ "اب اس کے صرف ایک احساس تھا۔ پھر وہ اس کا وقت و موقع دیا۔"
 "خیال بنا جو حقیقت۔ وہ اب حقیقت نے شدت اختیار کر لی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے ہاشم اس حقیقت سے غرا
 "لیکن میں نے تو اسے سنا تھا۔ کیا کروں؟ اس کی اس ایک رت ہے۔ اسے پاتے گت پاتے گت پاتے گت۔"
 "اس نے میری سانس۔" وہ اپنا سر پیچ کر ہٹ گیا۔

"وہ میری جانب سے میں مانی کی شادی کے ساتھ میری بیوی اور دونوں کی شادی کی بھی بات چہرہ تھی۔ اب انی جانتی
 "کہ وہ دونوں فراموشی کے ساتھ اورا کہیے جا رہے۔ یہ پتہ پاس انکار کے لیے کوئی نہیں ہے۔ ہاشم میں گھر
 "اول کا دل تو ابھی نہیں چاہتا۔ میں۔ میں وہاں تو ابھی نہیں چاہتا۔ بتاؤ کیا کروں؟"

"بول۔" اس نے سر ہلایا۔ "چلو کی باتیں ہے، تو کرو۔"
 "ہاشم۔" وہ غصے سے بدگیا۔ "بلی نہیں۔"

پھر اس نے سیرا دل چاہ رہا ہے رابع ایسی خوب ہنوں مذاق کروں۔ ہندوؤں کی حرکت نہیں۔ میں ہنستا
 "اب اسے چرائی سے دیکھنے لگا۔ اسے ہاشم کی دماغی حالت پر شک گذرا۔"
 "اب اسے تو رول رائٹ۔"

"پھر اس نے جب سے سرگرمی نکال کر سلگائی۔" ہوں "اب بات کرتے ہیں۔ اچھا تو یہ معاف
 "پھر رابع ان تمام باتوں سے بڑے بھی ایک بات ہے اور وہ یہ کہ ریدہ کیا چاہتی ہے۔"
 "رابع کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر سوئے گا تھا۔"
 "میرا خیال ہے ہاشم اور وہ۔ وہ میری پسند کرتی ہے مجھے۔"

"صرف خیال؟"
 "اب اسے ہرگز اور فریڈ کی موت تو کبھی آتی نہیں۔ خیال ہی پیش کر سکتا ہوں۔"
 "اگر ایسا ہے تو ریدہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ بھی کبھی سمجھ کر وار لڑی ہے۔ اسے وقتی طور پر دھوکا ضرور لگے گا
 "لیکن پھر پھر وہ ہی سہیل بابہ کی لیکن پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ریدہ کیا چاہتی ہے۔ کیا وہ تمہارا ساتھی
 "دینے پر آمادہ ہے۔"

"وہ ریدہ کی بہترین سہیلی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ آسانی سے اس بات پر رضامند ہوگی۔"
 "بول۔" ہاشم سوچنے لگا تھا۔ "پھر اس کا ایک اور سہیلی ہے۔"
 "وہ کیا؟" رابع نے اسے دیکھا۔

"تم ڈائریکٹ دونوں سے بات کرو۔ یہ سہیلی اس کے ہیکس کرو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔" رابع اسے ہر طرح
 "کے طور پر لگا تھا۔"

"ہاشم یا ریدہ یا رابع یا ریدہ کی ضرورت نہیں تھی لگتا ہے کہ تو کچھ اور کرنا چاہتے ہو۔ اب یہ کسی
 "بانی کر رہا ہے تو۔ لیکن میں دونوں سے پوچھوں کہ وہ کیا کہتی ہے؟ آیا اسے سیرا اپنی سہیلی سے اظہار محبت پسند
 "نہیں کیا؟ اور وہ خوشی میں شادی کی اجازت دے گی؟ ہاشم؟" ہاشم کان کھانے لگا۔

"اچھا۔" تو پھر پہلے ریدہ سے اظہار محبت کر دے۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔ کمال ہے لیکن کسی سے شروعات
 "کرنا ہی ہوگی۔ دونوں سے نہیں تو ریدہ سے اور کیا عمل کر سکتا ہے؟ بھلا؟"
 "تم کبھی شہلا بھائی کی باتیں نہیں کرتے۔" رابع نے دم سا بولا تھا۔

"اب کیا کلام ہے؟" شہلا نے کہا۔ "ہاشم؟"
 "نہیں۔" وہ میری ٹھیک ٹھیک مدد کر سکتی ہیں۔ ریدہ کیا چاہتی ہے کیا نہیں۔ شہلا بھائی اس کے دل کا۔
 "اب اس کے بتا سکتی ہیں مجھے۔"

"اب اس کے دل میں سوچا۔" اور شہلا کیا چاہتی ہے مجھے کون بتائے گا۔"
 "کیا سوچنے لگے؟" رابع نے اسے شہلا کا پتا تھا۔

پانی پینے کے لیے

باشم چونکہ انھما اس نے برسوں چاہا اور میں رانج کا چہرہ دکھا۔

"تم رینج نہ لےنا، اخبار پچھانا چاہیے ہو؟ شملہ کی مدد سے؟"

"میں۔۔۔" رانج نے کسی میں شملہ بھائی سے، میں شملہ بھائی سے؟ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ رینج سے باہر نہ

دیکھیں کہ اس کے میں کیا ہے کیا دیکھتے تھے، میں صرف میری خام خیالی ہے، اگر۔۔۔

اسنے دل میں وہی جذبات دھرتی ہے، جو کہ میرے دل میں ہیں، تب تو بات نہ بن سکتی ہے۔ میں۔۔۔

معاذے کر، گھر والوں سے بات کر سکتا ہوں لیکن اگر رینج۔۔۔ رینج ایسا بالکل نہیں چاہتی۔ اگر وہ اس۔۔۔

بات تک کرنا نہیں چاہتی تب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں خاموشی سے۔۔۔

"وہ سنے شاید ریلوں گا۔" باشم نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج زور سے بولا۔ "میں باشم۔۔۔" رینج میں ایسا کر سکتی تھی۔ بار بار وہ انہی لڑو

ہے، کہیں اس کے ساتھ نا انصافی نہ ہو، لے لیا لی، نہ وہ۔ میں۔۔۔ میں ساری زندگی اس کی آنکھوں میں کسی ایسا

نظر میں تنازعہ کوں میں۔ میں شاید خاموشی سے کہیں چلا جاؤں گا۔ مزید پر حال کی کیا چیز ہوگی؟

پے۔۔۔

"بالکل پروا ہے۔" باشم جراتور دیا۔ "انہی جذباتی ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔" کچھ دھڑکتے بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ جس دور سے پہلے میں چاہتا تھا، اس میں بری طرح اچھا

ہوں۔ بہت چاہتا تھا، یہ چاہتا ہوں، انہی چاہتا چاہتا ہوں۔ بار بار۔۔۔

باشم افسوس سے سر ہلاتا تھا، اسے نہ لگتا تھا کہ یہ یاد آگیا تھا۔

"اگر رانج دیکھ کہیں کا تو مجھے ایسا لگے گا۔۔۔" میں نے جیسے جیسے اسے

تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے رانج کے دل کا سکون انسان کی ہے۔

بس اپنی بات سے بے بسلا رہے ہیں۔ یہ محبت۔ بلکہ انسانی محبت۔ اس کے دل میں جلد ہی وہ محبت بہت

ہوئی ہے، اس کے فریضے سے بھر کر ان میں جاتا ہے، اس کے چاہا میں فرق آتا ہے، تنہا لوگ کیل جاتا ہے

چھوٹے، اگر تو تنہا پہلے پر رات کو تھی۔ تب یہ چاہتا ہے کہ کچھ دھڑکتے دھڑکتے تنہا لوگ سر ہاتھ۔۔۔

بے بسلا ہو گیا۔

رانج سب کچھ دیکھ کر باشم کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ باشم نے اس کے منہ میں

پے لیا، اس پر وہ چلا جا رہا تھا۔

"وہ۔۔۔" اور رانج اپنا ہے، صراحتاً بنیادی وصف کیا ہے؟ پاس۔ پاس ہے صراحتاً بنیادی

تو۔ تو میں رانج۔۔۔ تنہا کلا تمام ہے پاس۔ چاہے وہ آسان ہو کر یا کوس و ترچہ میں کر کے لگتا ہے،

آئے چاہے انسان میں کچھ بھی ہو جائے، پاس۔ پاس ہی پاس مقدور ہے۔ تو یہاں۔۔۔

اس نے رانج کے منہ میں ہاتھ رکھا۔

"تمنا۔۔۔" کہہ کر اس نے پاس سے۔ یہ محبت میں گرفت ہو رہی ہے۔ خوشی کے منت سے معنی سمجھا

ہے، بے سکتی کے ذرا دے دیتی ہے لیکن اتنا اس کا پاس۔ جو زندگی خود سے دے رہی ہے خوشی خوشی۔

خلف مزے میں رہے گا۔

"باشم۔" رانج نے اسے ہنسنے لگا، یہ یاد رانج دیکھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے میرے لڑا؟" رانج نے نرمی سے پوچھا۔ "تو مجھے بہت مزہ لگ رہا ہے۔ اپنی پرالم ہوتو ہوا

مجھ سے شیر کر رہا تھا۔"

میں کیا تھا۔ ریٹائی کی کوئی بات نہیں ہے۔

"پہلو میری ہی ہوگا۔" رانج مسکرایا۔

"میں چلوں۔" باشم نے ہنسنے لگا۔

رانج بھی اس کی تھلے میں اٹھا۔

"تو پھر مجھے یہ یاد کہ میں شملہ سے رینج کے دل کی بات معلوم کرنے کے لیے کہوں گا۔ اگر وہ بھی یہی چاہتی ہے

میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں نے یہ بات تو نہیں کہا۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"لیکن میں ایسا ہی کہہ رہا ہوں، یہ کچھ نہیں چاہتا ہوں۔" باشم نے انگڑائی لینے ہوئے نام سے انداز میں کہا

نہ ہر نہ کہ یہ ایک خاص بات تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

میں کیا تھا۔ ریٹائی کی کوئی بات نہیں ہے۔

"پہلو میری ہی ہوگا۔" رانج مسکرایا۔

"میں چلوں۔" باشم نے ہنسنے لگا۔

رانج بھی اس کی تھلے میں اٹھا۔

"تو پھر مجھے یہ یاد کہ میں شملہ سے رینج کے دل کی بات معلوم کرنے کے لیے کہوں گا۔ اگر وہ بھی یہی چاہتی ہے

میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں نے یہ بات تو نہیں کہا۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"لیکن میں ایسا ہی کہہ رہا ہوں، یہ کچھ نہیں چاہتا ہوں۔" باشم نے انگڑائی لینے ہوئے نام سے انداز میں کہا

نہ ہر نہ کہ یہ ایک خاص بات تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

"میں۔۔۔" رانج نے ہنسنے لگا۔

ماہنامہ شمع (246) اپریل 2007

دروہ اسے قدموں لرہے میں اُلی چمال وہ کمائیں بھرائے یہی تھی۔
 "ناعمد! میں اور امی ایقان خالہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ تم روٹیاں،
 قیہ میں نے پکا لیا ہے سو م پر رکھا ہے۔ چو لہا یا دے بند کر دیتا۔"
 "جی اچھا۔ آپ جائیں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔
 "میں میں ہر ادھیان بھی ڈال دیتا۔"
 "ٹھیک ہے۔"

دروہ نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی پھر ہار نکل گئی۔ ناعمد دروازہ بند کرنے کے خیال سے ہند لہ۔
 اٹھی تھی۔

دروہ بند کر کے وہ کمرے کی طرف آ رہی تھی جب فون کی بیل بجی۔ اس کا دل دھڑکا تھا۔ آج کل ہر بیل
 کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ خواہ دروازے کی ہو یا فون کی۔ فون تک آکر وہ مزید پریشان ہوئی۔ سی ایل آئی تھا۔
 کہ فون کس کا تھا۔ ناعمد چند لمحے کھڑی ہاتھ ملتی رہی لیکن بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اس
 آگے بڑھ کر ریسور اٹھایا۔
 "ہیلو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"فرا ز بات کر رہا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔
 "جی جی کیسے۔"

"میں نے وہ جواب بننے کے لیے فون کیا ہے جو آپ ادھا رہا تھا۔" وہ تیزی سے بولا۔
 "آج آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ نے میرے ساتھ چیٹنگ کیوں کی تھی۔ کیا آپ نے پیش نظر مجھے
 یہ وقفہ بنانا مقصد کیا؟ یا پھر آپ کے لیے دو وقت فوننگ کے لیے؟ یا پھر آپ ایک سی ایل آئی میں مختلف نمبر
 بات کرتی ہیں۔" سی ایل آئی نے سوال کا جواب نہ دیا۔
 جواب کیونکہ آپ کے جواب پر میری زندگی کے بے حد اہم فیصلے کا ارادہ رہا ہے۔"
 ناعمد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس قدر مشکل صورت حال کا تو اس نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ باہر
 بنانا کار و شوار تھا۔

"میں نے کہا تھا۔" مجبوری کی وجہ سے وہ کہہ رہی تھی۔
 "وہی مجبوری جانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ مجھے ایسی کیا مجبوری تھی تمہارے ساتھ کہ تم مجھے تسلی کے دو لفظ تک
 کہہ سکیں۔ تمہارے گھر سے وہ نمبر ختم کر دیا گیا۔ تم نے وہ سرائی نمبر لے لیا پھر بھی پلٹ کر کبھی مجھے فون نہیں کیا۔
 بولو کیوں؟ جواب دو؟"

"میں نے نہیں بتا سکتی۔" وہ رو بانسی سی ہو گئی۔
 "تمہارے اس جواب سے میں کوئی بھی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں اور ٹانٹنی ٹانٹن پر سنٹ سنٹ جیسے دھوکا
 ثابت کرتے ہیں۔ وہ نمبر لڑکی۔" وہ غرایا۔
 ناعمد نے بے بسی سے سانس بھری۔
 "نہیں، بخیر انہیں میں نے نہیں دھوکا نہیں کیا۔"

"محبت کی تھی مجھ سے؟ جیسی میں نے کی؟"
 "ہاں۔" وہ ٹانٹنی سے بولی۔ "کی تھی لیکن۔ لیکن جیسی آپ نے کی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر۔"
 اس کے ذہن میں عرشہ کی متورم آنکھیں تھیں، مگر لب احتجاج تھا جو سوائے لبوں کے رو میں رو نہیں۔

”تمہیں پتہ نہ رہی تھی جاؤں میں آج کل؟“

”بندہ دہلی کی چٹیاں ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

رائے نے ہنر کی سوال نہ کیا تھا اور دودھ باقی تھی کہ اب اس کے پاس کرے کے لیے کوئی اور سوال نہ تھا۔



نہانے کسی احساس کے تحت کسی کی آنکھ کھلی تھی اس نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس کے کمرے کے سینے میں اسے جو کمرہ تھا اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ابراہان اپنے بیڑ پر سے ہاتھ اٹائی کمرہ بیڑ وکھ سکا تھا۔

اس نے دیکھا کمرہ اپنے بیڑ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تکیہ گود میں رکھ کر اس پر کھینچا لیکن اس کا سر اس نے ہاتھوں کے پالے میں چدو رکھا ہوا تھا۔

ابراہان کے کمرے میں غائب بلب کی بدھ روشنی تھی لیکن عمر نے کمرے کی لائٹس تن کی ہوئی تھیں نو دہرے سے آخر تک تیزی سے ابھر کی جانب بڑھا تھا۔

”نہانے! سن۔“ وہ اس کے قریب آ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے جان۔“ سوئے نہیں جا سکتا تھا۔

”نہانے نہیں آ رہی ہے کھانا؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیوں؟ کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا ہوگا۔“ بھوک تھی۔

”نہانے کل دن نے کھانا کھایا تھا تو میں نے ڈال کر۔“ میں نے کھانا کھانا۔

”پھر نہ کھانے کیسے آ رہی؟“ ابراہان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”بھانے! میں اگلا نہیں سوتا تھا۔“ وہ مجبور ہو کر بولا۔

”اوہ!“ ابراہان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں نے“

”جیس میں کمرے میں سوئے تھی جلدی تھی۔“

”کیونکہ میں بڑا ہونا چاہتا تھا۔“ وہ بے لگاؤ سے کہنے لگا۔

ابراہان شرارت سے مسکراتے لگے۔ ”یہی جان ابراہان! یہی ہوتے تھے۔“ میں نے سوچا بھی اکیلے سوچا ہاتھ پند نہیں کر سکتا۔

اس نے عمر کو ہاتھوں میں چڑھایا۔

”اور جب تک تم بڑے ہو گے تب تک ہم تمہاری دوسن بھی بنے۔“ اس نے کہا۔

چل کر سو گیا۔ ”اس نے کمرے سے بڑھ کر عمر کو بازوؤں میں لے لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

”یہاں لیٹ جاؤ کھانے کے برابر۔“ دیکھتا تھا۔ ”ابھی تیرا آئی ہے۔“ کوئی تھا جس میں وہ رات بیک بڑ بھی نہا سکتا تھا۔

”جیس۔“ تمہارا ہاتھ اپنے کمرے میں تھا کہ میں نے خیال کر لیا تھا۔

ابراہان جان تھا کہ اسے کمرہ والوں کی یاد ہے جسے وہ اس کا دھان باندھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اسے لگا کہ اس کا سر اٹھ گیا۔ ”میں نے دیکھا کہ اس کے قریب لیٹ گیا۔

”پال تو آج صبح میری جان میں کئی کئی سالوں کی بالی داوے سے تمہارے ہاتھ صرف دیکھائیں ہی یاد ہیں۔“ وہ

رائے نے غصے سے اور غوطا پیات۔

”میرے پاس بہت سی بچس ہیں اب ہر روز یہ حالہ کتنی ہیں کہ مجھے اب کمانی پڑھ کر سونا چاہیے۔“ میں اتنا چہرہ

نہیں ہوں کہ کمانی سنہ۔ پڑھنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے چند سے غور کیا۔ ”مخاطبہ نہیں رہے۔“ وہ اپنے اسی جلدی کے ہار کیا کر کے یاد رکھا کہ وہ

کمرے کی صحت جلدی ہے۔ ”تھیں؟“ ہم اچھے دلوں کی آس میں بیٹھے ہیں اور ہم بھوک بار بار خیران ہونے کا ڈر ادا دیتے

”تمہیں کسے ہوڑے ہو سکتے ہیں۔“ تمہارا سنے شان وار ہیں اتنی اچھی باڈی ہے۔“ آپ کی۔“

”اوہ! ٹھیک ہے۔“ ٹھیک ہے۔“ وہ لاف نہایت سے بولا۔ ”اسی ہی باتیں کیا کر۔“ جن میں بھانے کی تعریف اور

تمہارا بچپن نظر آئے۔

پھر عمر خاموش ہو کر کھٹ کو کھڑے لگے۔

”بھانے! تمہارے سارے شادی کیوں کی تھی؟“

ابراہان نے عمر کی سانس پھری۔

”آپ کی ممانعت تھی کتنی تھی۔“ ہم نے شادی کر لی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پھر آپ کی ڈائی ورس کیوں ہوئی؟“

”میں نے بڑا اچھی کھار ہوئے ٹالنے آجاتے ہیں زندگی میں۔“

اس نے بازو ہاتھ اٹھایا اور ایک ہاتھ اپنے پیٹان غلبہ انسان غلبہ۔

”وہاں کے دھندلے گلوں میں چھوٹے لگے۔“

”پھر آپ نے مجھے بھی مکاروئے کیا؟“

”تمہارے۔“ میں تب تک نہ کہ۔

وہ خاموش ہو کر گیا۔ اس نے اپنے کمرے کو دیکھا۔

”ابھی اس وقت اس نے مجھے نہ سمجھا سکا تھا۔“

”میں نے اسے چوکا۔“ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے

ملتا ہو۔“ اس نے اس کی کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”ابھی!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس نے کمرے کی لائٹس کر رہے ہیں۔“

”کھل۔ مجھے ہنوکے گھر جانا ہے۔ آپ کو یاد ہے؟“
 ”ہاں ہیری مارن ہانچے اچھے طرح یاد ہے اور تمہیں اپنی ماسے کیا کتاب ہے یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔“
 ”نانش۔“
 ”گھر نہ پشچھا!“ وہ آہستگی سے ہلے۔

”تم آخر کسی دھماکان میں رہتی ہو؟“ قہقروے بہت مسکے توسبی کے ساتھ دوڑتے ہیں لیکن اس کاہ ظاہر نہیں ہے کہ انہیں بالکل ہی اپنے سر سوار کر لیا جائے۔ ”وہ سخت تھاہو رہی تھی۔“ ناعمدہ خاموش بیٹھی رہی۔
 ”دوڑناں لگاؤ تاکہ طرف سے چڑھنا تک بند نہ ہو کہ مارا قہر لگ گیا ہے۔ دل تو چاہا رہا ہے اسی شکایت کر کے سخت سٹ سٹاؤں تمہیں۔“ ناعمدہ نے دیکھا۔
 ”سنو اور۔“ اس نے توقف کیا۔ آہستگی سے بولے۔ ”ہاں میں ابھی کیا کہہ رہا تھا۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ روئے نکلی سے اس کی جانب دیکھا پھر کسی سانس بھری۔ ”کیا کچھ اچھا ایسی بات کر رہا ہو کہ کہہ کر مجھے نہیں جاسکتا۔“ خیر دنیا میں کیا کچھ ہوں، تم جا کر ان کا سراپا دیکھو۔“ ناعمدہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔
 ”آئی ہیں ان کے سر میں رہنے۔“
 ”جہاں۔“ اس کی نگاہ پڑی۔
 ”ناعمدہ! رابہر نیگم کاسن کر جلدی سے اٹھ گئی۔ دوسرے کران کے کمرے میں ہلی آئی تھی۔

”ای! آپ کے سر میں درد ہے؟“ وہ ان کے قریب بیٹھی گئی۔
 ”ہاں۔“ انہوں نے انہوں پر سے ہاتھ لگایا۔ ”دادو قہقروے۔“
 ”ناعمدہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے سر پر دھس لگے گئی۔
 ”ایساں خالہ کی ٹیشن سٹل آئی ہے؟“
 ”ایساں کی؟“ وہ لہجے میں جیسے کسی خیال میں تھیں۔ ”ایساں ایساں بے چاری پر بھی ترس آتا ہے لیکن ناعمدہ جب معاملہ اپنی اولاد کا ہوتا تو ان کو کسی اور کی لڑائی لڑ کر نہیں ہوتی۔“
 ”میں سمجھی نہیں آئی۔“ وہ لہجہ بگڑا۔
 ”ناعمدہ سر۔“ میں درد کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“
 ”وہ درد کے لیے۔“ اس کے ہاتھ رک گئے۔
 ”ہاں ناعمدہ! رانچ کے توجہ نہ لگائیں۔“ ناعمدہ نے بار بار غصوں کی بات کر کے اسے درد میں ڈرا بھی دیکھا نہیں ہے۔ اور آج تو نہ شاید یہ میرا دم ہو۔ خدا کرے کہ یہ میرا دم ہی ہو۔ آج تو رانچ نے اسے دلچ کر لیے نظروں پر آئیں جیسے نہ پچھیر لیا ہو۔“
 ”میں ای!“ ناعمدہ نے تین انداز میں بولے۔ ”یہ شخص آپ کا دم ہے۔ رانچ بھائی بہت اچھے ہیں، وہ بالکل ہی اچھے ہیں۔“
 ”تم نہیں جانتیں ناعمدہ! تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ مرنات کے دل میں کتنے چور خانے ہوتے ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے زیادہ دیکھی ہے کہ اتحاد کچھ کر لیں گے شکوے کا پتہ نہیں جاتا ہے اور نہ رابہر اچھی بیٹی کی کہہ رہی تھی کس۔“

”دادو خاموش ہو گئیں۔“ ناعمدہ بھی ٹھہر گئی۔
 ”ایساں! کیا کہہ رہی تھی۔“
 ”یہ کہہ رہی تھی کہ رانچ۔“ شادی کے لیے رضامند نہیں ہے۔“
 ”ناعمدہ! اور پریشانی سے خاموش ہی رہ گئی۔
 ”لیکن۔“ لیکن کیوں؟“ پھر اس نے بہت پرچھا۔
 ”دادو! تم کو کہہ رہی تھی کہ رانچ اپنی اپنی سزا بھگاتا ہے لیکن ناعمدہ رانچ کا چہرہ دکھا ہے۔ اس کی آنکھیں دھیمی ہیں۔ وہ ایک مڑی آنکھیں، بالکل ایک مڑی آنکھیں۔ بے مروت، سرد مزاج۔“
 ”ایساں!۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ گئے۔ ناعمدہ نے جلدی سے ان کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیے۔
 ”تم۔“ ای!۔ آپ دو نہیں نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ وہ آج اپنی آنکھوں میں ایک ہیں۔ انہیں رشتوں کی یاد نہیں۔“

”ایساں!۔“ وہ لہجے میں جیسے کسی خیال میں تھیں۔ ”ایساں ایساں بے چاری پر بھی ترس آتا ہے لیکن ناعمدہ جب معاملہ اپنی اولاد کا ہوتا تو ان کو کسی اور کی لڑائی لڑ کر نہیں ہوتی۔“
 ”میں سمجھی نہیں آئی۔“ وہ لہجہ بگڑا۔
 ”ناعمدہ سر۔“ میں درد کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“
 ”وہ درد کے لیے۔“ اس کے ہاتھ رک گئے۔
 ”ہاں ناعمدہ! رانچ کے توجہ نہ لگائیں۔“ ناعمدہ نے بار بار غصوں کی بات کر کے اسے درد میں ڈرا بھی دیکھا نہیں ہے۔ اور آج تو نہ شاید یہ میرا دم ہو۔ خدا کرے کہ یہ میرا دم ہی ہو۔ آج تو رانچ نے اسے دلچ کر لیے نظروں پر آئیں جیسے نہ پچھیر لیا ہو۔“
 ”میں ای!“ ناعمدہ نے تین انداز میں بولے۔ ”یہ شخص آپ کا دم ہے۔ رانچ بھائی بہت اچھے ہیں، وہ بالکل ہی اچھے ہیں۔“
 ”تم نہیں جانتیں ناعمدہ! تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ مرنات کے دل میں کتنے چور خانے ہوتے ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے زیادہ دیکھی ہے کہ اتحاد کچھ کر لیں گے شکوے کا پتہ نہیں جاتا ہے اور نہ رابہر اچھی بیٹی کی کہہ رہی تھی کس۔“

”ایساں!۔“ وہ لہجے میں جیسے کسی خیال میں تھیں۔ ”ایساں ایساں بے چاری پر بھی ترس آتا ہے لیکن ناعمدہ جب معاملہ اپنی اولاد کا ہوتا تو ان کو کسی اور کی لڑائی لڑ کر نہیں ہوتی۔“
 ”میں سمجھی نہیں آئی۔“ وہ لہجہ بگڑا۔
 ”ناعمدہ سر۔“ میں درد کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“
 ”وہ درد کے لیے۔“ اس کے ہاتھ رک گئے۔
 ”ہاں ناعمدہ! رانچ کے توجہ نہ لگائیں۔“ ناعمدہ نے بار بار غصوں کی بات کر کے اسے درد میں ڈرا بھی دیکھا نہیں ہے۔ اور آج تو نہ شاید یہ میرا دم ہو۔ خدا کرے کہ یہ میرا دم ہی ہو۔ آج تو رانچ نے اسے دلچ کر لیے نظروں پر آئیں جیسے نہ پچھیر لیا ہو۔“
 ”میں ای!“ ناعمدہ نے تین انداز میں بولے۔ ”یہ شخص آپ کا دم ہے۔ رانچ بھائی بہت اچھے ہیں، وہ بالکل ہی اچھے ہیں۔“
 ”تم نہیں جانتیں ناعمدہ! تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ مرنات کے دل میں کتنے چور خانے ہوتے ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے زیادہ دیکھی ہے کہ اتحاد کچھ کر لیں گے شکوے کا پتہ نہیں جاتا ہے اور نہ رابہر اچھی بیٹی کی کہہ رہی تھی کس۔“

میں اے! وہی ہے میرا دل اس وقت جبراً ہے
موفق کا احساس رہتا ہے۔"

سادگیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اپنے ہی دھماکان میں تھم۔ جو کہ اس وقت تک کوئی نہیں اترتا۔

”اچھا۔ اچھا یہ تو شہلا کی بہن ہے۔“ وہ ہنستا ہوا کہتا ہے۔

آخر میں یہاں ہوں کہڑے تھے گویا مٹی کا بے جان پتھر ہوں جی کہ اس کے وجود میں سانس کی جھینٹ تک محسوس نہ ہوتی تھی۔ یہاں نے اپنی بات کہ کر ڈوڈا بھی کہیں اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا پورا وجود ایک انگ کے گھومنے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس کی سانس دھونے کی کڑی نیند غل رسی، جسے اسے لگ رہا تھا کہ جس پندرہ بج گھنٹوں میں وہ پوری کی پوری دھواں بن کر سوا میں تحلیل ہو جائے گی۔

ایقان بیگم: ”آخر میاں کے بت میں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی ”نہیں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہم ایک بے وقوف نور سے درخشنا مستعد ہیں جاں میں۔ ہم نے تو اب سنے بھی نہ کھینچا جو دوبا ہے اور اب نہیں جھنجھکتے ہیں۔ نہیں۔ شاید آپ، آپ ہم سے مذاق کر رہی ہیں آپ آج بھی یہی ایقان ہیں شوخ و نمدل و فضیلتی کا چمچ سے بنی ہوئی اور بس کا چمچ کی طرح نور دینے والی ایقان۔“

”اگر تم میال نہ! آپ کی ہی بددعا تھی شاید۔“ وہ آہستہ سے بولی جیسے نیند میں جو کلام ہو۔ ”دورینہ بدو کی کاہل“

”ہم نے تو ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی ہے۔“ وہ جیسے منمنائے ”اور ہمیشہ کو کہتے رہیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دیر قبل جو آپ نے کہا، اس کے ساتھ غم کا نشانہ اتر گیا ہمارے سر پر۔“ اس کے ہم سب نے جھٹکیاں کیں، ہم سب نے جھٹکیاں کیں، ہم سب نے جھٹکیاں کیں۔

”چائے نہیں پسند“ وہ تجھے سے اس بڑی ”میں آپ کے“ لفظ پر مڑا ہوا ہے یا پھر اسے نصیبوں سے میری کی تنہا جو کہ مجھے بھی سمجھ بھیجے اسے۔ لیکن اتنا تعین کر لیں کہ میں نے کیا ہے نہ پھر کے میں نے میں نے بھی نہیں ہوں اور یہ نہیں دے بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے لیے تو خوش و خرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کی اور اب آپ کے جواب کی منتظر ہوں میں بتائیے کہ ایک مٹا دی حقیقت سے اپنا نہیں گئے تھے؟“

سے باؤں تک آپ کے بن جائیں گے۔ پھر کھو کر بھی باؤں تک آپ کی چو کوٹ سے نہ اٹھیں گے ہم۔

”مسمول دعدوں کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”آپ نے کہہ دیا کہ میں کافی سہمہ آپ آپ نہیں اور ہاں پھر منہ اٹھا کر میں جیل میں جا رہی ہوں۔“

”عزت ہو ہماری صورت پر اگر ہم ایسا کریں تو۔“ وہ جذباتی ہوئے ”ہم تو آج سے ہی گھر سے نکلنا چھوڑ دیں“

”جی ہاں۔“ وہ کھول اٹھی تھی۔ ”میں عدت میں بیٹھتی ہوں۔ آپ مایوں بیٹھ جائیں۔“ آخر مایاں لرزے پڑیں۔

”یقیناً سیکر ایکسہ ایک بات پوچھیں آپ سے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہوا؟ ایک ہستی بستی زندگی سے منہ کر آپ ہم سے دلوں سے یہ کیا لگا رہی ہیں؟ ہم تو اپنا دلوں بن ہی نئے سکتے ہیں آپ کو۔ آپ کی زندگی یہاں کی نوید نہیں سنائیں گے ہم۔“

میری زندگی کو کبھی بہار کی ضرورت نہیں رہی! آخر میاں! یہاں تو بس ہر شے کو جلا کر راکھ بنا دینے کی تمنا

میں اپنے جلنے کا تماشا آبِ کھنجا ہتی ہوں۔ بسنا چاہتی ہوں اپنی راکھ پر۔“

ایقان اور آخر میاں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ پھر یکدم ہی راجہ سامنے آ گیا تھا۔
 ”پتھو! آپ یہاں ہیں؟ اس وقت؟“ وہ سخت حیران تھا اور آخر میاں! یہ آپ اس

آخر میں کی شے ہم ہو گئی لیکن ایمان کے جامد انداز میں فرق نہ آیا تھا۔

لے یہاں آگئی۔ اور بیسہ اختر میاں خان کی اختر تیار یوں سے کون واقف نہیں ہے۔
 ”پچھیمو!“ رافع نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ چلیں اندر۔

اب کو آرام کی آئندہ ضرورت ہے۔ پھر ڈاکٹر نے خاص طور پر آپ کو یسٹن سے ڈیڑھ

”بچوں کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں؟ اگر سوچتے ہیں ڈر جائیں تو؟ آپ کو گھر میں نہ پارہا کیجئے اندازہ ہے آپ کو؟“

”رافعؓ! وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی تھی کہ ”اے اللہ! اگر میں مر جاؤں تو میری فضا“

پھر اس نے کہا ”اے اللہ! میں غنا شکر و محبت سے ناپا“

پھر اس نے کہا ”اے اللہ! صرف آپ کے فضل سے“

”نہیں“ گولیوں سے فرق نہیں پڑتا رافع!“ وہ بچوں کی طرح ہولی۔ ”پھر ہولی چھوڑو“

ساجت کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی پوری تیشی کیا کرے ایک بار موت کی دعوت ہی لڑنا
 ”خدا کا واسطہ ہے کچھ ہوتا ہے!“ وہ اس نکلے دروازے کے سامنے ٹک گیا۔ ”کیا ہے؟“

نے بھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ اسی سوچیت۔ اس اندر بندی کی پٹ...
 کر نے رہا ہے میں نے یہ سوچا کہ آپ تو بہت دلو نکلیں۔
 ”جاؤ۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔“ اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”ہر میدان کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ڈیر پیچھے! ایک مصرعہ انگلیک

کی کوشش میں تھا اور اب میں آپ کو یوں پھنوس رہا جیسے والا میں ہوں۔ پس۔۔۔

لیکن سکون؟ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے تم جاؤ۔ اپنا وقت مجھ سے
 کرو۔ مجھے تو اب اس کی عادت ہے۔ صبح ہوتے ہوتے خنڈ بھی اُڑی جائے گی۔ آؤ

"اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ سلیمن پلینر پیچھو، لولی اپنا سیدھا کام سمجھ کر رہے ہو۔"

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھروسہ کیجیے۔

"نہیں! افسوس! یہ نیک ہو جائے گا۔" اس نے جسے سرگوشی کی تھی۔

”اب میں چلوں؟“ وہ منگھوٹ مارتا تھا۔
 ”ہاں! تم جاؤ۔ شب بخیر۔“ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔
 راجہ پریشان سا کالی دیروہن کھڑا رہا تھا۔

”جی کی سی؟“ وردہ کافی گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ ”یہ ان لوگوں کا ہر کام ایسے جلد بازی اور افتراقی میں ہی کیوں ہوتا ہے؟ انہیں سکون و اطمینان کے معنی نہیں آتے کیا؟“
 ”گلیا ہوا؟“ راجہ بیکم گھبراہٹ میں۔ ”میں کی بات کر رہی ہوں؟“
 ”فراز کے گھر والوں کی۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ان کے سروں پر رو اور تانے کھڑا ہے۔ ابھی فریخ کا فون آیا تھا۔ کہنے لگی، ہم لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ضرور آؤ، سر آگے ہوں۔ تب بولی، ہم شادی کی تاریخ رکھنے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس موقع پر بہت خاص قسم کے لڈو بنوائے جاتے ہیں، لیکن چونکہ وقت کم ہے اس لیے کس مشائی کے فکر سے بچا لے ہیں۔ آپ لوگ پسند کریں گے یا نہیں؟“
 ”ہاں! راجہ بیکم بھی چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ ”تاریخ رکھنے؟ ہاں! کیا؟“
 ”ہاں! وہ بچی ہوئی تھی۔“ ”بہ کوئی نکتہ؟“ ”جی ہاں! سرسوں ہلانی؟“ ”آپ شام تک دعوت کا بندوبست کرنا آسان کام ہے بھلا؟ اس نے کہا ہے کہ قریباً آٹھ گھنٹے تو اس افراد کو دینا پڑے گا۔“
 ”لیکن ہم بھی تو اپنے سبھی رشتہ داروں کو بلائیں گے۔ اس طرح پچاس ساٹھ افراد تو بن جاتے ہیں۔“

راجہ بیکم کے چہرے پر پریشانی جھلک گئی۔
 ”خیر! آپ فیصلہ نہ لیں۔“ وردہ نے ان کی صورت دیکھ کر فوراً اپنی اسکان آباد کر لیا۔ ”میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اللہ مالک ہے، ہم ہمارے پاپ کا پکا کھانا منگا لیتے ہیں۔“
 ”ہاں! ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں راجہ سے کہتی ہوں، وہی انتظام سنبھالے گا۔“
 ”جی! وردہ آہستگی سے بولی تھی۔ ”ہاں! سبھی اچھی تو ہیں، لڈو بچہ ضرور ملی بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ میں بڑے ماموں کے یہاں جا رہی ہوں۔ انہیں شام کی دعوت بھی دے دی، وہیں اور کھانے کے متعلق بھی سارا کچھ ڈسکس کر لوں گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ ابھی سب کھربہ ہی ہوں گے۔ وہ خیال کر مارا انتظام سنبھال لیں گے۔“

”چچا! جیسے تمہاری مرضی۔“ راجہ بیکم چپ سی ہو گئیں پھر جیسے انہیں خیال آیا تھا۔
 ”آج چھٹی ہے۔ نیک سے پیسے بھی نکلوانے ہوں گے۔“
 ”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ اتنے ایام سے نکال لوں گی میں۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں، سب بالکل خیریت سے ہو جائے گا۔“

وہ پلٹ کر جانے لگی تھی۔
 ”بات سنو وردہ! راجہ بیکم نے اسے پکارا۔
 ”جی! ای! وہ اٹھنے قبول پلٹ آئی۔
 ”وہ لوگ۔ کب کی تاریخ رکھنے کا کہہ رہے ہیں؟“ وہ قدرے فکر مند کی پوچھنے لگیں۔
 ”سیرا خیال ہے اگلے چاند کی کوئی تاریخ؟“
 ”ہاں! وہ سچا نہیں۔“ اس قدر افتراقی؟ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ان کا کوئی کام بھی جلد بازی سے خالی

نہیں ہے۔ یہ ناعمد ہے کہاں؟“
 ”ضرور ہی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”پڑھاؤ اسے۔“ وہ جھلا میں۔ ”ہم یہاں دبلے ہوئے جا رہے ہیں اور وہ ٹھانڈے بستر کی سیر کر رہی ہے بلکہ تم جاؤ میں خود گاتی ہوں اسے۔“
 ”بستر کی سیر؟“ وردہ کو ہنسی آگئی۔ ”تب ہی اکثر بیک کے نیچے گر جاتی ہیں محترم۔ فراز کو کہنا پڑے گا کہ اس کے ساتھ میں ٹھیک لگاوا کرے۔“
 راجہ بیکم بھی ساری فکر بھول کر ہنس پڑی تھیں۔

شیشے کا بیرونی دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ فروغ بیکم سامنے ہی صوفے پر براجمان ہرے پتے کے اسلام علیکم ممالی جا بیٹھا۔ ”وردہ! ان کے قریب جا بیٹھی۔“
 ”علیکم السلام! انہوں نے کھانا نہ کھاؤں گے تو کوئی برے کی۔“ ”وہ بھی عمر سے بعد شکل دکھائی ہے تم نے لگا ہے کوئی خاص کام ہے آج؟“ وردہ نے پوچھا۔ ”کیوں؟“
 وردہ دیر سے مسکراتی تھی۔
 ”ٹھیک جی ہیں آپ۔ بہت ذہین ممالی ہیں آپ کی سیر۔“
 ”جی! سر تو ہمارے کی بات ہے۔“ وردہ نے بہت کڑھ مفرین ذہین تو تمہاری چھٹی ممالی ضرور ہوں گی۔ سارا جلد ہی کی کہانی۔
 اپنی بات سے محفوظ ہو کر انہوں نے خود ہی تجویز لگایا۔ وردہ بھی دھجے سروں میں ان کی بے ہنگام ہنسی میں شریک ہوئی تھی۔

”چچا! کہہ کیسے آنا ہوا؟“ انہیں فوراً ہی اصل بات یاد آگئی۔
 ”آج شام ہمارے ہاں کب سب کی دعوت ہے۔“ اصل میں ابھی ابھی فریخ کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ ناعمد کے لیے تاریخ رکھنے آ رہے ہیں۔ اس موقع پر آپ سب لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔“
 ”ناعمد! تاریخ؟“ ان کا منہ کھل گیا۔ ”شادی کی تاریخ؟“
 ”جی! ہاں۔“ وہ ان کے انداز سے قدرے گھبراہٹ ہوئی۔ ”شادی کی ہی تاریخ رکھنا ہے ممالی!“
 ”یہ تو اب بتا رہی ہو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”خیر! شکوہ کیا جا رہا ہے۔ پہلے کون سا تم لوگوں نے کسی بات میں شریک کیا ہے جو اب کر گئے سمانوں کی طرح وقت سے ملاتے ہو۔ ہم بھی سمانوں کی طرح جی آئیں گے۔“
 انہوں نے ذہن نہ تو کر کے اپنے آگے کہہ کر اور پتے نکالے گئیں۔

”میں کی بات نہیں ہے ممالی! میں جیج کہہ رہی ہوں۔ ابھی فریخ کا فون آیا ہے اور میں ابھی آپ کے پاس چلی گئی ہوں۔ بلکہ آپ بولیں کہ اگر جنت نوٹس پر کھانا بھی پکا ہوا اسکو اتارے اور مجھے اس سلسلے میں باہم بھائی اور جنت سے بھی مشورہ کرنا ہے۔“
 ”مگر مشورہ۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”ہم نے کب روکا ہے۔“ پھر دفعاً ”ان کے ہاتھ رکے تھے۔ ان کے انداز میں بیکم ہی اپنا تیرہ آئی۔
 ”بات سنو وردہ! یہ عذرا کا کیا خیال ہے راجہ اور تمہارے بارے میں؟“

”خیر تم فکر مت کرو۔ رائے آتی ہی ہوگی۔ خود ہی سمجھا دے گی تمہیں سب کچھ۔ اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ موقع تو خوشی ہونے کے ہوتے ہیں بیٹا۔ لڑکیاں تو آج بچاؤ کرتی ہیں ان بچوں کی بچوں کے رسول کو۔ تمہارا تو رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے کپڑے پہنچ چکے ہوں۔“

”ہی! ہی! کس کی آنکھیں کھرا آئیں۔“ چہ نہیں مجھے ذرمت لگ رہا ہے!“

رائے بیگم کو بے اختیاری اس پر بیاڑ آیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”آپ۔ آپ ان لوگوں کو رخ کر دیں۔“

”ناامحسب!۔۔۔ وہ درود چہ حیران ہو یں۔“ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے سربا باتیں منے نہیں نکالنے ہوتی!“

بچہ وہ قدرے اداس ہوئی تھیں۔

”تمہارے والد اگر زندہ ہوتے تو کسی قتلہ ہوتی مجھ سے اس وقت تو ایسا لگتا ہا ہے جیسے ایک کاروبار سے
میں کا کوئی بڑا بھائی ہے۔ بہت کم حوصلہ بوری ہوں میں اور تمہاری صورت بنا کر اور کسی معمول باتیں کر کے مجھے
مزید بے حوصلہ کر دی ہو۔ مجھ کو اگلے لیے سب اچھا بولہ کوئی الٹی سید بات منہ سے نہ نکلے۔“
”لیکن اتنی ہی دیر سے وہ لڑکی کا کفن تھا، وہ کچھ اور سمجھ میں نہ آنے پر احتجاجا سوجھ بولی۔
”سب تو اٹھ کر رہا ہے بڑا ہی لگتا ہوا لڑکی کا ہے۔ اس نے اگر تمہاری خوشی رو سے پہلے کبھی ہے تو اس
کو کوئی مصیقت ہوگی۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ انہیں یاد ہو سوجا جائے پھر وہ مطمئن ہے تو تمہیں کا ہے کی خبر؟
وہ میری بہت پیاری بیٹی ہے مجھے خیر ہے اس پر۔“

”میں نے اپنی کسی بہن سے یہ سنا ہے کہ اس نے منہ سوراخ کر کے اپنے گھر سے نکل کر ایک کھوکھلے درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے منہ سے سانس روک لیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس کے ساتھ کتنی ہی سختی کی تھی مگر وہ کبھی نہیں ہلکا ہوا۔ اب کبھی سوچتی ہوں تو افسوس بھی ہو جاتا ہے۔“

”وہ تمہارے کیا سوچنے کی بات تھیں۔ پھر مجھے خیال آئے تو اس کے چہرے پر جو تکلیف تھی۔“

”مجھے حیرت ہے کہ میں تو بھاری ریز کی ہوں۔ یہ وقت متعلقہ صحت کو دیکھ کر کے ایک مرتبہ یہ سن کر فٹنگ وغیرہ چیک کرلو“

”کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہم نہ نکل آئے۔ دودھ آئے تو اس کے ساتھ کل کر ٹافٹ کو سٹونے کا رولہ میں ڈراواں ہی ہی طرف جاتی ہوں۔“

”میں نے اپنے دل سے یہ سچا کہا کرتی تھی۔“
 راتو رات سوچتے رہتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے کیا کہا تھا۔ وہ اپنے دل میں بھی جانتی تھی۔ اس لیے اس کی باتوں سے کوئی
 شک نہ رہتا تھا کہ وہ سچا کہتا تھا۔ وہ سچا کہتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے کیا کہا تھا۔ وہ اپنے دل میں بھی جانتی تھی۔ اس لیے اس کی باتوں سے کوئی
 شک نہ رہتا تھا کہ وہ سچا کہتا تھا۔ وہ سچا کہتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے کیا کہا تھا۔ وہ اپنے دل میں بھی جانتی تھی۔ اس لیے اس کی باتوں سے کوئی

وہ کمرے میں اندر جا کے لیٹی ہوئی تھی۔ ساری رات غنیمت کیوں کے قریب نہ پہنچی تھی۔ اب سرور سے پتلا
 ارا تھا اور طبیعت بے خد بھاری ہو رہی تھی۔ یکدم موبائل کی گزشتہ سے اس کی غنیمت نے اس نے پتلا
 نکھیں کھول کر اسکرین پر عام دکھا پھر موبائل آن کیا۔
 ”ہیلو“

دب۔ وزارت داخلہ

”دشرب تو نہیں کیا کہیں؟“ وہ محتاط انداز میں بولا تھا۔ ۱۰

شہلا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔ باہم کے انداز میں پچھلے کچھ دینوں سے در آنے والی اجنبیت اس کے لفظ

”ایسی باتیں نہ کیا کریں ہاں بہت ابھری سے لگتے ہیں۔“

”میرا ہاں ہے۔“

کیا بات ہے؟ کیا تم یہاں انا میں چاہیں؟ ہاں ابھ سالیہا۔

میں نے کہا کہ میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔

[illegible]

”اور ابھی تم میرے الفاظ سے بچتی اجنبیت کی شکایت کر رہی تھی۔ مجھے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔“

بظن کے متعلق سوچتی رہ گئی۔

15. 16. 17. 18. 19. 20. 21. 22. 23. 24. 25. 26. 27. 28. 29. 30. 31. 32. 33. 34. 35. 36. 37. 38. 39. 40. 41. 42. 43. 44. 45. 46. 47. 48. 49. 50. 51. 52. 53. 54. 55. 56. 57. 58. 59. 60. 61. 62. 63. 64. 65. 66. 67. 68. 69. 70. 71. 72. 73. 74. 75. 76. 77. 78. 79. 80. 81. 82. 83. 84. 85. 86. 87. 88. 89. 90. 91. 92. 93. 94. 95. 96. 97. 98. 99. 100. 101. 102. 103. 104. 105. 106. 107. 108. 109. 110. 111. 112. 113. 114. 115. 116. 117. 118. 119. 120. 121. 122. 123. 124. 125. 126. 127. 128. 129. 130. 131. 132. 133. 134. 135. 136. 137. 138. 139. 140. 141. 142. 143. 144. 145. 146. 147. 148. 149. 150. 151. 152. 153. 154. 155. 156. 157. 158. 159. 160. 161. 162. 163. 164. 165. 166. 167. 168. 169. 170. 171. 172. 173. 174. 175. 176. 177. 178. 179. 180. 181. 182. 183. 184. 185. 186. 187. 188. 189. 190. 191. 192. 193. 194. 195. 196. 197. 198. 199. 200. 201. 202. 203. 204. 205. 206. 207. 208. 209. 210. 211. 212. 213. 214. 215. 216. 217. 218. 219. 220. 221. 222. 223. 224. 225. 226. 227. 228. 229. 230. 231. 232. 233. 234. 235. 236. 237. 238. 239. 240. 241. 242. 243. 244. 245. 246. 247. 248. 249. 250. 251. 252. 253. 254. 255. 256. 257. 258. 259. 260. 261. 262. 263. 264. 265. 266. 267. 268. 269. 270. 271. 272. 273. 274. 275. 276. 277. 278. 279. 280. 281. 282. 283. 284. 285. 286. 287. 288. 289. 290. 291. 292. 293. 294. 295. 296. 297. 298. 299. 300. 301. 302. 303. 304. 305. 306. 307. 308. 309. 310. 311. 312. 313. 314. 315. 316. 317. 318. 319. 320. 321. 322. 323. 324. 325. 326. 327. 328. 329. 330. 331. 332. 333. 334. 335. 336. 337. 338. 339. 340. 341. 342. 343. 344. 345. 346. 347. 348. 349. 350. 351. 352. 353. 354. 355. 356. 357. 358. 359. 360. 361. 362. 363. 364. 365. 366. 367. 368. 369. 370. 371. 372. 373. 374. 375. 376. 377. 378. 379. 380. 381. 382. 383. 384. 385. 386. 387. 388. 389. 390. 391. 392. 393. 394. 395. 396. 397. 398. 399. 400. 401. 402. 403. 404. 405. 406. 407. 408. 409. 410. 411. 412. 413. 414. 415. 416. 417. 418. 419. 420. 421. 422. 423. 424. 425. 426. 427. 428. 429. 430. 431. 432. 433. 434. 435. 436. 437. 438. 439. 440. 441. 442. 443. 444. 445. 446. 447. 448. 449. 450. 451. 452. 453. 454. 455. 456. 457. 458. 459. 460. 461. 462. 463. 464. 465. 466. 467. 468. 469. 470. 471. 472. 473. 474. 475. 476. 477. 478. 479. 480. 481. 482. 483. 484. 485. 486. 487. 488. 489. 490. 491. 492. 493. 494. 495. 496. 497. 498. 499. 500. 501. 502. 503. 504. 505. 506. 507. 508. 509. 510. 511. 512. 513. 514. 515. 516. 517. 518. 519. 520. 521. 522. 523. 524. 525. 526. 527. 528. 529. 530. 531. 532. 533. 534. 535. 536. 537. 538. 539. 540. 541. 542. 543. 544. 545. 546. 547. 548. 549. 550. 551. 552. 553. 554. 555. 556. 557. 558. 559. 560. 561. 562. 563. 564. 565. 566. 567. 568. 569. 570. 571. 572. 573. 574. 575. 576. 577. 578. 579. 580. 581. 582. 583. 584. 585. 586. 587. 588. 589. 590. 591. 592. 593. 594. 595. 596. 597. 598. 599. 600. 601. 602. 603. 604. 605. 606. 607. 608. 609. 610. 611. 612. 613. 614. 615. 616. 617. 618. 619. 620. 621. 622. 623. 624. 625. 626. 627. 628. 629. 630. 631. 632. 633. 634. 635. 636. 637. 638. 639. 640. 641. 642. 643. 644. 645. 646. 647. 648. 649. 650. 651. 652. 653. 654. 655. 656. 657. 658. 659. 660. 661. 662. 663. 664. 665. 666. 667. 668. 669. 670. 671. 672. 673. 674. 675. 676. 677. 678. 679. 680. 681. 682. 683. 684. 685. 686. 687. 688. 689. 690. 691. 692. 693. 694. 695. 696. 697. 698. 699. 700. 701. 702. 703. 704. 705. 706. 707. 708. 709. 710. 711. 712. 713. 714. 715. 716. 717. 718. 719. 720. 721. 722. 723. 724. 725. 726. 727. 728. 729. 730. 731. 732. 733. 734. 735. 736. 737. 738. 739. 740. 741. 742. 743. 744. 745. 746. 747. 748. 749. 750. 751. 752. 753. 754. 755. 756. 757. 758. 759. 760. 761. 762. 763. 764. 765. 766. 767. 768. 769. 770. 771. 772. 773. 774. 775. 776. 777. 778. 779. 780. 781. 782. 783. 784. 785. 786. 787. 788. 789. 790. 791. 792. 793. 794. 795. 796. 797. 798. 799. 800. 801. 802. 803. 804. 805. 806. 807. 808. 809. 810. 811. 812. 813. 814. 815. 816. 817. 818. 819. 820. 821. 822. 823. 824. 825. 826. 827. 828. 829. 830. 831. 832. 833. 834. 835. 836. 837. 838. 839. 840. 841. 842. 843. 844. 845. 846. 847. 848. 849. 850.

ایم اے کے لئے فریب آئیں۔

”اے محمدؐ کہ کھنڈہ کے آئینہ زلفِ رسولؐ کی خیر و برکت گما

”اگرچہ میں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔“

میں نے کہا: "اے میرے بھائی! یہ تو خدا کا علم ہے۔" "راغب نے خدا کا علم کہا۔

جیکم سورج میں رگڑا کر لیں۔

سچے کہ وہ کیا کر رہی ہیں، نہ کچھ بھی غلط کر سکتی ہیں۔ ایسے میں ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ اس میں کسی لحالی میں

ماہنامہ سحر 264 مئی 2007

”تم اماں کے سامنے ہر گز ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔“ عذرا بیگم نے اسے ٹوکا۔ ”وہ نیلے ہی

درد درجہ فلرمندر ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں سنیں گی تو بیمار پر ڈچائیں گی۔“

”اب کیا کرو گے؟“ عاتق کا بھر کہاں سے لو گے؟“

”میں نے یہ سنا ہے کہ اس سے...؟“ وہ جھڑپ ہوئی۔

”لو پتھر مٹی ہو نا۔“ وہ بھنکائیں۔ ”عاسرہ دیرینہ دوست تھے کہاں مل جائے گا“

در پر نظر آری تھی۔

”جی آئی۔“ فریجہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ ”ہم لانے تو خاص طور پر کوشش

الكتاب الثاني

رب لی تو ان بچیوں کے سوا میرا کون ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر اکرا

”ای! میں نے اعمیہ کے پاس جلی جاؤں گا اور مجھے لکڑی ملے گی۔“ وہ اندراپلی:

یہاں تک کہ لوگ یہ سوچیں گے کہ "وہ کسی سی۔ فریب

ہنگامہ پیل کے آئینے کے سامنے بیٹھ کر وہ قدرے محویت سے خود کو دیکھ رہی

“*Handwritten signature*”

میں بڑھا کر اندر بھٹی آئی۔ سیاہ پٹروں میں اس کی رنگت زرد اور مرہٹھی ہوئی تھی۔

2007 (265)

ناعمہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ گئی۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں اس کے انداز میں وحشت کا راج تھا۔ عریضہ آکر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں ناعمہ کو اس دیوانی لڑکی سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔

”بہت خوش ہو ہوں؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے سر جھکا کر قدرے اداسی سے کہا تھا۔ ”بالکل خوش نہیں ہوں۔ محض مجبوری ہے۔“
 ”اوہ۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”مجبوری۔۔۔ مجبورا شادی کر رہی ہو اس سے؟ جانتی ہو ناعمہ! مجبورا شادی کیے کی جاتی ہے؟ جیسے میں کر رہی ہوں، ایسے۔“
 ”جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم کیا جانو گی۔“ وہ تحارت سے بولی۔ ”تمہارے دل پر تو ان عذابوں کا سایہ تنگ نہیں اترا جو میری ذات کے اندر پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ صرف اتنا جان لو جو تمہارا بننے جا رہا ہے اس نے کبھی میری محبت کا دم بھرا تھا، میرے فراق میں آئیں بھری تھیں، میرے لیے راتیں جاگی تھیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ جب میں زنجیروں میں جکڑی گئی، تب وہ تمہارے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ جانتی ہو کیوں؟ صرف اور صرف مجھے جلانے کے لیے، میرا تماشا بنانے کے لیے۔ یہ جتانے کے لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا، وہ صرف دل کا بسلاوا اور تفریح تھی اور تم۔۔۔“ اس نے نفرت سے ناعمہ کو دیکھا۔ ”تم بھی خوشی خوشی اس کے تھیل میں شریک ہو گئیں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں ان ساری باتوں کا علم ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا جان لو کہ میرے قاتلوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ مجھے تم سے بھی نفرت ہے، مجھے سب سے نفرت ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی تھی۔ ناعمہ تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔

”مت رو، مت رو۔۔۔“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”تمت رو، کوئی تمہارا یا تمہاری خوشیوں کا قاتل نہیں ہے یہ سب نصیبوں کے بھیر میں۔ دل کسی کا ہوتا ہے، وجود کسی اور کا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔“
 ”تمت بسلاوا مجھے ان جھوٹے لفظوں سے۔“ وہ پھینکاری۔ ”میں بھی تم بہت خوش ہوئے تھے پانے جا رہی ہو اسے آسمان کا چاند سمجھتی ہو لیکن یاد رکھو، چاند صرف چند لمحوں کے لیے اپنا ہوتا ہے، پینڈا پل گزرتے ہیں اور دوسری چھت پر نظر آتا ہے۔ وہ جو کل مجھے مجھ سے محبت کرتا تھا۔۔۔“

”وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ ناعمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”فرق اتنا ہے کہ محبت نے روپ بدل لیا ہے اور اسے اس کی خبر نہیں ہے۔“
 عریضہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔

”کیا مطلب؟“ پھر وہ بولی تھی۔
 ”تمہیں یاد ہے عریضہ؟“ ناعمہ آہستہ آہستہ بولنے لگی تھی۔ ”جب ہم اپنی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہمیں انگریزی کے استاد گھر پر زہانہ آتے تھے۔“

”ہاں۔ یاد ہے۔ لیکن یہاں ان پر اپنی باتوں کا کیا ذکر؟“
 ”تب ہم آشران کے گھر فون ملا کر انہیں مختلف طریقوں سے تنگ کیا کرتے تھے۔ ہے نا؟“
 ”ہاں۔“ وہ قدرے اکتاہٹ سے بولی۔ ”پھر؟“

”نہیں کبھی اندازہ نہ ہوا تھا کہ ہم ایک نہیں دو مختلف لڑکیاں ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہماری آوازیں اور ہمارے بولنے کے انداز میں بے تحاشا مماثلت ہے۔ تب ہم نے تینوں کو ایک لڑکی بن کر بے وقوف بنایا تھا۔ آدھی بات تم کیا کرتی تھیں، آدھی میں اور کبھی کوئی ہماری چوری نہ پکڑ پایا تھا۔ ہے نا؟“

عریشہ یوں چوکی تھی جیسے اسے کرشنا گاہ کو وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

”تمہے تمہارا۔۔۔ تمہارا۔۔۔ مطلب ہے کب؟“
”ہاں۔۔۔“ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔ ”فرزاد کو بھی ایسی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے ایک منٹ میں دو مختلف لڑکیوں سے بات کی ہے۔“

عریشہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور یوں۔۔۔ یوں تم نے میری محبت، تمہارا اور اتنے اطمینان سے مجھے بتا رہی ہو۔“
”نہیں عریشہ! ناعمہ بات کو سننے کے بجائے بگڑاؤ دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”تم میری بات تو سمجھو۔“

”تب ہی تم نے کہا کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے سچ میں آکر تجھ سے اس طرح اس کی براہ کھولی کر دی۔ اسے اپنی جانب کھینچ کر لے گئیں۔“

”نہیں عریشہ! اہم بات یہ ہے تمہارا نکاح مانع سے ہو گیا تھا۔“

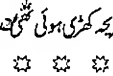
”ہاں ہوا تھا نکاح۔ لیکن میری نظر میں صرف اور صرف میرے دل کے رشتے کی بات تھی۔ وہ مجھے چاہتا ہے اور میں اسے۔۔۔ اسی بات پر میں غرور کر سکتی تھی لیکن۔۔۔ لیکن تم نے ایمان لے کر آئے ہو۔ ہمیں ایک عجب آسمانی کلمہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو میں اس بات کو آسانی سے بھول جاؤں گی؟ نہیں، ہمیں ہمسایہ ہاں

بے ایمانی کی پوری سزا ملے گی۔ نہ میں مانع کی بنوں کی اور نہ فریاد کو تمہارا سنبھالنے دوں گی۔ سنا تم نے؟“
”ہاں۔۔۔ تو عریشہ! ناعمہ کا کچھ کانپ گیا۔ ”کوئی سن نہ پاتا۔“

”جس کو سنا چاہیے وہ سب ضرور سنے گا۔“ وہ ایک غرور سے بولی۔
پھر وہ جلی اور کرنے سے نکل گئی۔ ناعمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور رو رو کر دیکھتے ہوئے

محسوس ہو رہے تھے۔ طلق میں کانٹے اگلے لگے تھے۔ تجھانے نظریہ اس کے ساتھ تیار کرنے والے تھے۔
”بھابھی!“ کسی نے یکدم قریب سے کہا۔

ناعمہ میری طرح جو کسا گئی۔ اس کے پاس فریڈ کھڑی ہوئی۔



تارکول کی سیاہ سرک تاحد نگاہ نظر آتی تھی۔ اس سے بڑے سیاہاؤوں کے بڑے بڑے گلوے ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ گویا کسی کارسٹ روکنے کی تیار کر رکھی ہو۔ مغرب سے آگے وقت تجھانے

نے سر اٹھا کر دیکھا تو سرسری آسمان اچانک بدلتے لگا۔ اس کے کناروں پر جیسے بدلیوں میں آگ کی لگ گئی۔ پل بھر میں آسمان گلابی ہو گیا تھا۔

ربیعہ کو احاس ہوا۔ دور دور تک محض پیرانہ تھا۔ کہیں آبادی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ربیعہ گھبرا سی گئی۔ ایسے سنسان پہر میں وہ تنہا ہواں کھڑی تھی۔

”ربیعہ!“ اسے کسی کی سسکی سنائی دی۔ ”ربیعہ! میں۔۔۔ میں یہاں ہوں۔ یہاں۔۔۔“
ربیعہ نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں پھر یا۔۔۔ وہاں کوئی نہ تھا تب ہی ایک شور کے ساتھ وہاں سے چل پڑی تھیں

جیسے سارے ہاں اچھی بڑے والے ہوں۔ ربیعہ کا جی چاہا ”ہاں سے بھاگ جائے۔“
”ربیعہ! ربیعہ!“ کوئی رو رہا تھا۔ ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ میں۔ یہاں ہوں۔ تمہارے قریب۔ آؤ۔“

دیکھو تو کسے ملو تو۔“
ربیعہ کو خوف محسوس ہوا پھر وہ لپکا لپکا بھائی۔ تارکول کی سیاہ سرک جیسے اس کے پیر تھا۔ اس کے لیے اس کے

ساتھ ساتھ بھاگی تھی۔ ربیعہ اپنی پوری برقرار سے بھاگ رہی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ!“ آواز اس کے قریب تر آتی تھی جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔
تب ربیعہ نے دیکھا۔ تارکول کی سیاہ سرک کے آخری کونے پر کوئی کھڑا تھا۔ ربیعہ غصہ مچی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا

جیسے ربیعہ کے انتظار میں ہو۔

”ربیعہ!“ اس نے بائیں پھیلا کر۔ ”آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس۔“

ربیعہ اپنی جگہ رُک کر آنکھیں پیرا بھاڑ کر دیکھنے لگی۔
”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب بولا تھا۔ ربیعہ کو اپنی گردن پر کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ اس

کے لبوں سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔
”تبی! تبی! آؤ۔ آؤ۔ کھل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس نہایت تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور پورا جسم کھینچ پھینچ رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منہ و ہیکہ تنہا وہاں سے چلتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ”ربیعہ! کیا ہوا؟“
”میری بی۔۔۔“ وہ اس سے گٹ کر رو پڑی۔ ”اکی۔“

”ربیعہ! میری بی۔۔۔ کیا ہوا؟“ وہ ریشہ ریشہ ہو گئی تھیں۔

چند لمحوں میں ہی عمار اور انقہ بھی چلے آئے تھے۔ وہ سب اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ان سب کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے اوسان اس کے قباؤں میں آئے تھے۔ انقہ نے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس بھر کر

دیا۔ وہ ایک کی سانس میں لپکی تھی۔
”تورا! تورا! خوں کی کھانچا؟“ عمار اس کا چہرہ دیکھ کر بولا تھا۔

”ہمت دن لو۔“ اس نے رازنی آوازیں کہا۔ ہمت دنوں کے بعد مجھے پھر۔۔۔ پھر۔۔۔“
”کیا مطلب پھر۔۔۔“ انقہ حیران ہوئی۔ ”کوئی کہہ رہے خواہوں گی؟“

ربیعہ نہ چاہے ہوئے بھی بدھم سا مگر لپکی تھی۔
”تا نہیں انقہ! میری لپکی ہے۔ اب اس کے انتقال کے بعد سے ایک عجب سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں ہر

دوسرے دن ایسا ہی کوئی غریب دیکھتی تھی۔ سچی داری نظر آتی تھی، ایسی ایک تاریخہ شخصیت کا واضح احساس ہوتا تھا۔
”خوف اور صرف خوف محسوس ہوتا۔“

وہ میوں حیران سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔
”اب لوگوں کے پاس آئے بے ابدان خواہوں میں کی انجی تھی پھر یہ سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا تھا لیکن آج

پھر اتنے دن کے بعد۔“
”تم کو تو میں تمہیں باہر نفسیات کے پاس لے چلوں گا؟“ عمار ہر دلی سے بولا۔

”اے تمہیں عمار بھائی!“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔ ”جو کچھ آپ لوگ کرتے ہیں میں اسی کا احسان نہ آتا پاؤں گی۔“

ساری عمر۔“ عمار ناراض ہوا۔ ”تم ہماری عینوں کو احسان شمار کرتی ہو ربیعہ! ہم سب تو بھول چکے ہیں کہ تم کوئی احسان؟“

آؤت سائز رہو! اس کے لیے تم تیری بیٹی اور میرے لیے تیری بہن۔“
”عمار! تم کھک رہا ہے۔“ منہ و ہیکہ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور یہ بات تم بھی جانتی ہو بلکہ ہم سب

جانتے ہیں کہ تم بھی ہمارے لیے ایسی ہی سچے جذبات رکھتی ہو۔“
”اتھو یہ احسان وغیرہ کی بات میں نہ سنو۔“ عمار بولا۔ ”اور کل شام میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر سے

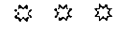
”ضرور۔“ انیہہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ عباد اور منجھڑہ بیگم باہر نکل گئے تھے۔

”ابھی میں دُعا کی طور پر پیار میں پیر۔“
 ”حقہ ہے۔“ ہاشم کے حوے، جسے ہار کے آثار نظر آنے لگے۔

ہو گئے۔ وہ چائے بنائے بغیر پلٹ گئی۔ میز پر وہاں چڑھتے ہوئے وہ عجیب سی ذہنی حالت کا شکار تھی۔ سر کے تین ڈاں
 نوکر وہ ہاسٹم کی جانب بڑھی۔

تھے ”ٹھیک ہے شہلا! مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں مجبوری کا قائل نہیں ہوں۔ مجبوری کا بار بس محبت میں اٹھانا ٹھیک ہے۔ تم جب کسی منطقی نتیجے پر پہنچو، مجھے صرف آگاہ کر دینا اور ہاں نہیں کسی راز کو خفیہ رکھنے کا پابند نہیں تھا۔ میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ تم اپنا ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو کہ میں یہ سب کسی سے کہہ سکتا ہوں۔ بدل کی شکست کا اظہار رات آسمان میں ہوا کرتا۔“

”مجھے تھکے انداز میں کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ شہلا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سرکار دوبار اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے سرخام کر رہی تھی۔“



”سنا رہا ہو ربیعہ؟“ عمار نے دستک دیتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔

ربیعہ جو اپنا دوش ٹھیک طرح سے اٹھ رہی تھی چونکا کھٹی۔

”جی عمار جانائی! میں تیار ہوں۔ ویسے آپ سے حد تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مجھے ان غفلتوں سے باز رہنا پڑیگا۔“

”تم خود جو بہت بڑی باہر نفسیات ہو۔ چلو فافٹ باہر آ جاؤ۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں۔“ دبا ہر نکل گیا تھا۔

ربیعہ نے ایک نظر آئینے پر ڈالی پھر اپنا ایک اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

فرشتہ دور کھول کر وہ بیٹھی تو عمار نے گاڑی اشارت کی۔

”میں رستے میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا ہو گا۔“ عمار بولا۔ ”ڈاکٹر کا نام آٹھ بجے سے ہے اور ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔“

”دیکھیں ہم اتنی جلدی کیوں نکلتے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیونکہ مجھے امیر حسن سے ملنا تھا، انہیں میں میرا منتہی ہو گا۔ تو مجھے کتنے کی منگ ہے پھر تم سیدھے ڈاکٹر کی طرف چلیں گے ٹھیک؟“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسی سے بولی۔

امیر حسن کی کنبی کا آتش شہری مشہور و معروف بلڈنگ میں تھا۔ ربیعہ اس کا آتش دیکھ کر متاثر ہوئی۔ امیر حسن یقیناً کتنا زائد مزاح کا بندہ تھا۔ اس نے اپنا آتش بہت دلکش انداز میں سجایا تھا۔ دیواروں کا رنگ اور فرنیچر کی طرز اس کی بہت زبردست اور نمایاں جدید تھی۔ جبکہ جگہ انداز پر لائٹس ایسی ترتیب دیے گئے تھے کہ ہر جگہ ہر چیز میں ایک خاص تناسب اور حسن نظر آتا تھا۔ ربیعہ ہر ہر چیز کا بہت خوبو کرنا جڑ لے رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“

ربیعہ چونکی۔ امیر حسن پر غلوس مسکرا ہٹ کے سامنے ان کا استقبال کر رہا تھا۔

عمار نے بڑبڑا کر انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔ ربیعہ نے بھی مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آپس پلینز۔“ وہ انہیں لے کر اپنے کمرے کی جانب رہہ گیا تھا۔

انہیں ہٹا کر اس نے آتش کا ہر کالی کا آؤر دیا پھر ان کو گول کی جانب متوجہ ہوا۔

”اور مس ربیعہ! آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔ جوت کا کیا حال ہے؟“ وہ غفلتی سے اس کا احوال پوچھنے لگا۔

”وہ۔۔۔ آپ کو اب تک وہ حادثہ یاد ہے۔“ ربیعہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”میں تو اسے بھول بھی چکی ہوں۔ جوت کا احوال کیا سناؤں۔“

”پارک جانے میں احتیاط کیا کریں۔ کیا خبر کتنے کو اب تک یاد ہو۔“

ربیعہ اور عمار جن سے ملے تھے۔ ربیعہ کو انہوں نے ہوا کہ وہ یہ حد شفقت اور دل چسپ شخصیت کا حامل نوجوان تھا۔ کچھ دیر اور اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد امیر حسن اور عمار اپنی بزنس کی باتوں میں مگن ہو گئے۔ ربیعہ انہیں کی اشیاء پر نگاہیں دوڑاتی رہی۔

اچانک ہی اس کی نظریں امیر حسن کی سائز ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر جا کئی تھیں۔ وہ تصویر ایک جوان شخص کی تھی۔ تجا نے اس کے چہرے میں ایسی کیفیات تھیں ربیعہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ ایک تک وہ اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس چہرے اور ان نگاہوں میں ایک متناظر طبیعت تھی۔ ربیعہ اس بے غنا طبیعت کا شکار ہو گئی۔ اس کے سامنے رکھی کالی ٹھنڈی ہوئی۔ امیر حسن اور عمار کی گفتگو اختتام کو پہنچ رہی۔ ربیعہ اسی کیفیت میں بیٹھی وہ تصویر دیکھتی رہی۔

عمار اب وہاں سے چلے گئے۔ وہ نے الوای مصافحہ کیا پھر عمار نے چونک کر ربیعہ کو دیکھا۔ امیر حسن کی نگاہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کافی کے پھرے کپ پر پڑی۔

”ربیعہ! دونوں کے لبوں نے ایک ساتھ نکلا۔“

ربیعہ بڑی طرح چونکی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“

”کمال کوئی ہوئی ہو تم؟“ عمار حیران تھا۔

”میں یہ تصور کرتا تھا کہ اس نے غائب نہ ہوئی۔“ وہ تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ تو شہلا کی تصویر ہے۔ امیر حسن نے کہا۔“

”آپ کو اس تصویر میں کیا لگتا ہے؟ کیا آپ نے اس سے پہلے اسے دیکھا ہے؟“

ربیعہ جیسے کسی گری سوچ میں گم تھی۔

(باقی اہل شاہدہ آئندہ وار)

Photo.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ

4 خوبصورت و مقبول ناول

☆ **میر خوب رہہ ریزہ** ماہانہ 300/- * **لاما سٹل** عیدہ احمد 180/-

☆ **آگ دیا جلانے لگنا** ماہانہ 300/- * **شہر کے دوڑنے والے** شانہ چوہی 300/-

چاروں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فرمیں

خوبصورت پروق، خوبصورت چھپائی، مضبوط جلد، آفست پیپر

شائع ہو گئے ہیں

آج ہی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں

37 اردو بازار، کراچی

2216361 فون

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

”ربیعہ! عباؤ نے اسے ملافت سے نکال کر ربیعہ چوکی۔
 پھر وہ ان دونوں کو لیکر غائب صاف سے گھر گئی۔
 ”پتلیں“ اس نے عباؤ سے پوچھا۔
 ”میں نے بتایا نہیں ربیعہ! امیر حسن نے تجھ سے جسکی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔
 ”کیا؟“ پتلیں نے پوچھا۔
 ”جی! کہ شیری کی تصویر میں آخر آپ کو ایسی کون سی غیر معمولی بات محسوس ہوئی؟ آپ اس طرح گرد و
 پیش سے بے خبر کیسے ہو گئیں؟“
 ”ربیعہ چندے سے غور کر رہی تھی اس نے بے جا چارگی سے کانڈھے اچکا دیے۔
 ”میں خود نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن اس چہرے میں ایک مقناطیسیت محسوس کی میں نے۔ ایک عجیب سی کشش
 ”شیری! کبھی پاکستان نہیں آیا۔“ امیر حسن دم سا مسکرا کر بولا۔
 ”آپ بھی پاکستان سے باہر گئے ہیں؟“
 ”نہیں۔ کبھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”بس پھر اتنا تو طے ہے کہ آپ لوگوں کی بھی ملاقات نہیں ہوئی؟ بانی اگر دور پر ہے کی کوئی رشتہ داری نکل
 آئے تو کیا بات ہے۔“
 ”تینوں نفی میں دے رہے تھے۔
 ”یہ ربیعہ دیکھ ہی سمجھ گئے۔“ عباؤ نے انگلی کو کچھنی کے پاس لا کر گولائی میں گھمایا۔ ”اس کی باتوں پر اتنا
 وحیان مت دو۔“
 امیر حسن نے لگا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ان دونوں کو کسی آتش کرتے تیار کرکے آیا۔
 ”آپ جاب و غیر جاب انٹرنیٹ میں ہیں؟“ عباؤ پارکنگ گاہ پر اسے گاڑی لائی لیا تو امیر حسن نے گلاسز کے پیچھے
 چھپی نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”جاب؟“ ربیعہ حیران سی ہوئی۔ ”میرا ایم اے ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔“
 ”اگر اسے ضروری نہ سمجھا جائے تو؟“ وہ دم سا مسکرایا۔
 ”تو۔“ ربیعہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ ”خوشیاد میں اپنا کلام ابھی طرح سے نہ کر سکیں گی۔“
 ”خوبصورت مفذرت ہے۔“ اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔
 ”آپ کی گاڑی آگئی۔“
 ”ربیعہ نے دیکھا۔ عباؤ اس کے انتقال پر تھا۔
 ”اللہ حافظ! وہ دیکھ سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔
 امیر حسن کے لب۔ آہستہ سے ہلے تھے۔
 لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو فریڈس بیگر کو ساٹھویں بیٹھا ہوا پایا۔
 ”السلام علیکم۔“ ہر طرف کیسین بیئر پر رکھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں حدود چھٹاوت
 تھی۔

شملہ کی جانب سے کسی رو عمل کا اظہار نہ ہوا۔ ہاشم زور تک مردم میں ٹھس گیا۔ چند محلوں بعد وہ اپنا گھوڑا بٹے برآمد ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا، ایک اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ شملہ کی پوزیشن میں رہی پھر تہہ پل نہ آئی تھی۔ ہاشم بے ساختہ اس کی جانب بڑھا۔
 ”شملہ! ہاشم نے اسے کانڈ سے پکڑ کر سیدھا کیا پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔
 شملہ کا جسم تیز بخار میں چمک رہا تھا وہ تقریباً ”تیمپے ہوش“ تھی۔
 ”شملہ شملہ! آنکھیں کھولو۔“ ہاشم نے اسے زور سے بلایا۔
 پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا، شملہ کو بازوؤں میں اٹھا کر وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔



”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ کئی دنوں سے حالت فاقہ میں تھیں۔ انہوں نے کب سے کچھ کھایا یا نہیں ہے؟“ اسے اجاس ہو رہا تھا جیسے شملہ کی اس حالت کا ذمہ دار وہی ہے۔
 ”آپ کے درمیان کوئی کشیدگی ہے؟“ ڈاکٹر سلطان نے اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔
 ”جی؟“ ڈاکٹر کی طرح چونکا ”کشیدگی؟“
 پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ ”ہاں، ذلیل شایہ۔“
 ڈاکٹر نے اس کی کیفیت سے انذوری کوئی مطلب افہام کیا پھر اس کا شانہ جھنجھٹا یا۔
 ”میاں ہیو کے درمیان کبھی بھی سیدھا راستہ نہیں ہوتا بیٹے۔ ایک ڈنگ ڈنگ سے یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ بے تحاشہ توقعات بے تحاشہ شہادت۔ لیکن یہ جی جی جی جی لے پھر ڈنگ ڈنگ سے بدلاؤ ایک خوبصورت موڑ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“
 ہاشم کو گواہ کا شکار پانی ہی سوچوں میں گم کر رہا تھا۔ اس نے پچھلے ڈاکٹر سلطان کی جانب دیکھا۔

”جی۔“
 ”آپ اتنا کٹلی فٹل منت کرو۔ خواتین کو ذرا سی بات پر کھانا پینا چھوڑ دینے کی بیماری بہت پرانی ہے۔“
 مسکراتے تھے۔
 ”ڈاکٹر شملہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انجکشن بھی دیا ہے۔ یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! انجیکشن پورے ٹھیک ہو۔ سوچ۔“ وہ بہت ممنونیت سے بولا۔
 وہ اس کا شانہ جھنجھٹا کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر سلطان اس کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے گھرانے کی ان سے برائی شناسائی تھی۔ اسی لیے ہاشم شملہ کو ان کے کلینک لے آیا تھا۔ اس نے شملہ کے گھر کسی فرد کو بھی اس بات کی خبر نہیں دی تھی۔ اس کے اپنے گھر میں بھی کسی نے اسے شملہ کو لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
 دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا وہ شملہ کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ پرسکون انجکشن کے زیر اثر غونگی میں تھی۔
 ہاشم نے اس کے پکھلیوں سے رکھے ہوئے نرم ہاتھ کو اپنے آنکھوں میں لے لیا۔
 ”آپ کا تھک فٹل مت کرو۔“
 ڈاکٹر سلطان نے اسے کہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہاشم اس وقت سخت پیشانی محسوس کر رہا تھا۔ کتنے دن

ہوئے اس نے شملہ کے حال سے واقف نہ بنا چھوڑا ہوا تھا۔ عمر کے چلے جانے سے اس کے دل پر قیامتیں بیت گئی تھیں۔ وہ غم سے نوٹ بیٹھ گئی تھی۔ لیکن ہاشم نے اس کے گے دل پر اپنی محبت کے اظہار کا مزہم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اسے وہ منظر صرف ابرار کی فاقہ خانہ مسکراہٹ کے حوالے سے یاد آ رہا تھا۔ اسے شملہ کی آنکھیں یاد نہ آتی تھیں۔
 پچھلے رات جب شملہ نے اسے دیکھا تھا تب وہ کس قدر شک و شبہ دل لگتی تھی۔ اس نے فردوس بیگم کے خراب رویے کی شکایت کی تھی تب ہاشم نے اس سے کتنا شک و شبہ رہا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں غمی اثر تھی۔
 وہ بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اس نے شملہ کی ہند پکوں کو دیکھا۔ اس کے زور چہرے کو دیکھا۔ وہ کتنی کمزور ہو رہی تھی۔ تجاہے اس نے کب سے کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ وہ اکثر شدید سرور کی شکایت کرتی تھی۔
 اس نے اسے قابل نوچ نہ جانا تھا۔

”شملہ! شملہ! آئی ایم سوری۔ آئی ایم سوری سوری۔“ وہ بڑبڑاتا۔ ”محبت کرنے والے یقیناً ایسے نہیں ہوتے۔ تم نے میری دعوے کو چھوڑ دیا ہو گا۔ تجاہے کس بات پر یقین کر کے تم میرے ساتھ چل پڑی تھیں۔ اوس میں نے دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہیں دیا۔“ اس نے شملہ کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔
 ”میں نے اپنے ہی اندیشوں کا شکار ہو گئی تھی۔ چند ہی رستہ ڈھونڈا رہا۔ تمہارے رستے میں بڑے پتھروں کو چھنا بھی میرا فرض ہے میں نے نہیں سمجھا۔ میں نے یہ وہ نہیں لکھا تھا جس کا میں نے تم سے دعوایا تھا۔ یقین جانو۔ اتنا غصہ رکھنا کہ میری محبت میں تمہارے لیے آج بھی وہی شدت ہے۔ وہی حدت ہے۔ وہی خلوص ہے۔ وہی جی جی جی جی ہے۔ سارا جی جی جی جی صرف تمہارا ہی جانب آتے ہیں۔“
 اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے شملہ کا ہاتھ محسوس کیا تھا۔



”مہمانہ مہمانہ۔“ مومن نے زور سے اس کا شانہ پینا۔ تب وہ چونک گیا۔
 ”جی میٹا۔ بولو۔“ اس نے کھولی کھولی آنکھوں سے سینے کا چہرہ دیکھا۔
 ”مہمانہ۔ میرا دل گریں کا رہے۔ آج میں برس گیا۔“ مومن نے ایتقان کی سمت کارڈ اور پین بڑھایا۔
 ایتقان نے دونوں چیزیں غمازیں اور کارڈ کھول کر ”پیرس سسٹم“ جو ”کے خالی خانے میں دستخط کر دیا۔
 ”جی بولو۔“ مومن نے مومن کو کارڈ واپس کرنا چاہا۔
 مومن نے کارڈ نہیں لیا۔ وہ بجلی آنکھوں سے ایتقان کا چہرہ دیکھا۔
 ”کیا بات ہے؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
 ”آپ نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ دم سرا ہوا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ ابھی پچھلے گئے ہی سمجھ رہی تھی۔

اس مرتبہ اس نے کارڈ دوسری ہی نظر سے دیکھا تھا۔ پورے کارڈ پر نظر دوڑاتے ہی اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔
 ”مومن۔ مومن۔“ وہ بات اڑ دیا۔ یہ یہ پورے گریں ہے تمہاری۔ اتنا خراب کاہنہ اتنے برسے لگا رہا کس۔“
 وہ خاموش کھڑا با کافارہا ایتقان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں اتنی ذہنی ٹینشن میں بھی تمہیں پڑھاتی ہوں۔ تمہارا کام چیک کرتی ہوں۔ تمہیں یاد کرواتی ہوں۔ پھر بھی تم نے اتنے خراب میسٹ دیے کیوں۔ کیوں مومن؟ باپ نے کیا کم احسان کیے ہیں میری ذات پر جو تم بھی مجھ ناتواں کو جلائے پر مل گئے ہو۔“

”آپ اب اس طرح نہیں پڑھائیں جیسے پڑھایا کرتی تھیں۔ وہاں اپنے گھر میں۔“

”وہ گھر اب اپنا نہیں ہے۔ اپنا گھر یہ ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ سمجھے تم؟“

”جی نہیں“ میرا گھر وہی ہے۔ میرے پیار والا۔ یہ گھر آپ کے پیار کا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہٹ

دھری سے بولا۔

ایقان نے غور سے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا۔

”ٹھیک ہے“ پھر وہ ٹھنڈے سبجے میں بولی۔ ”اپنی ماما کو چھوڑ کر چلے جاؤ وہاں دیکھو تمہیں وہاں اپنے پیار سے

ہیں یا نہیں۔“

”جا بھی سکتا ہوں۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔ ”عمر بھی اپنی ماما کو چھوڑ کر اپنے پیار کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ وہاں

بہت خوش ہے۔ اس کے پیار بھی بہت اچھے ہیں۔ میں بھی اپنے پیار کے پاس خوش رہ سکتا ہوں۔“

ایقان کا غصے سے برا حال ہو گیا اس نے کچھ کر ایک پھیڑ اس کے گال پر جڑا پھر دو سرا پھیڑ او سرے گال پر مارا۔

”تم سب کے پیار بہت اچھے ہیں تمہاری مائیں ہی خراب ہیں۔ ان کے نصیب جو خراب ہیں اپنے لبوں کی

بوندوں سے تمہارے جسم پر آئے۔ تمہیں جنم دیا۔ تمہارے لیے راتوں کو جاگے۔ خون جگر پلا کر تمہیں اتنا کیا

ہے ہم نے۔ چلے جاؤ اپنے باپ کے پاس جو ان ہو کر بھی تم نے یہی کہنا اور یہی کرنا ہے۔ اس لیے ابھی چلے جاؤ

تو بہتر وہاں جس گوری ڈائن کو اس نے سر پر بٹھایا ہوا ہے نا وہ تمہاری اوقات کا پیار ہے گی۔“

وہ خود بھی چیخ کر رونے لگی تھی۔ مومن ہوا مار کھا کر بڑی طرح رو رہا تھا۔ اب اس کے رونے سے سم کر

خاموش ہو گیا اور اس نے دیکھ کر کہا۔

ایمان اندر سو رہی تھی ان کی آوازوں سے ڈر کر جاگی اور بھاگی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب ایقان کی آواز میں اس کی

آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے رافع کے لیے یہ منظر ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا وہ انتہائی تیزی سے

اندر آیا۔

”پھپھو۔۔۔ پھپھو کیا ہوا ہے؟“ اس نے بلکتی ہوئی ایقان کو کاندھے سے لگایا، دو سرا بازو بٹھا کر ایمان کو سمیٹا۔

”رافع! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں، وہ بے ایمان شخص کسی اور کا ہو گیا۔ میری اولاد بھی

اسی کی ہے۔ یہ بچے اسی کے ہیں رافع! اسی کو دے آؤ۔ مجھے زہر لاؤ۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے تھوڑا زہر

لاؤ۔“

”پھپھو۔۔۔ پھپھو۔۔۔ سنبھالیں خود کو۔ خدا کا واسطہ میں آپ کو رتنا ہوں۔ اتنی کم ہمت نہ بنیں میں تو آپ کو بہت

اسٹرانگ سمجھتا تھا پھپھو۔ بہت برابر اور نڈر۔ آپ اتنی کمزور کیسے ہو گئیں؟“

”کوئی عورت بہادر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں

کہا۔

”کیسے ہو سکتی ہے بہادر۔ مٹی سے نہیں جذبات سے بنی ہے عورت۔ ذرا سی تیش سے پکھلنے لگتی ہیں۔ چاہے

تیش غم کی ہو غصے کی ہو یا محبت کی اسی لیے تو اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہے کم بخت۔“

اس نے اس طرح دانت پیس کر کہا کہ رافع کو ایسے موقع پر بھی ہنسی آگئی۔

”مت ہنوز میری یہ چار پرگے ہیں اس وقت بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔ ایسے یہ مومن جس کی آواز سے میری کھمبہ صبر شام بولنے سے یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہاں اپنے باپ کے پاس کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ باپ کیسے بہت کچھ ہے۔“

وہ چمچ بھری مومن اب سخت نامرد نظر آتا تھا۔

رافع نے مومن کو اشارے سے قریب بلایا۔ جب سے رومال نکال کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ ایمان کو چہرہ پر کر کے اس کے بال سنوارے پھر ایمان کا ہاتھ مومن کو تھمایا۔

بچوں کا موڈ لمحہ بھر میں بحال ہو گیا تھا، دونوں اپنی پسندیدہ چیز کا نام سن کر فناف و ڈو ڈو گئے۔ رافع نے ایتقان کا ہاتھ سا چھوڑ دیا۔

”عورت کی مسکراہٹ اور خوشی مرد کی دین ہے۔ رافع! آج نہ تو اور آج نہیں کسی ایسی کی سوغات ہیں۔“

”عورت مرد سے سب کچھ لے سکتی ہے پچھیدو۔ اپنی مرضی سے جو لینا چاہے۔“ وہ آہستگی اور نرمی سے بولا۔

معاذے میں سراسر آپ ہی قصور وار ہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ غلطی آپ کی بھی گئی ہے۔ کیا آج اپنے بچوں کو اس طرح زربالکنا دیکھ کر بھی جو کچھ ہوا اس پر آپ نظر ثانی نہیں کریں گی؟

”سو بے بازی نہیں کر پائی۔ باقی جو کچھ ہوا جو کچھ ہو رہا ہے۔ ثانوی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے، بچھو۔ آپ کی سوچ غلط سمت میں جھٹک گئی ہے۔ اسے سیدھا راستہ دکھائیے۔“

”آپ بہت کمزور ہیں۔ بچھڑو!“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”مومن کو اس طرح جوتا دکھ کر میرے دل پر

”تو میں کیا کروں رافع؟ کیا کروں؟ اس کے باب کے سامنے روؤں۔ گڑگڑاؤں۔؟ اسنے بھول کے لیے شفقت

وہ چینی تھی۔ رافع بن ہوکروہ گیا۔
 ”یہ سب کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

ایقان چند قہوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔
 "میں نے اس سے طلاق مانگنا ہے۔" پھر وہ ایک نوجوان انداز میں بولی۔ "میرے پاس دس سڑا کوئی آپشن نہیں ہے۔"

”قلمیوں نے ہلکے سے دو تہائی کر دی ہے تو کم از کم آپ تو عقل گت رہیں۔ یقین جانیں ایک دن انہیں ضرور اپنی ناپیوں کا احساس ہو گا۔ یہ سمجھئے ان کے دل کو کوئی جاننے ضرور موڑیں گے۔ ورنہ آئیں گے۔“

”آپ مجھے ان کا فلسفہ کیسے سمجھ دیں۔“ رافع نے بالآخر مایوس ہو کر کہا۔
 ”میں اسے ہی نہیں آتا تھا۔“

”میں ہر حال ایسا نہیں چاہتی۔“ اس نے سر جھٹکا۔
 ”اور تمہیں مجھ سے ہمارے لئے کی ضرورت پیش ہی کیوں آ رہی ہے۔ سہلے تو تم اکثر اس سے بات کیا کرتے

کئی ہے۔ موبائل نمبر چسپی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دوسرے شہر یا شاید دوسرے ملک شفٹ کر چکے ہیں۔“

۱ رافع جو مزید کچھ کہنا چاہتا تھا رک گیا اور ایتقان کی پھیلائی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر وہ دیکھ سے مسکرا دیا۔
 ”ان لڑکھوں میں تو اب تک ان کے نام کا شر آباد ہے پھیلاؤ آپ کیوں خود نے ان سے سب سے جھوٹ

بول رہی ہیں؟

ایقان نے یکدم ٹکا ہوا چرائی تھیں۔

”شہر آباد تو نہیں ہے رافع۔“ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”برادر ہو چکا ہے۔“

”نہیں۔“ چپکوتے چپکوتے ایسا نہیں ہے۔ ”وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔“ میرا یقین تھکے بہت کمہ رہا ہے۔ ”وہ جانے کے لیے آگے بڑھا۔

”رافع۔“ ایقان کی سرگوشی نے اس کے قدم روکے تھے۔

”جی۔“ اس نے سر نہ کرنا دیا۔

”دوبہ کہاں چلا گیا؟“

رافع چند لمحوں کے بعد دیکھتا رہا تھا۔

”ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ڈونٹ وری۔ لیکن اتنا ہے کہ خود کو سمجھانے کی کوشش کریں۔“ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ لیجئے ایسا۔“ ایقان نے اسے پائن اپیل جوس کا گلاس تیار کیا۔ ”بالکل فریش خرام دی فارم ہے۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

شملہ نے گلاس لیوں سے لگایا۔ ساتھ ہی اس کی نظر زور سے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہاشم سے لگرائی۔ نجانے ان نظروں میں کیسے جذبات پوشیدہ تھے۔ شملہ جینپ سی گئی۔

”ایقان۔“ ہاشم کے لیے بھی جوس لے آؤنا۔ ”وہ اپنے اپنے کھانا کھا رہے تھے۔“ ایقان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہاشم بھائی نے جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ربیعہ ان کے لیے جانے بنا رہی ہے۔“ وہ محبت سے اس کے چہرے پر تسکین بٹانے لگی۔ ”اور آپ نے اپنا کھانا خالی بنایا ہوا ہے؟ یوں لگ رہا ہے جیسے برسوں سے تیار ہوں ہاشم بھائی! آپ انہیں کچھ بھی نہیں کتے نا؟“ ایقان ہاشم کی جانب متوجہ ہوئی ہاشم نے مسکرا کر فری میں سر ہلایا۔

”بہت بری بات ہے۔ کما کر میں نا۔ بلکہ ڈانٹا کریں۔“

”یہ تو اسے بس کی بات نہیں۔“ اس نے بے جا کر کے کہا۔

”بہت مشکل کام ہے۔ ایقان، شرارت سے پوچھنے لگی پھر زور سے ہنس دی۔

ماحول قدرے شگفتہ ہو گیا تھا۔ ہاشم بھی کی چاہتا تھا وہ ہسپتال سے شملہ کو میس لے آیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول شملہ کو مزید فیش کر سکتا تھا۔

منیوہ بیگم نماز پڑھ کر آئی تھیں۔ وہ شملہ پر دم کرنے لگیں۔ ربیعہ بھی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”گناہ ہو گیا میری بچی کو۔“ منیوہ بیگم پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں ایس۔ ایس۔ ایس۔“ شملہ نے جواب دیا۔ ”شملہ نجانے کیوں اس ذکر سے شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

”مت سوچا کرو اتنا۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”اتنا اچھا شریک سفر ملا ہے خدا کا شکر ادا کرو۔ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ کچھ بھی تمہاری دسٹر سے دور نہیں ہے۔“

شملہ قدرے خاموش سی ہوئی تھی۔ ہاشم ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہر انداز کو، ہر رنگ کو

مجھے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاشم بھائی۔“ چائے۔ ”ربیعہ کی نرم آواز پر وہ چونکا۔

”آپ کی ایک ٹیکہ ہیں۔ اتنا غور پھر سکی کر سکتے گا۔“ ربیعہ کو بھی شرارت مچ گئی۔

سب ہی ہنس پڑے تھے ہاشم قدرے شرمندہ ہوا۔ شملہ بھی جینپ سی گئی۔

”مہم۔“ خوشی سے چپکتی ہوئی آواز پر سب ہی چونک اٹھے۔

سب نے ایک ساتھ دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ وہاں عمر کھڑا تھا۔

”عمر میری جان۔“ شملہ کے وجود میں، بچیاں سی بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب لپکی۔ دونوں ماں بیٹا بے

ثبات سے لپکے تھے۔ شملہ نے ہار بار اسے جوا۔

”میرا بچہ۔“ میری زندگی۔ کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ہفتہ ایسے گزرا ہے جیسے روئے کی بغیر جسم۔“ وہ مسلسل

دل رہی تھی۔

”ہاشم۔“ ایقان کو لگا ہے یہاں مجھے پہلی بار کپڑے کر دیا ہے۔ وہ بہت اوپر تک فلائی کرتا ہے۔ ریکوٹ سے چلنا

ہے میں لے کر آیا ہوں۔“ ایقان آپ کو دکھاؤں۔“

شملہ کے انداز سے پتہ چلا کہ عمر اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔

”ہم کس نام سے۔“

”بعد میں دیکھیں گے بیٹا! پہلے سب سے مل توں تاکو سے ملو۔“ حالہ جانی سے۔

عمر نے کمرے میں موجود اوپر پر غور کیا پھر خوشی سے نکل اٹھا۔

”آپ اسے آپس میں لے کر آئے۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔

”ہاشم نے اسے اس کے ہاتھ میں لے کر لایا۔“ اسے اٹھا کر اس کے قریب لایا۔

”یہاں یہ پہلی بار کپڑے لے آئے۔“ وہ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

”ارے تو تک ہیں؟“

شملہ اپنی لپ ہوئی ہاشم نے نوٹی سے ارادہ کر لیا تھا اس کے دل میں کچھ تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔

”آپ دیکھیں گے میرا بچہ کیل کاپر؟“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”میں آپ کو اڑا کر دکھانا ہوں۔“ وہ ہوش ہو کر بھاگا تھا۔

ہاشم اس کے پیچھے نکل دیا تھا۔ شملہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ منیوہ بیگم ربیعہ اور ایقان ایک دوسرے کی

بندوبست کھینچنے لگیں۔

”یہاں سب کچھ سیٹ ہے۔ بالکل پرفیکٹ! اس اب بہت اسیو تھلی اشارت لیتا ہے۔ بہت اچھے طریقے

ہے۔“

وہ ہاتھ روپ لیٹ، بالکل میں کھڑا بہت نیچے نظر آتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کان پر کاؤلیس لگا تھا جب کہ کافی کا

کرکٹ بالنگنی کی ٹیوایر پر لکھا ہوا تھا۔

”میں بہت زیادہ ہوں شیری۔ یہاں کی مارکیٹ میں بہت مارجن سے ہمارے لیے۔ پھر خدا کے فضل سے

بلند تر بھی بہت اچھا ملا ہے۔ عبادت عمر و انسان ہے۔ میں بہت پسند کرتے لگا ہوں اسے۔“

اں ہوں اس کی۔ بہت خفا ہے وہ ہم سب سے۔ کچھ کہتا نہیں لیکن دل ہی دل میں گڑھ رہا ہے۔
 ”کس پر؟“ ”سردو حیران تھی۔“

”ایک تو بے چارے کے سرزدستی کا سہارا بندھ رہا ہے۔ صرف رافع کی خدکی دیتا ہے۔ اگر رافع راضی ہو جائے تو یہ سب کچھ نہ ہو۔ دوسرے عیشہ کے رویے کی سب ہی شکایت کرتے ہیں۔ وہ بھی شہزادہ ہے۔ تابع بہت نہیں ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن کچھ باتوں کی تو ایک پینڈورا کھسکل جائے گا۔ جو میں نہیں چاہتی۔“ وہ ہلکے جھوڑ کر افسردہ ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

”عیشہ کو صرف فینٹسی تنگ کر رہی ہیں شہزادی کے بعد جو دوست ہو جائے گی۔“ ”مافیہ نے لکری سے بول۔“
 رافی بات تابع کی تو ابھی اسے اس بات سے شرمندہ محسوس ہو رہی ہے کہ جھوٹا ہونے کے باوجود پہلے اسے دو لہا بنا جا رہا ہے۔ وہ ان بعد دیکھنے لگا جیسے کل جاری ہوں گی۔

”چپ کر۔ بد تمیز!“ ”سردو دہاں کے سامنے ایسی بات سے جنپٹ گئی۔“

”عذرا ابھر لکرمند کی بیوی تھی۔ آج کل اسے بات بے بات ہی آتی تھی۔“
 عذرا ابھر لکرمند کی بیوی تھی۔ تابع کسی طرح فکری سے اٹھ کر گیا تھا۔ انیس سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔ مافیہ اور سردو عیشہ کے لیے شگون کے ڈھول بک رہے اور دیگر سامان کی بیچلنگ کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سوچی رہیں پھر اٹھ کر باہر نکلی۔ وہ لاؤن سے باہر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ عذرا ابھیم اس کے قریب آئیں۔

”کیا سوچ رہا ہے میرا بیٹا!“ وہ محبت سے پوچھنے لگیں۔

”میں کیا سوچ سکتا ہوں ای! وہ سمجھ رہی ہے بولا۔“ ”اور مجھے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

”کیوں؟“ ”وہ سوال ابھی نہیں۔“
 ”اس لیے کہ میرے بارے میں سوچنے والے کے لیے متعلق فیصلہ کرنے والے مجھے ہر فیصلے سے آگاہ کرنے والے بہت لوگ ہیں یہاں۔ میں کچھ سوچ سکتا ہوں گا۔“

”تابع! تم ناراض ہو ہم سب سے؟“ ”مجھ سے؟“

”رافع نے بے اختیار رافی اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔“

”میں ای!۔۔۔ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں آپ سے ناراض ہو بھی نہیں سکتا۔ بہت کچھ کر گزرا۔“
 ”لیکن آپ کا خیال کیا ہے؟“ ”انہوں نے جب کہ اس کے بالوں پر ہوسہ دیا۔“ ”ماں کو خوش رکھنے والے۔“

دیکھنے کے منتہی بیٹھ خوش رہتے ہیں۔ تابع! ”باد رکھنا“ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“
 ”لیکن اندیشہ تنگ کرتے ہیں ای!۔“ ”وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔“ ”آپ نہیں جانتے تھے۔ منتہی سے نکاح اور نکاح سے اب تک کا وقت بہت ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں تابع!“ ”نکاح کی ساس بھر کر لیں۔“ ”ماں ہوں تمہاری کیا پوشیدہ روکتی ہے تمہاری بے چینی سب سے؟“ لیکن میرے بچے! مشترکہ خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے بہت سے دریا پار کرنا ہوتے ہیں۔

”میں ہی اچھی باتوں پر مہر کرنا رہا ہے۔ ہونٹ سے رہنمائی عقل مند ہی ہے۔“
 ”عقل مند؟“ ”زندگی ہی بڑا کوسہ ماں؟“ ”چہرے؟“ ”اس نے قدرے طنز سے کہا۔“

”میں یہاں آیا نہیں ہوتا۔ مہر کا پھل بیٹھائی دکھاتا ہے۔ بس امید ابھی رکھو۔“
 ”وہ میرا ساتھ یا کہ بہت ناخوش ہے ای!۔“ ”وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔“ ”کیا امید رکھیں؟“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا۔ امیر حسن نے بلند آہنگ قسم دے لیا تھا۔
 ”اویس!۔۔۔ نوڈاؤٹ۔۔۔ بابا!۔۔۔ تو تمہیں یاد ہے؟“
 وہ مسکراتے ہوئے دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

”میں ڈاؤٹ اب تو لپٹی ہوئی ہے۔ بٹ ڈفرنٹ۔ کچھ الگ سا ہے اس میں۔“ ”وہ اپنا کپ اٹھا کر اندر لاؤن میں چلا گیا۔“
 ”تو جانتا ہے یا کہ بہت بہت نہیں گھوما ہوں۔ ہزار بالز لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن کچھ کبھی ہوئی کچھ چھپائی ہوئی،

آنکھوں کی بات ہی اور ہے۔ میں نے اب جانتا ہے۔“
 ”وہ نرم پد کے گداز صوفے میں دھنس گیا اور کائی کے سب لینے لگا۔“
 ”ہاں! اب اب تو کچھ سیریس ہی لگتا ہے معاملہ“ ”صاف گوئی سے بتا رہا ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں بہت سیدھی کے

سوچتا ہوں اس کے بارے میں۔“
 ”دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تھا۔“
 ”تو نہیں جانتا۔ ابھی اس سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی ملا ہی تھی بارہوں۔ کیا بابا!۔۔۔“

ایک ہی وار کائی ہو آئے۔ بالکل۔“
 ”لاؤن میں اس کی بے لگ رہی کو گھنچے گی تھی۔“
 ”مذہر!۔۔۔ تم تو بے چین ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے۔ تم بٹھنے کے لیے۔ ارنہ ہاں!۔۔۔ ایک بات بتانا

بالکل پھل گیا۔ جانتے ہو شیریں! میرے آئیں میں تمہاری تصویر دیکھ کر کس رعبہ بھانے کیوں بہت کم تم سی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ تمہیں جانتی ہوں۔ حالانکہ وہ کبھی پاکستان سے باہر نہیں گئیں۔ اور تم بھی پاکستان آئے نہیں۔“

”وہ کپ خالی کر کے میز پر رکھتے گا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

”پھر جیسے وہ اپوس ہوا تھا۔“
 ”چاند!۔۔۔ اللہ بڑھ کر گئے۔ میرا سلام کہنا انیس۔“ ”اس کے فون تنف کیا پھر کچھ سوچ کر

سکرانے لگا تھا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

”پھر جیسے وہ اپوس ہوا تھا۔“
 ”چاند!۔۔۔ اللہ بڑھ کر گئے۔ میرا سلام کہنا انیس۔“ ”اس کے فون تنف کیا پھر کچھ سوچ کر

سکرانے لگا تھا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

”پھر جیسے وہ اپوس ہوا تھا۔“
 ”چاند!۔۔۔ اللہ بڑھ کر گئے۔ میرا سلام کہنا انیس۔“ ”اس کے فون تنف کیا پھر کچھ سوچ کر

سکرانے لگا تھا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

”پھر جیسے وہ اپوس ہوا تھا۔“
 ”چاند!۔۔۔ اللہ بڑھ کر گئے۔ میرا سلام کہنا انیس۔“ ”اس کے فون تنف کیا پھر کچھ سوچ کر

سکرانے لگا تھا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

”پھر جیسے وہ اپوس ہوا تھا۔“
 ”چاند!۔۔۔ اللہ بڑھ کر گئے۔ میرا سلام کہنا انیس۔“ ”اس کے فون تنف کیا پھر کچھ سوچ کر

سکرانے لگا تھا۔“
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں خشک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سونا!۔۔۔ کیا ہے؟“

مال کی تھوڑی سی محبت ڈراسی ہمدردی نے جیسے کسی آبلے کا منہ کھول دیا تھا۔

”وہ بے عقل ہے۔ ابھی زندگی کو دیکھا ہی کہاں ہے اس نے؟ دل میں بنتی ہے تو عورت، عورت بن جاتی ہے نافع۔ اس کی آنکھوں پر دور اندیشی کی عینک خود بخود لگ جاتی ہے۔“

”جانے دیں ای! ایسا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی گھر نہ بگڑتا، ایقان پھپھو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“

”پھر بھی نافع۔ کوئی ایک فریق اگر اپنا گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور بسا رہتا ہے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں بہت فکر مند ہوں۔ اکثر اس بارے میں سوچتی ہوں۔ لیکن پھر تمہارے بارے میں سوچ کر بہت مطمئن۔ اور پرسکون ہو جاتی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں عریشہ کم عقل اور جذباتی ہسی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“

”آپ نے کہا ای! کہ ایک فریق اگر گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور رہتا ہے۔ لیکن اگر ایک فریق گھر اجاڑنے پر آمادہ ہو جائے پھر کیا ہو؟“

”ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”مرد وہ۔ مرد بن کر دکھاؤ۔ محبت کی نواقتی تیز رکھنا کہ ناخوشی موم بن کر پگھل جائے۔ بیٹا! میں تم سب کو ہنست ہنستا بتاؤ دیکھنا چاہوں گی۔ رافع کی جانب سے مجھے بہت خوف ہے۔ اس کے انداز مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔ لیکن تم میرے بہت پیارے بیٹے ہو۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“

نافع نے ان کا ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چوہا بنایا۔

”میں آپ کے یقین پر پورا اتارنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“

عذرا ایتم بے فکر ہو کر ہنسنے لگی تھیں۔



”یہ کیڑا لگ رہا ہے کچھ بھوٹ دمنہ ہے۔“ عریشہ کی بے پرواہی پر ماہینہ چیخ اٹھی۔

”میں یہاں شادی شادی کی شاپنگ کر رہی ہوں۔ تمہاری اس خفا خوشی سے راضی نہیں آتی۔“

”آئی۔“ اچو آپ کرنے آئی ہیں، کچھ شاپنگ کرنے آئی ہیں تو شاپنگ کریں۔ ہر بات میں میری رائے اور میری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”لو۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟“ بھئی شادی تمہاری، پنہنا اوڑھنا تمہیں۔ پسند بھی تمہاری ہو تو اچھا ہے۔ چلو ڈیزائن میں پسند کرتی ہوں۔ یہ بتاؤ ڈیزائننگ ڈریسنگ کا رنگ کیا ہو؟“

وہ اس کا تباہ کن موزو دیکھ کر مصالحہ انداز میں بولی۔

”سیاہ!“ عریشہ سکون سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ اسے جھٹکا لگا۔ ”سیاہ؟ عروسی لباس؟“

”کیا حرج ہے؟ شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی رنگ ہی نہ چمکے دل میں تو پھر سیاہ رنگ ہی مناسب ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو عریشہ!“ ماہینہ پریشان ہو گئی۔ ”تم اب تک اس ناراضی سے باہر نہیں نکلیں۔ اگر یہی معاملہ کرنا تھا تو اس وقت بولتیں، چچیتیں، چلاتیں۔ اسٹینڈ لے لیتیں۔ اب ان فضول باتوں سے کیا حاصل؟“

عریشہ نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔

”اسٹینڈ؟ اسٹینڈ تو پھر کسی وقت بھی لیا جاسکتا ہے۔“

”کیا کیا؟ کیا مطلب؟“ ماہینہ ڈر گئی۔ ”دیکھو عریشہ۔! خاندانی لڑکیوں کے یہ اطوار نہیں ہوتے، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب خود کو سمجھا لو۔“

انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔

.com

’کسی نے ایسی آگ لگائی ہے اس مرنے والے میں کہ راکھ بننے کے بجائے شعلہ بن گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے جلاؤ لوں سب کچھ۔“

”تھک ہے“ پھر وہ دھیمے سے بولا۔ ”میں چلا ہوں۔“

”وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ۔“ اس نے رابع کی آنکھوں میں اتارتے دمگوں سے نظریں چرا کر کہا۔

موو اور فیروز کا جینزیشن کے سوٹ میں اس کی رنگت دک رہی تھی۔ آنکھوں میں شام کے سب سے ہی رنگ

یہ ایک رافضی کو عقوبت میں کھڑی بورڈ کا اخیلا ہے۔ ہوا و درمیان سے چٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ رہبیہ نے بے ارادگی کی گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ چونک کر رو کر کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”کیسی ہو رہی؟“ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ نے اسے راستہ بتا دیا۔

”شہلا آبی کے کمرے سے ان کا کچھ ضروری سامان لینا ہے۔ دراصل شہلا بھائی، شہلا آبی کو اجانک ہی لے

آئے تھے بنامان کے پھر شملہ آئی ہیں ریک گئیں ہمارے پاس اب انہوں نے مجھے بھیہنچایا ہے ان کے وارڈ روم سے کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ تم پہلی منزل پر آگے ساتھ چلو میں ان کی ساس سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔“

پچاسویں باب: کونہ روئے بند اور کونہ بنی اور معاصروں کی باتوں

”جی! ربیعہ بیچا کی قدرے بچ، ابھی ہوئی۔“ ”کب؟ کب؟ اب آتم بھائی سے لوجہ لیجئے یا شہلا آبی

”تمہاری آئی کے پیروں میں شاید مندی لگی تھی۔ جتنا راستہ تم نے طے کیا اتنا وہ بھی تو کر سکتی تھیں۔“

”اے بالہ! ہم نے تو انہیں بیمار ہی پایا ہے۔“ انہوں نے کسی گوشے سے چلیں اور آئندہ کر کے: ”جہاں تیرے

”یہ لوہ کرے کی اور الماری کی سب ہی چلبیاں ہیں۔ ہمارا تو خیال ہے سب ہی سماں ایک بار ہی کے
 اکو۔ بار بار چکر لگانا پڑیں گے نہیں۔“

”جی۔۔۔! ربیعہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

ان شعلہ بیانیوں کا ذکر بھی کبھی شہلانے نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتی اور ادب سے ان کا ذکر کرتی تھی۔ ربیعہ کو شہلا سے عقیدت سی محسوس ہوئی۔

”تالی امی!“ ورنہ نے انہیں تنبیہ کرنا چاہی پھر خاموش ہی ہو رہی۔

وہ دونوں مزید گفتگو سے بچنے کے لیے تیزی سے بیڑھیوں کی جانب بڑھی تھیں۔ تب ہی کسی گوشے سے نکل کر اخترمیاں چلے آئے۔

”آپ! یہاں!“ وہ ربیعہ کو دیکھ کر کھل سے اٹھے۔

ربیعہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ کافی پریشان ہو چکی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ ورنہ سے پوچھنے لگے۔

”یہ میری دوست ربیعہ ہے۔ شہلا بھالی کی بہن!“

”بہت خوب۔ ایسے لوگوں کو خدا نہ جانے کتنی محبت سے بناتا ہو گا۔ کیوں باجی؟“

”اوسھر آکر بیٹھو اخترمیاں!“ فردوس بیگم بھنا کر بولیں۔ ”میں ان کا کام کرنے دو۔“

ربیعہ اور ورنہ بیڑھیاں چڑھ گئیں۔ اخترمیاں مسکراتے ہوئے بہن کے پاس آ بیٹھیں۔

”جانتی ہیں باجی!“ اپنی اپنی گود لیکر ہمیں کیا یاد آتا ہے؟“

”کیا یاد آتا ہے؟“ انہوں نے ابرو چڑھائے۔

”یقیناً کیا جوانی۔۔۔“ ان کی آواز انداز میں عجب حسرت تھی۔ ”وہی سوندھا پس۔۔۔ وہی خوشبو وہی روشنی۔“

”خدا کی تیار تم پر۔ آہستہ بولو۔ یہ بھی شریف لوگوں کے کہنے کی باتیں ہیں۔ پرانی اڑکھوں کے بارے میں

اور یقیناً کیا جوانی۔۔۔“ وہ بولنے لگی۔ ”جوانی بانی بانی ہے۔۔۔“ اخترمیاں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہا۔۔۔! وہ بزرگ برس پہلے کی بات تو نہیں باجی۔“

فردوس بیگم نے انہیں غور سے دیکھا۔

”بیابہ کروادیں تمہارا پس لڑکی سے؟“ وہ ان کے قریب جھک کر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

”باجی؟“ اخترمیاں کا منہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔



ہاشم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر فائل بند کی۔ آج پھر اسے آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ ریوا لونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے کمر سیدھی کرنا چاہی۔

تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی تھی۔ ہاشم نے اسکرین پر کال کا نام دیکھنا چاہا لیکن وہاں اجنبی فون نمبر تھا۔

”ہیلو!“ وہ ٹھکن کے احساس کے ساتھ بولا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ مسٹر ہاشم!“ دوسری جانب کسی کی گمبھیر خوبصورت آواز تھی۔

”جی۔۔۔ آپ کون؟“

”ہاشم! میں ابرار بات کر رہا ہوں ابراہیم جیلانی!“

ہاشم کی ٹھکن لمحہ بھر میں ہوا ہو گئی۔ وہ سیدھا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”فرمائیے۔“ وہ بے حد محتاط انداز میں بولا تھا۔

دوسری جانب ابرار نے کھنکھار کر اپنا کاف صاف کیا تھا کسی اہم بات کی تہدید باندھی تھی۔

”بات قدرے لمبی تھی جو کہتی ہے۔ آپ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو کچھ وقت لوں گا آپ کا۔ اور اگر اس وقت آپ بات کرنے کے موافق نہ ہوں تو۔ میں پھر کسی وقت۔“

”میں میں مصروف نہیں ہوں۔“ ہاتھ نے فوراً اس کی بات کالی۔ ”آپ کو جو کہتا ہے کہیں۔ میں بخور بن رہا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کی تھی۔ ابرار کے فون نے جیسے اس کے دماغ میں کسی علاقہ فیزیو منیٹر کی کڑکی بخول دی تھی۔ اس کے کچھ کچھ سے قبل ہی اس کی سوچ نے مختلف سمتوں میں پرواز بلند کی تھی۔

”میں نے تو میں ایک اہم سوال پوچھنا چاہوں گا ہاتھ۔ ایسا سوال جس کا جواب مجھے میرے بہت سے اندازوں کے صحیح غلط ہونے کا پتہ دے گا۔“

”پوچھیے۔“ ہاتھ نے بخشوں نہ کیا کہ وہ پیش کش کا شکار ہوئے نہ گئے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے اپنی اپنی باتیں

”آپ کے اور شملہ کے درمیان کبھی میرے متعلق گفتگو ہوئی ہے؟“ ابرار نے پوچھا۔ اس کے انداز میں بے حد اعتماد تھا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے میں کوئی عار نہ ہو۔ شملہ نے اپنے جواب میں شملہ کی شخصیت کی اسے احساس ہوا

کہ ابرار کے لیے شملہ کے نام نے اس کی شائستہ روی کو بھینچ دیا تھا۔

”میں نے کبھی بھی نہیں اور میرے اور میری بیوی کے درمیان کبھی آپ کا ذکر آئے بھی کیوں؟“ وہ چنانچہ

لے جے میں بولا تھا۔

دوسری جانب ہر کے لیے سکوت سا طاری ہوا۔ ابرار نے سنبھل جانا۔

”اس لیے کہ میں آپ دونوں کے لیے اس قدر اچھی یا سیدھے خیال مند ہوں کہ میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کے لیے

بادلا نا ہو گا۔“

”جی نہیں۔“ اس نے متعلق میں بے حد وقوف سے کہہ سکتا تھا۔ ”میرے لیے عرب کا حوالہ نہیں ہے۔“

”اور شملہ کے متعلق؟“ دفعہاً ابرار کے لیے میں چپکے چپکے ”آئی۔“ اس کے متعلق بھی آپ اپنا یہی

وقف استعمال کریں گے؟ آپ سمجھتے ہیں مسٹر ہاتھ کہ شملہ مجھے بھول چکی ہے۔ بھول سکتی ہے؟“

”آپ ایسا سوال کر کیجئے۔ جواب آپ کو مل گیا ہے اپنی بات سمجھیے۔“ ہاتھ نے اس کا یہ سوال نظر انداز

کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے آپ کے مڑو کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اس لیے زبان تہدید نہیں باندھتا۔ ہاتھ میں اپنا ہاتھ ہوں آپ ایک بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہندوؤں کے منہ آجینٹل میں آپ کی اچھائی ہے ہی آپ سے یہ بات کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

ورنہ شاید میں یہ طریقہ نہ اپنا تا ہاتھ! اگر کے بھلے کے لیے۔ میرے بھلے کے لیے۔ اور سب سے بڑھ کر شملہ کے بھلے کے لیے۔ شملہ کو وہی دور رس دے دے۔“

ہاتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک ظالم تیزاب بھرا تھا۔ اس کی ایک ایک نرس سنبھل کر رہ گئی تھی۔

”آپ کو یہ بات سننے کی جرأت کیسے ہوئی مسٹر ابرار۔“ دفعہاً پوچھ بولا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے جیسا ایک کہنے

خیال کرتے ہیں؟ میرے لیے عورت وہاں نہیں ہے مسٹر ابرار۔ میری بیوی میری ہم ناس ہے۔ آپ نے مجھے

انتا خریف خیال کیا کہ مجھے کسی کئی چاہیے جو کہ نہیں آتا۔ مجھے اس قدر شدید غصہ آ رہا ہے کہ اگر میں نے

اس کا مکمل اظہار کیا تو میرے متعلق آپ کی رائے قطعاً تبدیل ہو جائے گی۔ میں اتنے بھی ”جھجھکتا“ نہیں

ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔“

اس کا سامنا کر چکے تھے لگا تھا۔ ابرار نے اس کا لفظ لفظ بغور سنا تھا۔

”آپ کو یقیناً غصہ آتا چاہیے۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کی جگہ تو جانتا تھا۔ لیکن پلیز ہاتھ۔“

”لیکن آپ ایک ایسا آدمی ہیں جس کا وقت اپنے جذبات پر کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ بہت اہم گفتگو ہے۔ جس میں بہت حقیقتیں ہیں۔“

”ریٹیل؟“ ہاتھ نے بولا۔ ”کیا ابھی جو؟“ ”شورہ؟“ آپ نے مجھے دیا۔ وہ آپ کے حقیقت پسند ہو کر سوچنے کا

ثبوت ہے۔“

”ہاتھ! یہ بہت سے لوگوں کی زندگی کا ان کی خوشیوں کا۔ ان کے آئندہ کا سوال ہے۔ آپ غصہ نہ کیجیے

پلیز۔“ ابرار مزید نرم ہوا۔ ”یہ بات آپ کے احساسات پر ایک نوٹس کی مانند رہی ہوگی۔ میں اپنا انداز بدل رہا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بتائیے کہ میں اور عرب۔ جو کہ ایک مثلث کے دو کونے ہیں۔ اور اپنے تیسرے کونے کے

مضامین اور جوڑ ہیں۔ ہم یہ بات چیت پر بغیر کو کر رہے ہیں؟ میں شملہ کی فطرت سے واقف ہوں ہاتھ۔ وہ

حساس اور درد مند ہے۔ ساری عمر کرتے ہوئے تزاؤ کے لیکن خود اپنے منہ سے یہ بات نہیں

کہے کہ وہ عمر کو کس کر رہی ہے۔ لیکن اہم شیوں کے وہ مجھے بھی مس کر رہی ہے۔ ایسے میں کیا یہ اچھائی کی ایک

صورت نہ ہوگی کہ اسے لوگوں کی اداسی کا ہلکا سا ایک کندھا اٹھالے اور بہت سے دل بھل اٹھیں۔ غموں کے پوچھ

سے آزاد ہو جائیں۔“

”گندے کا انتخاب اچھا کیا ہے آپ نے۔“ ہاتھ نے شملہ کا انداز میں بولا۔ ”اور بتا ہوں۔“

”اس لیے ہاتھ! کہ یہ انداز انتخاب۔“ اس نے بولا۔ ”اچھا نہیں۔“

”کیونکہ اس کا کوئی ایک لفظ ہے۔“ ہاتھ نے بولا۔ ”پناہ دھکا ہو محسوس کیا تو گری پر بیٹھ گیا۔ بات آپ محض

اس رخ سے کر رہے ہیں۔ جہاں آپ خود کھڑے ہیں۔ اس ساری پوزیشن کے بہت سے رخ ہیں۔ اچھائی اور

بہتری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ عمر کو واپس لے جائیں۔ وہ یہاں خوش تھا۔ اس معصوم بچے کو

آپ نے ڈسٹر بس کیا اس کے شفاف ذہن کو آپ نے غمزدہ کیا۔“

”جسٹ اسے مثلاً ہاتھ۔“ ہاتھ نے بولا۔ ”عمر کو واپس آپ کے پاس بھیج دیں؟ آپ کے لیے اس کے

پاس کیا تھا؟“ آپ نے صرف شملہ کے لیے ہی ہاتھ عمر کو واپس بھیج دیں گے تھے اس کی نانی کے کھدے۔

ہاتھ ایک پتیلے لڑکے کے لیے حقیقت تھی کہ فادرین حسن اور فردوس بیگم کے عمر پروا کے باعث وہ

کچھ دیر ہی خوش رہا۔ سارے سارے ساڑھ ساہان سمیت اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر لے جا چکا تھا۔ اسے اس بات کی

خوابش ضرور تھی کہ شملہ کی ساری باتیں یاد کرادی گئی تھیں کہ ”جیات ولا“ میں صرف وہاں کے

کنبوں کی نسل ہی پروان چڑھ سکتی ہے کسی اور کی نہیں۔“

ہاتھ اس بات پر رضامندی کا اظہار کر کے ہی شملہ کو حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں کبھی بھی حالات ایسی کسی

خوشگوار چیز نہ آئے تھے کہ وہ اور شملہ عمر کو واپس لے آتے۔ خود شملہ بھی فردوس بیگم کے رویے سے تالاں نہیں

دہائی اس خوابش سے متہوار رہی ہو چکی تھی۔

”آپ خاموشی ہو گئے؟“ ابرار کو جیسے اس کی خاموشی سے سہت ہوئی تھی۔ ”اب تو میں آپ کے رخ سے

جو پیش کر رہی تھی کہ کی خوش کار ہوں مسٹر ہاتھ! کیا اس سے یہ رخ؟“ اس نے اس کا کیا کہیں بچہ غلط نہیں ہے؟“

”اور کہیں بچہ غلط نہیں ہے تو یہ آپ کی وجہ سے ہے ابرار! اب کے ہاتھ کے لیے میں بھی نہ پہلے والی سر

مندی نہ تھی۔ وہ جیسے بات کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔“

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر جوش مارا۔؟“

”ایمان۔“ ایمان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم ہی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کہا تھا آپ تو جیسے میرے بنوں میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کے لائق کون ہے؟ جس کی ماں ہوں پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”دعا ہے اور رات کی تاریخ گھنٹی بجے چکر کا سنے عذرا اور بچیوں نے بازاروں کے۔ تو سنہ پوچھا اگر کسی بات کا ایسی باتیں ہیں پیو پیو پیو۔“

اب تمہوں نے رات کی تاریخ چکر کا اظہار کیا۔

”اب رہے ہیں دس ناٹاں۔“ عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”دس بج چا رہی آئی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔“ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا نام کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا انداز میں خوار ہو۔ تم

ایمان بدھم سا مسکرائی۔ مسکراہٹ اب اس کے چہرے پر چھٹی نہ تھی۔

”مجھے اپنی کوئی باتوں کا اندازہ ہے بلکہ یہ سب۔“ وہ لڑائی سے بولی۔ ”بہتر شوق تھا ان سارے کاموں کا۔ بہت بے ایمانوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”جیسا کہ ہے“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری تیاریاں کرواؤں گی۔ بھاپ کی طرح اس ساری دنیا میں سچے ہوئے تل پرے۔“

اس کا بھجور بھرا تھا اس نے خور پر بٹھکر قابو پایا۔

”ایمان! تمہاری جان کوئی بھی کام ہو۔ آپ مجھے کسے کسہ دیا کریں۔ کم از کم میری کو تمہیں کا احساس دلائی

”میں نے آپ کو بھلانا چاہا اور آپ مزید دور رہیں۔“ رافعہ بولا۔ ”کیسے کیا کام تھا؟“

”مجھے نیٹ پر میرے اکاؤنٹ کی کرٹ چوڑی نہ دیکھ کر تاؤ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شفیقہ حیات نے قہقہے بولی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھا جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو۔

”جلین پھر میرے کمرے میں آجا میں اس رافعہ بھی کھڑا ہوا۔“

”ہاں مجھے بے چارے۔“

”دو دنوں کے لیے۔“

”جی ایمان۔ اب نیٹ پر ساری تفصیل مل جاتی ہے اپنے اکاؤنٹ کی، کب کتنے جمع ہوئے۔ کب کتنے نکلائے۔“ عذرا بیگم کی دیکھنے کی نگاہ تھیں۔

”ہمارا بیٹا بچتا ہے نا پیراے۔“

”بیٹا بچتا ہو گا۔ پیراے۔“ سچا اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں باپ کے دم سے

یہ ہوتا ہے یہ سب کچھ۔“

”اللہ اس بچے کو سلامت رکھے اس کی بے وقوفیاں بڑداشت کرنے کا جو صلہ دے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”آمین۔ عذرا بیگم مسکرا دی تھیں۔“

”رافعہ نے کمرے میں آکر پیو پیو آن کیا تھا۔“

”ہماری جاب کیسے جاری ہے؟“ ایمان نے ایک نظر دے ہوئے فریج پر ہڈی۔

انہوں نے اچانک ہی اٹھنے کی کوشش کی۔

”مجھے بس کمرے چلو۔ میں اب بھی ہو جاؤں گی۔“

”پلیز ای جی۔“ شفیقہ نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں لایا۔ ”ہم ضرور گھر چلیں گے۔ بس چند ایک ضروری ٹیسٹ ہیں جن کے لیے آپ کو ایڈمٹ کیا ہے۔ ٹیسٹ ہو جائیں تو ہم پہلے ہیں۔ تب تک صبر کریں۔“

”وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئیں۔“

”مجھے خبر ہے۔ آپ کو مارکٹ جانے کی جلدی ہے۔“ ربیعہ نے احوال کو شکستہ کرنا چاہا۔ ”بے فکر رہیں۔ وہ پروگرام بالکل سٹج ہے۔ ہم گھر جاتے ہی مارکٹ چلیں گے۔“

”گھر جانے کی ضرورت کیا۔“ عمار بولا۔ ”رستے میں ہی اترنا چاہیے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سہلایا۔

”سب مسکرائے نکلے تھے۔“

”آپ لوگ میری نانو کو تنگ نہ کریں۔“ دھنیا نے انداز میں بولا۔ ”وہ پہلے ہی ٹھیک ہیں اور آپ لوگ انہیں ایسی باتوں سے تنگ کر رہے ہیں۔ وہ تیار ہیں وہ نہیں جانتیں کہ مارکٹ سارے ٹیس دیے تھے۔ منہ دیکھ سب کچھ بھول بھال مسکرا رہے ہیں۔“

”السلام علیکم۔“ وہ سنجیدہ سنجیدہ سی انداز میں بولی تھی۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم چونک اٹھیں۔

”وہ کیا سلام؟“ ”دونوں ہی قدرے پر جوش انداز میں بولی تھیں۔“

عذرا بیگم نے اٹھ کر اس سے محبت سے معاف کیا۔ وہ ان کے دل کو مائل کی جاب آئی۔ ”مجھی انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔“

”شکر ہے تیری صورت نظر آئی۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”ایمان! تو تو اب کبھی بھول گئی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! وہ تنگ تنگ انداز میں ان کے قریب کھینچی۔ ”آپ تو میرے خون میں ٹھہری ہوئی ہیں۔“

”پھر یقیناً شکر ہوگی آپ کو۔“ اندر آتا ہوا رافعہ شرارت سے ہنستا تھا۔ ”تم ہی تو میرے بیٹے کی راوی جان جس کے خون میں کل جاتیں۔“

”کیا انصاف حاصل رہے ہو۔ عذرا بیگم خفا ہوئیں۔ ”پتاریوں کو دفنانے میں بھی باؤ نہیں کرتے؟“

”آپ سنا میں پیچھو کیا حال چال ہیں؟“ وہ ایمان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”خفگوں کو کچھ اتفاق ہے یا اب بھی سارے جہاں سے ٹالنا ہیں۔“

”اتنے شوق ہو رہے ہو۔“ ایمان نے اسے گھر کا۔ ”خیریت؟ بھابی بیگم۔ کیس اس کی ڈیٹ بھی تو فکس نہیں ہو گئی مانیہ کے ساتھ ہی؟“

”تم اسے سمجھاؤ۔“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”شاید تمہاری ہی سن ہے۔“

”پہلے تو سب مل کر پیچھو کو سمجھائیں۔“ رافعہ نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ کسی کی سنیں گی؟“

ایمان قدرے جڑبڑی ہوئی۔

”مجھے تم سے ایک کام تھا رافعہ! وہ میرے سے بولی۔ ”میں اسی لیے آئی تھی۔“

”زبردست۔ اندازہ نہیں ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ نیٹ کمنٹ کرتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

”ہاں ہو رہا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنس دی۔ ”تب ہی پوچھ رہی ہوں۔“

رافع نے اب اس کی اکاؤنٹ انفرمیشن کھولی تھی۔ ایقان بھی قدرے جھک کر دیکھنے لگی۔

پھر نکا ایک دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”اتنے پیسے؟“ رافع نے حیران نظروں سے ایقان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچیس لاکھ روپیہ پچھلے ماہ جمع کروایا

گیا ہے۔“

”عاشق نے اتنے پیسے۔“ ایقان متحیر و پریشان تھی۔

”کوئی فون آیا تھا ان کا؟“ رافع نے پوچھا۔

”نہیں۔ اور میں اسی لیے اکاؤنٹ چیک کرنا چاہتی تھی میں سمجھ رہی تھی کہ عاشق نے روپے بھی نہیں

بھجوائے ہوں گے لیکن اس نے تو۔“

”کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“ رافع متحیر سا برہنہ ہوا۔ ”اتنا روپیہ انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ میں اسی لیے ڈلوایا ہو گا

تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”بعد میں؟“ ایقان جیسے خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”کیا مطلب بعد میں؟“

رافع چونکا پھر ہلکے سے ہلکا کر اس نے کرسی گھمائی۔

”میرا مطلب ہے جب تک وہ پاکستان نہیں آجاتے تب تک آپ کو یہاں کوئی مشکل نہ ہو۔“

”پاکستان؟“ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے رافع کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ۔۔۔ یہاں کیوں آئے گا رافع! مجھے سچ بتاؤ“

کیا اتنے سارے روپے بھجئے سے اس کا یہ مطلب ہے کہ اب وہ ہم لوگوں سے کوئی سلسلہ کوئی رابطہ نہیں رکھنا

چاہتا ہے؟

رافع نے نظرس جڑالیں پھر وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں پھر وہ ان سے کوئی رابطہ ممکن ہو تب ہی صحیح صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔ میں نے

امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست کو ان کا پتہ بھیجا ہے۔ وہ معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرے گا۔ ان سے

ایک مرتبہ تفصیلی بات کرنا بہت ضروری ہے تب ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔“



ضروری ٹیسٹوں کے بعد منیجر بیگم گھر آگئی تھیں۔ رپورٹس چند ایک دن میں ملنا تھیں۔ ہاشم ان کی خیریت

لے کر اٹھا تھا۔ عباد سے مصافحہ کر کے وہ باہر کی جانب بڑھا۔

یکن کے دروازے پر کھڑی شملانے حیرت سے جاتے ہوئے ہاشم کی پشت دیکھی تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ

ہاشم اسے الوداع کہے بنا ہی چلا جائے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئی۔ تب تک وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر چکا

تھا۔

”ہاشم! شملانے اسے پکارا۔

وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ چند قدم اوپر کھڑی شملا کو اس نے نجانے کن نظروں سے دیکھا تھا، شملا کو عجیب سے

احساس نے گھیرا۔

”آپ۔۔۔ جارہے ہیں۔۔۔؟“ اس نے بے معنی سوال کیا۔

”نہایت۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”میں یہی مطلب ہے۔ میں بھی چلتی ہوں نا۔ اتنے دن ہو گئے یہاں۔“

”تم؟“ ہاشم نے اس کے چہرے پر کچھ کھوجا۔ ”میرے ساتھ چلو گی؟“

”ظاہر ہے۔ اگر آپ تو اتنا انتظار کر لیں تو۔۔۔ مجھے بیگ میں سامان رکھنے میں کچھ تاخیر ہو گئے گا۔ پھر پہنچ بھی کرنا ہے قریباً آٹھ گھنٹہ۔“

”میں چلتا ہوں شکلا۔“ اس نے گہری دیکھی۔ ”تم تیار ہو جاؤ تو مجھے فون کرو نا۔ میں آ جاؤں گا۔ میں تمہارا رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔“

شکلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

”ہوں۔“ پھر اس نے اذیت میں سر ہلایا۔

”دوست۔۔۔ کے۔۔۔ اللہ حافظ۔“ وہ گھٹ کی سمت بڑھ گیا۔

شکلا وہیں گھڑی اسے جانا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ دیکھ سکی کہ ہر نکل گیا پھر خراب تک وہ اسے سرک پر نظر نہ آتا رہا۔ وہ دیکھتی رہی۔ اسی عجیب سے آرزو کی گئی احساس میں وہ ایک لمحہ کی گھڑی ہوئی تھی۔

ہاشم کے انداز میں سر ہر دھارتے اس کے دیکھنے کا انداز، مسکراتے کا انداز، ہنسنا کا انداز، وہ کبھی بیکہ کسی مرد دل شخص سے اسے متاثر مانگ لایا تھا۔ یہ ہاشم کے لیے انداز تو نہ تھے۔ اس کے وہم و گم سے پہنچی بہت کی الوہی خوشبو بجائے کہاں گم تھی۔ وہ جانتے ہوئے کتنی ہی بار مرکز دیکھا کہ آتا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔

شکلا ہاتھ کچھ محسوس کر رہی تھی۔ لب کانٹے ہوئے اس نے تارے سوجا۔ گزشتہ کچھ دنوں میں سرزد ہونے والی کسی بدانتہا کو خطا کو لحاظ میں جیل لاسے کی سہی کی پھر اس کی ہی وہ کردہ انداز کے لیے مڑی تھی۔

گھبرے نکل کر کچھ رستہ طے کر کے پھر جانے کیوں اس نے مرکز دیکھا۔ کچھ دیر دیکھا۔ اب سبز میلوں سے ڈھکا وہ خوبصورت سنگ مرمر سے جھا ہوا گھر۔ کبھی کتنے خواب واپس تھے اس گھر سے۔ یہاں تک آتے آتے اس کے قدم آہ آہ آہ اب کچھ چلا کرتے تھے۔ اس کا تصور اس گھر سے کچھ جاتا تھا تو پھر اس کی سست چلا کر تھا۔ نیلے آسمان کی آوازوں میں، فحشٹی شاد فضاؤں میں منڈلاتے، بے فکر پرندے کئی بار نہروں کا کچھلا ہوا جاتا تھا۔ اب اسی گھر سے وہ تھا کہ بے دالابو جہ کا نہر حوٹل پر لیے نکلا تھا۔

”محبت میں اتنا فرق آ گیا؟“ اس نے تیراں ہو کر سوجا۔

محبت۔ کل۔۔۔ آواز پرندے کی مانند بے فکر نہروں اور خوش نظر تھی۔

محبت۔ آج۔۔۔ شادوں پر دھڑے پرانے بوجھ سی محسوس ہوئی تھی۔

کیوں نہ کیا ہوا تھا؟

”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ہاشم۔ آپ نے کبھی اس محبت کی بلکی سی رقص بھی محسوس نہ کی ہوگی۔ آج بھی جب وہ مجھ سے بات کرتی ہے اس کے لیے میں اس پرانی محبت کی خاموش خوشبو ہوں۔ وہ خوشبو صرف میں محسوس کر سکتا ہوں۔ صرف میں۔“

ایک آواز کانوں سے گمراہی تھی۔ ایک بار پھر اس کے مساموں سے پینہ پھوٹا۔

”میں اسے جانتا ہوں وہ کبھی یقیناً میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے۔“

ہاشم نے پارک کا دروازہ دیکھا۔ وہ سوچے۔ کچھ بغیر اندر داخل ہو گیا۔

”میں اس سے کہا تھا۔ اگر وہ میرے پاس لوٹ کر آنا چاہتی ہے تو کسی صورت پر گھنٹی۔ نہ ہونے دے۔ وہ میری بات پر عمل کر رہی ہے۔“

ہاشم نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کا دل جیسے محسوس کی جتنی ریت پر ریتا رہا تھا۔

کاش یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ شکلا بھی اسی عکسوں میں مقیم ہوئی تصویر میں زندہ ہے۔ محبت کبھی کبھی ثبوت کے طور پر بہت کچھ اٹکاتی ہے۔ کہ آپ شکلا کو خوش رکھنا چاہتے ہیں؟“

ہاشم پوری قوت سے دوڑا۔ وہ ان آوازوں سے چھٹکارا پاتا چاہتا تھا جو پچھلے کچھ دنوں سے اس کے تعاقب میں پوری طاقت سے دوڑتی چلی آئی تھیں۔

”اگر آپ کی قربانی سے یہ تصویر پھر سے جڑ جائے پھر سے وہی مکمل، نور خوبصورت ہو جائے تو کیا آپ یہ قربانی نہیں دے سکتے؟“

ہاشم جیسے تھک کر بڑھال ہو گیا تھا۔ وہ بیچ بیچ کر ہانپتا رہا۔

ماہین اور اس کی سندس عرشہ تھک چکے تھے اور چیوری وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ کئی جوڑوں پر آج ہی کامیاب کر آئے تھے۔ کئی جوڑے روزی کے یہاں سے نکل کر کتے تھے۔ ماہین نے اپنی بندوں کی فرائض پر خاص طور پر انیس دوسرے کے کھانے پر بلوایا تھا کہ وہ عرشہ کے لیے پہنچائی گئی چیزیں دیکھ سکیں۔

عرشہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے باہر سے ان لوگوں کی ہنسی اور باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس کے ہلکے قدموں سے لگاتار اپنی اپنی علیحدہ دنیا میں زندہ تھیں۔ کچھ دیر بعد ماہین کمرے میں داخل ہوئی۔

”دشمن! وہ کتنے ہی عرصے سے یہاں آ رہی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے باہر آ جاؤ۔“

اس کے اندر انہیں انتہائی غریب کے کونے کے کونے کے لیے بدل کر رکھ دیے تھے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر بہن کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ ختم آبادی سے بولی۔ ”آج ہی ہوں۔“

ماہین کا چہرہ کھل اٹھا۔

”میں چائے بنا رہی ہوں۔ تم تھکنا ان کے پاس بیٹھو۔“

عرشہ اس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”وہ علم السلام کچھ ڈھونڈ ڈھونڈ کرے دوئے انداز میں بولی تھی۔“

”وہ علم السلام کچھ ڈھونڈ ڈھونڈ کرے دوئے انداز میں بولی تھی۔“

عرشہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ دو دوں اسے غور دیکھ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کرے دوئے انداز میں بولی تھی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ چونکی۔ ”میں کبھی نہیں۔“

”اس قدر دلی ہوئی ہو کہ پچھلی تیس جا رہی۔ رحمت بھی کلامی ہے۔ ماہین کی باتوں والے دن تو تم اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ آج بھی بہت سے لوگوں کو تم یاد ہو سکیں۔ اب تو۔۔۔ بہت مختلف لگ رہی ہو۔ کیا بنا رہی ہو؟“

”جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ خشک انداز میں بولی تھی۔

دو دوں اس کا مود دیکھ کر ایک دوسرے کو کھینچ لگیں۔ اسے میں ماہین بھی چائے لے کر چلی گئی۔

میں کھائی تھی ہوں لیکن پھر مار کر چلے ہیں۔ اس دن بھی نہیں جاسکے تھے۔
 ”یہ کچھ دیر سوچ کر دوسرے کسی کئی تھی۔“

”اللہ۔ ائی جی۔ آخر ایسی کون سی اہم شاپنگ کرنا چاہتی ہیں آپ۔ کچھ دن آرام کر لیں مارکیٹ کون سا
 کہیں چاہی جا رہی ہے۔“

”یہ کچھ دیر میں اسی شرط پر کھاؤں گی۔“ وہ ہنسی لہجے میں بولیں۔

”یہ سب نے دیکھی ہے اس میں دیکھا اور پھر بھر دی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ اگر عبادت بھائی پر تیش نہ دے دے ہیں تو پھر چلے چلیں گے۔“

”میں عبادت کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ماں ہوں اس کی۔ وہ میری ماں نہیں ہے۔“

”یہ سب جس کو ہری ہو گی۔“

”آپ ہسپتال میں رہ کر بہت بڑا سلج ہو گئی ہیں۔“

”یہ سب ہو گئی ہے۔ میں تو بہت بڑی ہو کر آئی ہوں یہ تمہارا حوصلہ ہے کہ مجھے برواشت کر رہی ہو۔“

”یہ سب ان کے قریب بیٹھ گئی اور اپنا سر ان کے شانے سے ٹکایا۔“

”میرا دل چاہتا ہے کہ سارے عمر تو آپ کے ساتھ گزار دوں۔ آپ نے مجھے کیا کیا ہے۔ میں لفظوں میں اس کا
 اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے اندر ایک بات چلی ہے جسے آپ کی محبت سے میرا ب کیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں امی
 جی۔“

”منیڈر بیگم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔“

”یہ سب صرف تمہارے اندر نہیں تھی ریحہ اپنا ہاتھ میرے اندر بھی تھی۔ اسے تم نے بچھایا ہے۔ یوں لگتا
 ہے جیسے دل سے ہی وجود کا کچھ کھینچا ہو۔“ انہوں نے ریحہ کا چہرہ تمام کر غور سے دیکھا۔ ”بابا پوچھا تم
 اس کا کیا کہو؟“

”اسی سے عبادت اندر داخل ہوا۔“

”ای جی۔ امیر حسن آئے ہیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں سن کر عبادت کے بپے آئے ہیں۔ ویسے بائی
 واؤس۔ یہاں کون سا جذباتی سین چل رہا ہے؟“

”اس نے ریحہ اور انہیں بولیں اور پھر ہنسی لہجے میں کہہ کر مسکرا کر چھوڑا۔“

”اس سے نہیں کیا؟“ انہوں نے انہیں سے بولیں۔ ”یہ ہم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ امیر حسن سے ہمارا کوئی پر تو
 نہیں ہے۔“

”میں بچن میں جاتی ہوں۔“ ریحہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے وغیرہ تیار کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ عبادت نے سر ہلایا۔ ”میں امیر کو میں لے آتا ہوں۔ ڈرائنگ روم تو زرا کلفت ہے۔“

”ریحہ بچن میں چلی آئی پھر وہ دھنسا۔“ چونکی تھی۔ ”اٹنگ ٹیبل کی کرسی پر شملہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے
 پر اداسی اور غم کی انتہائی گہری نگہ تھی۔ ریحہ اس کے قریب چلی آئی۔“

”شملہ آئی۔“

”آئی۔ شملہ جیسے نیند سے جاگے۔“ ریحہ نے کہو؟“

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ”بس بونی۔ یہاں بیٹھ گئی تھی۔“

”آپ کچھ پریشان لگتی ہیں۔“ ریحہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”خیریت ہے نا؟“

”تمہاری بہن بہت بدل گئی ہے نا؟“ انہوں نے تھوکیا۔

”اچھا۔“ ماہین پھینکی سی ہنسی دی۔ ”ہاں یہ کچھ سنجیدہ مزاج ہو گئی ہے۔“ وہ ان دونوں کو چائے دینے
 لگی۔

”جو تمہاری کن ہے کیا نام ہے اس کا؟“ نوین سوچتے ہوئے بولی۔ ”ناعمہ۔ وہ کیسی ہے؟ اس کی منگنی تو
 بہت اچھی جگہ ہوئی ہے۔“

”عریشہ نے نگاہ اٹھائی اس کے لب بھیج گئے۔“

”ہاں وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔“ ماہین نے تائید کی۔

”بہن کی شادی ہو رہی ہے؟“ انہیں جیسے لاشعرا تھا۔

”شملہ۔ ہمیں تفصیل نہیں پتا۔“

”کرزن میں بھی پرے ہوتے کیا؟“ وہ بھی ہم عمر کرزن میں؟ عریشہ کی تو دوست ہے ناعمہ۔ اسے تو خبر ہو گی؟“

”جیسے کیا رہی ہے۔“ اس نے سسے سے؟“ ماہین نے جیسے پران کر طیبہ کو دیکھا۔

”میں جانتی ہوں نا کر کے کو اس لیے شمس پر امت مانا تھیں وہ تو بہت ہی کافی قسم کی فیمل ہے۔ وہ لوگ
 یہاں رشتہ لینے آئے تو شمس اس کے پیچھے کوئی کمال ہو گی۔“

”ہوئے دو۔“ ماہین عریشہ کی صورت دیکھ کر ہزار ہور رہی تھی۔ ”تم لوگ چائے پیو۔ یہ بتاؤ عریشہ کے کپڑے
 اور پیر کی کبھی لگی۔“

”زبردست بہت اچھی ہیں ساری چیزیں۔“ طیبہ نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”بہن کیسی بنائی ہے تمہاری چچی
 نے؟“

”پتا نہیں۔ جب یہیں گے تو پتہ چل جائے گا۔“

”میں کتنا بڑی ایسی ہو کہ فراز والوں کی بری کے سامنے پھینکی نہ لگے۔ ویسے ان کا مقابلہ مشکل نہیں نا ممکن
 ہے پھر کچھ۔“

”خدا کے لیے نوں۔“ ماہین نے اسے جھک دیا۔ ”یہ مقابلہ بازی ہمارے ذہنوں میں نہیں ہے ایسی باتیں
 نہ ہی کرو تو اچھا ہے اور سامنے نہیں۔“ ماہین کی بری کئی تھی۔ ”مقابلہ کس سے کیا جاسکتا
 ہے یوں بھی عریشہ ناعمہ۔“ ماہین ہی ہیں۔ ”میں مقابلہ بازی میں کر سکتی ہوں۔“

”نوین اور طیبہ ماہین کا موڈ خراب ہو کر دیکھ کر خاموش ہی ہو گئیں۔ چائے پی کر ان دونوں نے رخصت چاہی۔“

”عریشہ دیکھا وہاں سے گم اپنی بیٹی سوچے چلی جا رہی تھی۔“

”ارے سہی“ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ تم لوگوں نے کیا دل اور کچھری کھانا شروع کر دیا ہے مجھے۔“ منیڈر بیگم
 کچھری کی پلیٹ دیکھ کر بولی تھیں۔

”ریحہ بس دی۔“

”ہم نے مانا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہفتہ بھر کی صفائی منائی جا رہی ہے یہ سب کی۔ لہذا اولیہ اور
 کچھری کی کھانا ہوں گے۔“

”یہ پٹیاں تمہیں شملہ اور انفعہ پڑھا رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ دہانے انداز میں بولیں۔ ”خیریت یہ تو
 ”

"ارے سب خیریت ہے۔" اس نے بشارت سے مسکراتے کی کوشش کی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں دراصل
 ایشم کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کل میں نے کہا تھا کہ مجھے بھی لے جانیے گا۔ شاید بھول گئے۔ آج
 نہیں۔"

"وہ تھوڑی سی ہو کر خاموش ہو گئی۔

"اوہ۔" ربیعہ خوشی سے مسکرائی۔ "تو قبول کیےتے میاں ہی یاد آ رہے ہیں اور بے فکر رہے۔ وہ زمانے کو بھول
 سکتے ہیں لیکن آپ کو نہیں۔"

"آج صبح شملانے جیسے ہل کر اسے دیکھا تھا۔" یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟"

"کوئی دنوں سے تو آپ کو حاصل کیا ہے۔ انہوں نے۔ بھلا بھول سکتے ہیں وہ۔" ربیعہ کو اذیت پہنچ رہی تھی۔

شملانے جیسے اس کی کہ عقیقہ پر آفس سے مسکرائی۔
 "بھولنا اسے مشکل ہوتا ہے ربیعہ! آج لا جا حاصل ہو۔ حاصل ہو جانا نہیں یا اور کتنا مشکل ہے۔" ربیعہ نے چیخا۔
 "اس کی بات سے غور کیا پھر میں بڑی۔
 "آپ ایشم بھائی کی محبت پر بھی شک کر سکتی ہیں ایسا؟ بہت بری بات ہے۔ ہم شک تو آپ پر رنگ کرتے ہیں
 کہ اتنا محبت کرنے والا جیون ساعی لا آپ کو۔"

شملانے کمری سانس پھری۔
 "وہاں محبت بھی ایک مشکل ہے ربیعہ! ہر تم نہیں سمجھو گی۔ میں تو دراصل سوچ رہی تھی کہ باہن کئی ہوئی
 ہے۔ کیا سوچے گی وہ۔ ایک ہی بھائی ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔"

"تو فون کر لیں یا تم بھائی کو وہ آفس سے انھیں گے تو آپ کو بھی جانیے گا۔"

دفعۃً ربیعہ کو بچن میں اپنی کمر کا منہ یاد آیا تو وہ چائے کی پیالی رکھنے لگی۔
 شملانے کچھ سوچتے ہوئے بچن سے باہر نکل گئی۔

چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ برائی سجا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو منینہ عیشم کے ساتھ منتقلیوں
 مصروف امیر حسن اسے دیکھ کر سنے ساختہ ہی کھڑا ہوا تھا۔
 "اسلام علیکم۔" ربیعہ نے غفلت سے مسکراتے سلام کیا۔ "تشریف رکھیے۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ بیٹھے ہوئے بولا۔ "کبھی ہیں میں مس ربیعہ۔ آپ آؤ۔ یہ آتا ہے آپ اس کے لیے۔"

آئی ہیں۔ امیر پر بیز کرنا نہیں چاہی۔

ربیعہ دھیرے سے ہنس دی۔ وہ یقیناً دل چسپ شخصیت تھا۔
 "آج صبح؟" نہیں ہے۔ وہ منینہ عیشم کے ساتھ بیٹھے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "اور یہ اسی کے لیے نہیں؟"

آپ کے لیے ہے اور آپ بالکل بھی تکلف نہیں کریں گے۔
 "چلیں جناب! ٹھیک ہے۔ سزا ہے تو سزا ہی سی۔"

"اس سزا میں میں بھی برابر کا شریک ہوں۔" عبادتہ خوش ہو کر بولا تو تب ہنس دیے۔ ربیعہ چائے بنانے لگی۔
 "جینی؟" اس نے اپنا کمر گھما کر امیر حسن سے پوچھا۔
 اور تب جیسے امیر حسن کی چوری چکاری مٹی تھی۔ وہ اسے بے حد جذب اور لگن سے دیکھ رہا تھا۔ شوق، جتنو اور

دھیرے سے بھر پور نظریے اختیار چک گئی۔ وہ اپنی چوری پکڑ لیتے جاتے پر ہنسنے لگا تھا۔
 "جینی۔" ربیعہ کو احساس ہوا کہ اس کی آواز کا بھی گونج۔
 "آپ کی مرضی۔" وہ دھیرے سے ہنسنے سے ڈرے اعتماد سے بولا۔
 "اور آج آپ ڈال دو۔" عبادتہ نے رس ملائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔
 ربیعہ بھی دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے چائے بنا کر اس کے ساتھ بڑی کارٹر ٹیبل پر رکھ دی۔
 "یار امیر! یہ رس ملائی لو نا۔ یہ اپنی ربیعہ آج کل اچھی شیفٹ بن چکی ہوئی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی چیز ہم پر
 آنائی ہے لیکن آج کی دس واقعی اچھی ہے۔ ٹرائی کرنا۔"

امیر حسن بھی ٹرائی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ربیعہ کچھ سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کا آخری پہر تھا۔ عرشہ نے بے چینی سے کوٹ بدل کر اور بارش سونپی ہوئی ماہین کو دیکھا۔
 "خوش فقیہ ہو گیا! اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کو دبا کر سوچا۔ "منینہ سے لطف اندوز ہونا قسمت
 والوں کا کام ہے۔ ہم سے حواس غیبی ہوں کورات اور رات کو کون کرنے کے یکسر ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔"

آج پھر منینہ اس کی آنکھوں سے کھول کر دیکھی۔ آج پھر زندہ کر میں سی اچھی لگتی دل میں۔ ماہین کی مندریں پھر
 دل کے دکنے ہونے والوں کو چھیڑ گئیں۔

فرانس۔ فرانس۔ فرانس۔ یہ نام اس کے لیے جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے خال پر
 صبر کرنا چاہتی تھی کسی بھی کسی کے لبوں سے اس نام کا ذکر کرنا کر رداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔
 "طیلا! کڑی وقت! آئیں۔" وہ اپنے لیے چلی گئی۔
 "منینہ! تو پھر اس کی وقت لیا جاسکتا ہے۔" یہ اس کا جواب تھا۔

اسے اپنا جواب اب بھی تک یاد تھا۔ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ کتنا تھا اس نے اور اب ہرگز راتوں اسے اتنا تھا کہ
 ابھی وقت ہے۔ ابھی وقت ہے۔ وہ ابھی کسی کا ذکر کرنا اور تو کسی بن کر بھی نہ بنی۔ بن بھی نہیں سکتی۔ یہ بے
 کار کا زبردستی کا ناطہ بھی کسی کو خوش نہیں بنائے ملک۔
 "تعلق کو تو جھن جابے تو اس کو تو تو آج صبح۔" دل نے سفاس کی کہا۔
 وہ دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے ماہین کو دیکھا۔

یہ ناعمدہ یہ کیسے بچی اس کی روتوں کو دیکھا۔ یہ میرا تھا۔ میرا ہے۔ اس کی بھی میں اس کی ہوں۔"

وہ بڑے اثر کی پھر اس کی روتوں کی مانند چلی ہوئی لاؤنج آئی۔
 "کسی کا ذکر نہیں ہے مجھے؟ ہر خوف سے آزاد ہو چلا ہے۔ دل۔ اس ایک ہی لگن ہے؟" وہ میرا نہیں بن سکتا تو
 ناعمدہ بھی اسے نہایت ناعمدہ نے اسے عرشہ بن کر بھانسا ہے میں اسے بناؤں گی کہ میں کون ہوں۔"

وہ صوفے پر بیٹھی اور برابر میں رکھا فون بیٹ اٹھایا۔ فرانس کا ٹیل نمبر اب تک یادداشت میں اسی آب و تاب
 سے جگمگا رہا تھا۔

باقی آئندہ شملانے کے لیے

”آپ کے لیے کھانا لگا دوں عباد بھائی؟ ناشتہ بھی بہت لائٹ سا کیا تھا آپ نے“

”میں نے مٹر چاول اور چکن کتاب بنائے ہیں۔ آپ کا فیورٹ کبھی نیشن۔ ساتھ لوکی کا راستہ بھی ہے۔“

”آپ یہ کھلیک لو ہیں؟“ ربیچہ لون بہت جھکا ہوا ست ساسکھوم ہوا۔
 ”نہیں، تم کہہ رہی ہو؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کہاں؟“

”نہیں، تمہیں کچھ نہیں پتا۔“

میں نے اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کر دی ہے۔

”میں کچھ دیر سوؤں گا۔“ عباد نے ایک مہری سانس بھری۔ ”تم لوگ اختیار ہو جاؤ تو مجھے جگنا۔ میں چھوڑ آؤں

”ابن رست کریں۔ ہم کو کسی میں بی بی ہے جائیں۔“

کامیابی کے لیے غور سے سوچنا ضروری ہے۔

”ہاں ربیعہ! میں تو تیار ہوں۔ ذرا یہاں آؤ۔“ ربیعہ کمرے میں چلی آئی۔

کئی۔ حندوبی میں سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔

انہوں نے چند چھوٹی چھوٹی نکلیاں اسے دکھائیں۔

”ہاں۔۔۔ فریبا“ پچاس لاکھ مالیت ہوئی اس کی۔ میں اسی بے ماریٹ جانا چاہ رہی ہوں۔ مجھے ایسے سارے پتے

مردادی کے زبورات ہیں۔ جو سونا میرا ہے، وہ میں نے سارے کا سارا تمہارے نام کر دیا ہے۔“

”انتا زیور سیکی میں لے جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ ہم مجاہدوں کو جتنا دے سکیں، سب سے زیادہ دے دیں گے۔“

”لیکن امی جی!“ وہ ہنسنے لگی۔ ”جیسے سونا آپ کا ہے، اس پر بھی میرا نہیں، شہلا آ“

”ربیعہ“ پھر وہ جسے سرگوشی میں بولا تجھ سے۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ تم کہہ رہے ہو کہ

نس کا حق ہے وہ اسے ہی ملنا چاہیے۔ میں شہلا اور انہی کا حق تمہیں نہیں دے رہی۔

”ربیعہ“ اور دوسرے دوسرے اس کے مال، سہلانے لگیں۔ ”جب ہم لڑیں، گھر تر

ہیں ہم پر۔“

میں نے کتنی راتیں صرف اس سوچ میں مبتلا کر گزاریں ہیں کہ میں، آپ سے مجھ

میں نے تجھ کو ملتی ہوں مٹی، تیرے ہی خا جو شہ رسی۔ ” انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ”

ربیعہ کو عساکر کی بات یاد آئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مضطرب ہو کر ان کا حوالہ کیا۔

انی کی شادی کی تیاریاں کریں، مجھے شادی وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔“

”آپ نے کہاں جانا ہے؟“ رابعہ ان کے سارے لمحے طے کی گئی بات کا مطلب لے کر

اپنی سی کو شش تو ضرور کرتی ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔“

”آپ اکثر میرے ہاتھ جو متوڑیں۔ مرنے کے بعد آپ کو شہلا آبا یا انیس کے ہاتھ جو متے

”کیا۔“ راجہ محویت سے ان کے سلونے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھنے لگی۔

3007

”نہیں دیر نہیں ہوئی ابھی۔“ منیوہ بیگم معنی خیزی سے مسکرائیں۔ ”چلو چلیں۔“



ربیعہ کے ہتیرا منع کرنے کے باوجود منیوہ بیگم نے وہی کیا جو انہوں نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے جیسے کامسارا سونا ربیعہ کے زیورات تیار کرنے کے لیے جو لڑکے حوالے کر دیا تھا۔
”تم مجھ سے بار بار مذاق میں پوچھتی تھیں کہ میں مارکیٹ آنے کے لیے اتنی بے چین کیوں تھی۔“ انہوں نے ربیعہ سے کہا۔ ”تو یہی وجہ تھی۔ میں یہ کام نمٹانے کے لیے از حد بے چین تھی۔ آج میں مطمئن ہوئی ہوں۔“
وہ دونوں جو لڑی شاپ سے نکل رہی تھیں۔ ربیعہ خاموش ہو گئی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ تھی۔ اس کے خیال میں منیوہ بیگم کی ملکیت پر ان کی بیٹیوں کا حق تھا۔ اسے انھیں اور شہلا سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیوں نہ کچھ گرم کپڑوں کی شاپنگ کریں، سردی بس پہنچنے ہی والی ہے۔“ منیوہ بیگم نے مسرور سے انداز میں کہا۔ وہ اپنا بوجھ اتر جانے سے بہت خوش لگتی تھیں۔

”آپ نے اپنی ضروری کر لی؟“ وہ ہار مانے والے انداز میں بولی۔
”جی ہاں، میں اپنی باتیں مانتی ہوں۔“ وہ بریاری انداز میں بولیں۔

پھر وہ دونوں ایک شاپنگ بلازہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ منیوہ بیگم ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوئیں تو ربیعہ وندوؤں کے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ تب ہی کسی نے بے حد مسرت جوش اور حیرت کے طے پہلے جذبات سے اسے پکارا تھا۔

UrduPhoto.com

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا پھر کچھ بھر کے لیے جیسے پتھر کی ہو گئی۔

”ترانہ؟“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے عالم میں نکلا۔ ”ترانہ؟ تم یہ تم ہو؟“
ترانہ نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ عالم جوش میں وہ جیسے بولنا چھوٹی تھی۔ بس ربیعہ کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

”اوہ خدا۔ آج میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی ملتا۔ آج وقت تو بہت تھا ربیعہ!“ پھر وہ گلو کیہ لہجے میں بولی۔ ”آج گھر سے نکلنے وقت میں نے نجانے کیوں شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔“
دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ چند لمحوں بعد انہیں آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کا احساس ہوا تو وہ علیحدہ ہوئیں۔

”ایک منٹ ترانہ!“ ربیعہ بولی۔ ”میں ابھی آئی۔“

ترانہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے دکان میں داخل ہوئی تھی۔ منیوہ بیگم کاؤنٹر کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دکاندار انہیں مختلف کپڑے دکھا رہا تھا۔

”ای جی سیسے“ ربیعہ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”میں باہر ہوں، آپ اطمینان سے شاپنگ کریں۔“
”خیریت؟“ وہ پوچھیں۔

”میں بعد میں بتاؤں گی۔“ وہ اسی تیزی سے باہر نکلی تھی جیسے اسے پھر سے ترانہ کے کھوجانے کا خدشہ تھا۔
ترانہ وہیں کھڑی تھی۔ ربیعہ اسے لے کر قدرے کم رش والے حصے میں چلی آئی۔
”اب کو تم یہاں کراچی میں کیسے؟“

”ایک لمبی داستان ہے۔“ ترجمانہ میسکر ایٹ عجیب سی تھی۔ ”سننے کے لیے کم از کم دو راویں چاہیے ہو گا۔ بس مختصر ”یہ کہ میں نے اور عبدالباری نے کورٹ میں کر لی اور یہاں آگئے۔ خدا کے فضل سے باری کو اچھی نوکری مل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔“

”اوسے اور سہ پیچھے والے لوگ۔۔۔ سب کیسے ہیں؟ منور پچھلا۔ مینا آئی۔ صولت۔ قصور اور تون بھائی۔ سب سب لوگ کیے ہیں۔ میرے چلے آنے کے بعد کیا کر رہی ہوں۔“

ترانہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔
”ہمت محبت سے بنایا ہے خدائے تمہیں۔ تمہارے اندر کتنی محبت ہے ربیعہ! بونی تو نہیں تم اتنی خوبصورت ہو۔ وہاں شاید ہی کبھی کسی نے تمہیں اس انداز میں یاد کیا ہو اور تمہیں اس طرح ان سب کے نام لے رہی ہو جیسے پیچھے کوئی ہمت پنوں کو یاد کرے۔“

ترانہ کالجیہ تم ہو گیا تھا۔
”بابہ! کیا شک ہے اس میں۔ دیکھتے نہیں پر شاید اسی ایک گھر سے میرا خلی رشتہ ہے۔ ترانہ اور تون تو مجھے کہیں اپنی بڑی نظر نہیں آتیں۔“

”کی زمانہ خون پالی سے کیمیت ہے ربیعہ!“ ترانہ دھجے سے ہنس دی۔ ”بھئی متیرا ناوان غولی رشتوں کو۔“
”کیسے نہ کو ترانہ!“ ربیعہ کو دکھ سا ہوا۔

”خیر نہ تم اپنی سادگی عباد بھائی کے ساتھ اگر کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟ کبھی کوئی بریٹان تو نہیں ہوئی؟ تم سوچتی ہو گی کہ ایک اور مرتبہ خون کے بعد میں نے بھی تم سے رابطہ نہیں کیا تو میری سن! آج ساری داستان تمہیں سناؤں گی تب تمہیں حقیقت کا علم ہو گا۔“

”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔“
”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں کوئی غرض نہیں کوئی محبت نہیں۔“

”مگر یہ خدا کا میرے دل سے آج ایک بہت بڑا ہوا ہے۔ اگر تمہارے بارے میں سوچتی تھی نہ تجھے تم کس حال میں ہو گی۔ تم ہمارے خاندان کا حصہ تھیں۔ تمہاری حفاظت ہمارا فرض تھا لیکن جب رکھوالے کی دشمنی بن جائیں تو۔۔۔“

”وہ دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مگر ترانہ نے جلدی سے خود پر قابو پایا۔“

”میں تمہیں اپنا دل پس دیتی ہوں۔“ وہ اپنا سر کھول کر بہن نکالنے لگی۔ ”تم کل ہی مجھے ملے تھے۔“
احساس ہوا ہے کہ دنیا میں میرا اپنا بھی کوئی ہے، ہم دونوں جی بھر کر باتیں کریں گے۔ آف خدا۔ میں کس قدر خوش ہوں۔ باری بھی تم سے تمہیں مل کر بہت خوش ہو گا۔“

”دیکھتے دیکھتے دو دن ان کی بولی رہی تھی۔ پتہ ربیعہ کو تھا کہ اس نے گرم چوٹی سے اس کے ہاتھوں کو پایا۔“
”کوئی نارہیہ!“

”یہ بھی دیکھنے کی بات ہے۔ یہ تو تجھانے وقت کیسے گزرے گا کل تک۔“
”تم سے ملنے نہ ہو گئی نہیں کر تائیں میں چند ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔ باری کے آنے سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔“

”نکل میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لیتا۔“ ربیعہ شرارت سے ہنسی۔
”ضرور۔“

”اچھا۔ خدا حافظ۔“ ربیعہ نے محبت سے ہاتھ ملایا۔

ترانہ مڑ کر علی دی تھی۔ ربیعہ وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جب وہ بیچوم میں گم ہو گئی تب ہنر کر مینہ دیکھ کر اس کی طرف آئی تھی۔
”گوئی مل گیا تھا؟“ انہوں نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔

”جی۔۔۔ میری پیچھے ڈاؤن۔“

”پیچھے ڈاؤن؟“ وہ تجعب سے پوچھنے لگی۔

ربیعہ کو یاد آیا۔ عباد نے سب سے اس کے متعلق ہی کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔

”میں۔۔۔ میں کچھ مل کر آ کر کھانا کھاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ہوں۔۔۔ انہوں نے مجھے سمجھتے ہوئے سر ملایا۔ ”اچھا۔ یہ رنگ دیکھو۔ یہ سوٹ تمہارے لیے لیا ہے۔“

”نہایت اچھے کیسے۔“ ہمیں گول سا زانو پہنڈے؟“
ربیعہ ان کا دل دیکھنے کے لیے ان سے شاباش دیکھ کر کہنے لگی، ”ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ترانہ سے ملنے کے بعد اب اس کا کسی بات میں کچھ مل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کچھ کا عرصہ ملک چھپے ختم ہو اور وہ ذکر ترانہ کے پاس جا پہنچے۔ اس کا ذہن اندرون لگا ہوا ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن میں تنگ رہا تھا۔“

شملہ نے آٹھ مرتبہ بچے والی کلاک کی جانب دیکھا اور سوچ انداز میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر وہ اٹھی اور جا کر ڈسٹرکٹ ٹیبل کے سامنے کچھ اسٹول پر بیٹھ کر اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔
”آج میں خود کو کھانا کھاؤں گی۔“

”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔“
”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں کوئی غرض نہیں کوئی محبت نہیں۔“

”مگر یہ خدا کا میرے دل سے آج ایک بہت بڑا ہوا ہے۔ اگر تمہارے بارے میں سوچتی تھی نہ تجھے تم کس حال میں ہو گی۔ تم ہمارے خاندان کا حصہ تھیں۔ تمہاری حفاظت ہمارا فرض تھا لیکن جب رکھوالے کی دشمنی بن جائیں تو۔۔۔“

”وہ دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مگر ترانہ نے جلدی سے خود پر قابو پایا۔“

”میں تمہیں اپنا دل پس دیتی ہوں۔“ وہ اپنا سر کھول کر بہن نکالنے لگی۔ ”تم کل ہی مجھے ملے تھے۔“
احساس ہوا ہے کہ دنیا میں میرا اپنا بھی کوئی ہے، ہم دونوں جی بھر کر باتیں کریں گے۔ آف خدا۔ میں کس قدر خوش ہوں۔ باری بھی تم سے تمہیں مل کر بہت خوش ہو گا۔“

”دیکھتے دیکھتے دو دن ان کی بولی رہی تھی۔ پتہ ربیعہ کو تھا کہ اس نے گرم چوٹی سے اس کے ہاتھوں کو پایا۔“
”کوئی نارہیہ!“

”یہ بھی دیکھنے کی بات ہے۔ یہ تو تجھانے وقت کیسے گزرے گا کل تک۔“
”تم سے ملنے نہ ہو گئی نہیں کر تائیں میں چند ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔ باری کے آنے سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔“

”نکل میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لیتا۔“ ربیعہ شرارت سے ہنسی۔
”ضرور۔“

”اُس اودے“

”نہیں دے دیجئے۔“ اس نے اصرار سے کہا۔

”رہے نہ، یہ کافی دیر ہے۔“

”وہ دس تا بیس گھنٹے میں رکھ دیتی ہوں۔“

ہاشم نے اُرد گردانی سے باہل خواستہ برف کیس اسے تھمایا۔ شملانے سر جھکا کر اسے اندر داخل ہونے کا رستہ دیا تھا۔ ہاشم قدیم بڑھانا بھول گیا تھا۔ وہ اس کے آویز دیکھنے لگا جو شاید اس نے پہلی بار پہنے تھے۔

شملانے مرکز چل دی تھی۔ تب اس نے بھی چونک کر قدم بڑھائے تھے۔ وہ میز حیاں پر بیٹھ لی۔ وہ اس کے قدم گنتا اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ہاشم کو خوش گوار سا احساس ہوا۔ اس کے پسندیدہ اینیر فریشر کی دھنکی منہک میں باصاف تھرا کر وہ جا ہوا تھا۔ شملانے برف کیس الماری میں رکھ دیا پھر مرکز اسے دیکھنے لگی۔

”کچرے چھین کر لیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر لایا۔

شملانے گواہ کیا وہ جب بھی خوش ہو نا تھا اسے باہر کھانا کھانے کے لیے کتنا تھا۔

”قید کر لیتے بنے ہیں۔ آپ۔ آپ شوق سے کھائیں گے؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے سر لایا۔ ”جو بھی ہو۔“

شملانے الماری سے پشت نکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاشم کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ٹالی کی ٹاٹ ڈھکی کی پھر آستین کے شکن کھولنے لگا۔

”کچرے ڈرے دیکھ رو میں لٹا کئے ہیں میں نے استری کر کے۔“

ہاشم نے اس کا سر لایا دیا۔

”ٹھیک ہے۔“

اس نے ٹالی گردن سے نکال کر پیچھے پڑھ کر جوئے آ رہی لگا۔

”آپ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟“

ہاشم نے چونک کر سر اٹھایا۔ شملانے نظر اس جھکاے قالین کو گھور دی۔

”میں میں آتا۔ آتا بھی۔ دراصل کل مجھے ہاشم نہیں مل سکا۔“ وہ ہٹکایا۔

شملانے اب کی بار قدرے شکاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے فون کر کے کر سکتے تھے لیکن آپ نے ایک مرتبہ فون تک نہیں کیا۔“

ہاشم کے ہاتھ میں اس کے موزے تھے وہ انہیں جوتوں میں رکھنا بھول گیا۔ ایسی شکایتیں تو اس نے خواب میں بھی سنی ہوں گے۔

”کتنی اہم سوزی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ ”نہیں نے شاید خیال نہیں کیا۔“

”جی ہاں آپ آپ کہی خیال کرتے ہیں۔“ اس نے پھر گناہیں جھکا۔

ہاشم کھڑا ہوا تھا، چند قدم بڑھنا کو اس کے قریب آ گیا۔ شملانے گواہنے قالین پر دھڑکی سرفی کا احساس ہوا۔ اس کا

دل کی نئی رفتار سے چلا تھا۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ قدرے سمٹ گئی۔ ہاشم نے وارڈ روب کا دروازہ کھولا۔

شملانے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اپنی شرٹ نکال کر ہاتھ شملانے خفیف سی دھکی۔

”کھانا۔ کھانا۔ اوپر لے آؤ؟“ وہ ہلکی سی آواز میں اتنا ہی پوچھ سکی۔

”نہیں، نیچے سب کے ساتھ کھاتے ہیں۔“

”نیچے ابھی کوئی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔ ”میں نہا کر فریش ہوتا ہوں، تب تک سب آجائیں گے لیکن پہلے

ایک کپ چائے ملا دو تو بہتر ہو۔“

”میں ابھی لے آتی ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

ہاشم ایک بار پھر حیران ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

”یہ لوہ۔“ راجہ بیگم نے ایک سفید لفافہ درود کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے امی جی؟“ اس نے اشتقاق سے لفافہ کھول کر اندر دیکھا پھر حیران ہوئی۔ ”یہ تو چھٹی پھلی رقم ہے۔“

”تھکتے ہیں۔“

”چتا نہیں لیکن لوہ یہ اماں نے دیکھے ہیں۔ ان کی جانب سے ناعمہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ انہوں نے کہا

ہے کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بولا یا جائے۔“

درود رقم لے گئی۔

”پورے بیچاس ہزار ہیں لیکن ٹالی امی نے اسے زبان باندھ دیا۔“

”میں نے نہت بیخ کیا تھا پھر راجہ بیگم نے کہا کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بولا یا جائے۔“

”تھکتے ہیں۔“

”چتا نہیں لیکن لوہ یہ اماں نے دیکھے ہیں۔ ان کی جانب سے ناعمہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ انہوں نے کہا

ہے کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بولا یا جائے۔“

”چلتیں خیر ہے، وہ بھی ہمارے اپنے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچنا ہی تھا۔ آپ کا بھی بوجھ بٹکا ہو گیا۔“

”فرزاد کی والدہ بیوی گمرو کے خلاف ہیں۔ وہ شاید مجھ پر پھیند نہ کریں۔“

درود خاموش سی ہو کر سوچنے لگی۔

”ایک مرتبہ فرنیچر تیار ہی کیے فراز دست سلیکٹو ہے۔ اسے ہر چیز پسند نہیں آتی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے

اپنا کمرہ دست سلیکٹو انداز سے ڈیکھ لیا ہوا ہے۔ نوک فرزان کا فرنیچر خاص طور پر صرف کمرے کی بناوٹ کو نظر

رکھنے کے لیے بھجوا دیا تھا۔ میرا خیال ہے اس میں فرنیچر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ یہ رقم ناعمہ کے اکاؤنٹ میں

ڈال دیں۔“

”جیسا کہ میں نہ کریں کہ تم باتوں ہی باتوں میں فراز کا غم بے لوب ہو سکتا ہے وہ فرنیچر تبدیل کرنا چاہے۔“

”وہ نہتہ رشامندی سے بولی۔“ چلتیں یہ بھی کر لیں گے۔ ثانیہ کہہ رہی تھی کہ اس نے سینئر لڑ لیا ہیں

تو ساتھ ہی ناعمہ کی سینئر لڑ بھی لے لی جائیں۔ آپ اس نے کہا نہیں؟“

”کہا ہے۔“ وہ فراغت سے بیٹھے ہوئے بولی تھیں۔ ”ابھی رات آفس سے آجائے تو ثانیہ اور ناعمہ کو مار کر

لے جائے گا۔ تم بھی ساتھ جانا۔ اس ناعمہ کو کوڑی کی عقل نہیں ہے۔ صرف پیچنگ چھین لے آئے گی۔ تم

اسے ایسی سینئر لڑو لانا جو ایک سے زیادہ جوتوں پر چل جائیں۔“

درود متامل سی نظر آنے لگی۔ ہر چند کہ ماں کی بات رو کر نا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

”رہے دس امی! پھر بولی۔“ ثانیہ اور ناعمہ کو ہی جانے دیں۔ جو چیز بھی ہو، وہ ان کی ذاتی پسند کی ہوتا

لاؤنج کے دروازے پر رافع کھڑا تھا۔ رابعہ بیگم بھی بنے ساختہ کھڑی ہوئی تھیں۔ رافع کی نظریں درود کی نظروں سے ملیں، درود مقرر کرنے میں غلطی کی۔
 ”کو رافع“ رابعہ بیگم نے سنبھل کر اسے پکارا۔
 وہ چند قدم اندر چلا گیا۔

”السلام بیگم، باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں نے سوچا لاؤنج میں دستک دے دوں گا۔“
 ”وہ بیگم السلام، جیتے رہو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر ہاتھ پھیرا۔ ”میں ابھی تمہاری طرف سے آ رہی تھی۔ دروازہ میں سے ہی کھلا چھوڑا کیونکہ تانیہ نے کہا، وہ بھی پیچھے آ رہی ہے۔“ بیگم۔ ”انہوں نے رافع کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ اخذ کرنے سے قاصر رہیں۔
 ”میں ناعمہ کو لینے آیا ہوں، پیچھو! تانیہ گاڑی میں بیٹھی ہے۔“

”جھانک! میں ناعمہ کو کبھی نہیں ہوں۔“
 ”وہ کون ہے؟“ رافع نے پوچھا۔ ”وہ بھی ساتھ چلے۔“ وہ قدرے جھجک کر بولا۔
 ”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”وہ نہ سنے۔ کچھ نہیں لیتا۔“
 پھر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ کل ماہین کے ساتھ بارکٹ جانے کا ارادہ کر رہی تھی۔“
 ”بستر پھر آپ ناعمہ کو بھیجیں۔ میں اور تانیہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ وہ آواز کر چل کر رافع بیگم نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ قات کو دیکھ کر دل میں ایسا شاعرانہ گما تھا پھر وہ کوئی خیال آنے پروردہ اور ناعمہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔
 ”میں نے کہا تھا، آپ اس کی جان بچھیں۔“
 ”تانیہ میں نے اس کی جان بچھ دی۔“
 ”تانیہ میں نے اس کی جان بچھ دی۔“

”آپ میرے سارے کام کر دیتی ہیں۔ اس میں کیا تامل ہے؟ تانیہ بھی تو ساتھ ہے۔ آپ اور تانیہ اچھی شاہنگ کر لیں گی۔“
 ”پلیز ناعمہ۔“ وہ زنج ہوئی۔
 ”پلیز کیا۔“

”ناعمہ۔“ رابعہ بیگم نے زور سے بولی۔ ”کیا مذاق ہے یہ؟ چلو! آٹھو! چار لو اور جاؤ۔ وہ لوگ گاڑی میں ناعمہ نے ہاں کے تیرو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اب ایک لفظ مزید کہنا محال ہے۔ وہ جھپکے، اٹھی اور الماری کھول کر چادر نکالنے لگی۔ درود پانچ کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ رابعہ بیگم بڑ پریشان ہو گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔

”تم کو بھی مجھے شک کر رہے ہوں۔“ وہ جھلائی تھیں۔ ”جانتے ہو یاں کو سنا کتنا برا گناہ ہے۔“
 ”جی جی۔“ جانتا ہوں۔ آپ مجھے یہ گناہ کر لینے دیجئے۔ چلیں! انھیں ”شاہباش۔“ عباؤ نے چیلیل لا کر ان کے قدموں کے قریب رکھ دیں۔
 ”وہ بیگم میرے زندگی کے جتنے دن ہیں، وہ یہ میٹ کروانے سے بڑھ نہیں جائیں گے۔“
 ”محتاج لازم ہے۔ شاید آپ نے سنا نہیں، اور مجھے یہ جذباتی باتیں نہ سنیں۔ میں نے آپ کے لیے تاثر لیا۔“

چاہے۔ ناعمہ کو یہ شک سینڈلز کا کر رہے تو چند سینڈلز زیادہ ہی سے لے گیا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے، میں نہ جاؤں تو میرے چلنے کوئی بات نہیں۔ لیکن تم اپنے لیے شاہنگ کر لینا۔ شادی سر رہے، تم نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں خریدا۔“

”میں باہین کے ساتھ جاؤں گی، کل پانچ برسوں۔“
 رابعہ بیگم نے قدرے غور سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ درود گاڑی چرانے لگی۔
 ”وہ رہے۔“ کچھ کہتا تھا رافع کے ساتھ جانے سے انکاری ہو۔
 ”جی؟“ وہ چونکی۔ اس کے کمان میں بھی نہ تھا کہ رابعہ بیگم ایسی بات کہیں گی۔
 ”جانتا نہیں۔“ اس کے بول سے بے سوچے سمجھے نکلا۔
 ”مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“ اس کی نظروں میں کمری تشویش اتر آئی۔ ”وہ رہے۔“

پاس آکر بیٹھو۔“
 درود آہستہ سے اٹھی تھی۔ مدھم چال چلتے وہ ان کے قریب چلی آئی۔ رابعہ بیگم نے اس کا ہاتھ قلم کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔
 ”وہ رہے۔“ کچھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا رشتہ بڑ گیا ہے۔ وہ تم سے لڑ رہا ہے۔ تم اس سے خفا۔“
 ”میں میں تو کسی سے خفا نہیں ہوں۔“ اس نے غلات میں ہاں کی بات گائی۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“
 ”پھر یہ کب کر کیا؟ یہ تو محض دلوں کے میل کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا تمہارے دل میں اس کی جانب سے کوئی بدگمانی ہے؟“

”میں ابی کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی پھر رافع کی جانب دیکھا۔ ”میرے دل میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ بات ختم اتنی ہی ہے۔“
 رابعہ بیگم نے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”بس یہ اتنی سی بات ہے؟ اس بات پر تو زندگی کی خوشیوں کا دھندلار ہو کر رہا ہے۔ درود اتم سے اتنی سی بات کہہ رہی ہو۔“

درود نے سر جھکا لیا۔ رابعہ بیگم شکر کی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔
 ”اور اس کے دل کی کوئی کچھ خبر ہے؟ وہاں تمہارے لیے کتنی جگہ ہے؟“
 ”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ اس نے غمی میں سر ہلایا۔
 ”غلطی یہ بات رافع کے علاوہ صرف ہمیں معلوم ہوگی۔ ایسے جذبے کا تاب کے پھول ہوتے ہیں۔ نظریہ آئیں تو ان کی خوشیوں کی موجودگی کی خبر دیتی ہے۔“

درود کو لگا جیسے درود نے اپنی ہاں سے دل کے نازک گوشے کو نشتر سے چھیرا تھا۔
 ”ہو لو درود! آپا تم دونوں ایک دوسرے سے بندھ جانے والے دو مختلف سمتوں کے نشان ہو؟“
 ”اس بات کی کیا اہمیت ہے اسی؟“ وہ غم ناک لہجے میں بولی۔
 ”بہت اہمیت ہے۔ جی! میں اولاد کی خوشی کے لیے زمانے سے بغاوت کر سکتی ہوں۔ اگر تم اپنے دل کو رافع کے لیے آگاہ نہیں یائیں تو کل کراچی رائے کا اظہار کرو۔“ زبردستی جانوروں کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ”انسانوں کے ساتھ نہیں۔ کیا تمہیں رافع پسند نہیں؟“
 درود نے نظریں اٹھائیں پھر دھک سے روٹی، وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

”میر حسن کے کزن ہیں شہیار احمد، وہ بکے سے آئے ہیں۔ میں نے کل ان لوگوں کو کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کھانا بہت وی آئی کی قسم کا ہو۔ ویسے تو تم بہت ماہر ہو کونگ میں لیکن کل کمال ہی کرو تو اچھا ہے۔ امیر حسن تو خیر بہت سادہ مزاج آدمی ہے لیکن یہ شہیار صاحب کیسے ہیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ پچھا امیر لیکن اچھا زبان چاہیے۔ کیوں؟“

”جیہے، ٹھیک ہے عبادت بھائی، اس سے سر ہلایا۔
”گوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟“

”کمال کرتے ہیں۔“ اس نے پرانا نام۔ ”آپ صبح ناشتے کے وقت ڈش و ڈسائیڈ کر بیٹھے گا۔ ایک مرتبہ وہینو سیٹ ہو جائے تو میں سامان بھی منگوالوں گی اور اشارت بھی جلدی لے لوں گی۔“ عبادت نے اسے دیکھا۔
”کے۔“

”اس کی بڑھائی دو روں پر چل رہی تھی اسے نگہ نہ کریں۔ میں خود اپنی ہیلمپ کر سکتی ہوں۔ سات آٹھ ڈشیز ہی ہوں گی، کوئی اتنا بڑا بوجھ نہیں کھینچے جو آپ میرے لیے پریشان ہوں۔“

”ٹھیک ہے سوچ۔“ وہ لگا بھانکنا ہو گیا۔
”عبادت بھائی آج کچھ بازار میں ترانہ لی تھی۔“
”بھئی،“ عبادت کو حیرت ہوئی۔
”تو بازار سے اپنا ایڈریس لے کر آئی، اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا ہے۔“

”میں نے تو اسے اپنا ایڈریس نہیں دیا، غلطی ہوئی پھر برسوں آپ ٹھکے ترانہ کے گھر چھوڑ آئیں گے؟“
”میں کل رات ہی چھوڑ آؤں گا۔“ وہ ہنس۔ ”جیسا ہوں، تمہارے پیٹ میں کتنے تل پڑ رہے ہوں گے۔ میں نے شاید کل دعوت کا کہہ کر غلطی کی۔“
”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، ہم کل نہیں تو برسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”آؤ اب۔“ عبادت نے اس کو آواز پر فردوس سیکر نے مرکز دیکھا تھا انہیں خاصی حیرت ہوئی۔
”جیسی رہو، یہ ہمارے نصیب کیسے کٹے؟ ایقان بیگم ہمارے گھر آئیں۔ خدا کی قدرت! اسے بھی انہیں تو بھی گھر دیکھتے ہیں اپنا بیٹھو۔“
ایقان صوفے پر ٹیک بیٹھی پھر اس نے لالچ کا بازو لیا۔ واقعی وہ کافی عرصے کے بعد آئی تھی وہاں کی سینگنگ تک تھوڑی سی گنجی تھی۔ کئی ایسا ہی معلوم ہوئی تھیں۔
”کوئی کمی ہو؟“ وہ قریب آئیں۔
”شکر ہے خدا کا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”خاترمیاں کی کوئی خرچہ؟“ دور اندازی سے آگے کو جھکیں۔
”نہیں۔“ اس نے سر ہکا۔
فردوس بیگم قدرے سٹکارا بیچنے کو ہوئیں۔

”ہے اور ہم اسپتال چارے ہیں۔“
”رہید ان کی باتیں سن کر مسکرا دی۔
”آپ سال بیکہ کی نوک چھوٹیک میں تو قائم ضروری نکل جائے گا۔“ وہ بولی۔
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ عزم انداز میں بولا۔ ”اب اگر انہوں نے ذرا سے پس و پیش سے کام لیا تو میں انہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

وہ بازو چڑھانے لگا۔ منینہ و بیگم اٹھ کر چھیل پسنے لگیں۔
”چلو، جیسے کوم۔“ وہ بار بار کر رہی تھیں۔
عبادت نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔
”شکر کرنے پر معذرت۔“ لیکن یہ کہنا نہیں سمجھیں، بیکار تو اب ہے۔“
انہوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ایک چپٹ لگائی تھی۔
ان لوگوں کے جانے کے بعد ایقان صوفے کے لیے اسے کمرے میں چلی گئی جبکہ رجبہ وینو ڈینکے کمرے کے لیے کچن میں چلی آئی تھی۔

کہہ دو ان وہ ترانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ کتنے خوش قسمت اس نے ترانہ سے فون نمبر بھی لے لیا ہو تا تو اس وقت وہ اس سے فون پر ہی بخود ہی بہت بات کرتی۔ ترانہ کے کارڈ کافی مشکل لگ رہا تھا پھر اسے خیال آیا کہ اس کے پاس ترانہ کا صرف خرچہ شدہ ایڈریس تھا جسے وہ فون کے میں دقت ہو سکتی تھی۔ اسے بھی خیال آیا کہ اس نے عبادت سے ترانہ کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی آیا تھا اور آتے ہی منینہ و بیگم کو میٹ کے لیے لے گیا تھا۔

رہید نے ارادہ باندھا کہ وہ ان لوگوں کے آنے پر عبادت کو ترانہ کے متعلق جاننے لے لے اور اس کے لیے کمر لے لے۔
اسے ترانہ کے گھر ڈراپ بھی کر دے۔
”قربا“ وہ ٹھٹھکے لیوان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ منینہ و بیگم اس قدر تھکی ہوئی تھیں کہ وہ کوئی بھی بات کیے بغیر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ عبادت کھانا کھا کر صوفے پر بیٹھا تھا۔
”جائے بنا دوں عبادت بھائی!“ رہید نے اسے ہد روتی سے دیکھا۔
”اگر ٹکلیف نہ ہو تو؟“

”ٹکلیف نہ بہت ہوئی لیکن میں پھر بھی ناواقف ہوں۔“ وہ بار بار کر رہی۔
پھر وہ چائے بنا کر اس کے پاس چلی آئی۔ عبادت نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آہٹ پر بیٹھ گیا۔
”ای کوئی اور اہم ہے عبادت بھائی؟“ رہید اس کی بیچیدلی سے ڈر رہی تھی۔
”کچھ بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”ابھی تو میٹ چل رہے ہیں، تم دعا کرو رہید!“
”یہ بھی کہنے کی بات ہے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔“
”تم بہت اچھی ہو رہید!“ وہ منونیت سے مسکرایا۔
”اپنے کے لیے تو سب ہی دعا کرتے ہیں۔ آپ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”یہ شک۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

رہید اسے ترانہ کے متعلق بتانے کا سوچنے لگی۔ تب ہی عبادت بولا تھا۔
”رہید، کل ذرا سا کام ہے۔“
”جی۔“ وہ چونکی۔ ”کبھی؟“

”خرجا تو بھینٹا ہو گا یا وہ بھی نہیں؟“

ایقان اس قسم کے سوالوں سے ناک تک بھری ہوئی تھی۔ وہ کوئی زندہ انداز میں کھڑی ہوئی۔
”میں شملہ سے ملنے آئی ہوں بھائی، تیکم لیا وہاں سے کمرے میں ہے؟“

”ہاں۔۔۔ ہم بھی سوئیں یہ بھائی، تیکم کے لیے لڑا دیکھ لکھنا ہاں! ہاں! ہاں!۔۔۔ سبھی تمہاری اپنے کمرے میں ہی ہیں سیکے کے علاوہ زیادہ تر وہیں ہوئی ہیں۔ ہم تو اس عید کے چاند کو کم ہی دیکھتے ہیں۔“

ایقان کی بہن کے دروازے پر شملہ نمودار ہوئی تھی۔

”میں یہاں ہوں ایقان! اردو لکھا رہی رہوں۔ تم بیٹھو میں آئی۔“

فردوس تیکم ہری طرح سٹپٹائی تھیں پھر انہوں نے خود پر قابو پایا۔

”جائے کب چلی آئیں۔۔۔ لیکن کی طرح۔۔۔ وہ بڑا نہیں۔“ تیز ہی نہیں ہوئی۔

ایقان بیٹھنے کے بجائے بہن کی جانب ہی بڑھ ہی گئی۔ دفعہاً ”جیسے اسے کچھ خیال آیا تھا اس نے مرکز دیکھا۔“

”بھئی! تیکم! ایہ آپ کے راز و خرم کہاں ہونے ہیں آج کل؟“

”ہاں نہیں۔۔۔ کون؟“ وہ قطعاً نہ سمجھیں۔

”مختصر میاں کا پوچھ رہی ہوں۔“

”آرتھ؟“ ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”تک۔۔۔ کیوں۔۔۔ کہہ کیا اس نے نہیں؟“ اسے ہاں۔۔۔ وہ تو ایسا ہی

بولا ہے۔۔۔ جو تو جانتی ہو۔“

”میں تو صرف اتنا پوچھ رہی ہوں کہ وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟“

”میں نہیں کہہ سکتی۔۔۔ آج آتا ہے بھی بھاری۔“

”ہوں۔۔۔ اس نے کچھ کاروبار بھر گئے بڑھ گئی۔“

شملہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”میں یک گئی ہیں۔“ وہ روٹیاں دھال میں لیٹ کر بات میں لگ رہے ہوئے تھیں۔

”تمہیں یوں کام کرنا کچھ حیرت ہو رہی ہے۔ اچھی لگ رہی ہوئے! ایقان سکرانی۔“

”میں نے لاکھ لاکھ لے لیے۔“ وہ کھلے دل کے ساتھ بچہ دے ناخن اچھی طرح صاف کر رہی تھی۔

”کیوں؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”ہنگامت ہو گیا؟“

شملہ نے جیسے غم گم کر کے دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔

”اے نہیں۔“ وہ دوڑنے کے پورے ہاتھ پوچھتے ہوئے بولی تھی۔ ”میں یونہی دل بھر گیا تھا اس بوٹل

روٹیاں سے۔ اپنے گھر والوں کے لیے وقت ہی نہیں نکلا۔ ہر کسی کو شکایت تھی۔ مجھ سے سوچا سب کی شکایتیں

دور کیا جائیں۔“

”تازہ ہو گئیں تو چلو تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“ ایقان بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ شملہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

ای باتیں نہیں ہیں۔ خود ہی جلتے۔ کہتے رہتے ہیں۔ آج بے کلی حد سے نواختی۔ سو میں یہاں چلی آئی شاید نا سوچے سمجھے ہی۔“

شملہ نے اس کی غالی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہ بے گلی نہ اس کی فرقت کا سراں مرا ہے ایقان! اتم سمجھتی کیوں نہیں؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ وہ بڑبڑائی۔

”بھروسے آواز کیوں نہیں دے لیتیں؟ بھائی کیوں نہیں؟“

”وہ میری پکار کا منتظر نہیں ہے شملہ! وہ بے نیاز ہو چکا ہے۔ اب چاہے میں اسے پکاروں خواہ اس کے اپنے

بچے۔ نئی دنیا کھولنے چلا ہے۔ یہ کیوں یہ سڑک ہو نا ہے۔“

شملہ ابھورا سے دیکھ رہی تھی۔

”تو تو یہاں رہنے رہاں شادی کر لی؟“ ایقان کی باتوں سے وہ بھی سمجھی تھی۔

”نہ ہوں! یہ یقیناً مجھے اس نے کچھ عرصہ پہلے یہ اطلاع دی تھی۔ ہر چند کہ وہ جانتا ہے کہ اسے میری اجازت

کی ضرورت نہیں۔“ وہ طعنا بھری آواز میں بولی۔

شملہ کو حقیقتاً ”انفوس ہو تھا۔“ وہ جالوش پٹمی رہ گئی۔

”یہ تو برا ہوا ایقان۔۔۔ پھر بولی۔“ ”تمہاری جھڑپ میں تمہارے بچوں کا نقصان ہوا ہے۔“

”بچوں کے پاس تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ صرف یوں کی تیکم ہی تھی۔ ہوتی آسانکشت تھیں۔ سو اب بھی ہیں۔ جانتی ہو

شملہ! جھپٹنے والا اس نے پورے تیکم لاکھ روپے پیچھے ہیں۔ شاید عقد ثانی کی خوشی میں۔ پیسے کو وہ ہیشہ سے انسانی

دھڑوں کا بل اچھٹا کر کے بچے کے سامنے ہو تا تو اس کی آنکھیں اس کے منہ پر پار کی۔ کہیں نہ زلزل۔“

”ایقان! شملہ! اس کے سر کو لگاؤ! یہ تیکم شملہ جو دیر سے دیر سے لرز رہے تھے۔“

شملہ کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ اس کا گود ایک بھی لپا ہوا تھا جس میں اس کے سارے جذبے جل

رہے تھے۔

”اے بچوں سے بات تو کرتے ہوئے مجھے اس نے ہمدردی سے پوچھا۔“

”بات؟“ ایقان کی آنکھیں پھٹیں۔ ”بات کیسے ہو؟ وہ تو مجھے کہاں چھب گیا ہے وہ غائب ہو گیا

ہے۔“ شملہ نے ٹوپی پہن لی تھی اس نے صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے اچھے چوکانے کے لیے یہ

تیکم پوچھ کر لپٹا کر اسے اور میں ٹوٹ جاؤں گی لیکن جھول گئی تھیں۔ مرعاضوں کی لیکن اسے نہیں پکاروں گی جس نے

میری جگہ اپنی آسانی سے کسی اور کو دے دی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کے دیتی ہوں۔“

شملہ ہری طرح سے چوکی۔

”ایقان۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے بھاری ہو رہی ہو۔ صاف صاف کو لیکھا ہوا ہے۔“

بھائی کہاں جلتے ہیں اور سوچ کر کیا کرنا چاہتی ہو؟“

ایقان نے دفعہاً ”ہی خود پر قابو پایا تھا۔“

”وہ تو اسے شادی کر کے کسی دوسرے ملک شفٹ ہو گیا ہے شملہ! پھر وہ آہستہ سے بولی۔“ ”در شفٹ ہونے

سے قبل اس نے مجھے یہ رقم بھیج کر شاید اگلے پچھلے حساب برابر کر دیے ہیں۔ وہ مجھتا ہے میں اس بھیک کے

سارے پورے زندگی گزار لوں گی لیکن میں۔۔۔“

اس کی سانس شہج گئی۔ شہلا دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”کیا کرو گی اور بچوں کے ساتھ؟“

”کیوں نہیں جو وہ کر سکتا ہے کیا میں نہیں کر سکتی۔ مجھے تو صرف اتنا بتانا کرنا ہے کہ وہ ہے کہاں پھر میں اس سے طلاق لوں گی ہر صورت ہر قیمت پر اور پھر۔۔۔ پھر اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کسے دیتی ہوں۔“
 ”یقیناً۔۔۔“ شہلا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا اس کے لیے۔۔۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔۔۔ اتنی کم عقلی سے کام نہ لو۔۔۔ تم غم و غصے سے بالکل دیوانی ہو گئی ہو۔ اپنی ذات کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہوتی کہ اسے رو کرنے پر انسان دنیا کو رو کرنے پر تیار ہو جائے۔ اس نے تمہاری جگہ اگر کسی کو دی تو اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے۔ تم مرد کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ تم سے بے تحاشا محبت کر کے بھی یہی سنا چاہے گا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ محبت ایسی خطا ہے جسے مرد ہمیشہ عورت کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا ہے۔“

”یہ اس کی غلطی ہے اسے ضرور دکھ اٹھانا ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے خود کو پیڑوں چھڑک کر آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔“

شہلا آنکھیں کھولے اس دیوانی کو سختی رہ گئی۔ وہ محبت میں شدتوں کی قائل تھی۔ شہلا ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اس درجہ دیوانی کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

ایقان جو دل ہلکا کرنے آئی تھی۔ اب اطمینان سے تنکے سے ٹیک لگائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی گور کی آنکھیں تھیں۔ شہلا کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔
 اس نے مصرعہ پڑھا: ”ایک لڑکی کو بوسہ دینا اور اس کے اراکین سے بوسہ دینا“

Urdu Photo



بھگی ہوئی رات نے چہرے پر پھر اسے عرشہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قسمت آزمایہ کاؤنٹ ہوا چاہتا تھا۔ اس نے ماہین کے گرمی نیند میں ہونے کا اطمینان کیا اور اٹھ کر بستر سے نکل آئی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

ٹیلی فون سیٹ گور میں رکھ کر وہ پھر وہی پچھلی باتیں سوچنے لگی اور جب ناعمدہ کے قہقروں سے اس کا وجود گونجنے لگا تب اس نے فراز کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

اچانک ہی اس کے سب ہی حواس کام کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ پھر وہ آواز سنائی دی جس سے اس کا روم روم جاگ اٹھا۔

عرشہ کی آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ پھر بولا۔

”میں۔۔۔ میں عرشہ بات کر رہی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آوازیں آہستہ سے بولی۔

”عرشہ! کہیے؟“ وہ سادہ لہجے میں بولا۔

باقی آئندہ شہلا کے لیے

اس نے یہ نظر خاکڑ ایک مرتبہ پھراؤ انگلیں کیل کی جانب دیکھا، جسے اس نے بہت محنت اور شوق سے سنوارا تھا۔ سلیقے سے رکے گئے۔ چمکے۔ بڑے ترنوں صاف ستھرے سفید نفیخہ کنز اور درمیان میں رکھے خوبصورت گلہ دستے نے بیزکومت کش پش روی تھی۔

”ہوں، بہت خوب“ اسے پیچھے عباد کی آواز سن کر وہ چونکا اٹھی۔
”آپ کب آئے عباد بھائی؟“ وہ سکرانی تھی۔

”جب سے آپ اکیلے آ گئے، اکیلے خود کو داؤ پیش کر رہی ہیں۔“ وہ ہنسا ”بھئی کچھ حصہ اس میں ہمارا بھی ڈال لو۔ ہمیں بھی ”بہت خوب“ تو کہنے دو۔“

”آپ کہہ چکے، وہ چیخ کر بولی ”اور قیدہ دو گھانٹے کے بعد پیش کیجئے گا۔“
”کیا کیا ہے اور کیا کیا انداز پر دوس ہے؟“

”سب کچھ میں چکا ہے۔ اندر پر دوس کچھ بھی نہیں مانوے اس کے کہ پلاؤم پر رکھا ہے اور کتاب فرما کر لے آئے۔“

”وہ کیا ہے؟“ وہ بولی اس کے منہ میں معلوم ہوتا تھا۔

”وہی جو آپ نے ویسا ٹھونکنا نہیں کونے، وہ بھی تو کسی پلاؤ و افغانی چرچہ بشاوری، چکن چاؤ مین اور فروٹ ٹرانزل۔“ کتاب باری کی ہیں اور سناں کی ہے۔“ عباد اس کے پروفیشنل انداز پر ہنسنے لگا۔

”سہم سے کسی فائینا سار ہوئی کی کی طرح ٹھیک رہی ہو۔“
”جی ہاں!“ اس نے عباد کو گھورا ”میں کی ایک کتا دانی ہو گئی تھی۔ سو آپ نے چیخ کر دی۔ بالی ڈاؤسے میں۔“

”شیف بھی بولے، صرف بیٹرس نہیں۔“
”خاناؤں کے جلدی سے ڈن پڑے پڑے پھا پھاتا جو ڈن۔“

”کھانا کھا کر کیا رہی؟“ اس نے پوچھا۔
”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ ”کیا اس کے ہڈی پھٹے ہوئے ہاتھوں سے خفت زہ ہو کر مڑی۔“

”یہ کہاں ہیں؟“ عباد نے نظروں ڈالی۔
”نہاڑہ رہے ہیں۔ میں نے ہی اس کی کتا کھا کہ ممالوں کے آئے سے پہلے فارغ ہو جائیں ورنہ نہیں ہی فکر سٹاتی رہتی۔“

”وہ کچھ میں جلی آئی اور جلاؤں کے نیچے آج مزید ہم کرنے لگی۔“
”لوگوں کو کتنی پتہ نہیں ہوں گے“ عباد نے تفریحی سیجی ”تم بھی شاور لے لو اور فریش ہو جاؤ۔“

”نیک۔“ ”کیا یہ سہا سہی ہوئی“ عباد بھائی۔“ میں۔“
”ہوں۔“ کو؟“ عباد نے جاتے جاتے اسے رک کر دیکھا۔

”مجھ سے وہاں کھانے کے لیے اصرار مت کیجئے گا۔ میں صرف سرو کر کے اپنے کمرے میں چل جاؤں گی۔“ عباد نے براہ اتھار سے دُور سے ہنسی سے دیکھا تھا۔

”دیکھیں؟“

”دست دراصل میں تھک چکی ہوں۔“ اس نے حق تعالیٰ سے معذرت کرتا چاہی۔ ”میں کچھ دیر آرام کروں گی۔“

”غور کرنا۔“ لیکن ممالوں کے جانے کے بعد۔ جہاں اتنا کام کیا ہے وہاں خود ڈاؤس امیر بھی۔“
”لیکن عباد بھائی۔“ وہ زنج ہوئی ”میں آخرہ کروں گی کیا۔“

”سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاؤ گی۔“ وہ جی انداز میں بولا۔

عشرہ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا اپنے کانوں میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فراوی محسوس اور اجنبی آواز سن کر اپنے دل کو ایک دھچکا سا لگا ہوا محسوس کیا تھا۔ بخانے کیوں آئے تھے عرصے سے ایک مکان اس کے ساتھ ساتھ جتنا تھا کہ برسوں بعد بھی وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کی پہچان لیں گے جیسے روز اول پہنچا تھا اس کی آواز سننے کی فراز کے کانوں سے ناعلم کے جھوٹے کارڈ اٹھ جائے گا۔

اسے احساس ہوا کہ فرازا اس کی جانب سے تشنگی کا حکم تھا۔
”آپ۔“ اس کی آواز جیسے گلی کو وہ جیسے سے کیکاری ”لگتا ہے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔“

اس کے دھڑکنے میں یہ دیکھ بھی تھا۔ شکایت بھی تھی۔ بے یقینی بھی تھی۔
”میں بات نہیں ہے۔“ وہ بولا ”میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔“

عشرہ بے طعش ہو گئی۔
”آپ نے خود بتا دیا کہ آپ عشرہ ہیں۔ اور میرے جاننے والوں میں صرف ایک عشرہ ہے۔“ ”یہاں میں ہے۔“

سادے لباس میں بول رہا تھا عشرہ اندھیرے میں آنکھیں میاڑے سانس روکے اس کے اگلے پہلوں کی منظر پر۔
”آپ یقیناً“ ”شہلا آئی کی مندر میں۔“ باہم بھائی کی سسرے ناخ کی منکوحہ اناج عباد کا کھانا چھڑا دیا۔

حوالے سے بھی میں آپ کو جانتا ہوں۔ ایم آئی رانٹ۔“ عشرہ کو لگا اس کے ہاتھ میں اس کی اپنی سانس نے پیدا ڈال دیا ہے۔ جو نہ لوہ کو جاری تھی اور نہ پیچ کو صرف اس کے ہاتھ کے لئے کر دوسری بل دار سانپ کی مانند اپنا کھنجر کس رہی تھی۔

”سلاؤ۔“ اس کی جانب سے کمری خاموشی کا فرار بولا۔ ”آپ غیریت سے تو ہیں، یوں آج رات کے وقت آپ کا فون آتا۔ اور پھر کچھ نہ بولنا۔ میں سمجھ بیٹھ گیا تھا۔“

”جی۔ کچھ نہیں۔“ وہ بمشکل بولی ”میں نے میں نے شہلا کی طرف سے۔“
اس سے مزید کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔ اس نے فون بند کر دیا اور کھل کر اس کی طرف سے پوچھنے لگی۔

”وہ چند لمبے جن کے انتظار میں اس نے ایک طویل عرصہ دوڑے غار میں بیٹھے ہوئے جو کی کی طرف مڑا رہا تھا۔
”چند لمبے جن کی تیزی سے گزرے تھے کہ اس ان پر کسی خواب کی گمان ہو رہا تھا۔ یوں جیسے لمحہ بھر کے لیے آج کی گلی تھی اور کچھ بے ریا سا جذبہ اور نوٹ کیا تھا۔ وہ چران پر شان سا کھینچ رہی تھی۔“

”وہ تو اس کی جوں سے جانتا تھا اور وہ اپنی زندگی میں صرف ایک عشرہ کو جانتا تھا۔ وہ عشرہ جو باہم کی منہ تھی۔ شہلا کی مندر تھی اور ناخ کی منکوحہ تھی جس کی اس نے آگے شناخت کا کوئی حوالہ نہ دیا تھا۔“

”نے گوائے تھے اس کے بعد کچھ بھی کہنے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ ضرورت۔
عشرہ کو لگا جیسے اس کے وجود پر دم گھونٹے جس کا جو عالم چھایا ہوا تھا۔ وہ اب جھٹھٹا ہوا رہا ہے۔ اچانک ہی اس کی

آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور یوں سے آپس نکلے گلیں۔ اس کے پورے جسم پر ایک شدید کھپکھپا ہٹ خاری ہو گئی۔ جس کی سانس نے خوب قابو لیا کی با کام کو پیش کی۔ آگے کو جھٹکے جھٹکے وہ حوصلے سے بچ کر گئی تھی۔

بیز درم سے ماہین گھبرا جی ہوئی باہر نکلی تھی۔ اس نے لائٹ جلائی پھر عشرہ کو پیچ کر اہواؤ کچھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”عشرہ! ماہین نے اسے کاندھوں سے تھام کر سیدھا کیا۔
اس کا ہونٹ اس کے دانے سے رگڑ رگڑا کر پھٹ گیا تھا۔ خون کی بو ندیں اس کی تھوڑی پر سے پھسل رہی تھیں۔

”وہ بے ہوش“ ”بے سندھ تھی۔“

رجیہ خاموش ہو گئی۔ وہ یونی بارمان لیا کرتی تھی۔
 "اب جلدی سے فرش بولس میں بھی بیٹھ کر لیں ہوں۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"
 وہ مصروف انداز میں میز چوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

"مجھے آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔" رجیہ منتکری ہوئی "افینہ کھلاؤں؟"
 "نہیں۔" وہ فوراً "بولس" "نہیں سے کچھ مدت کھو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کھانا لگا دو۔" بچے بھوکے
 ہیں۔

رجیہ ان کے پاس سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن ان کا دو ٹوک انداز دیکھ کر وہ بچن میں جلی آئی۔
 تمام شہر دار ٹانگ ٹیکل پر بیٹھا کر ان لوگوں کو خیل پر آنے کا کہہ کر وہ بیٹھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی۔
 "ابھیس موندے صوفے کی پشت سے لگا کر بیٹھیں۔"

"اے بی بی۔" رجیہ نے ان کے کان پر ہاتھ رکھا "کھانا کھا لیجئے۔"
 "مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ دہرائی ہوئی آواز میں بولی۔
 "آپ وہاں کھانا نہیں کھا سیں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔" رجیہ بولی۔

"ٹھیک ہے، مجھے بھی دو دوں بعد میں کھائیں گے۔" پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر رجیہ کو دیکھا "منور رجیہ۔"
 ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ عمارت سے باہر چلا گیا۔
 وہ رک گئی تھیں۔ رجیہ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"بی بی ایک کیا ہو چلیں؟"
 "شہر دار احمد کے والد کا کیا نام ہے؟" وہ گویا کہہ رہی تھیں۔
 رجیہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ماہین کے کچھ دنوں بعد عمارت کی ایک کمرہ میں ایک عورت بیٹھ کر رہی تھی۔
 "خیر تم آؤ اور اسے لگا کر بیٹھو۔"
 "کیا کر رہی ہیں؟" اس نے ہونٹ کو انگلی سے چھوئے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"بی بی! وہ آہستہ سے بولی۔ "مگر کئی نہیں۔"
 "کہاں سے؟"
 عمارت نے نظر اٹھا کر شہر دار احمد کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔ شہر دار کو اپنی شادی کے روز سے اب تک بھی اس
 لڑکی کی سنجیدگی کی کمی نہ تھی۔ ہونٹ چڑھنے پر ایک تار اور انداز میں ایک سوگ کی کیفیت لیے۔ اس لڑکی کو اپنی سی
 فریٹل کوں سے نکالنا تھا۔ اسے بھی غم نہ ہو سکا۔

ماہین زیادہ تر اپنے سرسرا میں ہی رہتی تھی۔ شادو تار سے دیکھ کر نظر آتی تھی۔ اس کے سرسرا والے ان
 معاملات میں کافی سخت تھے پھر بھی شہر دار عمارت کی نسبت ماہین سے زیادہ قریب تھی۔ عمارت سے تو کڑیاں خاموس
 ساخون آتا تھا۔

"دیکھ کر لیان کہہ رہی ہوں۔" اس نے سانس بھر کر ماہین کو دیکھا "اسی تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔
 ہاں سا بخار ہے۔ آنکھیں تھاری ہیں کہ۔ دوئی رہی ہے۔ یا پھر موسم کا اثر ہے۔ میں نے پر سکون نیند کے لیے
 ٹیبلٹ لکھ دی ہے۔ ہونٹ پر لگائے کے لیے ایک نرم مٹی لکھا ہے۔"

اس نے لکھا ماہین کو کھانا۔
 "میں ابھی حوض سے منگوا رہی ہوں۔" وہ سہلائے ہوئے بولی۔
 شہر دار سکرا کر عمارت کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

باہر گاڑی کا بارن سنا رہا تو عمارت صوفے سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔
 "سیرا خیال ہے وہی لوگ ہیں؟ منیندہ تیکم سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے آئیں۔" رجیہ نے بھی ان کی تقلید
 کی تھی۔

عمارت کی رہنمائی میں وہ دونوں اندر آئے تھے۔ ایک امیر حسن تھا اور دوسرا وہی نوجوان تھا جس کی تصویر رجیہ نے
 امیر حسن کے آئین میں دیکھی تھی۔
 ایک مرتبہ چھوڑ کر بھر گئے تھیں مگر اب بھی تھیں۔ وہ چہرہ اتنا ہی مقناطیسی اور پرکشش تھا جتنا عمارت کو ان لوگوں کا

تعارف کروا رہا تھا۔
 "بی بی۔ ان سے ملے۔ شہر دار احمد امیر حسن کے کزن بھی ہیں اور بہت اچھے دوست ہیں۔"
 "اور بولس یاد نہ ہو۔" امیر حسن کی سیٹی سے گویا ہوا "ہر جگہ سے پھرنا اور کچھ سے چند پر بن بھوٹا ہے لیکن اس کا
 ذہن کی مقامات پر مجھ سے بہت تیز چلتا ہے۔"

شہر دار سکرا آیا ہوا منیندہ تیکم کے سامنے ڈر سا بیٹھا تھا۔ منیندہ تیکم نے جس وحارت کی کھڑی رہیں۔
 "بی بی۔" عمارت نے امیر حسن کی طرف اشارہ کیا "توبہ ہو چکی۔"
 "جیسے روپوش؟" انہوں نے شہر دار کے سر پر ہاتھ پھیرا "امیر حسن کو چھوڑنا پڑا۔" منیندہ تیکم نے اسے بھی

"بی بی۔" ہمیں بھی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" امیر حسن نے منیندہ تیکم سے اسے بھی
 یاد دہرایا۔ پھر عمارت نے شہر دار کا تعارف رجیہ سے بھی کروا دیا تھا۔ رجیہ اس کی کیفیت کا بخیر بھی وہ چہرہ ایک خاص
 کشش کا حامل کیوں تھا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

عمارت ان دونوں کو ڈرانا تنگ روم میں لے گیا۔ رجیہ منیندہ تیکم کی جانب منیندہ تیکم ہوئی۔
 "بی بی۔ آپ بھی طبیعت میں جب تک ایک لگاؤ کی ہوں۔ کالی لٹ ہو گیا ہے۔" پھر اس نے رک کہ منیندہ
 تیکم کو غور سے دیکھا کہ کتنے کے عام میں کھڑی تھیں۔

"بی بی۔" رجیہ نے ان کے کان پر ہاتھ رکھا۔
 "آہ۔" وہ جو گئی۔
 "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" رجیہ ان کا نہایت زور چودہ کیہ کر رہی تھی۔

"میری طبیعت؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "یہ ہے۔ لڑکا۔ کون ہے رجیہ؟"
 "یہ شہر دار احمد ہیں۔ انہی عمارت بھائی سے آپ سے متعارف تو کروا دے۔" امیر حسن صاحب کے کزن اور
 بولس یاد تھیں۔ عمارت بھائی سے بولس سے متعلق معاملات ہی تو بولے کر آئے ہیں۔

"یہ کمال سے آیا ہے۔" وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔
 رجیہ کو عجیب بے رغبتی نے آکھرا "شہر دار احمد میں آؤ اس کی کون سی بات تھی جو شخص کو ڈر کر رہتی تھی۔
 "منیندہ تیکم سے آئے ہیں۔ اب آپ ڈرانا تنگ روم میں چلیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر بے شک اٹھ جائیے گا۔"

"میں ادھر ہی بیٹھ رہی ہوں۔" وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 رجیہ کو عجیب بے رغبتی نے آکھرا "شہر دار احمد میں آؤ اس کی کون سی بات تھی جو شخص کو ڈر کر رہتی تھی۔
 "منیندہ تیکم سے آئے ہیں۔ اب آپ ڈرانا تنگ روم میں چلیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر بے شک اٹھ جائیے گا۔"

”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ہاشم آجائیں تو کھانا لگاؤں گی۔ پھر سب اکٹھے مل کر کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔“

ماہی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ عیش نے آنکھیں موند لی تھیں۔ شملہ اب ہر نکل آئی، میر جیساں چرتے ہوئے اسے مخصوص رنگ سنائی دینے لگی تھی۔ کمرے میں اس کا کل فون بج رہا تھا۔ شملہ نے رفتار تیز کر دی اور بیک چیک کرتے چلے گئی۔

آٹے والی کال کا نمبر دیکھ کر وہ کھنکی کھنکی گئی۔ پھر گہری سانس بھر کر اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“ وہ مختلط انداز میں بولی۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب عرفان: ”مہما! السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔“ وہ اسے چونے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ ”یکے میرا جانو بیٹا۔ میری زندگی!“

”آئی ایم فائن مہما۔ آپ کیسی ہیں؟“

”میں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹا۔ آپ اس ویک اینڈ پر مہما سے ملنے نہیں آئے۔“

”میں نے وہ دن بھی نہیں ملے۔ لیوں سے نوٹ ٹوٹ پڑے تھے۔“

”میں مہما۔ اس مرتبہ میں اور بیٹا کاؤں چلے گئے تھے۔ آپ نے دیکھا ہے یا بیٹا کاؤں؟“

”جی اور جی جانتی ہیں۔ بیٹا نے مجھے وہ کمرہ دکھائی دیا تھا۔ جس میں اب بھی کچھ چیزیں تھیں۔ مجھے وہ کمرہ تو اچھا لگا۔ مہما میں جب اس بستر پر سویا تو مجھے بہت اچھی نیند آئی۔ وہاں سنا آواز آتا تھا۔ میں نے تو فرسٹ ٹائر کاؤں دیکھا۔ بہت اچھا لگا۔“

”شملہ کی لیوں پر ویسی افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کو بیٹا شاید برا ہو گیا تھا۔ اس کی گفتگو میں ایک محسوس ہوا تھا۔ اس بچکانہ بین میں واضح کمی محسوس ہورہی تھی۔

”آپ کو میاں یاد آئے؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی مہما۔ بہت یاد آئے۔ آپ کا تو عبادا مومن ربیعہ جی! انفقہ خالہ۔ میں نے سب کو بس کیا۔ پھر بھی میں نے بہت انجوائے کیا۔“

”شملہ کی ہیکوں پر کئی جھپکے لگی تھیں۔ اس کا بیٹا زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔

”اور آپ کی بڑھالی۔ اسکو لگ۔ وہ سب؟“

”بیٹا نے مجھے بہت اچھے ٹیوٹر رکھ دیے ہیں مہما۔ بہت جیتیں ہیں میرے سر۔“

”انفقہ خالہ جی ان جیسا نہیں بڑھائیں۔ پتہ ہے مہما اس مرتبہ بیٹا کیلڈ میں میرے داس پوری کلاس میں سب سے زیادہ ہیں۔ بیٹا بھی خوش ہوئے۔ مجھے گفت بھی دیا ہے انہوں نے۔“

”مہما۔“

”جی۔“

”آپ کب تک آ رہی ہیں مہما؟“ عمر کے انداز میں دُور سے تہذیبی لگتی جیسے کوئی اسے کچھ بے پناہ کر رہا تھا۔

”میں؟ میں وہاں کیوں آؤں گی عمر؟ صرف آپ کا گھر ہے۔ میرا نہیں۔ میرا گھر ہے جہاں میں رہتی ہوں۔ آپ کے ہاشم لکھنؤ میں بہت مسرت خوش ہوں عمر۔ اب آپ براہے ہو گئے۔ زندگی جینے کے ہو جائیگا۔“

کرنے لگے۔ ”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ الفاظ اس کے گلے میں جھپٹنے لگے۔ ”تھے۔“

”آپ مہما کو کم کیا دیکھا تھا۔ بس کبھی کبھی۔ بہت دل چاہے تو لے آجیا کھ۔ لیکن بیٹا ایسی بات مت کہو جسے پورا کرنا آپ کی مہما کے لیے میں نہ ہوں۔“

”مہما۔ آپ میرے بغیر بھی خوش ہیں؟“ وہ آزدہ سا ہو گیا تھا۔

”میں۔۔۔ آپ کے بغیر کیوں۔ آپ تو اپنی مہما کی جان میں اترے ہوئے ہوتے۔ ہر وقت ہر مل آپ کو یاد کر کے مہما دل دھڑکتا ہے۔ لیکن بیٹا اہارن سے درمیان ہے جتنا فاصلہ ہے۔ اب اہل ہے اسے کم کرنا۔ آپ کے اختیار میں ہے۔ نہ میرے اب نہیں آتا فاصلہ رکھ کر اسے براشت کر کے جینا ہے۔“

”دوسری جانب سے کوئی جواب نہ دیا گیا تھا۔ شملہ کو کیا ایک ہی احساس ہوا کہ فون عمر کے ہاتھ سے لے لیا گیا تھا۔ اس کی باتیں کوئی اور سن رہا تھا۔

”عمر کا خیال رکھنا بہت زیادہ۔ بیشہ۔“ وہ بولی پھر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

عباد نے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ منیڈر بیگم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن جھکا کر عباد کی جانب دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جائے بناؤں عباد جی!“

”تم لوگوں نے کھانا کھیا نہیں کیا؟“ وہ اندر چلا آیا۔ ”ای کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی نہیں ای کی اچانک ہی کیا ہوا تھا۔“

”جی ہاں۔ میں نے بہت کم کیا۔ لیکن نہیں مہما۔ ای بہت خدی ہو گئی ہیں عباد جی۔“

عباد مہما کے قریب بیٹھ گیا اور پرتشوش نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ منیڈر بیگم دوائی کے زیر اثر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”ربیعہ! اتنی کانتا خیال رکھتی ہو۔“ عباد کو اس کا خیال آیا۔ ”میں چاہوں بھی تو تمہاری خدمتوں کا۔“

”عباد جی! ربیعہ آپ نے اپنے الفاظ بھی مزید کماتو میں۔“ وہ روٹھ گئی۔ ”آپ۔۔۔ آپ کیوں نہیں بول جاتے کہ میں اس گھر کا گھڑ نہیں ہوں۔“

”جی۔۔۔“

”شکر گزار ہوں۔ تم نے اپنی باتوں سے کسی پر اس گھر کے سب کی بار بہت سہولت سے اٹھالے ہیں۔ اب دیکھ لائقہ صرف بڑھائی سے ٹھک کر رہی ہے مگر یہی ہے مگر یہی ہے اور تم۔ تم صبح سے کچن میں کچھ مصروف تھیں۔“

ای کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں اور اب بھی بے تکان ان کی خدمت کر رہی ہو۔ مجھے خیال آتا ہے۔ ربیعہ۔ کہ ہم نے تم پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ تم کچھ کبھی بھی نہیں۔“

ربیعہ سادگی سے مسکرائی۔

”یہ سب آپ کو محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر سکون بُرائیت چھت کے نیچے ہوئے کا احساس اتنا قوی ہے کہ چھوٹے موٹے کاموں کی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔“

”آپ سب کی ہیکوں نے اتنی آسودگی کبھی عباد جی کو کسی قسم کی تسکین کا احساس نہیں ہوتا۔“

”تم اپنی زیادہ سچی ہوتی ہو۔“ وہ پرتشوش سے انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تب ہی۔“ اس نے پچھلی سے عباد کو کھلا۔ ”تب ہی کیا؟“
 ”تب ہی سب کو اچھی لگتی ہو۔“ وہ دیر سے ہنسا۔ ”یہ اُن کی نسل کس؟“
 وہ کچھ کہتے کہتے تنگ کر پھر سے رک گیا تھا۔ ربیعہ کو جبرت ہوئی۔
 ”کہہ بھی چکیں۔ یہ مجھ سے کیا چپا رہے ہیں آپ؟“
 ”اُن کی نسل؟“ مہر مہر حسن اہم میں انگریز طرز پر رہے ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”انہوں نے اپنی بات تمہارا دبوچا
 کہ میں جبرت زدہ اور وہ خود شرمندہ ہو گئے۔ تمہارے بانیوں نے انہوں نے اس قدر ذوق و شوق سے
 کھائے اور ان زیادہ لطف کی کہ میرا ہی چاہ تھا، اپنی ماہانہ کھانا یک کر کے ان کے ہواہ کر دیں۔“
 ربیعہ عباد کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم سے سرخ ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔
 ”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ انتہائی کہہ سکی۔

”ربیعہ! اپنی اڑسونا کس کے میں تم سے یہ ٹانگہ ڈس کس کیے بغیر نہ رکنا۔“ عباد بولا۔ ”اُن کی اہم شیور کہہ چند
 ایک روز میں ضرور تمہارے نیلے اپنا ہاتھ برضا میں کے“ اس لیے میں پہلے تم سے تمہاری ہمارے معلوم کرنا چاہتا
 ہوں۔“ یوں ربیعہ ایسی صورت حال میں تمہارا جواب کیا ہو گا؟“
 ”مجھے نہیں پتا عباد محال!۔“ ربیعہ سے طرح گھبرا گئی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کہنے کیلئے۔“
 ”مجھے برا بھالی سمجھتی ہو تو اتنے بچوں کی طرح بات کرو۔ ایسی باتوں میں اپنی اُزاد رائے استعمال کرنے کا حق
 ہمیں ہمارے مذہب سے رہا ہے ربیعہ!“
 ”اسی لئے منیہہ تنیک سے کسمسار کرنا نہیں کھولی تھیں۔“ وہ دیر اندازہ کر بیٹھ گئیں۔

”ای کی! عباد نے ان کا ہاتھ تھا۔“ آپ تنگ ہیں نا۔“
 ”وہ لوگ۔ وہ لوگ۔“ وہ جیسے خواب میں بولی تھیں۔
 ”گوں لوگ؟“ عباد کچھ نہ سمجھا۔ ”گوں لوگ؟“
 ”ای شہیار احمد کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔“ ربیعہ نے اٹھ کر بتایا۔
 ”جی ہاں! وہ جاگے ہیں۔ کھائے پر آپ لوگوں کا بار بار پوچھ رہے تھے لیکن آپ کا شاید بی بی لو ہو گیا تھا۔ ربیعہ
 نے مزہ نہیں دے کر آپ کو سلاوا تھا۔“ عباد ان کا ہاتھ سلائے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 ”مجھے اس لڑکے کے باپ کا نام بتاؤ۔“ انہوں نے بچوں کی طرح عباد کو پوچھ لیا۔
 ”اس کے والد کا نام۔“ عباد سوچنے لگا۔ ”وہ یو کے میں ہوتے ہیں۔ بہت بھلا ہیں۔ پیرالاز ہیں۔
 چارے میرا خیال ہے۔ بالیاں کیا۔ احمد جہاں زیب سے ان کا نام۔“
 ”احمد جہاں زیب۔“ منیہہ تنیک کے بولوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا تھا۔ ”احمد جہاں زیب۔“
 ربیعہ اپنی جگہ پر سناٹ کر بیٹھی رہ گئی۔ کیا عجیب اتفاق تھا؟ اس کے والد کا نام بھی تو احمد جہاں زیب ہی
 تھا۔

شہلا نے اُزد جرنالی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس کو دیکھا۔
 ”یہ سہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“
 ”سہ سہ کچھ بہت اونگھا ہوا رہا ہے۔“ انہوں نے نظریں جرات ہوئے مضبوط تھیں میں بولنے کی کوشش
 کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کے لوگ والے لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آخر میاں کے مقابلے میں

شہلا نے اُزد جرنالی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس کو دیکھا۔
 ”یہ سہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“
 ”سہ سہ کچھ بہت اونگھا ہوا رہا ہے۔“ انہوں نے نظریں جرات ہوئے مضبوط تھیں میں بولنے کی کوشش
 کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کے لوگ والے لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آخر میاں کے مقابلے میں

شہلا نے اُزد جرنالی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس کو دیکھا۔
 ”یہ سہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“
 ”سہ سہ کچھ بہت اونگھا ہوا رہا ہے۔“ انہوں نے نظریں جرات ہوئے مضبوط تھیں میں بولنے کی کوشش
 کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کے لوگ والے لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آخر میاں کے مقابلے میں

شہلا نے اُزد جرنالی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس کو دیکھا۔
 ”یہ سہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“
 ”سہ سہ کچھ بہت اونگھا ہوا رہا ہے۔“ انہوں نے نظریں جرات ہوئے مضبوط تھیں میں بولنے کی کوشش
 کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کے لوگ والے لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آخر میاں کے مقابلے میں

”خدا کے لیے اے! ماہین زندہ ہوئی۔“ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کریں۔ شہلا بھابھی جیسی شائبہ خاتون سے کسی برے سلوک کی میں توقع نہیں کر سکتی۔“
 ”شرم کرو۔“ وہ اس پر لٹ پڑیں۔ ”ماں کو جھوٹا بتائی ہو؟“
 ”معاملہ کیا ہے آخر؟“ وہ زنج ہو کر بولی۔
 پھر ساری بات سن کر اس کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو شہلا کی تھی۔
 ”غضب خدا کا۔ یہ بات کتنے ذرا لحاظ نہ کیا آپ نے؟“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”کہاں اخترا ماموں! کہاں وہ بچہ بولیں گی! آپ کی جان! آپ نے تو حد ہی کر دی۔ میری بمن کے لیے کوئی ایسے شخص کا رشتہ پیش کرنا تو میں نبھانے کیا حال کر لی اس کا کچھ تو سوچا ہوتا آپ نے۔“
 ”اے لی! یہ دیکھو۔“ انہوں نے پیٹ سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”یہ دیکھو۔“ پھر انہوں نے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔
 ”اب بولو تو ناک سے سولیکس کھینچیں۔ ارے! بمن ہوں۔ سن۔ اس مردار کی۔“ کچھ دیر بعد وہ آگے آئے اس کی حالت دیکھ کر کہہ پاؤں ہی روتے روتے مرجانے کے لیے اس میں داخل آیا ہے۔“
 ”تو ای! کی! ان کے حساب سے بھی تو رشتہ دیکھا اور دھوئیں جا سکتا ہے۔“
 ”وہ جو مرا جا رہا ہے اس کس حسد کے عشق میں پھر گیا کریں؟“
 ”کون! اخترا ماموں؟“ ماہین لگ بھگ ہو گئی۔
 ”اور کون۔“ ایک بار پوچھی کہ تم نے ذکر کیا۔ وہ تو میرے بھائی ہو گیا۔ روز صبح اپنا میلا منڈے کر سامنے آ بیٹھا ہے۔ ہاتھ بیروں سے چھوڑ کر نہ کر سکتا تھا۔ تو اور کیا کر سکتے۔“
 ”اخترا ماموں! کل ہو گئے ہیں۔“ ماہین خفا ہوئی۔ ”ان کے کچھ اور کچھ مانگنا ہو گیا ہے۔“
 ”اے! اب تم کس لو اس بد بخت کو۔“ انہیں برا لگا۔ ”اپنا منڈے ہوا منڈے کا مردانہ ہو گیا۔ ارے بھلا چنگا کے سلامت ہاتھ بیروں کا ہے تو کڑی نہیں کرنا تو کیا ہوا! ہم اس کے سر پرست ہیں! اسے پال رہے ہیں! اس کی آل و بھی پال لیں گے۔ ہم تو اپنی محبت سے مجبور ہیں۔“
 ”پچھلے کسی سے تو محبت کا دوا ہے آپ کو۔“ ماہین قدرے ناگوار ہوئی۔ بولی۔ ”اخترا ماموں تو بہت خوش تھے۔“
 ”اس سے! پچھلے سے فردوس بیگم کا منہ کھل گیا۔ یعنی ہم سب سے نفرت کرنے لگی۔“
 چارے۔ میرا زبیر۔“

”ماہین نے ترشی سے کہتے ہوئے عیش کی جانب اشارہ کیا تھا۔“ تو کھیں اس کی اس حالت رہیہ اپنی جگہ کون سے زہ دار اس کا۔“
 ”فیضان سے گویا ہوئیں۔“ اس کا غصہ اس کی بے جا ضد۔ ہمارے سرکس بات کا الزام لگاتی ہو تھا۔
 شہلا نے از حد یہ ضدی ہے غصہ دے لیکن ماں باپ کا اور خصوصاً ”ماں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر پچے کو اس کی پیسہ بے آہ سے ٹھٹھ کرے۔ آپ نے اپنے ہر پچے کو صرف اپنی طبیعت اور عادت کے حساب سے ٹھٹھ کر لیا ہے۔“
 ”تھیں بے کیا رٹ کیا ہم؟“ ہمیں بھی ہوا؟“ وہ غصے سے بولیں۔ ”یہ ٹھٹھ کر دیتے کہ ناؤ ٹھٹھ نہ کسی نے اٹھائے نہ ہم کسی کے اٹھانے والے ہیں۔“

”ہی! ماہین دکھ سے بولی۔ ”کاش! آپ نے سمجھا ہوا کہ بیٹیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات آنکھوں کی مانند ہوتے ہیں ان کے قصورات میں بھی دنیا کی اہم ہوتی ہے کہ باقی ہر معاملہ غیر اہم ہو جاتا ہے لیکن انفس! آپ جیسے ماں باپ اولاد کو موم کی ناک سمجھتے ہیں اور اسی طرح سوڑتے ہیں اپنے فیصلوں کے مطابق۔ نتیجہ اس صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔“ اس نے عیش کی جانب اشارہ کیا جس کی بند پٹیوں پر موتی لڑنے لگے تھے اور ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”کون کی گولی ماری ہم نے اے؟“ وہ ابو چوڑھا کر پوچھنے لگیں۔ ”جو اس کا نصیب تھا اسے مل گیا۔ اب جا کر لڑے خدا اسے نصیب تو ہی لگتا ہے۔“
 ”درست لیکن جی! اب! اولاد کو اعتنا میں لے کر فیصلے کیے جائیں تو اپنی غلطی نہیں کسی نہیں ہوتی۔ یہ کیا کہ فردوس جرم پلہ کر سنا لی اور مردانہ ڈالی۔ مجھے سخت انفس ہو رہا ہے اسے یوں کر خفا کر کے کہ نفسیاتی مریض بن گئی ہے۔“

”فردوس! جی! چھوڑتی ہیں۔“ گئیں۔ کچھ دیر تردد سے انہوں نے عیش پر چڑھ دیکھا۔
 ”ماہین! برا لگتا ہے۔“ پھر انہوں نے سرگوشی میں ماہین سے دریافت کیا۔
 ”ماہین نے اس بھر کر اپنی ناگوار بات سمجھا دی ہو گی۔“
 ”ضروری نہیں کہ اسے ناخ پائند ہو۔“ وہ نے چار ا تو ایک اچھا! سمجھا ہوا عید حاد سا دل انسان ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اسے کوئی اور پسند ہو۔“

”ہائیکس۔“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”بہت خوب پھر چار تو ہیں! اپنی پسند۔“
 ”ماہین! اتنا اچھا تو ہمارے والدین اپنی اولاد کو دے سکتے۔“
 ”اس نے تو تو پھر جی! کر لیا۔“

وہ مومن اور ایمان کے ڈھلے ہوئے استری شدہ کپڑے رکھنے کے لیے ان کے کمرے میں آئی تھی تب ہی وہ دروازے میں سے ٹھک کر رک گئی۔
 مومن کان سے موبائل فون نکالے کچھ لمبے سے ٹوٹھٹھو تھا۔ دھیمی آواز میں وہ کہاں میں کہاں تھا! اذیت کے لیے منہا ممکن تھا۔ تب ہی اس نے اپنے فون پر اس کی گرہان موز کو کال دیکھا اور جلدی سے فون آف کر دیا۔ اچانک چند قدم آگے بڑھی۔
 ”کس فون سے تمہارے پاس؟“ وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ ”اور کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”اپنے دوست سے۔“ وہ بے نیاز سی بولا۔
 ”یہ موبائل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔
 ”راجہ بیگم! نے دیا ہے۔“ وہ حائل ہو کر بولی۔
 ”راجہ!؟ لیکن کیوں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
 ”میں نے ان سے کہا تھا! جسے سب فون کا شوق ہے! انہوں نے مجھے گفٹ کر دیا! میں تپ کو بتانے والی اس میں کون سی بات ہے؟“

”مومن! اس نے آسف سے بیٹھ کر دیکھا۔ ”تمہ! تم روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہو۔ بڑے ہونے کا مطلب کرشمہ ہونا نہیں ہوگا۔“

وہ مرکز اس کی جانب دیکھتے لگا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر مزید سرکشی سے بولا۔

”آپ کا بیٹا ہوں نا، آپ رہی گیا ہوں۔“

ایقان کے قریب سے نکل کر وہ باہر چلا گیا۔ ایقان اپنی جگہ جیسے جم کر رہی رہ گئی تھی۔ حیرت، دکھ، تاسف اور غم غصے سے اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔

بو جھل قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مومن کی الماری کھولی اور اس کے کپڑے رکھ کر ان ہی قدموں سے واپس چلی آئی۔ اچانک ہی وہ رکی۔

لاؤنج کے بیرونی دروازے پر آخر میاں کھڑے تھے۔ ایقان کا دل مزید غمگین ہوا۔

”تشریف لائیے۔“ وہ قدرے طنز سے آہستگی سے گویا ہوئی۔

وہ چند قدم آگے بڑھ آئے۔

”کہاں تھے آپ، پچھلے کئی روز سے نظر ہی نہیں آئے۔“ وہ آہستہ آہستہ بول کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم۔ ایقان بیگم! آپ سے معذرت کرنے آئے ہیں۔“ آخر میاں قدرے بے مروت سے انداز میں دفعہاً بولے۔

”معذرت؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”کس بات کی؟“

”ہم اس روز یونیورسٹی میں آپ سے وعدہ کر بیٹھے۔ ہم اپنا وعدہ وفانہ کر سکیں گے۔“

وہ کان کھجائے ہوئے بولے۔ ایقان نے حیرت سے پوری آنکھیں پھاڑ کر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”دراصل کچھ بھی بیگم نے ہمارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“ وہ دانت کوس کر بولے۔ ”اور ہمیں وہ سمندر پر راجی جان کے بیٹے سے ہم سے سوچا ہے۔ آپ ہماری اس بیٹی سے بھی رہ جائیں۔ اس دن کچھ خیال میں جانے آپ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔“

ایقان کو ایسا لگا جیسے پورے سمندر کا پانی اس کے سر پر سے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ذلت اور حقیر کے احساس سے وہ پوری کانپنے لگی۔

”تم۔ تم گھٹیا۔ تم۔ ایک نظر کرم سے خود کو کوئی دیوانا خیال کر بیٹھے۔“ وہ دانت پیتے، مٹھیاں بھینچتے ہوئے آگے بڑھی۔ آخر میاں ڈر کر پیچھے ہٹے۔

”ہمیں گالی مت دین ایقان بیگم! ہم تو اپنا حق استعمال کر رہے ہیں۔ برسوں پہلے آپ نے بھی تو اپنا حق استعمال کیا تھا۔ آپ اگر بھول گئی ہوں تو ہم نہیں بھولے۔“

ایقان نے جھک کر میز پر رکھی ایش ٹرے اٹھائی اور زور سے انہیں کھینچ ماری۔

”تم صرف اپنی اوقات بھلا بیٹھے ہو، زمین کیڑے۔“

آخر میاں اچھل کر ایک طرف ہوئے تھے۔ ایش ٹرے کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی گری۔

”تم سمجھتے ہیں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔“ ایقان نے اب ایمان کا کھلوٹا بس اٹھایا تھا، اس بار وہ آخر میاں کے سر میں جا لگا۔

”تمہارے جیسے کہنے کے لیے اپنی اوقات دکھانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔“

آخر میاں پورے لاؤنج میں ناچتے پھر رہے تھے۔ ہمیشہ طاری رہنے والی حالت نشہ ہرن ہو گئی تھی۔ آخر میاں خود بھی ہرن بنے ہوئے بسی بسی چھلانگیں مار رہے تھے۔

ایقان کے ہاتھ اب سبزی کاٹنے والی چھری لگ چکی تھی۔ آخر میاں یہ خطرناک نظارہ دیکھ کر زور زور سے

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر شہلا اور ایقان پیچیدہ راضی ہوں تو میں ان کے نکاح میں بھی کفرم کر دیتا ہوں۔“
 ”نیک ہے۔ تم نکاح میں کفرم کر دالو۔ شہلا یہاں نے اگر انکار کیا تو میں خود ان سے بات کر لوں گا۔ رہے ایمان اور مومن تو وہ ای کے ساتھ دونوں گزار لیں گے۔“ اس نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”ہاں بالکل۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایقان کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ ہاشم نے دھیرے سے انکابت میں سر ہلادیا۔



منیوہ بیگم کی حالت پھر گزشتہ تھی۔ عباد اور انقضاء انیس اسپتال لے گئے۔ ریجہ پریشانی کے عالم میں گھبرائی ان کی صحبت کے لیے دیباغ بن گئی تھی۔
 ”اسے بار بار ترانہ کا خیال رہی آتا تھا۔ اس سے ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایسا الجھنوں میں گرفتار ہوئی تھی کہ باوجود کوشش کے چند لمحوں کے لیے بھی نہ جاسکتی تھی۔
 ”تمہارے ترانہ کی سوجھی ہوئی۔ کاش کہ ہم دونوں اتنی جگہ میں ٹھہرے ہوتے۔ پہلے ایک دو سرے کے فون فہرزی لے لیتے۔“
 ”ترانہ کے اس عباد کا میل فہر قاحس پر دھلا ہو رہے۔ ریجہ کو چند مرتبہ فون کر چکی تھی لیکن اس روز ترانہ نے اپنے جانا تھا کہ وہ کچھ ایسی مشکلات کا شکار رہی تھی کہ اس سے کس ہو سکتی تھی۔
 فون کی کھل پر اس نے ریجہ فہرزی سے چاہ فرما کر اسے کچھ فون تک بھیجی۔ اس کا خیال تھا کہ فون ہسپتال سے عباد لے گیا ہو گا۔“



”بیلو۔“
 ”اسلام علیکم۔“ دوسری جانب سے کھری ہوئی۔ ”بھگتہ کو از سنائی دی تھی۔“
 ”وہو ویکم السلام۔ میری سن صاحبہ کی ہے۔“ ریجہ نے کھری سانس بھرے ہوئے کہا۔
 ”آپ کی دعاؤں سے خوش باش ہوں۔“ وہ بڑا ”چرند کہ آپ کے شکایتیں بھی ہیں۔“
 ”مجھے سے؟“ وہ تعجب ہوئی۔ ”میرے تو ہم و مکان میں بھی نہیں کسہ کہیں۔ ایسا کیا تصور ہوا ہے مجھ کے لیے۔“
 ”آپ نے اس روز اتنے مزے دار کھائے کھلائے اور اس طرح کہ ہم آپ کی میزبانی کا شکریہ بھی ادا نہ کیا ہے۔ کم از کم کھانے کے مہمانوں کو کیت تک سی آف ہی کر دیتے۔“
 ”اودھ۔“ ریجہ اس کی بات سمجھ کر مسکرائی۔ ”دراصل ای کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ان کے پاس تھی۔“

”خیر بہت۔“ وہ چونکا۔
 ”عباد یہاں اور انقضاء ای کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان کی طبیعت کافی ڈاؤن ہو رہی تھی۔“
 ”اودھ۔“ ای کی۔ میں معذرت خواہ ہوں مجھے تو بالکل علم نہیں تھا۔ عباد بھی کمال کائنات ہے۔ کم از کم ہندو اتنی خیر خیرتا ہے اپنی۔ پھر و نیشنل ڈوم سے نکل کر بھی ہمارے درمیان دوستی اور خلوص کے کئی رشتے استوار

پہچانے گئے۔
 ”تمہارے جیسے عاشقان دل کے لیے ایک ہی شیردہری ہے۔ موت۔“ وہ دونوں کی طرح ان پر چھینی۔
 ”ولفتا۔“ وہ پوری کی پوری کسی کے گلے میں آگئی تھی۔ وہ رافع تھا۔
 ”پیچیدہ۔“ پیچیدہ کی پوری جی ہے۔ ”اس کا پھر یہ والا تھا۔ ہوا میں کیے ہوئے تھا۔
 ”جھوٹ۔“ میں کتنی ہوں جھوٹو مجھے۔ اس کیسے کو نہیں جھوٹوں کی میں۔ حساب برابر کرنے آیا ہے کتا۔
 میں اس کے سامنے حساب برابر کیے دیتی ہوں۔“
 آخر میاں جان بچا کر دینی مشغول سے لکھ لکھا ہے۔ رافع کو پھر بھی شہر کی کو قابو کرنا مشکل لگ رہا تھا پھر ولعتا“
 ای وہ بالکل ہی بے حس و حرکت ہو کر رافع کے بازوؤں میں جھول گئی۔



”شہزید منٹل شاکیب۔“ وہ کمرے انیس تھا تھا۔ ”یہ خوش قسمت ہیں جو اپنے خواہوں پر قائم رہیں۔“
 کی باقی حالت تہا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن پر کوئی بڑا صدمہ برداشت کیا ہے۔“
 ”صرف اپنی ضد سے لڑ رہی ہیں۔ وہ کوئی صاحبہ ای شہزید محبت کی نفی کیسے ہی کر رہی ہیں۔“
 رافع سانس بولا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور غور آتی تھی۔ ہاشم نے منٹل میں مکتوب دیکھا۔
 ”میں رات سے ہسپتال میں ہی گزار رہی۔“ اعذر آکر وہ رات کے کچھ شام آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“
 انہوں نے انکابت میں سر ہلایا۔ ”وہ اکثر آگے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ وہ کھڑا تھا۔ وہ کسی کمری سوچ میں مگن تھا۔ وہ تھا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔“
 ”پیچیدہ نہیں یا میں نے رافع یا میں نے کوئی حل نکالنا ہوتا۔“
 ”دیکھتے ہیں۔“ ہاشم نے۔ اسی دوران کی حالت ایسی تھی کہ وہ کچھ جانتا تھا۔
 ”عذرا بیگم نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تھی۔“
 ”ہاشم! رافع نے اس کے گاندے پر ہاتھ رکھا۔“
 ”تمہاریوں! سلام آباد جا رہے ہوتا۔“
 ”ہوں! دونوں کا وزٹ ہے۔“

”پیچیدہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ آفس کے کاموں سے فرحت کے ان کو انہیں مری اور بیورن لے جانا۔“
 ”پیچیدہ کو اسے ہاتھ ملوانا۔“ دیکھ لیں۔“
 ”سمجھا کہ انہوں نے اپنے اپنی موان دہیں۔ ان کا راز ہے۔ ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر پڑے گا۔“
 ”ابنک رافع یا۔“ ہاشم نے۔ میں اور پیچیدہ۔“
 ”تو مجھ بھی کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔“ رافع اس کا دھماکے سے مسکرایا۔
 ”دونوں کا چھوٹا سا بی مومن تم بھی

منالو۔“
 ہاشم کے چہرے پر ایک رنگ سا گرنا تھا۔ اس کی آنکھیں لہو بھر کے لیے ویران ہوئی تھیں پھر اس نے خود پر قابو لیا۔
 ”شہلا اپنی مرضی کی مالک ہے۔ پتہ نہیں دے جانا بھی چاہے یا نہیں اودھ۔ اور پیچیدہ۔ پیچیدہ کے بارے میں تمہیں کیا گمان ہے۔ یہ صاف انکار کر رہی گی۔“
 ”میں نہیں کریں گی۔“ رافع جھیرے سے بولا۔ ”نوٹ بھی ہیں اندر سے۔ اپنی کرسیاں میٹھے کے لیے انہیں بھی ستر در کر کے۔ تم اپنی کو۔“

”جوئی ایم سووی کہ اس وقت آپ ریٹائرڈ ہیں آپ سے بہت کدہ رہا ہوں لیکن ایسا کہ میں چند ایک روز میں ہو کے جا رہا ہوں۔ پاکستان میں معاملات کو فی الوقت شہر پارٹیکل کر کے سو جائے سے پہلے یہ معاملات خوش اسلوبی سے کسی حتمی نتیجے تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”ریجہ جانتی تھی کہ اس اس موضوع پر مزید بات کرنے سے روک دے۔ وہ ہولے کھٹکھٹا رہی۔ امیر حسن ابائی جون سن تھا۔“

وہیہ رینسور تھا مے بے جس و حرکت کھڑی تھی اس کے ماتھے سے پینہ ٹپک کر اس کی گردن میں سرسراہٹ کرنے لگا۔

ربیعہ نے بمشکل تھوڑا گھر میں چھپائے ہوئے کچھ سنا لے اور اکیلے پن کے درمیان ریسورس آتی ہوئی خواب ناک سہ آوازوں کے دلچسپ کھیل کا انا کا کھانا بنا رہی، تب ربیعہ کو اپنے تھیلے حذرات پر

نہیں ہے۔ دایوداد آپ کی ہاں یا ناں پر ہے۔ رجبہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ وہ خود کو کیسے جوڑ پر ہاں کہتا ہے۔

امیر حسن دھیرے سے ہنساتھا۔

شاید اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اللہ حافظ!“ امیر حسن نے فون بند کر دیا۔

وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاء نماز تک آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے انھیں بند لیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر سیدہ ولد نے نجانے کسے پکارا تھا۔ ربیعہ نے سہم کر انھیں کھول دیں۔

نام کے بارن دیا تھا۔ سہما کے سیزی سے اپنا پیوند یک ایسا اور پرواز کے لیے سمت بڑی۔ فلاں صرف ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھی اور ایئر پورٹ تک کے رستے میں خاصا ٹائم لگ سکتا تھا۔

”شہزادہ“ وہ بڑا دلکش شخص تھا جس کے ہاتھوں میں ایک گولہ تھا۔

آئی۔ ”کہاں۔ کہاں رکھے تھے۔“ اس کیلئے ذہن پر زور ڈالا ”تا نہیں ہاشم نے مجھے دے بھی تھے مابین ان کے۔“

آنور کھار اوڑ: خانقاہ اٹھا کر اے نے اندر کھے کاغذات نکالے پھر جسے مرگے ہوئے تھے بالکل اڑا دیا۔

نیچے ہاشم نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

یوسف نہ تھے مگر ہریا زار آگئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آگئے
آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آگئے
اب دل میں حوصلہ نہ سکتا ہڈوں میں ہے
اب کے مقابلے پر مرے یار آگئے

ہاتھوں سے لہجوں کو کاتنے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ نرم و ملائم سفید ہاتھوں کے ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہوئے اور کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے لیکن دھماکا کا پیچھے ان سے نہیں دوسرا۔ بہت دور کو پرواز تھا۔ اس کے برابر وہی نقشہ برائے انسان کو پیش کیے انداز میں دنیا دہاں سے بے خبر آتے تھے۔ بند کیے گئے مارتے گریبی تھی۔ اگلی کوئے والی نشست پر بائیں جانب اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شملہ نے ذرا کی ذرا ہاتھ کو کھینچا اور ایک مرتبہ پھر اچھٹے لہجوں کو کچلنے کی کوشش شروع کر دی۔

ایک تیر تھا جو دل میں یوں پیوست ہوا تھا کہ نہ آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ نظروں نے دیکھا تھا کہ دل کو ایک فسانہ معلوم ہونا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا۔ سوائے نشان قطار دور قطار اس کے اندر اتر رہے تھے۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ اس سکرار کا جواب اس کے اپنے پاس نہ تھا۔ جبر کے پاس جواب تھا وہ ایک نشست کے فاصلے پر بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

زندگی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اب کس جانب بڑھ رہی تھی؟ شملہ نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ اسے احساس ہوا یہ محض اعتبار کا سفر تھا۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کا سفر اسے دکھ ہوا ہر سفر کا انجام ایک سا کیوں تھا؟

وہ ابرار پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ابراہیم کے لیے اس کے پاس محبت تھی، غلوں تھا، وفا تھی، انجام کار دکھ ہے۔ اعتبار ہو جانے کا دکھ ہے۔

ہاتھوں کے ساتھ سفر کی ابتدا کیا تھی؟ محض اعتبار۔ اس نے بالآخر اس کی خاموش محبت اور دل کو چھوئے چن چن کر اعتبار کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تمام کر رہا نہ تھے کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے چل پڑی تھی اور اس بار بھی سفر کا انجام مختلف نہ تھا۔

ہاتھ کے برف کیس میں رکے ہوئے پیپر ڈسک جرم کی سزا تھے؟ شملہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے؟

شملہ نے سوچنے کی کوشش کی۔ شاید کچھ جرم اس کے نام اعمال میں درج تھے۔ ہاں شاید اس کے متقابل برتنے اور غلطی تھی۔ شاید اظہار محبت جنس منہائی کافی نہ تھا۔ اظہار محبت کی جرات بھی ضروری تھی۔ شاید شاید لا شعوری طور پر وہ اس کی مہربانی سے بے مری برت جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے نازک جذبوں کا ادراک کیے جانے لگا۔ سبک دینا کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی لیکن یہ سب کچھ تو اس کے روئے کو گزرتے وقت کا بخشا ہوا انعام تھا۔ یہ ادا ہے بے مہری و سنگدلی اس کا اپنا مزاج نہ تھی۔ یہ تو باہمی کا شائبہ نہ تھی۔ ہاتھ کو اس سے شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ہاتھ نے اسے جھٹکے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ رنگ کاروں کا ہر قسم ہونے سے کیا حاصل؟ وہ تو خود ایک ناقابل بیان الجھن و مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی سیمپا کے منتظر کسی اہم اعظم کے تشریف اور محبت سے بڑا اہم اعظم کیسے؟

ہاتھ نے اس کی محبت پر اعتبار نہ کیا۔ اسے کم از کم اپنے جذبوں کی پختگی پر یقین ہونا چاہیے تھا وہ اپنے ہی جذبوں کو رسوا کرنے کیوں چاہتا تھا؟
سوچ سوچ کر اس کا دل غل غل ہونے لگا، رگسں کھینچنے لگیں، وہ نہایت بے بسی کے عالم میں ایقان کی طرح جڑھاں ہو کر نیم دراز ہو گئی۔

شام غم کی سحر نہیں ہوتی یا ہم ہی کو خبر نہیں ہوتی
ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں بے گلی اس قدر نہیں ہوتی
دوستو! عشق ہے خطا لیکن کیا خطا درگزر نہیں ہوتی
ایک جاں سوز نامراد خلقت اس طرف ہے آخر نہیں ہوتی
دل چاہا نہیں گدائی کا عاشقی دردور نہیں ہوتی
دل چاہا نہیں گدائی کا۔

ہاتھ کے سینے میں ایک ہوک کی الجھی تھی۔ تہ شدہ اخبار آنکھوں پر رکھے وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود نفس کے احساس کو خود پر کسی غلاف کی طرح ڈھانپنا محسوس کر رہا تھا۔

سبک دل ہے وہ تو بچوں اس کا گھ میں نے کیا
جکے خود پتھر کو بت، محبت کو خدا میں نے کیا!

نظر پڑا اور گہری تھوڑی سی سلاخ اتر رہا ہے۔ بری ہو۔ تمہاری آہوں کو میں محبت سمجھا۔ تو کیوں؟ کیا؟ تمہاری غفلت کی کوئلے اپنے جذبوں کی سچائی جانا۔ کیوں جانا؟ تم سے شکایت کا کوئی حق میرے پاس نہیں ہے۔ تم نے مجھے آرا پی محبت کی بجائے کارنامہ بنایا تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے کچھ نہیں ہے۔ میرے سینے پر سر رکھ کر تم نے کسی اور کی طرح کون سا چاہا تو بھی کوئی بات نہیں۔ محبت میں نے بھی کی ہے۔ اس کی سہ زوری سے میری باتوں پرستی ہوئی۔ شملہ نے بہت ایمان دار بھی ہوئی ہے۔ بہت بے ایمان بھی۔ جنہیں میری ذات کا سہہ چاہیے تو میں تمہیں یہ رستہ دوں گا۔ تم جہاں تک جانا چاہتی ہو میں تمہیں پہنچاؤں گا۔ تمہارا اظہار محبت کی کوشش۔ کچھ کرتا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پاتا۔ میری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن تم کو خود سارا انتظار تھا۔ اسیا صاحب ایک بارادری آخری بار میرے مری خوشیوں میں شریک ہو کر اس کی طرح جیسا تم چاہو کیسیا ہو گا۔ میری غلطی میں تمہارا وجود نہیں ہے شملہ! صرف تمہاری آنکھ کا ایک کونا ہے۔ تمہارے آنکھوں کا ان رخصت میری غلطی کھول دے گا۔ میرے یقین رکھنا۔
اخبار کے کونے نے اس کی آنکھ کی جذب کی تھی۔ جہاز بازو پھیلائے کو پڑا تھا۔

سب ملایا ہے، سب دھاتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کما ہے، فیض نے جو فرمایا ہے
سب ملایا ہے
جو لوگ ابھی تک نام و وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں

ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے
سب ایسا ہے
جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جا
اس شر سے دور اک لکھا ہم نے بنایا ہے
اور اس سنگینا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

آنکھیں موندے وہ اندر ہی اندر کہیں پھیل رہی تھی کیا جانتا تھا اس کے پاس؟ اک جھوٹی ناک کا احساس تھا، وہ بھی نہ رہا۔ کسی رزم کے شکست خوردہ سپاہی کی مانند جس نے آخری دم تک ہتھیار اٹھائے رکھے اور پھر ہراسہ مسدود کار خود کشی کر لیتا تھا۔ سچ چاہنے کے باوجود جس کے پاس جینے کا کوئی اخلاقی جواز نہ تھا، ہو کیا تھا خود کو ایسا پارا ہوا سپاہی محسوس کر رہی تھی زندگی نے جسے خود تک پہنچنے نہ دیا اور موت جس سے کٹر کر نکلی گئی۔ بس سالوں کی زنجیر پریشانی کی مانند رہی تھی۔
کتنی خوش نصیب تھی اس کے پاس جانب بیٹھی ہوئی شمشلا جس پر زندگی ہتھیار کی مانند مہیاں تھیں جس کی ذہنی ناؤ کو ہر مار بھجوت کا مہیاں سارا مل جاتا تھا جس کے سر پر ہتھیار کی ناؤ کو بھر کر کئی تھی ڈانگے کی پل تھیں اور اعشار کے رنگ پھر اسے گھیرے میں لے لیتے تھے۔
کتنا خوش قسمت تھا اس کے دائیں جانب بیٹھا ہوا تھا اس نے زندگی سے جو مانگا زندگی نے اس کی خاطر سنبھال رکھا اور پھر اس کی جھولی میں ڈال دیا۔
اور کتنی بد نصیب تھی وہ سب کچھ کراچی کچھ پانکھی کچھ پانکھی کی شیدائی تھی اور اب سوال اٹھائی تھیں لے بنائے کس سے کس کی مسافر تھی۔
آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بار کتنی دن عاشر سے باڑی تھی وہ قسمت سے باڑی تھی وہ خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے ہتھیار گرا دیے تھے اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جیسا بنائی ہے اسے اسے وہاں رہنا ہے اسے جتنی حدی گئی ہے وہ بس وہاں تک ہی جاسکتی ہے۔ قسمت میں جو جیسا پیش آئے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا ہے۔

ہر کوئی شمشلا بیٹھا نصیب لکھو کر نہیں لاتا۔ ہر کوئی باشم جیسا ہر غلوس اور قابو پر نہیں ہوتا۔ وہ شمشلا نہیں ایقان تھی۔ باعشر باشم نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس کی ذات میں ہر خلی کو تنجھ لکھا جاتا تھا جتنا ایذا و ایقان کو دے سکتا تھا اس نے کیا تھا اس سے زیادہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایقان نے کیوں اس سے زیادہ کی طلب کی؟ وہ قصور وار تھی اس نے اسے انسان سمجھنے سے انکار کیا اسے فرشتہ سمجھنے اور فرشتوں کا سا سلوک پانے پر مصر رہی۔ اب سمجھنے سے انکار کر کے وہ اسے اپنے سامنے ٹھکے ٹھک دیتے پر مجبور کر رہی تھی۔
نیجہ دی تھا جو ایک کسی بھی سرپری ضد کا ہوتا ہے۔ آج وہ تنہا تھی، جس طور پر خود کو بیمار بزمہ تصور کر رہی تھی۔ وہ سارے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ زندگی کو خود سے بھٹکا ہوا دیکھ رہی تھی۔
صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی ہنسنا ہوگا

منیہ و تنیم اس طرح ہسپتال گئیں کہ پھر لوٹ کر گھر نہ آئیں۔ انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ عباد گھر لوٹا تو اس کی

رنگت اڑی ہوئی تھی۔ وہ از حد پریشان معلوم ہوتا تھا۔ رنجہ۔ کابل اس کی صورت دیکھ کر دھک سے رہ گیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔
"عباد بھائی؟"

عباد نے مرکز رنجہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ تھا۔
"رنجہ! بتا رہی کرلو۔ تمہیں اسی کے پاس ہسپتال جانا ہے۔ میں تمہیں ہی لے آتا ہوں۔" دکھ کے گہرے احساس سے اس کی آواز بول چل ہو رہی تھی۔

"امی۔ امی کو کیا۔ کیا ہوا؟ عباد بھائی؟" رنجہ کو پوری دنیا اندر ہوتی محسوس ہوئی۔
عباد خاموش رہا پھر اس نے اپنی رشتہ واپج انا کر سائڈ شیل پر رکھی۔
ایک گلاس پانی لاف۔ پلیر۔ "اس کے سوال کا جواب دینے سے احتراز کر رہا تھا۔ رنجہ دھڑکتے دل کے ساتھ

ایک مہمان سارا بن گیا جس کے پیچھے وہ بڑا گڑن تھی۔ رنجہ کو نجانے کیوں اپنے سر سے وہ مہمان سایہ دور بناتا ہوا محسوس ہوا سپاہی لے کر وہ اپنے دل کو عباد ایک ہاتھ سے سرتھاپے بٹھا تھا۔
"عباد بھائی! پانی۔" رنجہ کو بھر بھر کے پونے کے بعد آہستگی سے بولی۔
عباد نے سر اٹھایا۔ رنجہ بری طرح سے جو کچھ لکھا پکارا چہرہ آسموں سے تھا۔
"رنجہ! وہ بولا۔ "وہی ہوا جس کا ٹکٹ تھا۔ ایک ٹکٹ ٹکٹ سے۔ وہ وہ۔ شاید زیادہ عرصے تا۔

جتنی باتیں ہماری اسی سے پیچھا چلا گیا۔ رنجہ کو پھر ایک بار دیکھ کر وہ بولا۔
"عباد بھائی! پانی۔" رنجہ کو بھر بھر کے پونے کے بعد آہستگی سے بولی۔
عباد نے سر اٹھایا۔ رنجہ بری طرح سے جو کچھ لکھا پکارا چہرہ آسموں سے تھا۔
"رنجہ! وہ بولا۔ "وہی ہوا جس کا ٹکٹ تھا۔ ایک ٹکٹ ٹکٹ سے۔ وہ وہ۔ شاید زیادہ عرصے تا۔

"کیوں نکر کرتی ہو؟" وہ رنجہ کو خود سے لپٹا کر زمین سے بولیں۔ "میں ٹھیک ہوں! بالکل ٹھیک۔ کل ہم گھر چلیں گے۔"

رنجہ نے بے بسی سے ان کے چہرے کی جانب دیکھا وہ ان سے کیا کہتی؟ وہ ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟
"میں نے کچھ نہیں بولی؟" انہوں نے رنجہ کے بال سمیٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ "تم ایسی صورت بنا کر بالکل اچھی میں لگتیں۔ مجھے تو تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ میری آنکھوں میں روشنی ہی بھر جاتی ہے۔"
رنجہ ایک ایک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک دو دنوں میں ہی بالکل ٹھیک سی گئی تھیں۔ ان کی رنگت پہلے بھی کھلی لگتی تھی لیکن آج ان کے چہرے پر مرنی کا تاثر اتنا واضح تھا کہ رنجہ بالکل ٹھیک سمجھ ہی ہو گئی۔
"شمسلا نہیں آئی؟" وہ ادا سی سے بولیں۔

"اپنی اسلام آباد گئی ہیں کل پر سوئیں آج آئیں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"آجی اواس کیوں ہو رنجہ! وہ مجھے سمجھے انداز میں پوچھنے لگیں۔ "کیا میری وجہ سے پریشان ہو؟ مت ہو پریشان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں! وہ بے ہمت خوش ہوں۔"
رنجہ خاموش رہی عباد بھی بالکل خاموش سانسو نے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انفقہ رنجہ کے آنے پر گھر جا چکی تھی۔ اسے بھی رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ کمرے میں بلی سی مڑی اور لو بھل بن تھا۔
"عباد! منیہ و تنیم بولیں۔"

”تم اب گھر جاؤ، آرام کرو۔“

”ہاں کی بات نہیں مانو گے تو ماں خفا ہو جائے گی۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

”لیکن یہاں خدا نخواستہ کوئی ضرورت۔۔۔“

تم اب جاؤ آرام کرو۔ انیقہ کا خیال رکھنا۔

عبادنا چار اٹھا تھا چند قدم چل کر وہ ربیعہ تک آیا۔

”ربیعہ! کوئی مسئلہ ہو تو فوراً“۔۔۔

”جی ٹھیک ہے۔۔۔ آپ کے سیل پر کال کروں گی۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی تھی۔

UrduPhoto.com

"ربیعہ... ربیعہ..." وہ اسے پکار رہی تھیں۔

ربیعہ گواہی جگہ پر ان کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اس کے قریب ہی بول رہی ہوں۔

”واوی... واوی...! آجائیں... آندو آجائیں...“ درجیدہ نے انہیں پکارا۔

استے دنوں کے بعد وہ دادی کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ دادی خوش نہیں لگتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اداسی منجمد ہو چکی تھی۔ پریشان بالوں اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ بیمار لگ رہی تھیں۔

”زادی! اندر آجائیں۔۔۔“ ربیعہ نے پھر انہیں یکارا۔

”وہ نہیں آنے دیتی۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”کون؟“ ربیعہ نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ”کون؟“

”وہ... جو بستر پر لیٹی ہے۔“

ربیعہ نے دیکھا، بستر پر منہ زہ بیگم لیٹی تھیں۔

”یہ...؟ یہ تو میری امی ہیں۔“ رجبہ مسکرائی۔

”ہاں۔“ وہ بولیں۔ ”یہ مجھے اندر نہیں آنے دیتی۔ اس سے کمزور بیچہ! مجھے اندر آنے دے۔“ وہ لجاجت سے بولیں۔ ”باہر سردی ہے اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”باہر سردی ہے اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”رہیجے!“ دادی اچانک اسی شیشے سے دور ہونے لگیں۔ ”رہیجے! مجھے روک لو۔ اس سے کو مجھے اندر آنے

”اس سے کہو یہ جیسے اس سے کہو۔“ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”ایسے امی! ربیحہ نے بے ساختہ منہ پر ہیکم کو پکارا۔ ”ایسے“

دادی اب دور ہوتے ہوتے پھرے ایک ہیولے کاروبار اختیار کر چکی تھیں۔

”ای۔ ای۔ ای۔!“
کے خستہ کپڑوں کے

ایک نخت رہبر کی آنکھ کھل گئی وہ انی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ خشک تھا اور شخص سے حدیث پورا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مے کا محل بالکل ویرانی تھا بسواہ چند کھوپڑیوں پر اسے خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہی آباد چرا وہی سناٹا وہی خشکی۔ اس نے کڑکی کے شیشے کو دیکھا جس کے پار کھجور کے درخت تھے، وہ شیشے نظر آ رہے تھے۔ اس نے برابر میں سوئی ہوئی مینہ وہ تیکم کو دیکھا۔

مجدد، آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھیں۔ دیر سے دیر پہنچتے ہوئے، کھڑکی تک اپنی اور باہر دیکھنے لگی۔ باہر
 ڈروازا، کعبہ سناٹا تھا۔ رعبہ نے آہستہ سے کھڑکی کھولی۔ کھڑکی کے بلندی پر طرح سے لٹکی ہوئی چادریں
 سر جھونکاں اور آٹا تھا کہ رعبہ کے ہاتھ نہ ہو گئے۔ ہر جگہ کمرے نے ابھی پوری طرح سے اسے قدم نہیں
 جاتے تھے۔ رعبہ کو خوف محسوس ہوا۔ اس نے جلدی کرتے کھڑکی بند کی اور لیٹ کر پتھر لٹ اپنی جگہ تک آئی۔ اٹا

[illegible]

نژادری سہی۔

باہر پہنچ چکی ہوئی رات بہت خوبصورت تھی۔ اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی ہو کر دیکھ کر شہلا نے سمجھ لیا کہ یہ ساری خوبصورتی اور دلکشی کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر سمونا چاہا۔ بجائے زندگی میں بھر کبھی ایسی دلکش رات نہ آئے۔
 مگر وقت میسر نہ آیا تھا۔

”تم ہو ساتھ رات بھی حسین ہے۔۔۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“

لہا کی خوبصورت آواز نے تک نہتی ہی، جیسے اچول کو مزید خراغ کیا۔ کتا۔ شملانے یریلانی سے مرکز کو کیا۔ شیشے کے دروازے کے باہر بیٹھنا اچھل پڑی کہ چیلن بدل رہا تھا۔ شملان کا ہر سے ٹیس پر کھڑی تھی۔ قریباً سو گج سے بچنے کے وقت سے۔ بخوریں کی خوبصورتی سے اس کا تہ نہ بھر ا تھا۔ کبھی وہ طالب علمی کے زمانے میں کالج کی نمب سے آکر پاکستان کو دیکھ کر بھی تھک تھک کر آتے ہوئے سٹول کے پورے ٹولے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

تب وہ اور اہل یقین ہاتھوں میں ہاتھ دیے یہاں مسرکوں پر گھونٹی بھری تھیں۔ مری، پیڑیاہ، بھورن، قضا علی
ہوں نے سب اپنی بچہ تپ چھوڑا تھا اور قصد کیا تھا کہ وہ لوگ ہر سال نہ سہی تو چند ایک سال بعد ضرور یہاں آیا
میں گی اور اب کتنے سالوں بعد قسمت چند روز کے لیے یہاں لائی تھی، وہ بھی اس طرح کہ شملہ ایلی میس پر

کھڑی بی بی کے خوبصورت لائن کو ایک گہری اراسی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور یقیناً برابر کے کمرے میں لائنس آف کے ستر پر لیٹی بنائے کیا سوچے جاتی تھی۔

شمالیہ نے ایک باجیگر مرزا کرے میں اسلئے بھجے دی دیکھتے تھے کہ کون دھاسا تاں سی جاہور کا دلہا ہے کہ اس کی پاس دہاں تیریں پر چلا آئے اسی الفت کے ساتھ جو اس نے شمالیہ کے لیے وابستہ کر رکھا تھا وہ نری بھری محبت جو دیر سے دیر سے دل کے دروازے پر دستک دیتی تھی آج نجانے کہاں گم گئی۔ وہ بولتی اکھیں وہ راز افشا کرتی مسکان وہ سکون آمیز لہجہ۔ ہاشم نے اپنے سب سے خزانے نجانے کہاں چھپا دیے تھے۔ ایک کمری خاموشی تھی جو اس نے خوب بٹاری رکھی تھی۔

شہلا کو ایک مرتبہ پھر ڈیوڑھی اور سر پیمبر زیادا نے۔ اس کی پتلون پر ہی پیسے کی ہمارے ایسا سیوں سوچا؟ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے شہلا سے کچھ بھی کیوں نہیں کہا؟ اور وہ کس بات کا انتظار کر رہا تھا؟

”تم ہوتا تہ رات بھر جی نہیں ہے“ آپ تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“

ہاشم کی چیلنج بدلتی انگلیاں ایک جگہ جم گئیں۔ لہنا کو بصورتِ بیتِ محراب کا یہاں اور رشتہ احساسِ عمارت و چیلنج بدلتا ہوا گیا۔

”میں نے یہاں سے ہوتے۔“ اس نے آواز نکلتے سے سوچا۔ ”جو خود تمہیں ہر غم ہر فکر سے آزاد کرنے کی

[illegible]

مگر ان کو تو میری آنکھوں میں پھر خواب اگر ہو جاوے تو کیا۔۔۔“

کے فاعل پر کئی شملہ خود سے بہت دور محسوس ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر زہینہ: دیکھ کاچیک آپ کر رہے تھے۔ انہیہ بھی وہاں موجود تھی۔
 رجبہ: کہہ رہے تھے یا ہر کھل سٹی اس کا دل بے طرح اڑا اس ہو رہا تھا۔ اُسے والے سرائے شاملیں ابھی یا سیت

آہستہ آہستہ کارڈور میں چلتے ہوئے دیوار کا ایک رکیہ سامنے سے آئی، وہ کی ڈانٹا، آنا تھیں۔ ریجہ بیگم غدار بیگم کو رو رو کر رہی تھیں۔ ریجہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

”وَنُكَلِّمُ الْإِسْلَامَ أَيْ كَيْسِي هِيَ مَنِيزَةُ بَہن!“ رابعہ بیگم نے پوچھا۔

رہیجہ اس سوال کا جواب نہ دیا جا سکا اس کی آنکھوں میں دلیاں بھر گیا۔

”آئیے تا ب لوگ۔“ وہ انہیں لے کر کمرے کی جانب بڑھی۔

ڈاکٹر زہرا ہر نگل رہے تھے۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئیں تو کم مسمیٰ منہ پر تیکہ تدرے سنہل گئیں۔ سلام دعا کے مراحل سے گزر کر لوگ ان کی خدمت دریافت کرنے لگیں۔ منہ پر تیکہ اپنی اصل بیماری سے آگاہ نہ تھیں۔ وہ انہیں اپنی تکلف کے متعلق بتانے لگیں۔

رہیجہ گلاب پیکھی پڑھ رہی اور اداس تھا وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آئی۔ چند لمحوں بعد وردہ بھی باہر نکل آئی۔

رہیجہ کمرے کے سامنے بیڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جہاں سے ہسپتال کا لان نظر آتا تھا۔ وردہ اپنی جگہ ٹھیک کر کر گئی۔ ایک ہاتھ دیوار پر دھرے وہ رہیجہ کو دیکھنے لگی۔ زورورنگ لباس پر سفید پونچھ پہنے جس سے کنواروں پر نہایت نفس کشیہ بہاؤ تھا۔ رہیجہ بے حد کمزور معصوم نظر آ رہی تھی۔ سیاہ آنکھیں دوسرے بھی نرم اور اداس معلوم ہوتی تھیں۔ گلاب ایک دوسرے میں پوست تھے اس کی پشت پر بڑی سیاہ چلی اس کی شخصیت کی نشانی میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھی۔ وردہ اس کے قریب پہنچ کر کھٹکنا سی رہی اور چونکا اٹھی۔

”اگر سے وردہ۔“ اس نے سکرانے کی کوشش کی۔ ”مجھے یہی نہیں چاہا۔ باہر کیوں چلی آئیں تم؟“

”میں بولنی۔“ وہ بھی دھیرے سے سکرانی۔ ”میں کیوں چلی آئی ہوں؟“

رہیجہ نے گہری سانس بھر کر سر جھکا دیا۔

”ابھی ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وردہ نے اسے تسلی دی۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

دو دنوں دھیرے دھیرے کارڈیور میں چلنے لگیں۔

”اور تم سناؤ۔“ یونیورسٹی جاری ہو؟“ رہیجہ نے پوچھا۔

”ہاں لیکن تمہارے بغیر مزہ نہیں آتا۔“

”میں اب یونیورسٹی نہیں جاسکتی۔“ رہیجہ بولی۔ ”میں اپنی کو اس طرح چھوڑ کر ایک پل کے لیے بھی کہیں نہیں جاسکتی۔“

وردہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ قدرے دھیان سے دیکھا۔

”تم بہت اچھی ہو رہیجہ۔“

”اور تم سناؤ۔“ رہیجہ نے موضوع بدلا۔ ”شادی کی تیاریاں کہاں تک پیچھے ہیں؟“

”مجھے ہفتے ناعامہ، ٹھانیے اور عیشہ تینوں ایک ساتھ ہاؤس بیٹھ رہی ہیں۔“ وہ اُسی۔ ”میں تو ابھی کمزور ہوں۔“

بھول جائیں گے اتنا دیکھنا چاہا ہو گا۔ تم ضرور آنا رہیجہ؟

”میں۔“ رہیجہ دھیرے سے بولی۔ ”میں کہاں کیاؤں گی وردہ! تمہارا مذمت کرنا لیکن میں نہیں آسکتی۔“

”کسی ایک فکشن میں تو۔“ لہجہ۔ ”وردہ نے اصرار کیا۔“

”تمہاری شادی میں آؤں گی ضرور۔“ رہیجہ مسکرائی۔

وردہ یک فٹ ای خاموش ہو گئی۔ دونوں کارڈیور کے کونے پر پہنچ کر کڑک گئی تھیں۔ ”میری مانو تو تم بھی ان تینوں کے ساتھ ہی ہاؤس بیٹھ جاؤ۔“ رہیجہ دل پر دھچکا ہوا جو لگا کرنے کے لیے ہلکے ہلکے انداز میں بولی۔ ”سب لڑکیاں خیریت سے منت جا رہی ہیں۔“ وردہ قدرے سختی سے سکرانی تھی۔

”میرا ہی انوٹ تیرا کیا کوئی ارادہ نہیں۔“

”کیوں؟“ رہیجہ کی آنکھوں میں تیرت بھر گئی۔

”میں۔“ رہیجہ میں شاید۔“ وردہ نے ایک ایک کچھ کہنا چاہا۔

رہیجہ اسے جڑائی سے دیکھتی رہی۔

”میں شاید رافع سے شادی نہ کیا ہوں۔“ وہ بالآخر بولی تھی۔

”وردہ!۔“ رہیجہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”لیکن کیوں کیا برائی ہے رافع میں؟“

”بس۔ دل بدل آنا۔“ وہ کہیں ہوتا۔ ”وردہ نے اختیار اپنی آنکھوں کا خطرہ اوری انداز میں مروڑنے لگی۔

رہیجہ نے اسے دیکھا۔ ”وردہ نے چند لمحے پہلے بھی بولنے کے قابل نہ رہی۔

”رہیجہ! میں اتنے عرصے سے دل کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے جو فیصلہ کر دیا، ہمیں اسی کو قبول کر لینا چاہیے۔ خوش دلی سے باہر سے۔ یہوں کی سوچ ہماری سوچ سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اسی بہت سی باتیں میں سوچتی رہی رہیجہ! خود کو بسلائی رہی لیکن ان میں اس نیچے پر پختی ہوں کہ زندگی کا اختیار اپنے لیے کرنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہونا چاہیے۔“

رہیجہ تیرائی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”لیکن وردہ! تمہاری ابا۔“

”اسی نے یہ اختیار خود مجھے دیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں کو رکھنے کا کیا۔ نہ رکھنے کا۔“

”نہیں۔“ رہیجہ نے رافع سے۔ ”کوئی شکایت نہیں۔“ رہیجہ کے الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ابا کی بات نہیں ہے رہیجہ! اگر رافع میں کوئی برائی ہے، بہت اچھا انسان ہے۔ سو فٹ، وبل مینز، کھانا کھانا۔“

دورہ چند لمحے دانتوں سے لب کاٹتی رہی۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تمہارے بعد!“ وہ مایوسی سے بولی۔

”دورہ!“ ربیعہ نے اس کا ہاتھ تھما۔ ”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔ تدبیر معاملہ فہمی، دوراندیشی، بنیادوں میں ان سب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو، محض جذبات کے دھارے میں بہہ کر سوچ رہی ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے میں جذبات کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہ فیصلہ تدبیر اور دوراندیشی کے سہارے کرو۔ تم نے ابھی بالکل ٹھیک کہا کہ رافع کسی بھی لڑکی کو زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ وہ لڑکی کسی اور کو نہیں، تمہیں ہونا ہے ورنہ صرف تمہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود دورہ کے ہاتھ کو سرد تر اور بے جان سا ہوتا ہوا محسوس کیا پھر اسے پھتپھتا کر چھوڑ دیا۔

”او، کمرے میں چلیں۔ سب لوگ کہیں گے کہ ہم دونوں نجانے کہاں چلے گئے۔“ وہ دونوں کمرے کی جانب مڑ گئیں اور آہستہ آہستہ کارڈز کے کونے سے دور ہونے لگیں۔ تب بہت آہستگی سے رافع وہاں سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے کونے پر نمودار ہو کر دیر جاتی رہی۔ اور دورہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔ وہ خود کو بے تاب شاہتہ کا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہا تھا۔

دورہ اور ربیعہ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نگاہوں سے او جھل ہو گئیں تو وہ بچنے جان ہوتے قدموں سے واپسی کے لیے چڑ گیا۔

UrduPhoto.com

ہسپتال کے لانا میں ایک دورہ خداداد زندگی کی نئی پرت لکھ کر لائیں۔ خود کو بہت تھکا ہوا اس اور ادھورا محسوس کیا۔ اپنا ٹوٹا ہوا اور اس قدر پڑھ لکھ اس نے خود کو بھی پایا ہو۔ اسے یاد نہ تھا۔

وہ صرف مستحقہ تنہائی کی مزاح پر ہی کے لیے وہاں آیا تھا اس میں اس کی کسی اور جاہ یا تشنگانہ دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں آکر دل نے کیسا بوچھڑا دیا تھا وہی جانتا تھا۔

”میں۔۔۔ میں شاید رافع سے شادی نہیں کر پاؤں۔“ دورہ نے کہا تھا۔

”بس۔۔۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔“

”میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہ اقرار کسی اور کو دے چکی ہوں۔“ یہ ربیعہ کی آواز تھی۔

”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔“

”وہ لڑکی۔۔۔ کسی اور کو نہیں۔۔۔ تمہیں ہونا چاہیے ورنہ۔“

رافع نے اپنا سر نیچے ایشیت سے نکایا اور آسمان کی وسعتوں کو کھوجنے لگا۔ کتنا حقیر، کتنا بے مایہ تھا اس لئے اس کا وجود جسے کوئی بھی اپنا نہ کویتا رہ نہ تھا۔

اس نے لان میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ پودوں کو۔ پھولوں کو۔ سخی بینچوں کو۔ فوارے کو۔ سبز گھاس کو۔ اس نے ہر شے کو زوریدہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب اس کا جید جانتے تھے جیسے وہ سب اسی پر مسکرا رہے تھے۔ اس پر طعنہ زن تھے۔ رافع کا جی چاہا کہ وہ ساری دنیا سے اپنا چہرہ چھپالے۔

گہری سانس بھر کر وہ سیدھا ہوا۔ تب اس نے درویش پر عباد اور امیر حسن کو اندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ لہجہ میں دھڑکنے والا تھا۔ اس نے اس وقت کسی کا سامنا کرنے کوئی آمادہ نہ تھا۔ جب میں اپنی گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے وہ پارکنگ کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

کی پی بی محرومن کے سربراہ اقبال میں بیٹھی وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ نرم و خوب اس کے پیروں سے ذرا پرے گلاب کی کپڑیوں پر رک رک رہی تھی۔ اقبال کی نظریں اس جگہ پر جم گئیں۔ کئی سال پہلے اسی جگہ بیٹھ کر اس نے کتنے شوق سے تصویریں بنوائی تھیں۔ وہ تصویریں اب تک اس کے سینہ پل کر رہی ہوئی تھیں۔

اقبال کی پگھلے ہوئی ہنسی کے دل میں ایک ہوک اٹھی تھی جس نے سوئے ہوئے ہر جذبے کو جگا دیا تھا۔ خود ایدہ جذبے کے سانس لگے تھے۔ اس کا پیلا ہوا پیٹ بچوت کر دو سے قدم بڑھ کر دھڑکنے لگا تھا۔ آپ منوانے لگی تھیں۔

اچانک اسی ساہا سرب والی چیلون میں قیدو نہایت گورے، حسین، پرانے کے قریب اگر رکے تھے۔ اقبال نے ذرا کی ذرا اسرا کر لیا۔ وہ بڑھتی ہوئی تھی۔ اس نے حد حسین تھی۔ جس پر اس نے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بھی بڑھتی ہوئی تھی۔ اقبال کا نفس دھڑکنے لگا تھا۔ وہ نارنگی لگی تھی۔ اقبال اسے دیکھتی تھی۔

”ہنس“۔ ”خیر، خوب حال اقبال چالیس ہے۔“ وہ اگھر پر کی پگھل رہی تھی۔ اقبال نے نہایت جرت سے انہماک میں سر ہلایا۔ ”میں کچھ دیر یہاں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔“ وہ بڑھتی ہوئی تھی۔ اقبال نے پھر سر ہلایا، وہ مخاطب سے انداز میں اس کے قریب پہنچی۔ ”آپ مجھے کسے جانتی ہیں؟“ اقبال نے پوچھا۔

”یہاں کسی کے ساتھ آئی ہوئی ہوں؟“ اس نے اقبال کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ”میں اپنے بیٹے کو اس کی بیوی کے ساتھ۔“ اس کی بیوی میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔“ اقبال نے اپنے سوال سے اس کا احتراز واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ ”یہاں تو اپنے شوہر کے ساتھ آنا چاہیے۔“ وہ مسکرائی۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک واضح آواز آئی تھی جس نے اس کی پگھل کو بھی نم کر دیا۔ اقبال لمحہ بھر کے لیے خاموش رہی ہوئی۔

”وہ پاکستان میں نہیں ہوتے۔“ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”پاکستان میں نہیں ہوتے؟“ اس نے نارنگی کو حیرت ہوئی۔ ”پھر پھر کہاں ہیں وہ؟“ ”نہیں۔“ اقبال لمحہ بھر کو کی۔ ”جہاں میں۔“ ”نہیں۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔ ”وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔“ اقبال بے طرح چونکی۔ ”بیٹھی سے وہ اس نارنگی کو گھورنے لگی۔ ”تمہیں کیا جانتی ہو میرے شوہر کو؟“

”نہیں۔“ ”آف کورس۔ بہت اچھی طرح۔۔۔ اسی لیے تو میں تمہیں جانتی ہوں۔“

”تم کون ہو؟“ ”سکرانچ۔“ ”وہ میرے سے مسکرائی۔“ ”سکرانچ؟“ اقبال نے دہرایا۔ ”لیکن عاشر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ ”ایک لوگ کا ایک اچھے دوست کا اور ایک طرفہ محبت کا۔ میں اس سے محبت بھی کرتی تھی۔“ اقبال کے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ ”عرا؟“ ”اے اختیار اس کے کیوں سے نکلا۔“ ”تمہارا تو ہوا؟“ ”ہاں میں آ رہا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

اقبال کے ہونٹ عاشر سے تھک گئے۔ آج بھی شعلے پر سارے لگیں۔ اس کا پیلا تمام اخلاقیات بالا کے طاق رکھتے ہوئے وہ اس مخصوص عورت کا گریبان بکڑے اور طہانے مارا کر اس کا چروال روئے۔ یہی عورت اس کی برائی کا سبب بن چکی تھی۔ اس کی زندگی کی تمام تر خوشیاں دکھ میں بدل دیں۔ اس عورت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے نفرت کی شہت سے اس کے پیٹ میں جھکے لگتے محسوس کیے۔

”عرا۔“ ”میری بھاری آواز نے حد قریب سے آئی تھی۔ ”لڑاؤ لڑاؤ۔“ ”لڑاؤ لڑاؤ۔“ ”لڑاؤ لڑاؤ۔“ ”میں تو کرمزین۔“ اقبال نے بھی پوچھی تھی۔ ”کھیلوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے میرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔“

”ہاں، اسی لئے۔“ ”میں تو کرمزین۔“ اقبال نے بھی پوچھی تھی۔ ”کھیلوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے میرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔“ ”میں تو کرمزین۔“ اقبال نے بھی پوچھی تھی۔ ”کھیلوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے میرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔“

”وہ لڑاؤ لڑاؤ۔“ ”میں تو کرمزین۔“ اقبال نے بھی پوچھی تھی۔ ”کھیلوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے میرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔“ ”میں تو کرمزین۔“ اقبال نے بھی پوچھی تھی۔ ”کھیلوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے میرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔“

اقبال کا ذہن ان کی گفتگو کی جانب ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ مسلسل عاشر کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ عاشر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چند ہی روز میں اسے شادی کر دے گا۔ اس کے بعد اس نے کبھی اقبال سے رابطہ نہ کیا۔ پھر اس نے اقبال کو ایک خط پر فریج دی اور اس کے بعد سے اس کا کچھ آنا پنا نہ تھا۔ یہاں لڑاؤ اس کی اور کے ساتھ موجود تھی اور اسے اپنا شوہر چاہتی تھی۔ عاشر نے اقبال کا ذہن ایک جگہ پر لٹکا دیا تھا۔

”یہ بہت تمہارا شوہر ہے۔“ ”نہیں کے جانے کے بعد اس نے جلدی سے بوجھا۔“ ”نہیں۔“ ”میں نے اچھی بتایا ہے تمہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”شاید تمہیں نہ جانتی ہو۔ میرا شوہر لڑاؤ کے عاشر کو بڑھتی ہوئی تھی۔ اس نے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے تمہیں اس کی بیوی ہو، سمجھ سکتی ہوئی کہ تمہاری عورت جو عاشر جیسے مرد کی نہوت میں رہے، وہ اسے چاہنے لگی۔ وہ نہ صرف بیٹھ سم بلکہ بہت پیارا انسان ہے۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“

اقبال نے کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔ اس نے لڑاؤ کا ریمان بکڑا دیا۔ اس پر تھپوٹوں کی بارش کی نہ مغلظات کہیں

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اتنا ضرور تھا کہ عاشر کا ذکر اور وہ بھی ایسے الفاظ میں سن کر اس کا دل سینے میں یوں ترنے لگا تھا جیسے کسی نے اس پر چھری چلا دی ہو۔ عاشر کی بے پناہ محبت جو خون میں حل شدہ تھی جیسے ہر رگ جال سے چھن کر کاٹھن دل میں جمع ہو رہی تھی۔

”پھر تم نے مسٹر منیر سے کیوں شادی کر لی؟“ دھواں دھواں لہجے میں وہ انتہائی پوچھ سکی۔
”کیونکہ عاشر کے انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسی جیسا مرد چاہتی تھی۔ انتہائی مکمل، انتہائی پیارا، انتہائی ٹائٹ۔“

”عاشر! بس حیرت سے بیدار کرو گئی۔“
”پھر میں نے طے کیا تھا کہ اگر بھی شادی کی تو کسی پاکستانی مرد سے کروں گی، کسی مسلمان سے۔ میں نے محسوس کیا تھا ایقان! کہ عاشر میں جتنی بھی خوبیاں تھیں جو کہ مجھے اٹریکٹ کرتی تھیں، وہ اس کے مذہب نے عطا کی تھیں۔ تمہارا مذہب بہت عمدہ ہے ایقان! میں۔ میں پچھلے چند ماہ سے یہاں پاکستان میں ہوں۔ منیر کی جاب امریکہ میں ہے۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے سلسلے میں جاپان آئے تھے جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تب سے ہم چھٹیاں لے کر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہاں آکر میں نے تمہاری مشرقی روایات کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ میں اس کے علاوہ دوسروں میں اسلام قبول کر لوں۔ میرا دل۔ میرا دل مسلمان ہو چکا ہے۔ لیکن افرار کی دیر ہے اور میں لڑا سے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔
ایقان اس کی بات مکمل ہونے کے خیال سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”لڑا سے۔ ایقان بن جاؤں گی۔“ اس نے مسکرا کر اور قدرے جھینپ کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔
”میں نے اپنا اسلامی نام یہی سوچا ہے۔“

دو دنوں کے اندر اس کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر لڑا نے اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔
”عاشر! کیا ہے؟ کیا اب وہ پاکستان میں ہے؟“

ایقان نے کھولی کھولی نگاہوں سے اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

”میں نے اسے پروپوز کیا تو اس نے انکار کیا جس سے میرے دل کو بہت ٹھنسی ہو گئی۔“ لڑا نے گلی۔ ”میں نے غصے میں اسے نجانے کیا کیا کہہ دیا، وہ ناراض ہو گیا پھر اس کے بعد کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے جاپان جا کر اپنی جاب تبدیل کر لی۔ ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ میں نے اسے کبھی بارودستی کا پیغام بھیجا لیکن اس نے جواب نہیں دیا پھر نجانے وقت کی دھند میں وہ کہاں گم ہو گیا۔“

لڑا کی نگاہیں بھوری بن کر پہاڑیوں پر چمکتی دھوپ دیکھنے لگیں۔
”ایک۔۔۔ بات پوچھوں لڑا۔؟“ ایقان نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ضرور، مجھے خوشی ہوگی۔ یوں بھی میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔“
”تمہارے اور عاشر کے مابین کس قسم کے تعلقات رہے تھے؟“

لڑا کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ایقان کو دیکھتی رہی۔

”میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا ایقان! کہ مجھے تمہارے شوہر کی جس خوبی نے اٹریکٹ کیا، وہ اسے تمہارے مذہب نے دی۔ وہ یہی خوبی تھی، یہی بات جو تم مجھ سے جانا چاہتی ہو۔ میں اس کے پاس جاتی تھی اسے اپنی قوت کی آنکھ سے پکھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے جلووں کی بھرپور واداس کی بے بسی اور بے چارگی سے وصول کرنا چاہتی تھی لیکن ایقان! انجانے یہ تمہاری محبت تھی یا اس کا ایمان۔۔۔ وہ پکھلتے پکھلتے بھی سنبھل جاتا تھا جیسے۔ جیسے اس کے اندر بیٹھا کوئی فرشتہ عین وقت پر اس کے منہ پر طمانچہ پہنچتا رہتا۔ وہ نہ تو کسی چوٹ لگاتا تو کسی ہڑبڑاتا تھا۔“

اس کی مدد بوشی اچانک ہی بوش مندی میں بدل جایا کرتی تھی۔ وہ بے بس ہوتے ہوتے پھر سے توانائی حاصل کر لیتا تھا۔ تمہاری محبت سے یا اپنے ایمان سے۔ یہ دونوں باتیں اخلاقی ہیں اور یہ اخلاقیات تمہارا مذہب مکمل کرتا ہے۔“ اس نے غمگینی مائل بھری۔

”اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ جب بھی شادی کی۔۔۔ کسی مسلمان مرد سے کروں گی اور اگر وہ پاکستانی بھی ہو تو کیا کہنے۔ خدا نے میری بدناموں آرزو میں پوری کر دیں۔“ وہ مسکرائی۔

ایقان کو اس کی سکر ایٹ جھوٹ کی چٹائی کی سیب سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایقان کو خود ایک وقت رشک بھی آیا اور خوشے لغت بھی محسوس ہوئی۔

”تم نے مجھے کیسے پہچانا تھا؟“ اب وہ قدرے دلہنستان سے انداز میں ہوئی۔

”عاشق اپنے والد میں تمہاری اور اپنے بچوں کی تصویر رکھتا تھا۔ بہت صاف گوئی سے بتا دوں کہ تمہارے بچے مجھے بالکل یاد نہیں لیکن تمہارا نقش میرے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ ویسے کیا اب میں جو بچہ کہتی ہوں کہ عاشق کلاس ہے؟“

”عاشقِ شہر“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں پاکستان میں ہیں۔“

”بجھے اور بچو! کوئی کر رہا ہے۔“

”اے یہاں کیوں نہیں لائیں؟“

”اے ماہ لے کر آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔

سیدہ کبیرہ کے والد کے نام سے

سوٹ کیس کو لاک کر کے اس نے سر اٹھایا۔ شمالاً اس کے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دیکھ اور بے اعتبار اسے تجسم شمع جزیرہ پر کر کے اٹھ گیا۔

”ایقان! پچھو اب تک نہیں آئیں۔“

دُرُایُور بھی صبح سے گاڑی لے کر آیا ہوا ہے، وہ تمارا منتظر ہے۔" "اب میں نکلتا جاؤیے۔" پتی؟

”میں لیا رستہ کی ہوں۔“ وہ شاکی سے انداز میں بولی۔ ”میں اور میرا ہینڈ بیگ تیار ہے۔“

ہاشم نے غور سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”پچھیں؟“ وہ شادمان سی ہوئی۔
 باشمخہ کرنا شروع کرے گی۔

آتی تھی۔

”آپسے تیار ہیں۔“

ہاں کیسے پاس... سیر ایک سی تیار ہے۔ وہ سزا دی۔ ”لیوں بھی تھلا! مختصر مانی مہون کیسا کزرا۔ دیکھو“
میں نے تم لوگوں کو بالکل بھی ڈسٹ نہ کیا۔ گوارہ نہ کیا۔ یہ کہہ سکتے ہیں۔ نہ جگہ نہ جگہ۔

کباب میں ہڈی اتری رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

ہاشم نے بے اختیار شملہ کا اور شملہ نے بے اختیار ہاشم کو دیکھا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت کے سمندر تھے۔

”میں اپنا بیگ لے کر اُس پر چڑھ چلتے ہیں۔ میرا انتظار کرنا۔“ وہ ان کی جبرائی سے دفعہ گھر سران کی بولی مگر۔
 ”یہ تو بالکل تبدیل ہو گئیں؟“ ایشم کے بنانہ روہ کا۔ ”رفع ٹھیک کرنا تھا۔“ شلالے کے جواب نہ دیا۔ اس کا
 دھڑکن ایقان کے جملے میں اُٹھیا ہوا تھا۔ ”جیسی میون کی گڑا؟“ ہوموٹ کا منہ ہوئے وہ اپنے مختصر سے ”جیسی مون“ کے
 متعلق، رسونے لگی تھی جس میں ایشم نے مرانے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

”تم چاہتے ہو، عمار! کہ مرستہ وقت سنبھالے مجھے؟ یہی سکون میسر نہ ہو؟“

عمار نے چونک کر مائل کی جانب دیکھا۔ وہ گلو گیر کیرے میں اپنی بات کہہ کر اب شاکی نظموں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہی ہے۔“ ورد کے بڑا اچھا پیہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟“

”میں نے یہاں اسپتال میں بیٹھ کر اس بات پر غور کیا کہ مجھ کو جیسا کہ میں نے کہا ہے، میں اپنے
میں اپنے ہر بہت سبکوں سے جان دے چکا ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے عباد! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں
تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔“ انہوں نے اپنے بچے کو دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”آسمان کی آنکھوں سے رواں تھے
عباد، تم ہی سے ان کے قریب گیا اور انہیں سننے لگا گیا۔“

وہ تو بال بال ہمارے لئے تھے۔ جسے ہم نے اپنے لئے لیا۔

انہوں نے کبھی کہ بات کو اپنے اہل غار کے ہونے پر راتھا۔ ہر تکلیف وہ خاموشی سے اندر ہی اندر اسی لیے سہتی

آئی تھیں کہ اسیں باسپنڈ اور ان کمروں سے بچنا خوف محسوس ہوتا تھا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتی عباد اہم اپنی بیوی بچوں کو آخری غول میں خوش اور
 سے لے جاؤ۔“

”تمک ہے۔“ وہ جھنجھکی سے بولا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔“

عزیز! یہ بتاؤ کہ لڑائی کب کر رہے تھے؟

”مشملا نہیں آئی۔“ یہاں اس سے بولیں۔

”آپ کی فلاسٹ ایک ٹھنڈے بعد ایئر پورٹ پہ اترے گی۔“ ربیعہ نے لکھڑی دیکھی۔

”نہیں۔ لیکن ہاشم بھائی کو عمان بھائی نے بتا دیا تھا۔ وہ شہلا آپی کو آپ سے ملوانے لے آئیں گے۔“

”میں شہلا سے گھر پر ماؤں کی۔“ وہ بے غصہ ہو گئی۔ ”عباس سے کہو، بس ابھی پچھنی لے لے کر مجھے لے کر چلے۔“

ربیعہ حامیوں کی ہورہی۔ اب ان کی صفوں سے ابھرتا سخن نہ رہا تھا۔

(این شا، الله آخری قسط آئندہ ماہ)

ترانا، ربیعہ کو دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب دوڑی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مل گئیں۔

صبر سے بیٹھا ہوا عبدالباری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
”اگر تمہیں اچھی طرح سے جانتی نہ ہوتی تو کسی شخص کے تمہا سے ساتھ مجھے بھی بھلا چکی ہو اور اب تمہیں مجھ سے ملنے میں کوئی دیر نہیں ہے لیکن۔“ ترانا کا دیکھ کر میرے میں بات اور عورتی چمکڑ کر رہی۔
”لیکن میں اپنی ربیعہ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اس لیے مجھ بھر کے لیے بھی میرے دل میں کوئی شک کوئی دوسرا سوچا نہ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ تم کسی مجبوری کے تحت ہی میرے گھر نہ آ سکی ہو اور یہاں پر کچھ خیال ٹھیک ثابت ہو گیا۔“ انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔
”آئی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

ربیعہ نے تم آنکھوں سے ترانا کا پر خلوں سے چہرہ دیکھا۔
”ہم انہیں گھر لے آئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے وہ اب ٹھیک ہیں؟“ ترانا مطمئن ہوئی۔

”اکثر جواب دے چکے ہیں۔“ وہ خوب کمال ضبط کر کے بولی۔ ”دل کی قلی کے لیے تھوڑی دیر میں چل رہا تھا لیکن ای سے ضد کی کہ وہ ہسپتال میں مزید ایک گھنٹہ بھی نہیں رکیں گی۔“ مجبوراً۔

”وہ۔“ اس کے بازوؤں پر ترانا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

”بہت افسوس، وہ اب سب کچھ جان کر۔“ عبدالباری بولا۔

”آپ کیسے ہیں باری بھائی۔“ ربیعہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”دیکھ کی شدت سے دماغ ٹاؤٹ ہو رہا ہے۔ آپ سے سلام دعا تک نہ کی۔“

”اٹس اوکے ربیعہ! وہ نرمی سے مسکرایا۔ ”میں تمہاری طبیعت کو سمجھ رہا ہوں۔“

”آپ لوگ بیٹھیں نا۔“

”میں پہلے آئی کو دیکھنا چاہوں گی۔“ ترانا بولی۔ ”ہاتھ تو پیچھے بھی کی جاسکتی ہیں ان کی عمارت ضروری ہے۔“

”او آئی کے کمرے میں چلے ہیں۔“ ربیعہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں منہ بیک کے پاس لے آئی۔ ”وہاں کے ذرا خیر غم غم نہیں۔“ انہیں دیکھ کر قدرے ہشاش بشاشی ان کی نگاہوں کو خوش کرنے لگیں۔

”کیسی ہوئی!“ ربیعہ کے تعارف کروانے پر وہ خوش ہو کر بولی تھیں۔

”جی میں ٹھیک ہوں، آپ۔“

”اللہ کا احسان ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولیں۔

”ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو ہمیں دیکھا ہو۔“ ترانا نے جیسے جاننے پر زور دیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ”میں ربیعہ کی وہی بہن ہوں جو ایک مرتبہ بازار میں اسے ملی تھیں۔“

”جی ہاں لیکن تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ شاپ کے اندر تھیں۔ ربیعہ اور میں شاپ سے باہر تھے۔“

”مجھے ربیعہ نے بتایا تھا کہ اسے تم سے ملنے جانا ہے لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے میں نے تم کو ہم چاہتے ہوئے بھی اسے تمہارے پاس نہ بھیج سکا۔“

”جی میں جانتی ہوں۔ میرے یہاں تک پہنچنے میں سارا کمال باری کا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کے بعد کسی طرح حجاب بھائی کا ٹیلی نمبر اور پھر ایڈریس حاصل کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ربیعہ کے ساتھ کوئی پرانہ پیار ہوگا۔“

ترانا اور منیہ بہت کھل کھل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ربیعہ جانے جانے کے خیال سے بچن میں جلی جاتی رہی۔

اسے حیرانی ہوئی تھی۔

انھوں نے جانے تیار کر لی تھی اور اب ڈال میں چڑھ کر رہی تھی۔

”تم کیوں جلی آئیں ربیعہ!“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں جانے لاری ہوں نا۔“

”جیت آئیں۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”میں گھر رہی ہو؟“ جلی مسکرائی۔

”ہنر انہیں۔ تمہاری حرکت پر پیار آ رہا ہے۔ میں وہاں کے لیے ہسپتال گئی اور تمہارے سب کچھ دیکھ لیا۔“

”تمہارے جانے سے اس احساس ہو گیا کہ تم اس گھر کے لیے اللہ کا کتابدار انعام ہو۔ تم کس طرح سارے کام آسانی سے سرانجام دے لیتی ہو ربیعہ؟“

معصومیت سے بوجھتی ہوئی انھیں ربیعہ کو بہت اچھی لگی۔

”جیسے تمہاری اپنی جلدی!“ اپنی آسانی سے یہ سب کچھ تیار کر لیا ہے۔“ اس نے ڈال پر نظر ڈالی۔

”جلی جلدی کوڑی لاتی ہے۔ اپنی خاطر داری تو اس کا حق ہے۔“ انھیں ڈال دھکیلتے ہوئے بولی تھی۔ ربیعہ اس کے ساتھ چل دی۔



”آپ لوگوں کا بہت احسان ہے آئی، ربیعہ کو اپنے گھر کی منہ پوڑ اور محفوظ چھواؤں دے کر آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے اس کا بدلہ تو صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔“ ترانا کہہ رہی تھی۔ ربیعہ کے قدم دروازے پر کھ بھر کے لیے رکے پھر اندر داخل ہو گئی۔

”ایک لمحے سے۔“ ترانا اپنی اس طرح چھائی رہی تھی۔ ہر چند کہ اس میں چھپانے والی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ اکثر جو چاہتا تھا اپنی نگاہوں نے اور عمارت کے کونوں سے حقیقت چھپا کر اچھا نہ کیا تھا۔ وہ سب کے سب اسے کشادہ دل لوگ تھے کہ بہت جلد جانے ہوئے بھی اپنے گھر میں خندہ پیچشالی سے جگہ دیتے۔ منیہ بیکم نے ترانا کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔

انھیں سب کو لوازمات کے ساتھ جانے پڑا۔ جلی تھی گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

جانے لی کر عبدالباری نے سب کے رخصت چاہی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے تحت جا رہا تھا۔ البتہ ترانا کا ارادہ رات گئے تک ان کو روک دینے کا تھا۔

خیر اللہ ان کو اپنے گھر کے بعد عمارت بھی کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیہ بیکم کیس ترانا اور ربیعہ ہی بیٹھی رہ گئیں۔

”اوم!“ چاکلی ہی ترانا کو کچھ یاد آیا تھا۔ ”میرا ایک بیک ڈرائنگ روم میں رکھا ہے ربیعہ! اس میں تمہاری کچھ باتیں ہیں، میں آج ہی اس خیال سے وہ ساتھ لے آئی کہ وہ سب کچھ جس پر صرف تمہارا حق ہے، تمہیں سونپ دیا جائے۔ یہ زندگی تو قدم قدم پر ہمیں جد کر رہی ہے جانے کھل کھل ہم دونوں بچکر کماں ہوں۔“

ربیعہ نے قدرے جراتی سے ترانا کو دیکھا۔

”بھول گئیں؟“ ترانا مسکرائی۔ ”جب تم لاہور آئی تھیں تب تم نے اپنا کچھ سامان میرے پاس امانت رکھ دیا تھا۔“

نہایت حجاب بھائی کے ساتھ جانے کے لیے جب تم گھر سے نکلیں تو بگلت میں سب ہی کچھ میرے پاس بھول گئیں۔

اب ذرا ڈرائنگ روم سے وہ بیک اٹھا کر لے آؤ، میں آئی کے سامنے تمہارا سامان تمہارے حوالے کر دوں۔“

ترانا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

اس بات پر تردد ہی ہو کر اٹھی۔ معینہ دیکھ کر طبیعت کے جیش نظر ہو انہیں کوئی مینشن دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس وجہ کی منتہی بھی تھی کہ انہیں اپنے متعلق ہر بات سے آگاہ کر دے۔ معینہ وہ سب سے اس کا جو دلی رشتہ استوار ہو چکا تھا وہ متقاضی تھا کہ رجبہ اپنے اور ان کے مابین پڑا ہو رہا تھا۔

جھوٹا سا بیگ اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ معینہ وہ ٹیکم کے پلنگ اور ترانہ کی کرسی کے بیچ چڑی ٹیبل پر اس نے بیگ رکھا۔

”تم خود ہی کھولا اسے اور اپنی چیزیں چیک کرلو۔“ ترانا بے حد اطمینان سے بٹنی ہوئی تھی۔ رجبہ نے بیگ کھول کر اس میں سے سلمان کا ٹافٹا شروع کیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ خود بھی ساکت رہی تھی۔

ایک سرخ جوڑا تھا، سونے کے تاروں کے کام سے مزین۔ کام پر ایک تک کلا نہ پڑا تھا، البتہ چمک چمک ضروور پر مارتی تھی۔ ایک جھوٹا سا پاس تھا۔ رجبہ اسے کھولنے پر ناچی جاتی تھی کہ اس پاس میں کیا ہے پھر بھی اس نے وہ پاس کھولا۔ اس میں طلائی زیورات تھے لیکن کے کام کا بھاری ٹکڑا اور جھمکے دو خوبصورت نگین۔

رجبہ ساکت ان چیزوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی پیکل پر موتی چمکے لگے تھے۔ اسے غائب کیا کچھ یاد آیا تھا۔ اپنی وادی امان، ان کے چھوٹے چھوٹے معدنوں جن میں سے ایک بر تالا گا رہتا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گھر جس کے چترن میں بارگشتہ کار خود اپنی ایک مکہ پھیلانے رکھا تھا۔ اپنا محلہ، محلے کے محلہ اس لوگ اپنی سہیلیاں اپنا کالج اپنا بچپن، اپنی معصومیت۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چکے تھے جسے دیکھ کے دانے ایک کے بعد ایک گرتے ہوں۔

دفعہاً وہ برسی طرح سے چونکی تھی۔ اس نے معینہ کو ان چیزوں کے پاس کھرا دکھا، وہ دونوں کی طرح انہیں اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ کسی دیوانے کا چہرہ عروس ہو تھا، ان کے انداز میں حد درجہ وحشت تھی۔

”یہ یہ سب کچھ یہ سب کچھ۔“

”یہ سب کچھ رجبہ کا ہے آئی! ترانا بھی قدر سے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔“ وہ چلا گیا۔ ”یہ سب کچھ میرا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔“

پھر وہ دونوں کی طرح رجبہ کی جانب دیکھیں۔

”یہ بھی میری سب۔“ وہ رجبہ کو خود سے بچھ کر چلا گیا۔ ”یہ بھی میری ہے۔ یہ میری ہے۔ یہ میری ہے۔“

”آئی۔ آئی۔ آئی۔ میری بیٹی۔“

عباد اور رفیقہ گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”آئی۔ آئی۔“ عباد ان کی جانب بڑھا۔

تب تک وہ رجبہ کے بازوؤں میں بھول چکی تھیں۔



میرا نام موہنا تھا، موہنا جو فساد میں ایک کرکین فیملی کا حصہ تھی۔ مجھے اپنا بچپن کچھ کچھ یاد ہے۔ میری ماں ایک مڈوائف تھی، باپ ایک شرابی۔ میری ماں جو کچھ کما تی تھی میرے باپ کے لشکے کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ اپنا پیار دیتی تھی، میرے باپ کا کہہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر چلا گیا۔ اسے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل نظر نہ تھا۔ اس لیے اسے میرے مستقبل کی فکر نہ تھی۔ اس نے مجھے ترنگ اسکول میں داخلہ دلایا، خود زندگی کی گاڑی کو اپنا پورا اور گاڑ کر سمجھتی رہی۔ میں ترنگ میں لی اور مجھے ایک جیڑی اسپتال میں نوکری مل گئی۔

میرے دن ہی میری ماں اس اسپتال کے ایک سبزی گری خند ہو گئی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے میرے اوپر اس نے کھانا ڈرا۔ لیکن میرے باپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کے لیے کمانے والے دو تازہ مہینہ میدان عمل اتر چکے تھے۔ زندگی یوں ہی بے بسی سے گزر رہی تھی، تب ایک روز کچھ زخموں کو ہسپتال لایا گیا۔ وہ لوگ کسی نرگزار دستے سے گزر رہے تھے کہ ان کی بس کمرے کھڑ میں جا کر رکھی تھی۔ ان ہی بیچ جانے والے زخموں میں ایک احمد جہانزیب تھا، ایک خوب جوان جو اپنے آپ کی شہرے بہت دور کسی ایمر پور جیکٹ پر کام کرنے ہمارے نے میں کیا ہوا تھا، اس کی بس کے ساتھ کچھ پیش آگیا اور یوں وہ ہسپتال لایا گیا۔ شاید قسمت نے جنہیں جدا بہو اور جنہیں ملانا ہو گا، اس کے لیے ہی حالات نے تشکیل پاتے ہیں۔

میں جب کہ ہسپتال میں اپنی دینی سرانجام دے رہی تھی احمد جہانزیب کو بھیجا۔ مجھے اسے میری کیا بات ہوئی۔ میرے نقش بہت خوبصورت تھے لیکن رانگ سانولا تھا، جبکہ وہ گورا چٹا، یونانی دیتو کا سا حسن نئے والا ایک خاندانی آدمی تھا۔ وہ بڑھیا، ہڈیاں سستلا، نرہ اور اس بڑھیا ہڈیوں نے انہیں ہی نظروں میں دیکھے تھے۔ وہ بڑھیا، وہ بڑھیا، جس روز اسے چھٹی ملی اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ مجھے کھلا کیا چاہیے

اس نے اپنے باپ کو کھنکھناتی ہی اطلاع دی کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور ایک مسلمان فوجوان سے اپنی کر رہی ہوں۔ اس دن میرا باپ بہت ڈھنگ سے گرتا رہا۔ مجھے میری مری ہوئی ماں کے واسطے دیے لیکن احمد جہانزیب کی محبت ایک متقاضی تھی اور میرا وجود ایک بے بسی کے لیے اسے کھلا دیا۔

اپنے اپنے باپ کی ایک نہ سنی۔ احمد جہانزیب اور میرا بے شادی کر لی۔ میری ماں نے میرے لیے شادی کا جوڑا جو کچھ ہوا تھا، مفید نہیں وار فراک۔ میں نے اپنی شادی کے دن دبی جو پہنا۔ ہماری شادی مسجد میں ہوئی، لیکن اس کے لیے میں نے اسلام کوئی پھر ہمارا رنگ بولنا۔ جوزف فرنانڈس مسجد کے باہر بیٹھا اور نامہ اور مجھے اور احمد جہانزیب کو کھڑا کر دینا، اب میں سوچتی ہوں کہ شاید اس دن میرے باپ کی کسی بدعوائے میرا فب شروع کیا تھا اور۔ اور تاہم میرے تعاقب میں وہ آئی۔ تاہم۔ میرے اور میری خوشیوں کی راہ میں حائل تھی۔

خیر میں بتا رہی تھی کہ موہنا جو فساد میں احمد بن کرش دیتی طور پر بہت خوش تھی۔ احمد جہانزیب میرے ہونے سے شہرے بھی دور دراز ایک گاؤں میں علاقے میں ایک پر جیکٹ پر کام کرنے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنے باپ کے لیے جو کچھ بھی چاہا شادی کے بعد بتایا۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں اس کے خونی رشتوں میں نہ اس کی ماں اور اس کی ایک بہن ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور ماں اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب سے ان کا شہر دور دراز کے علاقے میں ہوا، ماں اکیلی ہو گئی۔ اسے اکیلا بننا لگنے لگتا، تب اپنی بیٹی بلیٹس کے اصرار پر انہیں ماں بیٹی مل کر احمد جہانزیب کی منتہی بلیٹس ہانکی منہ بند ٹیکم سے کر دی۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ایک متغی شدہ شخص ہے، ورنہ شاید میرا فیصلہ فساد ہو گا۔ احمد جہانزیب نے نوکری سے چھٹی لے لی۔ وہ مجھے اپنے شہر لے آیا، جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ انہیں اس کی بہن بھی اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں احمد جہانزیب کے لیے سخت پریشان تھیں کیونکہ عوامان علاقے اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہے۔ میں احمد جہانزیب سے پیچھے کھڑی تھی۔ بلیٹس ہانوا اور ان سے دونوں احمد سے پٹ کر رو رہی تھیں، اسے پیار کر رہی تھیں، لیکن اسے صدمے سے واری ہو رہی تھیں۔ تب چاکا نکا ان دونوں کی نظر بھر پڑی۔

”تمہیں میں آج تک اپنے آپ میں ان نظروں سے خوف زدہ رہتی ہوں، وہ نظرس۔ وہ تمہارا تھیں، وہ آری

میں ایک نو مسلم تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں اس طرح ایک غیر مسلم کے ساتھ بلا ضرورت سفر نہیں کر سکتی۔ وہ بھی کئی دن کا سفر لیکن مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے کسی نے نہیں روکا۔ اگر احقر نے بھی نہیں۔ میں باپ کے پاس پہنچی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مجھے حلاف کے بہانہ سے دور جاکر تھا۔ وہ دفعتاً جا چکا تھا۔ میں اس کی قبر دو آٹسو ہزار روپے کے لیے گھر پہنچی تو ایک حیرت انگیز ریل کو دھکا دے والا انکشاف میرا سامنے تھا۔

ابو جحیفہؓ جو فوراً میرے پاس آگیا ایک غمر مہر دت کے لیے مجھے کچھ بھیجے تاکہ میرا راجھ سے ملے بغیر وہ کیسے کر سکتا تھا؟۔ چ سوچ کر میں پاگل ہو گئی لیکن کوئی مرا میرے ہاتھ نہ آیا۔ آخر وہ اچانک تو نہیں گیا تھا۔ نے کوئی ایسا نیک کیا ہو۔ میں ایسا کیا کہ وہ کوئی طے شدہ پروگرام ہو گا جس پر عمل درآمد کیا گیا تھا لیکن میری توقع کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ بتائیں بالوتو میری صورت کے فطرت کرتی ہیں۔ اماں کی بے نیازی بھی عروج پر تھی۔ میں نے تو دلہن میں رہی تھی نہ عروسی میں۔ مارے بانو سے لو کہیں رہ جاتی تھی وہاں ہی پر پورے کا نام کر لیں تھی پھر کسی کوئی مجھے خوش نہ تھا۔ مجھے کسی کی خوشی سے غرض نہ تھی سوائے احمد جہانزیب کے اس طالع نے تو مجھے اپنا کوئی فون نمبر کوئی آگاہ کیا نہ کیا نہ جانتا جس پر میں اس سے رابطہ نہ کرتی۔

پھر میرے اندر خوشی کا ایک کوئل پھیل گیا۔ آخر چھانسیب سے جانگھسل جلدائی کا ایک گواں روز تھا۔ میں نے شک ساہو نے پراس کی تصدیق چاہی۔ ہسپتال میں دورانِ بولی کی جگھے یہ خوش خبری ملی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ خبر زمین پر نہایت تھکے میں خوشی سے گھوم رہی تھی۔ میں احمد کو خوشخبری سنانا چاہتی تھی

میں نے کھینچ کر اٹال کو تپا یا۔ ان کا رنگ ہلکی سی طرح زرد ہو گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے
 ان کی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر کچھ یاقوت ہمارا لگا ان کے پیروں میں جبکہ میں لیکن ان کا ایک
 جواب تھا۔ انہیں بھی میری طرح کچھ علم تھا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان کا حصر سے فون پر رابطہ ہے۔ اکثر
 سے بڑے انہیں بلانے کا انتظام احمد علی سرحد انہیں فون کرتا تھا۔

تھے، انہم کے دوست بڑے چمکے اور افسوس زیادہ ہوتا تھا۔ اس نے جیسے میری زندگی کے ساتھ ایک بے رحم کھیل چھوڑ دیا، جیسے مجھے ایک دلدل سے نکال کر ایک صحرا میں لا کر ڈھک دیا تھا۔ میں نے خود کو تقدیر کے آگے ہل دیا۔ حالات سے سمجھو کہ میں بالکل خاموش ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔ اس گھر میں شہنائی اور اداں اور بلیں باؤ کاویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ دونوں میرے آگے پیچھے بھرنے لگیں۔ مجھ سے اپنے ساتھ لے کر کے گئے۔ میں نے سمجھا کہ تقدیر نے میری حق ہوئی، آزمائش ختم ہو گئی۔ اب میں جیتی تھی، آگے کیا خبر تھی کہ یہاں سے ایک نیا امتحان یعنی آزمائش کا آغاز ہوا۔

لالہ اور بیٹیس باپ مجھے، ہلا چیسلا کر ایک دور افتاد علاقے میں ہے ہسپتال میں لے گئیں جہاں ان کے بقول لکڑی کی دوائیں بنائی جاتی تھیں کہ احمک کچھ بھی اسی ہسپتال میں جنم لے نجانے کیوں مجھے ان کی بات نہ نہ تھام میرے دل میں ایک کھکھاسا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے اور مجھ پر انہوں نے ہو کر ہی۔ درود

سوئی کر رہی ہوں۔
 ”یہ کون ہے؟“ اماں نے اسی تیش زدہ لہجے میں پوچھا۔
 ”میری سہیلی“ وہ مسکرایا۔ ”میری بھئی۔“ متینہ دھامیل نے اپنے خطوط میں اسی کا ذکر کیا تھا۔ ”رفعتا“ بلقیس بانو نے اپنا سر ہٹا کر دین کرنا شروع کر دیا۔
 اسی طرح احمد کی اماں نے بھی میرا استقبال اسی انداز میں کیا۔ وہ دونوں اس طرح دروہی تھیں جیسے جیسے کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ میں ان کے انداز سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھی۔

احمد نے بہت مشکلوں سے انہیں خاموش کر لیا ان کی منت بہانہ کی ان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے کہ بھڑکے۔ اماں اندر سے تو راضی نہیں تھیں لیکن احمد کی منت حاجت سے خاموش ضرور ہو گئیں۔ تاہم باقیس باقو خاموش رہی نہ ہو سکی۔ وہ چیخ کر کہنے پر ابھلا اٹھی رہیں۔ میرے پچھلے دہک کو یہ میرا باقیس باقو مولیٰ جرم کر لیا۔ رہی نہیں ان کے لیے میں جیسے ایک تجس 'پاپا' کے جسے وہ کسی طور قبول نہ کر سکتی تھیں۔

”تنتا بھجیا تھا اماں! کتنا بھجیا تھا میں نے آپ کو لیکن آپ کو اپنے بچے پر بہت مان تھی میرے بھروسے تھا۔“ وہ جاتے جاتے اماں سے پولیس ”کو کھلیں میری زندگی برباد کر ڈالی آپ کے بیٹے نے آپ کیا بھجیا۔“ میں ناگوار منور مجھے معاف کر دیں گے؟ کبھی نہیں منور میری زندگی برباد کر دیا ہے گا میرے لیے۔“

وہ آسویو پچیس باہری جانب برہیس پتھر کے پیرے میں سے قریب رکیں۔
 ”کلوئی۔ کیا پڑھ کر پھونکاؤ نے میرے ہاتھوں پر چاؤ کر لیا۔ میں بڑا دکھ کر کے تُو بھی خوش نہ
 رہے گی۔“

یہ دوسرے شخص کی بددعا تھی میرے لیے۔۔۔ سپریم کورٹ جج اور چیف جسٹس میرے دل کو اٹھانے لگے اور
سوسوں کی آندھی نے گھیر لیا۔

زندگی بہ طور شرمیخ ہوئی۔ جہانزیب کو نوکری سے اجلاخ کر دیا گیا۔ ڈپارٹمنٹ اتنی چھٹیاں برداشت نہ کیا۔
 گھر میں مشکلات کا آغاز ہو گیا اور جہانزیب کا کتناچ فکرت ہو گیا۔ یقیناً بالوں کو ہمارے جسم کی سزا دینا
 شروع کر دی۔ مینا نے وہ کراہ کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تاہم اسے چھٹیاں دیا گیا میرے لیے ایک حیرت انگیز
 شاف تھا کہ میرا احمد جہانزیب کو دلوانا ایک حد تک جا چکی تھی۔

کچھ دن اور نہیں گئے تھے احمد جنازہ سب سے نوکری کی اجازت مانگی۔ اس نے قدرے تردد کے ساتھ میری بات مان۔ میں نے ایک متناہی اسپتال میں نوکری کر لی۔ وہاں میری ملاقات رابرٹ سے ہوئی۔ رابرٹ میری رشتے کی ایک خالہ کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس کا میری آنجنابی ماں سے کوئی تعلق بننا تھا۔ مجھے رابرٹ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، لیکن جلد ہی یہ خوشی ایک ناقابل بیان الجھن میں بدل گئی۔ رابرٹ میرے گھر آنے لگے۔ میں اس بات میں چاہتی تھی لیکن میں اسے منع بھی نہ کر پائی۔ شاید میری اسی خاموشی سے میری بد قسمتی کا ناز ہو۔ مجھے گھبرانہ ہوا یا کہ احمد جنازہ سب کے دل میں کس وقت میری جانب سے بدل گئی تھی۔ اس نے مجھے نہ کہا، نہ کچھ نہ چھپا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی نہ بدلا۔ وہ میرا تھا تو اسی رہا۔

وہ رابرٹ پچھ دوں کے لیے میرے آبائی شہر گیا وہاں سے واپسی پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کی حالت کے لیے کبھی بدتر ہے۔ وہ شہر سے دور ایک جھونپڑے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں صرف اس امید پر قفا ہے وہ کہ کہ میں ایک مرتبہ اس سے مل جاؤں۔

سے پہلے ایسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر دیا گیا اور جب سے جب مجھے ہوش آیا۔ آہ میری کوکھ خالی تھی میرے ہاتھ خالی تھے میرا دل خالی تھا۔ آپریشن کے ذریعے ڈیویری عمل میں لائی جا چکی تھی وہاں میرے پاس کوئی نہ تھا نہ اماں نہ بہنیں باؤنڈ میرا بچہ۔

میں بہت روٹی پٹی بہت شور مچایا لیکن سب کے منہ پیسے دے کر بند کر دیا جیسے کہ پورا علمہ بیک زبان کر رہا تھا کہ مرہ بچہ پیدا ہوا تھا جسے دفنانا کراس کی وادی اور پھونکی وہاں سے چل کر گئی تھیں۔ جانے سے قبل وہ ایک لٹافہ بھی میرے لیے دے گئی تھیں۔ میں نے لٹافہ چاک کیا اور مجھے علم ہوا کہ معیت کبھی آپلی نہیں آئی۔ اس میں احمد جانیب کا ذکر کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟ کس جرم کی سزا؟ میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ طلاق نامے پر لکھی تاریخ آٹھ ماہ اپنی تھی۔ گویا آٹھ ماہ قبل اس نے مجھے طلاق سمجھوا دی تھی جسے مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ یہ ایک مصلحت تھی جسے میرے لیے چھپوا دیا گیا تھا۔ میں دن رات روٹی اور اسے لکھانے کی کوشش کرتی۔ ہسپتال کے کمرے میں رہنے والی اپنی بیوی میں میرے سارے کپڑے اور میرا سب سا زود سامان موجود تھا۔ گویا وہ مجھے بیشک کے خلیے خدا حافظ کئے کے لیے وہاں لائی تھیں۔

آپریشن کے پانچوس دن ماضی ہو کر گیا۔ ہسپتال کے ایجنٹوں کی ادا دہائی کی جا چکی تھی۔ میرے مری دم بھی مجھے اپنی کیس میں مل گئی تھی لیکن مجھے اپنا بچہ چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے جسے پورے نو ماہ میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پیچھ کر محسوس کیا تھا۔ جن کی کوئی انگریزوں کو اپنے اندر سمیٹے رکھا تھا جس کے ساتھ پھروں پھوٹی پھوٹی باتیں کی تھیں۔ اس کے باپ کی جانوں کی ساری شکایتیں میں اسی سے کیا کرتی تھی۔ اس بچے کو میں نے ایک نظر تک نہ دیکھا۔ میں نے اس کی لڑائی لڑائیوں کو جھانک کر دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ تک نہ دیا۔ میں نے اس کے نرم وجود کی خوبصورتی کو اس کے کسی کی گری کو اپنی مدوح میں اترنا محسوس نہ کیا۔ مجھ سے زیادہ کئی داماں مجھ سے زیادہ اجاڑا اور دوڑان پوری دنیا میں کوئی نہ تھا۔ روٹی، مکی، کسکتی میں اپنا زخمی وجود لے کر ایک لاسٹر کے کمرے کے صرف اپنا بچہ واپس لینے کے لیے گھر پہنچی مجھ پر اکتشاف ہوا کہ کلین وہ گھر چڑھ کر جا چکے ہیں۔ میں پوری دنیا میں اکتلی ہو گئی۔

بہر طور سانس کی ڈور بند ہی رہے بوندہ بوندہ صیحت بن کر ہر مشکل سہیل جانا دیکھ۔ میں ہسپتال چلی آئی۔ ایک گھری جاہد خاموشی کے ساتھ میں نے زندگی کا نیا شروع کی۔ احمد جہانزیب کو تو تھا مجھے محسوس ہو گئی کہ میں بے بیش ویش کے لیے بھول گئی لیکن ایک نئے وجود کے پلٹنے کی آواز نے مجھے میں خود بخود اپنی تھی۔ پورا دن بڑھا، ماہ میری تھیں میرے سینے پر چھٹی رہی اور میرے آنسوؤں سے میرا دم تر ہو آ رہا میرا آچکل گلیا ہی رہتا تھا۔ میرے دل کا خون مجھ سے جھک کر کالوسہ دودھ بن کر چھائی سے بہتا تھا۔ آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا تھا اور۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اماں اور بہنیں کو بیکش یا سارے بے مدد واتی تھی جس میں کراچی چلی آئی۔

میں ایک جنگمہ خیز زندگی کا حصہ بن کر اس روئے کی آواز کو فراموش کرنا چاہتی تھی جو میری راتوں کی بے خوابی کا سبب تھی۔ کراچی میں خوش قسمتی سے ایک ایسے ہسپتال میں مجھے نوکری مل گئی۔ وہاں میری ملاقات حسن علی صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک ازحد شریف النفس اور بے تحاشا ایسے انسان تھے جتنا ماہ قبل ان کی بیوی ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی تھیں۔ اس بچی سے پہلے کسی ماں کے بچے نہ تھے ایک مٹا ایک بیٹی۔ میری اور استان نے حسن صاحب کے قلب ہر گمراہ کر دیا۔ انہوں نے سیدھے سبھاؤ بچے سے اپنی زندگی میں شامل ہو جانے کے لیے کہا تاکہ میری مٹا کو قرار مل سکے اور ان کی بچوں کو ماں کا پاپا اور ان کے گھر کو ایک گمراہ۔ سوسا طرح ایک بچہ گھوکر

مجھے تین بچے مل گئے۔ چند ماہ کی انقبضہ دو سال کا عمار اور ساڑھے تین سال کی شملہ۔ میں نے اسے بچوں کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں لیکن کبھی ان سے بے حقیقت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی اور میرے بچوں نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں اور ہمیشہ مجھے یہ بات بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یہ بات بھول گئی میں بھول گئی کہ میرے بچے جو دو کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن وہ آواز وہ آواز میں بھول پائی جو میں نے حالت بے ہوشی میں سنی۔ میں ان نئے ہاتھوں کا لمس نہ بھول سکی جو میرے اندر اٹھارہاں لیتے تھے میرے لیے خواب میں کی ضرورت نہیں لیکن اب بھی اکثر رات کو آنکھ بے وجہ ہی کھل جاتی ہے لیکن اب۔۔۔ اب جو سکون کی نیند سوؤں کی خوشایہ روز قیامت ہی جا لوں۔



منینہ جینر کی کہانی مجھے میرے والد منور امین نے بسز مرگ پر سنائی۔ یوں تو میرے دم تک انہوں نے اپنی نظموں کا ذکر صرف نہ کیا تھا انہوں نے کسی سے بھی معافی مانگا یا پند نہ کی لیکن ان کی آنکھوں میں موت کا بے تحاشا خوف چچ چچ کر کتا تھا کہ اس میں اپنی بچی پوری زندگی ہر وقت ایک فلم کی اندر پھنسی نظر آتی ہے۔ وہ مرنے سے سخت خوف زدہ تھے اور ان کی زندگی موت سے کبھی بدتر نہیں تھی۔ اسی صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو نا ہے جنہوں نے ساری زندگی حقوق العباد کو بھری کر لیا تھا۔ منینہ جینر نے دو سروں کی بد دعا میں سستی ہوں دو سروں کو ابو رنگ آنسو لائے ہوں۔ میرے والد ایک ایسے ہی انسان تھے۔

نجانے کس مرنے سے چند گھنٹے قبل انہوں نے پاپا میرے کچھ دیکھے مجھے یہ کہانی سنائی۔ شاید انہیں اور اک دیکھا تھا کہ غلاموں کی معافی نہ تھی غلاموں کا اعتراف بھی بہر حال ایک اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے انہیں احمد جہانزیب ایک خوبصورت ذکاوت مزاج کے حامل شخص تھے۔ انہیں تباہے بغیر میری ای نے میری مائی کو رضامند کر کے مینا پیچھو سے جہانزیب بچوں کی منگنی طے کر دی۔

مینا پیچھو نہ صرف یہ کہ واجی شکل و صورت اور اور ابھی تعلیم کی حامل تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو کوئی خوبصورت صفت عطا کرنے کے متعلق بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ابھی صفات سے مبرا ایک تخت مزاج، انا پرور عورت تھیں جو میرے والدین کی شادی کے موقع پر ماموں کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھیں اور ماموں کو بلا شرکت غیر سے اپنا نا انہوں نے زندگی کا شہید بنایا تھا۔

ماموں جب منینہ دہائی کو گھرا لے تو تمام افراد پر بے خبر چل بن کر گر بی تھی۔ کئی تو ایسے تبسم ہونے لگے کہ کبھی ان پر بوندہ لگ۔ ایک ان میں مینا پیچھو اور میرے والد شامل تھے۔ اسی غالی اور میرے والد نے ایک مشترکہ منصوبہ بنایا جس کے تحت کسی بھی صورت منینہ دہائی کو خاندان کا حصہ نہیں بنانا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ جہانزیب ماموں کی نہایت فحاش غلطی تھی جسے بہر طور درست کرنا تھا۔

ماموں کو دکھانے کے لیے غالی ان سے مرنا کہا نہ کرتا کہ صدقاً بے دلی سے منینہ دہائی کو گھر میں رکھ لیا۔ انہیں وہ زور بھی رہا جو انہوں نے اپنی بیوی کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اپنا خاندان عوی لباس بھی دیا۔ منینہ دہائی فطراً ایک سادہ اور معصوم خاتون تھیں۔ وہ اس پر ہی خوش ہو گئیں۔

اب بلا تکبر یا بقاعدہ عمل دور آمد شروع کیا گیا۔ ای اور غالی ای ماموں کے پاس جانے لگیں ان سے تعویذ لالا کر جہانزیب ماموں کو بلائے جاتے تاکہ ان کا دل منینہ دہائی کی جانب سے بدگمان کیا جاسکے۔ غالی ای چیکے چیکے اندر ان اندر منینہ دہائی کے خلاف ماموں کو بھرا کرتی تھیں۔ سوئے اتفاق ان ہی دنوں مامی کے ایک رشتے کے بھائی جو

ایک عیسائی نوجوان تھے نامی کوئل گئے۔ بس ہمیں سے ان کی ذات کے خلاف سب سے بڑا شیو کھڑا کرنے کی بنیاد فراہم ہو گئی۔

ان اور نانی امی نے ماموں کو باور کرا کر شروع کیا کہ منیڈ ہامی جب موناجوزف تھیں تب سے ان کے واریٹ سے خفیہ تعلقات تھے۔ انہوں نے مکی جھولی مٹھیں اٹھائیں اور مکی غلط بیانیوں کیں جن سے خصوصاً ماموں کا دل مامی کی جانب سے بدگمان ہونے لگا۔ شوخی قسمت سے مامی تو کمری بھی کرتی تھیں ماموں کے دل کا بڑا حصہ ماموں اور گھر سے دور گزر رہا تھا۔

ماموں نے اپنی بھگلی مامی پر ظاہر نہ کی۔ انہوں نے اندری اندر اپنے ملک سے باہر جانے کے انقلاط شروع کر دیے۔ وہ بڑے بھلے قابل نوجوان تھے جلد ہی ان کے باہر جانے کا بندوبست ہو گیا۔ ایک یمنی نے انہیں اگریٹ کے تحت بلوایا۔ ان ہی دنوں امی نے رابرٹ کے ساتھ اپنے آپ سے ملنے کی اجازت مانگی۔

ماموں نے انہیں بلوایا اور اجازت دے دی اور خود سرے ہی دن ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ جانتے تو مامی کو بہت سے لیے چھوڑ بھی تھے تھے لیکن بنائے کیوں انہوں نے ایسا نہ کیا شاید ان کے دل کے لیے کچھ اور بھی تھا۔ مامی کی مدد میں یورپ بھی تھی۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ منیڈ ہامی سے قہر بھی ہو سکتی ہے منیڈ ہامی کی جانب سے کسی اعتراض کی شکوے کسی پار بھی شکایت کے منتظر تھے لیکن حالات کی بجائیں میں بستی مامی نے اور خود توجہ کی۔ یوں ان دنوں کے درمیان بھی نہ ختم ہونے والی خلیج جاہل ہو گئی۔

ان اور نانی امی کا پروگرام تھا کہ وہ مامی کو گھر سے نکال دیں گی اور ماموں سے کہیں گی کہ موناجوزف کے ساتھ بھاگ کر آئے۔ لیکن مامی نے انہیں وہ خوشخبری سنائی جس کی نالی ان دنوں ہو گئی۔ اب وہ اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکی۔ نانی امی نے خاندانی خاتون تھیں۔ وہ اپنے اکاؤنٹ سے کچھ کسے طور کسی دور سے کو نہ دے سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنے ایک بچے کی پیدائش تک منیڈ ہامی کو لڑائی لڑا کر ہارنے کا اہل کیا۔ ایک کام ماموں نے اور کیا وہ کہ ماموں کو پورے ایک ماہ بعد اطلاع کی کہ منیڈ کو وکیل سے بولیا ہے ماموں کے جانے کے پورے ذراہ ماہ بعد اسے منیڈ ہامی کے لیے طلاق نامہ موصول ہو گیا۔

پروگرام کے تحت یہ طلاق نامہ مامی سے چھپا گیا۔ نانی امی اور امی نے اپنا رویہ مامی سے بالکل تبدیل کر لیا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہوئے۔ میرے والد نے اپنے ایک رشتہ دار کے توسط سے ایک ایسے اسپتال کے متعلق معلومات حاصل کیں جہاں زیادہ تر ناجائز کام کیے جاتے تھے۔ وہاں ان کی نظر کو ابوتے رشتہ دار کے اپنی مرضی کا کام کرنے پر راضی کر لیا۔ یوں میری مصروف مامی کو ان کی زندگی کی ہر خوشی سے محروم کر دیا گیا۔

ابو جان کے پروگرام میں تو یہ بات بھی شامل تھی کہ گھر لاکر ہونے والی بیٹی کا کھانا کھونٹ کر کھا کر دیا جائے تاکہ جہازیب ماموں ہر بھینٹ سے آزاد ہو کر ان کی بہن کے ہوجائیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نانی امی نے اپنے بیٹے کی اولاد یعنی رجبہ کو قتل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس بات پر میرے والد اور نانی کے درمیان غصے میں۔ والد کا کہنا تھا کہ بیٹی کو کھانا کھا کر جہازیب معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے تو کچھ بیٹی نے نقشہ ہاں کے اور رنگت اپنے باپ کی بھی اور رجبہ نانی امی ایک ماں سے اس بے وردی سے اس کی اولاد چھین لینے سے قدرے خوف زدہ ہی ہو گئی تھیں۔

انہیں واضح سمجھ میں آ رہا تھا کہ بیٹی اور دامادی باتوں میں اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی میں ایسا نہ ہو گا لے جس کی خفیہ قیامت تک اس خاندان کے حافظے سے محو نہ ہو پائے گی۔ ابو کے توجہ اس وجہ خطرناک تھے کہ نانی امی اس بیٹی کے لیے سخت خوف زدہ ہو گئیں۔ ایک رات وہ اس بیٹی کو گھر سے چلی گئیں۔ ان کی بہن نواب شاہ کے قریب ایک نواحی علاقے میں رہتی تھیں۔ نانی امی ان کے پاس چلی گئیں۔ دونوں بہنوں کی مشترک جائیداد

میں ایک مکان اور چند روپیہ تھیں جس سے وہ زندگی بسر کرنے کے قابل تھیں۔ میرا مامی کو قدرت سے سزا دیتے ہیں میں نہ کی۔ مجھ سے بڑی بہن متناہوا اس وقت تین چار سال کی تھی سخت بخار میں مبتلا ہو کر چند راتوں میں ہی اس کی اولاد کے کچھ سے روٹنا شروع کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی۔ امی کے دل پر اس حادثے کا شدید اثر ہوا۔ اس کے بعد وہ بھی زیادہ عرصہ نہ جی پائیں اور اپنے گناہوں کو اب حساب کتاب لے کر اپنے خالق کے دروازے پر پہنچیں۔ بنائے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہو گا۔

میرے والد پر کسی حادثے کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں پر بندھی غفلت کی بچی قیامت تک کے لیے بھی۔ روز و رات اسے فرشتے ہی کھینچیں گے۔

میرے والد کے ہاتھ اس موڑ سے ایک ایسی خزانے کی چابی آگئی جس کو کپا کر وہ اپنی بیوی اور مری ہوئی بچی کو کوٹیا اپنی زندگی اولاد تک کو بھول گئے۔

نانی امی کے چلے جانے سے جہازیب ماموں کے رابطے کا واحد ذریعہ میرے والد ہی تھے۔ انہوں نے ماموں کو چھوٹی بھینچ بھائیوں متناہوا بہن کے مطابق منیڈ ہامی طلاق کے بعد رابرٹ کے ساتھ چلی گئی تھیں اور نانی امی سخت بیمار تھیں اور ابوان کا علاج کروا رہے تھے۔ جہازیب ماموں پر اپنی زندگی کے اس حادثے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے کسی ملک نہ لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابو کے اکاؤنٹ میں نانی امی کے علاج کے لیے پیسے بھجواتے رہے۔ بھجواتے رہے اور ابو کے من کو ایک شخص سے منہ منایا۔

نانی امی نے ابو کو کچھ لکھے اور جہازیب ماموں کا بیٹا اور فون بھرا کر دیں۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگا جاتی تھیں، انہیں سب کچھ بتا کر ہر جرم کا اعتراف کر کے وہ اپنی بعد پر دھروا کر ابوتہ چھٹا جاتی تھیں۔ ابو نے نانی امی کو اپنے سیدھے مغالطوں کا شکا کر دیا۔ ماموں نے جہازیب ماموں کے کسی حادثے میں سر نہ کرنے کی اطلاع دے دی۔ تو مامی کچھ ترس کر اپنے والد سے نانی امی کو کہنے کے دم تک شاید علم نہ ہو سکا ہو گا کہ جہازیب ماموں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

جہازیب ماموں کو جب ابو پر شک ہونے لگا تو انہوں نے ابو سے دو کوکھت کی۔ وہ فون پر اپنی والدہ کی آواز سننا چاہتے تھے تب ابو نے انہیں بتایا کہ نانی امی تو وہاں پہلے انتقال کر چکی ہیں اور ماموں کے بھجواتے پیسوں سے ابو نے مکان خرید لیا ہے۔ انہوں نے اپنے بچے کو لے کر ایک رومی میں مقدرت کر لی۔ جہازیب ماموں نے کچھ بھی کے ناخاموشی سے فون بند کر دیا اور ابوتہ کے بعد کبھی کسی نے ان کی آواز نہیں سنی۔

برسوں گزر گئے۔ ابو ابوتہ کی رومی پر کسی سانپ کی مانند بیٹھے رہے۔ تمدن بھائی کو بک بہن بھائیوں میں سے سے بڑے بڑے ہیں چنانچہ وہ اس معاملے سے کچھ کچھ آگاہ تھے۔ ابو کے ستر پر جانے کے بعد تمدن بھائی نے ابو سے دیکھتے بھانٹے شروع کیے لیکن ابو ایک نفسانی عارضے کا شکار ہو چکے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ رومی ختم ہوگی، ابو کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جب تک ان کے پاس وہ رومی باقی ہے وہ زندگی کی گڑھی کو کھینچتے رہیں گے۔

انہیں اپنی تقصیر ذرا زندگی ہر شے سے زیادہ پیاری تھی۔ انہیں پیاس کا عارضہ لاحق تھا جو شاید اسی نفسیاتی گمراہی سے پیوست ہوئی بات تھی۔ وہ ہر وقت پیاس کا شکار رہتے تھے۔ وہ خوبانی اپنی پی کر اور انہیں پانی پلانے والے پلاٹا کر تنگ کرتے لیکن وہ پیاس جنوں کی قوت نہ تھی۔

جہازیب نے ابو کی بہت خدمت کی۔ اس بات سے بے خبر ہو کر کہ ابو نے اس کی زندگی کے ساتھ کیا کیا زیادتیوں کی۔ ابو مرتے وقت رجبہ رجبہ کہہ رہے تھے بنائے ان کے دل میں کیا تھا؟ کیا وہ اس کو سب کچھ بتانا چاہتے تھے یا وہ رجبہ سے معافی مانگا چاہتے تھے؟ وہ رجبہ کے علاوہ اگر ان کی زبان کوئی اور لفظ ادا کیا تو شاید سمجھ میں

”محبت کبھی جھوٹ نہیں ہوتی۔“ مہارنے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ایسی ربیحہ سے سچی محبت محسوس ہوتی تھی۔ یہ تو واقعی ہماری سچی ہی محبت تھی۔“

”کسے کیسے انجام دیکھے ہیں میں نے۔“ ترانا اداوی سے مسکرائی۔ ”نفرتوں کے انجام اور محبتوں کے انجام۔ بلا عظیم الشان فرق ہے۔“



مہر بیچ کر سب سے مل کر پھر کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ چپ چاپ اپنا ہینڈ بیک اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ ٹیکسی والے کو مطلوبہ مقام پر اتار دیا اور راستہ خاموش چلی اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتی رہی۔ ٹیکسی رکی تو وہ باہر نکل آئی اس کے سامنے واقع اس بلند بالا عمارت کی تیسری منزل پر اس کا گھر تھا۔ سر اٹھائے وہ کچھ دیر اپنے گھر کی کونکریں دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر گریباں سے خود پر کشنول نہ رہا تھا۔

وہ اندر کی جانب بھاگی۔ عمارت میں لفٹ موجود تھی لیکن اس نے بیڑیوں کا انتخاب کیا۔ تیزی سے بیڑیاں چلا گئی وہ چند منٹوں میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے چپک نہیں کیا کہ دروازہ لاک نہایت تھیں۔ اس نے تیل پر انگلی رکھ دی اور اندر تیل کی آواز کو سنی اور فوراً ترے بچتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے وقفے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

ایقان ساکت رہ گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا جیسے کوئی برصی کا یار، برصی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، زرد رنگت، ٹانگے کپڑے۔

شاہزادہ نے دیکھ کر اس کی طرح کہنے کی بات نہیں تھا۔ کتنے ہی بل یوں گزرے تھے پھر نجانے ماہر کو کیا ہوا؟

آتا۔ ابو مرگئے۔ تمدن بھائی کے ہاتھ نہ کچھ نہ آیا۔ انہیں ابو کے سالان میں بھی کچھ نہ مل سکا۔ وہ غم غصے سے گویا پاگل ہی ہو گئے۔ تب ایک دن مینا بیچو خاموشی سے صولت کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دن بعد خبر ملی کہ مینا بیچو نے اپنے لیے ایک گھر خریدا ہے اور صولت بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ تمدن بھائی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے خبر کی نوک پر مینا بیچو سے سب کچھ اگلا لیا۔ ابو نے ماموں کو بھیجوائے ہوئے پیسے کلکٹر اکاؤنٹ میں ڈالوائے تھے جو اتنے عرصے میں دو گئے تھے ہو چکے تھے۔ ابو کی وفات سے چند روز قبل بیچو نے ابو کی چھاپی ہوئی چیزوں میں سے بیک کانڈاٹ اور چپک بیک ڈنل کر چھاپی تھی اس کے نیچے کوئی سراغ باقی نہ رہا۔ بعد میں بیچو اس رقم کی بلا شرکت غیرے مالک بن گئی تھیں۔

تمدن بھائی بیچو سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ مکان تمدن بھائی کے نام لکھ دیں۔ بیچو نے صاف انکار کر دیا۔ تمدن بھائی کے ہاتھوں بیچو کا قتل ہو گیا۔ وہ خون آلود خبر لے کر کھڑے اور بچہ ہی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ہمارے گھر کو گھیرنے میں لے لیا گیا۔ تمدن بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ تصور بھائی فرار ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے نیچے خون گرے کھڑے لوٹنے کے لیے کہا۔

میں اس وقت آفس میں تھی۔ میں نے عبد الباری کو سب کچھ بتایا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن ان کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ مجھ پر دیکھ کر اڑا ہوا تھا۔ بچہ پر دیکھ کر عبد الباری والے قدموں بیٹھے وہاں سے لے آئے۔ ہم نے شام کو باری کے ایک دوپٹے پر بیٹھے گھر نکاح کر لیا اور اگلے ہی دن شریچوڈ کر کر اچی چلے آئے۔ یہاں باری کے ایک درینہ دوست اور کشتہ دار کے توسط سے ہمیں گھر بھی میسر آگیا اور باری کو جلد ہی نوکری بھی مل گئی۔ یوں زندگی قدرے بہتر شکل میں دوایں ہو پائی۔ وہاں تمدن بھائی کو عمر قید سنائی گئی۔ تصور بھائی نے صولت سے نکاح کر لیا۔ یوں ان دونوں کا بھی گھر بس گیا۔ سب میرے گھر کے ہی کمانڈر ایک عمر کی لڑکی اور حرم کا انجام ساری عمر کی بیاس اور خالی ہاتھ پر آئی اور میرے پاس کاغذ پر لکھا کہ ایک رشتہ خواہشات کو اپنے خون سے سیراب کر کے بیشک کی خیر ہو جائے بیچو کی قسمت اور کھٹکے سکون کی جھکار سننے کے شوق میں۔ جھکریوں اور بیڑیوں سے بہرہ آسانی تمدن بھائی کا نصب نمبر۔



”مال۔ مال۔“ اس کے لب دھیرے دھیرے کاٹ رہے تھے اور ہینڈ بیک سے آنسو رواں تھا۔ پناہ سرائی مال کے سینے پر دھیرے دھیرے وہ شخص اسی لفظ کی تکرار کیے جاتی تھی۔

”میری بیٹی۔ میری بیٹی۔ میری زندگی۔“ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لیے ایک عمر کی عورت کو قہقہہ دیتا تھا۔

سیراب کر دی تھیں۔

عباد انیقہ، ترانا اور عبد الباری ساکت بیٹھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے زندگی اتنے گھر بھی بدل سکتی ہے، یقین کرنا مشکل تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، نظروں کے سامنے تھا۔ ”جب آکھ کلی تو میری کوکھ خالی تھی ربیحہ! میری ہاتھ خالی تھے میرا دل خالی تھا۔“

وہ ان ہی الفاظ کی تکرار کیے جاتی تھیں۔

”تو میں آپ کے پاس ہوں امی! آپ کے سینے سے لگی ہوئی ہوں۔“

ربیحہ نے ان کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دیوانگی سے اس کے ہاتھ کو لو سے لیے۔

”اس لیے جو کرتی تھی ان ہاتھوں کو میں۔ انہیں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے اپنے اندر پہنچتی وہ شخص، انکڑیاں یاد آتا کرتی تھیں۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت ناول

خوبصورت بیوی

مستحیو طالعہ

آتش بیچ

شادی ہو گئے ہیں

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم محرق قریشی قیمت: 400 روپے

☆ بیٹیاں، عزیز اور محبت، عمیرہ احمد قیمت: 200 روپے

☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین قیمت: 350 روپے

☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 180 روپے

☆ امرتیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

مکتبہ نے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

اس نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اگلے ہی لمحے ایقان نے اپنا ہاتھ چوکت کر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ "جسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ لگی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آئے۔ لحوں کا خیال بہت جانتا تھا۔ طرح سے مجبور ہوئی تھیں۔ شدت دروازے انگلیاں پھنسا کر پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گئی۔ یاد رکھنا۔"

اس کا چروا اپنی رکت کھو بیٹھا تھا۔
"پاگل ہو؟" وہ غرایا۔
"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔
"جاننا ہوں۔" وہ نظروں پر اکروا۔ "مجھی طرح جان گیا ہوں۔"
"پھر ایک بال کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ بال بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔
"پھر یہ خود ساختہ نظم بندی کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"
وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے تھے۔ اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑا پھر اس کی جانب پشت کر گئی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔
ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی پشت پر سر تکیا۔
"اب تم میرے سامنے نہیں ہو" جواب دو۔"
"تمہارے" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگتے آئی ہوں۔"
"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔
اپنے گرد و حال اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سراٹھار رہی تھی۔ اگر اپنی تھیں۔ دم توڑ چکی تھیں۔ وہ خود کو بس بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت حال کی طرح اس کے گرد و پیش چلتی ہوئی تھی۔
"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں! ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بجا کر صرف میرے لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پھر عاشر نے۔"
وہ اس کی پشت پر سے محسوس کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہ رہے تھے۔

جسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ لگی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آئے۔ لحوں کا خیال بہت جانتا تھا۔ طرح سے مجبور ہوئی تھیں۔ شدت دروازے انگلیاں پھنسا کر پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گئی۔ یاد رکھنا۔"

اس کا چروا اپنی رکت کھو بیٹھا تھا۔
"پاگل ہو؟" وہ غرایا۔
"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔
"جاننا ہوں۔" وہ نظروں پر اکروا۔ "مجھی طرح جان گیا ہوں۔"
"پھر ایک بال کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ بال بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔
"پھر یہ خود ساختہ نظم بندی کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"
وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے تھے۔ اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑا پھر اس کی جانب پشت کر گئی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔
ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی پشت پر سر تکیا۔
"اب تم میرے سامنے نہیں ہو" جواب دو۔"
"تمہارے" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگتے آئی ہوں۔"
"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔
اپنے گرد و حال اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سراٹھار رہی تھی۔ اگر اپنی تھیں۔ دم توڑ چکی تھیں۔ وہ خود کو بس بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت حال کی طرح اس کے گرد و پیش چلتی ہوئی تھی۔
"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں! ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بجا کر صرف میرے لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پھر عاشر نے۔"
وہ اس کی پشت پر سے محسوس کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہ رہے تھے۔

جسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ لگی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آئے۔ لحوں کا خیال بہت جانتا تھا۔ طرح سے مجبور ہوئی تھیں۔ شدت دروازے انگلیاں پھنسا کر پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گئی۔ یاد رکھنا۔"

اس کا چروا اپنی رکت کھو بیٹھا تھا۔
"پاگل ہو؟" وہ غرایا۔
"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔
"جاننا ہوں۔" وہ نظروں پر اکروا۔ "مجھی طرح جان گیا ہوں۔"
"پھر ایک بال کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ بال بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔
"پھر یہ خود ساختہ نظم بندی کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"
وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے تھے۔ اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑا پھر اس کی جانب پشت کر گئی۔

بانی شاہ شاہ

اس نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اگلے ہی لمحے ایقان نے اپنا ہاتھ چوکت کر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ "جسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ لگی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آئے۔ لحوں کا خیال بہت جانتا تھا۔ طرح سے مجبور ہوئی تھیں۔ شدت دروازے انگلیاں پھنسا کر پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گئی۔ یاد رکھنا۔"

اس کا چروا اپنی رکت کھو بیٹھا تھا۔
"پاگل ہو؟" وہ غرایا۔
"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔
"جاننا ہوں۔" وہ نظروں پر اکروا۔ "مجھی طرح جان گیا ہوں۔"
"پھر ایک بال کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ بال بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔
"پھر یہ خود ساختہ نظم بندی کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"
وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے تھے۔ اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑا پھر اس کی جانب پشت کر گئی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔
ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی پشت پر سر تکیا۔
"اب تم میرے سامنے نہیں ہو" جواب دو۔"
"تمہارے" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگتے آئی ہوں۔"
"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔
اپنے گرد و حال اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سراٹھار رہی تھی۔ اگر اپنی تھیں۔ دم توڑ چکی تھیں۔ وہ خود کو بس بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت حال کی طرح اس کے گرد و پیش چلتی ہوئی تھی۔
"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں! ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بجا کر صرف میرے لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پھر عاشر نے۔"
وہ اس کی پشت پر سے محسوس کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہ رہے تھے۔

جسین لگ رہا ہے۔" اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ لگی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آئے۔ لحوں کا خیال بہت جانتا تھا۔ طرح سے مجبور ہوئی تھیں۔ شدت دروازے انگلیاں پھنسا کر پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روو گئی۔ یاد رکھنا۔"

اس کا چروا اپنی رکت کھو بیٹھا تھا۔
"پاگل ہو؟" وہ غرایا۔
"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔
"جاننا ہوں۔" وہ نظروں پر اکروا۔ "مجھی طرح جان گیا ہوں۔"
"پھر ایک بال کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ بال بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔
"پھر یہ خود ساختہ نظم بندی کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"
وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے لگے تھے۔ اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑا پھر اس کی جانب پشت کر گئی۔

بانی شاہ شاہ

”ریجیہ..... ریجیہ! پیاس لگی ہے ریجیہ۔“ اگنا کی دھڑکنے والی آواز سن کر وہ بے پرواہی سے کہنے لگی۔
 ”دادی! دادی! کہاں ہیں آپ؟“ حیدر گاہک پہلے ہوئے صحرا میں چلتی دھوپ جیسے آنکھیں ہی بے چارے کی دھڑکنے لگی تھیں۔

”ریجیہ! ریجیہ!“ وہ کم مٹی کی آواز کسی ٹیلے کے پیچھے سے آئی تھی۔ ”میں یہاں ہوں۔ یہاں۔“
 اندھوں کی مانند آگے بڑھی۔ دھوپ کی شدت تیزوں کی صورت جسم کے آئینہ ہوئی جاتی تھی۔ ریجیہ باغیچہ میں دوڑ پڑی۔

”یہاں مگر ہے ریجیہ! اندھیرا ہے۔ پیاس ہے۔“ تو اڑ میں ہلاکی حسرت اور بچتا ہوا ہے تھے۔
 ”میں۔ میں آپ کے لیے پیالی لائی ہوں دادی! میں۔ میں روشنی کیے ہوئی ہوں۔“ میرا نظارہ نکریں۔
 ریجیہ دیوانوں کی مانند ہانگے لگی۔

”دو بجنی لاؤ ریجیہ۔ دس بجنی رو شنی۔ ذرا پیالی۔“
 آواز اندھم ہونے لگی۔ آسمان پر آگ برسا نا سوجن غائب ہونے لگا۔ ہر طرف خاموشی مچا دی اور اندھیرا گہرا ہو گیا۔

ریجیہ کی ہنڈ پکوں میں دھیرے دھیرے جنبش ہوئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ مانتے پر قطروں کی صورت ابھرتے لیے اور جسم میں کھٹے بڑھتے تھن کے دباؤ کو محسوس کیا پھر مگر سانس لینے ہوئے تھک دھڑکے۔
 ”جی۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔“ حیدر کی آواز میں پھرے پر پھیرتے ہوئے اس نے خود کو جھجھکے کرنے کی کوشش کی۔

وہ خواب پوری جزئیات کے ساتھ اب جاگتے میں آ رہا تھا۔ وہ لمبورنگ ماحول کی دھواں مگر۔ وہ گواہ کا میدان تھا۔ اس کی دادی کی روح پر عذاب دینے والے درختے سے بچ رہے تھے۔ وہاں بھی اس کی لگائی گئی آواز کا عذاب خریدنے پر مجبور تھیں۔

”دادی۔“ ریجیہ کے لبوں سے آواز جنبش کی۔
 اس کی پکلیں پر ستارے چمکنے لگے۔ اس کی دادی نے انہی کی ماں کے ساتھ بہت برا ظلم کیا تھا۔ اس میں کسی قسم

کا اہتمام تھا۔ نہیں لیکن اس کی دادی نے اسے ممتا کے ہر ذائقے سے روشناس کرایا تھا۔ ریجیہ کے لیے وہ مگر کی چٹاؤں اور مڑی کی دھوپ تھیں۔ وہ اس کی ابتدائی تین سالہ زندگی کا واحد ساتھی واحد غم خوار واحد مہربان ساتھی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے جھڑکا تھا، کبھی اسے سخت نظر سے دیکھا تھا، کبھی اس کے لیے وہ مٹری کی مٹری تھیں۔

”جی۔“ ریجیہ کی ہنڈ پکوں میں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منینہ بیگم کے ساتھ کبھی کبھی مٹری کی مٹری تھیں۔
 کو بیشہ اچھائی اور بھلائی کا درس دیا۔ ریجیہ کی ذات میں جتنے بھی غم و شہید تھے ان کا بیج دادی نے ہی رکھا تھا۔
 ریجیہ کا ان سے فکری و روحانی رشتہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد کبھی یہ تعلق ختم نہ ہو سکا تھا۔

اس نے گردن ہٹا کر برابر میں سوئی ہوئی منینہ بیگم کو دیکھا ان کے چہرے پر بھی بلا کا طمینان تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیوں میں انہیں کوئی ملال گئی۔ چچا ستاوانہ تھا۔ وہ خدا کے سامنے سرخرو تھیں۔ وہ ان کی ذات کے سامنے سرخرو تھیں۔ عمر دادی بھی گزار کر گئی تھیں۔ عمر۔ اس کی ماں نے بھی گزار دی تھی۔ عمر۔ مگر وہ جاتی ہے لیکن انجام۔ انجام بھرا نا ہے۔

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

مکوں اور مگر مینہ کا غماز تھا۔ وہ نیکی کے سارے تھوڑا سا نیم دراز ہو کر بیٹھا پھر اس نے بہت آہستگی سے

چپقل کی دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر ایک گمراہ لپا۔ رگ و پے میں

”جی۔“ ریجیہ کی ہنڈ پکوں میں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منینہ بیگم کے ساتھ کبھی کبھی مٹری کی مٹری تھیں۔
 کو بیشہ اچھائی اور بھلائی کا درس دیا۔ ریجیہ کی ذات میں جتنے بھی غم و شہید تھے ان کا بیج دادی نے ہی رکھا تھا۔
 ریجیہ کا ان سے فکری و روحانی رشتہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد کبھی یہ تعلق ختم نہ ہو سکا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سوئی ہوئی ایتھان پر نظر ڈالی کہ جو اب کچھ بھول بھال کر اس طرح سو رہی تھی۔ گویا اس

دے سے باہر موجود نہ اس کا نہ کوئی تعلق ہے نہ لینا وینا۔ اسے اپنے بچے تک یاد نہ تھے۔ عذرا بیگم کو فون

نی جیت کے اطلاع دے کر اور بچوں کی خبر گیری کرنے کی استدعا کر کے وہ ”مٹری“ تھی۔ اور ”حیات“ ولا۔ میں تو

باز کر رہی تھی جس نے بھی ساتھ اس نے فون ڈرائے مانے ہوئے فون ادا کرنے کے لیے جائے نماز پجائی تھی۔
 ”جی۔“ ریجیہ کی ہنڈ پکوں میں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منینہ بیگم کے ساتھ کبھی کبھی مٹری کی مٹری تھیں۔
 کو بیشہ اچھائی اور بھلائی کا درس دیا۔ ریجیہ کی ذات میں جتنے بھی غم و شہید تھے ان کا بیج دادی نے ہی رکھا تھا۔

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

عاشر نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ تجانے کس وقت مگر مینہ میں چل گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردستی

تھی بالکل خاموش۔ عاشر رسکون اور مطمئن تھا جیسے کچھ کما کچھ سنا نہ چاہتا ہو۔
ایقان نے اسے لڑا سے ملاقات کا احوال ذرا نہ کہا تھا۔ یوں جیسے وہ بغیر کچھ جانے بوجھے یونہی باران کر چلی تھی۔

عاشر نے اسے جاپان سے پاکستان تک چلے آنے کے پیچھے کسی بچھتاوے، تاسف یا شکست کا اظہار نہ کیا تھا۔

لڑا کا ذکر دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ وہ بار کبھی نہ باریں۔ دونوں ہی چاہتے تھے کہ وہ با طرفیں بآب ہوں۔ دونوں ہی محبت کے امتحان میں بارے تھے اور اپنی اپنی نظریں سرخ و درخشاں چاہتے تھے۔

عاشر جانتا تھا کہ ایقان کے یوں چلے آنے میں اس کی فراخ دلی کا ہتھ نہ تھا۔

ایقان سمجھتی تھی کہ واپس لیٹ کر فراخ دلی کا ثبوت اس نے دیا ہے۔ عاشر نے اسے آخر تک نہیں بکا تھا۔ محبت لیوں پر لکھی معنی خیز کمر اسٹمپ لیے بال بال غواستہ کی پار نہ دعا کی طاقت سے۔ مجبور ہو کر دلی غم و غم جو چپ چپ تھی۔

ایقان سو رہی تھی اور عاشر چپ چاپ سرگرم پھونک رہا تھا۔

وہاں سے بہت دور اپنے بڑے دم میں۔ یہم روز مہا کل کی کھڑکی پر کھینچے ہوئے راف کا ڈن، گیم میں مجنوں تھا۔ وہ ایقان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دعا عاشر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تقدیر اور قسمت جیسی چیزوں کے متعلق جو پہلے بھی اتنا سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ آج اسے پتا نہیں ہو چکا تھا۔ آپ قسمت سے منہ پھیرتے رہے، وہ گھوم گھوم کر آپ کے سامنے آئی تھی۔

اس کی ذرا سی پٹانک سے ایک گھر و سہا ہی بن گیا تھا۔ یہاں پہلے تو ایقان کی قسمت کو منظور تھا، مگر وہاں اور اس کی شدید کاوشوں کے بعد بھی بدل کا گروہ سے نہیں سکا جیسے وہ سنا چاہتا تھا کہ قسمت کو نام منظور تھا۔ اب وہ وہ بھی تقدیر کے سامنے ٹٹے نیٹے بیٹھا تھا لیکن وہ بے رحمی سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ کس کو علم تھا؟



سبلے ہاوں میں وہ حیاتی سے برش پھیرتے ہوئے وہ آسمان کی وسعتوں کو کھوج رہی تھی۔ اس کی ہر چیز متلاشی نگاہیں جیسے اتنی کے بار کی کو خود بخود چاہتی تھیں۔ اپنی ہستی اسے ایک جگہ پر لی کا ماند لک رہی تھی جس کے تمام بے مل جانے کے بعد بھی ٹھیک طرح سے جو نہیں پائے تھے جیسے چندھے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔

”رہیجیہ؟“ شملہ اسے آواز دی تھی۔

کھڑکی میں کھڑی رہیجہ چونک کر بال میٹھے ہوئے وہ پلٹ آئی۔

”جی آئی!“

”وہاں کھڑی کیا سوچے چار دی ہو؟“ شملہ نے محبت سے اسے دیکھا اور منہ نہ بیگم کا چہرہ ٹٹو سے صاف کرنے لگی۔ وہ اویس سوپ پار دی تھی۔

”مجھے تو جب سے علم ہوا ہے تب سے تمہیں دیکھنے کی پیار آنے لگتا ہے۔ عزیز تو میرے لیے بھی بہت تھیں اب تو عزیز تر ہو گئی ہو۔“

رہیجہ نے آگے بڑھ کر شملہ کے کانہوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”میرے دل سے پوچھتے آئی! میں نے کبھی بھی آپ لوگوں کو پایا یا غیر نہیں سمجھا لیکن اسی سے ملنے کے بعد میں ان کے حوالے سے آپ میرے کتنے اپنے ہو گئے ہیں۔ میں شاید سمجھا نہ سکوں۔ ایسا لگتا ہے میرے وجود کے گم شدہ حصے آپ جاکل مل کر میری ذات کی تکمیل کر گئے ہیں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رنڈے لگی تو وہ لیکنٹ خاموش ہو گئی تھی۔

”رہیجیہ؟“ منہ نہ بیگم نے بازو پھیلائے۔

رہیجہ نے اختیار آگے بڑھ کر ان سے لپٹ لی تھی۔ منہ نہ بیگم نے اس کے سر کو چوم لیا۔

”ہائے رہیجیہ۔“ اب تو مجھے جیسی بولنے لگی ہے۔“ ایقان شرارت سے بولی۔ ”فنا چلی ہو؟“ اسی کی محبت کا یہ اظہار صرف میرے لیے ہی مخصوص تھا۔ شملہ آئی اور عبا ربھائی اسی سے شکایت کرتے تھے کہ مجھے جس۔

ایقان صرف میرے لیے اسی بار کر رہی ہیں وہ ان کے ہاں میں کیوں نہیں آئی؟“

”تو میری کو اس غم میں ملی تھیں جس عمر کی اس وقت رہیجہ تھی۔ اسی لیے تمہیں پیار کرتے وقت یوں۔“

ایقان رنج و جالی تھیں۔ ”یہاں پرانہ انداز میں بولا۔“

وہ سب روناؤں کی مانند منہ نہ بیگم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے سچا پیار نہیں ملا؟“ منہ نہ بیگم قدرے روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔

شملہ آواز اور ایقان کے اختیار ان سے لپٹے تھے۔

”ہماری۔“ سب لپٹ گئی تھیں اس سے زبان محبت اور شفقت نہ دے پاتی ای رچی۔ اقیامت کے دن بھی ہماری یہی نگاہیں ہوں گی۔“ شملہ آواز کی ہر دہائی پر بولی تھی۔

”یہاں میری بھانجی تھیں۔“ شملہ کی نگاہیں ٹپک ٹپک تھیں۔ ”اپنے آخری وقت میں، میں بہت خوش بہت مطمئن بہت تھی ہوں۔ مجھے سادہ زندگی تھی۔“

سب کی ہلکی غم ہو گئی تھیں۔

”ابھی آپ نے بہت جینا ہے ای! اب ہم سب کے لیے۔“ رہیجہ کے لیے۔ ہم سب کے دامن آپ کی بے پناہ توجہ اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔“ رہیجہ نے یہ تو ابھی کی مٹی کی مانند آتش ہے پیاسی ہے۔ آپ کی محبت اور ممتا۔ ابھی ابھی آپ سے لپٹے تھے۔

”مگر وہاں ان کے لوگوں کا ہاتھ تھا۔ بہت آہستہ آہستہ کہ وہاں منہ نہ بیگم نے بس سے مسکرا دیں جیسے عباد کی بات نہ کرنے کا حوصلہ ان میں نہ ہو لیکن اسے پورا کرنا بھی ممکن نہ دکھائی پڑا ہو۔“

رہیجہ کی آنکھوں میں دھواں سا بھر نے لگا تھا۔



وہ رات گئے تک اسٹری میں مصروف تھا۔ عموماً رہیجہ یا ایقان جیسے کا قہر یا مس بھر کر اس کی اسٹری میں رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ بستر تک جانے سے پہلے وہ زمین کپ جائے ضرور ہی لی لیا کر آتا لیکن آج تھا نہیں ”ان دونوں کو ہی علم نہ تھا کہ عباد کا سونے سے قبل کچھ ملٹا ملے گا۔ وہ بڑا س قواسم سے متعلق کتابیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ تب ہی اسے اختیار اس کی نظر روزانہ کی جانب اٹھ گئی، جہاں منہ نہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ عباد نے اختیار اٹھ کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

”اسی جی۔“ ایکوں جلی آئیں آپ؟“ وہ پریشان ہو کر ان تک پہنچا اور انہیں تمام لیا۔ ”کچھ تکلیف ہوئی؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ چنچے۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”انتظارِ یثبات مت ہو۔“
عباد انہیں سارا دوسے کرانڈر لے گیا۔

”میں نہیں۔“ اس نے انہیں نرم کرکے چڑھایا اور خود ان کے قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ”اور ہاں بتائیں، اتنی رات کو آرام نہ کر گم سترے اندھ کر کے کیا مصلحت ہے؟“

منہ زور بیگم نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
”اپنے بچے کو ایک نظر دیکھئے گا خیال آیا تھا۔“ وہ ہلوس پر نرم مکان سجائے بولیں۔

”ریجہ سوئی؟“ عباد نے پوچھا۔
”ہاں، گورا دن میری خدمت کر کے بہت تھک جاتی ہے۔ وہ سبے خبر ضروری ہے۔“
”آپ کی خدمت میں عبادت و سعادت ہے، ہم سب کے لیے۔“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔

”عبدال!“

”جی ہاں۔“ عباد نے۔
”میں ایک بات کہنا چاہ رہی تھی تم سے۔“ وہ دوسرے ہتھی کر بولیں۔

”آپ نہیں لگی تھی۔“ عباد نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔
”عبدال، اس دن امیر حسن کے ساتھ۔ جو لوگ آیا تھا۔“ وہ لڑکا لڑا کر لیں۔
”شہزادہ احمد۔“ عباد فوراً بولا۔

”بالندہ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”شہزادہ احمد! میں نے آپ کے والد کا نام دریافت کیا تھا۔ جانتے تو کسی لیے۔“

عباد جواب دے کر ان کی اداس آنکھیں دیکھتا رہا۔
”وہ لوگ۔“ وہ بوسہ بوسہ جہاں نصیب کی تصویر ہے۔ ہو رہا ہے بالندہ۔ ہو رہی ہے۔ ریجہ کے والد امیر جمال

زیب۔ میں نے جس لمحہ اسے دیکھا، کوئی انجمنِ طاعت نیچے پوری شدت سے دھکیلی ہوئی بائیں کی بھول سے پیچس برس پیلے کی تصویر کے فریم میں ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے ایک فریم میں قید کر دیا ہو۔ رنج

عباد نے ان کے ٹیف جسم کو گانتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان کے منہ کے نیچے اپنے گرم آنکھوں میں دبا کر

ہوئے۔ ”میں نے تم سے اس کے باپ کا نام پوچھا اور میرے شک پر تصدیق کی مہریت ہوئی۔ ہاں ہاں عباد! مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ۔ ریجہ کا بھائی ہے۔ امیر جمال زیب کا بیٹا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو

آگئے۔ ”کیا انہو کا اتفاق ہے۔“ عباد بڑبڑایا۔
”میں۔“ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں عباد! اگر واقعی وہ ریجہ کا بھائی ہے تو ان رشتوں کو ملنا چاہیے۔ ریجہ کو

ان کا بھید بھر گیا۔
”میں انہوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا امی جی۔“ عباد کو ان کے ساتھ ہونے والی ساری نا انصافیاں یاد

آگئیں۔ ”ریجہ کیوں لے آئے۔“
”میں نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں میرے بیٹے! وہ دے لیں۔“ اس کے بعد مجھے کچھ

اعتبار نہیں رہا کہ میں کسی شخص کے خلاف اپنے دل میں کچھ کدورت رکھوں۔ میرا اللہ سب کا حساب کتاب انصاف سے کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ عباد نے بے اختیار ہمو کرانے کا حقوں کو چہا اور آنکھوں سے لگا

لیا۔
”تمہیک ہے امی جی۔! پھر وہ بولا تھا۔“ امیر حسن یوں بھی آپ کی عبادت کے لیے آنا چاہتا ہے۔ میں شہزاد

کے لیے بھی اصرار کروں گا۔ میں۔ میں کل ہی امیں بلوا ہوں۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔



شام ست رنگی چڑا اوڑھ کر ”حیات دلا“ میں اتری تھی۔ وسیع عریض رہنے کے حامل پورے گھر پر تازہ رنگ

و روغن کے بعد ہونے والی لائٹنگ کے ایک عرصے کے بعد کوئے کوئی اور دکھائی دلا چھوٹا آسٹریس جھنڈا

تھا۔ جابجا جھنک کے سب ہی رنگ بکھرے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔
عمار ت کے پچھلے وسیع لان کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ یہاں ایک وقت تیزوں و سنوں کی رسم مندی کا انتظام

کیا گیا تھا۔ وہ تین تین خاص باندھ کر گرہاں بچا دی تھی۔ کمرہ سبوں کے درمیان میں اسٹیج اس طرح بنایا گیا تھا

کہ ہر طرف سے سہارا ہو سکے اور تھوڑے سیٹیں۔
شام ابھی اتری ہی تھی کہ تمام لائٹس آن تھیں۔ جابجا رکھ گئے تازہ پھولوں کے گلے۔ ستیوں نے انھوں کو

لطیف و معطر بنا دیا تھا۔
پورے محل کا یہ نظریہ جازز لینے کے لیے عرشہ سے کھڑی ہندو کی پھر سو کر کھڑکی سے ٹیکہ لٹاکا۔ کچھ

سوئے تھے۔ غلبہ کا گونا گس کے دانت تھک دیا۔ آج بوسے مہر کے کا وقت آیا تھا۔ اس کے برابر

میں ہونے والے بعد اور سامنے بیٹھا۔ وہاں ایک کرسی پر آج۔
خدا کی پچھل جہوں کی قربانیوں کی رسم مندی کی ایک ہی موقع پر سرا جہا ہوتی جائے۔ بزرگوں

نے بھی بچوں کی خوش طبعی کا خیال رکھتے ہوئے ایک اجازت دے دی تھی بلکہ مایع کی رسم مندی بھی اسی وقت

کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
”عرشہ!“ ماہین کی حیرت بھری آواز بڑبڑاتی تھی۔ ”وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہارا بڑا دواوش دوم

میں لٹکا دیا ہے۔ تمہارا کمرہ بن لو۔“
عرشہ نے خاموشی سے اپنے کمرے میں سر لایا۔ ماہین اس کے قریب آگئی پھر اس نے پیار سے بس کی ٹھوکی کو

چھوا۔
”خیر، انہوں میں میری رسم الا جواب ہوگی۔ دیکھ لےنا۔ آج بیلا جو لایا گیا غضب دھائے گا۔“

عرشہ کے لبوں پر ایک نا بوجھ میں آنے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
”غضب ہی تو ڈھانچا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔
پھر وہ خاموشی سے رات کو دم کی جانب بڑھ کر بیٹھی۔



کھانے اور دیگر انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد وہ نہانے کے ارادے سے تھکا ہوا سا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں

کروڑوں ٹھنک کر رک جانے کے تمام لوازمات لگا ہوں کے سامنے آئے تھے۔
شام گھر سے زور رنگ کی ہمارے ساڑھی زیب تن کی تھی۔ ہر لٹا نا تزیں کھڑی تھی۔ وہ کٹائی میں میوے کے سیکٹے

نگلی کا ہاتھ کر اپنے کام میں منہمک شملہ کو دیکھ گیا۔

گمراہ زورنگ اس نے شاید پہلی مرتبہ پہنچا تھا اور اس رنگ میں وہ کسی قدر حسین نظر آتی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ کمر تک آتے سیاہ کھنڈے، چمکیلے بال اس نے کئی دن بعد بول سنوار کر کھینچے چمڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں لگائی ہوئی ڈھیروں ڈھیر موٹی کی لڑیاں اس کے دونوں کانوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ منگے میں بچے موتیوں کا گنگنہ اور کانوں میں آواز سے تھے جو بصورت آنکھوں کو مسکارے کانوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ منگے میں بچے ہونٹوں پر گہری سرخ پانک بھی۔ اتنا چمکدار، مسکراتا وہ تھا جس نے شاید سہاگ رات کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ کیا ایک اس کا چاہا کہ وہ اپنی دیوانی جست سے شملہ کا سارا روپ لگا ڈالے۔ اس کے یک سبک سے درست انداز کو بھیر مارے۔

شملہ اچانک چوکی تھی۔

”ارے آپ۔ آپ کب آئے؟“

”ہاں! کو خوشیوں لوٹنے میں چند لمحوں گئے۔“

”میں۔ بس۔ ابھی۔“

”انفکات مکمل ہیں؟“ وہ تجربا لے اس کے قریب چلی آئی۔

”ہاں! بالکل۔ رافع نے سب ہی دیکھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔“

”اچھا۔ یہ ذرا بھر آؤ۔“ شملہ نے کان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں! تم کسی معمول کی مانند بھر آؤ۔ شملہ کا مخصوص رنگ دم کی دلکش مسک سے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔“

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔ شملہ نے اس کے جذبات کی پکڑ لی۔“

”نظر میں اچھا نہیں پھر فوراً ہی چھٹا۔“ رافع نے اس کے جذبات کی پکڑ لی۔

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

لوگوں نے دھوکہ کی تھاب پر دوایتی گیتوں کا آغاز کیا تھا جو کچھ ہی دیر بعد نفسی علاقائی اور مختلف قسم کے ہنسونے ہوتے ہوئے شور شرابے اور پچھتوں کا رخ اختیار کر گئے تھے۔ ہوش کی طرح لڑکے بھی ڈھلیاں اور جیشیاں لیے محفل میں شریک ہو گئے تھے اور ”دو جوان“ سے قصور کائنات میں رنگ کے نظریے کو اپنا ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری پوری توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ اقبال کا جوش اور دلولہ عرونی پر تھاب۔ سب کی چیز چھاؤں شرارتوں اور خوشیوں کا برا مٹانے بغیر مفصل جواب دیتے ہوئے وہ چنان محفل نظر آ رہی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں اس کی خوبصورت رنگت گود رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک جھج چمک بھی جیسے آئینے کو بت ہی روشنیوں میں آئینے کی ہی مقابلے لے آیا جائے دھوکہ بجائی! بلند لے میں آواز کا جادو جگائی وہ ظلمانی ایک جگہ سین لگ رہی تھی۔

”گمراہ کی نظر میں ہے اسے دیکھتے ہوئے رافع کسی کام کا خیال آجائے پر پلٹ رہا تھا جب عاشر سے لکراتے لکراتے تھا۔“

”دیکھ کر بھائی۔“ عاشر نے اپنے بازوؤں سے تھا۔ ”کہاں کھوئے ہوئے؟“

”رافع نے سنی خبر نظروں سے اسے دیکھا۔“

”میں نے سنی ہے جان،“ کا بدلا بدلا خوبصورت روپ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ روپ تو چھپا جان آپ کا بھی دیک رہا ہے۔“

”اس نے کھنڈ شیدو ہونے تک سب سے درست عاشر غور کرتے ہوئے کلمہ دونوں نے ایک وقتہ لگا دیا تھا۔“

”دیکھ کر اس کے دھڑکنے لگی۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں! سب سے پہلے اس کی پشت پر بھرے ہونے کو دیکھا ہوا اور رنگ۔“

”شملہ نے کان لپیٹ لیا۔“

”الہامی سے اپنا ہاتھ کیا ہوا کر اٹھا اور نکالے ہوئے ہاتھ سے اپنے ہاتھ سے اس نے شملہ کی دست دیکھ کر

”ہاں! تم نے اسے سچا بھرا بنا دیا۔“

”موتیوں کی سب سے دونوں کو کسی طرف سے لے کر گشت ہے۔“

”ہاں۔۔۔ اگر خوشیاں تقدیر میں ہوں تو، میں خوف اور دوسروں سے بھری انجمنی دنیا میں قدم رکھتے جا رہی ہوں۔ مجھے تو یہ جدائی اور یہی مشکل معلوم ہو رہی ہے۔“

اسنے عرصے بعد آج کے من کے سامنے کھل کر بولی دینی بھی کر دل کا بوجھ آج سوا معلوم ہو تا تھا۔

”میری بہن، بہت بھادر بہت ہمت والی ہے۔ تم نے جس صاف دلی اور ثابت قدمی سے یہ محاذ لڑا ہے اللہ تمہیں ضرور اس کا اجر دے گا۔ جو دوسروں کے پردے رکھنا جانتا ہے خدا اسے ہر مشکل سے بچاتا ہے۔“ وردہ نے اس کے دل کا بوجھ کمر کرنے کی بھرپور سعی کی۔

ناعمہ گہری سانس بھر کر بچھے۔ چنے کی بھی۔
پنڈال میں سبھی آگئے تھے اب صرف فراز کے گھر والے باقی بچے تھے۔
ناخن کے مخصوص شے تکلف دوستوں کو انتظامات دیکھنے سے روایت آج اور رافع باشم کو دوسو روپے چھاپی تھا کہ

شہلا کی ہمرای میں انیقا اور ربیعہ آ رہی تھیں۔ رافع نے سوچا کہ وہ مڑ جائے یا وہ ان سے کسے آکر گھر سے باہر

گھر کی خیر کر اس سے کلام کر لے۔ بل ناؤں نے لمحہ بھر میں ہی صورتوں پر غور کیا۔

ربیعہ کا دل اس یوں راہ میں جاں کو دیکھ کر مختلف لے پڑا۔ کاش اس نے نہ ہوتا۔ وہ دیکھ کر بغیر شہلا اور انیقا کے ساتھ سر جھکا کر گزر جائے یا یوں ظاہر کرے جیسے اسے دیکھا ہی نہ تھا یا پھر اس کے پاس خیر کر اس کا حال

پوچھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم، ایک ہی کیفیت کا شکار تھیں۔ ایک ایک دونوں ہی چوکنے تھیں۔ شہلا اور انیقا اپنی

دھن میں بائیں کرتی کب کی آگے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ نے بھانسنے کب اور کیسے وہیں خیر کر گئی تھی۔ دھیر ساری

دوشیزوں اور خوشبوؤں کے ہالے میں بس وہی دونوں ہالیں گھر سے ہو گئے تھیں۔

”آپ۔۔۔“ ربیعہ نے ساختہ ہی گھبرا کر بولی۔

”کپ۔۔۔“ رافع نے چونک کر بے ساختگی سے کہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ پھر دونوں ایک ساتھ بولے تھیں۔

پھر دونوں کو ہی اس عجیب سی صورت حال پر ہنسی آگئی۔

”ہن اور بھائی کی شادی مبارک ہو آپ کو۔“ یہ بولی۔

”شکر ہے۔“ وہ مختصر ”بولی۔

مزید رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ربیعہ سر جھکا کر آتے بڑھ گئی۔ رافع کو کیا کیا یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا بھینسا

اور خوشبوؤں میں اس کے قدموں سے ہندجی تھیں۔ اس کے ساتھ پورا منظر ہی جانے لگا۔

”ربیعہ۔۔۔“ وہ بے ساختہ پکارا۔

ربیعہ کے قدم ٹھم گئے وہ پلٹ کر دیکھنے لگی چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا وہ حضراتیں ہال کی مانند تھیں۔ وہ کسی

سراب کی مانند تھا۔ اس کی نظروں کی وہ دنیا کی صرف اس کے لیے تھی یا سب ہی کے لیے تھی؟ اس کے لبوں کی وہ

مہمان سکرابٹ اس کے دیدار کی عطا بھی باہینہ وہ لب بونی مسکراتے تھے؟

اسنے درمیان ایک متناظر طبعی کشش کے زیراثر دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ دفعتاً زوردار آوازوں کے ساتھ آسمان رنگ برنگ روشنیوں سے جھلکا اٹھا تھا اور ربیعہ اور رافع جیسے کسی طلسم سے آزاد ہو گئے۔ ربیعہ نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا جو بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رافع تیزی سے باہر کی جانب بڑھا تھا۔ یہ فراز کے گھر والوں کی آمد کا اعلان تھا۔

”ای ٹی۔۔۔“ عمار نے نیم پکارا۔

منیقا وہ یکدم کی بند پگھل میں گرزش سی ہو گئی۔ منجانب سے وہ سوئی ہوئی تھیں یا کسی گزشتہ یاد کا عکس ان کی نم پگھلوں پر

لرزاں تھا۔

”جی بی بی! کیسے۔۔۔“ ان کا لہجہ بھی بیگناہ بیگناہ تھا۔

”امیر حسن اور شہناز امیر آئے ہیں۔“ عباد نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔ ”آپ کو ذرا تنگ روم میں لے

چلوں۔“

”ضمیں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولی تھیں۔ ”نہیں۔ میں لے آؤ اپنے ہی بچے ہیں۔“

”جی بی بی۔“ عباد ہر کی جانب پرکھتا تھا۔

انہوں نے امیر حسن اور شہناز امیر کو گلابیں طور پر اسی وقت بلوایا تھا۔ وہ بے باتیں ربیعہ کی غیر موجودگی میں کرنا

چاہتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس پر کسی ایسی بات کا کشاف ہو جو اس کے نازک دل کو مزید تھیں بچانے کا

باعث بنتے۔

شہناز کی ہمرای میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا اور ان کی خیریت

پرمانت کی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، بڑا اللہ تمہیں صحت عطا فرما۔“ نے خوش رکھے۔ ”بھئیو امیر حسن۔۔۔“

”شہناز۔۔۔“ آپ میاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

امیر حسن اور شہناز امیر کی آنکھوں میں عجیب کاغذ بھرا تھا۔ امیر حسن عمار کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ

شہناز ان کے قریب جا بیٹھا۔

منیقا وہ یکدم نے بہت محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بی بی! میں نے آپ کو کون کون پریشان کر دیا؟“

”اتنا چاہتے تھے۔“ وہ بھی بہت محبت بھرے انداز میں بولا۔

”مجھے خوش ہو گئی اگر آپ مجھے ”ای ٹی“ کہو۔“ منیقا وہ یکدم آہستہ سے بولیں۔

”غصوب۔“ شہناز نے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”آپ کو کچھ کر ”ہاں“ کا ہی خیال آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں ”عمار صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ ان سے بہت پیار کرتی ہوں گی۔“

”سب ہی مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔“ منیقا وہ یکدم دیر سے مسکرائیں۔ ”آپ کی ای بھی آپ سے پیار کرتی ہوں گی۔“

شہناز کے چہرے پر لہجہ ہر کے لیے اواسی بکھری تھی۔

”شہری کی محبت۔“ میری کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ ”امیر حسن نے دیر سے بتایا۔

”میری مہمان نے ہم دونوں کی دلچسپی بھال کی۔ میری عمار اور شہری کی مہمانیں ا تھیں۔“

زندگی سے لگتے ہو، زندگی سے ملتے ہو،
ایسی ہی خوشی سے کیا ہر کسی سے ملتے ہو؟
خوابوں سے جی دنیا اک ہمارے آنے سے
روشنی سے لگتے ہو، چاندنی سے ملتے ہو؟

”دوسے افسوس ہوا بیٹے آپ کی والدہ کے بارے میں جان کر۔“ منیزہ بیگم کے چہرے پر کرب کا سایہ لہرایا تھا۔
 ”اور آپ کے والد؟“

”میرے والد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے۔ برسوں پہلے وہ پیشہ کے لیے وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ میرے
 نانا ایک انڈین تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں برطانیہ گئے پھر وہیں کے ہو سب ان کی دینی بنائیں تھیں۔ میری ماما
 پیدا کی طور پر دل کی مریض تھیں۔ ان کے دل میں سوراج تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات میرے بابا احمد جمال زیب
 سے ہوئی۔ جنہوں نے یہ حقیقت جاننے سے بھی کہ ممائی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، ماما کو اپنا رفیق بنایا۔
 نجانے کیوں وہ شروع سے کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی سوراج ہے“ اسی لیے انہوں نے عمامے نہائی کی۔
 حالانکہ یہ غلط ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق ان کا ہارت بالکل پرفیکٹ ہے پھر بھی نجانے کیوں بابا اپنی بات پر اٹل ہیں۔
 انہیں وہم ہے کہ وہ دل کے مریض ہیں۔“

شری راجہ سادگی سے کہہ جا رہا تھا۔ عباد نے ان کی مائیں کی پاکوں پر ستارے سے جھپکنے دیکھے۔
 ”چھپکے چند سالوں سے انکل بیل لڑا رہے۔“ امیر حسن گویا بولا۔ ”وہ صرف اشارے کے لہجہ میں بیان کر سکتے
 ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہے جو اندر ہی اندر انہیں گھلاتا ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی سے کچھ کہا نہیں۔ شیریں
 سے بھی نہیں۔“

”لیکن میں جانتا ہوں بابا کے ماضی کے متعلق۔ مجھے ان کے ایک بہت گہرے دوست سے مت کچھ بتایا ہے۔“
 شری راجہ نے بہت سکون سے کہا پھر اس نے منیزہ بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ عباد نے ان دونوں کو اپنا
 میں لے کر سب ہی کچھ بتایا ہوا تھا اور شری راجہ نے بہت باتوں کی تصدیق بھی کی تھی لیکن منیزہ بیگم کے
 گفتار سے اس کے لیے وہ لوگ دیر سے دیر سے ساری باتیں لکھ رہے تھے۔
 ”کیا سہ کیا بتایا انہوں نے آپ کو؟“ منیزہ بیگم نے پوچھا۔
 ”بابا پاکستان بھی چھوڑ کر گئے تو وہ شری شادی شدہ تھے۔ انہوں نے ایک کریم خان کو مسلمان کر کے
 ان سے شادی کی تھی لیکن بعد میں غلط فہمی کا شکار ہو کر انہوں نے ان خان کو دہائی دوسری بھیجی۔“
 ایک آنسو منیزہ بیگم کی آنکھ سے بہہ کر ان کی گردن کی گھڑیوں میں گھو گیا۔ بہت ضبط سے انہوں نے باقی
 انگلیں گواہی اندر ہی سمیٹ لیا۔

”آپ کے بابا سہ جانتے ہیں۔ کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی؟“ بہت سی آنسو ان کی آنکھوں سے گھونٹے ہوئے
 انہوں نے دیر سے ہرچھوٹا۔
 ”جی ہاں۔“ شری راجہ پورا اعتماد سے بولا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ انہیں غلط فہمی بتائی گئی۔ انہیں اصل رستے
 سے بھٹکا گیا تھا۔ ان سے جھوٹ درجہ جھوٹ بولا گیا تھا اور ایسا کرنے والا کوئی اور نہیں، ان کی اپنی ماں اور بہن
 تھیں۔“

”الحمد للہ۔“ منیزہ بیگم نے زرب کما اور آگئیں بند کر کے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔
 شری راجہ ”امیر حسن اور عباد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کئی بلی پو بھی مکر رہے۔ منیزہ بیگم کی ہند پکوں میں
 جنبش نہ ہوئی۔
 ”اُمی جی۔“ عباد گہرا گیا۔

منیزہ بیگم نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا اور سکون و اطمینان سے مسکرائیں۔ عباد کو یک گونہ تسلی
 ہوئی۔

”ادھر آؤ بیٹے۔ میں آپ کی پیشانی چومنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے شری راجہ کی جانب ہاتھ دے دیا۔ ”وہ فوراً ان
 کی طرف جھکا تھا۔ منیزہ بیگم نے اس کی پیشانی پر محبت سے ہوس دیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

”میں تمہاری ماں ہوں شری راجہ۔ مجھے اپنی ماں سمجھو۔ میں تمہاری بہن کی ماں ہوں۔“
 شری راجہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیا۔
 ”انسان بہت شکر اور جلد باز ہوتا ہے۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”بھئی میں ایک بچی کے چہن جانے پر تڑپ تڑپ
 کر دیتی تھی اور آج میری ممتا کو سب کر کے لیے میری اتنی بیٹیاں اور بیٹے میرے پاس ہیں۔“
 امیر حسن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ منیزہ بیگم نے اسے بھی پکار لیا۔
 ”میری بیٹی بہت اچھا تو ہے۔ گزری ہے۔ خدا نے اسے سب ہی آزمائشوں میں سرخرو کیا۔ اسے سب ہی
 رشتہ عطا کیے۔ اے میرے رب اتیرا شکر ہے۔“
 وہ اپنے سچ سچ کی بیاباں غنائیوں پر شکر گزار تھیں۔

اس نے خود کو کھینک کر طرے پر کھتا ہوا محسوس کیا تھا۔
 اس کے پاس جس جانب ٹائیٹھی اسی کی طرح زرد بیراہن میں بلبوس۔ بائیں جانب ناعہ، تھی جس کا چمکا روپ
 اس کے خوفناک لہجے سے بھی اپنی وہ خنیاں، گھبر رہا تھا اور اس کے عین مقابل صوبے پر بیٹوں کا فرازا ہستادہ
 تھا۔

میروں“ خوبصورت شری والی زینت تھی۔ وہ بہت پر کمند اور پر کشش نظر آ رہا تھا۔ عرشہ کو احساس ہوا، کسی
 نے اسے نگاہیں جھکانے کی ہدایت کی ہے پھر اپنے احساس ہوا کہ وہ جھپکنے لگا۔ کفر فرما کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے
 بہ وقت تمام نظریں جھکا لیں۔

فراز کے گھر والوں نے عین وقت پر نکاح کی اجازت طلب کر لی تھی تاکہ شادی کی تقریب میں وقت بچانے کا
 ہوشیار رہا جائے۔ کسی کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ سو مختصر سے وقت میں اس ضروری کام کو خوش
 حالوں سے سرانجام دیا گیا۔ عباد فرزانہ کی سیکڑہ ہو چکی تھی۔ اس کے دل کی کیا حالت تھی عرشہ کو علم نہ
 تھا لیکن اس کا پائیل کو کھینک کر اندر دھک دیا اور اسے تبدیل ہوا جا رہا تھا۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ اس شری سے
 ہاتھ کے گھونٹ کو آگ لگا کر اسے بھی راکھ بنا دینے لے۔ سامنے بیٹھے مطمئن و خوش خرم فراز کا کہ بیان تار تار
 کر کے اس کے چہرے پر تبخیر سارے اور اسے بے غل غل کر کے لے کر اپنے گھر کے لیے ٹھیک سی گئی۔
 تب ہی نافع اگر فراز کے قریب بیٹھا تھا۔ خلقی مسکائی عرشہ کو بھر کے لیے ٹھیک سی گئی۔ اس نے بہت دنوں

کے بعد اسے دیکھا تھا اور اپنی بالفاظ میں گھٹا تھا۔
 ”بھئی شری راجہ اور عباد کی سہروانی میں گورا چٹا نافع اتنا دیر رہا تھا جیسے آدھی رات کو چاند کے بجائے سورج
 نکل آئے۔ عرشہ کو اپنی نظریں پر اعتبار نہ آیا۔ فراز کے ساتھ بٹھا ہوا نافع وجاہت میں فراز کو بھی بات دے رہا
 تھا۔ وہ چونک اپنی بی بی کی آکر بیٹھا تھا اس لیے اس کے انداز میں فراز کا سا تکلف نہ تھا۔ وہ خوش باش اور بے فکر
 نظر آتا تھا۔

”یہ اجنبی شادی کون کروا رہا ہے؟“ علی نے اسٹیج پر نظر ڈال کر ہچکچاہٹا۔
 ”میں کوئی راضی ہوتا تو کب بھی بیٹھ جائیے۔“ کسی کو نے آواز آئی۔ مزید قہر بلند ہوا۔
 ”مجھے شادی کرنی ہے، راضی کی رفتار میں نہیں لگنا۔ قاضی صاحب نہ ہوں تو فیصلی اسودوالے ہو گئے۔“
 اس کی باتوں پر سب سے کو بخور پر مسکان تھی۔ سوائے عرشہ کے جو لب بھیجے کسی پچھر کے بت کی طرح
 رہیں کروا رہی تھی۔

”ٹھیک طرح سے کھانا۔“ وردہ نے کوسے میں بیٹھ چکے تھے۔ کوہدایت کی تھی۔
 ”یہ کیا؟“ پھر وہ اس کی بیٹھ میں ڈرا سے چاہل اور سلاو دیکھ کر بولی۔ ”کی چیز یا۔ اتنا تکلف نہیں چلے گا۔
 اور حالاً ولایت ہے۔“
 ”مجھ سے نہ رتی ہو گئی۔ وردہ نے اسے دوست پس اور کیا بلا کر دے۔
 ”میں اتنا نہیں کھا سکتی وردہ! رجبہ منت سے بولی۔ ”میں تو تقریباً کچھ کھا چکی ہوں۔“
 ”چلو میں تمہارے ساتھ کھاتی ہوں۔“
 دونوں قریب کی میز پر بیٹھیں۔
 ”مجھ جانے سے پہلے میں ناعہ کو مبارکباد بھی دینا چاہتی ہوں۔ رش میں مجھے موقع نہ مل سکا۔ کائی تیر رنگ
 ہے نا۔“
 ”خاندان بھر سے سب کی کوہد عوام کیا ہے نا پھر دوست احباب۔ ملنے ملانے والے۔ یوں ایک بڑی تقریب
 بن گئی۔“

”کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ تمہارا ساتھ ایک اچھے انسان سے جڑے۔ میں
 چاہتی ہوں۔ میرے انکار سے۔ رافع کو مجھ سے بھی اچھی لڑکی کا ساتھ ملے۔ میرے انکار کا وہ اس خاندان
 کے دل سے مٹ جائے۔ اس لیے میں ایسا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری دوست نہیں ہو رہے۔ کیا تم کسی بھی
 محبت مجھ سے نہیں کر تیں جیسی محبت میں تم سے کرتی ہوں؟“
 ”میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر چاہتی ہوں۔“ رجبہ دھیرے سے مسکرائی۔
 ”پھر انکار مت کرو۔ تمہارے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پلیز۔“
 اس نے اپنے دونوں ہاتھ رجبہ کے پاؤں پر رکھ دیے۔ رجبہ تذبذب اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیسی باتیں کر رہی ہو وردہ۔ اتنا برا فیصلہ میں اس لیے کیسے کر سکتی ہوں۔“
 ”رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔“ وردہ کی مسکان میں کیا تھا۔ رجبہ سمجھ نہ سکی۔
 ”تمہارے خرواؤں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں خود سنیوہ آئی سے بات کروں؟“

رجبہ کا دل اس خیال سے بھی تیز تر جڑنے لگا تھا۔
 ”تمہا پہل ہو گئی ہو وردہ۔“ وہ ہنسنے لگا۔
 ”دوست تو باتہ بکڑ کر کھائی میں چلا آگے گا۔ تم اسے سے پائل بن میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں پھر
 کیسی دوستی؟“
 ”کیسی دوستی ہے کہ میں تمہارے متبصرے شادی کر لوں؟“ رجبہ زنج ہوئی۔
 ”یہ تو میرا سہرا ہے۔ میں نے سوچا ہے۔“ رجبہ نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے کہ اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے کہ اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے۔“
 ”میری آنکھوں میں کوئی ناخوشی نہیں ہے اور میرے دل پر کوئی نام نہیں ہے۔“

”نہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”ہاں رجبہ۔ تمہاؤں مجھے رافع میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔
 ”مجھ نہیں۔ خدا کی قسم۔ کچھ بھی نہیں۔“ رجبہ اسے دیکھنے والے انداز میں بولی تھی۔
 ”پھر تم رافع سے شادی کر لو رجبہ۔“ وردہ اچانک بولی۔
 ”مجھ سے نہ دفعتاً پیٹھ سے ہاتھ پھینک لیا اور خوشو سے ہاتھ پوچھنے لگی۔
 ”دیکھو رجبہ! میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی۔
 ”دیکھو! میں رافع میں اتنی خوبیاں ہیں کہ تمہارے جیسی بیاری لڑکی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ میرا دل
 کہتا ہے۔“ وردہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”میں تمہیں بتا چکی ہوں وردہ۔ میں کسی سے۔“ اس نے کہا۔

”غلط۔ بالکل غلط۔ تم کہیں بھی اگے نہ گئی۔“ وردہ دھوکے سے بولی تھی۔
 رجبہ چند لمحوں کی جانب دیکھتی رہ گئی۔
 ”تمہارا ہی بہت، ابھی ہیں رجبہ۔ تمہاری دل سے قدر کر سکی اور رافع سے۔ وہ تمہیں چاند آلود سے بڑھ کر
 چاہے گا۔ تم ایک مرتبہ ہاں تو کہو۔ تمہارے اور رافع کے ایک ہونے میں کوئی مشکل حاصل نہ ہوگی۔“
 وردہ جذباتی ہو گئی۔
 ”لیکن۔ تم ایسا کیوں چاہتی ہو وردہ؟“ رجبہ نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیسی دوستی ہے کہ میں تمہارے متبصرے شادی کر لوں؟“ رجبہ زنج ہوئی۔
 ”یہ تو میرا سہرا ہے۔ میں نے سوچا ہے۔“ رجبہ نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے کہ اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے کہ اس نے اپنے دل میں اتنا سوچا ہے۔“
 ”میری آنکھوں میں کوئی ناخوشی نہیں ہے اور میرے دل پر کوئی نام نہیں ہے۔“
 رجبہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔
 ”آج اپنے تجلے عروسی میں ایک فراز۔“ وہ اس کی طرف دیکھا۔
 ”یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے اناروں کی روشنی میں رات بھر جانی کی تھیں۔
 یہ وہ لڑکی نہیں ہے جو آپ کے دل دھڑکنے کا سبب بن گئی۔“
 ”یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے اپنے دل دھڑکنے کے لئے۔“
 ”یہ لڑکی اس کی آواز نہ کر سکتی ہے اس کے الفاظ نہ کر سکتی ہے اس جیسا دل نہیں لا سکتی۔
 آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ آپ کی محبت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔
 کہیں اس سے اگلی حرکت نہ ہو۔ محبت کا ثبوت مانگے گا۔ وہ کوئی ثبوت نہ دے پائے گی۔
 ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سہ۔“
 اس نے اپنے لہکے ہوئے سہ کو بار بار پورا پورا فراز کے سوا بل نمبر سنڈ کر دیا۔
 اپنا لکھا ہوا بیسج ڈیلیٹ کر کے اس نے سوا بل کی کم نکال کر الگ رکھ دی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے
 نیچے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر دیکھا تھا۔
 ”ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سہ۔“ اس نے زیر لب کہا۔
 ”عزیز۔“
 ”اپنی آواز نہ دیکھو۔“
 چاقو اس نے واپس گھسے گھسے رکھ دیا۔
 ”میں تمہیں بتا رہی ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہرین فکر مند تھی۔
 ”عشرہ وال کا کہ ایک جانب کہتے ہوئے اچھے کھڑی ہوئی۔ رات کے عین بچ رہے تھے۔

”عزیزہ!“ فردوس تیکہ بے حد محبت سے اسے پکارا تھا۔ وہ بسترِ سعدی میں لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر حقدورِ بختِ بختِ نظر آتی تھی۔ عزیزہ کے پتھر لے جذبات میں منہ کی تیز آنکھ سے پانی کی ہوتی وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔

”عزیزہ!“ انہوں نے اس کا سر ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹی! ہماری غلطیوں کو معاف کر دیا۔“ ان کی آواز میں لرزش تھی اور لمبے لمبے ہنسنے کی جگہ تھوڑے کا احساس۔

”اب بے کوئی غلطی نہیں کی ای۔“ اپنا دوسری جانب سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں کا دوسرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ماں باپ! ابھی بھی جان بوجھ کر اولاد کو دھرنے کا نہیں سوچ سکتے۔ عزیزہ یہ بات تب سمجھے گی جب ماں سے کسی ماں کے لیے پناہ محبت اور بے غرضی کو اس وقت صحیح طور پر پرکھ پائے گی ابھی یہ ناص سوچ رکھتی ہے اس لیے مغالطوں کا شکار ہے۔“

عزیزہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے کسی بھی بات کی تائید یا تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”مقام کے ساتھ بہت خوش رہو گی بیٹی! اب یہ ایک سال کا قیام ہے اور دعا ہے کہ فردوس تیکہ اس کے اندر کے شائے کوئی گنہ گار نہ بنے گی۔“

”انتانتو میں بھی چلی ہوں کہ تم اس رشتے سے سخت ناخوش ہو گئیں۔ یہ تمہارے دادا کا فیصلہ تھا اور باپ بیٹیوں کے مقدور کا فیصلہ صحتِ سوچ سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ انتانتو یقین ہے نا تمہیں کہ تمہارے باپ تم سے بہت پیار کرتے ہیں؟“

”صرف بابا جان ہی نہیں آپ بھی ہم سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ ماہین پھر چھل دی۔ بولی تھیں۔

”ہم سب کو اس بات کا یقین ہے۔ ماں اگر سخت کر بھی رہی ہو تو اس کی محبت میں کسی کی کمی نہیں۔“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔ ”شاید۔ میں نے تم کو کون سے سختی یاد رکھی ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے میرے بچوں کی دل میں تم سب کو بہت جانتی ہوں۔“

”عزیزہ!“ ماہین اس سے مخاطب ہوئی۔ ”اسی کی طبیعت تھیں۔“

خاموشی گھرا۔ وہ نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

”نکل تمہارے اس گھر سے چلے جانے کا خیال! انہیں سنا رہا ہے۔ تمہاری ناخوشی سے یہ خود کو بیمار تصور کر رہی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم انہیں بتا دو کہ تم غصے میں ہو اور خوش نہیں۔“

عزیزہ کے لبوں پر ایک ناخوشی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ماہین نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ابھی اسی کے پاس ہی لیٹ جاؤ کہ تمہاری یہاں موجودی سے ای کو تقویت ملے گی۔“ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نیچے جا کر پڑھ رہی ہوں۔“

”میں سن رہی ہوں۔“ عزیزہ بے چین سی ہو اٹھی۔ ”مجھے شاید یہاں نیند نہ آئے۔“

ماہین نے کمرے سے ہوتے ہوئے تھوڑے بھر کے لیے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ پھر وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم تو بول بھی راتوں کو جاگنے کی دعاؤ ہو۔ ایک رات اپنی ماں کے لیے بھی جاگ اٹھیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”بیٹی! ماہین ٹھیک کہتی ہے۔ ہم میرے پاس ہی لیٹ جاؤ۔ مجھے سکون رہے گا۔“ فردوس تیکہ قدرے لجاجت سے بولی تھیں۔ عزیزہ نے خود کو بے بس محسوس کیا۔

”میں تمہیں فرنگلہ ناز دیتی ہوں۔“ ماہین بولی۔ ”تم سکون سی نیند سو جاؤ گی اور کل فریش بھی لگو گی۔“

عزیزہ باہل ٹھوٹا ہاتھ کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے لیکن ماں اور بہن نے بالوقت اسے مجبور سا کر دیا تھا۔

اس نے پھر بے چینی سے کمرٹ بدل چھی۔ کمرٹیں بدل بدل کر اس کے اعصاب جھنجھلا اٹھے۔ نیند کسی بے مروت کی مانند روکی ہوئی تھی۔ اس نے رات بھر مسلسل منقطع کر دیا۔

شمالا بالآخر گھر کی پیٹھ کی۔ سارے دن کی تھکاوٹ والی مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن ذرا سی تھکن محسوس نہ کر رہا تھا۔ ایک اچھے کے فاصلے پر سوتے ہوئے ہاتھ کی سانپوں کا زہریم سے بار بار اپنی جانب متوجہ کر آتا تھا۔

شمالا نے ہاتھ پر ہاتھ کر اپنی جانب کا سانپا لپ روٹھ کر دیا۔ کمرے میں بجلی دودھیا روٹھنے نے ماحول کو عجیب سحر سے ڈھلے ڈھالے کر ڈال دیا تھا۔ ”جس کو تو سمجھا ہے؟“ اس کے اندر دھوکا دیا سی ہوئی۔ ”نیند کیوں نہیں آتی؟“

”نیند ہوتی؟“ چہن یوں نہیں ملتا؟ اس کی لیے اعتنائی۔ دل سے۔۔۔ ٹھوکیوں نہیں ہوتی ہے؟“

وہ اپنی جگہ سے ذرا اٹھ کھڑی ہو کر باہر نکل گئی۔ فاصلہ ہاتھ بھر سے سٹ کر دو باشت کا رہ گیا۔ باہر دھیرے سے سردھا ہوا تھا۔ شمالا کھل دھڑکا لیکن وہ پھر نیند میں تھا۔ ایک لمبے عرصے سے وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان میں دو اجنبیوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ دو نہایت شائستہ اور مہربان اجنبیوں کی مانند۔ جنہیں شکایت نہ تھی۔ وہ نہ گھٹے نہ بڑے، نہ فاضل نہ حقیر، نہ عمر گزار دینے کے حوصلے کے ساتھ۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔

”تم از کر شمالا کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا، ریف۔“ میں بیل رکھے ہوئے وہ چند ہیرو کتھی ہی بار ذہن کے پردے پر پھرے تھے پھر ایک موبہم سانس میں اسے کہتا تھا کہ ایسا چھٹا ہوا تاؤ تاب تک ہو چکا ہو۔ تہذیب انتہائی طویل نہیں ہو کر بہت محبت ایسی بھی مکرور نہیں ہوتی۔

”ایک بار اس سے پوچھ لو کہ اس انداز سے کہ صداقت سے کہنا واسطہ ہے؟ پوچھ تو سہی۔“ شمالا پھر ذرا سا سر کی تھکی۔ اب کے فاصلہ محبت باشت بھر کا رہ گیا تھا جسے باہر کی ایک کمرٹ نے پٹا دیا۔ دوسرے ہی گئے وہ جاگ اٹھا تھا۔

چند دنوں سے وہ اپنے بیٹنی اور حیرانی سے ان ستارہ آنکھوں کو اپنے قریب دیکھ کر کھتا پھر اپنے بازو کے نیچے اس کے سر کے نیچے سے بالوں کو محسوس کر کے وہ بولیں اٹھ بیٹھی تھیں اسے گرفت لگا ہو۔ شمالا جس کی عقب میں۔۔۔ بعد ازاں اس کی گھڑی کر بیٹھی تھی۔

”سو نہیں کیوں نہیں؟“ ہاتھ نے گھڑی کی جانب نگاہ کر کے جو بھل آواز میں پوچھا۔

”نیند نہیں آتی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“

جواب میں جو خاموشی تھی اس کی ملک سے ہاتھ نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے۔ اس نے ہر دوں مودور دیکھا۔ اس کا گلاب چہرہ اس کے شانے کے بالکل قریب تھا۔ ان آنکھوں کی سطح صاف ادھر تھی۔ ہاتھ کاٹی چلا آواز اس کی سے اپنی پوری ہستی کو سرب کر لے۔

”ہاتھ!“ شمالا کے لب دھیرے سے کانپے۔

رشتے کے تحت ہونا چاہیے۔ کیا یہ تعلق خاطر شادی سے پہلے قائم ہونا ایسا ہی ضروری ہے کہ اس کے نہ ہونے سے برسوں پرانی منگنی کو ٹوڑنا جاسکتا ہے کیا وہ روج چولہا دہی ہے؟“

اچھی سوچوں سے بے چین اور مضطرب ہو کر وہ چلتی چلی پھر وہیں قہقہہ کر رہ گئی۔ سامنے والے درخت کے تنے کے ٹیک لگائے دلائیلا ہاتھ تیرے پر باندھ کر ارفع نے بجائے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اوسے“ زبیر کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا تھا۔

”سزاں بھتیجی؟“ وہ مسکرایا۔

”جی ہاں۔“ زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دافع اس کے ساتھ ساتھ ہی طے کا مختار رہے۔ قدم اٹھانا دشوار ہونے لگا۔ ابھی چند لمحوں قبل وہ جس طرح کی سوچوں کا شکار تھی، اس کے فوراً بعد رافع کا سامنا ہو جاتا ہے۔ یہاں کرکے رہا تھا۔

”میں بہت کمزور ہو گیا اب کہاں۔“ رافع نے گروہل موز کر کے دیکھا۔

”میں بہت کمزور ہو گیا اب کہاں۔“ رافع نے گروہل موز کر کے دیکھا۔

”میں بہت کمزور ہو گیا اب کہاں۔“ رافع نے گروہل موز کر کے دیکھا۔

”ہوں تب ہی مجھے روزِ روز کوئی ہلکی سی ”دھجی“ ہوتے سے بولا۔
 راجہ کے قدمِ ست ہونے لگے۔ ہر قدم کو دیا نہیں تیزی سے دھسا چاہتی تھی۔
 ”رہیجے!“ ایک بار راجہ کا تھا۔ ”آپ مجھے شادی کریں گی؟“
 راجہ شہزادہ رہی۔ یوں اچانک سربراہِ اساتذہ اس کی ایسا مشکل سوال پوچھ لے گا اس کے گمان میں
 بھی نہ تھا۔ گئے روزِ رختوں کے سامنے اس نے آواز دھجائی کہ ”آپ مجھے شادی کریں گی؟“
 راجہ راجہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ ”مگر آپ نے کہا تھا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔“
 ”آپ نے صرف میرا نام لیا۔ راجہ آپ نے اس کا نام نہیں کہا۔ آپ کی بیوی ہیں۔ جانی ہیں کیوں؟ کیونکہ
 بے اختیار ہی میں انسان کے لبوں سے سچ نکلتا ہے۔“ اس نے بازو بائیں ہاتھ میں آپ نے دور سے جو بوجھ کھانا ہوتا تھا۔
 ”نجانے دور دورہ کونسا نے کے لیے تھاپا ہے۔“ راجہ نے اس پر تھپتھپا کر کہا۔ ”نہیں میں کیا۔“

”مجھے اس سے کچھ ناگوار لگتا تھا؟ رشتے زبردستی باندھے نہیں جاتے ربیحہ! تو زبردستی توڑے بھی نہیں جاسکتے۔ ان کی خوبی یا خرابی کا تعین ہی نہیں ہوتے۔ کچھ رشتے صرف انہوں کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی غرض کوئی کھوٹ کوئی راسخ نہیں ہوتا۔“

”پیرے اور آپ کے درمیان کیا ہے رافع؟“

”اب تک وہ تھوڑے کھنکھاسے ایک احساس تھا زنجیر! جس کے رنگ بدل چکے تھے۔ لیکن اب اس احساس کو نہیں بتا سکتے کہ کافور ہے اگر تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو۔“ وہ قہر سے رات بے رات بے مل کر کے اس کی آنکھوں میں جمنا دیکھ کر زنجیر نے سر ہٹا لیا۔

”یہ احساس میں خود تک محدود رکھنے کا پابند تھا۔ لیکن اگر وہ اس قسم کے کامیاب ہو کر کا اعلان کرے مجھے اس بند زنجیر سے آزادی نہیں دی ہے اس کا گناہ ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

ہاشم کا ذہن ان آوازوں کی شدت سے کھینچنے لگا۔ دھک لہو لہو تیرے بڑے بھی تھی۔ ہاشم کا شخص اتنا تیر ہوا کہ تم کمرے جاؤ گے کہ ہمارے میں بہتی شلالے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔

”ہاشم! کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر پوچھی۔

”میں سونا چاہتا ہوں کہ“ ہاشم نے اپنے بے ہوش چہرے پر ایک دھک لگا کر کہا۔

”ہوں“۔ انکسٹ میں گھبرا کر وہ اپنی جگہ پر ہوش ہو گئی۔

ہاشم نے لیف کراس کی جانب پلٹ کر لی تھی۔ شملہ کا دماغ بالکل سون ہو چکا۔ کھلی آنکھوں سے پچھلے کو گھورتے ہوئے اس نے بغیر رات تمام کی تھی۔

صبح بے حد خوبصورت اور معطر معطر تھی۔ اے بوئے خوش ریلے! جس کرا آئی صاف تھری ہو اسے لطف اندوز ہوئے ہوئے خراماں خراماں بہت کچھ سوتی ہوئی بلبل جاری تھی۔

”تم ایک بار ”ہاں“ تو کہو۔ یہ اُراغِ خمیس چاندیوں کے برہہ کر چاہے گا۔ رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جائے۔ یہ رعبہ اتھم کر رہے ”ہاں“ تو کہو۔“

رعبہ کے دل کو یہ احساس جان فزا کہ کرائے کا تھا۔ اس نے دوش گانے اٹھ کر کھیلنا شروع کر دیں۔ اے بوئے خوش ریلے!

اور آہستہ سے فہم دی۔

”تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا“ میں خوشنود ہونے کی بات کر دیں گا۔“ وردہ جیسے اس کے کان میں بولی تھی۔ یہ رعبہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہوا جائے گا۔“

اس نے اپنے گل کمر ہوئے محسوس کیے اور انہیں پھیلے ہوں سے چھو کر دیکھا۔

”مکمل درود!۔“ مجرورہ گرد کے پھیلے ہوئے درخت کے چوڑے سے پتہ نکال کر حیران کی طرح ہونچنے پر مجبور ہوئی۔

”درود ایسا کیل جانتی ہے؟ اپنی قسمت کی زلفوں میں ساجا خوبصورت چٹکاتا رہ تو ذکر وہ میرے بالوں میں لٹکا چاہتی ہے۔ کیوں؟“ رعبہ سوچنے لگی۔

”وجہ کچھ بھی ہو، گناٹے پر، گرد میں رافغ سے شادی نہیں کر سکتی۔“ درون کی آواز پھر آتی تھی۔

”وجہ کچھ بھی ہو، ہٹلا کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا درود کسی اور سے..... نہیں بھلا ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایسا ہو تا درود مجھ سے کیوں چھائی؟“

”نہیں۔“ وہ بے چین ہو اٹھی۔ ”تمہیں لے کر چھوڑنا نہیں۔ تمہارے لیے بھلا میرے پاس تھا ہی کیا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ سے کچھ جیسا رہے۔ وہ کون سی بات کرے کہ وہ رافع سے شادی کرے۔ تمہیں گریباں ہے؟ کیا مصلحتی اس کی بات کر گزن ہوئے کہ تمہارے رافع سے اس کا وہ لعلی استعوا ارنہ ہو سکا جو ان دونوں کے امین قائم

پھر ایک دوسرے کو کھد کر مسکرا دی۔

”خیر، یہ دورہ کی دوست ہو، اس لیے تم سے کہہ گئی یہ سب کچھ۔۔۔ ورنہ وہ نہ تو اس ایڈیٹور بات کرنے پر بین لگایا ہوا ہے لیکن تم ہی کو رہیہ! اپنی پرانی بٹنیوں بیک جنبش ابو خشم کی جاسکتی ہیں؟ خشم کی جالی چاہیں؟ لڑکوں کا کیا ہے۔ وہ تو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہیں۔ تم سے کہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر رشتے ٹوٹ جایا کرتے ہیں؟ ورنہ تمہاری دوست ہے۔ اگر تم اسے سمجھاؤ کہ وہ ابھی کھڑی ہوئی۔“

”اور ابھی بھی شاید تمہارا کامناں لے۔۔۔ اصل ایسی بہت پریشان ہیں۔“ وہ آگے بڑھے گئی تھی۔ رہیہ کچھ دیر بائبل بے حسن و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ حرکت کرنا چاہے گی بھی تو کرن پائے گی۔ پھر اس نے بروقت میز پر دھر اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے گال پر رکھا۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ پھر اسے لگا وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے والی ہے۔ اسے لگا وہ ابھی اتنے ڈیڑھ سارے لوگوں کی موجودگی میں زور زور سے رونے لگ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنا دیش اس نے سر پر لیا اور اڑھا کہ اس کا آدھا چہرہ ڈھک گیا۔ پھر وہ بیٹھ کر تیزی سے لوگوں کے درمیان سے نکل بیٹھی گئی۔



عباد اور انقیہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی سے اترے۔ تینے مرکز کی دروازہ انہیں کھلائی ملا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج میں بیٹھی مسند و نیم کو کھد کر دیوڑوں سے نکلے۔

”کی! وہ رہیہ۔۔۔ عباد نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔“

”دوسری ہے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔

وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”موسری ہے؟“ پھر عباد نے نہایت حیرانی سے کہا تھا۔ ”وہ ایسے کے ساتھ آئی ہے؟“

”جیسی لے کر آئی تھی۔ اس کے سر میں بہت خوف و وحشت ہو گیا تھا۔ تم دونوں کی تقریب خراب نہ ہو“ اس خیال سے وہ جیسی نے کمر کھینچ کر اٹھ بیٹھ گیا۔ اب بیٹھ کھا کر سو گئی ہے۔“

”لیکن، لیکن وہ کم از کم مجھے کتا تو جانی۔“ عباد کو بیک غصہ چڑھا تھا۔ ”میں اتنا پریشان ہوا اسے کیسے نہ پا کر میں اور انقیہ اسے ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا۔“ عباد نے کہا۔ ”میں دوڑوں کھانا تک پہنچاؤں۔“ وہ گلاؤ آئی کاٹ لیو کہ رہیہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتی ہے۔“

”چند روز نہ بھاگی۔“ وہ بے چاری عباد خیال کر کے ہی ہمیں بتاتا ہے جلی آئی اس نے سوچا ہوگا، ہم لوگ کھانا کھا کر گھر آئے۔“

گھر فون کر کے پتا کر لیں گے، ہمیں بھی تو گھبراہٹ میں اتنا دھیان نہیں رہا۔ ابی سے فون پر کفر ہم کریتے تو اتنی پریشانی اٹھان نہ پڑتی۔“

انقیہ نے رہیہ کی طرف دوا دی کرتے ہوئے عباد کو ٹھنڈا کیا۔

”میں کھانا کاتی ہوں۔ آپ پیچ کر لیں!“

”رہیہ؟ اس نے کھانا کھایا؟“ عباد نے بے چین ہو کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ آ نکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے جسے وہ رستہ بھر دیتی آئی ہو۔“

”لیکن، لیکن وہ کتنے تیرے اداسی سے بولیں۔“

”لیکن کیوں؟ اسے کسی نے کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے ساتھ مس بی ہو تو نہیں کیا؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے عباد بھائی!“

رہیہ کی آواز پر وہ سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”میں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میرے سر میں اچانک ہی درد اٹھا تھا۔ میں آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہی تھی۔“

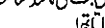
رہیہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دوپٹہ نماز بجنے کے انداز میں چہرے کے گرد دیکھا ہوا تھا۔ شاید وہ نماز پڑھ کر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں لیکن چہرہ اور انداز بالکل پرسکون تھا۔

عباد اور انقیہ اس کے قریب جا کر جیسے اپنا اطمینان کرنے لگے تھے۔ انقیہ نے اس کا سراپے کاغذ سے لے لیا۔

”سچ رہیہ۔۔۔ نجانے کیوں ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے!“

رہیہ کے اندر سے ایک سسکی کی نکل گئی اس نے خوب قابو پایا۔

”میں کھانا کاتی ہوں۔ پھر ہم سب مل کر شادی کی دعوت کا نمونہ لیتے ہیں۔“ انقیہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔



نہایت خواب ناک اور مسکراتی ہوئی دل سے کسی بہت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ پورے دو درمیں ایک پائیل دل تھا جو خاموش ہوئے پر راضی نہ تھا اور شور مچاتے پھرتے تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلی کی آواز آئی تو کچھ بھرے گئے پائیل دل بھی سسم کر خاموش سا ہوا پھر سوچ سوچ کر دھڑکنے لگا وہ آہستہ سے چلتے ہوئے قریب آ بیٹھا تھا۔

پائیل دل نے ڈرتے ڈرتے پائیل دل کو اٹھایا اور پوچھا، ”کیا ابھی میرا؟“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

پائیل دل نے جواب دیا، ”نہیں، ابھی نہیں۔“

”تمہاری ایک بائبل کرن کے ساتھ کچھ عرصہ بائبل کرتا رہا۔ ذہن میں تمہارا تصور باندھے۔ بخدا ناعمہ! میں نے اس سے تمہارے دھوکے میں بائبل کی۔ یہ واقعہ خطا ہے۔ سرگز ہوئی مجھ سے۔ اس سے قطع نظر میں نے بھی تمہارے علاوہ کسی کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں اس تعلق کے منتقل ہونے پر اپنی شدت سے رد عمل ظاہر کرنا چاہتا تھا خدا بھلا کرے فری کا جس نے تم دونوں کی منگولوں کی شہادت سب احوال سنایا۔ ورنہ ”دوسرے ہم اڑھائی اور خود سری سے خود کو دینی لڑکی ظاہر کر رہی اور اپنی اور میری عمر کو ضائع کر دیا۔ تمہاری فروری میں زہد کسی کے بد وقت کا بھی اضافہ نہ کرنا ہوں۔“

”فروری نے آپ کو کیا۔ آپ سب جانتے ہیں؟“ ناعمہ نے خود کو بڑی بڑی زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد محسوس کیا۔

”شکر ہے خدا کا جس نے پردے ہٹائے۔“ وہ سوراہا بولا تھا۔

”آپ سب کچھ جانتے ہو مجھے بھی بتائیے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”نہیں، یہ حقیقت جان لینے کے بعد میں نے بھی تمہیں پریشان نہیں کیا۔“ اس نے محنت سے اس کا ہاتھ تھما تھا۔

”آپ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ اتنا بڑا جھوٹ بولے؟“ ناعمہ کی آنکھیں پھلنے لگی تھیں۔

”اس جھوٹ کے پیچھے تمہارے جو احساسات و جذبات پوشیدہ تھے ناعمہ! انہوں نے مجھے تمہارے دام غلام بنا ڈالا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جو تمہارے جیسی بائبل نظر اور ایسا پسند لڑکی میری شریک حیات بنی ہے۔ اور معافی تو میں تم سے طلب کرتا ہوں۔ بے پردہ کر کے ایک قافلے میں سے بننے کا ایک خراب و خطرناک حرکت کی ہے چند لمحوں کی نشاط انگیزی ساری عمر کے لوگوں سے شرمسار کر کے۔“

”ناعمہ! تم سب سے۔“

”عزیز!“ ناعمہ نے جھڑپ سے بولی تھی۔ ”اس کا پکا پکڑا پتہ ہے، یہ فرما رہے۔“

”میں جانتا ہوں ناعمہ۔ لیکن وقت ہی ایسا ہے کہ پھر ان کا دھوکا دے کر آپ نئی زندگی کی شروعات اسے بھی بدل ڈالیں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”اے عزیز! کہو خطرناک انداز زیادہ کرنا تھا۔ اے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرزانے اس کا چہرہ اپنی جانب کیا تھا۔

”عزیز! کہہ رہے ہیں سوچ رہی ہوں میں نہیں فیض اس کا سکڑا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں!“

”ایسا ہی ہوگا۔“ فرزانے اس کی طرف سے بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”لیکن میں۔۔۔ ابھی تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ناعمہ اس کے بعد لے انداز پر جو گئی، سنبھلی پھوٹھرے سے مسکرا دی۔

”میں تو سوچے بیٹھی تھی کہ آپ میرے آنسوؤں کے سوا کچھ دیکھنے کے متحمل نہ ہوں گے!“ فرزانے دھیرے سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ ”آپ آہستہ سے دہلایا اور مضبوط کیے میں کہا۔

”ہم اس بل سے۔۔۔ ایک بائبل نئی زندگی کا آغاز کریں گے ناعمہ! ہمارے درمیان بچھلا کوئی حوالہ کبھی نہیں آئے گا بچھلی کوئی بھی بات کوئی کچھ کوئی گھوٹ کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہارا دامن تمہاری طرف جاک اور صاف ہے لیکن مجھ سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں اسی لیے میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہوں۔“

”آپ نے ہمارے درمیان کی تیرے فرد کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی میں اور تم سب کی ہونا ہے۔ ٹھیک ہے نا!“

ناعمہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ خود کو بے حد آزاد پکا پکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ نیک نیتی کے شر کے چار جانب بکھڑے ہوئے تھے۔ اس کا دل ”بار“ اور ”برج“ آسودگی اور سیرانی کی انتہا کو محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لمحوں میں بھی اس نے کچھ سے عزیز اور نافع خیال خوشگوار زندگی کی ابتداء کی دعا کی تھی۔



لباس تبدیل کر کے کچھ رنگ ملکہ سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو شملہ کو دوسرے حیرت سی بولی۔ ”اسم اور نافع کو داناں ہو کر محفل چمکے ہوئے تھے۔ کھرکے برف آواز بھی سننے لگے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عیش و عشرت کا عمل ایسا ہی تھا کہ دینے والا اعضاء ملن محسوس ہوا تھا۔

”اس نے رات کے دو بجائے کھڑی کو کھارو برہ کر دیا نہ کھولا۔ اسے حیرت کا بھوکا لگا تھا۔

”نافع!“ پوری آنکھیں کھول کر اس نے نافع کو کیا۔ ”تم یہاں اس وقت؟“

”نافع نے اپنے کھانے کی کٹائی بائیں کمرے پر چڑھا ہوا انداز غلبت میں۔ میں لے جانے لگا۔

”نافع!“ شملہ نے کہا تھا۔

”شملہ! خدا رحمتی! خاتون! میں۔۔۔ اس نے سرگوشی کی تھی۔

”شملہ! کسی غیر معمولی احساس نے تیرا دل بوجھتی تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔ نافع اسے لان کے بجائے گھر کی بجلی لگی کی جانب لے گیا تھا جہاں کاسی آپ کی آنکھیں اور اکثر کمروں کے باہر کی جانب کھلنے والے دروازے تھے نافع کے کمرے کا بھی ایک دروازہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

”دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے اس کے کمرے پر پہنچے تھے۔ شملہ اس دوران چشمِ قصور سے نبانے کیا کچھ دیکھ چکی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ کھانا کھا رہا ہے تو کھانا کھا رہا ہے۔

”کیا کھانا کھا رہا ہے؟“ شملہ نے اس کے کمرے کے اندر سے پوچھا۔

”شاید کوئی کھانا کھا رہا ہے۔“ نافع نے اس کی توجہ خالی عیش کی جانب مبذول کرائی۔

”وہ کھانا کھا رہا ہے یا نہیں؟“ شملہ نے اس کے اعضاء جواب دے رہے تھے۔

”بھلا! کیا بات اس کمرے سے باہر نکالنا تو ساری عمر کسی نے نظر میں پایا تو کھانا۔“ وہ غصے سے بولا تھا۔

”تم نے کچھ نہیں کیا نافع! شملہ نے اس کی طرف سے۔

”شاید۔۔۔ کسی غیر معمولی احساس نے میں نے اسی سے کہا تھا۔“ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

”کیا کھانا کھا رہا ہے؟“ فرزانے اس کی طرف سے پوچھا۔

”نہیں اس وقت کہاں جا رہے؟“ وہ ہراساں ہوا۔ ”یہ تو بولیں کیسے ہے!“

”ڈونٹ روٹی۔ میرے پوتے روٹی اور کھانا۔“ ان ہی کے کلک لے کر چلتے ہیں اسے۔ جلدی کو نافع دقت ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔“

نافع نے سب سے پہلے عیش کو کانٹے پر ڈال دیا۔ شملہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

صح صاف ہو چلی تھی۔ شملہ بے حد تھکے تھکے تھے۔ انداز میں نافع کے سامنے آ بیٹھی۔ چہرے پر عمدیوں کی تھکن لیے بیٹھا نافع کو کچھ آنکھیں سننے لگا۔

”اسے کمرے میں شغف کر دیا گیا ہے۔ تم اسے دیکھ سکتے ہو۔ ویسے ابھی ہوش تو نہیں آیا۔ لیکن خطرے سے باہر ہے۔“ شملہ آہستگی سے بولی تھی۔

نافع نے چند لمحے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ شملہ کی اہرائی میں وہ بے ہوش 'بے سدھ پڑی عریشہ کے پاس جا کر گھٹا۔

"کچھ درمیں ہوش آجائے گا۔" شملہ نے تسلی دہی تھی۔
نافع نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ ایک گہری سانس ضرور اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ ایک نرس ٹرے میں چائے کے دو کپ لیے چلی آئی۔

"ڈاکٹر خالد کہہ رہے ہیں، وہ کچھ درمیں آتے ہیں۔ آپ لوگ تب تک چائے پیئیں۔" اس نے چیرہ دراز نہ سکرانہ کے ساتھ امین اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں نے گرم گرم چائے کی شدید طلب کو محسوس کرتے ہوئے کپ اٹھا لیے تھے۔ ایک کھوٹ بھر کر شملہ نے کھجوتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کھمرو! انوں سے کیا کہنا ہے؟"
جواب میں نافع نے سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں۔

"فؤاد پوڑنگ۔" شملہ خود کو سارا دینے لے کے کھنکھارنے لگی۔
"فؤاد پوڑنگ؟" فؤاد پوڑنگ ہونے سے عریشہ پر کوہ رات بیگے۔
طبیعت خراب ہوئی تو ہم اسے یہاں لے آئے۔ ٹھیک ہے نا؟
"ہوں!" وہ آہستگی سے بولا۔

"تمہیں تم پریشان مت ہو نافع۔" شملہ نے اسے تسلی دینا چاہی، یہ دیکھ کر وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس وقت اس کے دکھ اور شدید غم کے لیے نفع کا دروازہ بن سکیں۔
"عریشہ عرشہ اچھی لڑکی ہے۔ اسے تھوڑی سی توجہ۔ تھوڑی سی محبت ملے گی تو۔۔۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

نافع نے بے تاثر سیات نظروں سے شملہ کی جانب دیکھا پھر چپ چاپ رہ گیا۔
"اور پھر۔۔۔ تم ہی۔۔۔ اس سرپرستی لڑکی کا پڑا ہوا نافع۔" شملہ نے تسلی دینا چاہی، یہ دیکھ کر وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس وقت اس کے دکھ اور شدید غم کے لیے نفع کا دروازہ بن سکیں۔
"عریشہ عرشہ اچھی لڑکی ہے۔ اسے تھوڑی سی توجہ۔ تھوڑی سی محبت ملے گی تو۔۔۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بے فکر رہیں شملہ بھائی!" نافع نے کپ خالی کر کے میز پر ڈکھار دیا۔ "ہمارے گھر انے الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ایک خاندان کا حصہ ہیں۔ عریشہ صرف آپ کی سیر کر رہی ہے۔" عریشہ نے بھی عزت سے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کی تمام تر بے اعتنائی۔۔۔ بے توجہی اور بے نیازگی کے باوجود میں اس کے لیے محبت بھی کر رہا ہوں۔ وہ محبت جو نکاح کے پاک لبوں سے دو دلوں کے درمیان خود بخود نہرے کی مانند آگ آتی ہے۔ اس کا دل اگر خبردار تو شاید میری ناکامی ہے۔ میں اپنا قصور تسلیم کر رہا ہوں۔"

شملہ نے بہت محبت سے اس کے کانوں پر ہاتھ رکھا۔
"بہت کم لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں نافع۔ ایسے وسیع القلب۔ اتنے باظرف۔ جیسے ٹھاٹھیں بارتا دیرا ہو۔ تم کا وہ ہونہی نہیں سکتے۔ ایسا دریا تو عجز میں پھول کھلا سکتا ہے۔ پورے کا پورا ایک ذاب۔ کھڑا بنا سکتا ہے میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ ایسے ہی رہو۔ اسے نشانہ دل۔ ایسے ہی مہمان۔ باوصف۔ خدا تمہیں ہر موڑ پر سرفراز کرے۔"

شملہ کے الفاظ جاوہر اثر تھے۔ نافع کے چہرے پر بکھری اداسی اور آنکھوں میں سی تھمائی کی جگہ بشارت اور سکون نے لپیٹی۔

"تھنک یو بھائی!" وہ ممنونیت سے بولا۔
"یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو ہم اسے گھر لے چلتے ہیں۔ اگلی ڈرپ میں اسے گھر پر ہی لگا دوں گی۔"

آج رات ٹائمہ کا دل سے۔ کل ناعملہ کا۔۔۔ برسوں تمہارے دینے تک میں اسے بالکل فریش کر دوں گی۔" شملہ نے لمبے لمبے سے ٹکری اور بشارت پیدا کرتے ہوئے اسے مزید ریٹیکس کرنا چاہا۔ عریشہ کی بند پاجوں کو دیکھتے ہوئے نافع نے سر ہلایا تھا۔

ازحد تھکے ہوئے انداز میں وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، یہی تھی کہ کمال پر رننے والے زنانے وار تھوڑے سے چند لمحوں کے لیے مائل سا کر دیا۔ اسے دیکھنے میں دشواری سی ہوئی۔ پچھلے دنوں کی بے تحاشا مصروفیت کے بعد رات بھر کی تھکان نے اسے بہت برا حال کر ڈالا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا۔

"آٹھرا!" پھر اس کے لبوں سے نہایت حیرت اور افسوس کے ساتھ نکلا تھا۔ "آپ نے مجھ پر ہاتھ آٹھرا! میں سر کیلے ہر دشت کا جنگل لیے وہ چرو باٹم کا چوہہ تھا۔ اس کے بال کچھ بے ہوش تھے اور سانس لینے پر تھیں۔"

"الہامک! اس بار بھی قضا کا تھمنا۔" اس کے لیے آپ سب سے معذرت۔ ان شاء اللہ آئندہ وہ "تربیک زار تھمنا" کی آخری قسط شائع ہوگی۔

Urdu Photo.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ ستاروں کا آنگن، نسیم محترقیشی قیمت: 400 روپے
- ☆ ایمان امین اور محبت، عمیرہ احمد قیمت: 200 روپے
- ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین قیمت: 350 روپے
- ☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 180 روپے
- ☆ امرتیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

خوبصورت عروسی
خوبصورت پہناو
منسوجات جلد
آفتاب چتر

شائع ہو گئے ہیں

منکوانے کا پتہ: ملکیت، عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

”رات بھر اپنے بندہ دم سے باہر رہنے والی بیوی اپنے شوہر سے کیا توقع کرتی ہے شہلا؟“ وہ پھرے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ ”وہ نہیں ساقم تھا جہاں سے تمہاری آواز کا نشانہ بھی محال تھا؟“ شہلا ششدر رہ گئی۔ پچھلی پچھلی آنکھوں سے وہ دیکھنے لگی۔

”کہاں گئی تھیں؟“ اس نے دانت پیچے۔ ”جواب دیجئے۔ ابھی وہ بیچہ زمیں نے سانس نہیں کیے ہیں شہلا احمر! جس کو لے کر تم آزاد ہو جانے کی خوشی میں سب ہی کچھ فراموش کر گئے۔“

اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ شہلا کسی زخمی شہینی کی طرح اس پر جھینپتی تھی۔ ہاشم اس کے تجھروں کی پوچھا۔ ”گھبرا گیا۔“

”کیا سمجھتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو؟ آواز۔۔۔ بد کردار ہوں میں؟“ شہلا کزور جانا تم نے مجھے۔ بس انتہائی کچھ پائے۔ یہ تھا تمہاری کھوکھلی محبت کا عوا“۔ دو دیوانی ہونے لگی تھی۔

”شہلا۔۔۔ شہلا بھلا کھل ہو گئی ہو۔“ ہاشم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

شہلا اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ چھڑا کر اس نے نشن اٹھا کر اسے پار لٹھا۔

”تم سے محبت چاہتی رہی میں۔ تم سے۔ تمہارے جیسے کمزور ذات کے انسان سے۔ جو رات بھر بندہ دم سے باہر رہنے کو لانا۔ بیوی کی بد چلتی کاروائی ہے ہاشم! شہلا! دل کل بھٹکا۔“

ہاشم اس پچھلی شہینی کو سنبھالنے کی کوشش میں بندہ دم اور لپٹا رہا۔ ہوشیاری ہوئی شہلا اس کے سینے پر آ گئی۔

”عریشہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ شہلا کھوکھلی ہو گئی تھی۔ ”مجھے اور نایاب کو احاطہ کیا ہے اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ میرا سب کچھ جلد بازی میں کمرے میں ہی رہ گیا۔ ابھی میں عرشہ کو اس کے کمرے تک پہنچا کر آ رہی ہوں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہاشم۔ کہ آپ بھی اپنے بے اعتبار ہو سکتے ہیں۔“ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سینے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔“

رات بھر اپنے اعصاب سے جنگ لڑتا ہاشم شل ہو چکا تھا۔ شہلا کے کردار اپنے بازوؤں کو پھینکے ہوئے وہ سمجھتا تھا کہ انداز میں سانسیں بھر رہے لگا تھا۔

”شہلا! شہلا! مجھے معاف کر دو۔ زندگی لگا ہوں کے سامنے روٹھ کر جاری ہو تو بڑے بڑا دی ہوش بھی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی تمہارے جانے کے تصور سے ہی دیوانہ ہو گیا۔“

”میں تم سے دور رہ کر نہیں بیٹھا ہوں گا۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس لاوے کے بہہ نکلنے کی وہ کب سے منتظر تھی۔

”اور وہ بیچہ۔۔۔ وہ کس بات کا اعتراف ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”میں محبت کا؟“ ہاشم پوچھ رہا تھا۔

”نظروں میں دیکھتا رہا پھر اس نے انگلی کی پورے اس کے آسپو پچھے۔

”کہاں گئے وہ بیچہ؟“ وہ تم نے ہی اٹھائے ہیں؟“

”جلا دیے تھے میں نے۔“ وہ گھڑکیر لیے میں بولی۔ ”ان کا خوف مجھے رات کو سونے نہیں دیتا تھا؟“

ہاشم نے ساختہ ساختہ ہاشم اس کی شفاف ہنسی میں زندگی کی بھرپور حرارت کی اٹھنے کا مکمل احساس تھا۔

”مرد شکر۔“ وہ ہنسنے بولا۔

”نہیں دینا چاہتے تھے مجھے یہ سرا؟“ شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں اب تک شکایت تھی۔ بے چینی تھی۔

”شہلا! شہلا! میں گمراہ کیا گیا تھا۔ لیکن آج تمہارے اس انداز نے بدگمانی کا ذرہ ذرہ میرے دل کی حوس سے پھونک ڈالا ہے۔ یہ انداز محبت کا ہے سراسر محبت۔“

شہلا چند لمبے اس کی نظروں میں دیکھتی رہی۔ ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

”ہاشم۔۔۔ وہ شخص ایک پرچھائیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے جیسا مضبوط شخص کبھی بھی ایک پرچھائیں سے خوف زدہ نہ ہو گا۔ یہ یقین تم نے میرے خوف زدہ دل کو اپنی محبت سے اپنے اعتماد سے بٹھاتا تھا۔“

ہاشم سر ہار تھا۔ شہلا کی نظروں میں وہ شخص اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”اکی ایم سو ری۔ لیکن جانو محبت جواب میں محبت اور اعتبار جواب میں اعتبار اٹکتا ہے۔ صحر میں جیتے رہنے کے لیے ایک خلستان بھی درکار ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہاشم۔“ شہلا اپنے آپ میں لوٹ چکی تھی۔ ”آہستگی سے بولی۔ ”آپ کے گریز کے دور میں جیتے ہوئے مجھے اپنی سب ہی خامیوں کا اور اک ہو چکا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہر لڑکی کے اس عرصے میں میں نے کئی مقام پر آپ کو پاؤں کیا ہے۔“

”پھر لڑکی نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹپکی۔

”لیکن ہاشم۔۔۔ میں اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ تک آنے والی راہ میں نے کسی لاپرواہی سے دھوکے کی آڑ لے کر ہر نہیں کی تھی۔“

”مجھے سنا تھا کہ محض اعتبار تھا۔ آپ کے خلوص کا اعتبار۔ زندگی کو نئے سرے سے دیکھنے کا اعتبار۔ ہاشم! میں نے کبھی فیور کو اتار دیا۔ اتنا بے مول نہیں سمجھا کہ ایک مرتبہ ہمیں سر جھکا کر کنگی دیں بھڑکی ہو جکا ہو سر لے کر دیں جاؤں۔ اس شخص نے جس خنجر غرور اور بے نپاری سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اس کے بعد اس کی سمت کو جانے تمام رستے ہمیشہ کے لیے اندھے ہو گئے تھے ہمیشہ کے لیے۔ میں نے کبھی اپنے کمران رستوں کو پچھاننے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ عمر کی محبت بھی مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔“

”وہ وقت ہمیشہ یاد رکھنے کا جملہ اس نے سلطان نامہ کی طرح کرنا شروع کر دیا۔ ”میں نے اپنے دل میں یہ خیال کے سامنے پیش کر کے کہ شہلا سر آواز دے کر بول کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس لپٹنے کے سوجواز ہوں۔“

”میرے پاس ایک بھی نہیں۔“ مجھے آپ کی محبت، خلوص اور احترام کی کو جھنپی چھاؤں ملی ہے۔ اس سے میں مرکز لگی۔ شہلا روہانہ چاہوں گی۔ مرنے کے بعد کو بھڑکا۔ مجھے جنت عطا کی تو۔“

ہاشم بے اختیارانہ ایک ٹپک لگا تھا۔

”تو میں وہاں بھی آپ جیسے شخص کا ساتھ چاہوں گی ہاشم! اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ مجھے خود سے دور کرنا چاہتے ہیں تو۔“

”شہلا! شہلا! میں نے خود ہو کر اسے سینے سے لگایا تھا۔“ پچھت محبت کو جس اب ایک لفظ بھی نہیں سب کچھ تم کیلئے ایک بار بھی کہہ دیتیں تو میں قیامت تک تم سے بدگمان نہ ہوتا۔ محبت نظروں کی محتاج تو نہیں ہوتی لیکن لفظ اندیشوں اور بدگمانیوں کے قائل ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایک مرتبہ تو کسی کو اپنے نظروں کی بارش سے سیراب کرنا ہی ہوتا ہے۔ آج تم نے میری زندگی بھر کی پیاس کو اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ آنا تم مجھے اپنی مٹی سے اس کی خوشبو آتی رہے گی۔“

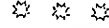
”شہلا! اس کے کاندر سے سر کا کر سکون و طمانیت کے احساس سے سرشار ہو کر آنکھیں موندی تھیں۔

”اب شہلا کوئی سا رو بہ دل کر آئے۔ میں اسے بچان لوں گا۔“ ہاشم مزید بولا تھا۔ ”میں ساتھ ساتھ رہنے شہلا۔۔۔ جنت میں بھی!“

شہلا کی دھڑکنے سے کمرے کا ماحول مزید خوشگوار کر دیا تھا۔

سب لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ سب ہی کے چہروں پر نگر بندی تھی۔

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟
اسے اندر سے اچھتی تھکارتے گھبرا کر عرشے سے سرٹکے پر ڈال دیا۔ پھر اس نے بے تابی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ اب اسے صرف اس خاموشی کے ٹوٹنے کا انتظار تھا۔



”ربیعہ بیٹی! اب کسی طبیعت ہے؟“ اس کی آنکھ کھلی تو منہ دیکھ کر اس کے اوپر ہنسی ہوئی تھیں ربیعہ چند لمحوں کا مہمان چوہا بھرت بھری نظرس اور خوب صورت مکان کو دیکھتی رہی پھر شاشت سے مسکرا دی۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں امی بیٹی! دیکھ کر بیٹھ گئی۔“

”یہ لوہ جائے لیو!“ انہوں نے اسے جانے کی ہلائی پکڑائی۔
”آپ نے تکلیف کیوں کی امی جی!“ وہ شرمندہ ہوئی۔ ”تبی خدمت کرنا میرا کام ہے بجائے اس کے۔“
”بس خاموش رہو۔“ انہوں نے محبت سے اسے ڈانٹا۔ ”کبھی بھی خدمت کرو ابھی لیا کرو۔“
ربیعہ مسکراتے ہوئے جانے لگی۔
”ربیعہ میری جان! انہوں نے اس کے بال سنوارے“ تم مجھے پریشان ہی لگتیں۔ کیا بات ہوئی کوئی مسئلہ ہے تو ابھی ماناں کو بتاؤ۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے امی بیٹی۔!“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”لیکن میں کچھ کرنا چاہ رہی تھی آپ سے۔“
اس نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا پھر قدرے عجیب کے پھر سے مسکرایا۔

”آپ! امیر حسن کے لیے پوچھ رہی تھیں؟“
”مگر تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوگی ربیعہ!“ منہ دیکھ کر اس کی بات کاٹ کر اس نے جھپٹے۔
”جڑی ایک حقیقت بھی ہے جو میں نہیں۔“ جانا چاہتی ہوئی۔ ”وہ ان کو پوچھ کر دیکھو۔ تمہاری ماں ہر صورت تمہارے ساتھ ہے!“

”کیسی حقیقت!“ ربیعہ حیران ہوئی۔
منہ دیکھ کر چند لمحوں کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ وہ تذبذب کا شکار لگی تھیں۔
”ربیعہ۔۔۔ پھر نہ بولی تھیں۔“ میں جانتی ہوں قدرت نے میرے لیے کچھ فیصلہ کر دیا ہے۔ میں اب چند! سے زیادہ نہیں جی توں گا۔“

ربیعہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھامے۔
”امی جی!“

”ہاں میری جان۔! میں جانتی ہوں مجھے کس قدر ہے۔“ ان کی آنکھیں ڈنڈا بیگیں۔ ”لیکن مجھے اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔ جو اس کی رضا میں بہت سے میرے دل کی سب سے ہر مردوں کو یوں پورا کیا ہے کہ دل میں کسی حسرت کا پر چھاواں تک نہیں۔ مجھے اپنے لیے مل گئی۔ میں نے جی بھر کر اپنی متاکو سیر کیا۔ مجھے اپنی بے گناہی ثابت ہونے کی نوید ملی۔ میں اپنے رب کی آواز کشوں میں سرخرو ہوئی۔ ایک گناہ گار انسان اور کیا چاہ سکتا ہے اس کے سوا؟“

ربیعہ نے اپنا سر ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔
”میں تمہاری محبت سے سیراب ہوں ربیعہ! اس لیے میں جانتی ہوں کہ تمہارا باپ بھی اپنی بیٹی کی محبت و خدمت کے ذائقے سے روشناس ہو سکے۔ اسے تمہاری ضرورت ہے!“

ربیعہ نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بے چینی تھی۔
”ہاں ربیعہ! احمد جہاں ازب تمہارے والد لائقہ حیات ہیں۔“ شہریار احمد تمہارا بھائی اور امیر حسن تمہارا اکڑن ہے۔“

”امی جی۔!“ ربیعہ کے لبوں سے ہنسنے لگا تھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“
”یہ سچ ہے بیٹی۔!“ وہ ہنسی کیوں کو جھٹکتے ہوئے بولیں۔ ”شہریار احمد تمہارا سوتلا بھائی ہے۔ تمہارے والد نے باہر جا کر اس کی ماں سے شادی کر لی تھی لیکن انہیں سکون نہ مل سکا۔ وہ ساری عمر اپنے غلام فیصلے پر پشیمان اندر رہی اندر کھٹکتے رہے ہیں۔“

جیرانی کے سمندر میں ڈوبی ربیعہ یک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔
”تمہارے والد پیر الازہر ہیں بیٹی۔! ان کی دیکھ بھال کے لیے محض نرسوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وہ ساری عمر اپنے حقیقی رشتوں سے دور کسی طرح تو رہے ہوں گے۔ کتنا ترسے ہوں گے۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو ان کی اپنی بیٹی ان سے مل پائے۔ ان کی خدمت کر سکے۔ ان کے ساتھ کچھ ہو جائے۔“
ان کی نگاہوں میں ان کا ہاتھ تھامنے پر راضی ہو سکو تو ایسا ممکن ہے۔“

”میں آپ کو چھوڑ کر کیس میں جاؤں گی۔“ وہ ایک ایک ان سے لپٹ گئی۔ ”کبھی نہیں۔“
”میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتی جی! انہوں نے خود پر قابو پائے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ایک التجا ہے۔ تمہارے والد کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”میرے والد۔۔۔ جنہیں ہم تک علم نہیں۔ کہ کبھی ہوں۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”وہ ایک اچھے انسان ہیں بیٹی۔! ان کی ایک سیر کرنا۔“
”میں جانتی ہوں۔“ وہ ایک ایک ان سے لپٹ گئی۔ ”میں ان سے ضروری ملنا چاہیے۔“
”نہ کیوں کر میں۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں۔۔۔ تمہیں ایک باپ کی طرح یاد کر رہی ہوں۔“

”امی جی! امی جی۔!“ ربیعہ ان سے لپٹ کر پھوٹ کر رو دی۔ ”میں آپ کو چھوڑ کر کیس میں جاؤں گی۔“
”میں آپ کو۔“

منہ دیکھ کر دیر سے اس کا چہرہ ٹھیک رہی تھیں۔



نئی کی خوشبوؤں میں ایک جاوٹی اثر تھا! رانچ نے مشام جہاں کو محسوس کیا۔ پھر اس نے دس بجاتی

رنگ دوپٹے کی اس محفل میں بہت سے چہرے تھے۔ لیکن نظرس جس چہرے کو دیکھنے کی متنی تھیں وہ

آن فرماؤ اور ناعمہ کی تقریر دیکھ رہی تھی۔ اس پر بیٹھے دولہا، دولہن کے چہرے حقیقی خوشی کی روشنی سے جگمگ

تھے۔ ان کے انداز میں ایک دوسرے کے لیے چاہت اور الفت تھی۔ ان دونوں کو خوش و خرم دیکھ کر

دراہم بیکم اور ناعمہ کو ہنستا مسکراتا اور مطمئن بنا کر اعداد خوش تھیں۔
ناعمہ بیکم بیٹھے اور ہو کو آپس میں ملتفت پار کشاں و فرخاں تھیں۔

تقریب میں جگمگاتے چہروں کے درمیان ایک مسکرا تا چہرہ پہنچ کر ایک جانب رواں دواں تھا۔ گولڈن بنارسی ساڑھی زیب تن کیے بھاری زیورات پہنے عریضہ نے جب دیکھا تو اس کو مبارکباد دہی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھنے بارہ پائے۔

”عریضہ! ناعمہ نے بے ساختہ سرست سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”آج کے کاجل کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی دعا کی مقبولیت کا احساس ہوا تو ایک عرصے بعد ناعمہ نے اس کی آنکھ کے کاجل کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی دعا کی مقبولیت کا احساس ہوا تو اس کا رواں دواں خدا نے پاک کاشکر بھالائے گا۔“

”خوش ہو تا تم؟“ ناعمہ نے غلٹ بھرے انداز میں تصدیق چاہی۔

”الحمد للہ۔ میں بہت مطمئن اور خوش ہوں ناعمہ۔“

اس نے ذرا کی ذرا فراز کی جانب دیکھا جو اس کی سمت دیکھنے سے گریباں قد رے شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ ”اس دنیا میں زیادہ تر لوگ ایک مرتبہ جیتنے اور ایک مرتبہ مرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ان کا خدا اپنے زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔ انہیں سیدھی راہ چلانا چاہتا ہے۔ انہیں پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ پھر بھی وہ اگر بھٹکیں تو انہیں ہدایت دے کر پھر سیدھی راہ پہ لے آتا ہے۔ میں اپنی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں۔“

ناعمہ حیرانی سے آنکھیں کھولے کب تک اس کا جگمگا تا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ناصح؟ پھر اس نے استفسار کیا۔ ”ناصح کہاں ہے؟“

عریضہ کا چہرہ طبع کے نام پر جس طرح کھلا تھا اس نے ناعمہ کو مزید حیرت میں غرق کیا۔

”آئے تو ہیں۔“ وہ قد رے شہرہ کر لئی۔ ”شاید دوستوں کو بلا کر آئے ہوں۔“

ناعمہ ہنس پڑی۔ تو عریضہ نے جو کچھ کر دیکھا۔ ناصح اس کے پیچھے سے کھڑا تھا۔ ناصح اور گولڈن اپس میں ملنے لگے۔ عریضہ شفق رنگ چہرے کو واپس مڑ گئی۔

تقریب اب اختتام پذیر تھی۔ انتظار کرنا ناصح اب قد رے باپس ہو چلا تھا۔ اس کے انداز کی تمام گفتگو اور دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ عبادت تو تقریب میں موجود تھا۔ عریضہ کو اگر آتا تو وہ بلا کے ساتھ ہی آتی نہ کہ بعد میں۔ اس نے اپنی حاضرت پر خود کو سرور کر لی۔

”ہم بھی آوی تھے کام کے۔“ بڑا بڑا ہی جانتی ہوئے وہ مڑائی تھا کہ ہاشم کے مقابل آگیا۔

ہاشم کے لبوں پر ناقابل فہم ہی مسکراہٹ تھی۔ شہیدہ نرم قد رے اشرفی کو گلاہر کرتی مسکراہٹ۔ ناصح کو محسوس ہوا جیسے وہ مسکراہٹ ناصح کے لیے ہی تھی۔

”کے وہ صوبہ رہے ہو؟“ ہاشم نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔

”قسمت کو!“ اس نے جیسے آہ بھری۔

”وہ کھڑی ہے!“ ہاشم نے اشارہ کیا۔

ناصر نے غلٹ اور حیرانی سے اس سمت دیکھا پھر فوراً ہی اس کے تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔ ہاشم نے چہرہ اشارہ کیا تھا؟ وہاں وہ کھڑی تھی۔

ناصر نے جیسے قد رے فحش کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاڈھے سے ہٹایا تھا۔

”تیرا دوست ہوں یا۔“ ہاشم نے یقین پلانے والے انداز میں کہا۔

”نہیں۔ قسم ظریف ہو!“ وہ ایک سمت کو بڑھ گیا۔

ہاشم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھر سے اس کے کانڈھے پر رکھ لیا تھا۔

”ناصر! ہمیری جان قسمت سے منہ نہیں پھیرے۔ برابراں جاتی ہے اور جو ستارہ قسمت کے ستارے سے دور کھینچتا ہو۔ اس سے روشنی نہیں ملے۔ اس کی روشنی کسی اور کے لیے ہوتی ہے۔“

ناصر اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ پھر اس نے ہاشم کی جانب سر کیا اور چند لمحوں کے لیے اس کی مہربان اور پر غلوس نظروں میں دیکھتا رہا۔

”ہاشم۔“ وہ بول بولا جیسے خود سے بھی خوفزدہ ہو۔

”اے۔“

”کیا وہ کسی اور کے لیے ہے؟“ اس کے لمبے میں انتہائی بے یقینی تھی۔

”ہاں۔“ ہاشم نے ایک لمحے کے انداز میں بولا۔

ناصر کا چہرہ تیزی سے تاریک ہوا۔ ناصح کی آنکھوں میں ترجمہ آیا۔

”میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”کل شام ربیعہ کا کاجل ہے۔ اس کے لڑکپن ابیر حسن کے ساتھ ایس اور شہلا ابھی وہیں سے آرہے ہیں جہاں ساری تفصیلات ملے گی جا رہی تھیں۔ وہ کسی اور کا ستارہ ہے ناصر! اسی کے نام ہونے چاہا ہے۔“

ناصر کو یوں لگا جیسے وہ اس دنیا سے بہت دور۔ سو بوج سے بڑا دل لاکھوں میل دور۔ کسی اندھیرے سمرنا چلا کر اس کے لیے ترنا لگا رہا ہے۔ کچھ دھماکی نہ دیتا کچھ بھائی نہ پڑتا تھا۔ وہ غلام تھا یا اس کے قدموں سے

نکلتی تھی اس کی آواز نہ آتی تھی۔ آقا کے لیے دینا اور اس کے لیے اس کی کیفیت میں وہ کتنی پر جھلا رہا اسے علم نہ تھا۔ ہاشم

نزدیک کیا کہہ رہا تھا اسے علم نہ تھا۔

ہاشم جو اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا، خاموش ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ محض ایک بت سے

مکلف ہے۔ اس کا سب سے پیارا دوست اور لڑکپن اس کے سامنے نہیں ہے اس کے سامنے صرف اس کی

مورت کا ایک بت ہے۔

ہاشم نے خود کو ایک سے چھ مہینوں محسوس کیا جو کوئی زندگی دینے کے لیے سفای کے اس کا سینہ چاک

کر رہا ہے اور اس کی زبان پر ہر گھڑی دیتا ہے جو خود پر ایک مہینے کے جسم صرف اس لیے طاری کر رہا ہے کہ اس کے

سارے جسم کا احساسات اور جذبات دور بیٹھے اس کی محنت بالی کا وظیفہ بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

سادری دینا چاہتے کیا کر رہی تھی؟ وہ دونوں آئے سامنے کھڑے تھے لچرے رنگ کے بے جان بت میں جان لونی۔

ناصر چاک مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلا ہوا اس سے دور جانے لگا۔

ہاشم نے اسے پکارا نہیں۔ اس کے اب آپس میں ہی ہوتے تھے۔ اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ نیا بل کتنی دیر بعد

دھڑکنا شروع کرتا ہے۔ اسے اس کا انتظار تھا۔

نکلی پورج میں کھڑی کر کے وہ تیزی سے چلا ہوا اندر آیا تھا۔ اپنے پورشن کی سمت بڑھتے ہوئے بیک ایک اس کے قدموں سے تھے۔

”حیات والا“ کے رو دو دیوار ہنوز رنگ برنگ و دشنیلوں سے سجے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر خالی عمارت

”میں برسوں پہلے کے جا رہا ہوں وہاں کام نہ خیر کیا خاک کروں گا۔ ساری توجہ سارا ارکان تو یہاں پھونڈ جاؤں گا۔ آپ کے پاس۔ آپ کے کاغذات تیار ہوئے میں بتا دیتے گا میں ایک ایک سینڈ بھی من کر کراؤں گا۔“ اس کے ہاتھ میں ربیعہ کا ہاتھ رزے نہ لگتا۔ اس کی ہتھیلی ٹپک گئی۔ امیر حسن ہولے ہولے ہنس دیا۔
”آپ۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گے؟“ وہ دھڑلے سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔
”نہیں! اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔
امیر حسن مسکرایا۔
”آپ کی تین مرتبہ والی“ ہاں“ کے احوال پر ناں منظور ہے۔“
ربیعہ نے لب بچھ کر مسکراہٹ دکھائی تھی۔
”لیکن آپ سے“ ہاں“ کہلوانے کے کئی طریقے مجھے بھی آتے ہیں۔ مثلاً۔۔۔“ ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے

دیکھا۔

”میں اب جاؤں؟“

ربیعہ نے جلدی سے انہماک میں سر ہلایا۔

”دیکھا آپ نے۔“ وہ زور سے ہنس دیا تھا۔

ربیعہ ہری طرح سے جھینپ گئی۔

امیر حسن نے اس کا ہاتھ چھونے سے قفل آہستگی سے ہٹا لیا۔

”آپ کی یہ جیسا۔ اور کم آمیزی۔ فی الوقت میں تاکت آنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن خدا را۔ میرے

حال پر ترس لگائے گا۔ کاغذات بننے کے بعد ایک دن کی ڈیڑی کی اجازت نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟“

ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”جلدی آجانا ربیعہ! لینے۔“ وہ اس کے کان کے قریب ہنسنے لگا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”خدا حافظ۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

”خدا حافظ!“ ربیعہ نے اس کی پشت کو دیکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔

بست سے چپکے چروں کے درمیان وہ تھما اور اس تھا۔ ہنسنے مسکراتے نفوس ہاں کے ارد گرد سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی کوئی پہچان نہ ہو۔ کوئی شناخت نہ ہو۔ کوئی انت باہیا ہو نہ وہ کسی کو جانتا ہو۔
”راغی۔“ ایقان نے دفعہ ۱۲۰ دیکھا تھا۔
راغی کسی معمول کی مانند اس آواز پر تھرا۔ چپکے مسکے ایقان کی نظروں میں بے اختیار سی جاتی تھی۔
”ایسے خاموشی سے“ یوں شبیدہ سی شکل بنا کر کہاں سے آ رہے ہو۔ کچھ دیر پہلے سب تھما رہے تھے ناں پوچھ رہے تھے۔“

راغی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”بھیسو۔ آپ خوش ہیں نا؟“ اس کے سوال نے ایقان کو حیران کر دیا۔

”ہاں۔۔۔ بہت! اس کا اعتراف نہ ہو رہا تھا۔

”خوش نہیں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ اس نے محبت سے اس کا کھال چھتہ پتا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ایقان نے نہایت جراتی سے اس کی پشت دیکھی تھی۔
پاس سے گزرتے ہاں نے دفعہ ۱۲۰ راغی کا بازو تھام لیا تھا۔ راغی رک کر اسے دیکھنے لگا۔
”ہاں۔۔۔“

اس کی نظروں میں عجیب سی وحشت اور ویرانی تھی۔ ہاں نہ نہ پایا اس نے راغی کو گھلے سے لگایا۔

”ہاں۔۔۔ تم خوش ہو نا؟“

ہاں خاموشی سے اس کی پشت تھپکتا رہا۔

”سب لوگ خوش رہیں ہاں۔۔۔ اور میں بھی بہت خوش ہوں۔۔۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ مکرور مت سمجھو مجھے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ گفتگوں کا سامنا کیے کیا جاتا ہے۔ مسکرا کر چندہ پیدائشی سے مراد نہ دار۔ وہ بہت ہمارے ہاں اتنی ہمارے یعنی وہنا زک ہے اس نے مجھے ہمارے دیکھا تھا ہے۔ مجھنا سکھایا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرائے سکھایا ہے۔ میں اس کا احسان مند ہوں۔ ہمیشہ رہوں گا۔“

ہاں نے الٹ ہو کر راغی کا چہرہ دیکھا۔

”اس کی بھی بہت فرق ہے راغی۔“ کچھ دیر بولا۔ ”میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا اطمینان ہے۔ آنکھوں میں نہ کچھ ہونے والا یقین اور اعتبار۔ اور گفتگو میں زیادہ اور تھراؤ۔ تمہاری آنکھوں میں وحشت ہے۔ چہرے پر پاپوسی اور گفتگو میں کچھ بھی نہیں کیا سیکھا تم نے اس سے؟“

راغی ٹھٹھکا سا گیا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”ٹھٹھک کتے ہو نا؟“ کچھ دیر بولا۔ ”میں وحشت کا جنگل نہیں ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جو زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ کچھ دیر گداز نہ کھانا۔ کچھ دیر کدو سوں کے دھول پر دو تار دو سوں کی خوشیوں پر کھانا آجائے۔“

ہاں ٹھٹھک کر کھل کر مسکرایا۔

”میرا دوست تو جیج میں بدل گیا۔ دوا رہے محبت۔۔۔ تجھے سلام!“

راغی دھیمے سے مسکرایا تھا۔

رنگ و بو کی محفل میں خوشیوں کی لہریاں ہنسی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ ہر چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیکھ کر کچھ دیر کچھ دیکھ کر طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں داخل ہو کر وہ کچھ بھر کے لیے ٹھٹھکا پھر خاموشی سے ڈرنک روم کی جانب بڑھا تھا۔
تاج بیٹی عیشیہ نے اس کی پشت کو دھیمے سے مسکا کر دیکھا تھا۔ چند دن پہلے ایسی ہی ایک ہفتی رات اس کی بے وفائی کی نذر ہو چکی تھی۔ ایسی بڑی حماقت کی کہ راغی جیسا حوصلہ مند ہی اس کا تحمل ہو گیا تھا۔ ایسی بے وفائیوں جو زندگی بھر کے ناست اور پچھتاؤں کا سبب بن جایا کرتی ہیں عیشیہ بحفاظت اس شرور کی بلند ہوئی بیٹیوں سے باہر نکل آئی تھی تو ناخ کے طرف کی بدولت۔ وہ اس کا سامنا تھا۔ اس کا محافظ۔ ہاں اس سے کچھ ناراض ضرور تھا لیکن آج وہ اس کی ہر ناراضی دور کر دینے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔

ناخ لپٹ لپٹ کر کے باہر نکلا۔ نظروں میں ابھجمن بھر کر اس نے بیڈ کے پتوں چھ بیٹھی ”لو سن“ کوں کھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ گلی کی جانب کھلتے دروازے کی جانب بڑھا۔ شاید عیشیہ کے سونے کا انتظار وہ کمرے سے باہر چا کر کرنا چاہتا تھا۔

”اے پاننانا عملن امر ہے۔“

”ہائیم آہ ابراہیم“ نے اذکار کے ساتھ کہہ کر پتھر

300R. 6-11-140 1-15-1

”ہاں۔ میں یہاں۔ تم جہاں کہیں بھی ہوتی ہو۔ محبت مجھے آواز دے لیتی ہے۔ میں مجبور ہوں“ وہ دنگش سے مسکرایا تھا۔ شہلانے نگار سزا دار کا ہاتھ میں تھام لے اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے اور ہاتھ کے درمیان کچھ حائل ہوا۔ اسے گوارا نہ تھا۔

وہ پورے ایک ہفتے کے بعد لوٹا تھا لیکن اس کے چہرے پر ششادہ اور ناگہانی تھی۔

”سب کام تمنا کر آ رہا ہوں۔“ عمار نے رعبہ کو فائل تھما دی۔ وہ نواب شاہ سے رعبہ کی ملکیت کا وعدہ ادا کر کے اور اس کے مکان اور کانوں کے کاغذات حاصل کر کے آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا رعبہ کے نام جو کچھ ہے اسے مل سکے۔ رعبہ نے فائل کو کھول کر دیکھی۔ کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور اداسی سے مسکرائی۔

”میں نے تو آپ کو منع کیا تھا عمار بھائی۔“ وہ بولی ”مجھے ان چیزوں کی تمنا نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔“

”یہ تمہارا حق ہے رعبہ بیٹی۔“ منینہہ بیگم قناعت سے بولی۔ ”پانچ حاصل ضرور کرو۔ پھر خدا سے رکھو یا کسی غریب کو بخش دو۔“

”عمار بھائی۔“ رعبہ نے اچانک فائل اسے واپس تھما دی۔ ”مجھے اس کے ساتھ ان چند کانوں کی قطعاً حاجت نہیں۔ یہ راوی کی ملکیت تھیں راوی ہی کو ان کی ضرورت ہے۔“

”تمہاری راوی کو؟“ عمار نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی ہاں! رعبہ نے اپنی بیگم پر چلتے ستارے خوشبو لگے۔ ”میری راوی کو۔ میں چاہتی ہوں عمار بھائی کہ آپ یہ سب کچھ کسی ٹرسٹ کو دے دیں تاکہ یہ مدد جاری رہے۔ ان کے عذاب میں تخفیف کا باعث بنے۔“

”رعبہ! منینہہ بیگم کے لب کا پتہ تھے۔

”جی ہاں!۔“ رعبہ نے اختیاران سے لپٹ گئی۔ ”میری راوی اس جہاں میں غریب ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ کی مٹائی پاس نہ ان کی مدد کو پہنچے۔ میری سزا سنائی ہے۔ لیکن امی جی راوی نے مجھے ہمیشہ محبت کے دریا سے سیراب رکھا۔ اس طرح کہ میں اپنے عمر کے اس حصے میں مٹائی طلب کو بھی محسوس نہ کیا۔“

منینہہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چلے۔

”امی جی۔ امی جی۔ ہو سکے، ہو سکے تو میری راوی کو معاف کر دے امی جی۔ مجھے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ منینہہ بیگم کی ہند بھیلوں سے مونی بیج کے دانوں کی مانند گر رہے تھے۔

”امی جی۔ میری راوی۔ بہت عذاب سہہ چلیں۔ اب میری خاطر آپ انہیں معاف کریں۔“ رعبہ تواتر سے گلے جا رہی تھی۔

منینہہ بیگم کا پکیا ناہاتھ اس کی پشت تھپکتے لگا۔

ایک ماہ کے اندر اندر اس کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ وقت روایتی آپسنا تھا۔ عمار اس کے اور شہار کے شخص کو کرا کر لانا تو باخول سوگوار سا ہو گیا۔ منینہہ بیگم کے حد نہ زور ہو چکی تھیں۔ اب بستر سے اٹھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ رعبہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ بنانا چاہتی تھی سو ہر وقت ان کے قریب موجود رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان کے قریب بیٹھی ان کا سر آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے بار بار قطرے پھپھکتے۔ رعبہ خاموشی سے انہیں صاف کر دیتی تھی۔

”تمہارا سارا سامان تیار ہے۔“ انقبہ اس کی پیٹنگ سے فاسخ ہو کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”جہاں جا کر کھو لو گی تو مجھے یاد کرو گی۔“ انہی فطرت سے پیٹنگ کی ہے میں نے۔ پیٹنگ کے دوران بھی اس کا کچھ نہیں جھڑپے گا۔

”میں ویسے بھی تم کو بہت یاد کروں گی انقبہ۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”امی کا بہت بہت خیال رکھنا۔“

ایئر پورٹ پر معمول کی گھبراہٹ تھی۔ رعبہ کو الوداع کہنے کے لیے کئی چہرے موجود تھے۔ شہلا، ہاشم، انقبہ، عباد۔ وہیل جیٹر منینہہ بیگم۔ ترانا، عبدالباری، فراز، ناعہ اور سب سے مل کر اس نے وردہ کو گونجھا تو اسے خوشی آمیز حیرت نے گھیر لیا۔

”وہ وردہ! وہاں سے لپٹ گئی۔ ”تم نے مجھے حیران ہی کر دیا۔“

”کیوں۔“ وہ نرم آنکھوں سے مسکرائی۔ ”مجھے دوست نہیں سمجھتیں؟“

رعبہ نے ناقابل فہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

”تم چاہتی ہو وردہ! میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں! بہت چاہتی ہوں میں تمہیں۔“

اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے وردہ کے ہاتھوں کو اپنے گلے سے دبا لیا۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی کے اپنے حصے کی ساری خوشیاں حاصل کرو۔“ وہ دونوں بے اختیار لپٹ آئیں۔

پھر رعبہ کے باوی باوی لپٹ کر لاری باور کھڑا حافظ کو کہہ کر اور شہار احمد لاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے اندر چلنے والے کے بعد چار نظارے دکھائی دیے۔ اپنے اہل صاف کر رہے تھے۔ انقبہ، منینہہ بیگم کا چہرہ صاف کر رہی تھیں۔ انہیں خود سے پتہ نہ تھا۔

”میں ہوں نا امی۔ آپ کی دوسری رعبہ۔“ وہ بولی۔

اور وہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

| | | |
|------------------------------|------------------|------------------|
| ☆ ستاروں کا آئینہ | ☆ نیم حرقیشی | ☆ قیمت: 400 روپے |
| ☆ ایمان امید اور محبت | ☆ عبیرہ احمد | ☆ قیمت: 200 روپے |
| ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جیوں | ☆ قیمت: 350 روپے | |
| ☆ تیرے نام کی شہرت | ☆ شازیہ چودھری | ☆ قیمت: 180 روپے |
| ☆ امرنیل | ☆ عبیرہ احمد | ☆ قیمت: 450 روپے |

خوبصورت مرد
خوبصورت عورت
منہ بولا جلد
آخست بھی

شانس ہو گئے ہیں

ایرپورٹ سے باہر آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر رافع کھڑا تھا۔ وردہ نے گردن موڑ کر فراز اور ناعمہ کو دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ رافع نے گلاسز اتارے اور آگے بڑھ آیا۔
”وردہ!“

وردہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان سپاٹ نظروں میں عجیب سی خاموشی تھی۔
”چلیں؟“

”لیکن میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔
پھر اس نے ناعمہ اور فراز کو دیکھا تھا۔

”آپ لوگ چلیں۔۔۔ میں رافع کے ساتھ آجاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ہلکی سی حیا در آئی اور گال سرخ پڑ گئے۔ فراز اور ناعمہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہلا اور ہاشم بھی دور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وردہ نے رافع کا پھیلا ہوا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہوئی۔
وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔

”امی جی۔۔۔“ عباد کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے لب لہجہ آہستہ آہستہ بل رہے تھے۔
”ربیعہ اور شہلا راجہ شہناخ خیریت کے پہنچ گئے ہیں۔“ وہ آستکی سے بولا۔
انہوں نے آہستہ سے الحمد للہ کہہ کر لرزتے ہاتھ منہ پر پھیرے۔

”میں ان سے آپ کی بات کروا تا ہوں۔“ عباد کے انداز میں عجیب سی مٹن تھی۔

پھر اس نے دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھا کر وہیل چیر کر شہلا اور وہیل چیر کر دھکے لگاتا ہوا آجی اسٹڈی میں لے آیا جہاں انیقہ ان کے گریب لاپ پر بیٹے گلگلے بیٹھی تھی۔
اسکرین پر ربیعہ نظر آ رہی تھی۔ منیوہ بیگم کی آنکھوں میں روشنی در آئی۔ عباد نے انہیں ربیعہ کے رویہ کو دیا۔

ربیعہ کی آنکھوں میں غمی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ دفعۃً ”اسکرین پر ایک کمزور بدقوق چہرہ نمودار ہوا۔ منیوہ بیگم ساکت رہ گئیں۔ یہ چہرہ یہ سناسا چہرہ۔ یہ اپنا اپنا سا لگتا چہرہ۔ کون تھا یہ شخص۔۔۔ ان کا ماضی۔۔۔ ان کی روشنی تقدیر۔۔۔ ان کا مہرمان۔۔۔ پھر ان کا ستم گر۔۔۔
احمد جہاں زیب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں منیوہ بیگم ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ ان ہاتھوں کو دیکھے جاتی تھیں۔

اچانک ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسکرین خاموش ہو گئی۔

عباد نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا۔ وہاں بھی ایک جلد خاموشی تھی۔
”امی۔۔۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت برآمد ہوا۔

”امی۔۔۔“ انیقہ نے چیخ ماری تھی۔

سارے رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ عباد نے آستکی سے ماں کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بابا۔۔۔“ ربیعہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہلا راجہ نے اسے گلے سے لگایا۔ امیر حسن نے ان کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کیا تھا۔

دو روہیں بدگمانی کے ہر بندھن سے آزاد آسمانوں کی جانب محو سفر تھیں۔

(ختم شد)